جُراتوں کے نشان

پاکستان
اسلام آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

جنرل محمد ضیاء الحق
صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان

مجھے جناب سعید راشد کی تالیف کردہ کتاب "جراُتوں کے نشاں" دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ اسے پڑھ کر جی بہت خوش ہُوا۔ کیونکہ اس کتاب کا موضوع وہ غازی اور مجاہد ہیں جنہوں نے ہماری آزادی کے دفاع میں اہم کردار ادا کیا اور ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے ملک و قوم کی تعمیرِ نو کو جاری رکھ سکیں۔ ملک، قوم اور نظریۂ اسلام کے یہ محافظ ہمارے خراج اور تشکر کے مستحق ہیں۔

یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ ہمارے ہاں تاریخی واقعات کو محفوظ رکھنے کا رجحان بہت کم ہے اور جو بہادر اور جیالے اپنے خون پسینے سے یہ تاریخ بناتے ہیں ان کے نقوش بھی خال خال صفحۂ قرطاس پر منعکس ہوتے ہیں۔ جنگ و جدل کے دوران تو ان جیالوں کی جراُتوں سے ساری قوم حرارت پاتی ہے لیکن بعد میں وقت کی خاک ان چہروں کو دھندلا دیتی ہے اور ہم اپنے اپنے معمولات میں گمن ہو کر ان محسنوں کے کارناموں کو بھول جاتے ہیں۔ جناب سعید راشد نے ملٹری کالج جہلم کے ۳۹ سپوتوں کے حالات قلمبند کرکے اس ضرورت کو جزوی طور پر پورا کر دیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کام کو ملکی سطح پر انجام دیا جائے تاکہ ہماری ملی تاریخ کا یہ درخشندہ باب نہ صرف محفوظ ہو جائے بلکہ آئندہ نسلیں بھی اس سے حوصلہ اور تحریک حاصل کر سکیں۔

میں ملٹری کالج جہلم کے شعبۂ تعلیمی تحقیق و ترقی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے اپنے فرزندوں کے کارنامے محفوظ کرنے کا اہتمام کیا۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب بہت سے نوجوانوں کو نیا ولولہ عطا کرے گی۔

جنرل ضیاء الحق
چیف آف آرمی سٹاف
و
صدر اسلامی جمہوریۂ پاکستان

راولپنڈی
۲۹ مارچ [illegible]

جرأتوں کے نشان

○

سعید راشد

○

جہلم بک کارنر

اشاعت ---------- ۱۹۸۸ء

اہتمام ---------- شاہد حمید، محمد کامران

پرنٹر ---------- معراج پریس لاہور

قیمت ---------- =/۲۵۰ روپے

---- سول ڈسٹری بیوٹر ----

کامران بُک بینک

اقبال مارکیٹ ○ مین بازار ○ جہلم

○

اِنتساب

اُن تمام گُمنام جانبازوں اور شہیدوں
کے نام
جن کا نہ کہیں سنگِ مزار ہے نہ چراغ ہے
لیکن جو جِیے تو پاکستان کے لِیے جِیے
اور جان دی تو پاکستان کے لِیے دی

سعید راشد

اِن کتابوں کے بغیر کوئی لائبریری مکمل نہیں کہی جا سکتی

جرأتوں کے نشان	سعید ارشد	۲۵۰٫۰۰ روپے	اُڑتے خاکے	سید ضمیر جعفری	۶۰٫۰۰ روپے
تذکرۂ شہداء	〃	۱۵۰٫۰۰ 〃	ضمیریات	〃	۵۰٫۰۰ 〃
اکرم نشانِ حیدر	〃	۱۰۰٫۰۰ 〃	متاعِ ضمیر	〃	۶۰٫۰۰ 〃
حق نواز کیانی	〃	۱۰۰٫۰۰ 〃	بہروپ نگر	عصمت چغتائی	۶۰٫۰۰ 〃
کردار ساز	〃	۲۰۰٫۰۰ 〃	عصمت کے شاہکار افسانے	〃	۶۰٫۰۰ 〃
مکالماتِ اقبال	〃	۲۰۰٫۰۰ 〃	آیا بسنت سکھی	واجدہ تبسم	۳۰٫۰۰ 〃
سرسید احمد خان	راجہ طارق محمود	۲۰۰٫۰۰ 〃	واجدہ کے بہترین افسانے	〃	۶۰٫۰۰ 〃
چنگیز خان	〃	۱۰۰٫۰۰ 〃	زرگاؤں کی رانی	کرشن چندر	۳۰٫۰۰ 〃
اورنگ زیب عالمگیر	〃	۲۰۰٫۰۰ 〃	کرشن چندر کے یادگار افسانے	〃	۶۰٫۰۰ 〃
اقوالِ زریں	شاہد حمید	۳۰٫۰۰ 〃	تُو چاند میں سمندر	امرتا پریتم	۶۰٫۰۰ 〃
روشنی کے مینار	〃	۳۰٫۰۰ 〃	امرتا پریتم کے منتخب افسانے	〃	۶۰٫۰۰ 〃
گفتگو تقریر ایک فن	ڈیل کارنیگی	۳۰٫۰۰ 〃	خزاں کا پھول	ایم۔اے سوز	۷۵٫۰۰ 〃
سلطان ٹیپو	فیض عالم صدیقی	۵۰٫۰۰ 〃	رانگ نمبر	انجم ممتاز	۳۵٫۰۰ 〃
اسلام کے نامور سپہ سالار	〃	۳۰٫۰۰ 〃	تجھ بن جیا کیا کیا	〃	۶۰٫۰۰ 〃
خلافتِ راشدہ	〃	۶۰٫۰۰ 〃	رام محمد ڈیسوزا	علی رضا	۳۰٫۰۰ 〃
حقیقتِ مذہبِ شیعہ	〃	۶۰٫۰۰ 〃	لفظ کھردرے	تنویر سپرا	۶۰٫۰۰ 〃
صبح کی دستک	خلیل جبران	۳۰٫۰۰ 〃	تلخیاں	ساحر لدھیانوی	۶۰٫۰۰ 〃
غالب فکر و فن	رشید حسن خان	۳۰٫۰۰ 〃	شبستان	شکیل بدایونی	۳۰٫۰۰ 〃
غالب ایک مطالعہ	〃	۶۰٫۰۰ 〃	آخری شب	کیفی اعظمی	۳۰٫۰۰ 〃

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست عنوانات

جرأتوں کی گواہی

سید ضمیر جعفری

خوبیوں کا حق ہے کہ ان کی شہادت دی جائے ـــــ محترم پروفیسر سعید راشد عصری تاریخ کے حوالے سے یہی اہم قومی فرض ادا کر رہے ہیں اور وہ یہ فرض کچھ اس لگن اور سلیقے سے ادا کر رہے ہیں کہ ان کا قلم ہماری تاریخی شہادتوں کا سب سے بڑا گواہ بن گیا ہے۔

"خوبیوں کی شہادت" کے لئے پروفیسر راشد، عسکری ستاروں کی بکھری ہوئی روشنی کو سمیٹ کر تاریخ کے سپرد کر رہے ہیں۔ قومی زندگی کے اس مخصوص تناظر میں اس سے قبل ان کی یہ تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

تذکرہ شہداء (جنگ ستمبر و دسمبر کے پندرہ شہیدوں کا تذکرہ)

اکرم شہید نشان حیدر

حق نواز کیانی شہید ستارہ جرأت

یہ کتابیں میری نظر سے گزری ہیں۔ یہ شہادتوں کے صحیفے تھے۔ ان کی چند اور تالیفات مثلاً مکالمات اقبال، گفتار و کردار قائد اعظم اور شاد باد منزل مراد پاکستان کی نئی نسل کے لئے نسخہ وفا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن کتابوں کو میں نے شہادتوں کا صحیفہ کہا ہے وہ ہمارے زندہ جاوید شہداء کے تذکار کے لئے وقف ہیں۔ یہ تذکرے ہماری تاریخ کا بیش بہا سرمایہ ہیں کہ ان کے صفحات پر ہمارے ماضی کے ماہتاب اور مستقبل کے آفتاب چمک رہے ہیں۔

جرأتوں کے نشان، میں پروفیسر راشد نے پاکستان کے جیالے غازیوں کی روئداد لکھی ہے میدان جنگ میں ان کی غیر معمولی جرأتوں کا احوال بھی اور ان کی زندگی کے خدوخال بھی میں سمجھتا ہوں کہ ان جیالوں کے شخصی خاکوں نے اس کتاب کی دھڑکنوں کو ہمارے دل کے اور زیادہ

قریب کر دیا ہے۔ اپنے غازیوں کا اتنا موثر، سچا اور زندہ مرقع مرتب کر کے پروفیسر راشد نے یقیناً ایک اہم قومی خدمت انجام دی ہے جس کے لئے وہ ہمارے انفرادی شکریئے ہی کے نہیں بلکہ قومی سطح پر بھی اظہار تحسین کے مستحق ہیں۔

زیر نظر کتاب ــــ جراٗتوں کے نشاں ــــ معرکہ کشمیر کچھ اور جنگ ستمبر و دسمبر کے "بیالیس ستاروں" (اعزاز یافتگان) کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ انگریزی کی مشہور مثل ہے کہ خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے۔ پروفیسر راشد کا تعلق ملٹری کالج جہلم سے ہے، سو انہوں نے انہی ستاروں کو منتخب کیا ہے جو ملٹری کالج کے افق سے شہرت و عظمت کے آسمان پر طلوع ہوتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تقدیم سہولت کار کے لئے ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یوں بھی کسی درسگاہ پر پہلا حق اس درسگاہ کے فرزندوں ہی کا ہوتا ہے۔ بہر حال میں امید کرتا ہوں کہ ملٹری کالج جہلم کا شعبہ تعلیمی تحقیق و ترقی تاریخ پاکستان کی اس پوری سنہری متاع کو سمیٹنے کی سعی جاری رکھے گا اور مجھے یقین ہے کہ اپنے جیالوں کے کارنامے بیان کرتے ہوئے پروفیسر سعید راشد کا شاداب ذہن اور جی دار قلم اسی دھج سے رواں رہے گا۔ ع

کس کی زبان کھلے گی پھر، ہم ہی نہ گر سنا سکے

اسلام آباد

۱۸ ؍ اکتوبر ۱۹۸۴ء

سید ضمیر جعفری

قطرے سے گہر ہونے تک

غازیوں اور شہداء کے تذکرے مختلف اہلِ قلم نے لکھے ہیں، ان تذکروں میں عموماً انفرادی کارناموں کو نمایاں کیا جاتا ہے، اور نمایاں شخصیتوں کی اہمیت کا احساس دلایا جاتا ہے، لیکن شخصیت کو عظمت بخشنے والے عوامل کا تجزیہ بہت کم کیا جاتا ہے، اس روش عام سے ہٹ کر سعید راشد صاحب نے ان عوامل کی نشاندہی کی ہے جن کی بدولت کوئی شخصیت ملک اور ملت کے کام آتی ہے، شخصیت کا وہ جوہر جسے قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔

"اور اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ ان پر تنگی ہی کیوں نہ ہو" ایثار کشی کا یہی جذبہ کسی شخص کو اپنی جان تک حق کی خاطر قربان کرنے پر ابھارتا ہے، حق کی خاطر مر بھی وہی سکتا ہے جو حق کی خاطر جی سکے، اسی لئے غازی کا مرتبہ شہید سے کم تر نہیں ہے۔ میدان جنگ میں غازی یا شہید بننے کے لئے زندگی بھر کی ریاضت اور تربیت نفس کی ضرورت ہوتی ہے اس تربیت نفس کے مختلف مراحل کی نشاندہی اس کتاب کا اصل مدعا ہے۔ قطرے سے گہر بننے تک کن کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان مراحل کا بیان اس کتاب میں بڑے دلنشین اور دلنواز انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ دلنشینی اور دلنوازی اس روایت کی اہم کڑی ہے، جس کا اوّلین تابناک نقش حکایات سعدی ہیں۔

سعید راشد کے انداز بیان کی حلاوت اور گھلاوٹ ہمیں شیخ سعدی، رشید احمد

صدیقی اور خلیل جبران کی یاد دلاتی ہے، حکمت و موعظت کا یہ دلکش انداز بڑی مشکل سے نصیب ہوتا ہے، اس کے لئے نفسیاتی ژرف بینی کے ساتھ دردمندی اور دلسوزی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان دوخوبیوں کی وجہ سے ان کے ایک ایک لفظ میں حکیمانہ گہرائی کے علاوہ دردِ دل پر دستک دینے کی پوری صلاحیت موجود ہے

جہاد کو اگرچہ ہم صرف میدان جنگ تک محدود خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ جہاد بالسیف کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد اصغر اور جہاد بالنفس کو جہاد اکبر قرار دیا ہے اسی حقیقت کو سعید راشد صاحب نے ان الفاظ کا روپ دیا ہے۔

"جہاد صرف میدان جنگ میں نہیں ہوتا۔ جو جہاں ہے وہی اس کا میدان جہاد ہے"۔ "میدان جنگ میں اترنے سے پہلے کتنی زبردست ذہنی اور عملی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے"۔ اس حقیقت کی طرف بھی انہوں نے باربار توجہ دلائی ہے۔

جان بڑی قیمتی شے ہے بے ضرورت اپنے آپ کو یا اپنے آدمیوں کو خطرے میں ڈالنا بہادری نہیں بے وقوفی ہے۔ "کمانڈو اور گوریلا جنگ میں منصوبہ بندی اور ریکی کی ضرورت روایتی جنگ سے زیادہ ہوتی ہے۔ میدان جنگ میں بھی عام سپاہی اور مسلمان سپاہی کا کردار کتنا مختلف ہونا چاہیئے۔ اس اہم حقیقت کو بھی انہوں نے ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

" لڑائی میں مارنا برحق ہے۔ لیکن ظلم برحق نہیں ہے"۔ یہی وہ واضح فرق ہے، جو مسلمان فاتحین کے کردار کو دیگر فاتحین سے مختلف ہی نہیں بلکہ ارفع و اعلیٰ بناتا ہے۔ بریگیڈیئر سلطان کے کردار سے انہوں نے اس امر کا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔

"بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلے میں لاکھوں نہیں۔ کروڑوں روپے کے نوٹ اور کروڑوں کا سونا میرے ہاتھوں سے گزرا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس بے حد وحساب

دولت سے میرا دامن آلودہ نہیں ہوا۔ اور جب اس آگ کے دریا سے گزر کر میں نے گھر میں قدم رکھا، تو میرے تن کے کپڑوں اور قرآن حکیم کے سوا میرے پاس کچھ نہیں تھا۔

بے لوثی اور ایثار کشی کا یہ جوہر پیدا کرنے کے لئے گھریلو سطح پر اور تعلیمی اداروں میں صحیح خطوط پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ استاد کا کردار طالب علموں کے کردار کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں رول ادا کرتا ہے اس کو واضح کرنے کے لئے سعید راشد صاحب نے لکھا ہے

" جب تربیت ٹھیک ہو، تو تعلیم از خود ٹھیک ہو جاتی ہے چھوٹے درجوں میں بچوں کو احساس تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے اور ماں کی طرح احساس تحفظ وہی دے سکتا ہے۔ جو خود بھی ماں کا کردار ادا کر سکے، میرے یہ استاد اس معیار پر پورے اترتے تھے اچھی قومیں اچھے استادوں سے بنتی ہیں۔ افسوس ہے کہ اب اچھے استاد پیدا کرنے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی "

یہ پوری کتاب ایک دعوت فکر و عمل ہے، اس میں ہمیں اپنے معاشرے کو ان خطوط پر استوار کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کی زندگی اس سانچے میں ڈھل جائے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملک و قوم کے لئے وقف کر دے، زمانہ جنگ ہو یا زمانہ امن ہر موقع پر ہمارا کردار مثبت اور تعمیری ہو،

" زمانہ امن میں جرأت سے صحیح قدم اٹھانا اور اٹھاتے رہنا جنگ میں ایک جرأت مندانہ اقدام سے زیادہ مشکل ہوتا ہے "

" ہیرو بیرکوں میں بنتے ہیں۔ میدان جنگ میں نہیں "

(ڈاکٹر) غلام حسین اظہر

تصویریں اور ان کا مصوّر

ملٹری کالج جہلم کے شہیدوں اور غازیوں کے کارناموں کا تذکرہ ہو تو ذہن میں پروفیسر سعید راشد کا نام ابھر آتا ہے "جرأتوں کے نشاں" اسی سلسلے کا ایک اور سنگ میل ہے۔ اتنے غازیوں اور دلاوروں کے کارناموں کو ریکارڈ پر لانا بجائے خود ایک قومی خدمت ہے اور اس لحاظ سے اس کتاب کی تاریخی اور واقعاتی اہمیت مسلم ہے لیکن اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جیسا خود مصنف نے واضح کیا ہے زور انکی "شخصیتوں" کے مطالعے پر ہے ان کے "کارناموں" پر نہیں کیونکہ کارنامہ شخصیت ہی سے ابھرتا ہے۔

ہمارے سیرت نگار اور مرقع نگار عام طور پر اپنے ممدوحین کے بارے میں مواد کتابوں سے اکٹھا کرتے ہیں۔ لیکن راشد صاحب کے ممدوحین ایسے ہیں جن کے بارے میں کتابوں کی مدد دستیاب نہیں۔ انہوں نے یہ سوانحی خاکے ان شخصیتوں سے انٹرویو کرکے یا ان کی گفتگو ٹیپ کرکے مرتب کئے ہیں یا سوالنامے کے جواب میں ان کی خود نوشت یادداشتوں پر مبنی ہیں۔ یہ خاکے آپ بیتی کے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر داستان کے پردۂ زنگاری میں خود مصنف کا حسن بیان جھلکتا نظر آتا ہے۔

یہ شخصیتیں دیکھنے میں عام انسانوں جیسی ہیں لیکن میدان کارزار میں انہوں نے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے۔ راشد صاحب نے انکی تصویریں ایسے تناظر میں کھینچی ہیں جس سے یہ واضح ہو سکے کہ انسان میں بڑائی کیسے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں خاندان کا اثر، گھر کی تربیت اور درسگاہ کا فیضان کس کس طرح شریک ہوتا ہے۔ راشد صاحب کے اسلوب بیان میں شگفتگی، بے تکلفی، دوستانہ اور رازدارانہ لہجہ اور بلا کی روانی ہے ابلاغ اور اظہار یقیناً ایک نازک اور پیچیدہ عمل ہے۔ اس میدان میں بڑے بڑوں کے پاؤں پھسل جاتے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ راشد صاحب دقیق خیالات کو چٹکیوں میں کہہ جانے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ انکے چھوٹے چھوٹے جاندار اور دلنشیں فقرے بڑی خوبی سے وہ مطالب ادا کر دیتے ہیں جو دوسرے لکھنے والے ثقیل عبارتوں سے گراں بار کئی کئی صفحوں میں بھی پوری طرح بیان نہیں کر پاتے۔

ہماری زندگی واقعات کا ایک سیل رواں ہے جس میں کوئی وقفہ نہیں آتا لیکن اہل نظر صرف واقعات کو نہیں دیکھتے۔ ان واقعات کی تہ میں چھپے ہوئے مفہوم بھی تلاش کرتے ہیں۔ اس کتاب میں اور پروفیسر راشد کی دوسری کتابوں میں، میں نے یہ خصوصیت دیکھی کہ وہ واقعات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ انکی سطح سے نیچے بھی اترتے ہیں۔ اور ہر واقعے کے پیچھے چھپی ہوئی کوئی نہ کوئی اخلاقی یا نفسیاتی حقیقت انکے ہاتھ آجاتی ہے وہ ایک غواص کی طرح ہر دریا کی تہہ سے موتی نکال لاتے ہیں انکی تحریر کے ان حصوں میں ایک فلسفیانہ شان، ایک مفکرانہ حسن نظر آتا ہے۔ یہ مرقع عزم اور ولولہ پیدا کرنے اور دلوں کو گرمانے والی چیز ہے۔ عین الدین سلوک

دیباچہ

سب سے پہلے میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب اشخاص کے نہیں اقدار کے بارے میں ہے۔ اس کا مقصد کچھ اشخاص اور ان کے خاندانوں کو اچھالنا نہیں بلکہ ان قدروں کو ابھارنا ہے جن کی علامت یہ اشخاص ہیں۔ اور ان رویّوں کو اجاگر کرنا ہے جن کی ترجمانی ان کے گھرانے کرتے ہیں۔ چونکہ یہ قدریں اور رویّے ایک پوری نسل کے رویّے ہیں۔ اس لئے یہ تذکرہ صرف ان بیالیس غازیوں ہی کا تذکرہ نہیں جنہوں نے اتفاق سے ملٹری کالج جہلم میں تعلیم پائی بلکہ یہ پاکستان کے ان تمام نامور اور گمنام غازیوں اور مجاہدوں کا تمثیلی تذکرہ ہے۔ جو ۱۹۴۸ سے ۱۹۷۱ تک مختلف جنگوں اور معرکوں میں اسلام اور پاکستان کی خاطر داد شجاعت دیتے رہے۔ ان کے نام مختلف تھے۔ ان کے کام اور کارنامے بھی مختلف تھے۔ لیکن ان کی سوچ، ان کا طرز احساس ان کی خاندانی روایتیں اور ان کی تربیت کی روح یکساں تھی۔ اسی قدرِ مشترک کی نشاندہی ان اوراق میں کی گئی ہے۔

—— یہ کتاب ایک لحاظ سے ایک نفسیاتی مطالعہ بھی ہے۔ اس میں یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جیالے اور جیدار کس مٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔ کس ماحول میں پرورش پاتے ہیں اور ان کی شخصیت کا تانا بانا کن عناصر سے بنتا ہے اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس مملکت خداداد کی زمینی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لئے ہمیں جیالے اور جیدار ملتے رہیں اور مسلسل ملتے رہیں، تو ہمیں اپنے مجاہدوں اور غازیوں کی قدر کرنا ہوگی۔ اس طرح اور اتنی جتنی کہ ان کا حق ہے، اور ان حالات کو، اس ماحول کو، ان قدروں اور رویّوں کو قائم و دائم رکھنا ہوگا۔ جن کے زیر اثر

ایسے جاں نثار پروان چڑھتے ہیں۔

اپنے شوق سے جہاد کرنا اور اپنی خوشی سے جان دینے کے لئے تیار ہوجانا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کسی فرد کا اپنی ذات سے بلند تر اور عظیم تر مقصد پر ایمان ہو اور اسے اپنے آئیڈیل کے ساتھ پورا پورا جذباتی لگاؤ ہو، جب مال و دولت دنیا، اور رشتہ و پیوند ہی سب کچھ ہو جائیں تو پھر لڑنا اور جان دینا ممکن نہیں رہتا۔

یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند

بتاں وہم و گماں، لا الہ الا اللہ

____ اب چند باتیں اس کتاب کی تکنیک کے بارے ہیں، چونکہ کتاب کی تالیف کا مقصد ہے کہ مجاہدوں کی شخصیتوں کا نفسیاتی مطالعہ کیا جائے اس لئے جو سوال نامہ تیار کیا گیا اس میں نسلی اور خاندانی پس منظر، بچپن کے حالات واقعات، ماحول اور طرز تربیت اور بعد کی زندگی کے اہم تجربات کے متعلق خاص طور پر پوچھا گیا تھا۔ سوالنامے کے جوابات اور روبرو گفتگو سے جو مواد حاصل ہوا وہ پیش خدمت ہے۔ زور شخصیت کے مطالعہ پر ہے۔ کارنامہ پر نہیں۔ کارنامہ اصل میں شخصیت ہی کا ایک اظہار ہوتا ہے۔ بیشتر حالات و واقعات خود نوشت صورت میں ہیں اور کارناموں کے بیان پر سرکاری فرمان کی مہر تصدیق ثبت ہے۔

____ شخصیتوں کے ان خود نوشت خاکوں میں کہیں کہیں شوخیوں، شرارتوں، ناکامیوں اور کمزوریوں کا ذکر بھی ہے۔ صرف یہ جتانے کے لئے کہ مجاہد اور غازی بھی عام انسانوں جیسے انسان ہوتے ہیں فرشتے نہیں ہوتے۔ فرق صرف طرز احساس کا ہوتا ہے۔

____ حالات و واقعات کو بیان کرنے میں ناول کی تکنیک برتنے کار لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ بیان کی دلچسپی میں اضافہ ہوا اور ماحول کی صاف تصویر کھنچ کر سامنے آئے۔

بیالیس حضرات کو انٹرویو کرنا یا ان سے سوالناموں کے جوابات حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ بہر حال میں تمام شرکا تذکرہ کا ممنون ہوں کہ انہوں

نے اس قومی کام بلکہ ایک مشن کی تکمیل میں بھرپور تعاون کیا۔ ان اصحاب کے علاوہ اور بہت سے اولڈ بوائز نے انٹرویو لینے اور رابطے قائم کرنے میں میری بڑی مدد کی۔ ان سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا تو ممکن نہیں لیکن میرے دل پر بوجھ رہے گا اگر میں ان میں سے چند کا ذکر نہ کروں مثلاً ۷۰۵۲، کرنل رشید کیانی جن کی پُرجوش دلچسپی ہر مرحلہ پہ میرے شامل حال رہی۔ ۲۰۹۲ بریگیڈیئر رب نواز خان نے مواد کے حصول میں میرا ہاتھ بٹایا۔ ماشاء اللہ ۱۰۶۳، احسن اختر کیانی ۱۱۳۲۶ کیپٹن محمد امین ۶۵۲۰، منصور احمد ۶۰۲۱، کرنل محمد یونس ۱۷۰۰، راجہ محمد افضل ۷۰۳۳۰؛ وارنٹ آفیسر اورنگ زیب ۱۸۵۲۰، عنایت بھٹی ۱۸۷۳، عزیز احمد ۲۴۱۵، محمد یونس نے کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں تعاون کیا اور ۲۴۶۹ کرنل ذوالفقار علی شاہ بخاری نے کتابت کی پروف ریڈنگ جیسے کام کو جو بڑی توجہ اور دیدہ ریزی چاہتا ہے بڑے ذوق و شوق سے کیا میں ان سب کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

پاکستان ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ ایک تحفہ خداوندی ہے ایک مقدس ورثہ ہے اس ارض پاک کے ہم سب پر احسانات ہیں اس مٹی کے ہم پر بہت سے قرض ہیں۔ اس قرض کو کسی نہ کسی طرح تھوڑا بہت اتارنا ایک قومی فرض ہی نہیں بہت بڑی سعادت بھی ہے۔ یہ کتاب اسی قسم کی ایک ناچیز کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے۔ آمین۔

آخر میں، میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان، جناب جنرل محمد ضیاء الحق چیف آف آرمی اسٹاف کا خاص طور سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ازرہ کرم اس کتاب کو اپنے قیمتی پیش لفظ سے نوازا۔ اور اس میدان میں تحقیقی کام کی اہمیت و ضرورت کو اجاگر کیا۔ سبحان اللہ

۶ ستمبر ۱۹۸۴ء

سعید راشد
شیر شاہ ہاؤس
ملٹری کالج جہلم

ضروری وضاحت

یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں مرتب ہو چکی تھی۔ اس وقت اس میں ۳۹ غازیوں کا تذکرہ تھا۔ بعد کو لیفٹیننٹ کرنل فضل حسین بھٹی آرٹلری کی امتیازی سند کے بارے میں معلوم ہوا چنانچہ ان کا تذکرہ بھی شامل کر لیا گیا۔ پھر جب یہ کتاب طباعت کے آخری مراحل میں تھی تو جنرل رخمان گل اور کرنل شاہ محمد کے مسودات موصول ہوئے۔ ان کو کتاب کے آخر میں شامل تو کر دیا گیا مگر ناموں کی وہ اصولی ترتیب کالج کی سینیارٹی برقرار نہ رہ سکی۔ اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

الحمدللہ کہ اب یہ تذکرہ ۴۲ غازیوں کے حالات پر مشتمل ہے۔

دوسرے ایڈیشن پر نوٹ

اللہ کا کرم ہے کہ صرف چند ماہ کے عرصے میں ——— ضروری ترمیم و اصلاح کے بعد "جرأتوں کے نشاں" کا دوسرا ایڈیشن طبع ہو رہا ہے۔ اس کتاب پر جناب سید ضمیر جعفری، ڈاکٹر غلام حسین اظہر اور پروفیسر عین الدین علوی نے نہایت فاضلانہ تبصرے لکھے ہیں۔ میں ان تینوں حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس ایڈیشن کے متن میں، میں نے کافی کانٹ چھانٹ کی جس کا بوجھ ان اوراق کے جواں سال کاتب محمد اسلم نے خوشدلی سے اٹھایا اور اس کتاب کے ناشر شاہد حمید صاحب نے اس کے ظاہری پہلو کو مزید نکھارا۔ خدا ان کی مُرادیں برلائے۔

آخر میں، میں اپنی اہلیہ کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا۔ ان کی رفاقت کی مہربان چھاؤں میں، میں نے یہ ضخیم کتاب لکھی نہ صرف یہ بلکہ اس کی تحریر و ترتیب میں بھی انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے میرا ہاتھ بٹایا۔ اب جبکہ ہماری مشترکہ کاوشوں کے یہ گلاب کھل اٹھے ہیں تو وہ خود خزاں کی بے نشاں راہوں میں کھو گئی ہیں۔ خدائے رحمان و رحیم ان کی مٹی کو ٹھنڈا رکھے۔ اور ان کی روح کو اپنی رحمتوں کے سائے میں آسودگی عطا فرمائے آمین۔ اس تذکرہ کے قارئین سے میری التجا ہے کہ وہ مرحومہ کو دعائے سحر گاہی میں یاد رکھیں۔ جزاک اللہ!

راشد

۷ر جولائی ۱۹۸۸ء

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) شیر محمد ستارۂ جرأت

پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) شیر محمد ستارۂ جرأت

پنجاب رجمنٹ

کرنل شیر محمد صاحب السیف ہونے کے علاوہ صاحب قلم بھی ہیں۔ تاریخی اور مذہبی موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں۔ ان کا شمار اہل فکر ہی میں نہیں اہل ذکر میں بھی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ غازیوں اور مجاہدوں کے اس تذکرے کا آغاز ہم ایک ایسے مجاہد غازی کے ذکر سے کر رہے ہیں جو نہ صرف تلوار کا دھنی ہے بلکہ بڑا سچا اور کھرا مسلمان ہے۔ جس کا قلب روشن ہے۔ جو اسلام اور پاکستان کا سچا خادم اور جاں نثار ہے۔

ستارۂ جرأت ایسا کارنامہ محض اتفاق یا سازگار حالات کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ ایک مخصوص ذہن ایک خاص کردار، ایک منفرد طبیعت کا مظہر ہوتا ہے اس خاص ذہن، کردار اور تربیت کے نفسیاتی مطالعہ اور تجزیئے کے لئے ہم نے جو سوال نامہ کرنل شیر محمد کو بھیجا تھا اس کے جوابات پر مبنی ان کی داستان حیات ان ہی کے الفاظ میں پیش کی جاتی ہے۔

چونکہ انسان کے دل و دماغ، قدروں اور رویوں پر سب سے زیادہ اثر اس کے گھریلو ماحول، اور اس کی خاندانی روایتوں کا ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے سوال نامے میں پہلا سوال ان

کے آباؤ اجداد کے متعلق تھا۔

نسل اور خون کا سراغ

ہر چند کہ میں رنگ و نسل کا قائل نہیں ہوں (لا الہ الا اللہ پر ایمان ہر عصبیت کی نفی ہے)، لیکن چونکہ آباؤ اجداد کے بارے میں مجھ سے خاص طور سے پوچھا گیا ہے غالباً اس لئے کہ جس چیز کو ہم خون کا اثر کہتے ہیں وہ دراصل خاندانی روایتوں اور تربیتی ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے عرض کرتا ہوں کہ میرا آبائی اور نسلی تعلق قطب شاہی علویوں یا اعوان قوم سے ہے۔ اعوانوں کے مورث اعلیٰ محمود غزنوی کے مورخ عتبی کے بقول غزنوی لشکر کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ اور محمود کے ایما یا اس کی اجازت سے سکیسر کے علاقے میں آباد ہوئے۔ تلوار اور فقر اعوان قوم کے ہمیشہ سے طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ میرے والد مرحوم و مغفور سالہا سال تک پیشہ آبا یعنی سپہ گری سے متعلق رہے اور بڑی آبرو سے یہ خدمت انجام دی ہیں نے بھی تیشہ و تلوار کے اسی پیشہ کو اختیار کیا اور کوشش کی کہ اس پیشہ کی حرمت پر حرف نہ آئے۔ میرے بعد میری اولاد نے بھی اس روایت کو قائم رکھا ہے ماشاء اللہ! میری تمام سوچ جہاد کے گرد گھومتی ہے میں زندگی کو جہاد سمجھتا ہوں۔ میرے بیٹوں کے نام خالد اور محمود بھی جہاد بالسیف ہی کی علامتیں ہیں۔

جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش

میری پیدائش سکیسر ضلع سرگودھا کے دامن کوہ میں ایک گاؤں میں ہوئی۔ جس کا نام جبی ہے میری تاریخ پیدائش کاغذوں میں ۱۵ جنوری ۱۹۲۰ء ہے۔ یہ تاریخ اندازاً درج کی گئی تھی۔ صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں میرے والدین نے میرا نام شبیر محمد رکھا۔ اس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔ محمدؐ کی غلامی میرا دین و ایمان ہے اور لفظ شبیر کو میرے نام کا جزو بنا کر وہ جرأت و دلیری وہ میرے اندر دیکھنا چاہتے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں اس سے محروم نہیں رہا۔

بچپن کا رنگ ڈھنگ

تھوڑا بہت جو مجھے یاد ہے اور جو بزرگوں سے سنا ہے وہ یہ ہے کہ میں بچپن میں ناصا ضدی تھا۔ لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ جس بات پہ اڑ جاتا وہ کر کے چھوڑتا تھا۔ ویسے عام طور پر خاموش رہتا۔ یا گاؤں کے باہر اکیلا کھیلتا۔ اور پرندوں کے گھونسلوں کو نشانہ بناتا رہتا خرگوشوں کے بلوں کے کھوج میں مارے مارے پھرنا بھی میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

ناقابل فراموش واقعات

جو سوال نامہ مجھے بھیجا گیا ہے اس میں ایک سوال یہ بھی ہے۔

"بچپن کے ناقابل فراموش واقعات؟

میرے بچپن کا کوئی ایسا قابل ذکر ناقابل فراموش واقعہ نہیں جسے اس آپ بیتی میں جگہ دوں ہاں بچپن کی چند یادیں ایسی ضرور ہیں جو میری زندگی میں سنگ میل بلکہ چراغ راہ بن گئی ہیں۔ انہیں قلم بند کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

یا دوست تو! یا دوست تو!

ہمارے گھر کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا پرانا تخت پڑا تھا۔ میری والدہ اکثر اسی پہ نماز پڑھا کرتیں اور گرمی سردی صبح سویرے قرآن شریف کی تلاوت تو اسی تخت پر بیٹھ کر کیا کرتی تھیں۔ ان کی محبوب سورۃ، سورۃ رحمان تھی۔ اس کی تلاوت اکثر کیا کرتیں۔ اور لحن سے جب وہ بار بار فبای الاء ربکما تکذبان پڑھتیں تو میں سحرزدہ سا ہو کر کبھی ان کی آواز سنتا اور کبھی ان کو دیکھتا۔ اس لئے کہ وہ پوری سورۃ اور خاص طور پر یہ آیت بہت ڈوب کر پڑھتیں۔ یوں جیسے یہ آواز ان کے دل کی گہرائیوں سے آ رہی ہو۔ پھر ان کی عادت تھی کہ قرآن شریف پڑھ کر وہ مجھ

گئے لمالر دم سنہ ورلرتی تھیں۔ ایک روز جگ جگ جیو میرے پتر کہہ کر وہ میرے اوپر دم کر چکیں تو بولیں "بشیر محمد (وہ ہمیشہ مجھے میرے پورے نام سے پکارتی تھیں) سن رہا ہے کہ یہ فاختہ کیا کہہ رہی ہے؟" ایک فاختہ ہمارے کوٹھے کی منڈیر پر بیٹھ کوک رہی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہے؟"

"کہہ رہی ہے، یا دوست تو! یا دوست تو!"

"یا دوست تو؟"

"ہاں بیٹے وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کر رہی ہے، پرندے بھی اللہ کی عبادت کیا کرتے ہیں۔"

یہ بات میرے بالکل بچپن کی ہے۔ ابھی میں پورا چار برس کا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت سے فبای الاء ربکما تکذبان اور یا دوست تو! میری شعوری اور لاشعوری زندگی کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ اب نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی جب کبھی بھی فاختہ کی آواز سنتا ہوں تو بالکل یہی محسوس کرتا ہوں جیسے کہہ رہی ہو۔

یادوست تو! یادوست تو!

میں صدقے، میں قربان یارسول اللہ

میرے بچپن کی دوسری یاد میری نانی اماں کی جن شفقت کی چھاؤں میں میرا بچپن گزرا۔ میں صدقے میں قربان یارسول اللہ، کی صدا ہے۔ عجیب سحر تھا۔ ان کی شخصیت میں۔ جس وقت بھی اذان ہوتی تو وہ جو کام بھی کر رہی ہوتیں بے اختیار پکار اٹھتیں۔ میں صدقے، میں قربان یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)، صبح سویرے چکی پیس رہی ہیں فجر کی اذان کی آواز آئی۔ اللہ اکبر اللہ اکبر اور وہ دوپٹہ سر پہ ڈالتے ہوئے پکاریں، میں صدقے میں قربان یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور چکی چھوڑ کر نماز کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں کبھی میری آنکھ کھلی ہوتی تو میں اس صدقے، میں قربان یارسول اللہ کا شوق سے انتظار کیا کرتا۔ اور جب وہ مصلے پر نماز کے لئے کھڑی

ہوئیں تو میں بھی ان کے ساتھ مصلّے پر کھڑا ہو جاتا۔ کیا سوز کیا شوق تھا۔ ان کے "میں صدقے میں قربان یا رسول اللہ کہتے ہیں" یہ آواز، میرے تحت الشعور بلکہ لاشعور میں اتر گئی ہے اور اس وقت سے میرے قلب کی گہرائیوں میں موج زن ہے۔ اب تو میرا مقصد حیات ہی یہ ہے اور میں سمجھتا ہوں یہی ہر مسلمان کی زندگی کا عنوان ہے۔

بہ مصطفےٰ برساں خویش را دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

روشنی کی طرف پہلا قدم

میری والدہ ماجدہ کی خواہش تھی کہ میں دینی تعلیم حاصل کروں۔ اس لئے میری رسمی تعلیم کی ابتدا مسجد کے درس سے ہوئی۔ کچھ دنوں یہ سلسلہ چلا بھی۔ والد صاحب سروس پر باہر تھے۔ جب انہیں خبر ہوئی تو انہوں نے اسکول میں داخلے پر زور دیا۔ چنانچہ مجھے گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ابتدائی چار جماعتیں میں نے یہیں سے پاس کیں۔ پانچویں جماعت گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب میں پڑھی۔ چھٹی اور ساتویں جماعتوں میں انبالہ چھاؤنی کے ایک ہائی اسکول میں داخل رہا۔ اسی دوران میری والدہ مکرّمہ کا انتقال ہو گیا۔ والد اس سے پہلے بھی مجھ سے محبّت ضرور کرتے تھے لیکن وہ محبّت باپ کی محبّت تھی جس میں ایک پہلو سختی کا بھی ہوتا ہے والدہ کے انتقال کے بعد یکایک ان کا رویّہ بدلا اور وہ میرا جا و بے جا لاڈ کرنے لگے۔ غالباً ان کی کوشش تھی کہ میں ماں کی مامتا سے محرومی کو محسوس نہ کروں لیکن بچپن کی ناسمجھی میں میں نے اس کا غلط فائدہ اٹھایا اور پڑھنے لکھنے کو بالکل ہی نظر انداز کر کے کھیل کود میں اتنا محو ہوا کہ اسکول ہی سے ناغہ کرنے لگا۔ نوبت اسکول سے نام کٹنے تک پہنچی۔ دو بار تو از خود جرمانہ بھر کے میں نے دوبارہ داخلہ لے لیا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ سو دن چور کے ایک دن شاہ کا۔ اس کے مصداق ایک روز میں پکڑا گیا۔ والد صاحب اتفاقاً یا جان بوجھ کے ایک دن مجھ

سے ملنے اسکول گئے۔ میں وہاں ہوتا تو ملتا۔ تب انہیں پتہ چلا کہ صاحب زادے کا تو نام ہی اسکول کے رجسٹر سے خارج کیا جا چکا ہے۔ اور ایسا تیسری بار ہوا ہے۔ اسکول سے واپس آکر انہوں نے مجھے مارا پیٹا نہیں مگر میں ان کے تیوروں سے سمجھ گیا کہ بھانڈہ پھوٹ گیا ہے۔ نام تو میرا انہوں نے پھر لکھوا دیا اور میں اسکول میں جانے بھی لگا لیکن وہ میرے مستقبل کی طرف سے متفکر ضرور ہو گئے کہ برخوردار کے لچھن اچھے نہیں انہوں نے ساتھی سرداروں سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے۔ ان میں سے کوئی بزرگ کے جی آر اسکول جہلم سے واقف تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ بگڑوں تگڑوں کے لئے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں۔ سارے کس بل نکل جائیں گے۔ اور تعلیم بھی ہو جائے گی۔ مزید برآں جمعداری تو کہیں گئی نہیں۔ والد گرامی نے اس تجویز پر آمنّا و صدّقنا کہا اور میرے ملٹری کالج (اس زمانے میں ملٹری سکول) میں داخلے کے لئے ضروری کارروائی شروع کر دی۔ کسی نے خوب کہا ہے وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک خرابی سے میری تعمیر کی صورت پیدا ہوئی۔

شاہراہ زندگی پر

۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء کو میں ملٹری کالج (اس وقت کے جی آر آئی ایم اسکول) جہلم میں داخل ہوا۔ اور ۳۸۰ کالج نمبر ملا۔ برڈووڈ ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا۔ گو میں ساتویں جماعت پاس کر کے آیا تھا لیکن داخلے کے امتحان میں چونکہ آٹھویں جماعت کے لائق نہیں پایا گیا اس لئے مجھے پھر ساتویں جماعت میں بٹھا دیا گیا۔

اس زمانے میں یہاں عام ہائی سکولوں کی طرح پانچویں سے لے کر دسویں جماعت تک تعلیم دی جاتی تھی مگر پانچ سال کے بعد لڑکوں کو عام طور پر فوج میں بھرتی کر لیا جاتا تھا۔ ساتویں جماعت کے سالانہ امتحان میں تقریباً پچاس لڑکوں کی کلاس میں غالباً وسط میں پاس ہوا تھا۔ آٹھ ۲، میں دسویں لوزیشن، تھی۔ نویں میں جو تھے نمبر پہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دسویں جماعت میں ہی آرمی کے فرسٹ کلاس رومن اردو اور فرسٹ کلاس انگلش کے امتحانات بھی پاس کر لیئے۔ میرے ہم جماعت اور بہت سارے لڑکوں نے بھی یہ امتحانات پاس کیئے لہذا آرمی ہیڈ کوارٹر یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ ملٹری کالج کے ہونہار طلبہ کو مزید تعلیم کے لیئے کچز کالج نوگانگ بھیجا جاتے جہاں کیڈٹس کو انڈین ملٹری اکیڈیمی کے لئے تیار کیا جاتا تھا اسی زمانے میں ملٹری سکول کے مقاصد میں بنیادی تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ ہماری جماعت کے محمد گل شیر نامی لڑکے کو مئی ۱۹۳۶ء میں براہِ راست کچز کالج نوگانگ بھیجا گیا اور اس کے بعد ہر ششماہی میں ایک دو لڑکے نوگانگ بھیجے جانے لگے۔

آرمی اسپیشل کا پہلا امتحان

کے۔جی۔آر۔آئی۔ایم سی جہلم میں ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ آرمی اسپیشل امتحان کے لیئے چند لڑکوں کو بٹھایا گیا۔ اس امتحان میں ۳۱۷ محمد ایوب اور میں ۳۸۰ کامیاب ہوئے۔ اس کامیابی نے ملٹری سکول کے تعلیمی معیار کی فوج میں دھاک بٹھادی۔ اسی سال یعنی ۱۹۳۷ء میں مجھے اپنی ٹرم کے لڑکوں میں بہترین طالب علم قرار دیا گیا الحمد للہ!

گارڈنر میڈل

یہاں ہر سال آخری ٹرم کے آل راونڈ بیسٹ کیڈٹ کو ایک تمغہ دیا جاتا تھا۔ جو گارڈنر میڈل کہلاتا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں یہ گارڈنر میڈل مجھے عطا ہوا۔

لیڈر شپ کے عہدے

کالج میں شروع دن سے پبلک اسکولوں کا پری فیکٹوریل سسٹم رائج رہا ہے۔ اس نظام کے تحت طلبہ کو قیادت کی تربیت دینے کے لیئے مختلف انتظامی ذمہ داریاں دی جاتی ہیں،

میں ۱۹۳۲ء میں داخل ہوا تھا۔ دو سال کے بعد یعنی ۱۹۳۴ء میں مجھے سیکشن کمانڈر یا جونیئر پریفیکٹ بنایا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں پلاٹون کمانڈر یا سینئر پریفیکٹ بنا۔ نومبر ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء تک برڈوڈ ہاؤس کا ہیڈ بوائے رہا۔ اسی سال ہاکی ٹیم کا کپتان اور فٹ بال ٹیم کا نائب کپتان رہا۔ اواخر ۱۹۳۷ء میں مجھے براہ راست کچنر کالج بھیجا گیا۔

"شیرا" سے کے۔ڈی

ابتدائی چار سالوں کے دوران میں "شیرا" کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ آخری سال میں ایک ہم جماعت ادم محمد اکرم نے کے۔ڈی کا نک نیم کچھ ایسا پھیلایا کہ انگریز کمانڈانٹ بھی اسی نک نیم سے مجھے پکارنے لگا۔ اس نک نیم کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ اس زمانے میں ڈکٹیٹر قسم کے لوگ بین الاقوامی سیاست پر چھائے ہوئے تھے۔ محمد اکرم انگریزی ڈکشنری کے حافظ مانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی ڈکشنری میں ڈکٹیٹر کے معنی کیا ڈھونڈنا ہے اور یہ لفظ یعنی کرتا دھرتا انہیں کچھ ایسا پسند آیا کہ پہلی فرصت میں یہ لیبل مجھ پر چسپاں کر دیا۔ اس وقت کی کوئی قابل ذکر شرارت یاد نہیں آرہی۔ چھوٹی موٹی بچوں کی شرارتیں ہوتی رہتی تھیں مگر عام طور پر فوجی ڈسپلن کی پابندی ہوتی تھی اور ماحول میں بغاوت کے آثار نمودار نہیں ہوتے تھے۔ سزا کے بارے میں بڑا خوش قسمت رہا اور پورے پانچ برس میں کبھی سزا تک نوبت نہیں آئی۔

زندگی کا بہترین دور

میری زندگی کا حد درجہ بہترین زمانہ وہی تھا جو ملٹری کالج جہلم میں گزرا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء تک کے عرصے میں تعلیم اور کھیل کے میدان میں ہر قسم کے معرکے مارے اور اعزازات تھے کہ گویا ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے تھے۔ اساتذہ محبت کرتے تھے اور ہم جماعت عزت کرتے

نگاہ سے دیکھتے تھے اس زمانے کی یادیں بڑی خوشگوار ہیں۔ مگر سب سے بڑی بات جس نے عمر بھر ساتھ دیا وہ جذبہ اسلامی تھا جو کہ اس دور میں پروان چڑھا۔ انگریز کی حکومت کے باوجود۔

اسلامی ماحول

انگریز کی حکومت کے باوجود ملٹری سکول جہلم کا ماحول سراسر اسلامی اور مشرقی روح سے بھرپور تھا۔ کمانڈانٹ اور ایک انگریز وارنٹ آفیسر کے سوا دیگر تمام اساتذہ مسلمان تھے طلبا چونکہ فوجیوں کے بچے تھے۔ لہٰذا ڈسپلن سے کسی حد تک مانوس تھے اور فوجی ضابطوں کو اپنانے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ سکول کا نظم و ضبط کچھ اس قسم کا تھا کہ ایک بگل کی آواز پر چند ثانیوں میں بچوں کو منظم طریقے سے اکٹھا کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت باہر کی دنیا ــــــ اس نظم و ضبط پر معترض تھی اور اب وہاں بھی غالباً وہ صورت حال نہیں رہی جو ہمارے وقتوں میں تھی۔ مگر میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ڈسپلن عین منشاء اسلام ہے اور قرآن کریم نے تو اس کو زندگی قرار دیا ہے۔ کشمیر کی جنگ کے دوران میرے ماتحت آزاد فوج کی کچھ پلٹنیں اور آزاد قبائل کے چند لشکر تھے۔ یہ لوگ واقعی لفظی معنوں میں آزاد تھے۔ کیونکہ باقاعدہ فوج کے ڈسپلن سے عاری تھے۔ انہیں لڑائی پر آمادہ کرنا جوئے شیر سے کم نہیں تھا۔ کسی کٹھن مہم پر جانے کے لئے کہا جاتا تو اکثر تو صاف انکار کر دیتے اور کہہ دیتے کہ ہم آزاد فوج ہیں۔ اور صرف اللہ رسول کا حکم مانتے ہیں۔ اور کسی تیسرے شخص کا حکم ماننے کے لئے تیار نہیں وغیرہ وغیرہ ایسے موقعوں پر اپنے ملٹری سکول کے ڈسپلن کی یاد ستاتی کہ کاش ہماری ساری قوم ملٹری سکول کے نظم و ضبط کے مطابق تیار کی جاتی۔

پکچرز کالج نوگانگ سے رائل انڈین ملٹری اکیڈیمی تک

میرے زمانے میں کے جی آر ایم سی جہلم میں صرف ہائی سکول تک تعلیم دی جاتی تھی۔ ہر

شہنشاہی چیدہ چیدہ لڑکوں کو کچنر کالج نوگانگ سنٹرل انڈیا دو سال کے کورس پر بھیجا جاتا جس کے بعد سلیکشن بورڈ میں کامیابی کی صورت میں انڈین اکیڈمی ڈیرہ دون بھیج دیا جاتا۔ نومبر ۱۹۳۷ء میں مجھے بھی دو سال کی تربیت کے لئے اس ملٹری کالج میں بھیجا گیا۔ میں سکول میں ہی آرمی سپیشل پاس کر چکا تھا۔ لہٰذا مجھے ڈیڑھ سال کے بعد ہی انڈین ملٹری اکیڈمی میں داخلہ مل گیا۔ جولائی ۱۹۳۹ء میں جب ڈیرہ دون پہنچا اس وقت دوسری عالمگیر جنگ کی آمد آمد تھی اور دو مہینے بعد یعنی ستمبر ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ نتیجۃً ہمارا ڈھائی سالہ کورس ڈیڑھ سال کا کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء میں ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ ہوئی۔ اپنی کلاس میں تقریباً درمیان میں پاس ہوا۔ گو تعلیم اور کھیل کے میدان میں میں پیش پیش رہا مگر انگریزی کلچر یعنی انگریزیت کے لحاظ سے میں بہت پیچھے تھا۔ یہ خامی بعد میں بھی ساری عمر رہی۔ جبکہ اس بنس کی افسر کلاس میں بڑی مانگ تھی۔ پاکستان بننے کے بعد انگریزیت نے اور زور پکڑا اور قابلیت کا معیار محض انگریزی ثقافت کو ہی سمجھا جانے لگا تھا۔

کمیشن سے کشمیر آپریشن تک کی منزلیں

دسمبر ۱۹۴۰ء میں مجھے آئی ایم اے ڈیرہ دون سے کمیشن ملا تھا۔ اس وقت سے قیام پاکستان تک انگریز کی نوکری کرتا رہا۔ جہاں حکم ملتا جاتا۔ جو کہا جاتا کرتا۔ اس عرصے میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جو قابل ذکر ہو سوائے ایک صاحب دل اور صاحب نظر بزرگ کی ملاقات کے جو انبالہ چھاؤنی میں ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔ اس لئے میں اب ۴۸-۱۹۴۷ء کے کشمیر آپریشن کی طرف آتا ہوں جس میں کچھ خدمت بجا لانے پر مجھے ستارۂ جرأت کا مستحق سمجھا گیا۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

۲۴ مئی ۱۹۴۹ء کو بریگیڈیئر محمد شیر خان ایم سی نے لیفٹیننٹ کرنل شیر محمد کے لئے ہلال جرأت

کی سفارش کی۔اس پر انہیں ستارۂ جرأت عطا ہوا۔

مئی ۱۹۴۸ء میں کرنل شیر محمد نے ٹیٹوال سیکٹر میں غیر معمولی جرأت اور قیادت کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے ان کے زیر کمان دستہ مکمل تباہی سے بچ سکا۔ جون ۱۹۴۸ء سے اکتوبر ۱۹۴۸ء تک کرنل شیر محمد کے ہاتھ میں راجوری سیکٹر کی کمان تھی۔بہت تھوڑی نفری اور بہت ناکافی اسلحہ کے ساتھ اس افسر نے نوشہرہ سے پونچھ کی طرف دشمن کی پیش قدمی کی شدید مزاحمت کی اور اس طرح اس کے آگے بڑھنے کی رفتار بہت سُست کر دی جس سے دشمن کے منصوبے خاک میں مل گئے۔

راجوری کے محاذ پر دشمن سے بہت سی لڑائیوں میں کرنل شیر محمد نے غیر معمولی قوت فیصلہ، قیادت کی صلاحیت اور فرض شناسی کا ثبوت دیا۔ان تمام کارناموں کے لئے کرنل شیر محمد کو ستارۂ جرأت کا اعزاز دیا گیا۔اور اس کا اعلان بعض وجوہ کی بنا پر ۲۳ مارچ ۱۹۵۰ء کو کیا گیا۔

حاصل زندگی

کشمیر میں میں اپنی خدمت کو حاصل زندگی سمجھتا ہوں۔زندگی میں کچھ کرنے، کچھ حق وفا ادا کرنے کے موقعے بار بار نہیں آتے۔کشمیر کی لڑائی اصل میں استحکام پاکستان کی جنگ تھی۔اس جہاد میں حصہ لینا اور پھر کچھ کر سکنا میرے لئے بہت بڑی سعادت تھی۔کشمیر آپریشن کے کمانڈر مرحوم بریگیڈیر محمد شیر خان ایم سی تھے جو جنرل طارق کے نام سے اس آپریشن کی قیادت کر رہے تھے۔انہی نے میرے ستارۂ جرأت کا فرمان لکھا۔لیکن اس میں تفصیلات نہیں اور میں خود کیسے کہوں کہ میں نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔بہر حال میں اپنی کارکردگی سے شرمندہ نہیں ہوں۔جیسا کہ میں نے ابھی کہا میں اسے حاصل زندگی گردانتا ہوں۔

پنجاب رجمنٹل سنٹر کی چیف انسٹرکٹری

امن کے زمانے میں صحیح معنوں میں کچھ صحیح کام کرنے کا ایک نادر موقعہ مجھے ۱۹۵۶ء میں ملا۔ جب مجھے پنجاب رجمنٹل سنٹر میں چیف انسٹرکٹر مقرر کیا گیا میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے مستقبل کے فوجیوں کی تربیت کو اسلامیانے کا اور قومی رنگ دینے کا ایک نادر موقعہ عطا کیا۔ سنٹر کے پہلے کمانڈانٹ کرنل عبدالجبار خان بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے۔ ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہم ایک صاف ستھرا ماحول، اسلامی فضا اور اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے میں اپنے مقدور بھر کامیاب ہو سکے جس کا ثبوت بعد کو ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں سنٹر کے تربیت یافتہ جوانوں کی کارکردگی میں ملا۔ سنٹر میں جو وقت میں نے گزارا اسکو اپنے کیریئر کا بہت قیمتی وقت سمجھتا ہوں۔ یہ خیال کرکے کہ جو کچھ میں کر سکتا تھا وہ میں نے کیا مجھے بڑا روحانی سکون ہوتا ہے اور بڑی خوشی ہوتی ہے۔

میرے تین محسن

اپنی داستان حیات کا یہ مختصر جائزہ ختم کرنے سے پہلے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں جہلم اسکول کے ان تین اساتذہ کا ذکر بھی کردوں کہ جن کی شخصیت و کردار سے مجھے لازوال روشنی ملی

چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا

صوبیدار (بعد کو میجر) غلام احمد مرزا گو مزاج کے سخت تھے اور مارتے بھی تھے لیکن حساب پڑھانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان سے پڑھے ہوئے لڑکوں نے زندگی کی کسی منزل میں کم از کم حساب میں مار نہیں کھائی وہ ان یکتا و یگانہ اساتذہ میں سے تھے جو صرف کوئی مضمون ہی نہیں پڑھاتے بلکہ اس مضمون کی سوجھ بوجھ بھی اپنے طلبہ میں پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک اور غیر معمولی وصف ان میں یہ تھا کہ وہ اپنے ہر شاگرد کو بلکہ اسکے سارے خاندان کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ انکو اپنے دور کی انسائیکلوپیڈیا کا درجہ حاصل تھا۔ یہ صرف حافظہ کا کمال ہی نہیں تھا بلکہ اس میں ان کے عشق کا بھی بڑا دخل تھا جو انہیں اپنے مشن سے تھا۔

چراغ راہ گزر

رسالدار (بعد کو کیپٹن) محمد عبداللطیف صاحب (جو ہسٹری میں ایم اے ہونے کی وجہ سے ایم اے لطیف کے نام سے معروف تھے) تاریخ پڑھاتے ہوئے اسلامی اور قومی عصبیت کے تقاضوں کو بھی خاص طور سے ملحوظ رکھتے تھے۔ قومی احساس سب سے پہلے انہی نے ہمارے

..ان میں بیکا یا لطیف صاحب کی ظاہری شخصیت بھی بڑی شاندار تھی۔ رسالے کی وردی بڑے جتن کے ساتھ بڑے اہتمام سے پہنتے تھے اور بڑے رکھ رکھاؤ سے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں شعائر اسلام کے بھی سختی سے پابند تھے۔ سلیقے سے ترشی ہوئی سیاہ داڑھی ان پر خوب سجتی تھی۔ شروع شروع میں قدرے تند خو تھے لیکن آخر آخر میں قلب میں گداز آگیا تھا۔ ہمارے لئے ان کی حیثیت چراغ راہ گزر کی سی تھی۔

آہ سحر گاہی

صوبیدار (بعد کو لیفٹیننٹ کرنل) سکندر خان معلم بھی تھے اور مربی بھی۔ میں ان کا یہ احسان تا زندگی نہیں بھول سکتا کہ جب میں آرمی اسپیشل کی تیاری کر رہا تھا تو وہ مجھے میرے کمرے پر آکر پڑھاتے تھے وہ بھی رات کے دس سے گیارہ بجے تک۔ اپنے فرائض منصبی سے فارغ ہو کر اپنے آرام کے وقت میں۔ میرا کمرہ ان کے کوارٹر کے بالکل ساتھ تھا۔ اگر کبھی رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلتی تو ان کے کوارٹر سے ہو حق کی آوازیں آتی سنائی دیتیں۔ وہ تہجد کے بعد تواتر سے ذکر جلی کیا کرتے تھے ان کی آہ سحر گاہی نے میرے قلب کی دنیا بھی بدل دی گو اسکے اثرات دس بارہ سال کے بعد نمودار ہوئے ان اساتذہ کے دم قدم سے ملٹری کالج کا اسلامی تشخص قائم رہا اور طلبہ کی وہ ضروری مذہبی اور اخلاقی تربیت ہو سکی جس کی انگریز کے سیکولر نظام تعلیم میں کوئی جگہ نہیں تھی۔

— آخر میں میں ملٹری کالج کے بارے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس عظیم ادارے کو اپنے نئے تاریخی رول کے مطابق نئی قسم کے طلبہ پیدا کرنا ہیں۔ جو خبر ہی میں نہیں نظر میں اور اذان سحر میں بھی یکتا ہوں۔ کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا خبر میں نظر میں، اذان سحر میں۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر میں اسے اس کے وسیع تر تناظر میں پیش کرتا ہوں۔ قومیں تاریخی شعور سے بنتی ہیں۔ تہذیبی تصورات سے ان کا خمیر اٹھتا ہے اس وقت میں دنیا میں یونانی رومی تہذیب کا غلغلہ ہے اس تہذیب کے مفروضات اور مسلّمات اسلامی تہذیب کے مسلّمات اور اصولوں کی ضد ہیں۔ یہ دونوں تہذیبیں عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے اصولوں کی حریف چلی آ رہی ہیں۔ انگریزوں نے اپنے دور اقتدار میں مسلمانوں کا رشتہ ان کی تاریخ سے توڑنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن تحریک پاکستان اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کا تاریخی شعور پھر بھی زندہ رہا۔ محکوم قومیں لازمی طور پر اپنے حاکموں کا کلچر اختیار کر لیتی ہیں کچھ عرصے کے بعد حاکموں

لی تاریخ اور ان کی تہذیبی برتری ذہنی طور پر قبول کر لی جاتی ہے۔ اور وہ لوگ جو اپنے غیر ملکی حاکموں کو اپناتے اور ان پر فخر کرتے ہیں۔ ان کا اپنا علیحدہ تہذیبی وجود ختم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے حاکموں کی تہذیب میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ یہ تاریخ کا بنیادی اور مسلمہ اصول ہے۔ اسلام اس وقت یونانی رومن تہذیب کے اثرات سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوششوں میں مصروف ہے اور انشاء اللہ یہ زنجیریں توڑ پھینکے گا۔ پاکستان بننے کے بعد اپنی تمام ملازمت کے دوران میں نے مسلسل یہی کوشش کی کہ پاکستان میں فوج کو اسلامی قدروں اور اصولوں سے ہم آہنگ کیا جائے اور ان غیر ملکی اثرات اور روایات کو مٹایا جائے جو آزادی کے وقت ہمیں غیر ملکی حکومت سے ورثے میں ملی تھیں۔ ۱۹۴۷-۴۸ء کے کشمیر آپریشن سے اتنے قریبی تعلق کی بنا پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلام اس زمانے میں بھی ایک ناقابل تسخیر آرمی پیدا کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جنگ کرنے کا برطانوی طریقہ ہمارے حالات کے لئے موزوں نہیں ہے۔ لیکن میرے بہت کم ہم عصر اس زمانے میں بھی مجھ سے اتفاق کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی پاکستان بننے پر جو افسر پاکستان کے حصے میں آئے وہ محض یونانی رومن تہذیبی کردار کے حامل تھے اور ذہنی طور پر برطانوی کلچر کی پیداوار تھے۔ اور برطانوی روایتوں پر فخر کرتے تھے۔ چنانچہ برطانوی طرز فکر کے سائے ایک عرصے تک ہمارے طرز تربیت و تنظیم پر پڑتے رہے۔ ایک مدت سے میرا عقیدہ ہے کہ ہمیں برطانوی روایتوں سے پوری نجات حاصل کرنا چاہیئے۔ ہمارا سپاہی بہترین امکانات کا حامل ہے اس میں بہت کچھ ہے ضرورت اس بات کی ہے ذہن مغربی اثرات سے پاک ہو اور ہر سطح پر قیادت بھی اسلامی ہو اور ماحول بھی اسلامی ہو۔ الحمد للہ کہ اس سلسلہ میں اب آ کر کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ لیکن ہمیں خالی خول نہیں وہ اسپرٹ چاہیئے جس سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ ع

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

میجر جنرل (ریٹائرڈ) محمد جمشید، ستارۂ جرأت

ایم سی (دوبار) ستارہ قائد اعظم

میجر جنرل (ریٹائرڈ) محمد جمشید ستارۂ جرأت
ایم سی (دوبار) ستارۂ قائدِ اعظم

جنرل جمشید کا شمار ان لوگوں میں ہے جو پیدا ہی قیادت کے لیے ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے نومبر ۱۹۴۲ء میں آئی ایم اے سے کمیشن لے کر ۴۴-۱۹۴۳ء میں برما کے محاذ پر جاپانیوں کے خلاف جنگ میں حصّہ لیا اور یکے بعد دیگرے دو نہایت اہم جنگی معرکوں میں امتیازی کارکردگی دکھا کر دو بار ملٹری کراس حاصل کیا۔ اس وقت ان کی عُمر پچیس سال سے بھی کم تھی۔ پاکستان بننے کے بعد اُنھوں نے ۱۹۴۸ء کے کشمیر آپریشن میں حصّہ لیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ستارۂ جرأت حاصل کیا۔ ۱۹۷۰ء میں ستارہ قائدِ اعظم سے سرفراز ہُوئے۔

چونکہ کوئی کارنامہ از خُود سرزد نہیں ہو جاتا اس کے پیچھے ایک کردار، ایک شخصیّت ہوتی ہے اور شخصیّت کا تانا بانا نسل، ماحول، تربیّت اور مزاج سے بنتا ہے۔ اس لئے ان کے سوانحی حالات و واقعات کے لیے ہم نے جو سوالنامہ ان کے پاس بھیجا اس میں پہلا سوال ان کے نسلی اور خاندانی پس منظر ماحول اور روایات ہی کے بارے میں تھا۔

اصل و نسل

جنرل جمشید لکھتے ہیں۔ میرا نسلی تعلق گکھڑوں کے مشہُور جنگجُو قبیلے سے ہے اور گکھڑوں کی بھی اس شاخ سے جو کیانی کے نام سے معروف ہے میرا آبائی گاؤں گکھڑوں کی مشہُور بستی ڈومیلی ہے۔ جس نے بڑے بڑے جیالے اور دلاور پیدا کئے ہیں اور ایک عرصے سے کیانیوں کی عسکری روایات کو زندہ رکھا ہے۔ میرے والد راجہ مہرخان بھی فوجی تھے اور اپنے علاقے میں جرأت، کردار کے علاوہ فراست کی وجہ سے بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ گو تعلیم زیادہ نہیں تھی لیکن ذہن

بہت بیدار تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں اُنھوں نے ایک دُنیا دیکھی تھی اس تجربے نے انھیں بہت وسیع النظر بنا دیا تھا۔ میری شخصیت کو بنانے میں میرے والد مہرخان کا بڑا حصّہ ہے۔ وہ کہا کرتے تھے "بیٹے۔ مزہ جب ہے کہ کام میں مزہ آئے جسے کام میں مزہ نہیں آتا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ وہ خود بڑے سخت کوش تھے۔ جو کام بھی کرتے بڑے جوش وخروش سے کرتے جیسے اس سے بڑھ کر پُرلطف کوئی اور چیز نہیں۔ جان لڑا کر کام کرنا اور سر اٹھا کر چلنا میں نے ان ہی سے سیکھا اور زندگی بھر سُکھ بھی پایا اور عزت بھی۔ اب جب کبھی کوئی مجھ سے میرا آٹوگراف مانگتا ہے تو ہمیشہ ایک ہی جُملہ لکھتا ہوں۔

خُدا کرے تھیں اپنے کام میں مزہ آنے لگے۔ میرا زندگی بھر کا تجربہ ہے کہ اچھے سے اچھے کام کو شروع کرنا آسان ہوتا ہے لیکن اسے جاری رکھنا مشکل اس سے میں سمجھتا ہوں۔ وہ چیز جسے عزم کہتے ہیں۔ بہت بڑی چیز ہے۔ محنت ومشقت بھی وہی کرسکتا ہے اور مشکلات کا مقابلہ بھی وہی کرسکتا ہے جو فولادی عزم رکھتا ہو اس کے علاوہ کم از کم جنگ میں، خطر پسندی بھی کام آتی ہے۔ جنگ میں وہی سُرخ رو ہوسکتا ہے جو بہادر ہو اور خوف کو جو ایک فطری چیز ہے قابو پاسکے یہ صفت والد مرحوم میں بہت تھی مشکل اور پُرخطر کام پر ہاتھ ڈالنے میں انھیں مزہ آتا تھا۔ یہ انہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ تن آسانی سے مجھے آج بھی نفرت ہے۔ آسان کام کو میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔

ابتدائی تعلیم

راولپنڈی کا ایک مشہور اسکول ہے ڈینیز ہائی اسکول۔ ابتدائی تعلیم میں نے اسی اسکول میں حاصل کی۔ چھٹا درجہ یہیں سے پاس کیا۔ ۱۹۳۲ میں ملٹری کالج میں داخل ہُوا۔

ملٹری کالج کے ایّام

۱۹۳۲ء میں، مَیں ملٹری کالج میں ساتویں درجے میں داخل ہُوا تھا۔ ۳۹۷ میرا کالج نمبر تھا۔ اس وقت یہ کالج ایک

اسکول تھا اور اس کا نام کنگ جارجز رائل انڈین ملٹری اسکول تھا۔ میرا پہلا ہاؤس ۔ برڈ وڈ ہاؤس تھا۔ جب میں یہاں داخل ہوا تو کالج کے کمانڈانٹ کیپٹن ایچ ایچ کلارک تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ۱۹۲۳ میں میجر سیلبی نے یہ منصب سنبھالا۔ ۱۹۲۷ء تک وہ رہے۔ ان کے بعد میجر اسٹیبنگ آئے۔ ان کے آنے کے کچھ دنوں کے بعد ہی مَیں نے اسکول کو خیر باد کہا۔ اس طرح اسکول میں، مَیں نے تین کمانڈانٹ دیکھے۔ گویا زیادہ عرصہ سیلبی صاحب کے زیرِ تربیت رہا۔ سیلبی بہت ہی شفیق استاد تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی اسکول کے لیے وقف کی ہوئی تھی۔ ان کے زمانے میں اسکول نے بہت ترقی کی۔ اسکول کا معیار میٹرک تک بلند ہُوا حتیٰ کہ ۱۹۲۷ میں چند لڑکوں نے آرمی اسپیشل کا بہت مشکل امتحان پاس کیا اور کمیشن کی ابتدائی تربیت کیلئے منتخب ہُوئے۔

میجر سیلبی کی کام سے لگن مجھے اب بھی یاد آتی ہے ان کی پُوری کی پُوری توجہ اسکول پر مرکوز تھی جفاکشی اور کام سے محبّت کرنا میں نے ان سے سیکھا۔ طلبہ ہی سے نہیں طلبہ کے والدین سے بھی ان کا قریبی تعلق تھا۔ چھٹیوں میں وہ اکثر لڑکوں کے گاؤں انکے والدین سے ملنے جایا کرتے تھے۔ انگریز میں لاکھ برائیاں ہوں لیکن حکُومت کرنا یا قیادت کرنا اسکو آتا تھا۔ ہندوستان میں ملٹری اسکُولوں کو سلطنت برطانیہ کی آؤٹ پوسٹس کی حیثیت حاصل تھی انگریز کو یہ بات خوب معلُوم تھی کہ سلطنتیں کہاں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں۔

خُدا حافظ

۱۹۳۸ء میں اپنی نصابی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مَیں نے کالج کو خُدا حافظ کہا۔ جب اسکول میں پہلا قدم رکھا تھا تو دل میں ہزار اندیشے تھے اور جب یہاں سے رُخصت ہونے لگا تو سینہ اُمنگوں سے پُر تھا اور یہاں کے در و دیوار تک سے محبّت ہو چکی تھی۔

کالج نے مجھے کیا دیا

مٹی کے برتن کو اگر بھٹی میں پکایا نہ جائے تو وہ کچا رہتا ہے۔ کالج نے ڈسپلن کی بھٹی میں تپا دیا۔ ضبط و نظم کا خوگر بنا دیا۔ لیکن ان سب چیزوں سے بڑھ کر جو چیز مَیں نے کالج سے سیکھی وہ شدید مقابلہ کی فضا میں جفاکشی کی عادت تھی۔ خود اعتمادی سب سے بڑی قوّت ہے اپنی اندرُونی قوّت کا احساس اور اس کو بُروئے کار لانے کا شوق مجھے اسی کالج کی فضاؤں میں ہُوا۔

کالج سے میدان کارزار تک

دُوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۴ء کے آخری مہینوں میں جب برما فرنٹ پر اتحادی فوجیں جوابی حملہ کر رہی تھیں تو دشمن نے ٹنڈم فرنٹ پر کینڈی پیک اور وائٹل کارنر پر جو کہ ۹ سے ۱۰ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہیں ایک مضبُوط مورچہ قائم کر لیا تھا۔ جس سے اپنا ایڈوانس رُک گیا اور آگے بڑھنے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔ اس پوزیشن پر نمبر ۵ ڈویژن تقریباً تین ہفتے لڑتا رہا اور کامیابی کی کوئی صُورت نظر نہیں آتی تھی۔ ۲ پنجاب کو جو اس ڈویژن میں تھی حکم ملا کہ بائیں جانب سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ لیکن اس میں بھی کوئی فوری کامیابی نہ ہُوئی۔ اس دوران مجھے ایک گوریلا پلاٹون تیار کرنے اور دشمن کی سپلائی لائن کو کاٹنے کی کوشش کرنے کا حکم ملا مَیں تقریباً ۵۰ جوانوں کو لے کر نہایت ہی دشوار جنگل اور سنگلاخ چٹانوں میں سے ہوتا ہُوا دو دن رات کی مسلسل کوشش کے بعد کینڈی پیک اور وائٹل کارنر کے درمیان دشمن کی سپلائی لائن پر مورچہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور دُشمن کی سپلائی لائن کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس پوزیشن کا سرکاری نام جمشید ہل رکھا گیا۔ دشمن کو اتنا نقصان پہنچایا گیا کہ اس کو مجبوراً اپنی سپلائی لائن کو محفوظ کرنے کے لیے جمشید ہل پر حملہ کرنا پڑا۔

اور اس حملے میں دُشمن کا بھاری جانی نقصان ہُوا اور حملہ ناکام بنا دیا گیا۔ آخرکار دشمن کو مجبُوراً واُئٹل کارنر کی پوزیشن کو خالی کرنا پڑا۔ اور ۵ ڈویژن کا ایڈوانس پھر شروع ہوگیا۔ اس کارنامے کے صلے میں مجھے بہادری کا اعزاز ملٹری کراس ملا۔ اس وقت میں کیپٹن تھا ۱۹۴۵ء میں جب کہ اپنا ایڈوانس رنگون کی طرف جاری تھا تو مکٹیلا کے قریب خبر ملی کہ دُشمن کا ایک بھاری جاں باز دستہ گرد و نواح میں موجود ہے اور وہ ہمارے آرمرڈ کالم اور انفنٹری کالم کو کاٹنے کا منصُوبہ بنا رہا ہے۔ میری کمپنی کو حکم ملا کہ اس تباہ کُن دستے کو تباہ کرے۔

میری کمان میں ایک آرمرڈ کار سکواڈرن بھی دیا گیا۔ دُشمن کی تعداد تقریباً دو سو کے لگ بھگ تھی اس کی پوزیشن کا پتہ لگا کر ایک سکیم تیار کی گئی اور حملہ اس تیزی اور جرأت سے کیا گیا کہ دُشمن کو سنبھلنے کا موقعہ ہی نہ ملا اور اس کو نیست و نابُود کر دیا گیا اور اس بہادری کے صلے میں مجھے دوسرا ملٹری کراس دیا گیا۔ اس وقت تک میں میجر ہو چکا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد کی روئیداد

۱۹۴۸ء میں، مَیں نے اپنی پلٹن کے ساتھ کشمیر کی جنگ میں حصّہ لیا۔

۱۹۵۶ء میں مُجھے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی اور دو پنجاب کا کمان دار مقرر ہُوا۔ ۱۹۵۷ء میں کمانڈ اور اسٹاف کالج کا کورس پاس کیا۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۴ء تک سیٹو کے ہیڈ کوارٹر بنکاک میں تعینات رہا۔ ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء میں وار کورس کوئٹہ میں اٹنڈ کیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں دوبارہ دو پنجاب کی کمان سنبھالی اور جنگ میں حصّہ لیا اور اللہ کا شکر ہے کہ ستارۂ جرأت کے اعزاز سے سرفراز ہوا۔ بجائے اس کے کہ میں خود اس کارروائی کے بارے میں کچھ کہوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ستارۂ جرأت کا فرمان نقل کروں۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

۸ ستمبر ۶۵ سے ۲۲ ستمبر ۶۵ء تک لیفٹیننٹ کرنل محمّد جمشید پنجاب رجمنٹ کی دوسری بٹالین

کو کمان کر رہے تھے ۲۴ بٹالین بریگیڈ کے ایک حصّے کے طور پر گڈگور پھلورا۔ چونڈہ کے علاقے میں دشمن کے خلاف نہایت اہم جنگی کارروائیوں میں مصروف رہی۔ اس تمام عرصے میں اس افسر نے اپنے دستوں کی قیادت کرنے میں غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ جرأت سے صحیح وقت پر صحیح قدم اُٹھایا اور اپنے فرض کی حدوں سے آگے بڑھ کر اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دشمن کے خلاف کارروائی کی۔

۸ ستمبر ۶۵ کی صُبح کو کرنل جمشید کو چونڈہ پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ اسی وقت اپنے دستوں کو لے کر آگے بڑھے اور دشمن کے لگاتار حملوں کو ناکام بناتے ہُوئے نہ صرف چونڈہ کے شمال میں اہم چوکیوں پر قبضہ کر لیا بلکہ اپنی ایک کمپنی کو اس ٹینک اسکواڈرن کے ساتھ تعاون کے لیے بھی بھیجا جو دشمن کے توپ خانے کے خلاف پھلورا کے شمال میں صف آرا تھا۔ ۸ ستمبر ۶۵ء کی شام تک گڈگور پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ اس وقت کرنل جمشید کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی کم تعداد بٹالین اور ۱۴ بلوچ کی ایک کمپنی سے وہاں ایک دفاعی حصار (ڈیفنس باکس) بنائیں۔ دُشمن نے اپنے کثیر بکتر بند دستوں اور انفنٹری سے اس دفاعی حصار کو توڑنے کی دو دن دورات بار بار سر توڑ کوشش کی لیکن کرنل جمشید نے دشمن کی اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا اور اس طرح گڈگور کا کامیاب دفاع کیا اس معرکے کی کامیابی میں کرنل جمشید کی ذاتی جرأت ہمّت اور قیادت کی صلاحیّت کا بڑا دخل تھا۔ گڈگور کی مضبُوط مرکزی بنیاد فراہم ہو جانے کی وجہ سے بریگیڈ گروپ کے لیے ممکن ہُوا کہ وہ دُشمن کی حملہ آور فوج کی کامیاب سرکوبی کر سکے۔

۸ ستمبر ۶۵ سے ۲۲ ستمبر ۶۵ تک کرنل جمشید چونڈہ سیکٹر کے ایک نہایت اہم حصّے کا دفاع کر رہے تھے اس دوران اس افسر نے ایک بار پھر اپنا کارنامہ دھرایا اور دور مار کے پٹرولوں، آؤٹ پوسٹوں اور دشمن کو ہراساں کرنے والے گشتی دستوں کے ذریعے نومینس لینڈ پر اپنی برتری قائم رکھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دُشمن کو ان کی پوزیشن کے خلاف حملہ کرنے کے لیے اپنی قوّت کو جمع کرنے کا موقعہ نہیں مل سکا۔ جوں ہی دشمن اسمبلی ایریا میں مجتمع ہونے کی کوشش کرتا۔ وہ کرنل جمشید کے جوابی

حملہ کا نشانہ بننا۔ اور اگر کبھی دشمن منظم ہونے میں کامیاب ہو کر ان کی پوزیشن پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا ہوتا تو کرنل جمشید کے مجاہد اس پر ٹوٹ پڑتے اور اس کا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔

اس غیر معمولی جرأت قیادت اور فنّی مہارت کے لیے اس افسر کے لیے ہلال جرأت کی سفارش کی جاتی ہے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد کی کہانی

۱۹۶۶ میں بریگیڈیئر بنا۔ اور ۱۹۶۷ سے ۱۹۶۹ تک ای۔پی۔ آر کا ڈائریکٹر رہا۔ اس خدمت کے صلے میں مجھے ستارۂ قائدِاعظم کے اعزاز کے قابل سمجھا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی اور ایک ڈویژن کی کمان ملی۔ ۱۹۷۱ میں دوبارہ مشرقی پاکستان میں سول آرمڈ فورسز کے ڈائریکٹر جنرل کا منصب سنبھالا۔ وسط دسمبر ۱۷ میں سقوط مشرقی پاکستان کا المیہ دیکھا۔ ۱۹۷۵ میں فوجی زندگی کو خیرباد کہا۔

مصنف کا تبصرہ

اس کتاب کے سلسلہ میں جنرل جمشید سے ہمیں کئی بار رُوبرُو گفتگو کا موقعہ بھی ملا جبکی بعض ضروری تفصیلات ان صفحات میں شامل کر لی گئی ہیں۔ آخر میں ہم نے جنرل جمشید سے پوچھا۔ اتنی طویل اور بھرپور عملی زندگی کے بعد زندگی کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں۔ ان کا جواب یہ تھا۔

مطمئن تو کوئی کبھی نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے لیکن اگر میں اپنے ساتھ انصاف کرنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی اننگز اپنے مقدور بھر خُوب کھیلی ہے۔ مَیں اپنے بزرگوں کی ارواح سے شرمندہ نہیں ہوں۔ دو ملٹری کراس اور ایک ستارۂ جرأت

اپنی داستان آپ سناتے ہیں۔

ایک صاحب نظر کا تبصرہ

آخر میں ہم جنرل جمشید کی شخصیت پر ایک صاحب نظر مبصر کا تبصرہ درج کرتے ہیں جو آج خود بھی ایک کور کو کمان کر رہے ہیں۔

مؤثر گفتگو اکثر لوگ کر لیتے ہیں لیکن خاموشی کسی کسی کی مؤثر ہوتی ہے۔ مؤثر خاموشی کے پیچھے ایک گھمبیر اور پُر وقار شخصیت ہوتی ہے۔ ایسی شخصیت جسے اپنے کارناموں کے علاوہ کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

میجر جنرل محمد جمشید ستارۂ جرأت، ملٹری کراس (دوبار) کا شمار ایسے ہی شاذ و نادر لوگوں میں ہے جن کی خاموشی ان کی پُر وقار شخصیت کی غمازی کرتی ہے اور جن کے جوہر میدانِ جنگ میں کھلتے ہیں۔

جنرل جمشید کو میں نے پہلی بار پی ایم اے کاکول میں دیکھا۔ یہ واقعہ ۱۹۵۲ء کا ہے میں جی، سی تھا اور جمشید صاحب کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے پوسٹ ہو کر آئے۔ ان کے آنے سے پہلے ان کی بہادری کے چرچے عام تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں برما کے محاذ پر انھوں نے دوبار ملٹری کراس حاصل کیا تھا۔ جو ایک غیر معمولی اعزاز تھا۔ اس لیے ہمیں اشتیاق تھا۔ کہ انھیں دیکھیں اور ان سے کچھ سیکھیں۔ بہرحال جب وہ آئے تو ہم نے انھیں اپنی توقعات سے مختلف بہت کم گو اور کم آمیز پایا۔ طبیعت کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ ملٹری ہسٹری کی ایک کلاس میں انھوں نے اس موضوع پر لیکچر دیا تو اپنے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ توقع یہی تھی کہ وہ اپنے تجربات و تاثرات کا تذکرہ ضرور کریں گے لیکن وہ اپنے موضوع سے نہیں ہٹے۔ اکیڈمی میں وہ زیادہ عرصے نہیں رہے۔ کچھ دنوں کے بعد یکایک ایک دن سنا کہ جمشید صاحب اکیڈمی سے چلے گئے۔ وہ فیلڈ کے آدمی تھے۔ انھوں نے

فیلڈ سروس کو اکیڈیمی کی سروس پر ترجیح دی۔

کچھ عرصے کے بعد جمشید صاحب کو ۲ پنجاب میں سیکنڈ ان کمانڈ کی حیثیت سے دیکھا اور بہت قریب سے دیکھا۔ ان کی پر اسرار خاموشی بدستور ان کے ساتھ تھی۔ ان کا طریقہ کار بے حد رسمی تھا۔ کسی نے کبھی ان کو مسکراتے نہیں دیکھا تھا واقعہ یہ ہے کہ ہم نوجوان افسر اپنے سی او کی نسبت ان سے زیادہ خائف رہتے تھے یا محتاط رہتے تھے۔ اُنھوں نے کبھی کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ درشت بھی نہیں تھے۔ لیکن ان کا طرزِ زندگی ایسا تھا۔ جس کی وجہ سے ہر ایک پر ایک رعب سا تھا۔ سب سے الگ تھلگ، اپنے کام سے کام، بے ضرورت گفتگو سے پرہیز اور انتھک محنت۔ ان صفات کی وجہ سے سب ان سے ڈرتے بھی تھے۔ اور ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ ایم سی بار ہیں۔ میدانِ جنگ میں ان کی افسانوی جرات کے قصّے یونٹ میں عام تھے کچھ دنوں کے بعد اُنھوں نے ۲ پنجاب ہی کی کمان سنبھالی۔ اب بھی ان کے طریق کار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف محنت اور تندہی میں اضافہ ہوا۔ دفتر سے ہفتے میں ایک آدھ بار ہی پریڈ کے معائنے پر نکلتے میرا خیال ہے کہ اس وقت پریڈ گراؤنڈ میں ہوا بھی ذرا احتیاط سے چلتی تھی۔ فیلڈ ٹریننگ پر انکی خصُوصی توجہ تھی۔ فیلڈ کی ہر مشق کے موقع پر وہ خود موجود ہوتے تھے۔ ٹریننگ میں ان کی اس دلچسپی کی وجہ سے یونٹ کی تربیّت کا معیار بہت اونچا تھا۔

یونٹ سے ان کا رشتہ جرأت و قیادت کی بنیاد پر استوار تھا۔ چھوٹے بڑے ہر ایک کو معلوم تھا کہ ان کا کمانڈر مردِ میدان ہے۔ اس لیے ہر ایک کو شعوری و لاشعوری طور پر ان کی قیادت پر اعتماد تھا۔ ۱۹۶۵ء میں اس اعتماد کو کسوٹی پر کَسا بھی گیا اور وہ اس اعتماد پر نہ صرف پُورے اُترے بلکہ مزید سرخ رو بھی ہُوئے۔ اس جنگ میں ان کی قیادت نے ایک اہم لمحہ میں ایک تاریخی کردار ادا کیا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں گو میں ان کے ساتھ ان کی یونٹ میں نہیں تھا لیکن بریگیڈ میجر

کی حیثیت سے مجھے ان کی یونٹ میں ان کی کارکردگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔
۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ان کی یونٹ کو جبڑکی طرف جانے کا حکم ملا۔ اور جب رات کو سیالکوٹ کے محاذ پر حملہ ہُوا۔ تو اسی وقت ان کو واپسی کا حکم مل گیا۔ پسرور میں بیری کے ایک باغ میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ وہاں بریگیڈ کمانڈر نے کمانڈنگ آفیسرز سے مشورہ کیا۔ وقت کم تھا۔ ہر لمحہ قیمتی تھا۔ سُورج نکلنے میں کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا بیشتر مشورے یہ تھے کہ پسرور کے پاس دفاع لیا جائے لیکن جمشید صاحب نے کہا کہ ہم وسیع فرنٹ میں ٹینکوں اور انفنٹری کے ساتھ ایڈوانس کریں۔ اور دُشمن کو پیچھے دھکیلیں ان کا خیال تھا کہ وسیع فرنٹ زیادہ فوج کا تاثر دے گا اور اس کے ساتھ ہمارا حملہ دفاع کی نسبت زیادہ سُودمند ہو گا۔ بریگیڈ کمانڈر نے جو خود ایک دلیر اور قابل لیڈر تھے یہ مشورہ فوراً قبُول کیا اور ایڈوانس کا حکم دیا۔ دس منٹ میں ہم چونڈہ کی جانب رواں تھے۔ جمشید صاحب کا یہ اہم مشورہ اور فوری فیصلہ سیالکوٹ سیکٹر میں کامیابی کا پیش خیمہ بنا۔ جنگ کے دوران یہ خاموش اور الگ تھلگ رہنے والی شخصیّت دن رات فرنٹ کے مورچوں میں جوانوں کے ساتھ رہتی۔ مَیں نے ان کو توپخانہ اور ٹینک فائر کی بوچھاڑ میں دیکھا ہے۔ کوئی آڑ نہیں لی۔ کہیں پوزیشن نہیں لی۔ بے خوف گھومتے تھے اور ہر جگہ اور ہر وقت جرأت کی حرارت اور روشنی سے دوسروں کو متاثر کرتے۔ ماتحت اور بالا افسروں کو ان پر جو اعتماد تھا۔ اس کی مثال کم مل سکتی ہے۔ یہ مبالغہ نہ ہو گا۔ اگر مَیں یہ کہوں کہ ان کی اپنی ذات کم از کم ایک بریگیڈ کی طاقت کے برابر تھی۔ اس لڑائی میں ان کو ستارۂ جرأت ملا۔

فوجی صلاحیتوں کے علاوہ ایک انسان کی حیثیت سے بھی ان میں بے شمار خوبیاں ہیں وہ فراخ دلی اور بلند حوصلگی کا ایک نمونہ ہیں۔ شرافت ان میں کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ اتنے اعزازات کے باوجود انکسار ان کی طبیعت کا خاصّہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ وہ فوجی قائدین میں صف اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد شیر ستارۂ جرأت

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمّد شیر ستارۂ جرأت

کرنل محمّد شیر ستارۂ جرأت کا تعلق مٹھا ٹوانہ ضلع سرگودھا کے ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ ان کے والد ملک حاجی احمد خاں آئی او ایم او بی ای بہادر انڈین آرمرڈ کور میں سالار میجر تھے۔ کرنل محمّد شیر نے پرائمری درجات کی تعلیم مٹھا ٹوانہ ہائی سکول میں حاصل کی۔ ستمبر ۱۹۳۵ میں چھٹے درجے میں ملٹری کالج میں داخل ہُوئے اور ۵۶۲ کالج نمبر ملا۔ ان کا پہلا ہاؤس برڈ وڈ ہاؤس تھا۔ اس وقت کالج کے کمانڈانٹ میجر سیلبی تھے۔ محمّد شیر پانچ سال کالج میں رہے اور آرمی اسپیشل کا امتحان پاس کر کے مئی ۱۹۴۰ میں آرمرڈ کور میں بھرتی ہو گئے۔ رسالے سے محمّد شیر ۱۹۴۳ میں کچنز کالج نوگانگ جو ایک طرح کا پری کیڈٹ ادارہ تھا۔ منتخب ہُوئے کچنز کالج سے ۱۹۴۴ میں فارغ ہو کر او ٹی ایس بنگلور گئے۔ اس کے بعد ٹیکنیکل ٹریننگ او ٹی ایس احمد نگر میں حاصل کی۔ ستمبر ۱۹۴۵ء میں انھیں ایک ریکی رجمنٹ میں کمیشن ملا۔

آرمرڈ کور میں افسر کی حیثیت سے کرنل محمّد شیر نے مختلف ریکی رجمنٹوں اور ٹینک رجمنٹوں میں خدمات انجام دی ہیں۔ ۵۰ - ۱۹۴۷ میں کرنل محمّد شیر کو قبائلی علاقے میں فقیر اپی کے تربیت یافتہ اور منظم کئے ہُوئے گوریلوں کے خلاف تادیبی کارروائیوں کی رہنمائی کرنے کا موقع ملا۔

ستمبر ۱۹۶۵ کی جنگ میں کرنل محمّد شیر نے چھمب جوڑیاں کے معرکے میں ایک آرمرڈ رجمنٹ کی کمان کی اور اس کامیاب قیادت کے لیے انھیں ستارۂ جُرأت دیا گیا۔ اکھنور کی طرف پیش قدمی میں کرنل محمّد شیر کی رجمنٹ نے اہم کردار ادا کیا۔

۷۰ - ۱۹۶۶ء میں کرنل محمّد شیر ستارۂ جُرأت سکُول آف آرمرڈ کے کمانڈانٹ تھے۔ اسکے بعد تقریباً ڈھائی سال تک جیسور سیکٹر مشرقی پاکستان کی کمان ان کے ہاتھ میں رہی۔ اس خدمت

کے بعد ان کی خدمات حکومت قطر کے سپرد کر دی گئیں۔ جہاں اُنھوں نے چھ سال گزارے۔ اور ۱۹۷۶ء میں وہ پاکستان واپس آئے۔

قطر میں کرنل مُحمّد شیر نے اس عرب ریاست کی فوجی تنظیم میں خصوصی خدمات انجام دیں اور پاکستان کے مفادات کو بھی مستحکم کیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد کرنل مُحمّد شیر ستارۂ جرأت اسلام آباد میں رہتے ہیں اور اپنی مادر درس گاہ ملٹری کالج میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔

ستارۂ جُرأت کا فرمان

۶ ستمبر ۶۵ سے ۱۰ ستمبر تک دشمن نے انفنٹری اور ٹینکوں سے اپنے کھوئے ہُوئے علاقے کو واپس لینے کے لیے دو بھرپُور حملے کیے۔ پی ایس ایس ۲۷۸ لیفٹیننٹ کرنل محمد شیر نے ۱۳ لانسرز کی کمان کرتے ہُوئے ان دو جوابی حملوں کو پسپا کرنے میں مُؤثر کردار ادا کیا۔ تصادم بہت شدید تھا۔

دُشمن کا توپ خانہ شدید گولہ باری کر رہا تھا۔ دُشمن نے اپنے ٹینک محفوظ جگہ پر جمائے ہُوئے تھے اور آر آر کو موزوں مقامات پر نصب کر رکھا تھا۔ ان دونوں مہلک ہتھیاروں کے بے خطا نشانوں کی زد میں ہوتے ہُوئے بھی ۱۳ لانسرز کے جوان بہت لیفٹیننٹ کرنل مُحمّد شیر کی جرأت مندانہ اور ولولہ انگیز قیادت میں آگے ہی بڑھتے رہے اور اُنھوں نے وہ مقصد حاصل کر کے چھوڑا جو ان کے سپرد کیا گیا تھا۔

کرنل مُحمّد شیر ہر پُرخطر موقعہ پر آگے رہے اور ہر مشکل مرحلہ پر بہ نفسِ نفیس حملہ کی قیادت کی۔

۱۳ لانسرز کے تینوں اسکواڈرن ۲ ستمبر سے ۱۳ ستمبر ۶۵ تک مسلسل شریکِ کار زار رہے

اس کے باوجود ان کے دلیر اور جری کمانڈر کی قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے ان کا حوصلہ بہت بلند رہا۔

لیفٹیننٹ کرنل محمدؐ شیر نے ان معرکوں میں ذاتی جُرأت بے خوفی اور قائدانہ صلاحیت کا بہت اعلیٰ مظاہرہ کیا۔ اس امتیازی کارکردگی کے لیے لیفٹیننٹ کرنل محمدؐ شیر کو فوری طور پہ ستارۂ جُرأت دینے کی سفارش کی جاتی ہے۔

۲ر اکتوبر ۶۵ء کو یہ اعزاز کرنل محمدؐ شیر کو عطا ہُوا۔

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) سید اکابر حسین ستارۂ جرأت
تمغۂ قائداعظم

بریگیڈئر (ریٹائرڈ) سیّد اکابر حسین ستارۂ جرأت تمغۂ قائدِ اعظم

یہ مٹی کہاں کی ہے؟ اِسمیں یہ خُوشبو کہاں سے آئی

مجھے جو سوال نامہ راشد صاحب نے بھیجا اس میں پہلا سوال یہ تھا۔

سیّد صاحب۔ یُوں تو آپ کا نام ہی آپ کے نسلی اور آبائی رشتوں کی غمازی کرتا ہے، پھر بھی کچھ اس امر کی تھوڑی سی وضاحت کیجیئے۔ تاکہ عام پڑھنے والوں کو کچھ اندازہ ہو کہ یہ مٹی کہاں کی ہے اور اس میں یہ خوشبو کہاں سے آئی۔

میرا جواب یہ ہے کہ میں کیا اور میری مٹی کیا۔ بہرحال میری نسبت بڑی ہے حضرت امام مُوسیٰ کاظم کے توسط سے اہلِ بیت کا غلام ہوں۔ چونکہ اسلاف تبلیغ اسلام کے سلسلے میں ایران کے شہر مشہد سے ہجرت کرکے آئے تھے اس لیے ہمارا خاندان مشہدی بھی مشہور ہے میرے آباؤ اجداد میں پہلا نمایاں نام پیر مراد شاہ غازی کا ہے جو نہ صرف صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے بلکہ صاحب السیف بھی تھے۔ روایت ہے کہ اُنھوں نے متّور کے قریب ایک غیر آباد پہاڑی پر چِلّہ کشی شروع کی تھی۔ باقی زندگی وہیں ریاضت وعبادت میں گزاری اور اپنے قول وفعل سے تبلیغ کرتے رہے ان کے وصال کے بعد ان کی اولاد بھی وہیں آباد ہُوئی۔ وہ جگہ

اب موضع لٹوری سیداں کے نام سے مشہور ہے اور آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔
یہی گاؤں لٹوری سیداں ہمارا آبائی گاؤں ہے اور پیر مراد شاہ غازی کی روایت ہماری خاندانی روایت ہے۔ یعنی تعلق باللہ اور بالسیف۔ میرے پردادا سید امیر علی شاہ کو جنگی خدمات کے سلسلے میں لٹوری سیداں کا موضع جاگیر کے طور پر ملا تھا۔ وہی اس کے نمبردار تھے ان کے بعد یہ اعزاز میرے دادا اور پھر میرے والد سید محمد زمان شاہ کو ملا تھا۔ خاندانی روایت کے مطابق انھوں نے بھی سپاہ گری کے پیشے کو اختیار کیا اور بڑے دبدبے سے نوکری کرکے صوبیدار میجری سے ریٹائر ہوئے۔ حکومت وقت نے انھیں ان کی غیر معمولی خدمات کے صلے میں اس دور کا اہم اعزازی تمغہ او بی آئی عطا کیا تھا۔ صرف سپاہ گری نہیں دین کی محبت بھی میری گھٹی میں پڑی ہے۔ میرے والد اور والدہ دونوں حد درجہ دیندار تھے۔ جو بات نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی دینداری رسمی نہیں عملی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک ہمارے گھرانے میں یہ روایت جاری و ساری ہے۔ میری بیوی، میری بیٹی اور اب میرے داماد برگیڈئر رب نواز بھی دین کا ذوق رکھتے ہیں اور شعور بھی الحمدللہ۔

زندگی کی پہلی منزل

زندگی کا سفر میں نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۲ کو اپنے آبائی گاؤں لٹوری سیداں سے شروع کیا تھا۔ بچپن اسی طرح ہنستے کھیلتے گزرا جس طرح عام دیہاتی بچوں کا گزرتا ہے۔ بلکہ سیدوں کے گھرانے میں پیدا ہونے سے ذرا زیادہ احتیاط اور پابندیوں سے گزرا۔ مجھے ہوش سنبھالتے ہی اس بات کا احساس ہوگیا تھا بلکہ چھوٹے شاہ جی کہنے والوں نے کرا دیا تھا کہ مجھے کوئی ہلکی بات نہ کرنی چاہیئے اور نہ کہنی چاہیئے۔ گھر کے دستور کے مطابق جب میں چار برس چار مہینے چار دن کا ہُوا تو میری بسم اللہ ہُوئی اور قرآن شریف کے حروف شناسی سے میری تعلیم کی ابتدا ہُوئی۔

گورنمنٹ ہائی اسکول مٹور

میری درسی تعلیم کا آغاز پانچ چھ برس کی عُمر میں گورنمنٹ ہائی اسکول مٹور سے ہُوا ۔ چھٹے درجے تک میں نے اسی سکول میں پڑھا۔ یہیں میں تین استادوں سے متاثر ہُوا۔ ماسٹر سیّد علی قدر، ماسٹر عبدالرشید اور تیسرے اُستاد ایک سکھ تھے لیکن ان کو بھی میں اس فہرست میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا نام ماسٹر تارا سنگھ تھا ان تینوں میں ایک صفت مشترک تھی۔ بہت محنت اور محبّت سے پڑھاتے تھے۔ بچّوں کو اُستاد کے علم کے دریا کے مقابلے میں اسکی توجہ اور شفقت کے کوزے بھر میٹھے پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ توجہ اور تعلق سے بچے کا پڑھنے کا شوق از خود جاگ جاتا ہے یا کم از کم اسے وہ جذباتی تحفظ اور سکون ضرور مل جاتا ہے۔ جس کی اسے اس عمر میں سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ڈرا ہوا، خوف زدہ، دھتکارا ہُوا پریشان بچہ کیا پڑھے گا۔ جس گائے کو بھی پچکارا نہ جائے وہ رَج کر دودھ نہیں دیتی۔ جس پودے کو جاکر دن میں دوبار دیکھا نہ جائے اس میں پھٹ کر پھُول نہیں آتے۔

یہ میرا زندگی بھر کا تجربہ ہے کہ جو استاد جذبۂ مادریت MOTHERHOOD سے خالی ہُو خواہ وہ اچھا ریسرچ اسکالر ہو جائے تو ہو جائے۔ کم از کم اچھا اُستاد نہیں ہو سکتا۔ میرے یہ تینوں اُستاد اس صفت سے کماحقہٗ موصوف تھے۔

قد کا چھوٹا ہوں لیکن زہر کا ٹوٹا ہوں

مگر اس کا نام دُنیا ہے یہاں رنگ رنگ کے لوگ ہوتے ہیں۔ اسی اسکول میں ایک صاحب ہیڈ ماسٹر ہو کر آئے۔ ان کے آتے ہی خبر پھیل گئی کہ وڈا صاحب آیا ہے۔ وہ پہلے اُستاد تھے جو سوٹ بوٹ میں ملبوس نظر آتے تھے اور سر پہ ہیٹ بہار دکھاتا تھا۔ قد ذرا چھوٹا تھا۔ جس کی طرف ہم نے پہلے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن جب وہ اسکول کا چارج

ے چکے اور سارے اسکول کو خطاب کرنے کے لیے جمع کیا تو ان کا دوسرا یا تیسرا فقرہ یہ تھا۔ قد کا چھوٹا ہوں مگر زہر کا ٹوٹا ہوں۔ ان کے کہنے پر پہلی بار لوگوں کو ان کے قد کے چھوٹے ہونے کا احساس ہُوا لیکن بعد کو معلُوم ہُوا کہ وہ تو اپنے قد سے بھی چھوٹے ہیں احساس کمتری بھی عجیب چیز ہے۔ جو اپنے پاؤں سے نہ چل سکے اسے بیساکھیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ خالی برتن شور کرتے ہیں۔ اتھلی ندی کے کنارے پہلی بارش کے پانی سے چھلک جاتے ہیں۔ جس کا دل تنگ اور ذہن چھوٹا ہو وہ کندھے کے بیّل کی طرف ہی بار بار دیکھتا ہے یہ حال افراد کا ہے۔ لیکن جو قوم احساس کمتری کا شکار ہو وہ اپنی تہذیب، اپنے کلچر، اپنی تاریخ، اپنی روایات سے شرمندہ رہتی ہے اور ہنس کے پر اپنے جسم پر سجانے ہی میں اپنی ساری توجہ اور توانائی صرف کرتی رہتی ہے۔ اللہ رحم کرے!

گاؤں کا کلب

گاؤں کے قریب ایک تالاب تھا۔ جسے سب "بڑا" کہتے تھے۔ وہی ہمارا کلب تھا۔ اس کے آس پاس لڑکے بالے ضرور ٹھہرتے تھے گرمیوں میں اس میں تیرتے تھے شام کا وقت ہوتا تو وہاں کبڈی وغیرہ کھیلتے تھے۔ میل ملاقات اور تفریح کا مرکز بڑا ہی تھا۔ اب تو وہ تالاب رہا نہ وہ ماحول لیکن اس کی یاد دل میں باقی ہے۔

میرا پہلا آیئڈیل

سوالنامے میں ایک سوال ہے کہ بچپن میں آپ کو کن شخصیتوں نے متاثر کیا۔
— یہ سوال میرے دل میں تیر کی طرح جا کے لگا۔ موٹر میں اپنے گھر کی تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی وہ من موہنی صورتیں نظر میں پھر گئیں۔ جن کو دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی ہیں۔
— بہرحال جواب اس سوال کا یہ ہے کہ اس ضمن میں میں سب سے پہلے اپنے دادا

سیّد نواب شاہ صاحب کا نام لُوں گا۔ پھر اپنی والدہ اور دادی کا ان تینوں کے کردار سے میں نے بہت گہرا اثر قبُول کیا ہے۔ دادا جاگیردار، نمبردار سب کچھ تھے لیکن مزاج میں جاگیرداری کی خو بو نہیں تھی درویشانہ طبیعت تھی۔ مَیں نے ان سے سادگی اور عالی ظرفی کا سبق سیکھا۔ وہ احسان بھی اس انداز سے کرتے تھے کہ لینے والا شرمندہ نہیں ہوتا تھا۔ والدہ بھی تسلیم و رضا کی تصویر تھیں اور ان کا بھی بہت کھلا ہاتھ تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں۔ بیٹے دینے والا ہاتھ اُوپر ہوتا ہے یہ انہی کی تربیّت کا اثر ہے کہ زندگی بھر میں، مَیں نے اپنے ہاتھ کو اُوپر رکھنے کی کوشش کی۔ میرے والد سیّد زمان شاہ چونکہ بہ سلسلہ ملازمت زیادہ تر گھر سے باہر رہتے تھے، اس لیے اس زمانے میں ان سے کم تعلق رہا۔ لیکن ان کی شخصیت کا اپنا حُسن تھا۔ بڑے فراخ دل تھے، مخالفوں تک کو معاف کر دیتے تھے لیکن ان کی جس صفت سے میں نے شعوری طور پر اثر قبول کیا وہ ان کی انصاف پسندی تھی جاگیر اور نمبرداری کے سلسلے میں ہزار بکھیڑوں میں اُنھیں اُلجھنا پڑتا تھا۔ جن میں پیسے کا سوال بھی ہوتا تھا اور عزیز رشتے داری یا تعلقات کا بھی لیکن ان کی انصاف پسند طبیعت کسی رو رعایت کی قائل اور نفع نقصان کی پابند نہ تھی۔ حق بات کرتے تھے اور حق بات کہتے تھے۔ میری شخصیت کا تانا بانا بُننے میں ان کا ہاتھ بھی ہے۔

کاروانِ زندگی کی دُوسری منزل اور ستارۂ جرأت کی طرف پہلا قدم۔ ملٹری کالج

مَیں ملٹری کالج میں جو کنگ جارج رائل انڈین ملٹری اسکُول کے بھاری بھر کم نام سے موسُوم تھا اور مختصراً کے جی آر کہلاتا تھا۔ ۱۹۳۵ میں چھٹی جماعت میں داخل ہُوا۔ ۴۷۳ ۵ کالج نمبر ملا اور رہنے کے لیے جو درو دیوار حصّے میں آئے ان کا نام اسکین ہاؤس (بابر ہاؤس) تھا۔ اس ہاؤس کے مہربان سائے تلے میں نے کالج میں اپنی طالب علمانہ زندگی کے پانچ حد درجہ تعمیری سال بسر کیئے۔

کالج کے شب و روز

مجھے یاد ہے ریوالی پر بہت سویرے اُٹھتے تھے گرمی سردی صبح کا غسل لازمی تھا۔ البتہ فجر کی نماز لازمی نہیں تھی لیکن بعض لڑکے پابندی سے فجر کی نماز پڑھتے تھے اللہ کا شکر میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ صُبح کی پی ٹی شروع شروع میں بہت ناگوار گزرتی تھی پھر رفتہ رفتہ عادی ہوگئے تھے۔ ناشتے کے بعد پڑھائی شروع ہوتی تھی۔ گرمیوں میں دوپہر کے کھانے کے بعد سونا لازمی تھا۔ شام کے کھیل بھی لازمی تھے۔ رات کے کھانے کے بعد کلاس میں پریپ بھی دو گھنٹے کرتے تھے۔ مغرب اور جُمعے کی نماز بڑے اہتمام سے پریڈ کے طور پر ادا کی جاتی تھی۔ جُمعہ کی نماز سے پہلے تمام طلبہ پریڈ گراؤنڈ میں کمانڈانٹ کے معائنے کے لیے صف بند ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مغرب کی نماز کے وقت بھی کمانڈانٹ لڑکوں کو چیک کرنے مسجد میں آتے تھے۔ جو لڑکے نماز نہیں پڑھتے تھے وہ مسجد میں پیچھے بیٹھ جاتے تھے۔ کمانڈانٹ کو آتا دیکھ کر جلدی سے اُٹھ کر سجدوں پر سجدے کرنے لگ جاتے تھے۔ اگر کمانڈانٹ دیکھ پاتے تو ان کی خاصی گوشمالی ہوتی تھی۔ مَیں کالج میں داخل ہونے سے پہلے بھی نماز پڑھتا تھا۔ لیکن یہاں جس تواتر اور اہتمام سے نماز پڑھائی جاتی تھی۔ اس نے مجھے نماز کا ایسا عادی بنایا کہ اب بھی بمشکل کوئی نماز قضا ہوتی ہے اس زمانے میں ایک نہیں بہت سے لڑکے نماز پر سختی سے بیزار نہیں تو نالاں ضرور تھے مُجھے یقین ہے ان میں سے بیشتر اب کالج کو دُعا دیتے ہوں گے کہ کچھ اور نہیں تو نماز ایسی نعمت کا عادی تو بنا دیا۔

چھٹی کے دن کی عیاشیاں

ہفتے کے چھ دن سخت مصروفیت میں گزرتے تھے جُمعہ کو آدھی چھٹی ہوتی تھی۔ جو دھوبی کو کپڑے دینے لینے اور نماز کے لیے تیار ہونے میں گزر جاتی۔ اصل میں چھٹی کا دن اتوار کا دن تھا۔ اتوار کے دن لڑکوں کو گروپ میں باہر جانے کی اجازت تھی۔ باہر جانے کا

لباس سفید شلوار قمیض اور سبز کلاہ دار پگڑی تھی۔ (پگڑی کو باندھنا بھی ایک مرحلہ تھا جس سے گزرنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی تھی) کچھ لڑکے سرائے یا جہلم میں اپنے رشتے داروں سے ملنے چلے جاتے۔ سینما کے شوقین شہر میں سینما دیکھتے لیکن زیادہ تر لڑکے اپر جہلم نہر کے کنارے یا دریائے جہلم کے کنارے گھومنے پھرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ہفتے کے چھ دن ہاؤس اور کالج کی چار دیواری میں گزار کر ساتویں دن، کھلی فضا میں آزاد پرندوں کی طرح گھومنے پھرنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ باہر جانے کے لیے پاس لینا پڑتا تھا۔ واپسی پر پاس جمع کرانا ہوتا جس پر واپسی کا وقت بھی درج ہوتا۔ ذرا سی دیر ہونے پر سزا ملتی تھی۔ بحیثیت مجموعی کالج کی زندگی سخت کوشی اور جفاکشی کے فلسفے پر مبنی تھی کبھی تپتی دھوپ میں اور کبھی شدید سردی میں ننگے پاؤں نیکر پہنے پی ٹی یا کھیل کے لیے جانا پڑتا تھا۔ اسی طرح ہر موسم میں صبح شام نہانا بھی لازمی تھا۔

صحرا کا پھول اور ریگ زار میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا

بحیثیت مجموعی سخت قسم کا ڈسپلن تھا۔ ذرا سی غفلت پر سخت باز پرس ہوتی تھی بات بات پر سزا ملتی تھی۔ لیکن اس صحرا میں کبھی کبھی کوئی پھول بھی کھل جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بھی آجاتا تھا۔ مثلاً جب انٹر اسکول کھیل ہوتے یا جب چھٹی پہ جاتے یا آتے یا اسکول چھوڑتے وقت کے آخری ایام۔ ہاں یاد آیا کالج میں لاکر بنانے، کمانڈانٹ پریڈ اور انسپکشن کو بھی کافی اہمیت دی جاتی تھی۔ جس میں جمعدار منگا خان کی چھڑی مشہور تھی۔ مرحوم منگا خان جو بعد کو میجر ہو کر ریٹائر ہوئے اس زمانے میں ٹریننگ افسر، ایجوٹینٹ، کوارٹر ماسٹر سب کچھ تھے۔ جب کوئی سیری مونیل پریڈ ہونا ہوتی تو ان کی چھڑی بار بار حرکت میں آتی۔ ڈرل کے انچارج تھے۔ اس لیے اس معاملے میں سختی کرتے تھے۔ کاشن وغیرہ بہت شاندار تھی لیکن لڑکے

بہت تنگ تھے۔ یہاں سے میں نے آرمی کے مروجہ امتحانات، فرسٹ رومن اُردو، فسٹ میپ ریڈنگ اور سیکنڈ کلاس انگلش پاس کئے۔ پڑھائی میں میرا معیار برا نہیں تھا۔ سب مروجہ کھیل کھیلتا تھا۔ اور آخری سال میں اسکول کی ہاکی ٹیم میں آگیا تھا۔

شاہ جی

اس زمانے میں تقریباً ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی نک نیم ہوتا تھا (اب بھی ہوتا ہوگا۔ چونکہ یہ اجتماعی طرز رہائش کی ایک نفسیاتی ضرورت ہے۔) غالباً میرے سیّد ہونے کے ناطے لڑکے مجھے شاہ جی کہا کرتے تھے۔

سزا

اسکول میں سزا روز کا دستور سی تھی۔ کوئی کوئی ہوگا جو اس عزت افزائی سے بچا ہو۔ میں بھی اپنے محتاط رویے کی وجہ سے ان ہی تھوڑے لڑکوں میں سے ایک تھا۔ لیکن کب تک بچا رہتا۔ ایک بار چھٹی سے کسی خاص مجبوری کی وجہ سے ایک دن لیٹ ہوگیا۔ تو کمانڈانٹ نے تھوڑا بہت معاف کیا تو تین دن کی اضافی ڈرل عطا کی۔

روشن چراغ

اپنی کتاب زندگی کا یہ ورق الٹنے سے پہلے، میں اپنے چند اُستادوں کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں۔ صوبیدار میجر کامیاب خاں، صوبیدار ولایت شاہ، صوبیدار سکندر خاں، صوبیدار غلام احمد، سب اپنے اپنے دائروں میں روشن چراغوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا علم جو تھا سو تھا۔ میں اس اثر کی بات کر رہا ہوں۔ جو طلبہ نے ان کے کردار سے قبول کیا۔ کالج کی فضا کو اسلامی رنگ دینے میں ان سب حضرات کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ سب دردمند انسان اور

اچھے مسلمان تھے۔ ان میں سے سکندر خاں نے بعد کو لیفٹیننٹ کرنل ہو کر آرمی سکول آف ایجوکیشن کو کمان کیا۔ ولایت شاہ صاحب اور غلام احمد صاحب لے ای سی سے میجر ہو کر ٹیائر ہُوئے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے میرے دل سے دُعا نکلتی ہے۔

اسکُول کے کمانڈانٹ میجر سیلبی اپنے کام میں کامل تھے۔ ہر لڑکے کو مع اسکے خاندان کے جانتے تھے۔ چند لڑکوں کے کفیل بھی تھے۔ ان کے تعلیمی اخراجات اٹھاتے تھے۔ مُجھے ان کی جو بات یاد ہے وہ ان کا ہمدردانہ روّیہ ہے ان کی اپنی اولاد نہیں تھی۔ کالج کے لڑکوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ ان کے زمانے میں کالج نے تعلیمی اعتبار سے بھی ترقی کی۔ اور دائرہ کار بھی وسیع ہُوا۔ ۱۹۳۶ سے چیدہ چیدہ لڑکے کمیشن کی تیاری کے لیے کچنر کالج نوگانگ بھیجے جانے لگے۔ ۱۹۳۷ میں پہلی بار یہاں کے دو لڑکوں محمّد ایوب اور شیر محمد نے آرمی اسپیشل کا امتحان پاس کیا۔

سیلبی کا شمار بھی اس ادارے کے اولیں معماروں میں ہے۔ ان کا انتقال ہو چکا۔ حق مغفرت کرے۔ لیکن کام باقی ہے۔ انسان خواہ کچھ ہو آخر کار اس کا اچھا یا بُرا کام ہی باقی رہ جاتا ہے۔ افسوس یہ بات بہت دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔

الوداع اے مادر درس گاہ کی فضاؤ الوداع

مئی ۱۹۴۰ء میں، میں نے ملٹری کالج کو الوداع کہا۔ پانچ برس پہلے میں یہاں آیا تھا تو یہ در و دیوار میرے لیے اجنبی تھے اور اب جب جانے لگا تو یہاں کا چپّہ چپّہ اپنا ہو چکا تھا اس عرصے میں، مَیں نے اپنے کیرئیر کی بنیادیں رکھیں۔ اپنی شخصیت کو بنایا اور سنوارا ملٹری کالج ستارۂ جرأت کی طرف پہلا قدم تھا۔

چند کٹھن منزلیں

ملٹری کالج گویا ایک سایہ دار درخت تھا۔ اسکی مہربان اور ٹھنڈی چھاؤں سے اُٹھا تو تپتی دھوپ

میں دیر تک بھٹکتا رہا۔ لیکن ہمت نہیں ہاری سفر جاری رکھا۔ تفصیل اس امر کی یہ ہے کہ کالج سے فارغ ہونے کے فوراً بعد ۱۴ مئی ۱۹۴۰ء کو میں ۱۶ پنجاب رجمنٹ کے سنٹر سیالکوٹ میں ریکروٹ بھرتی ہوا۔ چند ماہ کی تربیت کے بعد ۴/۱۶ پنجاب کے ساتھ میں مڈل ایسٹ روانہ ہُوا۔ ستمبر ۱۹۴۰ء میں ۴/۱۶ پنجاب مینا کیمپ (قاہرہ) میں خیمہ زن ہُوئی اور ۴ انڈین ڈویژن اور ۷ انڈین انفنٹری کے ساتھ وابستہ کی گئی وہاں پہنچتے ہی انگریزی جاننے والے سپاہیوں کو نئے ہتھیاروں کا استعمال سکھایا گیا۔ انگریزی میں کچھ شُدبُد ہونے کی وجہ سے میں نے اس کورس میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور کچھ عرصہ خود بھی اس کورس میں انسٹرکٹر رہا اس کے بعد اپنی پلٹن کے ساتھ میں نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء تک سدی برانی، کیرن، مساوا سدی عمر۔ ڈرنا، غزالہ اور بن غازی کے معرکوں میں حصّہ لیا۔

ایک ناکامی

مڈل ایسٹ کے ان معرکوں میں میری کارکردگی کی بنا پر مُجھے کنگ کمیشن کے لیے منتخب کیا گیا۔ کمیشن کی تیاری کے لیے جولائی ۱۹۴۲ء میں، مَیں کچنز کالج نوگانگ گیا۔ وہاں میں نے تینوں لازمی مضامین امتیاز سے پاس کیے جو آئی ایم اے ڈیرہ دون جانے کیلئے ضروری تھے لیکن جب میں سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے میرے لیے وائسرائے کمیشن کی سفارش کی۔ اس صورت حال سے مَیں دل برداشتہ تو بہت ہُوا لیکن میری تربیت نے مجھے سہارا دیا اور مَیں نے دل سے کہا۔ حوصلہ نہ ہار وتعزُ من تشاءُ وتذل من تشاءُ جو کچھ قسمت میں ہوگا مل جائے گا۔ پھر دادا کی بات یاد آئی کہ اصل عزت کام سے ہوتی ہے عہدے سے نہیں۔

پھر بھی شکر الحمد للہ

بہرحال وی سی او منتخب ہونے پر میں نے خُدا کا شکر ادا کیا نومبر ۴۳ میں خوشی خوشی

ٹریننگ اسکول جھانسی رپورٹ کی۔ چھ مہینے کی یہ تربیت مکمل کرنے کے بعد یکم اپریل ۱۹۴۴
کو جمعدار کے عہدے میں اپنی فوجی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز کیا اب کے مجھے ۱۶/۹ پنجاب
رجمنٹ جنگل وارفیئر سکول میں تربیت کے لیے پوسٹ کیا گیا۔ تربیت کے مکمل ہونے پر میں نے
اسی اسکول میں کچھ عرصہ انسٹرکٹر کے طور پر کام کیا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہونے پر مجھے دوبارہ
اپنی پرانی پلٹن ۱۶/۴ پنجاب میں بھیجا گیا اور اس کے ساتھ پہلے میں پشاور پھر رزمک رہا۔

پاکستانی پرچم کو سلامی

۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کا وہ مبارک دن مجھے اب بھی یاد ہے جب ہم نے رزمک میں آزادی
کی پریڈ کی۔ اور یونین جیک کو اتار کر پاکستان کا قومی پرچم لہرایا اور اس کو سلامی دی۔ اس تبدیلی
کا فرق اسی کو محسوس ہو سکتا ہے جس نے دور غلامی دیکھا ہو اور اس زمانے میں انگریز کی نوکری
کی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں مڈل ایسٹ میں تھا تو عرب ہمیں طعنے دیا کرتے تھے۔ کہ تم
غلام ہو، تاج برطانیہ کے لیے لڑتے ہو، تمھارا اپنا کوئی ملک نہیں کوئی مقصد نہیں آزادی
کی کرن پھوٹتے ہی ہماری فوج اللہ کی فوج بن گئی۔ ہمارا پرچم چاند تارے کا پرچم ہو گیا۔ اب
ہمارا لڑنا جہاد ہو گیا۔ اور دوسروں کی طرح میرے دل میں بھی یہ آرزو مچلنے لگی کہ یا اللہ اب ان
بازوں کو اسلام کی سربلندی کے لیے جہاد کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اور بہت جلد وہ موقعہ آگیا کشمیر
میں جہادِ آزادی شروع ہوا تو مجھے بھی اس میں حصہ لینے کا موقعہ ملا۔

جہاد کشمیر

جہاد کشمیر شروع ہوتے ہی میری پلٹن ۱۶/۴ پنجاب کو اوڑی محاذ پر ہندوستانی فوج کے
ایڈوانس کو روکنے کے لیے ایبٹ آباد سے چکوٹھی بھیجا گیا ہندو فوج نے سری نگر بارہ مولا اور
اوڑی سڑک کے ساتھ مورچے لگا کر اندرونی حصوں کو گشت کے ذریعے قبضہ میں لے لیا۔ میں چونڈہ

میں اور ی ُپونچھ سڑک پہ رکاوٹ کے لیے اپنی پلاٹون کے ساتھ مقیم تھا اس پوزیشن میں ابھی دو ہفتے ہی گزرے تھے کہ کالم کے ساتھ جانے کا حکم ملا۔ تجویز یہ تھی کہ یہ کالم اوری پونچھ سڑک کو عبُور کرکے " چھپڑ گلہ " سے ہوتے ہُوئے بنیار ویلی میں آپریشن کرے گی۔ مَیں نے کالم کی کمانڈ کی۔ اور ۲۵۔ اپریل ۱۹۴۸ء کو مدانا پولیس اسٹیشن پر شام کے وقت چند آدمیوں کے ساتھ قبضہ کرلیا۔ ایک پولیس افسر اور پولیس کے تین سپاہیوں کو پکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ بعد میں سب کالم رات کو وہاں ہی اکٹھی ہُوئی۔ اس مہم میں مجھے ایک مخلص اور بھروسہ والا ہوشیار رہنما (گائیڈ) مل گیا تھا۔ اس علاقے کے مسلمانوں نے بہت خوشی منائی نمبردار نے بکرا ذبح کرکے روٹی کا انتظام کیا۔ اس کو معاوضہ اسی وقت ادا کیا گیا۔ پھر اسی رات کو دشمن کی بنیار پوزیشن پر گھات لگانے کا منصوبہ بنایا نقشے کی مدد سے پیرنیاں ایریا کا تعین کیا اور چل پڑے۔ ۲۶۔ اپریل ۱۹۴۸ء صُبح پانچ بجے اس پوزیشن پر پہنچ گئے۔ روشنی ہوتے ہی میں نے اس ایریا کی دیکھ بھال کی اور جوانوں کے تین حصّے بناکر پوزیشن میں لگادیئے دو دو جوانوں کے گروپ بناکر سارے راستے پر پوزیشن پکڑ لی۔ اور حکم یہ دیا کہ دشمن کے گھات میں آجانے پر پہلا فائر میں کروں گا۔ اس سے پہلے کوئی فائر نہیں کریگا۔ اسلئے میں نے خود دشمن کے آنے والی طرف سنتری کے ساتھ پوزیشن لی جب ۸ بجے مُجھے سنتری نے دُشمن کی پارٹی دکھائی دینے کی اطلاع دی تو میں نے سب کو ہوشیار کردیا۔ دشمن ہوشیار تھا وہ بجائے راستے پر آنے کے دریائے بنیار کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ جو ہم سے کچھ دُور پڑتا تھا۔ مَیں نے دیکھا دشمن کے سب آدمی گھات میں آچکے ہیں لانس نائیک فضل حسین کو لائٹ مشین گن دے کر دو آدمیوں کے ساتھ جنگل سے دشمن کے واپس جانے والے راستے پر پُل کے نزدیک بھیج دیا۔ جونہی وہ پوزیشن میں پہنچا تو مَیں نے فائر کردیا فضل حسین نے لائٹ مشین گن سے تین آدمی گرائے باقی ہندو دریائے بنیار کے کنارے کی طرف بھاگے۔ میں دس جوانوں کو لے کر ان کے اُوپر پہنچ گیا۔ وہ دریا کے کنارے بڑے بڑے پتھروں میں

چھپ رہے تھے مَیں نے کوشش کی کہ ان کو زندہ پکڑوں مگر میرے چہرے پر ایک گولی آلگی۔
(جس کا نشان اب بھی میرے چہرے پر بائیں طرف نمایاں ہے اور جب بھی کوئی اس کے بارے
میں پوچھتا ہے تو مجھے وہ تمام واقعہ یاد آجاتا ہے) پھر میں نے اپنے ساتھی نائیک معروف اور کیپٹن
خُداداد کو آواز دی کہ پٹی باندھو۔ فارغ ہونے پر مَیں نے دیکھا کہ وہ سب ختم ہو چکے تھے۔
فوراً مَیں نے آدمیوں کو کنٹرول کیا اور لاشوں کی تلاشی لی۔ اور ہتھیار جمع کر کے فاتحانہ انداز
میں دریائے بنیار کو عبور کر کے دشمن کے امدادی دستے کے انتظار میں مخالف سمت میں گھات
لگائی۔ اس دستے میں میجر مینن ملٹری کراس کے علاوہ جو مدراس سے تبدیل ہو کر بٹالین کی کمان
لینے آیا تھا۔ ایک کیپٹن ایک صُوبیدار اور باقی آٹھ جوان تھے۔ اس واقعہ کا مختصر سا حال
جنرل کول نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دن جنرل تھمیا اور
جنرل کول سری نگر سے اوری جاتے ہوئے وہاں سے گزرے تھے اور یہ گشت ان کی حفاظت
کے لیے بنیار کی وادی کی طرف بھیجی گئی تھی۔ جنرل کول کی جیپ کو آدمی نے کھڑا کیا اور اس واقعہ کا
حال اسے بتایا۔ اسی دن مورخہ ۲۶ اپریل شام کے وقت چند آدمی لاشوں کی تلاش میں اسی جگہ پہنچے جہاں
صبح کو گھات لگائی تھی اور لاشیں دیکھ کر چلے گئے۔ فاصلہ ہونے کی وجہ سے میں نے کوئی کارروائی نہ کی
ایک پارٹی گائیڈ کے ساتھ نوشہرہ بھیج دی گئی۔ اور مَیں دو جوانوں کے ساتھ ایک ہلکی مشین گن
کے ساتھ وہاں ہی دشمن کی کارروائی کا انتظار کرتا رہا۔ ۲۷ اپریل کو تقریباً ۸ بجے پوری بٹالین
اس علاقے میں آگئی دو کمپنیاں کھلی ترتیب میں دریا عبور کر کے میری طرف بڑھنے لگیں مَیں نے
خود لائٹ مشین گن کا فائر کھول دیا۔ دونوں کمپنیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے
لگے۔ کافی انتظار کے بعد دونوں کمپنیاں اسٹریچروں پر لاشیں لے کر واپس چلی گئیں قریباً ۱ بجے
تک پُوری پلٹن اس علاقے سے نکل گئی۔ شام کو دوسری پارٹی آئی ان کا آپریشن بھی کامیاب
رہا۔ دوبارہ منصوبہ بندی کی گئی کہ آئندہ کیا ہونا چاہیئے رات کو مجھے تکلیف زیادہ ہو گئی اس وقت
میں صرف دُودھ پی لیتا تھا لیکن منہ میں کوئی چیز نہیں ڈال سکتا تھا۔ میرا مشن پُورا ہو چکا تھا۔

چنانچہ میں نے واپس آنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن جوانوں کا شدید اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ اس لیے مجھے ایک دن اور ٹھہرنا پڑا۔ اور سب جوانوں کا حوصلہ بڑھاتے رکھا۔ ۲۹ اپریل ۱۹۴۸ کو میں واپس اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچا قیدی ہتھیار اور شناختی کاغذ کمانڈنٹ کے حوالے کیے۔ مجھے کرنل (نوشیرواں) شام کو ایبٹ آباد لے آئے اور سی ایم ایچ میں داخل کرا دیا۔ دس دن کے بعد میں ٹھیک ہو کر یونٹ میں واپس آ گیا کالم سے واپسی پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر ضروری ہے۔ قبرستان سے گزرتے ہوئے ایک بزرگ سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے السلام علیکم کہا اور ساتھ ہی مبارک باد دی۔ میں نے جواب میں وعلیکم السلام کہا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے انھیں نہیں دیکھا بزرگ سفید کپڑوں میں ملبوس تھے اور سیاہ داڑھی تھی۔ ۲۶ اپریل ۱۹۴۸ کو میں گھات میں زخمی ہوا تھا۔ ۲۹ اپریل تک بہت سے آدمی آ ملے لیکن کبھی کسی نے مبارک نہ دی تھی۔ اس مبارکباد کو میں نے تائید غیبی سمجھا کشمیر میں جہاد برحق تھا۔ اس لیے میرے دل کو بڑا اطمینان حاصل ہوا۔ اور اللہ تبارک تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ایثار و قربانی کے جذبہ کو قبول فرمایا۔

بھارتی فوج کے آنے کے بعد پاکستانی فوج کی یہ پہلی نمایاں کامیابی تھی جس پر پلٹن میں بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا اور کرنل نوشیرواں نے میرے لیے ستارۂ جرأت کی سفارش کی۔ مئی ۱۹۴۸ میں بھارتی فوج نے دوبارہ اوڑی اور ٹیٹوال محاذ پر حملہ کیا۔ اور یونٹ ٹیٹوال محاذ پر بھیجا گیا جس میں میں نے بہت سے مشن کیے۔ اور کامیاب رہا۔ اس میں کافر کھنڈ پر قبضہ بھی شامل ہے۔ چینج اور اخروٹ والی ٹیکری کے حملوں میں دوسرے جوانوں کے ساتھ پھر زخمی ہوا۔ اس حملے میں ایک جوان شہید ہو گیا ان دو حملوں میں میری امتیازی کارکردگی پر ایوارڈ کے لیے دو دفعہ تحریری سفارش بھیجی گئی چینج کا حملہ ایک بہت مشہور معرکہ تھا جس میں پلٹن نے ریوالی کا بگل بجا کر حملہ کیا اور کامیاب ہوئی یہ حملہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان شکار کو جگا کر شکار کرتا ہے۔ جیسا کہ ۱۶/۴ پنجاب رجمنٹ نے کر دکھایا پھر جس طرح اور جن حالات میں

کشمیر میں فائر بندی ہُوئی وہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ بہرحال جو کام ہمارے ذمے تھا وہ ہم نے دل وجان سے کیا۔

میرے ستارۂ جرأت کے کاغذات کچھ قانونی موشگافیوں کی وجہ سے التوا میں پڑے رہے۔ آخر کار حکام اعلیٰ کے سامنے جون ۱۹۵۱ میں پیش ہُوئے۔ اور ۴ ار دسمبر ۱۹۵۷ کو اعزاز کی عطائیگی کا اعلان ہُوا۔ الحمدللہ۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

۱۹۴۸ کے کشمیر آپریشن میں جمعدار سید اکابر حسین میجر محمد اکبر خان کے شان نامی دستے میں ایک پلاٹون کے کمانڈر تھے۔ اور ان کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی تھی کہ وہ بنیار، نوشہرہ اور پٹیاگھنڈ کے علاقوں میں دشمن کے رسد اور حمل ونقل کے رستے کو اپنا نشانہ بنائیں۔

۲۴ر اپریل ۱۹۴۸ء کو جمعدار اکابر حسین کو حکم دیا گیا کہ وہ دو پلاٹونوں سے مدانہ کے پولیس اسٹیشن پر قبضہ کرلیں۔ اُنھوں نے صرف ایک پلاٹون سے کامیاب کارروائی کی اور اسی روز پانچ بجے تک مدانہ کے پولیس اسٹیشن پر قبضہ کرلیا اور ایک پولیس افسر اور تین کانسٹیبلوں کو حراست میں لے لیا۔ اس مشن کو مکمل کرنے کے فوراً بعد جمعدار اکابر حسین سے کہا گیا تھا وہ اسی روز رات کے آخری پہر یعنی ۲۵ر اپریل کو صبح ۴ بجے پرنیاں کے علاقے میں دشمن کے ایک لڑاکا پٹرول پر شبخون ماریں اس مشن کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے ۱۶ میل کا دشوار گزار راستہ راتوں رات بغیر ایک لمحے آرام کئے کم سے کم وقت میں طے کیا اور مقررہ وقت ۴ بجے رات سے پہلے اپنی پلاٹون کو دشمن کے پٹرول کی گھات میں لگا دیا۔ ۲۵ر اپریل کو صبح ۸ بجے دشمن کا پٹرول نمودار ہُوا۔ تو جمعدار اکابر حسین کی پلاٹون نے اس پر کمین گاہوں سے حملہ کیا۔ اور ایک ایم سی میجر ایک کیپٹن ایک جے سی او، ۸ او آرز کا کام تمام کرڈالا

اس مشن کے شروع ہی میں جمعدار اکابر حسین کے چہرے پر گولی لگی تھی۔ اس کے باوجود وہ

اپنے جوانوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے تاآنکہ دشمن کے پٹرول کا مکمل طور پر صفایا کر دیا گیا۔ اس معرکے کے بعد اسی دن اور اسی علاقے میں اکابر حسین اپنی پلاٹون کو دائیں بازو پر لے گئے اور دشمن پر جو اپنے آدمیوں کی لاشیں اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا ایک بار پھر چھاپہ مارا اور دشمن کو کافی جانی نقصان پہنچایا۔ اس دلیر جے۔ سی او کے جرأت مندانہ ایکشن کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دشمن نے دو کمپنیوں پر مشتمل اپنا لڑاکا پٹرول اس علاقے میں بھیجا جو دشمن کے ایک پکڑے ہُوئے پیغام کے مطابق ۷ مئی ۱۹۴۸ تک یہاں مصروف کار رہا۔

اس تمام آپریشن میں اس جے سی او نے بڑی جرأت سے کام کیا اور اعلیٰ درجہ کی قائدانہ صلاحیت کا ثبوت دیا اکابر حسین کے کردار، شخصیت اور جوش و جرأت کی وجہ سے انکے جوان صحیح معنوں میں ان کی عزت کرتے تھے ان کی جدوجہد اور کوششوں کے بغیر شان دستے کو وہ کامیابیاں نصیب نہ ہوتیں جو اس نے حاصل کیں۔ اس تمام بے حد ممتاز کارکردگی کیلئے جمعدار اکابر حسین کے لیے ہلالِ جرأت کے اعزاز کی سفارش کی جاتی ہے۔

نوٹ : یہ سفارش جُون ۱۹۵۱ میں کی گئی جب کہ ستارہ جرأت عطا ہونے کا اعلان ۱۴ دسمبر ۱۹۵۷ کو ہُوا۔

او، ٹی، ایس کوہاٹ

آخر کار اللہ تعالیٰ کے کرم سے میں کمیشن کے لیے منتخب ہُوا۔ اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ کو او، ٹی، ایس کوہاٹ سے ۵۰۰ کیڈٹوں میں نمبرون پوزیشن پر پاس آؤٹ ہوا۔ پاسنگ آؤٹ پریڈ کو کمان کرنے کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہُوا۔ ۱۵ اکتوبر کو میں انفنٹری اسکول گیا جہاں سے کورس میں امتیازی کارکردگی کے لیے سلامت علی شاہ کپ حاصل کیا۔

ایف آر

کورس کے بعد مجھے فرنٹیئر فورس سے وابستہ کیا گیا۔ یکم فروری ۱۹۵۰ کو مَیں نے

۴/۱۳ ایف ایف آر سے اپنے کمیشنی کیرئر کا آغاز کیا۔ اور کمپنی کمانڈر تعینات ہُوا۔ دو ہفتے بعد، ڈویژن کی ایک مشق ہُوئی جس میں میری کمپنی کو حملے دفاع اور گھات لگانے کے تین مشن ملے جو بہت کامیاب رہے۔ جب مشق کے منصفین نے کمپنی کے اوّل آنے کا اعلان کیا تو کمانڈنگ آفیسر نے ۲۴ فروری ۱۹۵۰ سے مجھے لیفٹیننٹ بنا دیا۔ ایک سال بعد جولائی ۱۹۵۱ کو کیپٹن بنا اور پلٹن کے ساتھ آپریشن فلیپ 1951 میں شامل ہُوا۔

بوائز کمپنی کی کمان

پھر ۱۳ ایف ایف آر سنٹر ایبٹ آباد میں مَیں نے ۱۴ فروری ۱۹۵۲ سے ۱۶ فروری ۱۹۵۴ تک بوائز کمپنی کی کمانڈ کی اور کچھ عرصہ ایجوٹینٹ بھی رہا۔ بوائز کمپنی کی کمان کے دوران میں لڑکوں کا کردار بنانے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے میں کوشاں رہا۔ اور نظم و ضبط کو اہمیّت دی۔ جسمانی تربیّت کے لیے پی ٹی کھیلوں پر زور دیا۔ تعلیمی بہتری کیلئے سکول پیریڈ زیادہ کر دیئے۔ دماغی نشو و نما کے لیے پیشہ ورانہ ادبی اور مذہبی کتابیں مہیا کی گئیں۔ انہی میں سے کمانڈر بنائے گئے تاکہ وہ آئندہ زندگی میں اچھے لیڈر ثابت ہو سکیں۔ الحمدللہ کہ اس وقت کے میرے بہت سے طلبا آج جے سی اوز کے عہدے تک پہنچ گئے ہیں۔ اور کچھ پلٹنوں میں صُوبیدار ہو گئے ہیں کھیلوں میں بہت سے آرمی اور انٹر سروسز تک گئے ہیں۔ ان کو ایسے درجوں پر دیکھ کر مُجھے خوشی ہوتی ہے مَیں ان پر فخر کرتا ہوں کہ انھوں نے لڑائی میں بھی کارہائے نمایاں سر انجام دیئے اور اچھے لیڈر ثابت ہُوئے۔

۴/۱۳ ایف ایف آر

۱۶ فروری ۱۹۵۴ سے میں نے دوبارہ اپنی پلٹن ۴/۱۳ ایف ایف آر کے ساتھ

نوکری شروع کی اور کمپنی کمانڈری کے علاوہ پلٹن کی اسپورٹس آفیسری بھی بڑی کامیابی سے ادا کرتا رہا۔

مئی ۱۹۵۹ء میں میجر بنا اور کمپنی کی کمان کرتا رہا۔ ستمبر ۱۹۶۰ سے جولائی ۱۹۶۲ تک پہلے ایک سال پلٹن کے ساتھ اور جولائی ۱۹۶۱ کو سکاؤٹس میں تعینات ہونے پر باجوڑ سکاؤٹس کے ساتھ دیر باجوڑ آپریشن میں حصہ لیا۔ باجوڑ سکاؤٹس میں آپریشن ونگ کی کمان کی۔ جولائی ۶۲ میں ژوب ملیشا فورٹ سنڈیمان تعینات ہوگیا اور ۲؍ جنوری ۱۹۶۵ء تک وہاں رہا۔ ۱۹۶۴ کے قلات آپریشن میں سکاؤٹس کنٹیجنٹ کی کمان کی ۱۹۶۴ ہی میں افغان پاونڈ آپریشن میں حصہ لیا اور ان کو پاکستان میں آنے سے روکنے کے لیے ایک موزوں پوزیشن حسین نکہ میں فائرنگ کے دوران پوسٹ بنائی جس سے پاوندوں کو کنٹرول کیا گیا یہاں پہلے سکاؤٹس کا نقصان ہوچکا تھا۔ ۲ جنوری ۱۹۶۵ کو پلٹن میں، جواب ۹ ایف ایف آر ہے' میں نے رپورٹ کی۔ میں کمپنی کمانڈر اور ایجوٹینٹ کی ڈیوٹی پر فائز ہوا اپریل ۱۹۶۵ میں پلٹن کے ساتھ گوجرانوالہ گیا۔

جنگ ستمبر ۱۹۶۵

یکم ستمبر ۱۹۶۵ کو ۱۱ کیولری کے چھمب کے حملے میں میری کمپنی ہراول دستوں میں شامل ہوئی۔ ۸ ستمبر کو کمپنی کو واپس لاکر چونڈا محاذ پر پلٹن کے ساتھ ملا۔ میری کمپنی ڈوگری سے ظفروال تک دفاعی کام میں لگائی گئی یہ مشن ۹ ستمبر اور ۱۰ ستمبر تک پورا کیا اور ۱۰-۱۱ ستمبر ۱۹۶۵ کی آدھی رات کے بعد گڈگور میں دفاعی پوزیشن کا مشن ملا۔ ۱۱ ستمبر صبح بھارتی فوج نے حملہ شروع کر دیا میری کمپنی کی پوزیشن پر آرٹلری فائر رات کے دو بجے سے شروع ہوگیا تھا صبح آٹھ بجے، ۱۷ پونا ہارس کے ایک سکواڈرن نے میری کمپنی پر حملہ کر دیا۔ ہم نے دشمن کے تین ٹینک برباد کئے اور اس کا حملہ پسپا کر دیا اس حملے میں میرے چھ جوان شہید اور تین زخمی

ہُوئے۔ اس کے بعد میری پوزیشن پر شام ۵ بجے تک تھوڑے تھوڑے وقفے بعد فائرنگ ہوتی رہی۔ میرا ایف او لیفٹیننٹ قدوس مرزا زخمی ہو چکا تھا۔ اسے مَیں نے اپنے مورچے میں رکھا اور رات کو پیچھے بھیج دیا۔ اس حملے کے روکنے سے میری پلٹن سرپرائز حملے سے بچ گئی کور کمانڈر اور ڈویژن کمانڈر کو اس سیکٹر کو ری انفورس کرنے کے لیے ایک دن مل گیا۔ ورنہ بھارتی فوج اپنے مشن کے مطابق گوجرانوالہ تک پہنچ جاتی۔ شام کو مَیں نے پلٹن کے ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ دی اس واقعہ کو سنکر اور مجھے دیکھ کر سب خوش ہُوئے۔ چونکہ اس عرصہ میں چوبارہ پر

دشمن کی انفنٹری جمع ہو رہی تھی اس لیے میری پلٹن کو واپس آنے کا حکم ملا۔ شہیدوں کو دفن کرنے کے بعد جب میں فلورا جنکشن پہنچا تو بھارتی فوج وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ میرے ساتھ ایک حوالدار بھی تھا مگر وہ علیحدہ ہو گیا اور میں اکیلا گھات میں پھنس گیا آدھی رات ہو چکی تھی دشمن نے مجھے دو دفعہ چیلنج کیا میں نے جواب میں "اپنا" کہا اور پورے بھروسے کے ساتھ ان کے سامنے سے گزر گیا۔ بعد میں دشمن کو پتہ چلا تو فائرنگ شروع کر دی لیکن میں رحمتِ الٰہی کی پناہ میں خیر و عافیت کے ساتھ اپنی دوسری

دفاعی لائن چونڈہ میں پہنچ گیا اور دوسرے دن پلٹن سے مل گیا اس لڑائی میں میرے چھ جوان شہید ہوئے تین زخمی ہُوئے۔ میری کمپنی کو پسرور کے دفاع میں لگا دیا گیا۔ گڈ گور کے سب شہیدوں کو لڑائی کے بعد فلورا گڈ گور سڑک کے نزدیک دفن کیا گیا اور ان کی یادگار بنائی گئی۔ ان شہیدوں کے خُون سے مُلک اور پلٹن بچ گئی۔ ان کی قربانی رائیگاں نہیں گئی ان کو ایوارڈ دینے کے لیے سفارش کی گئی۔ لیکن صرف سپاہی یونس کو تمغۂ جرأت ملا۔ اس واقعہ کے بعد اپنی ۲۵ کیولری اور دشمن کی پونہ ہارس میں وائرلیس پر میرے متعلق پیغام رسانی ہوتی رہی۔ میری ایک ڈائری رہ گئی تھی جو پونہ ہارس کے کمانڈنگ آفیسر جس کو دیر چکر اسی آپریشن میں ملا تھا کا ٹینک ہٹ ہونے پر ۲۵ کیولری والوں نے مجھے واپس کر دی تھی۔ ۲۲-۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ کی رات کو میں نے

ڈوگری کا علاقہ اپنی کمپنی کو پوزیشن میں لگا کر قبضے میں لے لیا۔ رات کو سیز فائر ہو چکا تھا۔ صبح سویرے جب بھارتی فوجیوں نے ہمیں اس علاقے میں دیکھا تو ان کا کمانڈر سفید جھنڈا لہراتے ہوئے میرے پاس آ گیا اور کہنے لگا آپ سیز فائر کے بعد یہاں آئے ہیں میں نے جواب میں یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا کہ تم مجھے اس پوزیشن میں دیکھ رہے ہو یہ میرا علاقہ ہے اس طرح میں نے بہت سے گاؤں اور فصلیں بچا لیں۔

لڑائی کے بعد جب میں نے ۱۱ ستمبر کو اپنی لڑائی کی پوزیشن پر شہیدوں کو دفن کرنے کا ثبوت دیا تو سب حیران ہو گئے اور مجھے مبارک باد دینے لگے اس معرکہ کے لیے بھی ایوارڈ کیلئے سفارش کی گئی۔ زبانی بھی بہت تعریف ہوئی اگرچہ ایوارڈ نہ ملا لیکن مجھے خوشی ہوئی۔ کہ میں نے فارمیشن کمانڈر اور باقی افسروں کے شکوک شہیدوں کی لاشیں نکال کر دُور کر دیئے۔ اور اس حملہ کو ثابت کر دکھایا۔ میں نے اسی بٹالین کی کمانڈ تین ماہ تک کی اس کے بعد مجھے سینئر ٹیکنیکل کورس کے لیے کوئٹہ بھیج دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۶۶ میں کورس مکمل کرنے کے بعد ۱۹ ایف ایف رجمنٹ میں تعینات ہُوا۔ اور ۱۷ فروری ۱۹۶۷ تا ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ء اس کی کمان کی اس دوران پلٹن بنوں میں اور جولائی ۱۹۶۸ تا ستمبر ۱۹۷۰ ڈھاکہ میں رہی۔ پلٹن دوبارہ منظم ہُوئی جس میں ریکروٹ سابق فوجیوں کی جگہ بھرتی ہُوئے۔ ان کو ٹریننگ دی گئی ڈھاکہ میں انٹرنل سکیورٹی ڈیوٹی پر ڈھاکہ شہر اور ضلع اس پلٹن کو دیا گیا اس کے بعد ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ سے میں سب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تعینات کیا گیا اس دوران میں نے بہت سے فلاحی کام کیے اور مظلوموں کی مدد کی۔ شہر میں کرفیو کے دوران فائر کے بغیر حالات پر قابو پا لیا گیا۔ مئی ۱۹۶۹ء میں سائیکلون آ جانے کی وجہ سے پلٹن نے راتوں رات تین ہزار کے قریب لاشیں اور زخمی جائے حادثہ سے نکالیں۔ جس کی وجہ سے پلٹن میرے نام سے مشہور ہُوئی۔ جنرل مظفر الدین نے اس کا انکشاف پلٹن کے دربار میں کیا اور جنرل ہیڈ کوارٹر میں سینئر افسروں سے خطاب کے دوران بھی اس کا تذکرہ کیا ستمبر ۱۹۶۹ء میں پلٹن کو ایمرجنسی موومنٹ دیا گیا ڈھاکہ سے رنگ پور تک ریل مووہُوئی اور دریائے جمنا کو عبور کرنے کے لیے جہاز (فیری) کا استعمال

ہُوا۔ ۴۴ میل کا مارچ رنگ پُور سے لے کر بوگرہ تک تین رات میں مکمل کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد یکم نومبر ۱۹۶۹ء کو میں نے ایک سازش کا پتہ چلایا جس کے تحت بہاریوں کے علاقے میر پور اور محمدؐ پور میں قتل عام ہونا تھا اور اس کو بروقت کنٹرول کیا اس خطرناک سازش کے بارے میں۔ مَیں نے صدر گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو بروقت رپورٹ کی جو بعد کو صحیح ثابت ہُوئی۔ اس سازش کی ناکامی کی وجہ میرا بذات خود وہاں موجود رہنا اور حالات کا جائزہ لیتے رہنا تھا۔

تمغۂ قائدِ اعظم

پلٹن کے ان سب کارناموں کے صلے میں مجھے تمغۂ قائدِ اعظم دیا گیا۔ جو ۱۴ اگست ۱۹۷۰ کے پاکستانی گزٹ میں شائع ہُوا ملٹری سیکرٹری جنرل ابراہیم اکرم جب ڈھاکہ میں دورہ پر آئے تو انھوں نے مجھ سے تعیناتی اور تبادلے کے بارے میں گفتگو کی کیونکہ میرا عرصہ تعیناتی کمان زیادہ ہوچکا تھا۔ میں نے جواب میں ان سے درخواست کی کہ میں پلٹن کو مشرقی پاکستان لایا تھا اور خود واپس لے جانا چاہتا ہوں پھر انھوں نے میری پسند پوچھی تو مَیں نے جواب دیا کہ یہ آپ کا کام ہے مَیں سپاہی ہوں مُجھے جو کام ملا اسی جذبہ سے سرانجام دوں گا۔ مَیں نے تو ملک وملّت کی خدمت ہی کرنی ہے پلٹن کے ساتھ سیالکوٹ پہنچنے پر مجھے انڈس رینجرز حیدرآباد تعینات کیا گیا چند ماہ بعد مجھے چناب رینجرز سیالکوٹ بھیج دیا گیا۔

جنگ دسمبر

۱۹۷۱ کی لڑائی سے دو ہفتہ قبل مجھے ڈیزرٹ رینجرز میں تعینات کیا۔ بہاولپور پہنچنے پر فورٹ عباس سیکٹر کا دفاع کرنے کا مشن دیا گیا میرے پاس کوئی تربیت یافتہ آدمی

نہ تھے صرف ہیڈکوارٹر کے آدمی۔ بینڈ سگنل اور ایم ٹی والوں کو اکٹھا کرکے فورٹ عباس
پہنچ گیا ایک انفنٹری کمپنی بریگیڈیر (بعد میں جنرل) رحمت علی شاہ بخاری مرحوم سے مانگ کر
حاصل کی جسے میں رات کو بارڈر کے ساتھ گاڑیوں میں پھراتا رہا اور ان کو پوزیشن میں لگا
دیتا۔ دشمن کو خطرہ ہوا کہ یہ فورس انوپ گڑھ پر حملہ کرنے آئی ہے۔ اس لیے وہ دن
میں بار بار ہوائی حملے کرواتا رہا جب خطرہ بڑھ گیا تو فورٹ عباس
کی اہمیت کو سمجھتے ہُوئے ایک کمپنی آر۔ ایس اور ایک پلٹن فورٹ عباس میں بھیج دی گئی
لڑائی ختم ہونے تک اپنے ہیڈکوارٹر کے ساتھ اسی پوزیشن میں رہا۔ لڑائی کے بعد میں
نے کور کمانڈر اور ڈویژن کمانڈر پر فورٹ عباس کی سیاسی، معاشی اور دفاعی اہمیت واضح کی
جس کے لیے اب کافی انتظام کیا گیا ہے۔ لڑائی کے بعد پلاننگ میں اس سیکٹر کمانڈر کی حیثیت
سے کانفرنسوں میں حصّہ لیا اور اپنے مفاد میں فیصلے کرائے۔ اگست ۱۹۷۲ میں واپس ہیڈکوارٹر
آیا اور رینجرز کے کاموں میں مشغول رہا۔ چوکیاں اور ہیڈکوارٹر تعمیر کرائے اور یکم جولائی
۱۹۷۴ کو کمان چھوڑی۔ ۲۰ اگست ۱۹۷۴ کو میں سیکٹر کمانڈر نیشنل گارڈ جانباز فورس آزاد کشمیر
میں تعینات ہُوا اور مظفر آباد میں ہیڈکوارٹر بنایا۔ جانبازوں کی ٹیمیں بنائیں ٹریننگ دی
اور جذبہ جہاد اور شہادت کی اہمیت پر زور دیا۔ جس کا آزاد کشمیر میں اچھا ردِعمل
ہُوا۔ لوگوں نے ٹریننگ کے لیے درخواستیں دینی شروع کر دیں۔ یہ اسکیم جانفشانی سے
چلائی گئی۔ جس کے اچھے نتائج نکلے۔ میں یکم اکتوبر ۱۹۷۷ء سے تین سال سیکٹر
کی کمان کرنے کے بعد بریگیڈیر کی پنشن اور رینک کے ساتھ ریٹائر ہُوا۔ ریٹائر ہونے پر
۱۹ ایف ایف رجمنٹ کا کرنل آف دی بٹالین بنایا گیا یہ اعزازی خدمت میں ابھی تک انجام
دے رہا ہوں۔

مصنّف کا تبصرہ

بریگیڈیئر سیّد اکابر حسین ستارۂ جرأت کی داستان حیات قطرہ سے گہر ہونے تک کی داستان ہے۔ یہ مسلسل اور پُر عزم جدوجہد کی ولولہ انگیز کہانی ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت بھی ہے کہ

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد اقبال قریشی

امتیازی سند، ای بی آر

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد اقبال قریشی امتیازی سند

حسب و نسب

مثل مشہور ہے کہ جیسا گل ہوتا ہے ویسی بو ہوتی ہے آدمی پر اس کی خاندانی روایات اور ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے پہلے میں اپنے آباؤ اجداد اور خاندان کا تعارف کراتا ہوں۔ ہم نسلاً ہاشمی قریشی ہیں۔ اس نسبت نے ہمارے خاندان کو ہمیشہ سنبھالا دیا ہے مائیں بچوں کو بار بار یاد دلاتی ہیں۔ بیٹا تم ہاشمی قریشی ہو۔ میں بھی اپنے بچپن میں یہی سنا کرتا تھا چنانچہ اب بھی جب کوئی قدم غلط اٹھنے لگتا ہے تو ضمیر کہتا ہے۔ اپنے آپ کو قریشی کہتے ہو۔ کچھ تو خیال کرو۔

اس نسبت کے بعد ہمارا خاندانی طرۂ امتیاز رزم آرائی تھے۔ سپاہ گری ہمارے خون میں ہے۔ میرے پڑدادا اللہ دین، حوالدار تھے۔ والد، محمد خان صوبیدار ہو کر ریٹائر ہوئے۔ میرے بڑے بھائی فضل حسین قریشی بھی صوبیدار رہے۔ دوسرے بھائی بشیر احمد حوالدار تھے۔ تیسرے بھائی سکندر حیات ائرفورس میں افسر ہیں۔ میرے دونوں چچا لال خان اور غلام نبی خان نے بھی صوبیدار کی حیثیت سے فوج کی خدمات انجام دی ہیں۔ میجر عزیز بھٹی شہید نشانِ حیدر، میرے چچا زاد بھائی تھے۔ اس تفصیل

سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میں نے کس ماحول میں پرورش پائی ہوگی۔

ابتدائی زندگی اور تعلیم

میں اپنے آبائی گاؤں ڈھومیانہ چک ضلع گجرات میں فروری کی ۸ تاریخ ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوا۔ یہ گاؤں نالہ بھمبر کے دھانے پر واقع ہے۔ مجھے بچپن کی کوئی خاص بات یاد نہیں علاوہ اس کے کہ میں بچپن میں حد درجہ صفائی پسند تھا۔ خود بھی صاف ستھرا رہتا تھا۔ اور اپنے گھر بار کو صاف ستھرا رکھنے کی اپنے طور کوشش کیا کرتا تھا میری اس عادت سے سب گھر والے واقف تھے۔ اور اس کی قدر کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے چھٹی پر آنے کا دن ہوتا تھا تو گھر والے گھر کی زیادہ دیکھ بھال شروع کر دیتے تھے۔ والد کہا کرتے۔ اقبال گھر آ رہا ہے۔ صفائی ستھرائی کر دو ورنہ ہر چیز اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔ اسی طرح مجھے اُجلے بے داغ کپڑے پہننے کا بھی جنون سا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن کپڑے بدلتا تھا۔ اور بستر پر شکن برداشت نہیں ہوتی تھی بچپن میں مجھے پتنگ بازی کا شوق تھا۔ پیچ لڑانے کی مہارت نہیں تھی۔ بس پتنگ اڑانے میں مزہ آتا تھا۔ شروع کی چار جماعتیں میں نے ڈھومیانہ چک میں پڑھیں۔ جماعت پنجم اسلامیہ ہائی اسکول لالہ موسیٰ سے پاس کی۔

ملٹری کالج میں ایک نئی زندگی کا آغاز

ملٹری کالج میں ۱۹۳۶ء میں، میں چھٹے درجے میں داخل ہوا۔ اور ۷۶۴ کالج نمبر ملا۔ پہلا ہاؤس اسکین ہاؤس تھا۔ اور ولایت شاہ صاحب ہاؤس ماسٹر تھے۔ کالج میں میرا شمار اوسط درجے کے خاموش طبع لڑکوں میں تھا۔ ہاکی شوق سے کھیلتا تھا۔ اتھلیٹکس سے بھی دلچسپی تھی۔ لیکن ان میدانوں میں، میں نے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی۔ البتہ پڑھائی کا زیادہ شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں میں کالج کے تیز اور بہت ذہین لڑکوں کے ہم قدم رہا۔ خوش قسمتی سے

میں کالج کے ان چند لڑکوں میں سے تھا جنھوں نے چار سال میں اسپیشل کیا۔ ان میں سے دو گل خاں اور صاحب زادگل تھے جو ۱۹۶۵ء میں کھیم کرن کے محاذ پر داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے اور ستارہ جرأت کے اعزاز سے سرخ رو ہوئے۔ آرمی اسپیشل کے بعد اسپیشل آرمی کلاس میں ایک سال صاحب زادگل اور میں نے ایک ساتھ گزارا۔ یہ اسپیشل آرمی کلاس ایک خاص چیز تھی۔ کمانڈانٹ ہمیں پری کیڈٹ ٹریننگ کے لیے کیڈٹ کالج نوگانگ بھیجنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ہمیں تیار کرنے کے لیے یہ ایک کلاس کھولی گئی تھی۔ اس میں تین چار لڑکے تھے۔ کوئی رسمی پڑھائی نہیں ہوتی تھی۔ ایک کمرے میں ایک میز پر اخبارات، رسالے پڑے رہتے تھے۔ ریڈیو بھی موجود تھا۔ ہمارا کام یہ تھا اخبار رسالے دیکھیں اور لائبریری سے کتابیں لے کر پڑھیں۔ اور مفصل مضمون لکھیں اور آپس میں بحث مباحثہ کریں۔ یہ سارا کام انگریزی میں ہوتا تھا کبھی کبھی کوئی استاد چھٹی پر ہوتا یا بیمار ہوتا تو ہمیں جونئر کلاس کو پڑھانے کا موقعہ ملتا تھا۔ ان تمام مصروفیتوں سے ہمیں آگے چل کر بہت فائدہ ہوا۔

کالج میں پڑھائی کے علاوہ کسی اور شعبے میں، میں کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں کرسکا۔ البتہ خود اعتمادی اور بنیادی قیادت کالج ہی سے سیکھی۔ کالج کے دنوں میں میرا زیادہ سے زیادہ عہدہ جونئیر پریفکٹ کا تھا۔

کیا کھویا اور کیا پایا

کالج کی زندگی اس زمانے میں اتنی زیادہ منظم تھی اور سخت کوشی پر اتنا زیادہ زور تھا اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی اتنی سختی سے جانچ پڑتال کی جاتی تھی کہ میرا خیال ہے کہ جو اس ٹریننگ کو خوش دلی اور کامیابی سے جھیل گیا وہ زندگی میں کبھی ہار نہیں کھا سکتا۔ سینئر لڑکوں کے ہاتھ میں ضرورت سے زیادہ طاقت ہونے کی وجہ سے یا اس کے غلط استعمال سے کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوگئی تھیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس تربیت نے ہمیں محنت اور دیانت داری

سے اپنی ڈیوٹی کو سرانجام دینا سکھایا۔ اور سخت کوش بنایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی کالج کی دین ہے۔

ایک یادگار واقعہ

اس سے پہلے کہ کالج کے زمانے سے آگے کی داستان سناؤں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک بظاہر معمولی سے واقعہ کا ذکر کروں جس نے میری زندگی میں ایک موڑ کا کام کیا۔ ہوا یوں کہ جب میں کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا تو میرا دل بالکل نہیں لگتا تھا۔ بے طرح گھر یاد آتا تھا۔ اور اکثر رویا کرتا۔ یہ خبریں جب گھر پہنچیں تو والدین بہت پریشان ہوئے ایک روز والد صاحب آئے پہلے تو تسلی دی اور پھر دیر تک سمجھاتے رہے، ان کے کچھ الفاظ مجھے اب بھی یاد ہیں۔ کہنے لگے بیٹا تم فوجی کے بیٹے ہو۔ تمہارے دادا پردادا فوجی تھے۔ فوجی کچے دل کے نہیں ہوتے انھیں تو جان تک دینی ہوتی ہے۔ بیٹے بس ایک بار تم ارادہ کر لو، مجھے یہیں رہنا ہے۔ اور پڑھنا ہے پھر ایک فوجی کی طرح ڈٹ جاؤ یاد رکھو جو ارادے کا کچا ہو وہ پکا فوجی نہیں بن سکتا۔ ارادہ انسان کی عزت ہوتا ہے آن ہوتا ہے جوان مرد جان دے دیتے ہیں۔ آن نہیں جانے دیتے۔

غرض یہ والد کی باتوں کا اثر تھا یا والدہ کی دعاؤں کا میں یہاں جم گیا۔ بلکہ زندگی میں جم گیا والد مرحوم کی نصیحت آج میرے لیے اصول زندگی ہے۔ اس وقت سے اب تک زندگی کے ہر مرحلہ میں میری کوشش ہوتی ہے کہ میں کچا ثابت نہ ہوں فوجی زندگی میں بھی میرا شعوری اور لاشعوری اصول یہی تھا۔ جس کارروائی کے لیے مجھے امتیازی سند کے قابل سمجھا گیا۔ اس کی تہہ میں بھی یہی ملک اور اپنی آن کا احساس تھا۔

کچنر کالج نوگانگ سے جنگ ستمبر تک

۱۹۴۳ء میں مجھے چند اور لڑکوں کے ساتھ کچنر کالج نوگانگ سنٹرل انڈیا بھیجا گیا۔

کچنز کالج ایک طرح کا پری کمیشن کیڈٹ کالج تھا۔ کمیشن کے امیدوار پہلے کچنز کالج بھیجے جاتے تھے جہاں انکی تقریباً ایک سال تربیت ہوتی تھی اور اس کے بعد پھر ان کی چھان پھٹک ہوتی تھی۔ جو کیڈٹ کمیشن کے لیے موزوں سمجھے جاتے آئی۔ ایم۔ اے بھیج دیئے جاتے تھے۔ باقی اپنی رجمنٹ میں واپس بھیجدیئے جاتے۔ مجھے بدقسمتی سے پہلی بار یہ پروانہ نہیں ملا اور میں اپنی رجمنٹ جاٹ، رجمنٹ میں بھرتی ہوگیا۔ ۱۹۴۵ء میں برما آپریشن میں حصہ لیا۔ میں ۱۷ ڈویژن میں ۶ جاٹ رجمنٹ کے ساتھ وابستہ تھا۔ اور ۳۔ انچ مارٹر پلاٹون کا کمانڈر تھا۔ پہلے سنٹرل برما کا رخ کیا۔ پھر زنگون پر چڑھائی کی۔ پیگو علیگون اور میچی گولڈ مائن ایریا ان سب علاقوں میں جاپانیوں سے لڑے اور خوب لڑے۔ اور جو ڈیوٹی میرے ذمے تھی اسے میں نے امکانی حد تک کامیابی سے پورا کیا۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد میں جاٹ رجمنٹ کے ساتھ خدمات انجام دیتا رہا۔ ۱۹۴۸ء میں مجھے کمیشن کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ گویا کچنز کالج میں جو ڈور ٹوٹ گئی تھی وہ اب بندھ گئی۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ مجھے کمیشن کالج نے دلایا۔ یہیں کی تعلیم و تربیت میرے کام آئی اور آگے چل کر مجھے اس سے روشنی ملی۔

کمیشن کے بعد

کمیشن کے بعد میں ٹریننگ اور منصبی ذمہ داریوں کے اس دائرے میں چکر لگاتا رہا جس میں سب افسر حرکت کرتے رہے ہیں۔ تاآنکہ ۱۹۶۵ء کی جنگ ستمبر آگئی۔ ۶۵ء میں، میں میجر تھا اور فرسٹ ای پی آر کے ساتھ میں بیدیاں سیکٹر میں لڑ رہا تھا۔ میرے بٹالین کمانڈر لفٹیننٹ کرنل حق تھے۔ اور بریگیڈ کمانڈر نوازش ملک میں اپنی پلٹن کے سب ساتھیوں کے نام تو نہیں لکھ سکتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم سب مل کر اس جذبے سے لڑ رہے تھے جو جنگ ستمبر کے جذبے کے نام سے مشہور ہے۔ دشمن نے اس محاذ پر ۱۶، ۱۷ بھرپور حملے کئے اور ہم نے ہر بار دشمن کے دانت کھٹے کئے۔ اس محاذ پر میری کارکردگی کو سراہتے ہوئے افسران بالا نے مجھے امتیازی سند کا مستحق سمجھا۔ جو کچھ ہم نے مل کر کیا تھا اور اگر اس میں میرا کوئی

خاص حصہ میرے افسروں کو نظر آیا تو میں ان کا ممنون ہوں۔

امتیازی سند کا فرمان

پی اے ۵۸۶۲ میجر محمد اقبال قریشی جنگ ستمبر ۶۵ کے دوران اس کمپنی کو کمان کر رہے تھے جس کے سپرد بیدیاں ہیڈ ورکس کے دفاع کی ذمہ داری تھی دشمن نے یہاں ۶، ۷، ۸، ۹ ستمبر کو متواتر میجر اقبال قریشی کی کمپنی کی پوزیشن پر بڑے بھرپور حملے کیے۔ میجر قریشی نے اپنے غیر متزلزل عزم اور حوصلے سے بیدیاں پر دشمن کے ان تمام حملوں کا جم کر مقابلہ کیا چنانچہ دشمن کو سخت جانی نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔

اگرچہ میجر اقبال قریشی پورے دس دن تک دشمن کے توپ خانے کے فائر، ہوائی حملوں اور بمباری کی زد میں رہے اس تمام عرصے میں بغیر آرام اور نیند کے انھوں نے دشمن کا مقابلہ کیا اور ایک لمحے کے لیے اپنی شگفتہ مزاجی اور حوصلہ مندی میں کمی نہیں آنے دی جس کی وجہ سے ان کے ماتحتوں اور جوانوں کا حوصلہ بہت بلند رہا اور وہ انتہائی مشکل حالات میں پامردی اور استقلال سے لڑتے رہے۔

میجر قریشی کے عزم، حوصلے، جرات، حاضر دماغی، فرض سے لگن اور قیادت کے اعلیٰ مظاہرے کے بغیر، بیدیاں کو دشمن سے بچانا بہت مشکل ہوتا اور اگر بیدیاں ہاتھ سے نکل جاتا تو یہ ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔

اقبال قریشی کی اس امتیازی کارکردگی کے لئے انکو امتیازی سند عطا کرنے کی پرزور سفارش کی جاتی ہے۔

۹ مارچ ۱۹۶۶ء کو امتیازی سند عطا کی گئی۔

ستمبر ۶۵ کے بعد

ستمبر ۶۵ کے بعد میں اپنی یونٹ کے ساتھ مختلف مقامات پر فرائض منصبی ادا کرتا رہا۔ جب مجھے کرنیلی کے عہدے پر ترقی دی گئی تو دسمبر ۷۱ کی جنگ آئی اس وقت میں مجاہد فورس کو کمان کر رہا تھا۔

مجھے خاص طور پر وزیر آباد پُل کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا۔ ویسے جہلم اور راوی کے درمیان کے سارے مجاہد میرے زیر کمان تھے۔ دشمن کی کوشش تھی کہ وہ ان اہم پلوں کو نشانہ بنائے اور ہم تن من کی بازی لگائے ہوئے تھے کہ ان پلوں پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ دشمن کے بیشتر حملے رات کی تاریکی میں ہوتے تھے۔ ایک رات دشمن کے تین جہازوں میں سے ایک تو ہم نے مار بھی گرایا تھا اللہ کا شکر ہے کہ ہم ان پلوں کی حفاظت کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے۔

۱۹۷۲ء میں ریٹائر ہوا اور کچھ کاروبار کچھ کاشت کاری کر کے عزت کی زندگی گزار رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اپنے والدین اور کالج کو دعائیں دیتا ہوں۔

مصنّف کا تبصرہ

کرنل قریشی کی آپ بیتی پڑھ کر مجھے بے اختیار ملٹن کا یہ فقرہ یاد آیا۔ THEY ALSO SERVE WHO STAND AND WAIT کالج میں یا اس کے بعد اقبال قریشی کبھی اس طرح نہیں چمکے کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ انہیں ایک ہی بار چمکنا تھا۔ اور وہ میدان جنگ میں چمکے اور اس چمکنے سے بڑھ کر اور کونسا چمکنا ہو سکتا ہے ان کی کتاب زندگی کا ایک بہت واضح سبق ہے کہ جو بندھ جائے وہ موتی اس لیے ان عام سے اوسط درجے کے انسانوں کا احترام کرنا چاہیے جو جینیئس تو نہیں ہوتے لیکن جن کا کردار بڑا پیارا ہوتا ہے جو وفادار ہوتے ہیں جو جان دینا اور ایثار کرنا جانتے ہیں۔ سبحان اللہ۔

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد حسین ملک

ستارۂ جرأت، پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد حسین ملک

ستارۂ جرأت، پنجاب رجمنٹ

نسلی اور خاندانی پس منظر

ہم قطب شاہی اعوان ہیں ہمارے آباؤ اجداد، محمود غزنوی کے ساتھ ہند کے بتکدے میں اسلام کا چراغ روشن کرنے آئے تھے۔ اس وقت سے ہم کوہستان نمک کے علاقے میں آباد ہیں، اور اسلام اور تلوار سے اپنا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ خاندانی روایت کے مطابق میرے والد ملک فتح خان بھی فوج میں تھے۔ لیکن ابھی میں نو برس ہی کا تھا کہ یکایک ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح ہم بھائی بہنوں کی پرورش کا سارا بوجھ والدہ کے کندھوں پر آن پڑا۔ جو انہوں نے صبر و شکر سے اٹھایا اور حق تو یہ ہے کہ اس ذمہ داری کو اٹھانے کا حق ادا کر دیا۔

گھر میں، میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا شاید اسی وجہ سے اس چھوٹی سی عمر میں مجھے کچھ کچھ احساس ہو گیا تھا کہ گھر کے چھپر کو اٹھانے میں مجھے بھی زور لگانا ہے۔ اب برسوں کے بعد میں اس زمانے کو یاد کرتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ اس کچی عمر میں جو احساس ذمہ داری مجھ

میں پیدا ہوا تھا وہ تمام عمر میرے کام آیا۔ زندگی کے ہر مرحلے میں ۰اس نے مجھے سہارا دیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ بچپن میں جو اثرات میں نے قبول کئے وہ والدہ صاحبہ سے کئے۔ تو بڑی حد تک یہ کہنا صحیح ہو گا۔لیکن پورے طور پر نہیں۔اس لئے کہ شروع کے آٹھ سال تو بہر حال والد کا سایہ مجھ پر موجود تھا ان کے بعد بھی ہمارے گھر کی فضا وہی رہی جو والد نے اپنی زندگی میں پیدا کر دی تھی بچپن میں میں نے جس فضا میں سانس لی اس میں غیرت مندی اور جفاکشی رچی بسی تھی۔ والدہ کی جس خصوصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ان کا صبر و شکر اور استقامت کا رویّہ ہے کتابی علم سے وہ ضرور بے بہرہ ہیں۔لیکن زندگی اور دین کی بنیادی قدروں کا گہرا شعور رکھتی ہیں اب جبکہ آزمائش کا وقت یعنی وہ دور کبھی کا گزر چکا اور اللہ نے ہمیں خوشحالی و فارغ البالی سے نوازا ہے ان کا رویّہ اب بھی وہی شکر الحمدللہ کا ہے۔

جب مجھے کمیشن ملا تھا اس دن بھی اور جب میں میدان کارزار میں سرخ رو ہوا تھا اس وقت بھی غرض کہ جب بھی زندگی میں شادمانی اور کامرانی کا کوئی لمحہ، کوئی موقعہ آتا ہے، تو میرا دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے "محمد حسین۔شکر کر۔ یہ تیری ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے" جب میں یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے زندگی میں حاصل ہوا ہے وہ میری ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے تو محض زبان سے کہنے کی بات نہیں یہ میرے دل کی آواز ہے میں دعا پر خاص طور پر ماں کی دعا کی تاثیر پر گہرا یقین رکھتا ہوں۔ خدا والدہ کا سایہ ہمیشہ ہمارے اوپر قائم رکھے۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

۱۰ ستمبر ۱۹۲۷ء میری پیدائش کی تاریخ ہے اور جنم بھوم، وادیٔ سکیسر کا ایک گاؤں پدھراڑ ہے۔ جو ضلع سرگودھا میں واقع ہے۔ پدھراڑ کے پرائمری اسکول ہی میں، میں نے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اور اس زمانے کے لحاظ سے میں ایک اچھا طالب علم تھا۔ پدھراڑ کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر، پیر اللہ دین اب بھی مجھے یاد ہیں۔ پیر اللہ دین اللہ لوگ تھے۔ بوڑھے تھے۔ تین چار

میل پیدل چل کر اسکول آتے تھے۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وقت پر نہ پہنچے ہوں۔ ان کا قلب روشن تھا۔ بہت لگن سے پڑھاتے تھے۔ اور بہت شفقت سے پیش آتے تھے بمعلات کے کھرے تھے۔ بے غرض تھے کسی بچے سے یا اسکے والدین سے نہ کبھی کوئی فرمائش کی اور نہ کبھی کوئی نذر قبول کی۔ درویشانہ شان تھی۔ جا بابا شکر کر، خدا تیرا بھلا کرے۔ تو گویا ان کا تکیہ کلام تھا۔ صراط مستقیم کا شعوری درس میں نے ان ہی سے سیکھا۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے بڑے عظیم انسان تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے ستارۂ جرأت کا کریڈٹ اگر کوئی ہے تو بڑی حد تک میری ماں اور میرے استاد پیر اللہ دین کو جاتا ہے۔ ان دو نے میری زندگی کی راہیں روشن کر دیں۔

بچپن کے شوق

میں نے ابھی کہا ہے کہ ہمارا گاؤں وادی سیکسر میں واقع ہے یہ پہاڑی علاقہ ہے یہاں شکار بہت ہے۔ گاؤں کے اکثر لوگوں کو شکار کا بہت شوق ہے۔ کبھی کبھار میں بھی کسی شکاری کے ساتھ نکل جاتا تھا۔ اس طرح ہوتے ہوتے مجھے بھی شکار کا شوق ہو گیا تھا۔ اور اب بھی ہے۔ اس زمانے کی کوئی خاص شرارت تو یاد نہیں۔ البتہ ایک سزا ضرور یاد ہے جس نے ہوش اڑا دیئے تھے اگر تھی تو وہی ایک شرارت تھی۔ معاملہ کچھ یوں تھا۔ کہ ہمارے گاؤں پدھراڑ میں کبڈی کا ایک زبردست مقابلہ ہونے والا تھا۔ ایک ٹیم تو ہمارے گاؤں کی تھی۔ دوسری ہمارے حریف گاؤں کی دونوں ٹیموں کا بڑا شہرہ تھا اور خیال تھا کہ مقابلہ بہت سخت ہو گا۔ گاؤں میں میلے کا سا سماں تھا آج تو خیر دور دراز گاؤں میں بھی تفریح کے لئے اور کچھ نہیں تو ریڈیو ہوتا ہے اس زمانے میں میلے ٹھیلے ہی تفریح کا واحد ذریعہ تھے۔ گاؤں میں ہر طرف اس کبڈی کے چرچے تھے۔ تھوڑی بہت کبڈی میں بھی کھیل لیتا تھا۔ مجھے بھی کبڈی دیکھنے کا شوق تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ مقابلہ اسکول کے وقت تھا۔ اب یا تو میچ دیکھتا یا اسکول جاتا۔ چونکہ کبھی اسکول سے غیر حاضر نہیں ہوا تھا۔ اس لئے غیر حاضری اور اس کی سزا سے ڈرتا تھا لیکن کبڈی دیکھنے کا شوق بھی غالب تھا۔ اسی شش و پنج میں تھا

کہ اسکول جاؤں یا نہ جاؤں کہ چند دوستوں نے ایک ایسی دلیل دی کہ میں نے اسکول نہ جانے کا اور کبڈی دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوستوں کی دلیل یہ تھی کہ اسکول تو ہر روز لگتا ہے۔ لیکن کبڈی کا ایک شاندار مقابلہ روز روز نہیں ہوتا۔ واقعی بہت وزنی دلیل تھی۔ چونکہ یہ میری دلی خواہش کے مطابق تھی اس لئے مجھے اور بھی وزنی معلوم ہوئی۔ انسان کا قاعدہ ہے کہ جو دلیل اس کے دل کے چور کے مطابق ہو وہ اس کو زیادہ معقول لگتی ہے میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پھر میرے ہوشیار دوست نے یہ بھی کہا۔ ڈریں تو ہم ڈریں کہ ہمارا شمار نالائقوں میں ہے تجھے کیا ہے۔ تجھے تو پیرجی بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ کل اسکول گول کیا جائے کوئی نہ کوئی بہانہ کر دوں گا آپ جانتے ہیں اسکول کے بچوں کے بستے خواہ کتابوں سے خالی ہوں لیکن ان کی جیب بہانوں سے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں نے بھی ایک نہیں کئی حد درجہ قابل یقین بہانے دل میں سوچے اور کبڈی دیکھنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ ان تیاریوں میں سے ایک کام یہ بھی تھا کہ عید کا جوڑا دھلوا کر تیار کیا جائے۔ کبڈی کے میلے میں کھانے پینے کے لئے دو چار آنے کا حصول بھی ضروری تھا۔ بہر حال وہ دن آن پہنچا جس کا شدت سے انتظار تھا۔ نہا دھو کر ہم تیار ہوئے۔ ایک دوست بھی آ گیا۔ گپ شپ شروع ہوئی۔ وہ کچھ مٹھائی بھی لایا تھا۔ اس کے ساتھ بھی انصاف کیا گیا اور بہترین موڈ میں مٹھائی کے ساتھ مزید انصاف کرنے کی چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ کہ یکایک بیٹھک کا دروازہ کھلا اور اسکول کے دو لڑکے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بظاہر خوش تھے۔ لیکن ان کی آنکھوں میں وارنٹ گرفتاری تھا۔ ان کی مسکراہٹ میں طنز کے تیر تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کھیل بگڑ گیا میرا ساتھی تو پچھلے دروازے غائب ان دو منکر نکیروں نے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا اور میں چپکے سے ان کے پیچھے ہو لیا۔ جب اسکول پہنچا تو ساری جماعتوں کے لڑکے مڑ مڑ کے مجھے دیکھنے لگے۔ یا مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اسکول پہنچ کر ان لڑکوں نے صرف اتنا کہا پیرجی بلاتے ہیں۔ میں ان کے کمرے میں آیا تو دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔

"اچھا تو کبڈی دیکھنے کی تیاریاں ہیں، اور پھر سارے اسکول کے سامنے میری خوب تواضع کی۔

سزا کی جسمانی تکلیف تو جلد ہی ختم ہو گئی لیکن سزا کے بعد جس انداز سے میرے محترم استاد پیر اللہ دین نے مجھے سمجھایا وہ میرے لئے زندگی بھر کا تجربہ بن گیا۔ انہوں نے کہا بیٹے یاد رکھو۔ صاف دھلے ہوئے صاف کپڑے پر ہلکا سا داغ بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان کی یہ بات آج بھی میرے دل پر نقش ہے۔ دوسرا نتیجہ جو اس واقعہ سے خود میں نے نکالا وہ یہ ہے کہ غلط کار آدمی ہمیشہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ہوشیار میں ہوں اور اپنی ہوشیاری سے ہر ایک کو چوٹ دے سکتا ہوں۔ یہی اس کی بھول ہوتی ہے۔

ملٹری کالج میں داخلہ

میں ۱۹۳۸ء میں کالج میں چھٹی جماعت میں داخل ہوا اور ۴۷۰ کالج نمبر تھا۔ برڈووڈ ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا۔ صوبیدار سکندر خان میرے ہاؤس ماسٹر اور میجر ٹی ایچ ایل اسٹیبنگ ایم۔سی کمانڈانٹ تھے۔ میں نے کالج میں پانچ سال گزارے اور انگریزی اور رومن اردو میں آرمی فرسٹ کلاس کے امتحانات پاس کئے۔ آخری دنوں میں میں کالج کی باسکٹ بال ٹیم میں کھیلنے لگا تھا۔

کالج کی یادیں

کالج میں ہمارے کھانے کا انتظام بہت اچھا تھا اور اس کی بہتری پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ راشن کا پورا پورا حساب رکھا جاتا تھا۔ کوئی چیز کم ہو یا زیادہ بہر صورت باز پرس ہوتی تھی راشن رجسٹر میں بڑی تفصیل سے ہر چیز کا اندراج ہوتا تھا اور ہندسے بہت صاف لکھے ہوتے تھے اسٹیبنگ رجسٹر کی اچانک چیکنگ خود کرتے تھے۔ کچن میں ایک جونیئر پریفیکٹ ڈیوٹی پر ہوتا تھا جو صفائی کا خاص خیال رکھتا تھا۔ ایک روز میں برڈووڈ ہاؤس میں کچن ڈیوٹی پر تھا۔ کہ شام کا دودھ گرم کرتے ہوئے پھٹ گیا۔ ایک اور ہاؤس کا بھی دودھ اسی طرح خراب ہو گیا۔ دوسرے روز ہم دونوں پریفیکٹوں کی کمانڈانٹ کے سامنے پیشی ہوئی چھ چھ بید لگے۔ کمانڈانٹ نے کہا

دودھ برتن گندے ہونے کی وجہ سے خراب ہوا ہے۔ برتنوں کو صاف رکھوانا تمہاری ذمّہ داری ہے۔ اگر دودھ میں کچھ خرابی ہوتی تو باقی دو ہاؤسوں کا دودھ بھی خراب ہو جاتا۔

صرف یہ ایک مثال ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ ڈسپلن کتنا سخت تھا اور لڑکوں کو ذمّہ دار بنانے کا کتنا اہتمام تھا۔

تربیت کا معیار بہت سخت تھا۔ بہت صبح سویرے اٹھنا سردیوں میں ٹھنڈے پانی سے غسل تاروں کی چھاؤں میں پی ٹی کرنا اور مغرب اور جمعہ کی نماز کو سبز پگڑی اور سفید کپڑوں میں فال اِن ہو کر نماز کو جانا اب بھی یاد آتا ہے۔

اساتذہ

میرے زمانے میں اساتذہ کا اپنا تعلیمی معیار بہت اونچا نہیں تھا۔ د بیشتر آرمی اسپیشل تھے اور صرف ایک دو گریجویٹ) لیکن استاد وہ بہت اچھے تھے۔ کالج میں اس وقت کتابی تعلیم سے زیادہ تربیت پر توجہ تھی، خود اعتمادی، ذمّہ داری، جرأت اور جفاکشی کی صفات بہت تردّد اور کاوش سے طلبہ میں پیدا کی جاتی تھیں۔ اور استاد ایک تناور درخت تھے جس کی چھاؤں میں ہم یہ کٹھن سفر طے کر رہے تھے۔ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ اس زمانے کے تقریبًا سب ہی طلبہ نے بہت کم نصابی تعلیم کے ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں افواج پاکستان میں تو ان کے کارنامے سونے کے حروف میں لکھنے کے قابل ہیں۔ یہ سب اس تربیت کا فیض ہے۔ جو ملٹری کالج نے اس نسل کو دی۔

میجر ڈی ایچ ایل اسٹیبنگ

اس زمانے کے کالج کی بات ہو اور کرنل اسٹیبنگ کا تذکرہ نہ آئے ناممکن سی بات ہے۔ وہ غیر معمولی قیادتی صلاحیت اور انتظامی قابلیت کے مالک تھے۔ کالج سے ان کا تعلق جزوی نہیں

کلّی تھا۔ طلبہ سے ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ انہیں ہر کیڈٹ کا نام نمبر یاد تھا۔ نہ صرف اس کا نام نمبر یاد تھا بلکہ اس کی رجمنٹ اس کے خاندان سے بھی واقف تھے۔ ان کا صرف ایک واقعہ سناتا ہوں اس سے آپ خود نتیجہ نکال لیں وہ کس پائے کے آدمی تھے۔

۱۹۳۹ء کے اواخر کی بات ہے کہ سرِ شام مجھے اپنڈکس کا درد محسوس ہوا۔ چند لمحوں میں اس نے اتنی شدّت اختیار کر لی کہ میں درد سے بے حال ہو گیا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا اپنڈکس کا شدید حملہ ہے۔ فوراً آپریشن ہونا چاہیئے۔ چنانچہ فوراً ایمبولینس منگوائی گئی۔ اور مجھے اسٹریچر پر ڈال کر اس میں لٹا دیا گیا۔ اور ایمبولینس سی ایم ایچ روانہ ہو گئی۔ میں درد کی شدّت سے نیم بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ بہرحال جب ایمبولینس جہلم کے پاس پہنچی تو مجھے کسی نے بتایا کہ کمانڈانٹ میجر اسٹیبنگ کی کار پیچھے آ رہی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ایسی کیا بات ہے کہ کمانڈانٹ صاحب آ رہے ہیں۔ سی ایم ایچ پہنچتے ہی اسٹیبنگ صاحب نے مجھے بہت تسلّی دی لیکن ان کے چہرے کے تاثرات سے مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ شاید کوئی خطرہ ہے۔ لیکن ان باتوں پر زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں درد سے بے حال تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھا اور فوراً آپریشن کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مجھے آپریشن تھیٹر پہنچایا گیا۔ اس تمام عرصے میں کمانڈانٹ صاحب سائے کی طرح میرے ساتھ تھے۔ آپریشن سے پہلے انہوں نے میرے سرپرست کی حیثیت سے کچھ کاغذات پر دستخط کئے۔ پھر مجھے کلوروفارم دیدیا گیا۔ اس کے بعد مجھے خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ دوسرے دن صبح کو جب مجھے ہوش آیا تو کمانڈانٹ اس وقت میرے بیڈ سے لگے کرسی پر بیٹھے تھے۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور مسکراتے ہوئے کہا یو آر اے لکی بوائے۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ آپریشن کے کئی گھنٹے بعد مجھے ہوش آیا تھا۔ اس وجہ سے مجھے خطرناک حد تک بیمار فہرست پر رکھ دیا گیا تھا۔ میری زندگی سے اس حد تک مایوسی ہو گئی تھی کہ میرے گھر والوں کو فوری طور پر پہنچنے کا تار دے دیا گیا تھا۔

میں تقریباً چار ہفتے سی ایم ایچ جہلم رہا اس عرصے میں وہ تقریباً ہر روز مجھے دیکھنے ہسپتال آتے تھے۔ سی ایم ایچ سے آنے کے بعد ایک ہفتہ میں نے کالج ہسپتال میں بھی لگایا۔ اس دوران

مسز اسٹیبنگ اپنے بنگلے سے میرے لئے کھانا بھجواتی رہیں۔ خود بھی شام کو ضرور دیکھنے آتی تھیں۔
سچ پوچھیئے یہ واقعہ جو چند سطروں میں سما گیا ہے اس دن سے میری زندگی پر چھا گیا ہے
اس نے میری سوچ ہی کا نہیں میری زندگی کا رخ بدل گیا۔ اسٹیبنگ کی سختی مشہور تھی۔ اکثر
لڑکے ان کو جلاد کہتے تھے۔ لیکن انہوں نے اور ان کی بیگم نے اپنی محبت و شفقت سے جو
دیپ میرے دل میں جلایا چالیس برس سے کوشش کرتا رہا ہوں کہ وہ دیپ بجھنے نہ پائے
میں نے فوج میں پچیس سال بحیثیت افسر کے نوکری کی۔ اس تمام عرصے میں، میری یہ کوشش رہی
کہ میں اپنے ماتحتوں سے ایسا رشتہ قائم کروں جس کی بنیاد باہمی اعتماد، عزت اور شفقت پر ہو
میری کوشش رہی کہ میرے اور میرے ماتحتوں کے درمیان افسری ماتحتی کی دیوار حائل نہ ہو۔
میرا اللہ جانتا ہے کہ میں نے ان کے دلوں میں گھر کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ سب کچھ بڑی حد تک
ایک غیر مذہب، غیر زبان، غیر قوم اجنبی کے خلوص اور شفقت اور بے لوث کرم کی وجہ سے ممکن
ہوا۔ اس واقعہ کو میں نے اتنی تفصیل سے اس لئے بیان کیا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو کہ قیادت
اور سیادت کا جوہر کیا ہے۔ آخر میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ استاد یا افسر کا رویہ دو دھاری تلوار ہوتا ہے
جہاں اس کے خلوص سے کوئی بن جاتا ہے تو اس کی نفرت یا بے توجہی سے کوئی بگڑ بھی سکتا ہے
میرا زندگی بھر کا تجربہ یہ ہے کہ بہت سے اچھے بھلے لوگ محض بعض بڑوں کے غلط رویوں کے ردعمل
کے طور پر غلط راہوں کی طرف چل نکلتے ہیں۔ اس لئے میں ہر اس شخص سے جو کہیں بھی کسی ذمہ دار جگہ
پر ہے اور تھوڑی بہت بھی طاقت رکھتا ہے یہی کہوں گا بھائی سنبھل کے، احتیاط کے ساتھ
قدم اٹھاؤ، انسانوں کو انسان سمجھو، ماتحت بھی دل رکھتے ہیں۔ ان کی بھی عزت ہوتی ہے۔ خدا نے
تمہیں بڑا بنایا ہے تو اپنے دل کو بھی بڑا کرو۔

سدا رہے نام اللہ کا

کالج سے کمیشن تک

کالج سے میں ۱۹۴۳ء میں رخصت ہوا۔ اپنی آبائی رجمنٹ ۲ پنجاب کے سنٹر انبالہ میں رپورٹ

کی اور سپاہیانہ زندگی کی ضروری تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد کالج آف سگنلز پونا اور
راولپنڈی میں بطور انسٹرکٹر خدمات انجام دیتا رہا۔ اس طرح چھ سال رینکس میں نوکری کی۔ پھر
کمیشن کے لئے منتخب ہوا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو او ٹی ایس کوہاٹ سے پاس آؤٹ ہوا۔

کمیشن کے بعد کی منزلیں

اپنی کمیشنی ملازمت کا بڑا حصّہ میں نے اپنی پلٹن سیکنڈ پنجاب میں گزارا۔ اسی پلٹن کے ساتھ میں نے میجر کی حیثیت سے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں حصّہ لیا اور گڈگور کے معرکے میں ستارۂ جرأت کے اعزاز سے سرفراز ہوا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد میں تین سال کالج آف سگنلز میں انسٹرکٹر رہا۔ پھر کچھ عرصہ گزنے برسی، اے، ایف سکاؤٹس میں تین سال نوکری کی۔ ۱۹۷۵ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے عزت کی نوکری دی اور پھر اس بات کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں عزت سے نوکری کر سکا۔ اور آج اپنے ضمیر کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں۔

ستارۂ جرأت کا معرکہ

وہ معرکہ جس کے لئے مجھے ستارۂ جرأت دیا گیا گڈگور (چونڈہ) کا معرکہ کہلاتا ہے ایک ایسی جنگی کارروائی پر تبصرہ کرنا جس میں، میں خود ایک اہم کردار تھا میرے لئے دشوار ہے بہتر ہو گا اگر میں اس معرکے کے بارے میں غیر جانبدار مبصروں کے بیانات نقل کروں۔

چونکہ مجھے سگنل کے ذریعے آپریشنل اوارڈ دیا گیا تھا اس وجہ سے میرے ستارۂ جرأت کے فرمان میں صرف اتنا لکھا گیا ہے۔

پی ٹی سی ۲۹۹۵ میجر محمد حسین ملک ۲ پنجاب۔

انتہائی دلیری کا کارنامہ صحیح وقت پر قدم صحیح اٹھا کے مثالی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ یکتہ بند

دستے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے گڈگور میں دشمن پر کامیاب حملہ اور دشمن کے ٹینکوں پر قبضہ کرنے کے لئے ستارۂ جرأت عطا کیا گیا۔

اس فرمان سے اس تاریخی معرکے کی کوئی تصویر نہیں بنتی نہ کوئی تفصیل سامنے آتی ہے اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر میں ۲۰ فروری ۱۹۶۶ء کے "ھلال" سے اس مضمون کو نقل کروں جو گڈگور کا ہیرو کے عنوان سے ایک جنگی وقائع نگار کے قلم سے شائع ہوا ہے۔

گڈگور کا ہیرو

ستمبر کی آٹھ تاریخ تھی سورج حسب معمول مشرق کے افق سے ابھر رہا تھا خستہ حال بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں گھر چھوڑ کر پناہ کے لئے اس طرف آ رہے تھے۔ دشمن جارحیت کے نشے میں چور گڈگور کو پامال کرتا ہوا چونڈہ کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔

کرنل جمشید نے میجر محمد حسین ملک کو حکم دیا کہ وہ فوری طور پر اپنی کمپنی کو لے جا کر دشمن کی پیشقدمی کو روکیں میجر محمد حسین ملک نے حکم کی تعمیل کی۔ ان کے ساتھ ٹینکوں کا ایک سکاڈرن میجر رضا کی قیادت میں آگے بڑھا۔

میجر محمد حسین عقاب کی طرح دشمن پر جھپٹے اور ایک ہی یلغار میں اس کے ہراول دستے کو چونڈہ سے کئی ہزار گز پیچھے دھکیل کر لے گئے۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ دشمن کے ٹینک ان کی راہ میں مزاحم ہوئے اور انھوں نے آناً فاناً آگ برسانی شروع کر دی میجر ملک نے اپنے جوانوں سے کہا کہ وہ دفاعی پوزیشن اختیار کر لیں اور ساتھ ہی اپنی ٹینک شکن توپوں کو حکم دیا کہ وہ دشمن کے ٹینکوں پر فائر کرائیں۔ بیشتر اس کے کہ اپنے ٹینک دشمن کے ٹینکوں کو برباد کرتے میجر ملک کے دو جانباز قربان حسین اور محمد صدیق اپنی اپنی ٹینک شکن توپوں سے دشمن کے دو ٹینکوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ اب اپنے ٹینکوں نے بھی دشمن کے ٹینکوں کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھوڑی ہی دیر میں میجر ملک فلورا گاؤں پر قابض ہو گئے۔ مختصر سی کانفرنس ہوئی۔

گڈگور پر دشمن کا قبضہ ہمارے لئے باعث شرم ہے۔ میجر ملک نے حملہ کے بارے میں تفصیلات طے کرتے ہوئے کہا۔

"تو انتظار کس بات کا ہے قدم آگے بڑھایئے، میجر رضا نے جواب دیا میجر ملک ایک لحہ ضائع کئے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دل میں اللہ سے فتح و نصرت کی دعا مانگی اور اس کی رضا چاہی۔ دشمن کی کثرت انہیں خائف نہ کر سکی ان کے سینہ میں جذبہ آزادی کا طوفان موجزن تھا۔ اس طوفان کی لہروں نے دشمن کو خس و خاشاک کی مانند اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جانباز مجاہد پامردی و استقلال کا علم بلند کئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دشمن کیلئے موت کا پیغام بن کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک طرف دن بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد تھکا ماندہ سورج مغرب کے آخری کناروں کو چھو رہا تھا۔ دوسری طرف فضا اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی اور میجر ملک اپنے اپنے سرفروشوں کے ساتھ دشمن پر دھاوا بول رہے تھے۔ دشمن کے لئے یہ حملہ اتنا شدید اور غیر متوقع تھا کہ گڈگور سے اس کے پاؤں اکھڑ گئے وہ افراتفری کے عالم میں بھاگا اور اللہ تعالیٰ کی نصرت سے میجر ملک فاتحانہ انداز سے گڈگور کے اندر داخل ہوگئے۔ انہوں نے وائرلیس سیٹ اٹھایا اور کرنل جمشید کو اپنی کامرانی کا مژدہ سناتے ہوئے یہ خوش کن بات بھی بتلائی کہ دشمن سراسیمگی کے عالم میں اپنے آٹھ ٹینک بھی چھوڑ بھاگا ہے جن میں سے دو سٹارٹ ہیں۔ انہوں نے کرنل صاحب کو مزید بتایا کہ دشمن کی بدحواسی کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنی ایک جیپ بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے جس سے آرمرڈ ڈویژن کا آپریشن آرڈر ایک نقشہ اور چند دیگر کارآمد کاغذات برآمد ہوئے ہیں۔

کرنل جمشید اپنے بہادر مجاہد کے اس کارنامے پر نازاں تھے ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو امڈ آئے۔ انہوں نے میجر ملک کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بریگیڈ کمانڈر کو اس کی اطلاع بھی دے دی۔

دشمن نے گڈگور سے پسپائی کے فوراً بعد چوبارہ گاؤں میں پناہ لینا چاہی لیکن وہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ میجر ملک نے موت و حیات سے بے نیاز ہوکر اس پر پھر اس پھرتی سے حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں گاؤں سے بھی اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ میجر ملک اپنے شیر دل جیالوں کے

ساتھ چوبارہ سے بھی آگے نکل گئے۔

گڈگور کی فتح کی خبر کو ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ میجر ملک نے پھر کرنل جمشید کو وائرلیس سیٹ پر دشمن کو چوبارہ سے بھی مار بھگانے کی خوش خبری دی۔ ویلڈن ملک۔ کرنل صاحب کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

میجر ملک ابھی مشکل سے گفتگو ختم کر پائے تھے کہ دشمن نے ایک بازو سے گولہ باری شروع کر دی۔ میجر ملک نے دفاعی پوزیشن اختیار کر لی اپنے ٹینک بھی حرکت میں آئے اور دونوں طرف سے آگ برسنے لگی۔

جنگی چالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اب مصلحت اسی میں تھی کہ میجر ملک اپنی مزید پیش قدمی کو روک کے دفاعی پوزیشن اختیار کرتے اور گڈگور دفاعی اعتبار سے نہایت موزوں جگہ تھی۔ اس لئے بریگیڈ کمانڈر کی طرف سے انہیں گڈگور میں دفاعی پوزیشن اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔

افشائے راز کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وائرلیس سیٹ کی بجائے کرنل جمشید نے اپنے انٹیلی جنس افسر کو بریگیڈ کمانڈر کی نئی ہدایات پر عمل کروانے کے لئے میجر ملک کے پاس بھیجا۔

تذبذب اور بے یقینی کی کیفیت چھائی ہوئی تھی گرد و غبار اور اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کیپٹن اجمل جیپ پر سوار گڈگور کی طرف جا رہے تھے۔ تاکہ وہ میجر ملک کو مزید پیش قدمی سے منع کریں جبکہ دشمن انہیں روکنے میں ناکام ہو چکا تھا۔ دشمن کے ٹینک اپنی مشین گنوں سے فائر کی بارش کر رہے تھے۔ ڈرائیور نے جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ گڈگور میں دشمن کے ٹینک سٹارٹ تھے۔ لیکن بے حس و حرکت سڑک پر دیوار بنے کھڑے تھے۔

جیپ تیزی کے ساتھ گڈگور سے نکل گئی۔ میجر رضا کے ٹینک اپنی ڈرل کے مطابق فائر کر کے واپس آ رہے تھے۔ دشمن کی گولہ باری کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں اور میجر ملک درختوں کی آڑ میں کھڑے بے خوف و خطر بڑے مزے سے سگریٹ پی رہے تھے۔

"السلام علیکم، سر!" کیپٹن اجمل نے کہا۔

"ہیلو اجمل تم اتنے فائر میں کیسے آتے ہو؟" میجر ملک نے سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"سر، کرنل صاحب نے حکم دیا ہے کہ آپ اپنی مزید پیش قدمی روک دیں، اور گڈگور میں دفاعی پوزیشن لے لیں۔"

کرنل صاحب کی طرف سے یہ حکم ملتے ہی میجر ملک نے اپنی کمپنی سمیت فائر کی زد سے بچتے ہوئے گڈگور کی طرف آنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کا نگہبان تھا۔ ذات باری تعالیٰ نے انہیں اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا اور وہ تھوڑے ہی وقت میں بغیر کسی جانی نقصان کے گڈگور واپس آ گئے انہوں نے بریگیڈ کمانڈر کے حکم کے مطابق وہاں پر دفاعی پوزیشن لے لی۔ دشمن اندھا دھند انکی پہلی جگہ پر گولہ باری کرتا رہا اور بالآخر خود ہی خاموش ہو گیا۔

دشمن نے جتنی تیزی سے چونڈہ کی جانب یورش کی تھی اس سے دگنی رفتار کے ساتھ وہ پسپائی اختیار کر چکا تھا۔ اسے ذلت آمیز شکست مل چکی تھی۔ اور اس کی چونڈہ کو فتح کرنے کی ہوس خاک میں مل چکی تھی۔ اور یہ سب کچھ میجر ملک کی جنگی فراست، شجاعت، دلیری اور بے مثال قیادت کا صلہ تھا۔ اس وقت وہ گڈگور (چونڈہ) کے ہیرو بن چکے تھے۔ انہوں نے دشمن پر واضح کر دیا تھا کہ اب بھی مسلمانوں کی رگوں میں محمد بن قاسم کا لہو موجزن ہے۔

میجر ملک کو اس اعلیٰ کارکردگی پر صدر مملکت نے ستارۂ جرأت کے اعزاز سے نوازا۔

حرفِ آخر

اس سے پہلے کہ میں اپنی تگ و تاز کی زندگی کی داستان ختم کروں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ اس معرکے میں میرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو میجر جنرل) محمد جمشید ایم سی ایڈ بار ملٹری کالج ہی کے ایک نامور فرزند ہیں۔ (کالج نمبر ۳۹۷) جنرل جمشید کو بھی اس معرکے میں ستارۂ جرأت کا اعزاز ملا تھا ایک اور عالمگیرین کالج نمبر ۸۸۸ نائب صوبیدار سلطان سکندر بھی

۴ پنجاب سے وابستہ تھے۔ انہیں بھی اسی مہم میں ستارۂ جرأت عطا ہوا تھا۔ اس طرح اس معرکے میں ملٹری کالج کی ہیٹ ٹرک ہو گئی۔ سبحان اللہ

مصنّف کا تبصرہ

ابھی تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ، کرنل ملک کی آپ بیتی تھی بیشتر انہی کے قلم سے۔ چونکہ اس کتاب کا مقصد جنگی ہیروز کی شخصیتوں کا نفسیاتی مطالعہ کرنا بھی ہے اس لئے ہم نے ان سے جو تجزیاتی گفتگو کی وہ بھی پیش خدمت ہے۔

ہمارا پہلا سوال یہ تھا۔

ایک مشہور قول ہے کہ بڑے سے بڑے ہیرو کا بھی کوئی ہیرو ہوتا ہے آپ کو گڈ گور کا ہیرو کہا جاتا ہے آپ کے ہیروز کون ہیں؟

اس سوال کے جواب میں کرنل ملک نے کہا۔

عسکری میدان میں میرے اوّلین ہیرو خالد بن ولید رضؓ رہے ہیں۔ میں نے ان کی زندگی اور کارناموں کا بغور مطالعہ کیا اور دل میں یہ آرزو مچلتی تھی کہ کبھی مجھے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کا دو چار قدم ہی سہی موقعہ تو ملے۔ اس کے بعد میرے ذہن و فکر کی آبیاری میں سب سے زیادہ حصّہ علامہ اقبال کی شاعری کا ہے۔ ان کے ہاں جو مجاہدانہ جدّوجہد کی تعلیم ہے اس نے میری عسکری زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ میرے ستارۂ جرأت کے پس منظر میں کلام اقبال بھی ہے۔

ہمارا دوسرا سوال یہ تھا۔ آپ نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں حصّہ لیا اور ۱۹۷۱ء کی لڑائی بھی دیکھی ان مواقع پر بھی آپ کو کسی نے متاثر کیا اور کیا تو کیوں؟ جس کے جواب میں انہوں نے کہا۔

۱۹۶۵ء میں میں اپنے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل محمد جمشید ستارۂ جرأت ایم سی بار کی قائدانہ صلاحیت اور عسکری فراست سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ دشمن کی جنگی چالوں کو سمجھنے اور ان کا توڑ کرنے اور خود نئی تدابیر سوچنے کی ان میں حیرت انگیز صلاحیت ہے۔

وہ دوسرا افسر جس کی قائدانہ صلاحیت اور رنگ و تاز سے متاثر ہوا وہ میری اپنی بٹالین ۲۵ پنجاب رجمنٹ کا ایک جونیئر افسر تھا۔ کیپٹن عطاء اللہ شہید کیپٹن عطاء اللہ نے جو کارنامہ انجام دیا اور جس عزم و حوصلہ سے اس نے جان دی اس کو میں بڑا آدمی سمجھتا ہوں۔

کیپٹن عطاء اللہ شہید دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں رنگ پور (مشرقی پاکستان) کی ایک اہم چوکی بارنگا ماری کے دفاع پر مامور تھا۔ اس کے زیر کمان صرف ایک پلاٹون تھی۔ جس کے پاس نہ پورے ہتھیار تھے نہ اس کو فوری طور پر کسی کمک پہنچنے کی توقع تھی۔ نہ فضائی امداد حاصل تھی حدیہ کہ اسے توپ خانے اور بکتر بند دستوں کا حد درجہ ضروری تعاون بھی میسر نہ تھا۔ ان نامساعد اور نازک حالات میں اس جوان ہمت اور جوان مرد نے نہایت جوانمردی کا ثبوت دیا اور دشمن کے پورے بریگیڈ کے حملے کو جو ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس تھا اور ہر طرح کی امداد بھی اسے حاصل تھی اس کو ۲۸ گھنٹے تک آگے بڑھنے سے روکے رکھا اور دشمن کے یکے بعد دیگرے تمام حملوں کا زور توڑ کر اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور آخر کار ایمونیشن کے ختم ہونے پر اپنے چند دوسرے جانثاروں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا وہ زندگی کے آخری لمحوں تک ملک کا دفاع کرتا رہا کیپٹن عطاء اللہ شہید نے پاکستانی فوج کے لئے بے نظیر مثال قائم کر کے بہادری کی تاریخ میں ایک زریں باب کا اضافہ کر دیا۔

اس مرد مجاہد نے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ ایسے نڈر اور دلیر افسر پر پوری قوم کو فخر ہونا چاہیئے۔ وہ قوم کے سب سے بڑے اعزاز کا مستحق تھا۔ لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بڑی بڑی قربانیاں بھی نوٹس میں نہ آسکیں اور نہ ہی انہیں فوجی تاریخ میں شامل کیا جا سکا جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

بہر حال عطاء اللہ ایسے تمام گمنام شہیدوں کو ہزار بار سلام۔ شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔

کرنل ملک سے ہمارا آخری سوال یہ تھا۔

آپ کی ذاتی قدریں کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔

اقبال کا یہ مصرع میرے دل میں چراغ کی طرح روشن ہے۔

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

احسان اور ایثار کو میں بنیادی اہمیت دیتا ہوں۔ میدان کارزار میں جو کچھ میں کر سکا اس کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔

میری دعا ہے کہ پاکستان کے تمام طلبہ اسلامی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں اور تمام فاتحین خاص طور پر مسلم فاتحین کی سوانح حیات اور طرز زندگی کا مطالعہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اسی سرزمین سے خالد، طارق، قاسم اور صلاح الدین اٹھیں گے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) محمد حیات ستارۂ جرأت

بریگیڈیر (ریٹائرڈ) محمد حیات ستارۂ جرأت

بریگیڈیر محمد حیات نے بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ جہاں رہے بڑے دھڑلے سے رہے ۴ ایف ایف ایبی کریک بٹالین کو کمان کیا۔ ایس ایس جی میں اپنا سکہ جمایا۔ پھر مشرقی پاکستان میں اپنے زور بازو کے جوہر دکھائے۔ ۱۹۷۵ء میں ریٹائر ہوئے لیکن اب بھی ان میں آگ بھری ہے جوانوں سے زیادہ پر عزم اور پر حوصلہ ہیں۔ ہم نے ان سے ان کے ستارۂ جرأت کے سلسلے میں دو تین بار طویل گفتگو کی۔ پھر ایک سوالنامہ بھی بھیجا۔ ان کے جوابات پر مبنی ان کی کتاب حیات کے چند اوراق ان ہی کے الفاظ میں ضروری ترمیم و توضیح کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

نسلی ورثہ اور آباؤ اجداد

ہمارا نسلی تعلق مشہور یوسف زئی قبیلے کی اتمان زئی شاخ سے ہے۔ میرے دادا کا نام شریف خان تھا۔ بچپن میں، میں نے انہی شریف خان کی کہانیاں سنیں۔ میرے دادا شریف خان امبیلا کی مہم کے زمانے میں جوان تھے امبیلا کے علاقے پر قبضہ کرنے کے لئے انگریزوں نے اگست ۱۸۶۳ء سے دسمبر تک ایک زبردست فوجی کارروائی کی تھی۔ امبیلا بنیر سب ڈویژن میں اب ضلع سوات کا حصہ

ہے اس مہم کے وقت میرے دادا جوان تھے۔ اوران کی جواں مردی اور جنگجوئی کی دھوم تھی انگریزوں نے انہیں ہتھیار پیش کئے ان کے سامنے روپیہ کے انبار لگائے کہ وہ انگریزوں کی طرف سے لڑیں۔ میرے دادا نے نہ صرف اس پیش کش کو بے رخی سے ٹھکرادیا بلکہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بنیر قبیلہ کے ساتھ جاکرمل گئے اوران کے شانہ بشانہ انگریزوں سے لڑے۔ بنیر قبیلے سے ہمارا نسلی رشتہ بھی تھا۔ میرے دادا نے اپنے ہم وطن بنیر قبیلے کا ساتھ دیا۔ فرنگی کا ساتھ نہیں دیا۔ حالانکہ فرنگی نے انہیں بہت لالچ دیئے تھے میں اپنے دادا کی اس بات پر آج بھی فخر کرتا ہوں جوان مرد غداری نہیں کرتے وہ آدمی جسے پیسے سے خریدا جا سکے ذلیل ہوتا ہے۔ وفاداری سودے کا مال نہیں۔

دادا شریف خان کے کچھ ہتھیار ایک بریچ لاک گن، چند تلواریں اور ایک خنجر آج بھی ہمارے گھر میں موجود ہیں اور سب سے اونچی جگہ پر سب سے زیادہ عزت کی جگہ پر آویزاں ہیں۔ میرے لئے وہ محض ہتھیار نہیں بلکہ اس بات کی نشانیاں ہیں کہ ہم کیا تھے۔ اور ہماری خاندانی روایت کیا ہے۔

گھر کے اندر دیوار پر لگے یہ ہتھیار بچپن میں میرے لئے پر اسرار کہانیوں کے راز دار بن گئے۔ دادا شریف کا انتقال ۱۹۰۵ء میں میری پیدائش سے پہلے ہو چکا تھا۔ میں نے سنیں تو ان کی دلیری اور جوانمردی کی داستانیں ہی سنیں۔ اور دیکھے تو یہ ہتھیار میں ان کو دیکھ دیکھ کر اکثر سوچتا تھا یا اللہ کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب میں ان کی وراثت کا حق ادا کر سکوں گا۔ اور اپنے دادا کا نام روشن کر سکوں گا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں اس قابل ہو سکا۔

والد کا کردار

میرے والد کا نام محمد عمر خان تھا۔ وہ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۶ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو بیاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ۱۹۰۰ء میں وہ ۶ ایف ایف آر کی یوسف زئی کمپنی میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے۔ چند سالوں کے بعد انہوں نے بعض گھریلو مسائل کی بناء پر ملازمت

چھوڑ دی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ ۱۰۷ انڈین پانیئر بٹالین میں براہِ راست نائیک بھرتی ہو گئے اور پہلی جنگ عظیم میں فرانس اور بلجیم میں اپنے زورِ بازو کے جوہر دکھائے اور ایک جنگی اعزاز بھی حاصل کیا۔ ایم۔ڈی۔آئی یا امتیازی کارکردگی کی سند لیکن والد بھی اپنے ہٹ کے پکے تھے۔ اس کارکردگی کے بعد انہیں وی۔سی۔او بنایا جانے والا تھا کاغذات تیار ہو چکے تھے جمعداری یا نائب صوبیداری پر انہیں عراق کے محاذ پر منتقل ہونا تھا۔ تفصیل مجھے معلوم نہیں کہ کیا بات ہوئی۔ بہر حال انہوں نے کسی وجہ سے عراق جانے سے انکار کر دیا لوگوں نے کہا بھی عمر خان! کیوں سرداری کے لات مارتے ہو۔ اس زمانے میں کسی کا جونیئر کمیشن لینا بہت بڑی بات تھی۔ بہر حال وہ نہیں مانے۔ جس بات پہ اڑے تھے اڑے رہے۔ پرموشن کی پرواہ نہیں کی۔ والد کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ نہ ڈر کر کام لیتے تھے نہ ڈر کر کام کرتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ فوجی ڈسپلن میں انکار کی گنجائش نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان کا کورٹ مارشل ہوا۔ وہ واپس ہندوستان بھیج دیئے گئے۔ لڑائی سے اس طرح واپس آنے کے بعد انہوں نے اپنی آبائی زمین پر کھیتی باڑی شروع کر دی اور اسی میں مگن رہے۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۵۰ء کو ان کا انتقال ہوا۔

میرے آئیڈیل تو میرے دادا شریف خان تھے لیکن مجھے اپنے والد کی جو بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ تھی کہ پرموشن قربان کر دیا۔ کورٹ مارشل کرا لیا لیکن اپنی بات پر اڑے رہے، ڈر سے یا لالچ سے اپنا راستہ نہیں بدلا۔ آج بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو دھمکی میں آ جائے یا کسی لالچ کا شکار ہو جائے وہ دیر سویر ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ کم از کم اپنی نگاہ میں تو ذلیل ہو ہی جاتا ہے۔ میں اپنے والد کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے زندگی کا ایک بہت قیمتی سبق دیا۔ کہا کرتے تھے کہ "حیات خانا! کبھی جھکنا مت، اپنے سامنے بھی نہیں دوسروں کے سامنے تو بڑی بات ہے۔"

تعلیم کی پہلی سیڑھی اور تربیت کا پہلا سبق

میں اپنے آبائی گاؤں لوپی میں پیدا ہوا اور پانچویں درجے تک تعلیم اپنے گاؤں کے ہائی اسکول ہی میں حاصل کی۔ اس زمانے کی ایک خاص یاد ایک لڑائی کی ہے۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ ایک روز کسی معمولی سی بات پر اسکول کے دو لڑکوں نے مجھے دھونس دی۔ دھونس اور دھمکی میں آنے والا تو میں آدمی ہی نہیں نہ اب ہوں نہ اس وقت بچپن میں تھا۔ تو جناب میں ان سے بھڑ پڑا۔ وہ دو اور تگڑے میں تن تنہا لیکن میرے لئے اپنی عزت کا سوال تھا۔ خوب مار دھاڑ ہوئی ان میں سے ایک کی ران میں گہرا زخم آیا۔ میرے دو سامنے کے دانت بھی ایک پتھر کی زد میں آ کر ٹوٹ گئے۔ ہونٹ بھی کٹ گئے۔ شکر ہے کہ جب میں گھر پہنچا تو رو نہیں رہا تھا۔ گو دانت ٹوٹنے سے اور ہونٹ کٹنے سے خون رس رہا تھا اور قمیض پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ بعد کو والد نے مجھے بتایا اگر تو روتا ہوا گھر آتا تو میں تجھے اور مارتا۔ اور پھر کہا حیات خانا! ”جو لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہے وہ روتا نہیں یاد رکھ جو مارتا ہے وہ پٹتا بھی ہے اگر مار کھانے کی سکت نہیں تو ہاتھ اٹھانے سے فائدہ۔“

ان کے ان الفاظ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے میری تربیت کس انداز سے کی ہوگی مختصر یہ کہ اسی طرح لڑتے بھڑتے پانچواں درجہ پاس کر لیا۔ ایک روز خان بابا نے کہا ”حیات خانا۔ تیار ہو جا کے جی آرا اسکول جانا ہے“ مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ دریائے جہلم کے کنارے کنگ جارجز رائل انڈین ملٹری اسکول میں ایک نئی زندگی میرا انتظار کر رہی ہے۔

ملٹری اسکول میں داخلہ

میں اگست ۱۹۳۸ء میں چھٹے درجے میں ملٹری کالج میں داخل ہوا جو اس وقت کنگ جارجز رائل انڈین ملٹری اسکول کے نام سے موسوم تھا۔ مجھے ۲۸۷ کالج نمبر ملا۔ میرا سب سے پہلا لا ڈ س

بر ڈووڈ ہاؤس تھا۔ اور اس کی پہلی سیکشن کا تیسرا لاکر مجھے دیا گیا۔ یہ کالج کی نمبر تین پلاٹون تھی۔ میرے سیکشن پریفیکٹ کا نام محمد ایوب نمبر ۵۲۱ تھا۔ پلاٹون کمانڈر نمبر ۴۴۴ علی بہادر تھا۔ (جو بعد کو لیفٹیننٹ بننے کے بعد بلوچ رجمنٹ کے ساتھ دوسری جنگ میں اٹلی کے محاذ پر لڑتا ہوا کام آیا) اور میرا کمپنی کمانڈر نمبر ۴۶۹ خداداد تھا (جو بعد کو میجر جنرل کے عہدے تک پہنچے اور اے۔ جی ہوکر ریٹائر ہوئے اب مرحوم ہوچکے ہیں)

میرے داخلے کے وقت برڈووڈ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر صوبیدار سکندر خان تھے جو بعد کو لیفٹیننٹ کرنل ہوکر آرمی اسکول آف ایجوکیشن اپر ٹوپہ کے کمانڈانٹ ہوئے۔ چند سال بعد جب اسکول میں بہت سے سویلین انسٹرکٹر آئے تو مسٹر ایف ایچ حیدری برڈووڈ ہاؤس میں ہاؤس ماسٹر مقرر ہوتے۔ اسکول کے چیف انسٹرکٹر لیفٹیننٹ منظر جمیل تھے اور کمانڈانٹ میجر ٹی ایچ ایل اسٹبنگ ایم۔ سی۔

اس زمانے میں جونیئرز پر بڑی سختی ہوتی تھی۔ فارسی کا ایک محاورہ ہے۔

سگ باش برادر خورد مباش

یہاں کی صورت یہ تھی کہ سگ باش جونیئر مباش۔ لیکن خوش قسمتی سے مجھے زیادہ عرصے تک سگ باشی نہیں کرنا پڑی اور سال بھر بعد ہی مجھے جونیئر پریفیکٹ یا سیکشن پریفیکٹ بنا دیا گیا۔ کمانڈانٹ نے مجھ میں کیا دیکھا کہہ نہیں سکتا۔ لیکن یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوا۔ کالج میں مجھے فٹ بال اور اتھلیٹکس میں زیادہ دلچسپی رہی ۱۹ فٹ اور ۷ انچ لانگ جمپ کرتا تھا۔ بعد کو میں ۲۱ فٹ کرنے لگا تھا۔ اور ۱۰۰ گز اور ۲۲۰ گز کی دوڑوں میں بھی مجھے امتیاز حاصل تھا۔ فٹ بال میں میں ہاؤس ٹیم سے آگے نہیں گیا۔

ممتاز طلبہ

میرے دور کے کالج کے بہت سے طلبہ نے آگے چل کر بہت ترقی کی ان میں سے حضور احمد خان تر بعد کو کرنل اور ایم سی اینڈ بار، ہیڈ لوائے محمد عنایت (بعد کو کرنل) اور محمد بشیر

دبعد کو بریگیڈئر) سے میرے تعلقات زیادہ تھے۔

سزائیں

اس زمانے کی ایک خاص سزا جی ٹی روڈ پر ۹۸ سنگ میل تک دونوں طرف دوڑ لگانے کی تھی سردیوں میں صبح سویرے تالاب میں تیراکی سے لڑکے پناہ مانگتے تھے۔ اسٹیبنگ کی کیننگ کی سوغات تو عام بٹتی تھی۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس نعمت سے مجھے وافر حصّہ ملا کرتا تھا خدا جھوٹ نہ بلوائے میرا بید کھانے کا مہینے میں دو بار کا اوسط تھا۔ کرنل اسٹیبنگ بہ نفس نفیس مجھ پر یہ توجہ فرماتے تھے میری اتنی زیادہ عزت افزائی کی وجہ یہ تھی کہ مار دھاڑ، کلاس فیلوز سے لڑنا اور سینئرز سے جھگڑنا میرا مشغلہ سا تھا۔ ساتھیوں سے تو تفریحاً یا مذاقاً لڑتا رہتا تھا لیکن سینئرز سے اصولاً جھگڑتا تھا۔ اگر کوئی سینئر ہے اور صحیح ٹوکتا ہے اور سزا دیتا ہے تو سر آنکھوں پر۔ ضرور دے۔ لیکن کوئی کتنا بڑا سینئر ہو خود غلط کام کرے یا گڑبڑ کرے، بے انصافی کرے۔ تو میں اس سے بھڑ جاتا تھا۔ کبھی کبھی میری غلطی بھی ہوتی تھی۔ ایک شرارت اور سزا کا حال بغیر شرمائے سناتا ہوں۔

میرا اپنا خیال ہے کہ شرارت کرنے میں اتنی برائی نہیں صحیح شرارت کا حوصلہ بھی کسی کسی میں ہوتا ہے۔ برائی شرارت کرکے اس سے مکر جانے، جھوٹ بولنے یا کسی اور کو پھنسانے میں ہے جس میں شرارت کرنے کا حوصلہ ہے اس میں جرأت سے سزا لینے کا بھی حوصلہ ہونا چاہیئے۔

ہاں! تو کالج کی ایک شرارت کا قصّہ سناتا ہوں ایک بار میں کالج

ہسپتال میں داخل تھا۔ لیٹے لیٹے بور ہوگیا تھا۔ کوئی ایسا بیمار نہیں تھا۔ ایک دم خیال آیا کچھ کرنا چاہیئے کالج ہسپتال کے قریب کے بنگلہ میں سارجنٹ میجر میرس رہتے تھے۔ ان حضرت کا قد چھ فٹ دو انچ تھا اور یہ ہمیں باکسنگ سکھاتے تھے۔ (باکسنگ اس زمانے میں سب کے لئے لازمی تھی اور اس پر بڑا زور دیا جاتا تھا) اور ٹاٹپ بھی باکسر ہی کا تھا۔ بہرحال میں نے ان کے کچن گارڈن پر دو اور اسپتالی لڑکوں کے ساتھ حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس زمانے میں گاجروں

کا موسم تھا۔ چنانچہ غریب گاجریں ہی ہماری چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنیں۔ جب رات میں گاجریں اکھاڑی جائیں تو آپ باغ کی حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ صبح کو جب میرس صاحب اپنی پیاری سبزیوں سے ملاقات کے لئے گئے تو دیکھا کہ ساری جگہ کا ستیاناس ہو چکا ہے۔ بہرحال تفتیش شروع ہوئی جو زیادہ مشکل نہ تھی اس لئے پیروں کے نشان ہسپتال کے برآمدے تک موجود تھے۔ بہرحال معاملہ کمانڈانٹ تک پہنچا۔ انہوں نے ہم تینوں کو بلالیا۔ ہم اس طرح بلانے کا مطلب سمجھتے تھے اور اس کے انجام سے بھی واقف تھے۔ بہرحال حیرت مجھے اس وقت ہوئی جو کرنل اسٹیبنگ نے باقی دو لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے چھوڑ دیا۔ اور مجھے دس کرارے بید عطا کئے۔ یہ عطیہ میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی لیکن حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اسٹیبنگ تو بڑے انصاف پسند ہیں کبھی کسی کی رعایت نہیں کرتے حتّٰی کہ حق نواز کیانی کی بھی نہیں تو پھر آج یہ کھلی بے انصافی کیوں ہوئی۔ آخر وہ بھی تو میرے ساتھ باغ اجاڑنے میں برابر کے شریک تھے۔ ان کی خلاصی تو باتوں سے ہو گئی اور اپنے حصے میں ایک دو نہیں پورے دس کین آئے۔ چنانچہ میں نے دفتر سے باہر نکلنے سے پہلے پوچھ لیا۔ سر! سزا تو خیر ٹھیک ہے لیکن یہ بے انصافی کیوں؟ اسٹیبنگ نے اپنے مخصوص لہجہ میں کہا۔

"حیات! میں تمہیں جانتا ہوں تمہارے اندر لوگوں کو متاثر کرنے اور اپنے پیچھے لگانے کی صلاحیت ہے تم ہی نے انہیں ورغلایا ہوگا اور یہ بیچارے پھنس گئے۔ تمہیں میں نے اس لئے سزا دی کہ تم اپنی صلاحیت کو غلط استعمال نہ کرو۔ دوسروں کی صحیح سمت میں رہنمائی کرو۔ پھر میں تمہیں سینئر پریفیکٹ بنا دوں گا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد کرنل اسٹیبنگ نے مجھے پریفیکٹ بنا دیا۔ سٹیبنگ میں یہی تو خوبی تھی کہ ہر لڑکے کو جانتا تھا اور خوب جانتا تھا اس کی سزا غصے کا نہیں سوچ کا نتیجہ ہوتی تھی۔ اب غور کرتا ہوں تو مجھے کرنل اسٹیبنگ کے تربیتی مقاصد بہت محدود نظر آتے ہیں لیکن جو مقاصد بھی اس کے سامنے تھے ان میں وہ شخص بلاشبہ مخلص تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے معیار کے مطابق ہمیں ایک اچھا افسر بنانے میں کرنل نے انتھک محنت کی۔ سختی کے ساتھ ساتھ اس کی ہمدردی اور شفقت بھی بے انتہائی تھی۔

ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے اور وہ بھی مار پیٹ ہی کا ہے ایک بار میں ایک چار سال سینئر لڑکے گل نواز سے الجھ پڑا اور اس کی پٹائی کر دی۔ اس کو خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ اتنا جونیئر بھی یہ ہمت کر سکتا ہے بے خیالی میں غریب مارا گیا۔ لیکن اس نے دل میں بات رکھی ایک اتوار کو میں سرائے عالمگیر سے چوری چھپے واپس آرہا تھا کہ گل نواز نے ارشاد اور اکرم کے ساتھ مل کر میری کمبل پریڈ کر ڈالی۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ پر چھاپا مارا اور خوب پٹائی کی۔ لیکن میں چپ رہا کسی کو رپورٹ نہیں کی۔ میرے خیال میں مار کھا کر رپورٹ کرنا بزدلی ہوتی ہے۔ جب خود مارا تھا تو کون سی رپورٹ کی تھی لیکن میرے رپورٹ نہ کرنے سے وہ تینوں پریشان رہے ان کا خیال تھا کہ میں جوابی کارروائی کروں گا۔ وہ مجھ سے بہت بچ کر رہتے تھے میرے خیال میں حساب برابر ہو گیا تھا اس لئے میں خاموش رہا میں لڑائی میں ہمیشہ سے اصول کا قائل ہوں۔ گل نواز میجر ہو کر اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ حق مغفرت کرے۔ بعد کو اکثر دوستانہ ملاقات ہوئی۔

یہ قصے تو مار پیٹ کے تھے اب ایک دلچسپ واقعہ سنیئے۔

وہ یوں ہے کہ ایک روز رات کو رول کال کے بعد امیر جان (اب بریگیڈیئر ریٹائرڈ) اور ۱/۱ سبز تھی (لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید ستارۂ جرأت) مجھ سے ملنے آتے۔ میں نے کہا چلو میموریل فلیگ اسٹاف کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں گپ شپ کریں گے۔ اور کچھ کھائیں پئیں گے، کھانے پینے کی بات پر دونوں چونکے۔ بولے۔ وہ کیسے؟ میں نے کہا تم چلو تو سہی ایسا منہ میٹھا کراؤں گا کہ یاد کرو گے۔ مختصر یہ کہ ہم باتیں کرتے میموریل تک آ گئے۔ چاندنی رات تھی ہر طرف سناٹا تھا میموریل کی گول سیڑھیوں پر کچھ دیر بیٹھے رہے۔ امیر جان نے کہا حیات وہ کھانے پینے کی بھی بات کرو میں نے کہا ابھی لو یہ کون سی مشکل بات ہے بس تھوڑی سی تگ و دو کرنی پڑے گی میں دونوں کو ساتھ لے کر سامنے باؤنڈری کی طرف لے چلا۔ وہاں ایک بڑے پیڑ کے ساتھ شہد کی مکھیوں کا ایک بہت بڑا چھتہ لگا تھا جو چاندنی میں صاف نظر آرہا تھا میں نے کہا۔ دیکھو آج یہ شہد میں تمہیں کھلاؤں گا۔ وہ بولے کیسے؟ میں نے ان کو ترکیب بتائی۔ بڑے ڈائننگ ہال کے کچن سے ایک بڑی بالٹی لاتے ہیڈ مالی

کی کٹیا سے ایک لمبا بانس لے کر درانتی اس میں باندھی اور اللہ کا نام لے کر شہد کے چھتے میں، میں نے سوراخ کر دیا اس میں سے حسب توقع شہد نیچے رکھی بالٹی میں ٹپکنے لگا ہاتھ کی اوک بنا کر ہم شہد کھانے لگے یا پینے لگے جو بھی آپ کہیں۔ صاحب زاد گل کی اوک میں شاید کوئی مکھی آگئی تھی جوں ہی اس نے شہد منہ میں ڈالا مکھی نے اس کی زبان پر کاٹ لیا۔ وہ چیخ کر پیچھے ہٹا شہد کے ساتھ جو مکھیاں گری تھیں وہ میرے ہاتھوں اور منہ پر لپٹ گئیں یہی حشر امیر جان کا ہوا۔ صبح ہمارے چہرے سوجے ہوئے تھے سب سے بُرا حال صاحب زاد گل کا تھا۔ ہاؤس ماسٹر اسٹاف اور اساتذہ سب کے سامنے ہم نے یہی کہانی بنائی کہ بھڑوں نے کاٹ لیا ہے۔

آخر کار کالج سے نکلنا پڑا

۱۹۴۳ء میں برڈ ووڈ ہاؤس (اب محمود غزنوی) کا ہیڈ بوائے یا ہاؤس پریفکٹ تھا اور دسویں جماعت میں آرمی اسپیشل کی تیاری کر رہا تھا اور ان چند لڑکوں میں سے تھا جنہیں کچنر کالج نو گانگ کے لئے تیار کیا جا رہا تھا کہ ایک حادثہ کی وجہ سے مجھے آرمی اسپیشل کئے بغیر کالج چھوڑنا پڑا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں کوئی نہ کوئی شرارت کرتا رہتا تھا۔ اور ڈسپلن کا کوئی نہ کوئی کیس بنتا رہتا اب کے پھر بنا تو کرنل اسٹیبنگ نے غالباً میرے ہیڈ بوائے ہونے کی وجہ سے کچنر کالج کے لئے میرے متوقع انتخاب کی وجہ سے اس کا سنجیدگی سے نوٹس لیا اور کہا، "حیات۔ یا تو عہدے سے معزولی قبول کر و یا پھر کالج چھوڑنا پڑے گا"۔ میری طبیعت جو ہے سو ہے۔ میں نے فوراً کہہ دیا۔ "سر میں کالج چھوڑنا پسند کروں گا۔ لیکن معزولی کی ذلت گوارا نہیں کر سکتا۔" چنانچہ مجھے کالج چھوڑنا پڑا چونکہ بات آن کی تھی مجھے افسوس نہیں ہوا۔ گو ایسا کرنے سے پریشانی بہت ہوئی۔

دھوپ اور پھر چھاؤں

کالج سے جانے کے بعد تین سال تک میں اپنی منزل کی تلاش میں حالات کی سخت دھوپ میں

ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ آخر کار ۱۹۴۶ء میں مجھے کمیشن کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو میں او ٹی ایس بنگلور پہنچا اور ۱۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو وہاں سے سیکنڈ لیفٹیننٹ ہو کے لوٹا۔ ۲۵ جولائی کو میں نے ۴ ایف ایف آر میں ڈیوٹی کے لئے رپورٹ کی۔ اس وقت یہ بٹالین میر علی کے مقام پر شمالی وزیرستان میں متعین تھی۔

کمیشنی زندگی کے اہم واقعات

دسمبر ۴۷ء سے جنوری ۴۸ء تک میں قبائلی لشکر کے ساتھ کشمیر کے جہاد میں مصروف تھا۔ اس کے بعد ایک بار پھر اکتوبر ۴۸ء سے جنوری ۱۹۴۹ء تک مجھے ۱۲/۲ ایف ایف آر کے ساتھ کشمیر میں پانڈو آپریشن میں مصروف تگ و تاز رہنے کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد کئی سال تک معمول کے کورسز کرتا رہا اور فرائض منصبی بجالاتا رہا۔ ۱۹۵۶ء میں امریکہ میں ایک کورس کیا۔ ۵۸-۱۹۵۷ء دو سال پی ایم اے میں انسٹرکٹر رہا۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں اسٹاف کالج کیا۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء سے مئی ۱۹۶۲ء تک ایک بار پھر مجھے ایک آپریشن میں ایک اہم کردار ادا کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ دیر، باجوڑ آپریشن تھا۔ اس موقعہ میں ۵ ایف ایف آر اور باجوڑ اسکاؤٹس کا سیکنڈ ان کمانڈ تھا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں مجھے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی۔ اپنی پرانی بٹالین ۴ ایف ایف کی کمان عین حالت جنگ میں کی۔ یہ بٹالین ان دنوں سیالکوٹ سیکٹر میں مصروف کارزار تھی۔

ستمبر ۶۵ء کی جنگ

آخر کار وہ وقت آن پہنچا تھا جس کے لئے میں تمام زندگی انتظار کر رہا تھا۔ بٹالین کی کمان سنبھالتے ہی میں نے دل کے کچھ حوصلے نکالے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے کامیاب کیا دوران جنگ ہی میں ۱۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو مجھے ستارۂ جرأت سے نوازا گیا اس وقت مشہور عالم چونڈہ کی لڑائی میں شریک تھا۔ اپنے ایکشن کے بارے میں، میں خود کیا لکھوں۔ اس کے لئے ستارۂ جرأت کا فرمان موجود ہے۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

جن حالات میں ۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کو لیفٹیننٹ کرنل محمد حیات نے بٹالین کی کمان سنبھالی ان سے بدتر حالات میں شاید ہی کسی کمانڈنگ افسر نے اپنی بٹالین کی کمان سنبھالی ہوگی۔ اس وقت ان کی بٹالین ۴ ایف ایف ظفروال میں تھی۔ جب وہ بٹالین میں کراچی سے پہنچے اور بٹالین کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو ہندوستانی اس جگہ کو تقریباً محاصرے میں لے چکے تھے۔ صورت حال حد درجہ خطرناک تھی کرنل حیات نے فوراً صورت حال کا جائزہ لیا اور ۲۴ انفنٹری بریگیڈ کے کمانڈر کو وائرلیس پر صورتحال سے آگاہ کیا بریگیڈ کے کمانڈر نے ان سے کہا کہ موبائیل ڈیفینس کی تدبیر استعمال کی جائے اور آر آر اور راکٹ لانچرز کی ٹیمیں دشمن کے ٹینکوں کے بازو کی طرف بھیجی جائیں۔ کمانڈر نے کرنل حیات سے یہ بھی کہا کہ ظفروال کا ہر قیمت پر دفاع کیا جائے کرنل حیات نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔

اس انتہائی نازک موقعہ پر کرنل حیات نے قیادت کی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور آر آر اور راکٹ لانچرز کو ملا کر اس ہوشیاری سے استعمال کیا کہ دشمن کے ٹینک ڈھیر ہونے لگے۔ کرنل حیات کی استقامت اور جرأت نے تمام رینکس میں جوش و ولولے کی ایک نئی روح پھونک دی۔ اور سب کے سب ایک تازہ تر جوش و خروش سے لڑنے لگے۔ جس کے نتیجے میں دشمن کے ٹینک دھڑا دھڑ تباہ ہونے لگے۔ چنانچہ کرنل حیات کے کمان سنبھالنے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر ہندوستانی بہت سے مقتول اور ۱۴ تباہ شدہ ٹینک میدان میں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔ دوسرے دن دشمن نے ان کی پوزیشن پر پھر ایک زوردار حملہ کیا لیکن اس وقت تک کرنل حیات نے اپنے ٹینک شکن دفاع کو اتنا مضبوط اور موثر بنا لیا تھا کہ دشمن دو ٹینکوں کا نقصان اٹھا کر پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا اور پھر دشمن کی جرأت نہیں ہوئی کہ کرنل حیات کی پوزیشن پر دوبارہ حملہ کرے۔

۶۵ء کی جنگ کے بعد کی داستان

۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک دو برس میں نے ایس ایس جی نمبر دو بٹالین کمان کی۔ جولائی ۱۹۶۹ء میں مجھے ڈویژن نمبر ۹ کے کرنل اسٹاف کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ جنوری ۱۹۷۰ء میں بریگیڈیئر بنا۔ اور مجھے ۳ اے کے بریگیڈ دیا گیا جو اس وقت کوٹلی میں تھا۔ اور ۱۹۷۱ء اوائل میں مشرقی پاکستان کے جیسور سیکٹر میں ۱۰۷ بریگیڈ کی کمان سنبھالی۔ اور اپنے حصے کی ذمہ داری کو پوری ذمہ داری سے پورا کیا۔

جیسور سیکٹر کا ایکشن

اب تو وہ تذکرہ ہی تلخ یادوں سے بھرا ہوا ہے جو کچھ میں نے وہاں کیا اور جس طرح میں نے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا اس کا ثبوت یہ ہے کہ جولائی ۱۹۷۱ء میں میرے لئے ہلال جرأت کی سفارش کی گئی۔ ۲۱ نومبر ۱۹۷۱ء میں ایک اور معرکے میں زخمی ہوا اور ۱۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ایک بار پھر ہلال جرأت کے لئے کاغذات اوپر بھیجے گئے وہ سگنل اب بھی ایم ایس برانچ میں پڑے ہوں گے۔ ۱۶ دسمبر ۷۱ء کے بعد تو وہ بساط ہی الٹ گئی۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۲۷ اپریل ۷۴ء تک میں اسیر جنگ رہا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۷۵ء کو فوجی خدمت سے سبکدوش ہو گیا لیکن شادم کہ کارے کردم۔ خوش ہوں کہ کچھ خدمت کی اور وہ بھی سر اٹھا کے۔

میرے ساتھی، میرے بچے

یہ تذکرہ ختم کرنے سے پہلے، میں ان کو محبت و عقیدت سے یاد کرنا چاہتا ہوں وہ جو میرے ساتھ لڑے۔ وہ جنہوں نے میرے اشارے پر جانیں دیں۔ وہ ساتھی جنہوں نے میری قیادت میں اپنی جانوں کی بازی لگا دی اور اپنے تعاون سے ان کاموں یا کارناموں کو ممکن بنا

دیا جو میری قیادت میں انجام پذیر ہوئے۔ میری بٹالین ۴ ایف ایف کے جوان میرے بچے ہیں اور ان میں سے ایک ایک کی صورت ایک ایک کا نام میرے دل پر نقش ہے۔ یہ گمنام مجاہد اور گمنام شہید اس ملک کے اصل ہیرو ہیں۔ افسر ساتھیوں میں سے کس کا نام لوں اور کس کا نہ لوں۔ وہ سب ہیرے تھے۔ لیکن دو ایک کا نام لئے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ ایک بریگیڈئر ممتاز ملک ستارۂ جرأت، جو ۱۹۶۵ء میں ظفروال کے معرکے میں میرے کمپنی کمانڈر تھے اور دوسرے لیفٹیننٹ کرنل سید فخر عالم جو مشرقی پاکستان کی تگ و تاز میں میرے بریگیڈ میجر تھے میں ان کی جرأت مندانہ رفاقت کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ اب یہ میرے اچھے دوست ہیں۔ اور دوست ہونے کی بات یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی دلیر ہے، جوان مرد ہے، سچا اور کھرا انسان ہے وہ میرا دوست ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) رشید احمد کیانی

ستارۂ جرأت، آرٹلری

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) رشید احمد کیانی ستارۂ جرأت

آرٹلری

کرنل رشید کو لکھنے کا شوق بھی ہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں۔ ہمارے سوالنامے کے جواب میں، انہوں نے اپنی داستان حیات کئی سو صفحات میں رقم کی۔ اس میں سے جستہ جستہ ٹکڑے اختصار کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

خون اور خاندان

میں اس جدید سائنسی تحقیق سے بے خبر نہیں کہ جس چیز کو ہم خون کا اثر کہتے ہیں وہ اصل میں ماحول اور تربیت ہی کا اثر ہوتا ہے۔ کسی خاندان کا مخصوص نسلی نام اصل میں ایک علامت ہوتا ہے مخصوص ماحول اور تربیت کی قدروں کا جو اس نسلی گروپ میں رائج اور مقبول ہوتی ہیں۔

اس وضاحت کے بعد میں عرض کروں گا کہ میرا خونی تعلق اس نسلی شاخ سے ہے جو گکھڑ اور کیانی کہلاتی ہے۔ کیانی جو صدیوں تک پوٹھوار کے علاقے میں مصروف تگ و تاز رہے۔ انہوں نے شمشیر زنی بھی کی اور حکمرانی بھی۔ لیکن آن کو جان پر ہمیشہ مقدم رکھا۔ دوستی کو نبھانا اور دشمنی کو انتہا تک پہنچانا ان کا شیوہ تھا۔ مغلوں کے وفادار تھے تو اس وقت بھی وفادار رہے جب ہمایوں

بے تاج و تخت تھا۔ شیر شاہ سوری سے ٹھنی تو ٹھنی رہی۔ تحریص و ترغیب یا تلوار، کوئی طاقت ان کو ان کے عزم سے ہٹا نہ سکی۔ رہتاس کا قلعہ آج بھی گواہی دیتا ہے کہ اس کے حریف کون تھے اور کیسے۔ روات میں سلطان سارنگ کا شکستہ مزار آج بھی اس جوان مرد کی یاد دلاتا ہے۔

گکھڑوں کی کہانیاں، گکھڑ قوم یا کیانی قوم کے بچے آج بھی ماں کی گود میں سننا شروع کر دیتے ہیں۔ عزم و حوصلے اور شجاعت کی یہ داستانیں ہماری گھٹی میں پڑی ہوتی ہیں۔

آباؤ اجداد

ہمارا تعلق گکھڑوں کی اس برادری سے ہے جو صدہا سال سے ضلع جہلم کے ایک گاؤں بدلوٹ میں آباد ہے۔ بدلوٹ ضلع جہلم میں قلعہ رہتاس سے چھ میل جنوب مغرب میں اور ٹلہ جوگیاں کے دس میل جنوب مشرق میں ٹلہ رینج کے نواح میں واقع ہے۔ گاؤں چھوٹا سا ہے لیکن اسے چاند ستاروں کا گاؤں کہنا چاہیئے۔ ہر رینک اور ہر مرتبے کے جتنے فوجی اور سول افسر اس گاؤں نے پیدا کئے ہیں اتنے اس آبادی کے کسی اور گاؤں نے پیدا نہیں کئے ہوں گے۔ گاؤں کا نام بدلوٹ اس کے ایک نامور بزرگ بدلا خان کے نام پر ہے۔ میرے والد محترم راجہ فیروز خان اسی بدلوٹ کے چشم و چراغ تھے۔ اور گکھڑوں کی بہترین روایات کے حامل۔

وہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تھے ۔۔۔ ۱۹۰۰ء میں رائل ہارس آرٹلری کی ایک بیٹری میں بھرتی ہوئے پہلی جنگ عظیم میں مڈل ایسٹ میں لڑے۔ نائب صوبیداری اور انعام کی زمینیں لے کر لوٹے۔ اس زمانے کے لحاظ سے خاصے پڑھے لکھے تھے۔ اپنے تین بیٹوں کو ملٹری کالج میں پڑھایا۔ (میرے دو بڑے بھائی حق نواز کالج نمبر ۵۶ اور خداداد کالج نمبر ۶۸ کالج کی پہلی انٹری ستمبر ۱۹۲۵ء میں داخل ہوئے تھے۔ میں ۱۹۳۸ء میں کالج میں آیا تھا) ان کی مذہبی عصبیت اس درجہ کی تھی کہ اس زمانے میں جب داڑھی رکھنا وہ بھی فوج میں نامقبول تھا۔ انہوں نے جس دن سے چہرے پر بال آئے داڑھی رکھی۔ قبلہ اوّل کی زیارت کی تین بار حج کیا۔ انگریز کی نوکری ضرور کی لیکن غلامی نہیں کی، ۲۷ دسمبر ۱۹۷۵ء

کو ۱۰۱ برس کی عمر میں انتقال کیا اور بدلوٹ ہی میں اپنے پوتے مشتاق کیانی شہید (کالج نمبر ۵۹-۱) کے پہلو میں دفن ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی عظیم تھی۔

والدہ مرحومہ بھی اپنی صفات میں ان سے کم نہیں تھیں۔ ان دونوں کی سوچ کی چھاپ ہمارے سارے خاندان پر ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں والدین کی قدروں اور رویّوں کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یہ تذکرہ صرف میرے ماں باپ ہی کا نہیں کم و بیش پوری نسل کا ہے جو اب گزر چکی ہے یا چراغ سحری ہے۔ ضرورت ہے کہ ان چراغوں سے چراغ جلتے رہیں اور ہم اپنی قومی روایات کو زندہ اور تابندہ رکھیں۔ سب سے پہلے میں راجہ فیروز خان صاحب کے ایک قول کو نقل کروں گا جو وہ بار بار دہراتے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ لوگ جعلی اور نقلی پیروں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اصلی پیر تو ان کے گھر میں موجود ہیں۔ ان سے رہنمائی لیں۔ ان کے پیر دھو کے پئیں۔ ان کی اطاعت کریں۔ ان کی خدمت کریں۔ اسی سے دنیا سنورے گی۔ اسی سے دین سنورے گا۔ یہی اللہ کا حکم ہے۔ یہی فرمان نبی پاک کا ہے۔ ماں باپ کی اطاعت اور خدمت ہمارے خاندان میں ایک عقیدے کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے علاقے میں مشہور ہے کہ بدلوٹ اور راجہ فیروز خان کا سارا خاندان ماں باپ کی دعاؤں سے پھولا پھلا ہے۔ اور یہ ہے بھی صحیح۔ ماں باپ کی اطاعت و خدمت کے طفیل پورے بدلوٹ پر اللہ کا کرم ہے۔ اس کی رحمت کا سایہ ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ آج بدلوٹ میں زکوٰۃ دینے والے تو بہت ہیں لیکن زکوٰۃ لینے والا کوئی کوئی ہے۔

نوکری اور غلامی کا فرق

ابھی میں نے کہا کہ میرے والد گرامی راجہ فیروز خان بڑے دبنگ قسم کے آدمی تھے انگریز کی بھی انہوں نے نوکری تو کی لیکن غلامی نہیں کی۔ اس امر کی وضاحت مثالوں سے کرتا ہوں۔ اس زمانے میں انگریزوں کا کالوں کے ساتھ جو فرعونیت کا رویہ تھا۔ اس کا تو آج ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے جو ایک بار والد صاحب نے ہمیں سنایا۔ وہ

واقعہ یوں تھا۔ کیرلونٹ میں ایک ہندوستانی سپاہی کو ایک گورے سارجنٹ نے مارا۔ اس کی شکایت سپاہی نے انگریز کمانڈنگ افسر سے کی۔ اس نے اسے بلایا اور پوچھا کیا بات ہے۔ سپاہی مظلوم تھا اس نے فریاد کی کہ "سر! ڈانلڈ نے مجھے لات گھونسوں سے مارا ہے"۔ (اس سارجنٹ کا نام ڈانلڈ تھا) کمانڈنگ افسر یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور کہنے لگا تم نے ڈانلڈ صاحب کیوں نہیں کہا صرف ڈانلڈ کیوں کہا۔ تم گستاخ ہو۔ دفع ہو جاؤ۔ بیچارہ سپاہی پٹا بھی اور اسی پر ڈانٹ بھی پڑی اس طرح کے واقعات عام تھے۔

محترم والد راجہ فیروز خان کا ایک قصہ سناتا ہوں۔ ۱۹۱۰ء میں وہ رڑکی میں رائڈنگ سکول میں رائڈنگ کا ایک کورس کر رہے تھے۔ کورس انچارج ایک گورا سارجنٹ تھا جو سیلوٹ لینے کا مجاز نہیں تھا۔ لیکن وہ رعب دکھا کر سب زیر تربیت ہندوستانی سپاہیوں سے سیلوٹ لیتا تھا۔ جو خلاف قاعدہ تو تھا لیکن بیچارے سپاہی ڈر کے مارے اسے سلام کرتے تھے۔ اگر اسے سلام نہیں کیا تو راجہ فیروز خان نے نہیں کیا۔ اس نے بہت تنگ کیا۔ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آیا۔ خراب سے خراب گھوڑے دیئے۔ امتحان میں زیادتی کی۔ لیکن یہ آخر وقت تک اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اصول پر ڈٹنا ان کو آتا تھا۔ اسی طرح ۱۶-۱۹۱۵ء میں بہادری کے تمغہ کے بعد جب انہیں توپ خانے میں نائب صوبیداری ملی تو وہ سیلوٹ کے حقدار ہوئے ایک گورے سپاہی نے انہیں سیلوٹ نہیں کیا تو انہوں نے اسے فوراً چارج شیٹ کر دیا معاملہ اوپر تک پہنچا تو رفع دفع کر دیا گیا۔ اس قسم کے بہت سے چھوٹے موٹے واقعات اور معاملات ہیں جن سے ان کی شخصی اور قومی عصبیت کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں جو ایک طرح پاکستان کے لئے ریفرنڈم تھا انہوں نے کھل کر پاکستان کے لئے کام کیا۔ آخر دم تک وہ اسلام اور پاکستان کا دم بھرتے رہے۔

اب والدہ مکرمہ کی طرف آتا ہوں بسم اللہ ان کا تکیہ کلام سا تھا۔ کوئی آتا تو بسم اللہ۔ کوئی کام شروع ہو تو بسم اللہ۔ بسم اللہ کا ورد جس طرح میں نے ان کو کرتے دیکھا کسی اور کو کرتے نہیں دیکھا شکر الحمد للہ بھی بہت کہا کرتی تھیں۔ انہوں نے بڑی بڑی آزمائشیں دیکھیں۔ بڑے بڑے امتحان

آئے۔ دوسری جنگ عظیم میں ایک بیٹا جاپانیوں نے قید کیا۔ دوسرا بیٹا لام پر گیا۔ لیکن ہیں نے کبھی انہیں اللہ کی رحمت سے مایوس اور زمانے سے شاکی نہیں دیکھا۔ ہر حال میں شکر الحمدللہ

یہ تو طبیعت کا ایک رخ تھا لیکن چونکہ گکھڑانی تھیں۔ جنگجو باپ کی بیٹی جنگجو شوہر کی بیوی جنگجو بیٹوں کی ماں لہٰذا دلیری اور حوصلے میں بھی یکتا تھیں۔

ماں کی للکار

یہ واقعہ دوسری جنگ عظیم کا ہے جب میرے بڑے بھائی خداداد خان لام پر جانے لگے تھے تو جہلم اسٹیشن پر سارا خاندان انہیں الوداع کہنے آیا۔ ان میں والدہ بھی تھیں۔ خود بھائی صاحب کے بیوی بچے بھی تھے۔ گاڑی آنے تک تو بھائی صاحب ہنس ہنس کے گلے ملے۔ لیکن جب ڈبے میں بیٹھنے لگے تو اپنے بچوں کو دیکھ کر دل بھر آیا۔ سوچا ہوگا پھر دیکھنے کو ملیں یا نہ ملیں۔ والدہ نے بیٹے کے آنسو دیکھے تو للکارا "پتر۔ بچیاں نوں دیکھ کے ڈول نہ، نوں وی تے کسے دا بچہ ایں۔ یاد رکھ کنڈ نہ دکھلاویں جے بدنامی لے کے آیوں تے میں تینوں کدے وی نہ بخشاں گی"

اسی قسم کے الفاظ میرے والد محترم کی والدہ محترمہ نے ان سے تقریباً پچیس سال پہلے اسی جہلم ریلوے اسٹیشن پر کہے تھے جب وہ پہلی جنگ عظیم پر روانہ ہو رہے تھے اب یہ رویہ ہماری خاندانی روایت بن چکا ہے جب بیٹا میدان کارزار کا رخ کرتا ہے تو یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں۔ اور محسوس کر کے، خلوص سے دہرائے جاتے ہیں۔

اسی تربیت اور رویے کا نتیجہ تھا کہ میرے بڑے بھائی راجہ خداداد خان پر دوسری جنگ عظیم میں ہر افتاد پڑی۔ دو بار سمندر میں جہاز سمیت ڈوبے اور موجوں کے تھپیڑے کھائے۔ جاپانیوں کے قیدی ہوئے۔ پھر قید سے فرار ہو کے ہندوستان پہنچے بہادری کا میڈل لیا۔ کمیشن منظور ہوا جو قید کی نظر ہو گیا۔ ہر آفت اور ناکامی ان پر ٹوٹی۔ لیکن چونکہ ماں کہہ چکی تھی کہ کنڈ نہ دکھلانا انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اور بالآخر اپنے آپ کو بھی سرخرو کیا اور اپنے والدین کو بھی۔

باپ کی سخت گیری کا ایک واقعہ

آخر میں ایک اور واقعہ سنانا چاہتا ہوں جس سے اندازہ ہو گا کہ والد محترم کس مزاج کے انسان تھے اور ان کے اصول تربیت کیا تھے۔

یہ واقعہ بھائی حق نواز سے متعلق ہے ان کی نوجوانی کا قصہ ہے۔ وہ عید پر چھٹی آئے ہوئے تھے۔ اور عید کے دن گاؤں کے باہر نیزہ بازی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ بھائی حق نواز بھی مقابلے میں شریک تھے وہ اچھے نیزہ باز تھے۔ لیکن اس روز ان کے ہاتھ کو کیا ہوا۔ کہ دو بار کوشش کی لیکن کلہ نہ اکھاڑ سکے اور ساتھ ہی بُری طرح گرے بھی لیکن والد نے جو خود بہت اچھے شاہسوار اور نیزہ باز تھے کہا "چل پتر پھر کوشش کر" بھائی حق نواز کی حالت پھر کوشش کرنے کی نہیں تھی گھوڑا بہت منہ زور تھا۔ کسی طرح قابو نہ آتا تھا۔ اور گرنے سے خاصی چوٹ بھی آئی تھی۔ آس پاس بیٹھے دوسرے عزیز رشتے داروں نے کہا بھی کہ لڑکا نڈھال ہو گیا ہے۔ اب چھوڑ دے۔ لیکن والد نہ مانے انہوں نے کہا "گکھڑ پتر منہ زور گھوڑے سے مات کھائے یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ان کی بات سن کر بھائی حق نواز کو بھی جوش آ گیا۔ اچک کر گھوڑے پر جا بیٹھے اسے دبا کر دو چکر دیئے اور تیسری بار کلہ صاف اڑا لے گئے۔ جس نے دیکھا عش عش کر اٹھا۔

یہاں میں اس امر پر بھی زور دینا چاہتا ہوں، یہ باتیں، یہ واقعات یہ رویّے صرف میرے خاندان میرے والدین ہی کے نہیں اس پوری نسل کے ہیں جو اب تک پاکستان کے دفاع کی امین رہے ان میں گکھڑ بھی ہیں۔ اعوان بھی ہیں، جاٹ بھی، چوہدری، راجپوت، پٹھان غرض ہر قوم ہر علاقے کے مجاہد ہیں۔ یہ کہیں کے ہوں ان میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ یہ سب دلیر ہیں، سچے اور پکے مسلمان ہیں اسلام اور پاکستان کے جان باز سپاہی ہیں۔

میری ابتدائی زندگی

میری پیدائش اپنے آبائی گاؤں بدلوٹ کی ہے میں ۱۵ مئی ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوا تھا۔ تین

بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ والد کچھ عرصے کے لئے ضلع ملتان کی تحصیل خانیوال کے ایک چک میں اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں رہنے لگے تھے۔ میری ابتدائی تعلیم اسی چک الف ۹/۸ آر کے ایک نواحی پرائمری اسکول میں ہوئی۔ اس زمانے کی کوئی خاص بات یاد نہیں سوائے ایک واقعہ یا شرارت کے۔

ایک خیال انگیز واقعہ

چک کے مسلمان بچوں کا قاعدہ یہ تھا کہ صبح سویرے پہلے مسجد میں مولوی صاحب سے قرآن شریف پڑھتے تھے۔ اس کے بعد پرائمری سکول جاتے تھے۔ اور پھر سہ پہر کو واپس آتے تھے۔ اس لئے دوپہر کی روٹی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ہمارے ساتھ چک کے دوکاندار بنیئے کا لڑکا سری رام بھی پڑھتا تھا وہ بھی اسکول میں ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اور آدھی چھٹی کے وقت اپنے جھولے سے روٹی نکال کے کھاتا تھا۔ ایک روز بے خیالی میں میرا ہاتھ اس کی روٹی کی پوٹلی کو لگ گیا اس نے کہا روٹی بھرشٹ ہو گئی۔ اب میں نہیں کھاتا۔ ہم نے کہا تم نہ کھاؤ ہم کھا لیتے ہیں۔ دوکاندار کا بچہ تھا اس کی روٹی گھی سے چپڑی بہت مزیدار تھی۔ اب ہمیں جو شرارت سوجھی تو روز روز جان بوجھ کر اس کی روٹی کو ہاتھ لگا دیتے۔ وہ چھوڑ دیتا ہم مزے اڑاتے وہ کب تک بھوکا رہتا۔ اس نے گھر بتایا اور اس کی ماں ہمارے گھر آئی اور بڑی شکایت کی۔ ہمارے والدین نے ہمیں ڈانٹا۔ اس طرح یہ سلسلہ ختم ہوا۔ لیکن جب بڑے ہوئے تو اس تجربے سے معلوم ہوا کہ پاکستان بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ آج کی نسل کو تجربہ نہیں کہ ہندو کتنا تنگ دل، کتنا تنگ نظر اور متعصب تھا۔ وہ کسی دوسرے مذہب یا دین کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی اور ہماری کوئی قدر مشترک نہیں۔ ہم گائے کھاتے ہیں وہ گائے کی پوجا کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ چک میں پرائمری سے آگے تعلیم کا انتظام نہیں تھا اور یوں بھی وہاں کا رہنا ہمارے گھر والوں کو پسند نہیں تھا۔ ہم لوگ اپنے گاؤں بدلوٹ واپس آگئے اور پانچویں سے آگے تعلیم کے لئے مجھے اسلامیہ ہائی اسکول جہلم میں داخل کر دیا گیا۔

چونکہ یہ اسکول بدلوٹ سے نو، دس میل کے فاصلے پر تھا اس لئے میں اسکول کے ہوسٹل ہی میں گاؤں اور برادری کے چند دوسرے لڑکوں کے ساتھ رہنے لگا۔ اسلامیہ ہائی سکول جہلم میں میں نے دو سال تعلیم حاصل کی۔

اسلامیہ اسکول کے دو استاد

اسلامیہ اسکول کے دو استادوں کو میں نہیں بھول سکتا۔ ایک انگریزی کے استاد اور ہوسٹل کے انچارج معصوم اصغر صاحب دوسرے دینیات کے استاد مولوی عبدالعزیز صاحب۔ دونوں بہت اچھے استاد تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود باکردار تھے۔ ہوسٹل میں نماز کی پابندی پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار چند لڑکے جنہوں نے ایک رات عشاء کی نماز نہیں پڑھی تھی انہیں ہوسٹل سے نکال دیا گیا تھا۔ سردی کے دن تھے غریبوں نے وہ رات مسجد میں بسر کی معصوم صاحب بہت ہی شفیق لیکن اتنے ہی بااصول اور سخت استاد تھے۔

ایک اضطراری حرکت

انہی معصوم اصغر صاحب سے ایک بار میں نے چھٹی کی درخواست کی بات یہ تھی کہ بھائی خداداد خان گھر چھٹی آئے ہوئے تھے لہٰذا میں ان سے ملنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے اس وجہ کو ناکافی سمجھا ——— میں بھی ضد میں آگیا۔ سائیکل اٹھائی اور گھر کی راہ لی۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ بھائی کی چھٹی ختم ہو چکی ہے اور سب گھر والے اور عزیز رشتے داران کو الوداع کہنے گاؤں سے باہر آئے ہوئے ہیں میں نے بھی سب کے ساتھ انہیں خداحافظ کہا اور پھر جلدی جلدی گاؤں کے گھر کی طرف جانے لگا۔ اس طرح میرے اور الوداعی پارٹی کے درمیان خاصا فاصلہ ہو گیا۔ میں نے یوں ہی جیب میں ہاتھ ڈالا تو دیاسلائی کی ڈبیہ ہاتھ میں آ گئی۔ پھر نہ جانے جی میں کیا آئی ایک کھیت کی باڑھ کو آگ لگا دی اور باڑھ بھی جیسے دیاسلائی کی منتظر تھی فوراً آگ فانا

آگ بھڑک اٹھی۔ میں آگ کو دیکھ کر بری طرح خوف زدہ ہوگیا اور شہر کی طرف بھاگا اور اسکول جاکر دم لیا اس طرح بغیر ارادے کے نومیل کی نان اسٹاپ ریس کا ریکارڈ قائم ہوگیا اور ہوسٹل کی غیر حاضری سے بچ گیا ادھر گاؤں والوں کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ یہ رشید کی کارستانی ہے کوئی پندرہ برس کے بعد میں افسر ہوکر گاؤں چھٹی آیا ہوا تھا تو باتوں باتوں میں بڑی بوڑھیاں کہنے لگیں نہ جانے وہ باڑھ والی آگ کیسے لگی تھی۔ کس نے لگائی تھی۔ میں ہنس پڑا۔ اور کہا اس کا مجرم آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ انہیں اس کا یقین نہ آتے تب میں نے اس کا پورا قصہ سنایا۔ تو سب حیران رہ گئے۔

غالباً میں نے وہ حرکت ذہنی اضطراب کی حالت میں کی تھی اس واقعہ کا تذکرہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ بتاؤں کہ بچوں کے والدین اور استادوں کو ان کے ساتھ بڑے صبر سے کام لینا چاہیئے اور ان کی کسی ایک حرکت یا شرارت سے مایوس اور بیزار نہیں ہونا چاہیئے اکثر ضدی اور غصیلے بچے بڑے ہوکر کارہائے نمایاں انجام دیا کرتے ہیں بشرطیکہ کوئی ان سے کام لینا جانتا ہو اور انکی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو سکے۔

ایک یادگار تجربہ۔ قائداعظم کی زیارت

یہ ۱۹۳۸ء کے اوائل کا قصہ ہے میں اسلامیہ ہائی اسکول میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ اعلان ہوا کہ جہلم کے پل کے قریب جوبلی گھاٹ پر ایک جلسہ ہوگا جس میں قائداعظم محمد علی جناح تقریر کریں گے۔ اس اعلان کا بڑا چرچا تھا۔ مقررہ دن ہم ساتھیوں کے ساتھ جوبلی گھاٹ پہنچ گئے۔ قائداعظم کے ساتھ اسٹیج پر راجہ غضنفر علی خان اپنی مخصوص طرّے دار پگڑی کے ساتھ موجود تھے۔ قائداعظم نے ابھی تقریر شروع نہیں کی تھی کہ ایک دیہاتی نے مجھ سے قریب بیٹھے ہوئے صاحب سے پوچھا "قائداعظم کہڑا اے" انہوں نے اشارے سے بتادیا وہ ہیں۔ وہ دیہاتی بڑا حیران ہوا اور پھر کہنے لگا "اوہ تے بڑا کمزور اے، میں تے سمجھیا سی کہ اتنا وڈا لیڈر لمبا تڑنگا جوان ہوئے گا" قائداعظم کی تقریر انگریزی میں تھی۔ کچھ سمجھ میں آئی کچھ نہیں آئی۔ اتنا یاد پڑتا ہے کہ بار بار

کانگریس اور مسلم لیگ کا نام آتا تھا۔ (۱۹۳۷ء میں جب پہلی بار صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئی تھیں۔ ہندوؤں نے بہار وغیرہ کئی صوبوں کی مسلم اقلیتوں پر بڑے ظلم کئے تھے۔ یہ جلسہ غالباً پنجاب مسلم لیگ کو مقبول اور مضبوط بنانے کے لئے تھا) اس وقت تو یہی شوق تھا کہ قائداعظم کو دیکھیں ان کی عظمت کا اندازہ نہ تھا۔ آج میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ بچپن ہی میں اس عظیم انسان کی زیارت نصیب ہوئی۔ اور اس عمر ہی میں کچھ کچھ قومی شعور پیدا ہوا۔

نئی امنگیں، نئی منزلیں، ملٹری کالج میں داخلہ

اسلامیہ ہائی اسکول جہلم کے بعد کنگ جارج رائل انڈین ملٹری اسکول جہلم میں میرے داخلہ کا بندوبست کیا گیا۔ کے۔جی۔آر جہلم میرے لئے اجنبی نہ تھا۔ میرے دو بھائی یہاں پڑھ چکے تھے۔ دو ایک رشتے دار اب بھی پڑھ رہے تھے۔ یہاں آنے سے پہلے میں اسکول کے بارے میں اتنا کچھ سن چکا تھا۔ کہ جب یہاں میں پہنچا۔ تو کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی اور پہلے دن سے دل لگ گیا۔ ملٹری کالج میں میرا داخلہ ایک شاندار گو جدوجہد سے پُر مستقبل کی طرف پہلا پُرعزم قدم تھا۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں میں ملٹری کالج میں داخل ہوا۔ اور ۵۲۰ کالج نمبر ملا۔ اور رابرٹس ہاؤس (حال شبیر شاہ ہاؤس) کی نمبر ون سیکشن (حال کیانی ڈارم) میں گیا۔ اس سیکشن میں میری لاکر کا نمبر ۴ تھا۔ حسن اتفاق سے تیس برس بعد ۱۹۶۸ء میں اسی سیکشن میں، اسی لاکر پر میرا بیٹا طارق رشید گیا۔ اس کے بعد میرا بھانجا واجد بھی اسی لاکر پر رہا۔ اسی لاکر پر میرے عزیز کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرأت بھی کبھی رہے تھے۔

چند معروف ہم عصر

میرے داخلے کے وقت محمد عنایت کیانی (بعد کو کرنل) کالج نمبر ۳۷۵ ہیڈ لوائے تھے۔

اور کالج نمبر ۴۰۲ ۔حضور احمد خان (بعد کو کرنل اور ایم سی اینڈ بار) وار کس ہاؤس کے ہیڈ بوائے تھے۔

اسٹاف

میجر ٹی۔ ایچ ۔ ایل ۔ اسٹیبنگ ، ایم ، سی کمانڈانٹ کیپٹن لیوس چیف انسٹرکٹر تھے۔ اور چار انگریز وارنٹ آفیسر تھے۔ ان میں سے دو، ریڈ اور ہے ہرسٹ کا نام یاد رہ گیا ہے۔

کالج میں میرے پہلے دو سال

ہر رہائشی ادارے میں شروع کے دن نوگرفتاروں پر بھاری ہوتے ہیں۔ میں خود تو گھبرایا ہوا نہیں تھا نہ بری طرح گھر یاد آتا تھا۔ کہ روتا اور پھڑکتا ہی رہوں جو حالت بعض دوسرے لڑکوں کی تھی۔ لیکن بہرحال ماحول کا دباؤ اپنی جگہ تھا۔ پہلے ہی دن ایک دل شکن صورتحال پیدا ہو گئی۔

پہلے چپل صاف کرو

سہ پہر کو کٹ ملنی شروع ہو گئی۔ اس کو سنبھالنا ہی مشکل ہو گیا۔ شام کو فالن ہو کر نماز کے لئے جانا تھا۔ جس کے لئے کلاہ پر پگڑی باندھنا تھی۔ پگڑی۔ پگڑی۔ پگڑی ہر طرف پگڑی کی پکار تھی۔ جس کو باندھنا کسی کو نہیں آتا تھا۔ دو چار سینیئر پگڑی باندھنے میں مدد بھی کر رہے تھے میری مدد کو ایک سینیئر صاحب آئے اور شرط یہ کہ تم میری چپل صاف کرو تو میں تمہاری پگڑی باندھوں مجھے اس شرط میں سبکی نظر آئی۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ مجھے یہ شرط ماننی پڑی لیکن دل بہت خراب ہوا۔ اس لئے گھر سے میں نے عزت نفس کی تربیت پائی تھی۔ اور یہاں معاملہ بظاہر الٹ تھا میں کسی کا کام کرنے کو برا نہیں سمجھتا لیکن جس طریقے سے اور جس شرط کے ساتھ کسی دوسرے کی چپل صاف کرنا تھا یہ مجھے برا معلوم ہوا۔

اینٹ کا جواب پتھر سے

دوسرا حادثہ دوسرے سال کا ہے یہ ہاکی گراؤنڈ میں پیش آیا۔ ہم لوگ کھیل کر واپسی کے لئے فالن ہونے کے لئے کھڑے تھے ایک سینیئر لڑکے نے جس کا نام فخر تھا سامنے پڑی ہاکی کی گیند پر زوردار ہٹ لگائی جو سیدھی میرے ٹخنے پر آکے لگی۔ میں بھنا گیا میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پاس اینٹ کا ایک ٹکڑا پڑا تھا اسے اٹھایا اور فخر کے دے مارا اس کے یہ اینٹ کا ٹکڑا سر میں لگا وہ دھڑام سے گر پڑا اور اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ سب دوڑ پڑے اور اس کو اٹھا کے اسپتال لے گئے۔ اس صورت حال سے میں پریشان ہوا۔ ساتھیوں نے ڈرانا شروع کیا۔ تم نے ایک سینیئر کا یہ حال کیا ہے اب نہ دوسرے سینیئر چھوڑیں گے اور نہ کمانڈانٹ۔ خدا کا شکر ہے کہ اس تمام واقعہ کو چند دوسرے لڑکوں نے دیکھا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ پہلی غلطی فخر کی تھی۔ بہرحال خدا بھلا کرے ان سینیئرز کا انہوں نے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ اور اسپتال میں جاکر یہ رپورٹ کی کہ کھیلتے میں گر گیا تھا۔ اس واقعہ سے میں نے زندگی بھر کا یہ سبق سیکھا کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے اور یہ بھی کہ طیش میں آکر بدلہ لینے سے ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے وہ تو شکر ہے کہ اس کے زیادہ چوٹ نہیں لگی ورنہ وہ مر بھی سکتا تھا۔

میں نے یہ دونوں واقعات بے کم و کاست اتنی تفصیل سے اس لئے بیان کئے ہیں تاکہ اگر کوئی میرے ۱۹۶۵ء کے ستارۂ جرأت کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہے تو اس مواد سے کر سکے۔

اسپورٹس میں دلچسپی

داخلہ کے وقت میری عمر تیرہ برس کی تھی۔ لیکن ڈیل ڈول کا اچھا تھا۔ اور مضبوط بدن تھا۔ اس لئے بہت جلد ہاکی، فٹ بال اور اتھیلیٹکس میں اپنی جگہ بنالی۔ پہلے ہاؤس ٹیموں میں کھیلا پھر کالج کی سطح پر کھیلنے لگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے اصل جوہر باکسنگ میں کھلے۔

بالکنگ رنگ میں اپنی تگ و دو کی داستان سنانے سے پہلے میں ہاکی کے ایک دلچسپ مقابلے کی روئداد سنانا چاہتا ہوں۔

ہاکی کے جادوگر۔ دھیان چند سے مقابلہ

میں ہاکی میں رائٹ ان پوزیشن کھیلتا تھا۔ بعد کو کالج ٹیم کی کپتانی بھی کی لیکن یہ ۱۹۴۰-۴۱ء کی بات ہے جب میں کالج ٹیم میں کھیلتا تھا لیکن کپتان نہ تھا۔ کہ مشہور زمانہ ہاکی کے سنٹر فارورڈ دھیان چند اپنی ٹیم کے ساتھ کالج میں پریکٹس میچ کے لئے آئے۔ جہلم پنجاب رجمنٹ کا سنٹر تھا۔ یہاں ہر سال ہاکی کے رجمنٹل مقابلے ہوتے تھے جن میں دھیان چند بھی شرکت کرتے تھے اس وقت وہ صوبیدار تھے۔ اوران کے رائٹ ان اکرم بھی صوبیدار تھے۔ (بعد کو دونوں میجر ہو کر ریٹائر ہوئے) دھیان چند ایسے انٹرنیشنل کھلاڑی کا کالج میں آنا اور کالج کی ٹیم کے ساتھ میچ کھیلنا سارے کالج کے لئے ایک خوشگوار حادثہ اور خبر بن گیا۔ سب لڑکوں کا خصوصاً ٹیم کے کھلاڑیوں کا ایکسائٹمنٹ سے بُرا حال تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ کمانڈانٹ اسٹیبنگ کا پیغام آیا کہ ہر گول پر ٹیم کو پچاس روپے انعام ملے گا۔ بہر حال میچ شروع ہوا سیٹی بجی دھیان چند وغیرہ نے غالباً اس خیال سے کہ بچے ہیں ان سے کیا کھیلنا ان کو کھلانا ہی ہے اپنا کھیل بہت سلو ٹیمپو پر شروع کیا۔ لڑکوں نے جان کی بازی لگا دی اور تھوڑی دیر میں ایک گول بھی کر دیا۔ اب کیا تھا لڑکوں نے یک لب کرکے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ دھیان چند اب جاگے کہ یہ کیا ہوا۔ جناب پھر جو ان کی ٹیم نے گول کرنے شروع کئے تو ایک تانتا بندھ گیا۔ ادھر بال ان کے پاس آئے ادھر گول۔ ہم نے کوئی دس بارہ یا اس سے بھی زیادہ گول کھائے۔ لیکن مزہ آگیا اور زندگی بھر کے لئے کہنے کو ہو گیا کہ ہم نے بھی دھیان چند کو کھیلتے دیکھا ہے بلکہ ہاکی کے اس جادوگر کے خلاف کھیلا بھی ہے۔ غرض یہ تجربہ بھی ہماری تربیت کے لئے تھا کمانڈانٹ میجر

سے ملاتے رہتے تھے بلکہ بڑے بڑے مشکل مقابلے بھی کراتے رہتے تھے تاکہ ہمارے حوصلے بلند ہوں اور بلندیوں کا احساس بھی ہوتا رہے۔

باکسنگ کے معرکے

یوں تو میں نے کالج میں، کالج کی سطح تک سب ہی بڑے کھیلوں میں حصہ لیا لیکن میرا اصل میدان باکسنگ تھا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کالج میں باکسنگ کا باقاعدہ آغاز ۴۰ - ۱۹۳۹ء میں ہوا۔ چونکہ باکسنگ ایک ایسا کھیل ہے جس سے لڑنے کی صفات کا امتحان ہوتا ہے اور ان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے باکسنگ کو یہاں کی تربیت میں بہت جلد ایک بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی۔ کمانڈانٹ خود اس میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ اور باکسنگ کے وقت کیڈٹ باکسر کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کرتے تھے۔ میں ہاؤس کی باکسنگ ٹیم سے ہوتا ہوا کالج کی باکسنگ ٹیم تک پہنچا اور ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا بوائز باکسنگ چیلنج کپ میں کالج ٹیم کی کپتانی کی اور وہ ریکارڈ قائم کیا جو آج تک نہیں توڑا جا سکا ہے۔ ۱۹۴۳ء کی کالج ٹیم میں چار ناک آؤٹ کھلاڑی تھے۔ ۸۳۵ حق نواز کیانی۔ ۹۱۴ عافل داد کیانی، میں ۷۵۲ رشید کیانی۔ اور چوتھا ۱۱۳۹، چھاتا محمد حسین بھٹی تھا (اسے حسن اتفاق کہیئے یا کچھ اور کہ ان چار میں سے تین نے ۱۹۶۵ء میں ستارۂ جرأت لئے)

ٹیم کی کارکردگی کالج میں بہت اچھی تھی لیکن اب آل انڈیا چیلنج کپ کے لئے انڈیا بھر کی بہترین ٹیموں سے مقابلہ آپڑا تھا۔ اس مقابلہ کا فائنل پنجاب رجمنٹ کے سنٹر جہلم میں تھا۔ مقابلہ سے ایک روز پہلے کمانڈانٹ میجر اسٹیبنگ خلاف معمول کیڈٹ آفیسرز میس میں میرے کمرے پر آئے اور بولے رشید۔

اپنے لڑکوں کو بتا دو یہ پہلا آل انڈیا چیلنج کپ ہے اسے ہمیں ہر قیمت پر جیتنا ہے

کل ۹ فائنلس ہیں ان سے میں صرف پانچ جیتنا مانگتا ہوں صرف پانچ۔ تم کیا نبول اور راجپوتوں کے لئے یہ کیا مشکل ہے۔ تمہارے بزرگوں نے بڑے بڑے معرکے مارے ہیں نہیں صرف باکسنگ رنگ میں اپنی دلیری اور جی داری کا سکہ بٹھانا ہے۔"

وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے میں نے اپنی ٹیم کو جمع کیا اور کہا " دوستو یہ معاملہ ہے، یہ اب اپنے کالج ہی کی عزت نہیں اپنے خون کی عزت کا سوال بھی ہے۔" مختصر یہ کہ مقابلہ ہوا اور خوب ہوا ہم نے قسم کھائی ہوئی تھی خواہ مر جائیں لیکن پیٹھ نہیں دکھانا ہے۔ ہمت مرداں مددِ خدا کے مصداق، ہم نے ہر توقع کے خلاف اور ہر امید سے زیادہ نو کی نو فائنلس جیتیں جس میں چار ناک آؤٹ فائیٹس تھیں۔ میں نے حق نواز کیانی عاقل داد اور بھٹی نے ناک آؤٹ فائٹ جیتی تھیں۔ اتنی زبردست کامیابی پر جو خوشی کے ہنگامے اور جشن ہو سکتے تھے ان کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کمانڈانٹ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا ہر جگہ کے۔ جے۔ آر جہلم کا نام تھا۔

نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں

پڑھنے لکھنے میں بھی، میں ایسا برا نہیں تھا۔ امتحان کے قریب جان لڑا کے شروع کی آٹھ دس پوزیشنوں میں سے کوئی ایک لے لیتا تھا۔ لیکن سچی بات ہے کہ یہ شوق کی نہیں ضرورت کی بات تھی۔ کالج کا نظام تربیت کچھ ایسا تھا کہ اس میں غیر نصابی سرگرمیوں کی کچھ ایسی زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ جو کچھ لڑکے کرتے اپنے زور پر یا اپنے شوق سے کرتے۔

وائلن کے تار

۴۳-۱۹۴۲ء میں حیدری صاحب کے آنے پر اس صحرا میں کچھ کلچرل سرگرمیوں کے پھول کھلے۔ اس سال میں برڈووڈ ہاؤس میں تھا۔ میری خوش قسمتی سے حیدری صاحب اسی ہاؤس میں ہاؤس ماسٹر ہو کر آئے۔ وہ وائلن بہت اچھا بجاتے تھے۔ مجھے بھی شوق ہوا کچھ دن

ان سے وائلن سیکھتا رہا۔ حیدری صاحب نے ڈراموں، کنسرٹ اور موسیقی کی محفلوں کی داغ بیل بھی ڈالی تھی۔

سن اے شتر سوار میرا پیام لیتا جا

اس زمانے کی ایک مشہور نعت کا مصرعہ ہے اس زمانے میں جمعہ کی نماز کے بعد کبھی کبھی لڑکے نعتیں پڑھا کرتے تھے۔ میں جب کبھی نعت پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا تو اس نعت کی فرمائش ضرور ہوتی تھی۔ مسجد کے امام مولوی عبدالعزیز صاحب تو برسہا برس کے بعد جب بھی کبھی ملے تو یہ ضرور کہا رشید وہ نعت

سن اے شتر سوار میرا پیام لیتا جا

تو سناؤ۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں کرنل مرتضیٰ کے زمانے میں عالمگیر ہنز کی ایک بڑی شاندار ری یونین ہوئی تھی اس موقعہ پر جب میں مغرب کی نماز کے لئے مسجد میں گیا تو مولوی صاحب کی فرمائش یہی تھی۔ رشید وہ نعت! اب میں پھر کالج کی زندگی کی طرف آتا ہوں۔ تعلیم و تربیت اور کھیل غرض ہر شعبہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اتنی اچھی کارکردگی کے باوجود مجھے کوئی پری فیکٹوریل عہدہ ملنے میں بہت دیر لگی اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔

فیگ بوائے (اردلی) ہونے سے گریز

فوجی تربیت کے ایک کلاسیکی اصول کے تحت کہ عہدہ دار کو سب سے نچلی سیڑھی سے شروع کیا جاتے۔ کمانڈانٹ نے عہدہ دینے کا یہ سسٹم رکھا تھا کہ جس کو ترقی دینا ہوتی اسے پہلے کسی سینئر کیڈٹ افسر کا فیگ بوائے بنایا جاتا۔ تاکہ اسے حکم بجا لانے اور زیردستوں کی زندگی کا کچھ اندازہ ہو اسے فیگنگ FAGGING کہتے ہیں کبھی یہ فیگنگ کا سسٹم انگلستان کے پبلک اسکولوں میں بھی رائج تھا۔ اصول برا نہیں تھا۔ وہاں اونچے سے اونچے گھرانے کا لڑکا

جب فیگ بوائے سے شروع ہوتا تو اس کی ساری پھنّے خانی خاک میں مل جاتی اور وہ سینئر اور جونیئر کے تصور کے شکنجے میں کس دیا جاتا۔ لیکن کالج میں فیگنگ کی جو عملی صورت تھی وہ میرے لئے قابل قبول نہیں تھی۔ مثلاً یہ کہ عملاً ایک جونیئر لڑکا ایک سینئر لڑکے کا ذاتی اردلی ہو کے رہ جاتا تھا۔ جس میں اس سینئر کے جوتوں کو چمکانا بھی شامل تھا۔

میری طبیعت کچھ اس قسم کی رہی ہے اور تربیت بھی ایسی ملی کہ میں کسی کی ذاتی غلامی کو پسند نہیں کرتا۔ کوئی ایسا کام جس سے عزت نفس مجروح ہونے کا امکان ہو میں چاہوں بھی تو کر نہیں سکتا۔ چنانچہ اس مزاج کی وجہ سے میں فیگ بوائے بننے سے انکاری رہا اور ترقی رُکی رہی آخر کار دو سال کے بعد مجھے براہ راست جونیئر پریفیکٹ بنا کر بر ڈوڈ ہاؤس میں بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد جب ۴۳-۱۹۴۲ء میں کالج کو جنگی ضروریات کے تحت ایک بٹالین کے طور پر منظم کیا گیا۔ تو ۳۴۳ء محمد اقبال بٹالین کمانڈر، میں سیکنڈ ان کمانڈ اور ۸۳۵ حق نواز کیانی بٹالین ایجوٹینٹ مقرر ہوئے تھے۔ کالج میں آٹھ پلاٹونیں اور چار کمپنیاں تھیں۔ ہر ہاؤس کو ایک کمپنی بنا دیا گیا تھا اور سینئر پریفیکٹ کو کمپنی کمانڈر ہم کیڈٹ آفیسرز میس میں رہتے تھے یہ پہلا موقعہ تھا جب سب کیڈٹس کو اپنے سے سینئرز کو سیلوٹ کرنے کا حکم ملا۔ کالج کی بٹالین کے پہلے کمانڈر کالج نمبر ۳۴۳ء محمد اقبال تھے۔ جو بریگیڈیئر ہو کر اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اس زمانے میں زیادہ زور فوجی تربیت اور کردار کی تعمیر پر تھا۔ کالج کی ساری زندگی اس طور پر گھومتی تھی کہ لڑکوں کو کس طرح زیادہ سے زیادہ مضبوط، جفاکش، خود اعتماد اور ذمہ دار بنایا جائے۔ تاکہ وہ اپنی فوجی ذمہ داریوں کو جلد سے جلد اور موثر سے موثر طریقے سے پورا کر سکیں اس مقصد کے لئے کالج میں کھیلوں اسپورٹس اور لیڈرشپ کی سرگرمیوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی یاد رہے کہ یہ جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا تعلیم میں آرمی اسپیشل کا امتحان آخری منزل تھی۔ آرمی کے دوسرے پیشہ وارانہ امتحانات انگلش، اردو، رومن اردو اور میپ ریڈنگ بھی ہوتے تھے۔

آرمی اسپیشل

اپریل ۱۹۴۳ء میں، میں نے آرمی اسپیشل کا امتحان پاس کیا اور مجھے ان چند سینئر کیڈٹ آفیسرز کے ساتھ جنہیں کمیشن کے قابل سمجھا گیا تھا کچز کالج نوگانگ بھیجنے کیلئے منتخب کرلیا گیا میرے ساتھ جو دوسرے منتخب ہوئے تھے ان میں ۴۳، اقبال، ۲۸، محمد خاں، ۶۸، غلام محمد اور ۸۸، خورشید شامل تھے۔

اساتذہ

اس موضوع پر میں تفصیل سے کالج کی ہسٹری کے لئے لکھ چکا ہوں یہاں اتنا کہنا کافی ہو گا کہ اس وقت کے استادوں اور اسٹاف میں حیدری صاحب، مولوی عبدالعزیز صاحب، رسالدار میجر کامیاب خان صاحب، اور جمعدار ایجوٹینٹ منگا خان صاحب (جو بعد کو میجر ہوئے) اپنے اپنے دائرے میں بہت خوب تھے۔ لیکن کمانڈانٹ میجر ٹی - ایچ - ایل اسٹیبنگ کو میں خوب کی صف میں نہیں "لاجواب" کی صف میں رکھوں گا۔ کمانڈ اور تربیت کے معاملہ میں ان جیسا جامع الصفات آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ بعد کے زمانے میں لوگ کرنل رفیق کی تعریف بھی بہت کرتے ہیں چونکہ میرا ان سے براہ راست تعلق نہیں رہا ان کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن جہاں تک اسٹیبنگ کا تعلق ہے میں نے اپنی اکتیس برس کی سروس میں بھی اپنے کام میں اتنا مخلص، اتنا پرجوش اتنا سخت اور اتنا ہمدرد آدمی نہیں دیکھا۔ یہ صحیح ہے کہ بچپن کے تاثرات بہت گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں اگر اس عنصر کو نکال بھی دیا جائے تو یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بہت ہی کامیاب، موثر اور کارگر انسان تھے۔ انگریزی کے دو لفظ ہیں ڈیڈی کیٹڈ Dedicated اور ڈیووٹڈ Devoted ان کی شخصیت کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

اسٹیبنگ کے طریقِ کار کی چند مثالیں

پہلی بات تو یہ کہ انہیں کالج کا جنون سا تھا۔ سوائے کالج کے زندگی میں دلچسپی کے ہر خانے کو انہوں نے بند کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ صبح پی ٹی سے لے کر رات گئے تک وہ کالج میں گھومتے رہتے تھے۔ رات گئے سوتے میں لڑکوں کو چیک کرتے تھے۔ کہ کہیں سوتے میں منہ کو ڈھکا ہوا تو نہیں ہے مچھر دانی تو ٹھیک لگی ہے کہیں سوراخ تو نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ رات کو پالش شدہ چپلیں کیسے رکھی ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتے تھے۔ لباس اور لاکر کی چیکنگ کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ میں نے کالج میں اپنے پانچ برس کے عرصے میں انہیں کسی پریڈ پر ایک بار بھی ایک منٹ بھی لیٹ نہیں دیکھا مغرب اور جمعہ کی نماز کمانڈانٹ پریڈ کہلاتی تھی اکثر شلوار قمیض میں وہ خود مسجد جاتے تھے جمعے کی نماز کا انسپکشن وہ بڑے اہتمام سے خود کرتے تھے نماز کی پابندی پر جتنا زور اس شخص نے دیا کسی اور نے نہ دیا ہو گا۔ بے جا رعایت کرنا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ ۱۹۷۳ء کے اوائل کا قصہ ہے کہ میں اور حق نواز کیانی کیڈٹ آفیسرز کی پی ٹی پر جو عام لڑکوں سے پہلے ہوتی تھی کوئی منٹ آدھ منٹ لیٹ ہو گئے۔ اسٹیبنگ تو پی ٹی پر بلا ناغہ منہ اندھیرے ہم سے پہلے موجود ہوتے تھے۔ چنانچہ ہم پکڑے گئے اور انہوں نے سارے کیڈٹ آفیسرز کو ایک ہفتہ تک ۹۸ سنگ میل تک (یعنی پانچ میل) دوڑنے کی سزا دی۔ وہ اجتماعی ذمہ داری اور اجتماعی جزا اور سزا کے اصول پہ یقین رکھتے تھے۔ حق نواز کیانی کو انہوں نے کیانی کے والد کی وفات کے بعد اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ وہ ہیڈ بوائے شپ پر ترقی پانے والے ہی تھے کہ ان سے کوئی غلطی ہو گئی چھ کرارے بید ان کے بھی لگے گو بعد کو پروموٹ بھی کر دیئے گئے۔ کسی نے پوچھا "سر، یہ کیا؟" جواب دیا "چند بید غلطی کی سزا تھے پروموٹ ہونا اس کا حق تھا جو اس کو ملا۔"

اب اس عمر کو پہنچ کر جو میں ان کے طریقِ کار کو دیکھتا ہوں تو اس میں تربیت کا ایک خاص

فلسفہ نظر آتا ہے وہ تعلیم سے زیادہ تربیت پر زور دیتے تھے۔ تربیت میں بھی رویوں کی تعمیر کو اہمیت دیتے تھے۔ بحیثیت منتظم کے بھی ان کا ایک فلسفہ کار تھا۔ وہ یہ کہ حکم دے کر اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ حکم کی تعمیل میں وہ جان لڑا دیتے تھے جو بتایا یا کہا، یا حکم دیا تو اس کی چیکنگ اور کاؤنٹر چیکنگ میں وہ انتہا تک پہنچتے تھے ان کے حکم کے دائرے سے کوئی سستی یا نااہلی کی وجہ سے بچ کے نہیں نکل سکتا تھا جب ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء میں ہفتے اتوار کو چھوڑ کر ہر جگہ ہر موقعہ پر انگریزی بولنے کا حکم دیا تو انہوں نے اس پر عمل کرا کے چھوڑا اور یہ تجربہ ہر لحاظ سے کامیاب اور کارآمد رہا۔ اکثر اعتراض ہوتا ہے کہ کالج میں اتنے زیادہ ریجی مینٹیشن سے لڑکوں کی شخصیت دب کے نہیں رہ جاتی ہو گی۔ ہاں اس سسٹم میں یہ نقص ضرور تھا لیکن چونکہ ہر سینئر لڑکے کو موقع موقع سے کوئی نہ کوئی عہدہ ضرور ملتا تھا اس کے ذریعہ سے اس کو اپنی شخصیت کے اظہار اور اپنے INITIATIVE کو نشوونما دینے کا تھوڑا بہت موقع ضرور مل جاتا تھا۔ اور چونکہ ہماری فوجی زندگی میں بھی ریجی مینٹیشن ہے اس لئے اس دور کے کیڈٹ امن و جنگ میں بہتر کمانڈر ثابت ہوتے اور ان میں سے اچھی خاصی تعداد کو فوج کی اونچی سے اونچی کمانڈ کا اہل سمجھا گیا۔

ایک تلخ تجربہ

سٹیبنگ کی اتنی توصیف سے یہ نہ سمجھا جائے کہ مجھے انہوں نے کوئی خاص مراعات دے رکھی تھیں۔ نہیں یہ بات نہیں بلکہ شروع ہی میں ان سے اکھڑ گیا تھا۔ بہت دنوں کے بعد ان سے دل صاف ہوا تھا۔ یہ ابتدائی زمانے کا قصہ ہے کہ گھر چھٹی گیا تو وہاں سے چھٹی بڑھانے کی درخواست دی جو نامنظور ہوئی۔ یہاں آیا تو چارج شیٹ ہو گیا۔ اور سزا کہ آئندہ چھ ماہ تک چھٹی بند۔ اتفاق سے تھوڑے دنوں بعد میرے چچا کا انتقال ہو گیا۔ گھر سے آدمی مجھے لینے آئے لیکن کمانڈانٹ نہ مانے۔ سب نے بہت کہا سنا میں بھی بہت رو

دھویا لیکن کمانڈانٹ کا دل نہ پسیجا۔ ان کی ہاں یا نہ اٹل ہوتی تھی۔ بلکہ اس خیال سے کہ میں زبردستی بھاگ نہ جاؤں مجھے پر گارڈ بٹھادی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر گارڈ نہ بٹھائی جاتی تو میں یقیناً بھاگ جاتا۔ خواہ پھر کچھ ہوتا۔ اس واقعہ کے بعد سے کالج سے میرا دل کھٹا ہو گیا تھا اور میں کمانڈانٹ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ کالج سے نکل جانے کے لئے بہت زور لگایا والدہ راضی بھی ہو گئی تھیں۔ لیکن والد نہ مانے ان کے سمجھانے بجھانے پر میں کالج میں رہنے پر آمادہ ہوا تھا۔ اب کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر اس وقت میں کالج چھوڑ دیتا تو آج کیا ہوتا۔ جو کچھ بھی ہوتا آج جو کچھ ذہنی طور پر ہوں اس سے یقیناً مختلف ہوتا۔

الوداع اے مادر درسگاہ الوداع

اپریل ۱۹۴۳ء کے اواخر میں، میں نے اپنی مادر درسگاہ کو خدا حافظ کہا۔ ان پانچ سالوں میں جو میں نے یہاں گزارے باہر کی دنیا ہی نہیں، میری اپنی دنیا بھی بدل چکی تھی۔ دل امنگوں اور آرزوؤں سے معمور تھا۔ لیکن یہ خبر نہیں تھی کہ آزمائش کا زمانہ ختم نہیں بلکہ اب شروع ہوا ہے۔

کچز کالج نوگانگ کا دور

چونکہ میں سگنل کور کی طرف سے ملٹری کالج میں داخل ہوا تھا اس لئے پہلے سگنل کور کے سنٹر جبل پور میں حاضری دی۔ وہاں سے کاغذات بنوا کر اور کٹ کا سامان لے کر کچز کالج نوگانگ پہنچا۔ یہ مئی ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے۔ کچز کالج ایک طرح کا بڑی کیڈٹ کالج سنٹرل انڈیا کے علاقے بندھیل کھنڈ میں واقع تھا۔ آس پاس پہاڑی علاقہ تھا۔ اس کی دو منزلہ عمارت تھی جو پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اتحادیوں کے قیدیوں نے بنائی تھی۔ کالج کی عمارتوں کے وسط میں لارڈ کچز کا بت نصب تھا۔ کچز کالج کا کمانڈانٹ کرنل ہاروے ملٹری کالج کے اسٹیبنگ کی قسم کا سخت آدمی تھا۔ با اصول اور محنتی سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں تھے۔ سال ڈیڑھ سال کا کورس

تھا۔ خود ہسٹری پڑھاتا تھا۔ کورس کے دوران ہی بس کو کیڈٹ کے لیئے ناموزوں سمجھتا ہے فوراً واپس بھیج دیتا۔ کالج کی سرخ بس اس کے انتظار میں باہر کھڑی رہتی تھی۔ کرنل ہاروے بہت بااصول اور سخت انسان تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک بار اس کے اپنے لڑکے نے کوئی گڑبڑ کی تو اس نے اسے کوارٹر گارڈ میں بند کروا دیا۔ اس واقعہ سے دوسروں کے بھی کان ہوتے کہ یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہاروے کا اپنا فلسفہ ترقی تھا۔ کوئی کسی دائرے میں کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اگر وہ بتدریج تھوڑی بہت ترقی کرتا تو اس سے وہ بہت خوش ہوتا ایک ہندو لڑکا گوپال کرشن تھا بڑا مریل سا باکسنگ میں ایک راؤنڈ بھی نہ سہہ سکا۔ ہاروے سامنے بیٹھا تھا باکسنگ رکوا دی اس کو بہت شاباش دی اور کہا دوسرے راؤنڈ تک جانا۔ اتنی تعریف اس نے میری بھی نہیں کی تھی حالانکہ میں اپنے وزن میں چمپیئن تھا آخری ٹرم کی باکسنگ میں میں نے ایک ہندو لڑکے کو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ خاص طور پر اس لیئے کہ اس نے ایک کمزور مسلمان لڑکے کی بہت پٹائی کی تھی سب مسلمان لڑکوں کا اصرار تھا کہ میں اس کو مزہ چکھاؤں اور میں نے انہیں مایوس نہیں کیا۔

علی بابا کا قصہ

ٹریننگ انسٹی ٹیوشنز کی زندگی عام طور پر سخت ہوتی ہے۔ ہاروے نے کچھ کالج کے شب و روز کو کچھ زیادہ ہی سخت بنا رکھا تھا۔ ہم لوگ تھوڑی سی تفریح کو ترستے رہتے تھے۔ لڑکے بہرحال لڑکے ہی ہوتے ہیں کسی کو چھوڑتے نہیں۔ انہوں نے جہاں آپس میں ایک دوسرے کے نام رکھے تھے وہاں کرنل ہاروے کو علی بابا کا کوڈ نیم دیا۔ ایجوٹینٹ صاحب بھی ذرا عجیب چیز تھے۔ اس لیئے انہیں پھسٹی کے لقب سے نوازا گیا۔ صرف سینیئر لڑکوں کو معلوم تھا۔ کہ علی بابا کون ہے۔ پھسٹی کون ہے۔ باکسنگ وغیرہ میں اس طرح کے نعرے لگتے تھے۔ ویل ڈن ریڈ، گو ہارڈ علی بابا۔ کیپ اٹ اپ پھسٹی، اپ ریڈ، بک اپ علی بابا کرنل ہاروے اور دوسرے انگریز یہی سمجھتے تھے کہ ہم

اپنی زبان میں باکسروں کی تعریف کر رہے ہیں لیکن ایک کالی بھیڑ پرشوتم داس نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ وہ عجیب بے وقوف قسم کی چیز تھا۔ لڑکے اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ایک روز لڑکوں نے شرارت کی ایک گدھا اس کے کمرے میں باندھ کر اسے اس کا ہیٹ اوڑھا دیا اور اس کے گلے میں پرشوتم داس لکھ کر لٹکا دیا اس کمبخت نے ناراض ہو کر رپورٹ کر دی اور ہاروے کو بتا دیا کہ علی بابا کا کیا چکر ہے۔ ہاروے کو بہت غصہ آیا اس مذاق کے سرغنہ کو سرخ بس اسٹیشن لے گئی اس بے چارے کا کمبشن گیا اور دوسرے شہزادوں پر اوس پڑ گئی۔

مایوسیوں کے بادل

کچز کالج کا کورس پورا کرنے کے بعد میں اور بہت سے لڑکوں کے ساتھ دہرہ دون میں سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ یہ ۱۹۴۵ء کے اوائل کی بات ہے۔ میری تیاری بہت اچھی تھی۔ مجھے اور دوسروں کو یقین تھا کہ میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے اختتام نے صورت حال کو بالکل بدل دیا تھا۔ چنانچہ بورڈ نے بہت تھوڑے کیڈٹوں کو منتخب کیا اور میرا نام ان میں نہیں تھا۔ اس غیر متوقع ناکامی نے مجھے بہت مایوس کیا۔ دیکھتے دیکھتے سارا کھیل بگڑ گیا۔

رنگروٹی

کمیشن میں ناکام ہونے پر قاعدے کے مطابق سیالکوٹ سگنل کور کے سنٹر میں رپورٹ کرنا پڑی اب میری حیثیت ایک ریکروٹ کی سی تھی۔ فوج سے ڈسچارج لینا چاہا تو وہ نہیں ملا۔ سنٹر کو میرے کھلاڑی ہونے کا پتہ چلا تو مجھے ہاکی ٹیم میں شامل کر لیا۔ جب سنٹر کی ٹیم جیتی تو میری خاطر تواضع تو بہت ہوئی لیکن وہ میری جان چھوڑنے کو کسی طور آمادہ نہ ہوئے۔ بہرحال کوشش کر کے آرٹلری سروے رجمنٹ میں تبادلہ کرا لیا اور چھنڈورا میں جنگل وارفیئر کی تربیت ملی۔ ۱۹۴۵ء کے آخر میں کوئمبٹور مدراس گیا وہاں ہاکی کھیلتا رہا اور سروے میں انسٹرکٹری کرتا رہا۔ ۱۹۴۶ء میں

وہاں سے سکندر آباد تبادلہ ہوا۔

سہرے کے سرخ پھول

ستمبر ۱۹۴۶ء میں ایک مہینہ کی چھٹی پر گھر گیا۔ تو سہرے کے سرخ پھول میرے منتظر تھے میرے حالات اس قسم کے نہیں تھے کہ ابھی شادی کروں لیکن میں نے والدین کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور ۲۱ سال کی عمر میں ستمبر ۱۹۴۶ء کو بڑی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ اس شادی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ طوائفوں کے ناچ گانے کے بجائے گڑھی شاہو لاہور سے اس زمانے کا مشہور قوال سنتو خاں بلوایا گیا تھا۔

شادی کے بعد میں اپنی یونٹ فرسٹ انڈین سروے رجمنٹ آرٹلری میں واپس چلا گیا جو ان دنوں حیدر آباد کے شہر سکندر آباد میں تھی۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے کچھ عرصہ پہلے یہ یونٹ حیدر آباد آ گئی۔ یہ یونٹ ساری انڈین آرمی میں اپنی نوعیت کی اکیلی یونٹ تھی۔ اس میں ایک شعبہ ریڈار کا، ایک ساؤنڈ رینجنگ کا، ایک فلیش اسپاٹنگ اور ایک سروے کا تھا۔ تقسیم کے وقت اس یونٹ کی چار بیٹریوں میں سے صرف ایک بیٹری پاکستان کے حصے میں آئی۔ جس میں ایک ٹروپ ساؤنڈ رینجنگ کا۔ ایک ٹروپ فلیش اسپاٹنگ کا، اور ایک سروے ٹروپ تھا۔ اس بیٹری نے آگے چل کر ۱۳ سروے بیٹری آرٹلری کا نام پایا اور اسے حیدر آباد سے منتقل کر کے اسکول آف آرٹلری نوشہرہ کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس بیٹری نے توپ خانے کے بڑے بڑے نامور افسر پیدا کئے۔ اور اس کی مدد سے توپ خانے کی کئی سروے رجمنٹیں پیدا کی گئیں۔ اس نے ۱۹۴۸ء میں کشمیر میں، اور ۱۹۶۵ء میں چونڈہ کے مقام پر بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جن کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ اس سے پہلے میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ جس سے ظاہر ہو گا کہ آزادی کے وقت مسلمان سپاہیوں کا موڈ کیا تھا۔ تقسیم کے وقت فرسٹ انڈین سروے رجمنٹ آرٹلری میں مسلمان افسر صرف ایک (کیپٹن شیر دل نیازی بعد کو میجر جنرل نیازی توپ خانے کے مشہور افسر) اور تقریباً ۱۵۰ مسلمان

سپاہی اور ادر رینکس تھے۔ اس کے باوجود ہمارا حوصلہ بہت بلند تھا۔ ایک تو ہم آزاد ہو رہے تھے اور دوسرے آزاد وطن ہی کے ایک حصّے حیدر آباد میں مقیم تھے۔ جبکہ یونٹ کے غیر مسلم اکثریت میں ہونے کے باوجود سہمے ہوئے تھے۔ اس طرح یونٹ کی دو قوموں میں ایک واضح کھنچاؤ موجود تھا۔ ۱۳۔۱۴ اگست کی درمیانی رات کو قیام پاکستان کا اعلان ہونا تھا۔ یونٹ کے حکام نے کسی قوم کے لوگوں کا اپنے طور پر یکجا ہونا منع کر رکھا تھا۔ پاکستان میں ہوتے ہوئے ہم پاکستان کی آزادی کا اعلان بھی نہ سن سکیں یہ کیسے ممکن تھا۔ چنانچہ غیر مسلم اعلیٰ افسروں کے احکامات کے خلاف سب مسلمان مسلم بیرک میں جمع ہوئے اور ریڈیو کو سامنے رکھ کے اس تاریخی لمحے کا انتظار کرنے لگے جب قیام پاکستان کا اعلان ہونا تھا عجیب پرشوق ہیجان تھا جس میں ایک مبہم سا خوف بھی شامل تھا۔ خوف اس بات کا تھا کہ کہیں ہندو اور انگریز آخری لمحے میں بھی کوئی اڑچن نہ ڈال دیں بہرحال ہماری نظریں گھڑی پر جمی تھیں اور کان ریڈیو سے لگے تھے آخر کار ٹھیک بارہ بجے لاہور ریڈیو سے اعلان ہوا کہ یہ ریڈیو پاکستان لاہور ہے۔ ابھی پورا اعلان سنا بھی نہیں تھا کہ پاکستان زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔ میں اور چند ساتھی وہیں فرش پر شکرانے کے نفلوں کے لئے جھک گئے۔ عجیب کیفیت تھی۔ اس پرہیجان مسرت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جس کو غلامی کا تجربہ نہیں وہ آزادی کی لذت کیا جانے۔ بہرحال مجھے اتنا یاد ہے کہ قیام پاکستان کے اعلان کے بعد ایک خصوصی پروگرام ہوا تھا جس میں پنجابی کا ایک نغمہ بھی شامل تھا جسکے بول تھے سانوں تانگاں پاکستان دیاں جو مرزا صاحباں کی دھن میں پیش کیا گیا تھا اور اس وقت وہ نغمہ دنیا کے تمام نغموں سے زیادہ پیارا معلوم ہوا تھا ہم میں سے جو زیادہ زندہ دل تھے وہ اس نغمے کی تال پر بھنگڑہ ڈالنے لگے۔

دوسرے دن سے رجمنٹ کے ہندوستانی حصّے کی کراچی روانگی شروع ہو گئی۔ جہاں سے سمندری جہاز کے ذریعہ انہیں ہندوستان جانا تھا۔ ان کے کنوائے تیار ہونے لگے جن میں سامان کے علاوہ غیر مسلموں کے اہل وعیال کو لے جانے والے ٹرک بھی شامل تھے۔ ہمیں شک گزرا ہمارے

حصے کی ساؤنڈ رینجنگ مشین کا ریکارڈر بھی ہندو ساتھ لے جا رہے ہیں اس کے بغیر ہمارا ساؤنڈ رینجنگ شعبہ بیکار ہو جاتا۔ ہم نے کیپٹن شیر یں دل کو مطلع کیا لیکن وہ کچھ نہ کر سکے۔ دوسرے روز صبح کنوائے کو روانہ ہونا تھا میں نے دوستوں سے کہا اگر یہ ریکارڈر چلا گیا تو پاکستان کا بڑا نقصان ہو جائے گا اس لئے ہر قیمت پر اسے ان سے اگلوانا چاہیئے۔ دوسرے روز صبح سویرے ہم ہاکیاں لے کر پہنچ گئے اور کنوائے کو گھیرے میں لے لیا اور مطالبہ کیا کہ جب تک ریکارڈر نہیں اتارا جائے گا کنوائے کو چلنے نہیں دیں گے۔ کنوائے میں جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ہندو سکھوں کے بیوی بچے بھی تھے انہوں نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ ہندو سکھ الگ مشتعل تھے ہم اپنے مطالبے پر اڑے ہوئے تھے اور رپورٹ ہوتی کمانڈنگ افسر نے صورت حال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ریکارڈر ٹرک سے اتروا دیا اور ہمارے خلاف انکوائری کا حکم دیدیا۔ ہم اپنی بیرک میں چلے آئے۔ کنوائے روانہ ہو گیا۔ ہمارا مقصد حل ہو گیا تھا۔ سب خوش تھے سب سے زیادہ میں خوش تھا۔ کہ خاص طور سے میرے مشورے سے یہ ڈائریکٹ ایکشن ہوا تھا۔ انکوائری سے ثابت ہو گیا کہ ریکارڈر ہمارا تھا۔ سپاہیوں کو تنبیہہ کے ساتھ معاف کر دیا گیا لیکن اس چکر میں کیپٹن شیریں دل کا تبادلہ ہو گیا۔

یہاں سے بیٹری نوشہرہ گئی اور اس کا نیا نام ۱۳ سروے رجمنٹ پڑا۔ اسکول آف آرٹلری کے میجر محمد شفیع اس کے نئے کمانڈر مقرر ہوئے کیپٹن محمد عجائب سروے بیٹری میں واپس آئے۔ کچھ دنوں بعد جب میجر محمد شفیع لیفٹیننٹ کرنل ہو کر آرٹلری سنٹر چلے گئے تو ان کی جگہ میجر ظفر اللہ خاں سروے بیٹری کے کمانڈر مقرر ہوئے ان کے ٹروپ کمانڈروں میں کیپٹن محمد عجائب، کیپٹن شوکت رضا اور کیپٹن محمد سمیع شامل تھے۔ یہ کیپٹن شوکت رضا وہی ہیں جو بعد کو میجر جنرل ہو کر ریٹائر ہوئے اور جنہوں نے آرٹلری کی ہسٹری لکھی ہے۔ کیپٹن محمد سمیع نے فرسٹ ایس پی فیلڈ رجمنٹ کو کمان کیا۔

پاکستان بننے پر مشرقی پنجاب میں قتل و غارت کا جو بازار گرم ہوا اس سے دنیا واقف ہے

مسلمانوں پر جو ظلم و تشدد ہو رہا تھا اس کی داستانیں تباہ حال مہاجروں کے ساتھ پاکستان پہنچیں تو ان کے ردِ عمل کے طور پر یہاں بھی ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ لیکن انہیں بربریت کے ان مظاہروں سے کوئی نسبت ہی نہیں تھی جو مشرقی پنجاب وغیرہ میں رونما ہو رہے تھے جو کچھ میں نے دیکھا وہ یہ تھا عام سندھی مسلمان ہندوؤں سے اتنے مرعوب تھے کہ وہ جانے والے ہندوؤں کو سلام کرتے اور جی سائیں جی سائیں کہتے کہتے ان کا منہ نہیں تھکتا تھا۔ اس رویے کی وجہ سے ہندو عورتیں اپنا سارا زیور پہن کر وہاں سے روانہ ہوئیں اور کم سے کم اس علاقے سے ہندو بڑے ٹھاٹھ سے گئے۔

۴۷ء کے اواخر میں حیدر آباد سے نوشہرہ جانے کے بعد میں ساؤنڈ ٹریننگ ٹروپ میں سپاہی ہی تھا۔ لیکن میری ہاکی کی دھوم تھی۔ سروے رجمنٹ کی ہاکی ٹیم میں اور بھی چند بہت اچھے کھلاڑی تھے چنانچہ سروے بیٹری نے سارے توپ خانے کی ٹیموں کو ہرا کر پہلا ہاکی ٹورنامنٹ جیت لیا۔ ۱۹۴۸ء میں کشمیر کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ سروے بیٹری کو بھمبر کے محاذ پر جانے کا حکم ملا۔ میں بنیادی طور پر ساؤنڈ ریننگ ٹروپ کا رکن تھا محاذ پر سروے ٹروپ کا حکم تھا اسی لئے اسی ٹروپ کو جانا تھا لیکن میں نے اپنے شوق سے محاذ پر جانے کے لئے اپنے آپ کو والنٹیئر کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے محاذ پر جانے کا حکم مل گیا۔ اتفاق سے بلکہ حسن اتفاق سے ان دنوں میری والدہ نوشہرہ میں موجود تھیں محاذ پر جانے سے پہلے خاندانی روایت کے مطابق جب میں اپنی والدہ محترمہ کی دعائیں لینے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے میرے سر پر دست شفقت پھیر کر کہا:

پتر یاد رکھ بدنامی لے کے واپس نہ آویں،

یہ وہ الفاظ تھے جو دادی اماں نے اپنے بڑے بیٹے یعنی میرے والد سے ۱۹۱۵ء میں اس وقت کہے تھے جب وہ انہیں جہلم ریلوے اسٹیشن پر مصر جنگ پر جانے کے لئے الوداع کہہ رہی تھیں

اکتوبر ۱۹۴۸ء کی کوئی تاریخ تھی جب میں سروے ٹروپ کے ساتھ گجرات پہنچا۔ وہاں سے کوٹلہ کے راستے لکڑمنڈی پہنچے۔ چھمب جوڑیاں کے مغرب میں جب ہماری جیپ رات کو پُرخطر راستوں سے گزر رہی تھی تو ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی گدھے پر کچھ سامان لادے جارہا ہے ہمیں تجسس ہوا کہ کون ہے اور کیا لے جارہا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک سویلین رضاکار ہے جو مجاہدوں کے لئے کمبل لے جارہا ہے یہ انتہائی مشکل اور خطرناک کام تھا۔ جو یہ شخص تن تنہا انجام دے رہا تھا۔ سچ ہے کہ جب دل میں محبت ہو تو نہ کوئی مشکل مشکل لگتی ہے اور نہ کوئی خطرہ خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ کشمیر کی لڑائی میں خاص طور سے قومی جوش و جذبے کی ایسی ایک نہیں بے شمار مثالیں دیکھنے میں آئیں۔ لکڑمنڈی تک تو جیپیں جاسکتی تھیں اس کے بعد ایسا پہاڑی علاقہ تھا جہاں گاڑی کا گذر نہیں ہوسکتا تھا۔ اس سے آگے خچروں اور قلیوں کے ذریعے سامان پہنچایا گیا اس کے بعد سارا سامان خود اٹھانا پڑا۔ پانچ چھ میل دشوار گزار پہاڑی سفر طے کرکے ہم ببوٹ گاؤں پہنچے۔ جہاں کشمیری مجاہدوں کے کچھ جتھے نظر آئے۔ پاکستانی فوج ایف ایف کی ایک کمپنی تھی۔ جو ایک وسیع و عریض علاقے کی نگرانی کررہی تھی۔ سروے ٹروپ کے کمانڈر کیپٹن ملک تھے۔ ہماری ذمہ داری یہ تھی کہ ہم محاذ کے سامنے کے بیس میل کے علاقے کا خفیہ طریقے سے سروے کریں۔ جو ہم نے جان جوکھوں میں ڈال کے جلد پورا کرلیا۔ اور ہنستے کھیلتے پورا کیا۔ اور کچھ سروے ٹروپ پر ہی منحصر نہیں ان دنوں کچھ جوش و جذبہ ہی ایسا تھا کہ جو جہاں تھا بے چین تھا کہ کسی طرح پاکستان کے لئے کچھ کرے۔ فرض کی لکیر سے بہت آگے۔ جس طرح ماں اپنے بچوں پر وارے جاتی ہے اور تن من دھن کی پرواہ نہیں کرتی اسی طرح ان دنوں پاکستان کے بیٹے اپنی مادر وطن پر وارے جانے کے لئے بے قرار تھے اور بری طرح بے قرار تھے۔ اس جاں نثاری کے جذبے کی وجہ سے کوئی کام ناممکن کیا مشکل ہی نظر نہیں آتا تھا۔ جس نے بھی کشمیر آپریشن میں حصہ لیا ہے وہ اس اسپرٹ کی ایک نہیں ہزار مثالیں دے سکتا ہے میں صرف یہاں صرف واقعہ اور بیان کروں گا۔ بھاری توپوں کو پہاڑی راستوں سے ببوٹ گاؤں اور بھمبر کے سامنے والے پہاڑ چنا کا تک پہنچانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ جب

توپ خانے والوں نے اس مسئلہ کو انجینئرز کے سامنے رکھا تو انجینئرز جوش میں آ گئے "بادشاہو یہ کون سا بڑا کام ہے تسی حکم کرو پھر دیکھو کہ کس طرح پہاڑ کا سینہ چیرتے ہیں" اور پھر واقعی انجینئرز نے بظاہر ایک ناممکن کام کو ممکن کر دکھایا اور بھاری توپیں ان چوٹیوں پر پہنچ گئیں۔ جہاں پہلے آدمی کا پہنچنا مشکل نظر آتا تھا یہ صرف احساس فرض نہیں تھا۔ احساس محبت تھا۔

جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اسی طرح ماؤنٹین رجمنٹ کی کارکردگی بھی حیران کن اور قابل فخر تھی۔ جس طریقے سے کشمیر میں جوابی حملہ کی تیاری کی گئی تھی۔ وہ ایک علیحدہ تاریخی داستان ہے میں یہاں صرف اس جوش و جذبے کی بات کر رہا ہوں جو اس آپریشن میں عام تھا۔ بات لمبی ہوتی جاتی ہے لیکن ایک اور واقعہ کا ذکر کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہ فائر بندی سے کچھ دنوں پہلے کا قصہ ہے کہ دشمن نے بیوڑٹ گاؤں میں ہماری پوزیشنوں پہ گولہ باری کی جو اتنی شدید تھی کہ ٹیلی فون کی تاریں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ سروے والوں کی تاریں بھی متاثر ہوئیں یونٹوں کا ایک دوسرے سے رابطہ جو اتنا اہم ہوتا ہے منقطع ہو گیا۔ خیال یہی تھا کہ جب تک فائر بند نہ ہو جائے تاروں کی مرمت ممکن نہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سگنلر بھاگتا ہوا آیا اور ٹیلی فون کی تاریں ٹھیک کرنے لگا۔ اس کے آس پاس گولے گر رہے تھے۔ پھٹ رہے تھے۔ پتھروں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ لیکن اس سگنلر نے بڑے اطمینان سے بلکہ بڑے پیار سے تاروں کو جوڑنا شروع کیا۔ یوں جیسے کچھ ہوا نہیں جس جس نے اسے دیکھا حیران رہ گیا میں اس ان پڑھ دیہاتی سے سگنل مین کو سلام کرتا ہوں۔ اس نے موٹی ویشن پر لیکچر سنے تھے یا نہیں اس نے ہیرو بننے کے خواب دیکھے تھے۔ یہ میں نہیں جانتا لیکن جو میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کا جذبہ سچا اور کھرا تھا۔ وہ صحیح سپاہی تھا۔ جب اسے وہیں کھڑے کھڑے لانس نائیک بنایا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ کچھ حیران تھا۔ قدرے اداس بھی جیسے کہہ رہا ہو یہ جو کچھ میں نے کیا وہ اس لئے تو نہیں کیا تھا اور اگر یہ قسمت سے تو

بہت کم قیمت ہے۔ آج جبکہ میں یہ واقعہ بیان کر رہا ہوں تو اس سپاہی سے کہنا چاہتا ہوں "میرے بھائی خدمت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ محبت کا کوئی صلہ نہیں ہوتا۔ احسان کا کوئی بھاؤ نہیں ہوتا، تم قابلِ فخر ہو، تم قابلِ عزت ہو، تم قوم کے محسن ہو، تم اس ملک کے عظیم سپوت ہو، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ۔ تمہارا معاملہ خدا کے ساتھ ہے بندوں کے ساتھ نہیں ہے۔ اور کتنے مجاہد ہیں اور کتنے جانباز ہیں جو خاک و خون میں مل گئے جو پاکستان کی آن پر خاموشی سے قربان ہو گئے نہ کہیں قبر بنی نہ کبھی چراغ جلا۔ نہ کوئی تمغہ ملا نہ کسی تاریخ میں کبھی نام آیا۔ اے قوم کے گمنام شہیدو، گمنام غازیو! تمہیں رشید کا سلام پہنچے۔ تمہیں ساری قوم کا سلام پہنچے۔"

بھمبر سے مجھے نوشہرہ میں ہاکی ٹورنامنٹ میں حصہ لینے بلایا گیا یہاں آکر ایک اور گل کھلا وہ یہ کہ کبھی ۱۹۴۷ء میں، میں نے انڈین جی ایچ کیو کو کمیشن کے لئے درخواست دی تھی وہ پاکستانی جی ایچ کیو کے کاغذات میں پڑی رہی۔ ۱۹۴۹ء کے اوائل میں میری تعدیر نے یاوری کی اور اس درخواست پر حکم ہوا کہ پشاور جا کر کمیشن کا تحریری امتحان دوں۔ جب یہ سگنل سروے ٹروپ میں پہنچا تو سب کو حیرت اور خوشی ہوئی اور سب سے زیادہ مجھے۔ مختصر یہ کہ کوہاٹ میں آئی ایس ایس بی اپنے کے بعد مجھے ڈائریکٹ کمیشن دیا گیا اور سروے بیٹری کے کمانڈر کی زبردست سفارش پر مجھے ۱۵ جون ۱۹۴۹ء سے اپنی پرانی بیٹری میں اے ٹروپ کے کمانڈر کے طور پر تعینات کیا گیا اللہ کا شکر ہے کہ ملٹری کالج کی تربیت کی وجہ سے اس اعتماد پر پورا اتر سکا۔

میری عمر کے لوگوں کو یاد ہو گا کہ ۱۹۵۰ء میں لیاقت علی خان شہید کے دورِ وزارت میں پاکستان پر ہندوستانی حملے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ملک میں بڑے پیمانے پر فوجی نقل و حرکت ہوئی تھی، اسی سلسلے میں، میں اپنی سروے بیٹری کے ساتھ قلعہ دیدار سنگھ گوجرانوالہ میں کیمپ کئے ہوئے تھا کہ ایک روز یکایک مجھے خیال آیا کہ گوجرانوالے میں ۸۸ے خورشید رہتا ہے۔ چلو اس سے ملتے ہیں خورشید ملٹری کالج میں میرے ساتھ تھا۔ نہ صرف

ساتھی تھا۔ بلکہ یار غار تھا۔ کالج سے کچز کالج بھی وہ میرے ساتھ گیا تھا اس کا کچز کالج جانا بھی تقدیر سے تھا۔ وہ اکہرے بدن کا نازک سا لڑکا تھا اور قدرے چھوٹا تھا یوں ٹھیک ٹھاک تھا۔ بلکہ کالج کے بعض ممتاز لڑکوں میں سے تھا۔ کمانڈنگ کرنل اسٹیبنگ نے اسے کچز کالج کے لئے منتخب کیا تو وہ ذرا جھجکا وہ کالج میں ایک سال اور لگانا چاہتا تھا۔ اس موقعہ پر کرنل اسٹیبنگ نے جو فقرہ کہا وہ آج بھی مجھے یاد ہے۔ اسٹیبنگ بڑی نظر رکھتے تھے انہوں نے خورشید کو صحیح پرکھا تھا۔ خورشید کچز کالج بھی گیا اور کمیشن بھی لیا۔ اس کے بعد اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی پرانے سنگی ساتھی سے ایک عرصے کے بعد ملاقات کی توقع پر دل کی جو حالت ہوتی ہے وہ حالت میری تھی۔ بڑی مشکل سے خورشید کا گھر ملا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کے بوڑھے والد نکل کر آئے پوچھا کون ہو کیسے آئے ہو میں نے کہا رشید میرا نام ہے خورشید کا ملٹری کالج کا کلاس فیلو ہوں۔ خورشید کا نام آنا تھا کہ وہ رو پڑے مجھے گلے لگا کے بولے۔ بیٹے خورشید کو پوچھتے ہو۔ خورشید اب کہاں۔ بار بار کہتے تھے خورشید اب کہاں۔ خورشید اب کہاں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ خورشید کسولی یوپی انڈیا میں ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلم فسادات میں مسلمانوں کو بچاتا ہوا شہید ہوا۔ تو پھر میرے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ اے ارض وطن۔ اے پاک وطن تجھ پر ہم نے اپنے کیسے کیسے چاند تارے لٹائے ہیں۔

اب جو لوگ یہاں ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے ہیں انہیں کیا خبر کہ پاکستان کا قافلہ کن پیاسے صحراؤں۔ کن آگ اگلتے ریگ زاروں سے گزرا ہے۔

شادباد منزل مراد

۱۹۵۰ء کے اوائل میں میں نے نوشہرہ میں گنری کورس کیا اور ۲ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری لاہور میں پوسٹ ہوا۔ لاہور میں میری سسرال تھی خوش ہوا کہ اب کچھ دن چین سے گزریں گے لیکن صحرانورد کی قسمت میں آرام کہاں۔ یونٹ کے پاس پی ٹی کورس کی جگہ تھی۔ چونکہ یہ ٹیڑھی کھیر تھی اس لئے قرعہ فال میرا نام نکلا یا نکالا گیا میرا تو زندگی کا فلسفہ ہے کہ نوکری میں گلہ نہیں کرنا اور مشکل سے

مشکل کام سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ چنانچہ میں ہنسی خوشی پی ٹی اسکول کا کورس کیا اور خوب فائدہ اٹھایا اور لطف بھی۔ پی ٹی اسکول کی بیشتر مشقوں کا ریہرسل میں ملٹری کالج میں کر چکا تھا اس لئے یہ کورس میرے لئے پانی تھا۔ اس کورس نے بہتوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ پی ٹی کورس کی خوشگوار یادوں میں سے ایک یاد پی ٹی کے استاد گولا خان کی ہے جن کا نک نیم شاٹ پٹ خاں تھا جو یوں تو بڑے سخت تھے لیکن نوجوانوں کی نفسیات سے واقف تھے۔ یہ جانتے تھے کہ کبھی سختی کرنی چاہیئے اور کبھی ڈھیل دینی چاہیئے۔ آواز اچھی تھی جب ترنگ میں ہوتے تو بڑے مزے سے گاتے بھی تھے۔ خدا بھلا کرے ایک لیفٹیننٹ دلاور بٹ تھے ان کے گلے میں بھی سر تھا۔ بہت اچھا گاتے تھے۔ کورس میں جسمانی مشقت انتہا درجے کی تھی۔ جس کا علاج بعض بے سی او زنے دودھ میں گھی ملا کر پینے میں ڈھونڈا۔ جب بعض افسروں نے یہ نسخہ آزمانا چاہا تو پانسہ پلٹ گیا۔ پھر ایک فقرہ چل نکلا ہور چوپو —— پی ٹی اسکول کے کورس کے دنوں میں پی ایم اے کی کینٹین میں جا کر کھانا پینا بھی ایک عیاشی سے کم نہیں تھا اس لئے جب وقت ملتا تو دوستوں کے پاس چلا جاتا۔ اس زمانے میں پی ایم اے میں ایک سارجنٹ میجر ڈفل ہوتے تھے بلند بالا قد تھا اور عام سارجنٹ میجروں کے خلاف ہنس مکھ اور خوش مزاج تھے ان کا ایک فقرہ جو بہت چلا ہوا تھا یہ تھا۔ Don't walk like a pregnant Duck, Sir!

ڈفل کی زندہ دلی کا یہ عالم تھا کہ کینٹین میں بیوی کے ساتھ آتے اور سامان خریدتے تو باقاعدہ ساتھ ڈرل بھی کرتے ایک دو تین پہ ایک دم اس کی بیوی باسکٹ اٹھا لیتی یہ تماشا بھی زندہ دلی کا انداز تھا۔ ویسے بڑا سخت تھا۔ افسروں کا پسینہ نکال کے چھوڑتا تھا۔

آرٹلری سنٹر میں پوسٹنگ

پی ٹی کورس میں اے ایکس گریڈ حاصل کرنے سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ آرٹلری سنٹر کیمبل پور میں میری پوسٹنگ پی ٹی افسر کے طور پہ ہو گئی۔ یہ کام میری صلاحیتوں کا بڑا سخت امتحان تھا۔

۵۲-۱۹۵۱ء میں جب میں پہلی مرتبہ آرٹلری سنٹر کیمبل پور میں پوسٹ ہوا تو سنٹر کمانڈانٹ ایک انگریز کرنل تھے۔ یہ ایک بردبار قسم کے آدمی تھے۔ سنٹر کے کام کے علاوہ انہیں کوئی کام نہ تھا۔ ان کی یادگار وہ بے شمار شیشم کے درخت ہیں جو انہوں نے سنٹر کے علاقے میں لگوائے تھے۔ یہ پودے آج تناور درخت بن چکے ہیں۔ انسان ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے اچھے یا بُرے کام کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ان کے اچھے یا بُرے نتائج کبھی محسوس طریقے سے اور کبھی لامحسوس انداز سے باقی رہتے ہیں۔ یہی انسان کی جیت ہے۔ یہی انسان کی ہار ہے۔

انگریز کمانڈانٹ کے بعد کرنل وصی الدین (بعد کو لیفٹیننٹ جنرل وصی الدین) آرٹلری سنٹر کے کمانڈانٹ مقرر ہوئے تھے اور ان کی جگہ کرنل بعد کو بریگیڈیر عباس بیگ (ایم سی نمبر ۱۹۱) نے لی۔ سنٹر میں میں نے اس پہلی پوسٹنگ کا زیادہ عرصہ عباس بیگ صاحب کے ساتھ گذارا۔ پی ٹی افسر کی حیثیت سے پہلی بار میری قائدانہ صلاحیتیں کسوٹی پر کسی گئیں جس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں سنٹر یعنی توپ خانے کے افسروں کی ری یونین کا انعقاد ہوا۔ اس میں اپنے حصے کی ذمہ داری میں نے ذوق شوق سے ادا کی۔ فرسٹ ماؤنٹین بیٹری کی صدسالہ تقریبات بھی اسی زمانے میں ہوئیں۔ ان کے انتظامات میں بھی میں نے زور شور سے حصہ لیا۔ جنرل محمد ایوب خان مہمان خصوصی تھے مجھے یاد ہے کہ انہوں نے ایک شاندار سیاہ گھوڑے پر سوار ہو کر پریڈ کی سلامی لی تھی ان کی شان اور چھب دیکھ کر اپنے تو اپنے غیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے تھے۔ واہ واہ کیا جرنیل ہے۔ کیا شان ہے۔ ہر ایک یہی کہہ رہا تھا۔

کپتانی کے عہدے پر ترقی

۱۹۵۳ء کے اواخر میں میری کپتانی آگئی۔ چونکہ سنٹر کی ٹی، او، اے میں پی ٹی افسر کی پوسٹ لیفٹیننٹ کی تھی اس لئے پروموشن کے ساتھ میرا سنٹر سے تبادلہ یقینی تھا لیکن سنٹر کے کمانڈانٹ کی نظر نے میرے اندر نہ جانے وہ کون سے ہنر دیکھے کہ کیپٹن کی حیثیت سے میرا تبادلہ سنٹر کی

ہیڈ کوارٹر بیٹری ہی کروا لیا۔ یہ سنٹر کی سب سے بڑی بیٹری تھی جس کی نفری تقریباً تین ہزار تھی اور کام بھی حد درجہ الجھا ہوا۔ یہاں آ کر میری صلاحیت کا کا نہیں میرے کُٹس کا امتحان بھی ہوا۔ اور بار بار ہوا۔ ماں باپ کی اور کالج کی تربیت کچھ ایسی تھی کہ نہ کبھی خود قانون کے خلاف چلا اور نہ کسی کو چلنے دیا۔ اپنا کام سولہ آنے اور نوکری سرکار کی افراد کی نہیں۔ اس روش کے جو نتائج ہو سکتے تھے وہ ہوئے لیکن سر اٹھا کے چلنا نہیں چھوڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری اس اصولی کج ادائی کی ہمیشہ لاج رکھی۔ جب میں پی ٹی افسر تھا۔ اور سنٹر کی ہاکی ٹیم کا کپتان تھا تو میں نے سنٹر کے ایجوٹینٹ سے کہا۔ سر اب آپ کی عمر ہاکی کھیلنے کی نہیں رہی۔ اس لئے کیا بہتر نہ ہو گا کہ آئندہ سنٹر کی ٹیم میں کھیلنے کی زحمت نہ کریں۔ یہ نرم سا جملہ کوئی بم تھا جو بڑے زور سے پھٹا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ بم پھٹے تو کیا ہوتا ہے لیکن خدا نے مجھے اس کے آتشیں ٹکڑوں سے محفوظ رکھا۔ اسی طرح ایک بار یہ طے ہوا کہ ہیڈ کوارٹر بیٹری کے سب افراد کی اے سی آر بحیثیت بیٹری کمانڈر کے میں لکھا کروں گا۔ کمانڈانٹ کرنل عباس بیگ کے دستخطوں سے یہ فرمان جاری ہو گیا اور میں نے اے سی آر لکھنا شروع کر دیا لیکن کمانڈانٹ کے پی اے نے اپنی اے سی آر ایجوٹینٹ سے لکھوا کر کمانڈانٹ سے دستخط کروا لئے۔ میں نے فوراً کمانڈانٹ سے انٹرویو لے لیا۔ اور ان کے اقدام کے خلاف ان ہی سے اپیل کی۔ عباس بیگ بھی بڑے دھڑلے کے کمانڈانٹ تھے۔ لیکن انہوں نے قانون اور اصول کا لحاظ کیا۔ اور اس اے سی آر کو منسوخ کر دیا۔

میں چونتیس سال یونیفارم میں رہا اور ایسے موقعے بارہا آئے جب قانون اور اصول کی خاطر میں نے اپنے کیریئر کو داؤں پر لگایا۔ میرا تجربہ ہے کہ جس کی طرف اصول ہو وہ مضبوط ہوتا ہے یا کم از کم اپنے آپ کو مضبوط محسوس کرتا ہے۔ اور سر اٹھا کے چلتا ہے۔ محنت، دیانت اور خدمت سے بڑھ کر کوئی تریاق نہیں۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں میری پوسٹنگ ۲ فیلڈ رجمنٹ کوئٹہ میں ہوئی اس کے سی۔ او کرنل اختر تھے۔ اور ٹو آئی سی میجر عطا محمد (بعد کو ایک نامور بریگیڈیئر اور گورنر پنجاب کے مشیر) ان کی شخصیت بڑی دلچسپ اور متنوع تھی۔ بڑے ——————

زور شور سے ہاکی کھیلتے تھے۔ رجمنٹ میں ایک ہاکی ٹیم میری اور دوسری عطا محمد صاحب کی تھی۔ جب دونوں ٹیموں میں میچ ہوتا تو لوگ میچ دیکھنے کم عطا محمد صاحب کے تبصرے سننے زیادہ آتے تھے۔ لے جا شیرا۔ لے جا شیرا۔ چھوڑنا نہیں کا گرج دار نعرہ بار بار بلند ہوتا۔ چھوڑنا نہیں کا اشارہ میری طرف ہوتا تھا۔ ہم بڑے اچھے دوست تھے لیکن ہاکی کے میدان میں بھوکے شیروں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹتے تھے۔ ہائے کیا دن تھے۔

جوانی کے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ میری جوانی دیوانی تو نہیں تھی۔ لیکن دو ایک خبط ضرور تھے ایک کتا روبی تھا۔ جو چہار درویش کے خواجہ سگ پرست کے کتے کی طرح ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا۔ اور میں اس کے بڑے نخرے اٹھاتا تھا۔ کراچی میں اے۔ اے کے بریگیڈ کے ہاکی کے مقابلوں میں روبی میرے ساتھ تھا۔ جب میری ٹیم کراچی سے جیت کے آئی تو کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پر کرنل اختر پورے بینڈ باجے کے ساتھ ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ میرے ڈبے سے روبی میرے ساتھ اترا اس کی بھی خوب پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد جو دعوتیں ہوئیں ان میں بھی روبی کو نظر انداز نہیں کیا گیا اسی زمانے میں مجھ پر یہ خبط سوار ہوا کہ خالص السیشن کتے کو خالص بھیڑیے سے کراس کراؤں چنانچہ ایک مادہ بھیڑیے کا بچہ حاصل کیا گیا پھر اس کو بڑے لاڈ سے پال پوس کے بڑا کیا۔ وہ بھیڑن میرے کتے کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ میں اس زمانے میں سارے کوئٹہ میں پہلے ہاکی والا کپتان پھر بھیڑیئے والا کپتان مشہور ہو گیا تھا۔ میرے اس خبط کو میرے سی او نے باہر اور میری بیوی نے گھر کے اندر برداشت کیا اور بہت برداشت کیا اب خیال آتا ہے تو شرمندہ ہوتا ہوں کہ میرے ان نامعقول شوقوں کی وجہ سے ان دونوں کو خاص طور سے میری بیوی کو کتنی تکلیف اٹھانی پڑی ہوگی ــــــــــ میں اپنے سی او اور اپنی بیوی دونوں کو داد دیتا ہوں۔ کرنل اختر نے اپنے رویے سے مجھے یہ سبق سکھایا کہ بڑوں کا ظرف بھی بڑا ہونا چاہیئے اور باصلاحیت کارپرداز اور منچلے جونیرز کی بعض ناپختہ لیکن بے ضرر حرکتوں کو نظر انداز کرنے کا سینیرز کو حوصلہ ہونا چاہیئے اور میری بیوی نے جس طرح بھیڑیئے کے بچے کو میری خاطر پال پوس کر بڑا کیا۔ اور میرے کتے کے

جس طرح نخرے اٹھائے اس سے مجھے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ محبت سے انسان خود بھی بدلتا ہے اور دوسرے کو بھی بدل دیتا ہے۔ خدمت میں عظمت ہی نہیں طاقت بھی ہے۔

۲ فیلڈ رجمنٹ کوئٹے میں میرے قیام کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک بار ہمیں اسٹاف کالج کے لئے آرٹلری کی فائرنگ کا مظاہرہ پیش کرنا تھا۔ آرٹلری فائر میں غلطی ناقابل معافی ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں غیر معمولی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ اتفاق دیکھیئے کہ اس بار تین دفعہ غلطی ہوئی۔ دو بار ایک افسر سے اور ایک بار ایک بہت تجربہ کار این سی او سے جو برس ہا برس کے سروس کے بعد چند روز میں پرموٹ ہونے والا تھا۔ اس ڈیمانسٹریشن کے فلاپ ہو جانے سے جو ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو سکتا تھا اس کا تصور آپ کر سکتے ہیں۔ انکوائری ہوئی۔ ہم نے اس این سی او کی شاندار گذشتہ کارکردگی کی وجہ سے اسے بچانا ضروری سمجھا۔ افسر کی جو خاطر تواضع ہوئی تو وہ ہوئی لیکن سیکنڈ ان کمانڈ میجر عطا محمد صاحب جلال میں آگئے۔ انہوں نے سب کو ایک ہفتے تک رات کو تیس میل مارچ کی سزا سنا دی۔ ہم میں سے ایک دو نے کہا یار ہم نے تو کچھ نہیں کہا۔ ہم کیوں رگڑے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا اس لئے کہ ہم ایک ہیں۔ ایک کی غلطی سب کی غلطی ہے پھر کسی نے کہا کہ چلو معافی مانگ لیتے ہیں۔ اس کا جواب میں نے یہ دیا کہ جن حالات میں اور جس وجہ سے یہ سزا ہمیں ملی ہے اسے محفوظ رکھتے ہوئے معافی مانگنا شیوۂ مردانگی کے خلاف سمجھتا ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم پوری سزا بھگتیں۔ غرض ایک ہفتے تک شام سے صبح تک یہ ڈرامہ ہوتا۔ لوگوں کا برا حال تھا۔ لیکن معافی کسی نے نہیں مانگی۔ ساری یونٹ کو علم تھا کہ ہم نے ایک جونیئر کو بچایا ہے اور ایک ساتھی کے لئے سزا بھگت رہے ہیں۔ ہمارے اس رویے نے ہمیں یونٹ میں ہیرو بنا دیا۔ پھر تو ہماری وہ گڈی چڑھی کہ حد نہیں اس تجربے سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ فزیکل کریج اور مارل کریج کے بغیر افسر افسر نہیں بنتا۔ جوانوں کو ایک ہیرو کی تلاش ہوتی ہے۔ اگر ان کے سینیئر افسر میں ہیرو کا کوئی وصف نہ ہو تو بات نہیں بنتی۔

نومبر ۱۹۵۴ء میں ملک بھر میں ایک ہمہ گیر فوجی مشق ہوئی تھی۔ جس میں تقریباً ساری آرمی شریک تھی۔ اس میں شرکت کے لئے ہماری یونٹ کو کوئٹے سے لاہور آنا تھا۔ یہ لمبا سفر تھا۔ راستے میں خانیوال پڑتا تھا۔ جہاں میرے والد اپنی زمینوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ میں چند گھنٹے نکال کے ان سے ملنے گیا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر یکایک بولے رشید تو آ گیا۔ بڑا اچھا ہوا۔ تجھ سے ایک خاص مشورہ کرنا تھا۔ میں نے چونک کر کہا۔ خیر تو ہے۔ کیا بات ہے بولے میں سوچتا ہوں اپنی زمین اور جائیداد کی تقسیم اپنی زندگی میں کر جاؤں۔ تاکہ میرے بعد زمین اور جائیداد تم بھائیوں میں وجہ نزاع نہ بنے۔ میں نے ادب سے کہا۔ زمین اور جائیداد پر نزاع ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوا تو آپ کی تربیت کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ ایسا ہرگز نہ ہو گا۔ دوسرے یہ کہ یہ زمین آپ کی ہے۔ آپ کو بہادری کے انعام میں ملی ہے۔ آپ اس کے مالک ہیں آپ ہی تو کہتے ہیں۔ کہ گھوڑا اس کا ہوتا ہے جس کی ران تلے ہو۔ آپ ابھی سے زمین جائیداد تقسیم کر کے اپنی طاقت اور اختیار کم نہ کریں۔ آپ کی اولاد اللہ کے کرم سے اپنے پیروں پر کھڑی ہے۔ سب آپ کی دعاؤں سے خوشحال ہیں آپ کو کیا پڑی ہے کہ کل کو دوسروں کا منہ دیکھیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے والد نے مجھ سے اتفاق کیا اور خوش ہو کر مجھے دعائیں دیں۔ اس واقعہ کے اکیس برس بعد ۱۹۷۵ء تک وہ جیے۔ اپنا پیسہ اپنے پاس رکھا اور شاہانہ انداز سے خرچ کیا۔ افسوس ہے اس اولاد پر جو اپنے والدین کی جائیداد پر نظر رکھتی ہے۔ کل کو ان کی اولاد ان سے برا سلوک کرے گی۔

نومبر ۱۹۵۴ء کی مشق میں ایک اور واقعہ ایسا پیش آیا جس سے میں بال بال بچا۔ اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس اکسرسائز کے دوران ایک سپاہی اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر سو رہا تھا۔ میں نے باز پرس کی تو وہ اور جھوٹ بولنے لگا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کے پیٹ میں باکسنگ کا ایک مکا جڑ دیا۔ وہ آہ کر کے تڑپنے لگا۔ پھر بے ہوش ہو گیا۔ بمشکل اسے ہوش آیا۔ تو میری جان میں جان آئی۔ پھر اس نے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ میں نے بھی اظہار افسوس کیا۔ بات رفع دفع ہوئی اس وقت تو اپنا مطلب رکھنے کے کہہ دیا یہ لڑائی کی رسم ہے۔ آئندہ بھی جس نے غلطی کی

اس کی اسی طرح توانعم ہوگی۔ چارج شیٹ مجھے بنانے کی فرصت نہیں، لیکن دل میں میں نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی غیر قانونی حرکت نہیں کرنی۔ اتفاقات اور حادثات پر کسی کا بس نہیں ہوتا۔

۱۹۵۵ء میں میرا تبادلہ کوئٹہ ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں افغان سرحد پر ایک خفیہ مشن کے لئے والنٹیر مانگے گئے تھے۔ اس اہم تادیبی ایکشن کے لئے جو پانچ جاں باز افسر چنے گئے۔ ان میں سے چار افسر یعنی کیپٹن اکبر، کیپٹن ذوالفقار، میجر محمد خان ۲۸، ۲۷ اور میں ۵۲، ملٹری کالج کے تھے۔ یہ مشن ابتدائی ناکامیوں کے بعد آخر کار اللہ کے فضل وکرم سے مکمل طور پر کامیاب ہوا۔ اور اس کامیابی میں اس تربیت کا خاصا دخل تھا جو ہم سب نے ملٹری کالج میں حاصل کی تھی۔

سارا سھان آپریشن

یہ آپریشن ۱۹۵۶ء کے اواخر میں ہوا تھا۔ افغانیوں نے دھوکے سے ہمارے چند افسروں اور جوانوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے ایک خصوصی مشن ترتیب دیا گیا تھا جس میں بہت چھانٹ چھانٹ کے جاں باز اور ہوشیار افسر اور جوان رکھے تھے۔ ساری کارروائی حد درجہ خفیہ رکھی گئی تھی۔

میں نے ۲ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری کے ۶ بیٹری کمانڈر کی حیثیت سے اس میں حصہ لیا۔ بہت مشکل مشن تھا۔ بڑے بڑے مرحلے آئے۔ آخر کار تائید ایزدی سے یہ مشن کامیاب ہوا۔ اس کی روئداد ایک ایڈونچر اسٹوری سے کم نہیں۔ لیکن اس کو سنانے کا یہ موقعہ نہیں۔ اس مہم سے مجھے ان مسلمات کی صداقت کا یقین ہو گیا جو اس سے پہلے میں ملٹری ہسٹری کی کتابوں میں پڑھتا رہا تھا۔ مثلاً حملہ کی مکمل تیاری کی جائے۔ دشمن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں خاص طور پر اس کی حکمت عملی کے بارے میں معلوم کیا جائے کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے پھر اسے غیر متوقع طور پر بجلی کی تیزی کی طرح جا لیا جائے اس طرح کہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اس مہم کے بعد میری ۶ بیٹری نے [illegible]

اکسر سائز میں توپ خانے کے ذمّے کا کردار بڑی کامیابی سے ادا کیا۔

ترقی اور تبادلہ

اپریل ۱۹۵۶ء میں مجھے میجری پہ ترقی ملی اور ساتھ ہی دو فیلڈ سے ۲۵ فیلڈ میں تبادلہ ہو گیا۔ ۲۵ فیلڈ، ۲۶ فیلڈ اور ۲۷ فیلڈ یہ تین نئی یونٹیں لاہور میں کھڑی کی جا رہی تھیں۔ مجھے ۲۵ فیلڈ کے سی او لیفٹیننٹ کرنل معصوم اصغر صاحب کی رہنمائی میں نئی بیٹری تیار کرنا تھی۔ مجھے والدین کا مقولہ، کہ کام سے عزت ہے یاد تھا۔ چنانچہ میں نے خوب جان لڑائی اور ۲۵ فیلڈ کا جھنڈا اونچا کر دیا۔ اسی دوران ایک اور شاندار افسر کے ۲۵ فیلڈ میں آنے سے ۲۵ فیلڈ کی شہرت بام عروج پہ پہنچ گئی۔

حمیدی

یہ نئے افسر کیپٹن (اب بریگیڈیئر) حمیدی تھے۔ (ہاکی کے مشہور کھلاڑی جنہوں نے بعد کو قومی ہاکی ٹیم کی کپتانی بھی کی، حمیدی ۲۵ فیلڈ کے اسپورٹس افسر اور ہاکی ٹیم کے کیپٹن مقرر ہوئے۔ میں ان سائڈ رائٹ کھیلتا تھا اور حمیدی سنٹر فارورڈ تھے۔ ہم نے انٹر رجمنٹ ڈیو آرٹلری، اور ۱۰ ڈویژن، ہاکی ٹورنامنٹ غرض سارے مقابلے جیتے۔ اور تینوں کی ٹیموں میں کھیلے۔ اس کا بڑا کریڈٹ حمیدی کو جاتا ہے۔ بہر حال ۲۵ فیلڈ کی دھوم مچ گئی اس زمانے میں لاہور میں آرٹلری کے کمانڈر (کالج نمبر ۱۹) بریگیڈیئر عباس بیگ تھے۔ جو خود بھی بڑے اچھے کھلاڑی رہے تھے اور کھیلوں اور کھلاڑیوں کی بڑی سرپرستی کرتے تھے مجھے ان کا ایک فقرہ یاد ہے جب کبھی نوجوان افسروں سے ملتے تو یہ ضرور کہتے "لڑکو، جب تک جوانی ہے خوب کھیل لو۔ آج کا کھیلا کبھی کام آئے گا۔"

وردی میں باکسنگ

۲۵ فیلڈ کے زمانے میں ایک بار مجھ سے کہا گیا کہ میں یونٹ کی باکسنگ ٹیم تیار کراؤں اس کے لئے انٹرٹروپ اور انٹربیٹری مقابلے شروع ہوئے۔ میری اپنی بیٹری کے انٹرٹروپ مقابلوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ دونوں باکسر ملے ہوئے ہیں۔ ٹھیک طریقے سے لڑ نہیں رہے جو اچھا باکسر تھا خاص طور پر وہ ڈھیلا پڑا ہوا تھا۔ میں نے کئی بار وارننگ دی لیکن وہ باز نہ آیا آخر کار مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کمزور کونگ سے باہر بھیج دیا اور خود وردی بوٹ کے ساتھ گلوز پہنے اور رنگ میں آگیا۔ پوری بیٹری کے لوگ سامنے بیٹھے تھے۔ سب سناٹے میں آگئے کہیں میجر صاحب کی بے عزتی نہ ہو جائے۔ رنگ میں کون کسی کی رعایت کرتا ہے۔ مقابل میں جو حوالدار میجر تھا۔ اس کے ناک آوٹ ٹکے مشہور تھے بہر حال سخت ہیجان کی حالت میں مقابلہ شروع ہوا۔ گھنٹی بجتے ہی وہ شیر کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ ایک ٹکہ بچایا لیکن دوسرا پڑ ہی گیا۔ تیسرا میں نے رسید کیا۔ چوتھا پانچواں پھر اس نے لگایا۔ میں قصداً ہاتھ روکے ہوئے تھا جب وہ اونچی ہوا میں آگیا تو میں نے تابڑ توڑ ٹکے رسید کئے اور کالج کا پرانا ناک آوٹ داؤں آزمایا۔ وہ نیچے آگرا۔ جب اٹھا تو میں نے دو ٹکے اور لگائے۔ جب وہ بے حال ہو گیا تو میں نے چھوڑ دیا —— اور کہہ دیا آئندہ جو بھی کھیل کو مذاق سمجھے گا اس کا یہی حشر ہوگا۔ باکسنگ کا یہ نسخہ بہت کارگر ہوا۔ میں نے بیٹری میں اعلان کر دیا کہ آئندہ کوئی چارج سیٹ نہیں ہوگا جس نے گڑبڑ کی اس کی رنگ میں تواضع کی جائے گی۔

یہ واقعہ میں نے اس خیال کو صحیح ثابت کرنے کے لئے لکھا ہے کہ ٹروپس کو کمانڈ کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ صرف کندھے کی سنیارٹی کافی نہیں ہے۔ کچھ گٹس کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

لاہور میں چھ سال

۱۹۵۶-۵۷ء۔ دو سال میں نے ۲۵ فیلڈ میں گزارے۔ پھر دو برس ۲۰ فیلڈ میں رہا۔ پھر مزید

دو سال ۹ ۱۱ انڈیپنڈنٹ بیٹری سے وابستہ رہا۔ اس طرح میں نے لاہور میں ۶ سال گزارے جو ایک ریکارڈ ہے۔ ۶ سال جو میں لاہور میں رہا یہ کسی کا احسان نہ تھا نہ کسی کی سفارش تھی۔ اور اگر کوئی سفارش تھی تو یہ میرے کام کی سفارش تھی اور اس کام کے پیچھے میری اہلیہ تھیں۔

بیوی کا رول

میرا یہ ایمان ہے کہ کسی شعبے میں انسان کامیاب ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کی بیوی اس کا ساتھ نہ دے اور اسے گھریلو سکون نہ دے تاکہ وہ یکسوئی سے اپنا کام کر سکے میں نے شادی ہوتے ہی اپنی بیوی سے کہہ دیا تھا کہ مجھے عزت سے نوکری کرنی ہے اور عزت سے نوکری کرنے کے لئے مجھے جان مارنی پڑے گی۔ زائد کام کرنا پڑے گا۔ یونٹ کو زیادہ وقت دینا پڑے گا اگر تم نے میرا ساتھ دیا اور گھر کو خود سنبھالا تو اللہ نے چاہا تو انشاء اللہ کچھ کر سکوں گا۔ اللہ بھلا کرے اس صابر شاکر بی بی کا کہ اس نے ہر حال میں میرا ساتھ دیا۔

ماں کا انتقال

۱۹۵۷ء میں تقریباً پچھتر سال کی عمر میں والدہ مکرمہ کا انتقال ہوا۔ انہیں اپنے آخری وقت کا احساس ہو گیا تھا سارے معاملات خود ٹھیک کئے آب زمزم میں بھیگے کفن کے ٹکڑے نکالے، کافور، لوبان منگوایا اور بہو کو بلا کر کہا۔ بیٹی میں نے تمام زندگی صبر و شکر سے گزاری ہے سانس کیسے نکلے۔ کسے خبر ہے۔ انسان ہوں کہیں تکلیف سے آہ نہ کر بیٹھوں اور کوئی سن لے تم دروازے کھڑکیاں بند کر لینا اور تلاوت ذرا زور زور سے کرنا میں اپنے رب کے سامنے آیات الٰہی سنتے ہوئے جانا چاہتی ہوں۔

—— اب اس کے بعد کیا کہوں؟ ان الفاظ میں ان کا پورا کردار ہے نہ صرف ان کا بلکہ پوری نسل کا۔ ان تمام ماؤں کا جنہوں نے شہید اور غازی پیدا کیے

پیاری ماں میری جنت! کہاں ہو نہاں — تم پہ قربان جاؤں میری مہرباں ..
جو بھی عزت ملی۔ تیرے دم سے ملی! — سب تیری ہی دعاؤں سے ہیں شادماں
ماں کی تعظیم میں ہم جو مشہور ہیں — ہے اسی کی کرامت کہ ہیں کامراں
ہمیں فخر ہے اپنے ماں باپ پر — حدی خواں وہ تھے وہم کارواں

۲۷ فیلڈ رجمنٹ کا زمانہ

۲۷ فیلڈ رجمنٹ میں میرے دو سال میری زندگی کے دو اہم سال تھے اس لئے کہ اس عرصے میں مجھے بہت سے قیمتی تجربات ہوئے۔ اور اس دوران مجھے دو ایک غیر معمولی آدمیوں سے بھی واسطہ پڑا۔ جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اس داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے میں تاریخی نوعیت کے دو ایک دلچسپ واقعات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

ھارس شو اور گیریزن کلب کا رقص

۱۹۵۶ء کا ہارس شو بہت شاندار تھا۔ اس کے انتظامات سے میں بھی وابستہ تھا۔ ہارس شو کے آخری دن رات کو ٹیٹو ہوا۔ اس کے بعد گیریزن کلب میں ڈنر تھا۔ ڈنر کے بعد ان گنہگار آنکھوں نے عجب نظارہ دیکھا صدر مملکت جنرل سکندر مرزا کی بیگم ناہید مرزا، کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کے ساتھ بڑے ذوق شوق سے رقص فرما رہی تھیں اور جنرل سکندر مرزا سامنے موجود تھے۔ میں اس حیرت خیز منظر کے سحر سے ابھی باہر نہیں نکلا تھا کہ میرے ساتھ کھڑے کسی افسر نے سرگوشی کی۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں یہ بازی گر دھوکہ کھلا

واقعی یہ رقص محض تفریحی رقص نہیں تھا اس کے مضمرات ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی صبح کو کھلے۔ اس ہارس شو کے موقعہ پر جو پولو میچ ہوا تھا اس میں جنرل ایوب خان مہمان خصوصی تھے۔ اس میچ میں جنرل شیر علی بھی حصہ لے رہے تھے اسی میچ میں ان کے گھوڑے نے تھرو کے وقت کھڑے

کھڑے دم توڑ دیا تھا۔

بعد کے سالوں میں بھی، میں ہارس شو کے انتظامات سے منسلک رہا۔ شاہ ایران رضا پہلوی اور ان کی ملکہ فرح پہلوی اور مسز کینیڈی جیسی شخصیتوں کو بہت قریب سے دیکھا مسز کینیڈی کو ایک نظر دیکھنے کے لئے جیسے سارا لاہور امنڈ پڑا تھا۔ مجھے تو ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ بس گلیمر تھا شہزادیوں اور ملکاؤں سے بڑھ کر حسین و جمیل عورتیں تو لاہور کے گلی کوچوں میں ہوں گی لیکن وہ سربازار نظارے کے لئے نہیں۔ افسوس کہ ہم اپنے گھر کی شہزادیوں کی قدر نہیں کرتے۔

ایک عابد و زاہد کمانڈنگ افسر

ایک عرصہ دراز تک ہماری آرمی کی فضا سیکولر رہی ہے اور وہی افسر اچھا سمجھا جاتا تھا جو برٹش افسروں کے طور طریق رکھتا ہو۔ جس میں منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولنا اور انگریزی لب ولہجہ میں اردو یا پنجابی بولنا بھی شامل تھا طرز زندگی میں بھی وہی چھاپ ضروری سمجھی جاتی تھی۔ بیس کے آداب و مشاغل بھی وہی تھے جو سفید فام آقا اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ مذہب دقیانوسیت سمجھی جاتی تھی۔ اسی ماحول اور پس منظر میں جن گنے چنے افسروں نے اپنی انفرادیت اور مذہبیت کا علم بلند رکھا ان میں سے ایک ۲۷ فیلڈ رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل محمد اسحاق بھی تھے ٹھیٹھ آفریدی پٹھان، صوم وصلوٰۃ کے سختی سے پابند خود نظم و ضبط کے عادی اور نظم و ضبط کے علم بردار انتہا درجے کے دیانت دار اور قانون کے پابند۔ اصولوں میں کسی لچک کے روادار نہیں تھے۔ اتنا بے لچک آدمی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے لیکن ان کی بے لوثی اور بے غرضی کے سب معترف تھے اس لئے سب ان کی دل سے عزت کرتے تھے ان کا اپنا طرز زندگی تھا۔ غالباً تہجد گزار بھی تھے۔ لیکن جو بات یقینی تھی وہ یہ تھی کہ بہت سویرے اٹھتے تھے نماز پڑھ کے ناشتہ کرتے اور گرمیوں میں صبح ساڑھے پانچ بجے دفتر آجاتے

دوپہر کا کھانا کھانے کی عادت نہیں تھی۔ اس لئے شام کو کھیلوں سے فارغ ہو کر پانچ چھ بجے کے قریب گھر یا میس میں واپس جاتے تھے اور پھر اس کے بعد کمرہ سے شاذ ہی نکلتے۔ پڑھنے اور عبادات میں مصروف رہتے۔ ان کے تقریباً تمام دن یونٹ میں رہنے کی وجہ سے تفریح باز حضرات بہت تنگ تھے۔ لیکن انہیں خود کسی کو بے جا تنگ کرنے کا شوق نہیں تھا۔ انہوں نے تو کسی سے براہ راست نماز پڑھنے کو بھی نہیں کہا۔ میں بھول گیا کہ ان کی ایک اور خصوصیت تھی کہ سر منڈاتے تھے قاعدہ یہ ہے کہ آدمی جو کام خود کرے دوسروں کو وہی کام کرتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے کاغذی شیر باتوں کے بادشاہ بھی ہوتے ہیں۔ اور ایسے ہی آدمیوں کو پسند کرتے ہیں جو ان کی ہاں میں ہاں ملائیں لیکن اسحاق صاحب خوشامد پسند بالکل نہیں تھے۔ پھر بھی خوشامدی کہاں باز آتے ہیں یونٹ میں دو ایک نے ان کی دیکھا دیکھی سر کو منڈوا دیا تھا۔

وہ اسٹاف کام کے ماہر تھے اور جزئیات پر نظر رکھتے تھے۔ ۲۷ فیلڈ رجمنٹ ان کی پہلی اور آخری فیلڈ کمان تھی اس کے بعد وہ جی ایچ کیو سی این سی کے اسٹاف پر چلے گئے اور دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ عابد و زاہد، تہجد گزار بندہ جنرل موسیٰ جنرل یحییٰ، جنرل عبدالحمید سب کے ساتھ نباہ کر گیا۔ اور وہیں اونچے سے اونچے عہدے تک ترقی کی میجر جنرل اسحاق کے کیریئر سے ثابت ہوتا ہے کہ کام اور کردار کی اپنی قوت ہوتی ہے۔

میں اسحاق صاحب کو اپنا محسن سمجھتا ہوں میں نے ان سے بہت سیکھا۔ ان کا تذکرہ میں نے اس تفصیل سے اس لئے کیا ہے کہ نوجوان افسروں کو معلوم ہو کہ ایسا بھی ہوتا ہے بعض بینگن تھالی سے بھی بھاری ہوتے ہیں۔

کمزور سے سخت بھلا

مجھے زندگی میں دو قسم کے افسروں سے واسطہ پڑا ایک وہ جو پلے سیف PLAYSAFE کے چکر میں ہوتے ہیں جو کسی قسم کا خطرہ نہیں لینا چاہتے جو بچ بچ کے چلتے ہیں جو۔ بڑی انتہائی

کوشش رہتی تھی کہ اوپر کا ایک آدمی خوش رہے خواہ نیچے کے ہزار آدمی ناخوش ہو جائیں۔ وہ بڑے کی ناراضگی کے خطرے کو مول لے کر اپنے ماتحت یا ماتحتوں کے مفادات کے لئے لڑنے اور نقصان اٹھانے کی جرأت اور حوصلہ نہیں رکھتے۔ اصل میں ان کا بنیادی مسئلہ اپنے مفادات کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ دوسروں کو تحفظ نہیں دے سکتے۔

تقریباً تیس برس جوانوں کے ساتھ رہ کر اور کام کر کے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جوان اس افسر کو پسند کرتے ہیں جو سخت ہو، اس لئے سخت آدمی ہی وقت آنے پر تحفظ دے سکتا ہے سختی وہ ہی کرتا ہے جس میں کچھ گٹس ہوں۔ وہ جو اپنے سے نیچے والوں کے لئے شیر ہو اور اوپر والوں کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے۔ وہ بزدل ہوتا ہے۔ اور جوان کبھی اس پر اعتماد نہیں کرتے۔

اگر کسی افسر کو جوانوں کے دل جیتنا ہیں اور ان کی وفاداری حاصل کرنا ہے تو اسے بعض اوقات رسک لے کر اپنے جوانوں کے کام آنا پڑے گا۔ خصوصاً جب معاملہ کسی جوان کی عزت کا ہو۔ ہر وقت احتیاط کرنے اور قانون چھانٹنے سے کام نہیں چلتا۔

ایم پی کے لئے انٹرویو

ایک واقعہ کا ذکر کرنا میں بھولا جا رہا ہوں۔ ۱۹۵۶ء کے اواخر میں مجھے جی ایچ کیو میں ایم پی میں پوسٹ ہونے کے لئے انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا۔ چونکہ اس پوسٹنگ میں افسروں کے اختیارات بہت ہوتے ہیں اس لئے کم از کم اس زمانے میں لوگ اس پوسٹنگ کے پیچھے بھاگتے تھے مجھے چونکہ کوئی غلط کرنا نہیں تھا اور کسی کو غلط کام پر چھوڑنا نہیں تھا اس لئے میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ میں معذرت کر لوں۔ تاکہ آئندہ کے ہزار جھمیلوں سے بچ جاؤں۔ لوگوں کو تعجب ہوا لیکن میں نے سکھ کی سانس لی۔

۱۹۵۸ء کا مارشل لاء

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جب مارشل لاء نافذ ہوا تھا تو ہماری یونٹ سے مارشل لاء ڈیوٹی کے لئے

افسر لئے گئے۔ یہ بھی چودھراہٹ کا کام تھا۔ اختیارات بھی بہت تھے لیکن اپنی مخصوص افتادِ طبع کی وجہ سے میں نے اپنے لئے بہتر یہی سمجھا کہ میں یونٹ ہی میں اپنے پیشہ ورانہ کاموں میں اُلجھا رہوں۔

کمان کی تبدیلی

۱۹۶۰ء میں ۲۷ فیلڈ کی کمان تبدیل ہوئی نئے سی او اگرچہ ایک مشہور پیر خاندان کے چشم و چراغ تھے لیکن کرنل اسحاق سے سو فیصد مختلف بلکہ متضاد تھے۔ یار لوگوں نے پھر قلابازی کھائی۔ جو کرنل اسحاق کے زمانے میں سر منڈا کر نمازی ہو گئے۔ اب کسی خانے بند نہ تھے۔ سی او کے ساتھ قدم ملا کر چلنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس امتحان اور عذاب سے جلد نجات دے دی اور میرا تبادلہ ۱۱۸ انڈی پینڈنٹ مارٹر بیٹری میں ہو گیا۔ لاہور میں یہ تیسری پوسٹنگ تھی۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں دو برس میں اس بیٹری کے ساتھ رہا اور اس کے انڈی پینڈنٹ مرتبے کو منوا کر چھوڑا۔ اس سلسلے میں مجھے بڑے بڑے افسروں سے بھڑنا پڑا۔ لیکن میں اپنے کیریر کو خطرے میں ڈال کر بھڑا۔ اصول کی خاطر بھڑنے کو میں کردار کی جان سمجھتا ہوں۔ جو آدمی اپنی صحیح بات پر اڑنے اور قاعدے سے منوانے کا حوصلہ نہیں رکھتا وہ امن کے زمانے میں خواہ کتنی اچھی نوکری کرلے جنگ میں لڑ نہیں سکتا جو عام زندگی میں دلیر نہیں جرأت مند نہیں وہ میدان جنگ میں یکایک جری اور دلیر کیسے ہو جائے گا۔ جو ایک بار گیدڑ بن جائے وہ پھر زندگی بھر شیر نہیں بن سکتا۔

ایک جرأت مندانہ اقدام

۱۹۶۲ء میں جنگ کے نئے تصور کے تحت ۱۱۸ مارٹر بیٹری کو توڑنے کا فیصلہ کیا گیا جوں ہی مجھے اس فیصلے کی بھنک ملی میں نے بیٹری میں جو تیس کے قریب خالی جگہیں تھیں۔ انہیں راتوں رات پرموشن کانفرنس کر کے پچھلی تاریخوں سے پُر کر دیا۔ یہ آخری بھلائی تھی۔ جو میں نے ۱۱۸ مارٹر

بیٹ ری کے جوانوں کے ساتھ کی۔ اگر بالکل قاعدے قانون کے لحاظ سے دیکھا جائے تو میرا اقدام قانون کے دائرے سے باہر تھا چنانچہ ایسا کرنے پر مجھ سے باز پرس بھی ہوئی لیکن میں نے جواب طلبیاں جھیلت لیں لیکن پروموشنز کو باقاعدہ کروا کے چھوڑا۔ اور بیٹری ٹوٹنے سے میرے جوانوں کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا وہ نہیں ہونے دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے کسی ماتحت نے مجھے کبھی کمزور ہونے یا لاتعلق ہونے کا طعنہ کبھی نہ دیا ہوگا۔

۱۸ ا مارٹر بیٹری توڑتے توڑتے مجھے ایک جوان کو اس کی شوقینی کا مزہ چکھاتے ہوئے کورٹ لکھپت جیل بھی بھجوانا پڑا۔ یہ لڑکا فیصل آباد یہ کہہ کر چھٹی لے گیا کہ میرا والد سخت بیمار ہے پھر باپ کے مرنے کا تار بھیجا اس طرح دو ہفتے کی چھٹی لے کر سرگودھا میں عشق نکھارتا رہا۔ اس عرصے میں فیصل آباد سے اس کی بہن اس سے ملنے آئی تو راز کھلا۔ جوان واپس آیا تو صاف مکر گیا اس کے خلاف اور شکایات بھی تھیں۔ اس لئے اس کو فوج سے چھٹی کرا کے جیل کی ہوا کھلوانا پڑی۔

۳ ایس پی میں تبادلہ

۱۹۶۳ء کے اوائل میں میرا تبادلہ ۳ ایس پی میں نوشہرہ ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں ۱ ایس پی کھاریاں میں ٹو آئی سی بن کر آیا۔ اس زمانے کی ایک ہی قابل ذکر بات ہے کہ میں نے سب افسروں سے پی ای ٹیسٹ پاس کروا کے چھوڑا حالانکہ خود میری عمر ٹیسٹ سے زائد تھی لیکن سب سے پہلے خود پاس کیا پھر دوسروں سے پاس کروایا۔ اس سال کے آخر میں پھر وہی ایس پی نوشہرہ جانا پڑا۔ جو ۱۰۰ آرمرڈ بریگیڈ کا جزو تھی۔

۱۹۶۵ء کے اوائل میں، میں سینیئر آفیسرز کورس کے لئے کوئٹہ گیا اور مئی ۱۹۶۵ء میں یہ کورس امتیاز سے پاس کر کے میں اپنی رجمنٹ ون ایس پی میں واپس آگیا جو اس عرصے میں ۶ آرمرڈ ڈویژن کے ایک جزو کے طور پر گوجرانوالہ کے علاقے میں خیمہ زن تھی چونکہ مئی جون میں

جنگ کے بادل چھائے تھے۔ اس لئے رجمنٹ کی ٹریننگ پر معمول سے زیادہ زور دینا ضروری ہو گیا تھا۔

ٹریننگ کا ایک نیا تجربہ

آپریشنل ایریا میں آکر میں نے اپنے اندر ایک جھرجھری سی محسوس کی۔ جیسے برسوں کی تگ و دو کے بعد کسی شکاری کو شکار کی بو ملے۔ کبھی میں ناک آؤٹ باکسر رہا تھا میری وہ حالت تھی جو باکسنگ رنگ میں اس پر اعتماد باکسر کی ہوتی ہے۔ جو حریف پر جھپٹنے کے لئے گھنٹی کی آواز کا بے چینی سے انتظار کرتا ہے۔ میرا ایک عرصہ دراز سے خیال تھا کہ پاکستانی سپاہیوں کی تربیت اسلامی رنگ میں ہونی چاہیئے۔ لیکن اس وقت فوج میں سیاست کے ساتھ مذہبیت بھی شجر ممنوعہ تھی بہرحال اب مجھے ون ایس پی کے ٹو آئی سی کی حیثیت سے رجمنٹ کی ٹریننگ کو منظم و مرتب کرنے کا موقعہ ملا تو میں نے ان تصورات و خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے ون ایس پی کے سی او لیفٹیننٹ کرنل عبدالرحمان دین کا درد رکھتے تھے۔ ان کی تائید اور تصدیق سے میں نے رجمنٹ کی پیشہ ورانہ ٹریننگ کو اسلامی رخ دینا شروع کیا۔ ہم نے انہیں ستمبر ۱۹۶۵ء کے جہاد کے لئے تیار کیا۔ جنگ ستمبر میں ون ایس پی کی کارکردگی کیسی رہی اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ غالباً یہ توپ خانے کی تنہا رجمنٹ ہے جس کے سی او کرنل عبدالرحمن کو ستارۂ جرأت ملا (اور شہید ہوئے) اور اس کے ٹو آئی سی (یعنی مجھے) گن پوزیشن پر اپنے جوہر دکھانے پر ستارۂ جرأت ملا۔ یہ ستارۂ جرأت اصل میں مجھے نہیں ملا سارے جوانوں کو ملا جو میرے ساتھ شریک کارزار تھے۔

اسلامی رنگ

سب سے پہلے تو میں نے سب کے لئے باجماعت نماز لازمی کی اور خود ان کے ساتھ نماز

پڑھنا اور پڑھانا شروع کی۔ شام کو کھیلوں سے پہلے ہر بیٹری میں اسلامی تاریخ کا ایک پریڈ رکھا۔ ہر ہفتے ہر بیٹری اسلامی تاریخ پر مبنی چھوٹا موٹا ڈرامہ کرنے لگی پھر ان کے آپس میں مقابلے کروائے۔ یہ تو نظری پہلو تھا۔ اصل میں ہر قسم کی تربیت کا عمل پہلو زیادہ مشکل ہوتا ہے میں نے اس پہلو کو نہ صرف نظرانداز نہیں کیا بلکہ اس پر زیادہ زور دیا۔ اور کردار کی عملی تربیت کے لئے ہم کو دور جانا نہیں پڑا۔ گوجرانوالہ کے گاؤں نندی پور کے قریب ہم ٹھہرے ہوئے تھے وہ بہت سرسبز شاداب کھیتوں اور باغات کا علاقہ تھا۔ میں نے اپنے جوانوں سے کہا۔ تمہیں کردار کی تربیت کرنے کا ماحول ملا ہے۔ بغیر اجازت کوئی گاؤں نہ جائے۔ کسی پھل کو ہاتھ نہ لگائے۔ جو چیز لے اس کی پوری قیمت دے۔ کسی کی فصل یا باغ کو نقصان نہ پہنچے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے کی عزت کی جائے عورتوں سے ماں بہن سے بڑھ کر سلوک کیا جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ون ایس پی کے جوانوں نے نماز کی لاج رکھی۔ گاؤں والے آکر ہم سے پوچھتے تھے کہ کیا بات ہے یہ کیسے فوجی جوان ہیں جو خربوزے تربوز کے بھی دام دیتے ہیں۔ آم کا ایک دانہ نہیں توڑتے امرودوں کے پیڑوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ میں دل میں خوش ہوا اور جوانوں کو شاباش دی اور کہا۔ میرے شیرو، اب قدم ایک قدم آگے بڑھاؤ، مسلمان باعث رحمت ہوتا ہے۔ گاؤں والوں کے کام آؤ۔ ان سے تعاون کرو۔ چنانچہ ون ایس پی کے جوانوں نے گاؤں والوں سے فصلوں کی کٹائی بوائی میں تعاون کیا۔ اسکول کا راستہ بہت خراب تھا اس کو بلڈوزر سے ٹھیک کیا۔ جیسے کو ہم کبڈی پہلوانی کے مقابلے کراتے تھے۔ ان میں گاؤں والوں کو بلانا شروع کیا تھا۔ مقابلوں میں شرکت کی دعوت بھی دی خوب ڈھول تاشے بجتے۔ بھنگڑا ڈالا جاتا۔ اس طرح ہم اپنے ہم وطنوں سے شیر و شکر ہو کر صحیح معنوں میں ایک قومی فوج بن کر وہاں رہے۔ اور فوج کی ایک نئی امیج ہم نے ابھاری۔

۶ ستمبر کی صبح

۶ ستمبر کی صبح ون ایس پی فیلڈ رجمنٹ اروپ قصبہ کے قریب پی ٹی کر رہی تھی کہ یکایک

جیٹ طیاروں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی پھر گکھڑ ریلوے اسٹیشن کی طرف ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ پلک جھپکتے میں پاکستان ایئرفورس کے ہوائی جہازوں نے دشمن کے ہوائی جہازوں کو للکارا اور ان کو مار بھگایا۔ ظاہر تھا کہ لڑائی شروع ہو چکی تھی مگر صورت حال واضح نہیں تھی بہرحال فوراً پی ٹی ختم کر دی گئی اور کیپٹن اسماعیل کو فوراً جیپ میں گکھڑ اسٹیشن کی طرف دوڑایا گیا وہ تھوڑی دیر بعد خبر لائے کہ دشمن نے گکھڑ ریلوے اسٹیشن پہ کھڑی مال گاڑی پہ حملہ کیا تھا دشمن کے بموں سے جو آگ لگی تھی اس کو بجھانے میں انہوں نے مدد دی۔ اور پی اے ایف نے دشمن کا جو طیارہ گرایا تھا اس کے دو ایک ٹکڑے بھی کیپٹن اسماعیل اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہمارے سی او لیفٹیننٹ کرنل عبدالرحمٰن ڈیو ہیڈ کوارٹر کانفرنس کے لئے جا رہے تھے وہ یہ ٹکڑے اپنے ساتھ لے گئے اس عرصے میں ریڈیو سے اعلان ہو چکا تھا کہ دشمن نے سارے مغربی پاکستان پر حملہ کر دیا ہے اور دشمن کو بی آر بی پر لاہور کے سامنے روک دیا گیا ہے۔ صدر پاکستان جنرل ایوب خان قوم کے خطاب کے وقت کا اعلان کیا گیا تھا۔ ہوائی جہازوں کی لڑائی کو آنکھوں سے دیکھنے اور ریڈیو کے اعلان سے ساری رجمنٹ میں سخت جوش پھیل گیا چونکہ صورت حال واضح نہیں تھی اس لئے اس جوش میں اضطراب کا عنصر بھی تھا بہرحال اتنا واضح تھا کہ اب ہمیں لڑنا ہے یہ بھی ظاہر تھا کہ ہمارے ۶ آرمڈ ڈیو کو ضرور آگے جانا ہو گا۔ اس لئے ہم نے مزید وقت ضائع کئے بغیر محاذ پہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ چند گھنٹوں میں پوری یونٹ کو حرکت میں آنا تھا۔ یہ کام کتنا مشکل اور دیر طلب تھا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں کسی یونٹ کی ایمرجنسی موومنٹ کا تجربہ ہو۔ اور یہ ایمرجنسی موومنٹ تو اس وقت ہو رہی تھی جب جنگ شروع ہو چکی تھی اور سر پہ طیاروں کی گڑگڑاہٹ سنی جا سکتی تھی۔ اس وقت یونٹ میں جو جوش وولولے کا عالم تھا اس کو میں تازندگی نہیں بھول سکتا۔ کسی کو حکم دینے اور کسی کو کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہر شخص کو جیسے بجلی لگی ہوئی تھی ہر شخص اپنے حصے سے زیادہ بلکہ دوگنا تین گنا کام کر رہا تھا ہر ایک کی کوشش یہی تھی کہ جلد سے جلد محاذ کی طرف روانہ ہو

جائیں- ۱۱ بجے ریڈیو پر صدر ایوب کی تقریر سنی- بڑی پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر تھی- لفظ لفظ سے مقابلہ کرنے کے عزم کا اظہار تھا- اور اس یقین کا بھی کہ انشاء اللہ ہم وطن عزیز کے چپے چپے کا دفاع کریں گے یہاں میں یہ بتانا بھول گیا کہ ۶ ستمبر کی صبح ون ایس پی کی سروے پارٹی پاک بھارت سرحد کے قریب سیالکوٹ میں سروے میں مصروف تھی- اس کو بھی یونٹ میں واپس بلانا تھا- اس پارٹی کو واپس لانے کے لئے میں نے لیفٹیننٹ (بعد کو کرنل) بشیر کو بھیجا دوپہر کے قریب کرنل رحمان ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے واپس آئے اور آتے ہی مجھے حکم دیا کہ میں یونٹ کی ریکی پارٹی کے ساتھ آگے جاؤں-

طے یہ پایا تھا کہ سارا ڈویژن غروب آفتاب کے بعد روانہ ہوگا اور دو بجے رات تک سیالکوٹ پسرور روڈ پر ۱۴ سنگ میل کے قریب جمع ہوگا یہ ساری موومنٹ بغیر ٹرانسپورٹرز کے ٹریکس پر اور ایم پی کور اور وائرلیس کمیونیکیشن کے بغیر عمل میں آنی تھی- رات کے اندھیرے میں بغیر ایم پی کور اور مواصلاتی سہولتوں کے ٹریکس پر آرمرڈ اور آرٹلری کی سینکڑوں گاڑیوں کے بیک وقت حرکت میں آنے سے جو مسائل و مشکلات پیدا ہوسکتی تھیں ان کا تصور کرنا مشکل نہیں-

مختصر یہ کہ شام سے پہلے میں نے منزل مقصود پر اپنی یونٹ کے لئے ریکی مکمل کرلی اور اپنی یونٹ کا انتظار کرنے لگا- رات کے بارہ بجے کے قریب ون ایس پی کی گاڑیاں اور گنیں پہنچنا شروع ہوگئیں- میں سڑک پر کھڑا اپنی یونٹ کی گاڑیوں کو کنٹرول کر رہا تھا کہ یکایک ایک جیپ میرے پاس آکر رکی- دیکھا تو یہ ٦ آرمرڈ ڈویژن کے جی او سی جنرل ابرار تھے وہ اکیلے جیپ میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ سفر کر رہے تھے- وہ سیالکوٹ میں ۱۵ ڈویژن کے کمانڈر کے ساتھ بات کرکے آرہے تھے وہیں انہیں جی ایچ کیو سے نئے احکامات ملے تھے وہ بہت جلدی میں تھے انہوں نے پوچھا تمہارے سی او کہاں ہیں میں نے کہا رجمنٹ کے ساتھ ہیں ان کا دوسرا سوال تھا رجمنٹ کہاں ہے میں نے جواب دیا ایڈوانس پارٹی پہنچ چکی ہے باقی رجمنٹ راستے میں ہے- انہوں نے کہا جو جہاں ہے رک جائے ہمیں واپس جانا ہے میرے پیچھے مزید احکامات کے لئے آؤ- یہ کہہ کر

انہوں نے جیپ چلوا دی میں نے جلدی جلدی جو بھی سامنے تھا اسے آگے پیچھے دوڑایا اور مزید نقل و حرکت رکوا دی اور خود جنرل صاحب کے پیچھے جیپ لے کے بھاگا۔ بمشکل ان کے پیچھے پیچھے ان کے ٹیک ہیڈ کوارٹر میں پہنچا۔ انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ رشید کیا تمہاری رجمنٹ سورج نکلنے سے پہلے واپس گوجرانوالہ پہنچ سکتی ہے؟ میں نے فوراً دیا سلائی جلائی۔ گھڑی دیکھی دو بج رہے تھے پھر نقشہ پر نظر ڈالی۔ نو، سر گوجرانوالے تو نہیں جاملے تک ضرور واپسی ممکن ہے۔ ٹھیک ہے جہاں تک واپسی ممکن ہے رجمنٹ کو واپس لے جاؤ۔ جنرل کا یہ حکم سن کر میں واپسی کے لئے سیلوٹ کرنے ہی والا تھا کہ انہوں نے فرمایا ٹھہرو کیا تم پیراڈراپس سے نمٹنے کا طریقہ جانتے ہو؟ میں نے اعتماد سے کہا۔ جی ہاں سر، ان کا آخری فقرہ تو جاؤ اور کارروائی شروع کر دو۔ اس تمام گفتگو میں تین چار منٹ لگے ہوں گے میں یہ احکامات لے کے پھر اپنی رجمنٹ کے پاس آیا اور اپنے سی او کو صورتحال سے آگاہ کیا اب پھر واپسی شروع ہوئی۔ سارے ڈویژن کو گوجرانوالہ واپس پہنچنا تھا۔ صبح سے پہلے ہم جاملے پہنچ گئے اور پیراڈراپس کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری کارروائی شروع کر دی اور دیگر اہم تنصیبات کی حفاظت کے لئے ضروری اقدامات کئے۔ ۶ آرمرڈ ڈویژن کی واپسی کی خاص وجہ یہ بھی کہ ابھی تک دشمن کے آرمرڈ ڈویژن کے حملے کی جگہ اور وقت کا تعین نہیں ہوسکا تھا۔ دشمن کے بکتر بند ڈویژن کا اصل حملہ سات اور آٹھ ستمبر کی شب کو چونڈہ پر آیا۔ اس کا ۶ ستمبر کی صبح کو جسٹر پر حملہ دھوکا دینے کے لئے تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی فوجیں جسٹر لے جائیں اور دشمن چونڈہ کے سامنے نمودار ہو جائے دشمن کی یہ چال کسی حد تک کامیاب بھی رہی ۶ ستمبر کی صبح کو جسٹر نارووال پر دشمن کے حملے کی وجہ سے ۱۵ ڈویژن نے اپنے دستوں کا رخ نارووال کی طرف کر دیا۔ ۲۴ بریگیڈ جو چاروا چونڈہ کے دفاع پر متعین تھا اسے بھی نارووال کی طرف روانہ کر دیا گیا اور جب سات اور آٹھ ستمبر کی رات کو دشمن کا بکتر بند ڈویژن چاروا کے راستے چونڈہ کی طرف بڑھا تو اس کے آگے کوئی قابل ذکر مزاحمت کا سامان نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے دشمن کو تیرہ چار میل اندر آنے کا موقعہ مل گیا۔ ۸ ستمبر کی صبح دشمن کے حملے کا پتہ لگتے ہی نارووال کی طرف

سے ۲۴ بریگیڈ کو روک دیا گیا۔ اور ۲۵ کیولری اور کرنل محمد جمشید ایم سی بار کی ۲ پنجاب رجمنٹ چاروا کی طرف دشمن کے مقابلے کے لئے آگے بڑھی اور چونڈہ سے کوئی تین چار میل دور سرحد کی طرف چوبارہ گاؤں کے قریب دشمن کو جا لیا۔ دشمن ۲۵ کیولری کے پیٹن ٹینک دیکھ کر حیران رہ گیا اس کا خیال تھا کہ ہمارا ۶ بکتر بند ڈویژن چھمب جوڑیاں پہنچ چکا ہے۔

دشمن نے جب چونڈہ پر حملہ کیا تو اس کے فخر ہند بکتر بند ڈویژن کے دائیں بائیں ایک ایک انفنٹری ڈویژن بھی تھا ان تینوں ڈویژنوں کے مقابلے میں ہمارا ایک بکتر بند بریگیڈ تھا جس کو ۶ آرمرڈ ڈویژن کا نام دے دیا گیا تھا جس کے پاس تین چار ٹینک رجمنٹوں کے بجائے صرف دو ٹینک رجمنٹیں تھیں اور جن کے پاس اے پی سی آرمرڈ پرسنل کیریئر کے بجائے ڈاج گاڑیاں تھیں اور چار پانچ آرٹلری یونٹوں کی جگہ صرف ایک ایس پی یونٹ ون ایس پی تھی اور صرف ایک انفنٹری بریگیڈ، ۲۴ بریگیڈ تھا یہاں یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ دشمن کی ایک ٹینک یونٹ میں ۶۶ ٹینک تھے تو ہماری ٹینک رجمنٹ میں ۴۴ اسی طرح ان کی توپ خانے کی رجمنٹ میں ۲۴ گنیں تھیں۔ تو ہماری طرف ۱۸ افراد اور اسلحہ کی اس نسبت کے ساتھ ہمارے جیالوں نے چونڈہ کے میدان میں دشمن کے دانت کھٹے کئے۔ ۲۴ بریگیڈ کا کمال یہ تھا کہ اس نے ۸ ستمبر سے ۱۰ ستمبر تک دشمن کو چونڈہ سے چند میل دور بڑی بہادری سے روکے رکھا۔ اس کشمکش میں ۲۵ کیولری اور ۲ پنجاب کی کارکردگی خاص طور پر قابل تعریف تھی ۲۴ بریگیڈ کی بروقت کارروائی سے ہمیں وہ قیمتی وقت مل گیا جس میں ہم ایک مستحکم حکمت عملی وضع کر سکے اور اپنے دستوں کو اس معرکے کے لئے منظم کر سکے کھیم کرن کے محاذ پر ون آرمرڈ ڈویژن کا حملہ ناکام ہونے کے بعد اس کا ۵ بریگیڈ بھی چونڈہ کے محاذ پر بھیج دیا گیا تھا۔ یہ ۱۵ یا ۱۶ ستمبر کی بات ہے۔ مقصد یہ تھا کہ دوسرے محاذوں سے مسلسل کمک منگوا کر چونڈہ کے محاذ کو مضبوط کیا جائے۔

ون ایس پی چونڈہ کے میدان میں

۹ ستمبر تک ۲۴ بریگیڈ کو ۳۱ فیلڈ رجمنٹ کی صرف دو بیٹریوں اور ۸ میڈیم کی ایک بیٹری کی مدد حاصل تھی حالات کے تقاضوں کے لحاظ سے توپ خانے کی یہ فائر پاور بہت کم تھی۔ ۹ ستمبر کی صبح چونڈہ میں ون ایس پی رجمنٹ نے اپنی پوزیشن سنبھالی اور لڑائی کے باقی دنوں میں ون ایس پی نے قابل ذکر اور قابل فخر کردار ادا کیا جس کی تفصیل میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ ۹ ستمبر کو ہم نے اپنی گنیں سیٹ کی ہی تھیں کہ ۳۱ فیلڈ رجمنٹ کا ڈی آر ایک چٹ لئے آن پہنچا جس میں ضروری حوالے کے بعد لکھا تھا کہ جوبارہ کے علاقہ میں دشمن کے ۵۰ ٹینک آگئے ہیں۔ ۲ گولے فی گن کے حساب سے فائر کئے جائیں یہ چٹ لے کر ون ایس پی کے ایجوٹنینٹ کیپٹن گلاب خان میرے پاس آئے سر اب کیا کریں؟ میں نے فوراً کہا۔ یہ لڑائی ہے اس میں رسمی کارروائی کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ فائر کرائیں چنانچہ پہلے تیلے میں سو سے زائد گولے فائر کئے گئے گولوں کی غیر معمولی دھاڑ نے اعلان کر دیا کہ اب ون ایس پی بھی شریک کارزار ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈی آر کے ذریعے ۳۱ فیلڈ رجمنٹ سے دوبارہ رابطہ قائم ہوا۔ ۳۱ فیلڈ سے ایک اور حکم آیا لکھا تھا کہ فائر بہت کارگر ہوا۔ ۱۰ کے حساب سے اسی ٹارگٹ پر مزید گولے پھینکے جائیں۔ ہم نے فوراً دس گولے فی گن کے حساب سے ۱۸۰ گولے داغ دیئے۔ ٹارگٹ پر آگ اور دھوئیں سے ہمیں یقین ہو گیا کہ بات بن گئی ہے۔ اس طرح ون ایس پی نے ۲۳ ستمبر کی فائر بندی تک سترہ ہزار گولے فائر کئے جو کسی بھی فیلڈ رجمنٹ کے لئے قابل فخر ریکارڈ ہے۔

چونڈہ کی لڑائی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی دس بارہ میل کے چھوٹے اور تنگ محاذ پر چار ڈویژن ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے تین دشمن کے اور ایک ہمارا۔ دشمن کے چھ سات سو ٹینکوں، ہزار گنوں، اور دو ہزار مشین گنوں کے مقابلے میں ہمارے ڈھائی سو ٹینک اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں ہیوی فیلڈ اور مارٹر گنیں بر سر پیکار تھیں۔ چونڈہ کے کھلے میدان میں ہر طرف آدمی ہی آدمی، ٹینک اور گنیں نظر آتی تھیں۔ روزانہ بریگیڈ یا بٹالین کی سطح کے حملے ٹینک اور

توپ خانے کی مدد سے ہو رہے تھے بیٹری یا اسکواڈرن کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں تھی جب تک لڑائی جاری رہی اس میدان میں آگ برستی رہی یہاں جنگی اصولوں کے برخلاف ٹینک سے ٹینک براہ راست بھی نبرد آزما رہے۔ دشمن جارحانہ کارروائیاں کر رہا تھا۔ اور ہم مدافعت کر رہے تھے۔ لیکن تمام عددی اور اسلحی برتری کے باوجود دشمن آگے نہیں بڑھ سکا۔ دشمن کے فخر ہند آرمرڈ ڈویژن کا غرور بھی اس میدان میں ٹوٹا۔ ۲۴ بریگیڈ۔ ۲۵ کیولری۔ ۳۱ فیلڈ، ۸ فیلڈ ون ایس پی ۱۵ اور ۱۹ ایس پی ۳۳ اور ۴۳ ہیوی اور ۱۷ لوکیٹنگ رجمنٹ نے دشمن کو پھلورا، چاروا اور سیالکوٹ کے سامنے بے دست و پا کر دیا۔ اس میں ہماری جرأت ہی کو نہیں اللہ کی نصرت کو بھی بڑا دخل تھا۔

چونڈہ کا تاریخی معرکہ

دشمن نے ۵ اور ۶ ستمبر کی رات کے نیسرے پہر جسٹر کے پل پر حملہ کیا اصل میں یہ حملہ دھوکہ دینے کے لئے تھا اصل حملہ چونڈہ پر آنا تھا۔ چنانچہ شاطر دشمن نے ۷ اور ۸ ستمبر کی رات کو ایک بکتر بند ڈویژن فخر ہند اور دو انفنٹری ڈویژنوں سے سیالکوٹ کے علاوہ سانبھا اور چاروا کی جانب سے چونڈہ پر بھرپور حملہ کیا۔ اور رات کے اندھیرے میں کچھ آگے بڑھنے میں کامیاب بھی ہو گیا سب سے پہلے لیفٹیننٹ کرنل نثار ستارۂ جرأت کی ۲۵ کیولری رجمنٹ نے ۸ ستمبر کی صبح کو چوبارہ گاؤں کے علاقے میں چونڈہ سے دور دشمن کو روکا۔ اس جھڑپ میں لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو بریگیڈیئر) نثار کے دو اسکواڈرن کمانڈروں میجر (بعد کو بریگیڈیئر) احمد اور میجر (بعد کو لیفٹیننٹ کرنل) رضا نے بہادری کے جوہر دکھائے اور ستارہ جرأت پائے۔ جلد ہی بریگیڈیئر علی کا ۲۴ بریگیڈ پہنچ گیا اور اس بریگیڈ نے ٹینکوں اور توپ خانے کی مدد سے دس اور گیارہ کی رات تک دشمن کو بڑی کامیابی سے روکے رکھا۔ یہ گھنٹے ہمارے لئے بہت قیمتی ثابت ہوئے ہمیں اپنے دفاع کو منظم کرنے کا ضروری وقت مل گیا۔ اور دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اس حملہ میں پہل کر کے اسے جو ابتدائی فائدہ پہنچا تھا وہ زائل ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ۲۴ بریگیڈ اور اس کی معاون یونٹیں خوب دل کھول کے لڑیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر لمحہ اور ہر

موقعہ پر اللہ کی نصرت شامل حال رہی۔

۹ ستمبر کی صبح سے ون ایس پی فیلڈ رجمنٹ بھی ۲۴ بریگیڈ کے ساتھ شریک کارزار رہی۔ اور چونڈہ دفاع میں ون ایس پی نے قابل کردار ادا کیا۔

ون ایس پی کے شریک کارزار ہونے کی داستان یہ ہے کہ ون ایس پی ۶ آرمرڈ ڈویژن کے ساتھ منسلک تھی ۸ اور ۹ ستمبر کی آدھی رات کو اس ڈیلو کو آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس رات کوئی ایک بجے ہمارے سی او کرنل رحمان نے مجھے ڈیلو ہیڈ کوارٹر میں بلوایا اور کہا میجر رشید، ون ایس پی کو صبح سورج نکلنے سے پہلے چونڈہ کے سامنے ایکشن میں آنا ہے۔ کیا خیال ہے ؟

میں نے کہا، سر منرور، ایسا ہی ہوگا۔ ون ایس پی کے لئے اس سے بڑھ کر عزت کا لمحہ اور کون سا ہو گا۔ اور کوئی سیکنڈ ضائع کئے بغیر میں ریکی پارٹی کے ساتھ بڈیانہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اسی راستے سے ٹینک رجمنٹیں بھی حرکت کر رہی تھیں۔ راستہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ روشنی اور وائرلیس کے استعمال کے بغیر تمام راستہ طے کیا اس وقت کچھ ایسا جوش اور جذبہ تھا کہ کوئی مشکل اور اور کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں نظر آتی تھی۔ بہر حال مختصر یہ کہ میں نے صبح صادق سے پہلے بیٹریوں کے لئے پوزیشنوں کا انتخاب کیا اور جوں ہی رجمنٹ پہنچی، ہم منٹوں میں فائر کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔ حسب حکم رجمنٹ سورج نکلنے سے پہلے چونڈہ کے سامنے صف آرا ہو کر شریک کارزار ہو چکی تھی یہاں میں اپنے سی او۔ ون ایس پی کے کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل عبدالرحمان کا بطور خاص تذکرہ کرنا چاہتا ہوں وہ ۹ اور ۱۰ ستمبر کو مسلسل اگلے مورچوں کے ساتھ رہے اور ۲۴ بریگیڈ سے پورا رابطہ قائم رکھا۔ ان کی جرأت مندانہ اور ہوش مندانہ قیادت نے ساری رجمنٹ کا حوصلہ بلند رکھا۔ ۱۱ ستمبر کی صبح جب چونڈہ کا اصل ٹکراؤ شروع ہوا اور دو بکتر بند ڈویژن ایک دوسرے سے کھلے میدان میں ٹکرائے تو کرنل عبدالرحمان ایک جرأت مندانہ اقدام کرتے ہوئے پھلورا کے مقام پر شہید ہوئے اور ستارۂ جرأت کے اعزاز سے سرفراز ہوئے ان کی یاد میں اب بھی ون ایس پی ۱۱ ستمبر کو یوم پھلورا مناتی ہے۔ پھلورا کے مقام پر چونڈہ کے

شہدا کی یاد میں ایک شاندار یادگار بھی بنائی گئی ہے۔

فیصلہ کُن ٹکراؤ

۱۱ ستمبر کا دن چونڈہ کی لڑائی میں کلنٹے کا دن تھا۔ اس دن دشمن نے سر توڑ کوشش کی کسی طرح چونڈہ پر قبضہ کر کے آگے بڑھنے میں کامیاب ہوجائے۔ لیکن ہمارے جیالوں نے دشمن کو چاروا اور چونڈے سے چند میل کے ٹکڑے کے اندر ہی محدود کر دیا۔

جنگ میں کبھی کبھی صورت حال اتنی تیزی سے بدلتی ہے یا اتنی پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ اعلیٰ ہیڈ کوارٹر کو صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں ہوتا یا جس صورت حال کے پیش نظر ہیڈ کوارٹر ایک فیصلہ کرتا ہے اس فیصلے پر عمل درآمد کی منزل آتے آتے یا صورت حال بدل جاتی ہے یا حقیقتاً اس اطلاع سے مختلف ہوتی ہے۔ جس کی بنیاد پر ایک خاص فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس صورتحال سے مجھے ۱۱ ستمبر کی دوپہر کو واسطہ پڑا جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ۱۱ ستمبر کی صبح کوئی ۹ بجے کے قریب ون ایس پی کے سی او کرنل عبدالرحمان ستارہ جرأت شہید ہوئے ان کے شہید ہوتے ہی میں نے سی او کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ وہ دن اور وہ وقت چونڈہ کی لڑائی میں بہت نازک تھا۔ کمان سنبھالتے ہی میں نے صورت حال کے مطابق ضروری اقدامات کیئے دن کے کوئی دو بجے کے قریب حکم ملا کہ ون ایس پی رجمنٹ چونڈہ سے دو میل پیچھے آکر دوبارہ ایکشن میں آئے۔ ہیڈ کوارٹر کا حکم بھی بجالانا تھا اور یہ بھی دیکھنا تھا کہ ہم سے آگے جو دستے دشمن کے گھیرے میں آئے ہوتے تھے انہیں قیدی ہونے یا مکمل طور پر تباہ ہونے سے کیسے بچایا جائے اس وقت میں نے اجتہاد کیا اور کچھ دیر وہیں جمے رہنے کا فیصلہ کیا۔ اگر ہیڈ کوارٹر کو بھی صورتحال کا صحیح علم ہوتا تو اس کا بھی یہی فیصلہ ہوتا۔ بہرحال مختصر یہ کہ میری چھٹی حس صحیح ثابت ہوئی رات ہونے تک ون ایس پی نے اپنی پوزیشن نہیں چھوڑی اور معمول کے فائر کو جاری رکھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رجمنٹ کی موجودگی اور فائر کی وجہ سے دشمن اس شبہ میں رہا کہ چونڈہ

کے سامنے ابھی کافی نفری موجود ہے لہٰذا اسے پھلورا سے آگے پیش قدمی کرنے کی شام تک ہمت نہیں ہوئی اور اس عرصے میں بچھڑے ساتھی قیدی ہونے یا تباہ ہونے سے بچ کر نکل آئے۔ نہ صرف وہ خود بچے بلکہ اپنی گاڑیاں اور زخمی بھی ساتھ لا سکے۔ پھر رات کے اندھیرے میں ون ایس پی بھی احکامات کے مطابق چونڈہ سے پیچھے اپنی نئی پوزیشنوں پر آگئی۔

اس جنگ کے تجربے کی بنا پر مجھے اس خیال سے مکمل اتفاق ہے کہ جنگ میں دلیرانہ اقدام بہتر ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ لڑائی کا میدان اپنا لیڈر خود پیدا کرتا ہے۔ لڑائی جرأت و عزم کا کھیل ہے میدان جنگ میں بزدل کی عقل اور تجربہ بھی کام نہیں آتا۔ فیلڈ کمانڈر کو کبھی کبھی خلوص سے نوسر کہنے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیئے۔ اصل وفاداری بنیادی مقاصد سے ہوتی ہے افراد یا اضطراری فیصلوں سے نہیں۔ کمانڈر کو اجتہاد بھی کرنا پڑتا ہے۔ مجموعی مقاصد کے فریم ورک میں خود بھی کچھ فیصلے کرنا ہوتے ہیں۔

چونڈہ کی لڑائی کے دوران میں نے وہاں کی سول آبادی کی تباہی اور بربادی کے بہت سے دل شکن واقعات دیکھے اور سنے ان میں سے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

چاروا کی مظلوم مائی

چونڈہ اور آس پاس کے گاؤں دشمن کے حملوں کی وجہ سے خالی کرنے پڑے تھے ان کے باسی پناہ گزینوں کی طرح ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک روز ون ایس پی کی گن پوزیشنوں کے پاس سے ایک تباہ حال عورت گذری اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ اس وقت ہم تھوڑا بہت کھانا جو پیچھے سے پہنچ سکا تھا کھا رہے تھے۔ ہمیں کھانا دیکھ کر اس درماندہ مائی نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"وے بھراؤ میرے بھکے تے یتیم بال نوں ای تھوڑی جیئی روٹی دیولو۔"

ہم نے ماں بیٹے کو کھانا دیا، پانی پلایا اور عزت سے بٹھایا اس عورت کی داستان بھی بڑی پُرالم تھی۔

وہ چارواں گاؤں کی تھی۔ دشمن نے رات گئے چاروا پر حملہ کیا اور گاؤں کو گھیرے میں لے لیا۔ نہتی آبادی کیا مقابلہ کرتی۔ صبح سویرے دشمن نے گاؤں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ جنہوں نے تھوڑی مزاحمت کی انہیں وہیں ڈھیر کر دیا گیا۔ جوان مردوں اور عورتوں کو وہ پکڑ کر لے گئے۔ بڈھے ٹھڈے مال مویشی چھوڑ جان بچا کر بھاگے۔ اس عورت کا میاں ذرا غیرت دار تھا اس نے دشمن کو للکارا۔ خبردار عورتوں کو ہاتھ مت لگانا۔ اتنا کہنا تھا کہ سنگین سینے سے پار ہو گئی۔ یہ واقعہ اس عورت کے سامنے کا تھا۔ اب وہ تصویر درد بنی ہمارے سامنے بیٹھی تھی۔ اپنے بچے کو اس نے اب بھی اس طرح سینے سے لگایا ہوا تھا جیسے کوئی بانا سے اس سے جھپٹ لے گا۔ اس عورت کے آنسو خشک ہو گئے تھے وہ جس انداز سے خلاؤں میں گھور رہی تھی مجھے تو لگا کہیں یہ پاگل ہی نہ ہو جائے۔

—— یہ ایک عورت کی کہانی نہیں بیسیوں بلکہ سینکڑوں عورتوں کی کہانی ہے جو دشمن کی بربریت کا شکار ہوئیں۔ اور اگر پاکستانی جیالے چونڈہ پر سینہ سپر نہ ہوتے تو شاید یہ کہانی ہزاروں نہیں لاکھوں بہنوں اور ماؤں کی ہوتی۔

—— چاروا کی اس مظلوم مائی کو دیکھ کر ون ایس پی نے عہد کیا کہ جو ظلم اس ماں کے ساتھ ہوا ہے وہ ہم دوسری ماؤں بہنوں کے ساتھ نہ ہونے دیں گے۔ انشاء اللہ۔

لاہور کا محاذ

نامناسب نہ ہوگا کہ ایک نظر لاہور کے محاذ پر بھی ڈال لی جائے۔

اب یہ کوئی راز نہیں کہ جب ۶ ستمبر کی صبح دشمن نے لاہور پر حملہ کیا تو بیشتر دس ڈویژن لاہور چھاؤنی میں تھا۔ دشمن کا پہلا ٹکراؤ رینجرز سے ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سے پہلے کہ دشمن بی آر بی پار کر سکے ہمارے دستے بی آر بی پر پہنچ گئے اور دشمن کی یلغار کو روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر بھی لاہور سیکٹر دشمن کے سخت دباؤ میں تھا۔ اس دباؤ کو کم کرنے کے لئے ضروری ہو گیا کہ ون آرمڈ ڈویژن جوابی حملے کے لئے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ سات آٹھ ستمبر کو ون آرمڈ ڈویژن نے کھیم کرن سیکٹر میں پیش قدمی کر دی۔ اسے دشمن کو پٹی دریائے ستلج تک پیچھے دھکیل کے

لے جانا تھا۔ یہ کام ۱۱ ڈویژن اور ون آرمرڈ ڈویژن کو ملا تھا۔ ۱۱ ڈویژن کو برج ہیڈ بنانا تھا۔ ون آرمرڈ ڈیو کے حملے کا آغاز بہت حوصلہ افزا تھا لیکن بدقسمتی سے اس کے ساتھ انفنٹری ڈیو کا بریگیڈ بھی نہیں تھا۔ کھیم کرن کے محاذ پر ۶ لانسرز کے لیفٹیننٹ کرنل صاحب زادگل (کالج نمبر ۱۷) نے اپنے طور پر بڑی بہادری دکھائی ولٹوہا تک وہ بہت آگے بڑھے لیکن انفنٹری اور توپ خانے کی مدد کے بغیر انہیں رات کو لیگر کے لئے پھر پیچھے آنا پڑا تھا۔ مختلف وجوہ سے ون آرمرڈ ڈویژن کا حملہ افراتفری کی نذر ہو گیا۔ ۶ لانسرز کے کرنل صاحب زادگل ستارۂ جرأت شہید ہو گئے۔ کمانڈر آرٹلری بریگیڈیر شامی بھی شہید ہوئے اور ۴ آرمرڈ بریگیڈ کے کمانڈر بریگیڈیر بشیر (کالج نمبر ۴۹۶) بمشکل دشمن سے بچے۔ دوسرے آرمرڈ بریگیڈ کو بھی شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۴ کیولری پوری پوری دشمن کے جال میں پھنس گئی۔ اس طرح ون آرمرڈ ڈویژن سے خاطر خواہ نتائج نہ حاصل ہوئے۔ اور اس محاذ کو منجمد کرنا پڑا۔ اس کی بڑی وجہ انفنٹری کی کمی نہیں نایابی تھی ہم بہت ہی کم وسائل سے لڑائی لڑ رہے تھے۔ ون آرمرڈ ڈویژن کے ۵ بریگیڈ نے لاہور کے محاذ پر کچھ موثر کارروائی کی۔ ۱۴-۱۵ ستمبر تک اسے بھی چونڈہ کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔

جنگ ستمبر کا نچوڑ

جنگ ستمبر کے اس مختصر جائزہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جنگ ستمبر میں دفاع پاکستان کا اصل معرکہ چونڈہ میں سر ہوا۔ ہر چند کہ ۱۱ ستمبر کو جنگ کا رخ بدل چکا تھا۔ لیکن دشمن کا زور کسی طور ٹوٹا نہ تھا۔

۱۷ ستمبر کو دشمن نے اپنی مایہ ناز بکتر بند رجمنٹ ۷ اپونا ہارس کو خاصی انفنٹری کے کے ساتھ ایک بھرپور جارحانہ حملے کے لئے آگے بڑھایا۔ یہ دشمن کی کریک رجمنٹ تھی اور اس کا سی او لیفٹیننٹ کرنل تاراپور بڑا جری اور دلاور سمجھا جاتا تھا۔ تاراپور کو اس کی کمان نے وائرلیس پر جو کھلا حکم دیا وہ یہ تھا کہ چونڈہ پسرور روڈ کو پانچویں میل پر پیچھے سے کاٹو۔ چونڈہ کی ساری پاکستانی

فوج کو پیچھے سے گھیرے میں لو اور مہاویر چکر (وکٹوریہ کراس یا نشان حیدر) تمہارے قدموں میں پڑا ہو گا۔ اس میں شک نہیں کہ تاراپور بڑے حوصلے اور جرأت کا افسر تھا اس نے بڑی دلیری اور چالاکی سے اپنا جارحانہ حملہ شروع کیا اور ہماری اگلی پوزیشنوں کو روندتا ہوا ون ایس پی کی پوزیشنوں سے ہزار گز کے فاصلے تک آگیا۔ یہاں ون ایس پی نے اس کی شدید مزاحمت کی چونکہ حملے کو تاراپور خود لیڈ کر رہا تھا وہ حملہ میں کام آیا اور پونا ہارس کا جارحانہ حملہ جو بڑے طمطراق سے شروع کیا گیا تھا۔ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تاراپور کو اس کی کمان نے مرنے کے بعد مہاویر چکر دیا اور اس کی یاد میں تاراپور کے نام سے ایک یادگار قائم کی۔ اپنے بہادروں کی قدر ہر قوم کرتی ہے اور کرنی چاہیئے۔ ارسطو نے اپنی خیالی ریاست میں جنگجو سپاہیوں کو اپنے شہریوں میں سب سے اونچا درجہ دیا ہے اور غلط نہیں دیا۔ اسی معرکے میں مجھے بھی ستارۂ جرأت کا مستحق قرار دیا گیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے اکیلے ہی کوئی کارنامہ انجام دیا میری پوری رجمنٹ لڑ رہی تھی اور صرف میری رجمنٹ ہی نہیں دوسری یونٹیں بھی شریک کارزار تھیں۔ اگر کوئی کارنامہ تھا تو سب کا تھا۔ بہر حال اس میں جو میرا حصہ تھا مناسب نہیں کہ میں خود اسے بیان کروں میرے ستارۂ جرأت کے فرمان میں اس کا کچھ تذکرہ موجود ہے بہتر ہے کہ اسے وہاں سے جوں کا توں نقل کر دیا جائے۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

پی ایس ۲۶۳۲ میجر رشید احمد ۱۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کو چونڈہ کے جوتھے میل کے قرب وجوار میں متعین۔ ون ایس پی فیلڈ رجمنٹ کے عارضی کمانڈر کے طور پر فرائض انجام دے رہے تھے وہ ایس پی فیلڈ رجمنٹ کی گن پوزیشن میں بذات خود موجود تھے۔ جب دشمن نے بکتر بند دستوں سے انفنٹری اور توپ خانے کے فائر کے ساتھ زبردست حملہ کیا اور موضع بُتر ڈوگراندی کو پامال کرتا ہوا چونڈہ پسرور روڈ اور گن پوزیشن سے تقریباً ۱۵ سو گز کے فاصلہ تک چڑھ آیا۔ ہمارے اپنے اگلے دستے پیچھے ہٹنے لگے تھے اور اس سارے علاقے میں سخت افراتفری مچی ہوئی تھی۔

اس نازک صورت حال پر قابو پانے کے لئے میجر رشید احمد نے مندرجہ ذیل جرأت مندانہ اقدامات کئے جن کی بدولت نہ صرف دشمن کی پیش قدمی رک گئی بلکہ اسے موضع بتسر ڈوگراندی سے باہر نکالا جا سکا۔

ا :۔ وہ فوراً آگے بڑھے اور حالات کا چارج سنبھال لیا۔

ب :۔ آرٹلری ہیڈکوارٹر کے احکامات کے تحت اپنی گنوں سے مسلسل فائر کراتے رہے اور اپنے آدمیوں کو آخری دم تک لڑنے کے لئے تیار کیا۔

ج :۔ خود او پی کی جگہ سنبھالی۔

دشمن کے دو ٹینک تباہ کر دیئے۔ اور دشمن کے پہلے حملے میں اس کی انفنٹری کا بڑا نقصان ہوا۔ اور اس کا حملہ منتشر ہو گیا۔

موضع بُتسر ڈوگراندی سے دشمن نے گن پوزیشن پر جو دوسرا حملہ کیا تھا اسے آرٹلری فائر سے پسپا کیا۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کو دشمن کی شدید گولہ باری اور ہوائی حملوں کی زد میں ہوتے ہوئے میجر رشید نے او پی کا کام خود کیا اور ۲۵ کیولری اور ۳ ایف ایف کو بُتسر ڈوگراندی گاؤں پر جوابی حملہ کرنے میں پوری مدد دی۔

یہ پوری کارروائی حد درجہ جرأت مندانہ اور عاقلانہ تھی جسکی وجہ سے ایک بہت ہی خطرناک صورت حال کو قابو میں لایا جا سکا۔ اس کارنامے کے لئے ستارہ جرأت کی پُرزور سفارش کی جاتی ہے۔

۱۸۔۱۷ ستمبر کی رات کو میجر رشید کا دوسرا کارنامہ۔

۱۸۔۱۷ ستمبر کی رات کو چونڈہ پسرور روڈ کے چوتھے میل پر ایک بار دشمن نے پُوری قوت سے بڑا حملہ کیا اور ایس پی کی گن پوزیشنوں کے ایک ہزار گز کے فاصلے تک چڑھ دوڑا میجر رشید احمد ایک بار پھر آگے بڑھے اور صورتحال کا چارج سنبھال لیا اور اپنے آرٹلری فائر سے دشمن کو پسپا کر دیا۔ ستارۂ جرأت کی پُرزور سفارش کی جاتی ہے۔

میجر رشید احمد کے لئے ستارہ جرأت کی دوبارہ سفارش ایس پی فیلڈ رجمنٹ کے کمانڈر لیفٹیننٹ

کرنل محمد اسلم خان نے ۲۵ ستمبر کو کی۔ اس کی تائید ۴ کور آرٹلری کمانڈر بریگیڈیئر اے کے چوہدری نے کی اس کی توثیق ۶ آرمرڈ ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل ابرار حسین ستارۂ جرأت نے کی۔ اسکے بعد کمانڈر انچیف نے ستارۂ جرأت کا اعزاز ان کے لئے منظور کیا۔

حاصل زندگی: چونڈہ کی لڑائی میں میں اپنے رول کو اپنی عسکری زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں گو بقول غالب:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو سکا

لیکن حاصل زندگی میں اس کنٹری بیوشن کو سمجھتا ہوں جو میں ون ایس پی فیلڈ رجمنٹ کو ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۸ء تک کمان کرتے ہوئے کر سکا۔ لڑائی ختم ہو جاتی ہے لیکن جہاد ختم نہیں ہوتا۔ اس کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں اور سالہا سال کے جہاد (قتال) سے کہیں زیادہ مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے اور زمانہ جنگ کا جہاد بھی اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب زمانہ امن کا جہاد کامیابی سے جاری رہے۔ یہ تصور میرے فلسفۂ زندگی کا بنیادی نقطہ ہے۔

ون ایس پی میری جان بلکہ جان جان رہی ہے اس کا ٹو ہے دی فرسٹ، فرسٹ ان بیس اینڈ وار۔ کارزار حیات میں فرسٹ ہونا کوئی فلوک FLOKE کوئی اتفاق یا حادثہ نہیں ہوتا اس کیلئے بڑے تدبر و تفکر کے بعد منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے۔ فرسٹ ہونے کی ٹیکنالوجی وضع کرنی پڑتی ہے اور پھر ایک عرصے تک منظم طریقے سے مسلسل تیاری کرنی پڑتی ہے۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ون ایس پی میں روح جہاد اور جذبہ وطن کو بیدار اور مستحکم کرنے کے لئے جو سلسلہ وار اقدامات کئے ان میں سے پہلا اقدام یہ تھا کہ چونڈہ کے نواح میں بھلورا کے مقام پر جہاں ون ایس پی کے شیر دل سی او کرنل رحمان شہید ہوتے تھے یہ وہاں شہداء کی یادگار تعمیر کروائی۔ چونڈہ کا معرکہ پاکستانی فوج کی جرأت اور ناقابل تسخیر عزم نے یادگار شہداء کے سنگ و خشت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کے لئے میں، ون ایس پی کے آل رینکس کو مبارکباد دیتا ہوں۔ انسان مٹی سے بنا ہے آخر کار مٹی ہی میں مل جاتا ہے لیکن یہ چنگاریاں جو اس کی خاک

اٹھتی ہیں اسکو زندہ رکھتی ہیں۔

کرنل رحمان ستارۂ جرأت ۱۱ ستمبر ۶۵ء کی صبح شہید ہوئے تھے۔ انکے شہید ہوتے ہی میں نے ٹو آئی سی ہونے کی وجہ سے فوراً یونٹ کی کمان سنبھال لی تھی اور ون ایس پی کے مشن کو کامیابی سے جاری رکھا تھا اس ایکشن کی یاد میں ون ایس پی ہر سال ۱۱ ستمبر کو یوم پھلورا مناتی ہے۔ یہ یونٹ کا سب سے بڑا سالانہ فنکشن ہوتا ہے جس کے لئے یونٹ کو سارا سال سخت تیاری کرنی پڑتی ہے۔ یوم پھلورا کا طریق کار یہ ہے کہ علی الصبح چونڈہ کے شہیدوں کے لئے ایصال ثواب کے بعد پوری یونٹ پورے جنگی ساز وسامان سے لیس جنگ کی سی حالت میں جی او سی کے معائنے کے لئے میدان میں کھڑی ہوتی ہے۔ جی او سی کے معائنے کے بعد ٹینکوں، گنوں گاڑیوں کو اسٹارٹ اپ کر کے ایکشن کے لئے باہر جانا پڑتا ہے۔ ظاہر یہ کرنا ہوتا ہے کہ یونٹ ۱۱ ستمبر کی طرح آج بھی دفاع وطن کے لئے تیار ہے (چونکہ ۱۱ ستمبر قائداعظم کی برسی کا دن بھی ہے اس لئے یوم پھلورا قائداعظم کی یاد کا دن بھی بن جاتا ہے) یوم پھلورا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس دن یونٹ کا سیکنڈ ان کمانڈ پریڈ کو کمانڈ کرتا ہے جس طرح ۱۱ ستمبر ۶۵ء کو ٹو آئی سی نے یونٹ کو کمان کیا تھا اور یونٹ کا سی او پریڈ کے بعد کے دربار کو خطاب کرتا ہے۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ یوم پھلورا جیسے اہم قومی اور تربیتی اہمیت کے فنکشن کو منانے میں بھی روڑے اٹکائے جاتے رہے ہیں (یہ وطن عزیز کی بدقسمتی ہے کہ صحیح آدمی کو راستے سے ہٹانے اور صحیح کاموں میں رکاوٹ ڈالنے سے اکثر وبیشتر اوقات ارباب، اقتدار باز نہیں آتے)

لیکن نہ پھونکوں سے چراغ بجھتا ہے اور تندیٔ باد مخالف سے عقاب گھبراتا ہے۔

یوم پھلورا ایک تقریب ہی نہیں۔ ایک سوچ، ایک رویّہ ایک جذبہ ایک روایت ہے اور اسی میں اس کی اہمیت مضمر ہے ۱۹۶۸ء میں میں ایک روایت کے ساتھ کھاریاں میں تھا۔ اتفاق سے ان دنوں کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرأت بھی ون ایس پی کے ساتھ کھاریاں ہی میں پوسٹ تھے۔ انکا

میں، کالج میں جو شاندار ری یونین ہوتی تھی اسکو منظم کرنے میں کالج سے ہم نے بھرپور تعاون کیا۔ شہداء کی یاد میں اولڈ بوائز کی طرف سے ایک شیلڈ پیش کی گئی۔ اس ری یونین سے عالمگیری اسپرٹ ابھر کر سامنے آتی۔ اسی یونین کے موقع پر میری تحریک پر اولڈ بوائز نے مسٹر حیدری، مسٹر علوی، مسٹر راشد جیسے پرانے استادوں کو کندھوں پر اٹھا کر بھنگڑا ڈالا۔ اس ری یونین کو میں اپنے نامۂ اعمال میں ایک روشن لکیر سمجھتا ہوں۔ کالج سے وابستگی پاکستان سے وابستگی ہے۔

۱۹۷۰ء میں جی ایچ کیو پنڈی میں، میں پوسٹ تھا اور مارشل لا کے ہونے کی وجہ سے ایک اسپیشل ملٹری کورٹ کا سربراہ بھی تھا کہ ایک روز میرا بھتیجا نثار کیانی مجھ سے ملنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں " ریڈ بک تھی۔ پتہ چلا طلبہ کو مفت تقسیم کی جا رہی ہے۔ گویا کمیونزم ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ (امریکی سرمایہ دارانہ نظام پہلے سے پاکستان کی جڑوں میں بیٹھا ہوا تھا) میرے دل نے کہا یا اللہ خیر یہ نظریاتی مملکت کدھر جا رہی ہے؟ یحییٰ کے دور میں جو روایت اور سوچ فوج میں جڑ پکڑ رہی تھی۔ اس المناک اور بعض صورتوں میں شرمناک داستان کو میں یہاں نہیں چھیڑنا چاہتا۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

بلکہ لگتی رہی ہے۔ چہرے بدل جاتے ہیں۔ نعرے بدل جاتے ہیں لیکن آگ لگنا بند نہیں ہوتی مولانا تیرا کرم ہے کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے۔

مختصر یہ کہ لادینی یلغار کو روکنے کے لئے اپنے طور پر ایک گرین بک تیار کی اور نماز کو مرکز بنا کر سب سے پہلے اپنی یونٹ کو باعمل بنانے کی کوشش کی۔ باری باری نماز پڑھانا بھی اس پروگرام کا ایک حصہ تھا اور صرف نماز ہی نہیں نماز کے ساتھ جو رویئے جو کردار ساتھ آتا ہے اس کی نشوونما پیش نظر تھی (گرین بک) ایک سیکولر سسٹم میں کہاں فٹ ہوتی چنانچہ گرین بک کی اپروچ ارباب اختیار کو کھٹکنے لگی آٹھ ماہ کے اندر اندر چار تبادلے جھگتائے لیکن گرین بک کے انعامات پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔ آخر کار ۴۹ سال کی عمر میں ریٹائرمنٹ

کی حد سے دو سال پہلے ہی وردی اتاری لیکن یہ بھی بتا دوں کہ نہ صرف وردی اتاری بلکہ یوم پھلورا اور گرین ایبک کے جذبہ کو نہیں چھوڑا وہ کام جاری رہا۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

ریٹائرمنٹ کے بعد دل کے بہلانے کو شاعری بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ تک بند۔۔۔ شا:ع کی اس کا موضوع بھی یہی ہے جو زندگی کا عنوان رہا ہے۔ چند شعر پیش خدمت ہیں۔

آؤ کریئے گل جی داراں دی
شہیداں غازیاں تے دلداراں دی
اناں پاکستان نوں مانٹر دتا
بنٹر شہید تے شہادت پیاراں دی
کرو سلام شہیداں غازیاں نوں
اچی شان ہوئی غمخواراں دی
سونٹراں پاکستان شالہ وسدا رہوے
اے دھرتی اے دین داراں دی
اہ رشید جیاں مراں گے غازی تے شہید بن کے
یکی اہ گل اے قول قراراں دی

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) احمد خان

ستارۂ جرأت، پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) احمد خان ملک ستارۂ جرأت

ضلع جہلم کی تحصیل پنڈ دادنخان میں قطب شاہی اعوان قبیلے کے بہت سے خاندان صدیوں سے آباد ہیں. جن کا پیشہ زیادہ تر زراعت یا سپاہ گری رہا ہے اور اعوانوں کی روایت کے عین مطابق جن کے خون میں جرأت بھی ہے اور دین کی حرارت بھی. کرنل احمد خان ستارۂ جرأت کا نسلی اور نسبی تعلق بھی موتیوں کی اسی لڑی سے ہے۔ ان کے دادا ملک حیات محمد خان سیدھے سادے شریف النفس انسان تھے. دن کو کھیتی باڑی کرتے اور رات کو اللہ کو یاد کرتے تھے۔ اکڑ کے چلنے والوں کے لیے وہ سخت مزاج تھے لیکن غریب و مسکین کے سامنے ان سے زیادہ عاجز و خاکسار کوئی نہ ہوتا تھا. جانوروں تک سے شفقت سے پیش آتے تھے. صبح سویرے بیلوں کی جوڑی لے کے کھیتوں کا رُخ کرتے تو گھر سے نکلنے سے پہلے ان کی گردنوں کو پیار سے تھپتھپاتے ضرور تھے. پھر اللہ خیر، اللہ مالک کہہ کے گھر سے باہر قدم نکالتے

کرنل احمد خان ستارۂ جرأت کے والد ماجد ملک راجہ خان نے اپنے آبائی پیشے سے تعلق بھی برقرار رکھا اور پہلی جنگ عظیم میں فوجی خدمت بھی کی۔ اور پنشن لے کر ہل بیل سے رشتہ استوار کر لیا۔ لیکن یہ

ذریعہ تو روزی کمانے کا تھا۔ اعوانوں کی روایت کے مطابق انھوں نے قرآن کی تلاوت اور تہجد کی نماز کا کبھی ناغہ نہیں کیا۔ سبحان اللہ۔

راجہ خان صاحب نے فوجی ملازمت تو تھوڑے عرصے کی لیکن فوجی طرز زندگی کو انھوں نے تمام زندگی اپنائے رکھا اور اسی ضبط و نظم، جفاکشی اور سخت کوشی کی تعلیم انھوں نے اپنے بچوں کو بھی دی۔ ماشا اللہ

کرنل احمد خان ملک، راجہ خان صاحب کے دوسرے بیٹے ہیں بڑے بیٹے کا نام ملک فتح خان ہے۔ جو فوج میں شاندار خدمات انجام دے کر کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

پیدائش، ابتدائی تعلیم و تربیت

کرنل احمد خان ستارہ جرأت کی پیدائش کی تاریخ ۲۹ مارچ ۱۹۲۴ء ہے اور مقام پیدائش تحصیل پنڈ دادنخان کا مشہور گاؤں دھولہ ہے۔ پہاڑی ٹیلوں اور برساتی نالوں کا یہ گاؤں بڑا مردم خیز خطہ ہے۔ اس نے بڑے بڑے جیالے غازی اور شہید پیدا کئے ہیں۔ اعلیٰ افسروں کا تو کوئی شمار ہی نہیں میجر جنرل غلام محمد، میجر جنرل پیر داد خاں بریگیڈیر عبدالروف ملک، بریگیڈیر عاشق حسین ملک اور بریگیڈیر غلام محمد ملک انہی چٹانوں سے نکلے ہیرے ہیں۔

مختصر یہ کہ احمد خان فوجی ماحول میں ایک فوجی پنشنر کے سایۂ عاطفت میں پلے بڑھے ابتدائی تعلیم اپنے دھولہ ہی کے پرائمری اسکول میں حاصل کی۔ پرائمری کے بعد ڈوال کے مشہور بلجئم مشن ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ بچپن کا زمانہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل کا زمانہ ہوتا ہے اس زمانے میں جو رنگ چڑھ جائے اور جو نقش جم جائے اسکا اثر شعوری اور لاشعوری طور پر تمام زندگی رہتا ہے۔ بچپن کے ان تاثرات کے بارے میں ہمارے ایک استفسار کے جواب میں کرنل احمد خان لکھتے ہیں۔

ایک ناقابلِ فراموش واقعہ

بچپن سے متعلق میرا پہلا تاثر والد کی شخصیت کا ہے جو بہت شفیق ہونے کے ساتھ ساتھ ڈسپلن

کے معاملے میں بہت سخت تھے نماز وغیرہ کی پابندی کے بعد جس چیز پر ان کا خصوصی زور تھا وہ یہ تھی کہ جھوٹ نہ بولوں۔ میری شامت اعمال کہ میں ایک بار جھوٹ بول بیٹھا۔ پھر تو انھوں نے وہ مرمت کی کہ میرے ہوش اڑ گئے۔ وہ واقعہ یوں تھا کہ دھول کے پرائمری اسکول کی تعلیم کے دوران ایک بار میں اپنے کلاس فیلو کی ایک پنسل ضد میں غائب کر کے گھر لے آیا۔ اس لڑکے کے والد نے میرے والد صاحب سے شکایت کی کہ احمد خان میرے بیٹے کی پنسل لے اڑا ہے۔ والد سر شام گھر آئے تو پہلا سوال جو انھوں نے کیا وہ پنسل کے متعلق تھا میں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ غور سے میری طرف دیکھتے رہے والدین اولاد کی نظر نظر کو پہچانتے ہیں اور اس کے معنی سمجھتے ہیں۔ گو میں نے بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن باپ کی نظر نے پہچان لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے چنانچہ انھوں نے بستے کی تلاشی لی۔ تو اس لڑکے کی پنسل بستے سے برآمد ہو گئی۔ چوری کھلنے سے میرا جو حال تھا سو تھا۔ میں نے جو ناقابل فراموش منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ پنسل کو ہاتھ میں لیتے ہی ان کے ہاتھ کانپنے لگے اور ایکدم ان کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا پھر وہ یکایک اندر چلے گئے میں اس طرح صحن میں پتھر بنا کھڑا تھا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ چند لمحے بعد وہ پھر باہر آئے۔ اشارے سے کہا کہ کپڑے اتارو۔ اس طرح مجھے ننگا کر کے صحن کے درخت کے ساتھ رسیوں سے باندھ دیا۔ سردیوں کی شام تھی۔ سورج ڈوبتے ہی سخت سردی ہو گئی اور میں سردی سے تھر تھر کانپنے لگا۔ میری حالت پر ترس کھا کر والدہ نے والد سے سفارش کی کہ اسے معاف کر دیں والد جو اس تمام عرصے خاموش تھے آہستہ سے بولے جب تک احمد خان خود معافی نہیں مانگے گا۔ معاف نہیں کروں گا۔ میں خود اپنی غلطی پر پشیمان تھا میں نے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ تو انھوں نے رسیاں کھول دیں۔ میں نے جلدی سے کپڑے پہنے اور پھر بھاگ کر بستر میں گھس گیا۔ ماں نے دودھ کا گلاس دیا میں پی کر سو گیا۔ دوسرے دن میں سو کر اٹھا تو میں اپنی تکلیف کو بڑی حد تک بھول گیا تھا لیکن والد کی اداس صورت نگاہوں میں چھائی ہوئی تھی۔ جو آج بھی یاد آجاتی ہے تو میں سناٹے میں آجاتا ہوں۔ کئی روز کے بعد والد نے مجھے اپنے پاس بلایا اور بولے احمد خاں عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں بیٹا۔ اس کو کبھی بٹہ نہ لگانا مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے

بس یہ چاہتا ہوں کہ تم عزت سے جیو اور موقعہ آئے تو عزت کی خاطر شان سے جان دو۔

والد کی یہ نصیحت اور یہ واقعہ میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ میرے بچپن کا دوسرا اہم واقعہ دہولہ پرائمری اسکول کا ہے خدا کا شکر ہے کہ امتحان میں اول پوزیشن لیتا تھا اس لئے اپنی کلاس کا مانیٹر ہوتا تھا۔ یہ واقعہ چوتھی جماعت کا ہے۔ ایک استاد تھے نورا نام تھا۔ وقت کے بہت پابند تھے آندھی آئے مینہ آئے کوئی آئے یا نہ آئے لیکن نورا صاحب وقت پر ضرور موجود ہوتے تھے بڑی محنت سے اور اس سے زیادہ محبت سے پڑھاتے تھے۔ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ انھیں ایک طرح سے صفائی اور ترتیب کا جنون سا تھا۔ ایک روز کلاس میں آئے تو تختہ سیاہ صاف نہیں تھا دیکھتے ہی بگڑ گئے۔ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ لیکن اس روز انھوں نے میری وہ پٹائی کی کہ میرے ہوش اڑ گئے۔ یہ غیر ذمہ داری کی سزا تھی۔ سزا دینے کے بعد بولے احمد خاں۔ کوئی اور ہوتا تو ڈانٹ کے چھوڑ دیتا۔ تجھے ترقی کرنا ہے اس لئے پلے باندھ لے کہ کبھی ذمہ داری میں کوتاہی نہ کرنا۔ یہ میری زندگی کا عجیب تجربہ ہے۔ کہ بچپن میں جن دو شخصوں نے مجھے سخت سزا دی۔ وہ دونوں مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور چونکہ محبت تعمیر چاہتی ہے۔ تکمیل چاہتی ہے ترقی چاہتی ہے۔ اس لئے محبت سے مجبور ہو کر انھوں نے دل پر پتھر رکھ کے میری تعمیر میری تکمیل اور میری ترقی کی خاطر مجھے سزا دی ہوگی۔

سچ ہے کہ محبت کے روپ نرالے ہیں۔

ناشکر گذاری ہوگی اگر یہاں میں ڈلوال کے بلجم مشن اسکول کا تذکرہ نہ کروں یہ ہمارے علاقے کا بہت ہی اچھا اسکول تھا اس کی تعلیم ہی اچھی نہیں تھی تربیت بھی اچھی تھی۔ اور اس غیر معمولی تعلیم و تربیت کا سہرا اسکول کے پرنسپل فادر سلوسٹر کے سر تھا فادر سلوسٹر کا اپنا کردار بھی بے داغ اور قابل تقلید تھا۔ ایمان داری اور فرض شناسی اس شخص پر ختم تھی انتظامی صلاحیت بھی ان میں کم نہیں تھی۔ فادر سلوسٹر کی لیڈر شپ نے مجھے بہت متاثر کیا میں انکو اپنے محسنوں میں شمار کرتا ہوں۔ بعد کو ان صفات کا جلوہ میں میں نے ملٹری کالج میں کرنل اسٹیبنگ کی ذات میں دیکھا۔ بلجم مشن اسکول کے دوسرے استادوں میں

مجھے انگریزی کے استاد مسٹر ریڈی، تاریخ و جغرافیہ کے استاد پنڈت جی اور حساب کے استاد مسٹر کندن لال اب بھی سب مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ یہ انہی استادوں کی شفقت تھی جو بیماری میں بھی مجھے اسکول کھینچ لیجاتی تھی۔

بچپن کا یہ تذکرہ مکمل نہ ہوگا اگر میں اپنے کھیلوں اور دلچسپیوں کا ذکر نہ کروں۔ مجھے بچپن میں، ہاکی فٹ بال، گلی ڈنڈا کا بہت شوق تھا آج بھی میرے چہرے پر جو زخم کا نشان ہے وہ اسی کی نشانی ہے تیراکی کا شوق بھی جنون کی حد تک تھا۔ سوئمنگ پول کہاں گاؤں کا تالاب ہی میری جولاں گاہ تھا۔ ہر چند کہ اس تالاب میں تیرنے کی اجازت والدین نے نہیں دی تھی۔ لیکن دن میں ایک آدھ بار جب بھی موقعہ ملتا میں تالاب میں اتر جاتا۔ یہ تالاب ہمارے مکان کی چھت سے نظر آتا تھا۔ جب میں گھر میں نہ ہوتا والدہ چھت پر چڑھ کر دیکھتی تھیں کہ میں کہیں تالاب پر جانے اور تیرنے والوں میں تو نہیں ہوں۔ میری بھی ایک نظر گھر کی چھت کی طرف لگی رہتی جوں ہی ان کا دوپٹہ نظر آتا میں جھٹ پانی میں غوطہ لگاتا۔ اوّل تو کئی منٹ تک میں پانی کے اندر ہی پڑا رہتا پھر اندر تیر کر دوسری طرف نکل جاتا۔ اس وقت میں سمجھتا تھا کہ میں نے ماں کو جل دیدیا ہے۔ لیکن اب میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ وہ سب سمجھتی تھیں لیکن میرے شوق کو دیکھ کر طرح دی جاتی تھیں۔ اگر والد سے شکایت کرتیں۔ تو مجھے سزا ملتی۔ جو شاید انھیں گوارا نہیں تھی۔ بچپن کے دن بھی عجیب نادانی کے دن ہوتے ہیں۔ جب بیشتر شرارتی بچے اپنے آپ کو والدین سے زیادہ ہوشیار سمجھتے ہیں۔ انھیں خبر نہیں ہوتی کہ محبت والدین کو کن مجبوریوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ملٹری کالج کا زمانہ تعلیم

احمد خان اگست ۱۹۳۷ء میں ملٹری کالج میں چھٹی جماعت میں داخل ہوئے اور ۸۴۲ کالج نمبر ملا۔ ان کا پہلا ہاؤس بڈووڈ ہاؤس تھا اتفاق سے کالج میں اپنی زندگی کے پانچ سال انھوں نے اسی ہاؤس میں گزارے۔ ۱۹۴۲ء میں آرمی اسپیشل کا امتحان پاس کیا اور دسمبر ۱۹۴۲ء میں کالج کو

لہا اور پری کمیشن کورس کے لیے کچنہ کالج نوگانگ روانہ ہوئے۔

کالج میں اپنے زمانہ تعلیم کے متعلق کرنل احمد خان لکھتے ہیں۔ جب میں داخل ہوا ہوں تو میجر کمانڈانٹ تھے کچھ دنوں کے بعد ان کی جگہ میجر اسٹیبنگ نے لی۔ اسٹاف میں صوبیدار سکندر خان دار عبدالوہاب خان، صوبیدار منگا خان، صوبیدار انور شاہ صاحب مجھے یاد ہیں۔ ان سب نے بعد شن لے کر اپنے اپنے دائرہ میں نام پیدا کیا۔ کالج میں میرے قیام کے آخری سالوں میں چند ین انسٹرکٹرز بھی آئے تھے۔ جن میں سے میرے دل پر سب سے گہرا نقش مسٹر فضل حق جیدری کا انگریزی ڈرامے کا ان جیسا استاد ہر کسی ادارہ کو میسر نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں دو استاد انگریز بھی لیکن جیدری صاحب ان سب پر بھاری تھے۔

بر ڈوڈ ہاؤس میرا ہاؤس تھا۔ اور صوبیدار سکندر خان صاحب ہاؤس ماسٹر تھے ان کو میں طور سے نہیں بھول سکتا چونکہ انھوں نے میرے ساتھ ایک خاص احسان کیا ایک سخت سزا جو انھوں نے مجھے دلوائی اور جو جرم کیا تھا وہ بھی سن لیجئے۔ اس زمانے میں پیسہ اپنے پاس رکھنا ت ممنوع تھا۔ میں نے چھپا کے چار آنے رکھے ہوئے تھے سکندر خان صاحب کو پتہ چل گیا ھوں نے رپورٹ کر دی اور پھر کمانڈانٹ اسٹیبنگ کو رپورٹ کرنے کا جو انجام ہو سکتا تھا وہ ہوا۔ سکندر خان مجھ پر بہت مہربان تھے۔ لیکن قانون شکنی کرنے پر میری رعایت نہیں کی۔ اس رعایت نہ کرنے کو میں ان کا احسان کہتا ہوں اس زمانے کا یہ دستور تھا کہ باپ ہو یا استاد خطا سے چشم پوشی نہیں کرتا تھا بلکہ جس سے تعلق زیادہ ہو اس سے زیادہ باز پرس کی جاتی تھی۔

کمانڈانٹ کرنل اسٹیبنگ کی نظر جزئیات پر رہتی تھی۔ وہ کسی کی چھوٹی سے چھوٹی فروگذاشت کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھے میلی بنیان پہننے پر سزا دی۔ اسٹیبنگ رات کو ڈارمز کا چکر لگاتے تھے اور چپلوں کا پالش تک چیک کرتے تھے۔ ایک بار وہ رات کو آئے۔ اور میری غیر پالش شدہ چپل اٹھا کر لے گئے صبح کو دفتر میں پیشی ہوئی اور حسب توقع مجھے میرے حصے کا انعام مل گیا۔ ایک بار پنجابی بولنے پر میری چارج شیٹ بنائی گئی۔ ایک دفعہ دوستی کا مفہوم یہ

سمجھا کہ جائز و ناجائز دوست کی مدد کی جائے۔ چنانچہ امتحان میں روستی کا حق ادا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ مولوی عزیز احمد نگران تھے۔ انھوں نے دھر لیا۔ نقل کرنے والے کو پانچ بید پڑے اور میں جس نے نقل کرانے کی جسارت کی تھی دس بیدوں کا تحفہ ملا۔ اس وقت تو میں بہت جز بز ہوا تھا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے لیکن اب سزا کے اس فلسفے کو سمجھتا ہوں اور اسٹیبنگ کو اپنے محسنوں میں شمار کرتا ہوں۔ اسی طرح ایک بار مفت میں مجھے اسٹیبنگ سے چالیس بید کھانے پڑے۔ اس کی روداد یوں ہے کہ انٹر پلاٹون سوئمنگ کا مقابلہ تھا مجھے میرے کمپنی کمانڈر نے سوئمنگ پول پر پہنچنے کا جو وقت دیا تھا وہ اصل وقت سے آدھ گھنٹہ بعد کا تھا میں اس کے حساب سے پول پر پہنچا۔ کسی پیریڈ پہ دیر سے پہنچنا اس زمانے میں بڑا سنگین جرم تھا۔ چنانچہ اسٹیبنگ نے مجھ سے باز پرس کی۔ میں نہ جانے کس موڈ میں تھا میں نے کہا، سر میں لیٹ نہیں ہوں جو وقت مجھے دیا گیا تھا اسکے حساب سے میں بروقت ہوں۔ اسٹیبنگ میں اس سینہ زوری کی تاب کہاں۔ اس وقت تو خاموش ہو گئے سوئمنگ کے بعد بنگلے پر بلا لیا۔ کیڈٹ آفیسرز کی تواضع وہ بنگلے پر ہی کیا کرتے تھے۔ اس شام میرے حصے میں چالیس بید آئے ہر منٹ کا ایک بید اور دس بید جواب دینے کی گستاخی کے بہرحال میرا ضمیر مطمئن تھا کہ میں بے قصور تھا۔ جب ہیڈ بوائے حق نواز کیانی کو میری سزا کا علم ہوا تو وہ میرے پاس آیا۔ اور مجھ سے اظہار ہمدردی کیا۔ اسی طرح میرے کمپنی کمانڈر نے بھی از حد شرمندگی کا اظہار کیا۔ قصور تو انہی حضرت کا تھا۔ بہرحال میں نے سب کو فراخ دلی سے معاف کر دیا۔ معاف کر دینے میں جو مزہ ہے جو بڑائی ہے جو سکون ہے اس کی لذت سے ہر کوئی واقف نہیں۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ اس روز سوئمنگ کے مقابلے میں میری پلاٹون اوّل آئی تھی۔ اور چمپئن شپ ٹرافی میری پلاٹون کو ملی تھی۔ شاید یہ اس کامیابی کا نشہ تھا کہ میں نے ان لوگوں کو معاف کر دیا۔ جو میری سزا کے ذمہ دار تھے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کامیابی، محبت اور خوشی انسان کو فراخ دل بنا دیتی ہے۔

کالج میں، میں تقریباً تمام کھیلوں میں حصہ لیتا تھا اور کالج کی ہاکی، فٹ بال اور باکسنگ ٹیم میں تھا۔ باکسنگ میں، میں نے کسی سے شکست نہیں کھائی سوائے ایک بار کے اور اس بار میرا مدمقابل کالج

کا چیمپئن باکسر چھایا تھا۔ جو باکسنگ رنگ میں ناقابل شکست شمار ہوتا۔ دھپاتا ۹۲ محمد حسین کا نک نیم تھا جو بعد کو لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوتے)

کرنل اسٹیبنگ کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں وہ بہت سخت تھے لیکن لڑکوں کا خیال بھی بہت رکھتے تھے اوائل دسمبر ۱۹۴۲ء میں میں کالج کی طرف سے ایک باہر کی ٹیم کے خلاف فٹ بال کھیل رہا تھا۔ اسٹیبنگ بھی حسب دستور موجود تھے میں نے یکے بعد دیگرے چھ گول کئے اسٹیبنگ اتنے خوش ہوئے کہ وہیں مجھے کچھ کالج کے لیے منتخب کر لینے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ ۲۹ دسمبر کو میں پری کیڈٹ ٹریننگ کے لیے کچھز کالج نوگانگ روانہ ہو گیا۔ یہ ترقی کی طرف میرا پہلا قدم تھا۔ جو ملٹری کالج سے اٹھا تھا۔ ۸۱۳ میجر راؤ عبدالقدیر خاں شہید بھی میرے ساتھ تھے۔

کچھز کالج نوگانگ اور ۸ پنجاب کا دور

احمد خان دسمبر ۱۹۴۲ء میں پری کیڈٹ کورس کے لئے کچھز کالج پہنچے ابھی کورس کو چلے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ مئی ۱۹۴۴ء میں کچھز کالج توڑ دیا گیا دوسری جنگ عظیم قریب الختم تھی۔ اور مزید افسروں کی ضرورت باقی نہ رہی تھی چنانچہ انھیں ان کی آبائی بلٹن ۸ پنجاب کے سنٹر لاہور بھیج دیا گیا۔ یہاں انھیں سپیشل کیڈٹ اور رینک آفیسرز ٹریننگ ونگ میں رکھا گیا۔ یہاں سے وہ آرمی مائن کورس اور آرمی گیس کورس کے لیے ساگر اور دیولالی گئے۔ یہ دونوں کورس انھوں نے امتیاز سے پاس کئے اور انھیں انسٹرکٹر منتخب کر لیا گیا۔

او، ٹی ایس بنگلور اور فسٹ پنجاب کا زمانہ

اپریل ۱۹۴۵ء میں ان کا انتخاب او، ٹی، ایس بنگلور کے لئے ہوا ان دنوں یہ انتخاب آسان نہ تھا۔ ہزاروں امیدواروں میں سے جو چند امیدوار کمیشن کے لئے منتخب ہوئے ان میں سے ایک احمد خان تھے ۲۸ اپریل ۱۹۴۶ء کو انھیں او۔ ٹی۔ ایس بنگلور سے کمیشن ملا اور پہلی پوسٹنگ فسٹ پنجاب

سنٹر جہلم میں ہوئی۔ کچھ دنوں بعد ۳/۱ پنجاب کی پیرا بٹالین میں بھیج دیئے گئے۔ اسی سال انھوں نے کاکول سے آرمی کا پی ٹی کورس اے گریڈ کے ساتھ کیا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ان کی بٹالین باؤنڈری کمیشن کے ساتھ وابستہ تھی اس دور کے بارے میں کرنل احمد خان لکھتے ہیں۔

اس بٹالین کا نہ صرف مشن بہت اہم تھا بلکہ اس کے افسر بھی ایک سے ایک بڑھ کر تھے۔ کمان ضرور ایک انگریز کی تھی لیکن سیکنڈ ان کمانڈ میجر شریف، کمپنی کمانڈرز کیپٹن آفتاب اور کیپٹن نوازش تھے بعد کو ان تینوں نے پاکستان آرمی میں بڑا مقام پیدا کیا اور سب جنرل ہو کر ریٹائر ہوئے۔ مجھے خود اس بٹالین میں کمپنی افسر، کمپنی کمانڈر اور ایجوٹینٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ باؤنڈری کمیشن کے سلسلے میں ہماری بٹالین نے اپنی ذمہ داریاں پوری ذمہ داری سے پوری کیں۔

یونٹ کی زندگی کے دو اہم واقعات

انسان کے کردار کا اندازہ ان واقعات و حادثات سے ہوتا ہے جن سے انسان کبھی اضطراری اور کبھی شعوری طور پر گذرتا ہے اس لیے جب ہم نے کرنل احمد خان سے پوچھا کہ وہ اپنی یونٹ کی زندگی کے دو ایک یادگار واقعات سے پردہ اٹھائیں تو انھوں نے کہا۔

ایک دفعہ بریگیڈ کا ہاکی فائنل میچ ہو رہا تھا جس میں بریگیڈ کمانڈر بھی کھیل رہے تھے۔ کھیل کے دوران انھوں نے مجھے ایسے الفاظ میں سرزنش کی جو سخت قابل اعتراض تھے میری خصلت ہے کسی کا توہین آمیز رویہ برداشت نہیں کر سکتا چنانچہ میں نے غصے اور جھنجلاہٹ کے عالم میں ہاکی کو وہیں گراونڈ پر پٹخا اور کھیل چھوڑ کر میں اپنے کمرہ میں چلا گیا بٹالین کے کرنل صاحب اور دوسرے افسروں نے بڑی کوشش کی میں گراؤنڈ میں واپس چلا جاؤں حتیٰ کہ خود بریگیڈئر صاحب بھی آئے لیکن میں نہ مانا۔ شام کے کھانے کے لیے میں میس میں بھی نہیں گیا رات کے نو بجے ان کا آدمی آیا کہ بریگیڈئر صاحب بلاتے ہیں لیکن میں پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ میرا غصہ ابھی اترا نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد دوسرا آدمی آیا اور

اس نے کہا بریگیڈئر صاحب کا حکم ہے کہ میں میس میں حاضر ہوں۔ اور وضو کر کے آؤں۔ وضو کا نام سنتے ہی میری قلبی کیفیت یکدم بدل گئی۔ چنانچہ میں گیا مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا احمد خان پہلے نماز پڑھو پھر بات ہوگی میں نے نماز پڑھی تو بولے تم خواہ مخواہ ناراض ہو گئے کھیلتے کھیلتے جوش میں ایک آدھ فقرہ منہ سے نکل جاتا ہے میرا مطلب تمہاری دلآزاری یا توہین نہ تھا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ان کی اس توضیح بلکہ معذرت کے بعد میرا دل بھی صاف ہو گیا اور بات رفت گذشت ہوئی۔ یہ بریگیڈئر صاحب جو بعد کو میجر جنرل ہوئے اور بڑے اونچے اونچے عہدوں پر فائز رہے اس حادثے کے بعد مجھ پر خصوصی کرم فرماتے تھے میں ان کے ظرف کی داد دوں گا کہ گو میرا رویّہ قابل تعزیر تھا۔ انھوں نے اسے درگذر کیا اور اپنے دل میں بھی نہیں رکھا۔ اس طرح کے اور بہت سے واقعات بھی میرے ذہن میں ہیں جب لوگوں نے اپنے سینئرز سے جرأت سے اصولی اختلاف کیا یا اپنے خلاف ہونے والی زیادتی کے خلاف احتجاج کیا اور ٹھیک ٹھاک رہے سروس کیریر بھی بڑا شاندار رہا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنی اور دوسروں کی نظر میں اونچے رہے دنیا میں عزت سے بڑھ کر کیا ہے۔

جب میں اپنی یونٹ میں ایجوٹینٹ تھا اس زمانے میں ایک اور قابل ذکر واقعہ بھی پیش آیا۔ جو لوگ یونٹ کی زندگی سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یونٹ میں جے۔ سی۔ اوز اور صوبیدار میجر کی حیثیت کیا ہوتی ہے بہرحال جب میں نے ایجوٹنٹی کا چارج لیا تو دیکھا کہ پی ٹی پر جے سی اوز نہیں آتے میں نے سب کو دفتر میں بلایا اور کہا آپ جونیئر لیڈر ہیں پی ٹی آپ کے لیے بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی ہمارے لیے اور جوانوں کے لیے۔ انھوں نے کہا ہم تو پی ٹی سے مستثنیٰ رہے ہیں میں نے کہا وہ حالات اور ہوں گے بہرحال آپ لوگ اب ضرور آیا کریں۔ مختصر یہ کہ انھوں نے قیل و قال کی اور قائل نہ ہوئے۔ میں چونکہ اصولی معاملات میں نہ رعایت لینا پسند کرتا ہوں نہ رعایت دینے کو جائز سمجھتا ہوں میں نے ان کے اس رویے کا سختی سے نوٹس لیا اور خصوصاً اس وجہ سے کہ خود صوبیدار میجر صاحب نے اس معاملے کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ کمانڈنگ افسر کو رپورٹ کر دی۔ اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ انھوں نے ایک گھنٹے کے نوٹس پر صوبیدار میجر کو گھر کی ریل پر سوار کرا دیا۔ بعد کو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ رحم

کرنا تھا۔ میں نے جواب دیا ذاتی معاملات میں رحم ٹھیک ہے لیکن قوم اور ملک کے مفاد کو قربان کر کے کسی خطاکار پر رحم کرنے کو میں سب سے بڑا ظلم سمجھتا ہوں۔ دنیا کی بھی عجب ریت ہے کہ ہم خود اپنے ذاتی مفادات کو تو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچنے دیتے لیکن خطاکاروں کو فائدہ پہنچانے کی خاطر قوم و ملک کے مفاد کو نقصان پہنچانے سے نہیں ہچکچاتے۔

پی ٹی اسکول سے ریٹائرمنٹ تک

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک احمد خان پی ٹی اسکول کاکول میں انسٹرکٹر رہے ۱۹۵۱ء میں انھیں، اٹامک، بیالوجیکل اور کیمیکل وارفیئر کورس کے لیے انگلستان بھیجا گیا اس کورس کے لیے یہ پہلے پاکستانی افسر تھے۔ یہ کورس کرنے کے بعد ان کا تبادلہ انفنٹری اسکول کوئٹہ میں ہوا جہاں انھوں نے اے بی سی وارفیئر کورس شروع کیا ۱۹۵۲ء میں احمد خان نے اسٹاف کالج کوئٹہ سے سینئر ٹیک کورس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایڈم کورس، انٹیلی جنس کورس اور ایم پی کورس بھی کیا اور پھر چھ ماہ ایم پی یونٹ کی کمان کرنے کے بعد انھیں سی ایم پی اسکول میں بحیثیت چیف انسٹرکٹر مقرر کیا گیا۔

۱۹۶۲ء میں احمد خان نے ۲۰/۱ پنجاب بٹالین میں سیکنڈ ان کمانڈ کی ذمہ داریاں سنبھالیں ۱۹۶۴ء میں ۱۹ اے کے رجمنٹ کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کشمیر کے محاذ پر اسی بٹالین نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

۱۹۶۶ء میں کرنل احمد خان ایس آئی بی کے او، سی مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۳ء تک انھوں نے کابل میں پاکستان کے ملٹری اتاشی کے فرائض انجام دیئے۔ اس کے بعد جی ایچ کیو میں ایم۔ آئی اور پی ایس ڈائریکٹوریٹ میں خدمات بجالانے کے بعد ۱۹۷۴ء میں آرمی سے ریٹائر ہوئے اور آجکل فوجی فاؤنڈیشن میں ایک اہم انتظامی عہدے پر فائز ہیں ماشاءاللہ۔

تو یہ ہے ان مرحلوں اور منزلوں کی داستان جن سے کرنل احمد خان اب تک گذرے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کا حاصل ۱۹۶۵ء کی جنگ میں وہ معرکہ تھا جس میں کامیابی کے لیے انھیں ستارۂ جرأت

کے اعزاز سے نوازا گیا۔

اس سلسلے میں کرنل احمد خان ستارۂ جرأت لکھتے ہیں۔

۱۹۶۵ء میں ہمارا بریگیڈ کوٹلی میں متعین تھا ہمارے ڈویژن کمانڈر جنرل اختر ملک کو ایک خاص مہم کے لیے ایک بٹالین کا انتخاب کرنا تھا۔ اس کے لئے انھوں نے چھان پھٹک شروع کی۔ آخر کار ان کی نظر انتخاب میری بٹالین ۱۹ اے کے پر پڑی۔ اس انتخاب کی علیحدہ داستان ہے۔

جنرل اختر ملک ایسا کمانڈر، ایک اہم مہم کے لیے میری بٹالین کا انتخاب کرے یہ میرے لیے اور میری بٹالین کے لئے بڑا اعزاز تھا اور اس سے بڑا چیلنج۔ دشمن کو اس کے گھر میں جا کر للکارنا آسان کام نہ تھا۔

میرا مشن للحال فیچر کو دشمن سے پاک کرنا تھا۔ اور اس کے لیے وقت کی ایک حد بھی تھی۔ اب پہلا مرحلہ تو یہ تھا کہ میں دشمن سے متعلق ضروری معلومات حاصل کروں۔ میں نے اپنے صوبیدار شیر خان کو بلایا اور کہا صوبیدار صاحب آج آپ کی کمانڈو ٹریننگ کا امتحان ہے نام بھی آپ کا شیر خان ہے اور یہ کام بھی شیر دلی کا ہے صوبیدار شیر خان کا چہرہ جوش سے سرخ ہو گیا۔ اور بڑے جوش سے بولے کرنل صاحب۔ دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بھی کوئی کام ہے۔ میں سالم بندہ اٹھا لاتا ہوں۔ آپ جو چاہیں اس سے پوچھیں۔ چنانچہ یہی ہوا زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ صوبیدار شیر خان دشمن کا ایک سپاہی اٹھا لائے۔ اور اسے میرے سامنے ڈھیر کر دیا۔ بولے کرنل صاحب۔ لیجئے آپ کا شکار آپ کے سامنے ہے۔ میں نے اس سپاہی سے ضروری معلومات حاصل کیں۔ اور اللہ کا نام لے کر للحال فیچر کا رُخ کر دیا دشمن اس پہاڑی پر بڑی شان سے جما بیٹھا تھا۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ۱۹ اے کے مجاہد اس پر عقابوں کی طرح جھپٹ پڑیں گے۔ اور جب واقعی جھپٹے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے مقابلہ تو دشمن نے رحال کیا اور حق تو یہ ہے کہ خوب کیا لیکن ہم جو کفن باندھ کے نکلے تھے وہ ہمارے سامنے کیا تھا اللہ نے ہماری نیتوں کو دیکھا اور ہمیں سرخ رو کیا۔

للمحال فیچر کی اہمیت

للمحال نامی پہاڑی کا محلِ وقوع کچھ ایسا ہے کہ اس پر کھڑے ہو کر پورا علاقہ آئینے کی طرح سامنے آجاتا ہے۔ حدیہ کہ رات کو جہلم کی روشنیاں تک دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ فیچر کوئی نصف میل چوڑا اور تقریباً ایک میل لمبا ہے اور اس کی ڈھلانیں سیدھی ہیں۔ دشمن اتنی جنگی اہمیت کے اس فیچر پر قابض تھا۔ یہاں اس کی دو پلٹنیں توپ خانے اور ہوائی جہازوں سمیت تمام امدادی ہتھیاروں سے لیس یہاں مورچہ بند تھیں۔ اور دشمن ہر قیمت پر اس فیچر پر قابض رہنا چاہتا تھا۔ ادھر ہمارے لئے اس فیچر کو دشمن سے چھیننا ضروری ہی نہیں لازمی تھا۔ اس پر قبضہ کئے بغیر ہمارے دستے اس علاقے میں وہ کارروائی کر ہی نہیں سکتے تھے جو ان کے سپرد کی گئی تھی۔

اس فیچر کی جنگی اہمیت اور اس پر اور اس کے آس پاس دشمن کی فوج کی تعداد کے پیشِ نظر خود ہمارے کمانڈروں نے اس پر ایک بریگیڈ کی قوت سے حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن جنگ کے بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے لڑاکا دستوں میں یکایک کمی پڑ گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے صرف ایک بٹالین سے یہ معرکہ سر کرنے کا حکم ملا۔ للمحال فیچر پر قبضہ پہلا مرحلہ تھا۔ اس مرحلے سے کامیابی سے گزرنے کے بعد ہم نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ اور کئی مربع میل کا علاقہ دشمن سے پاک کر دیا۔ چونکہ ہمارا مشن کمانڈو نوعیت کا تھا اسلئے ہمیں چھپ چھپ کے وار کرنا پڑا تھا۔ دشمن بھی چوکنّا تھا۔ اس نے اپنے جاسوس علاقے میں پھیلا رکھے تھے۔ جو اسے ہماری کارروائی سے باخبر رکھے ہوئے تھے۔ آخر مجھے انٹیلی جنس کے ذریعے سے اطلاع ملی کہ یہ جاسوس صاحب کوئی اور نہیں اس علاقے کے مولوی صاحب ہیں جو ہم سے بھی رسم و راہ قائم کئے ہوئے تھے اسی دن ان کی طرف سے رات کے کھانے کی دعوت موصول ہوئی میں نے کہا بسم اللہ آج ہم اپنی جرأت اور ان کی غیرت کو آزماتے ہیں۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے اپنے کمانڈو سپاہی مولوی صاحب کے گھر کے اردگرد متعین کر دیئے جنہوں نے منصوبہ کے مطابق ان کے گھر کی کھڑکیاں کھول دیں تاکہ دشمن اپنی کارروائی کرے تو باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہو۔

کھانے کے لئے جب ہم مولوی صاحب قبلہ کے گھر پہنچے۔ تو انھوں نے ہمارا ضرورت سے زیادہ گرم جوشی سے استقبال کیا۔ میں کھٹکا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ ان کے ساتھ ایک دو آدمی ایسے بھی تھے جنہیں میں نہیں پہچانتا تھا۔ بہرحال میں اور میرے ساتھی چونکنے ہو گئے۔ خطرہ کی بو آس پاس پھیلی ہوئی تھی۔ پھر وہی ہوا جسکا اندیشہ تھا جوں ہی ہم لوگ دسترخوان پر بیٹھے دروازے پر فائر ہوا میں سمجھ گیا کہ ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے فائر ہوتے ہی بجائے دروازے کی طرف بھاگنے کے ہم پیچھے کی کھڑکیوں سے چھلانگیں لگا کے باہر آ گئے دائیں بائیں بہت فائر ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم بغیر کوئی نقصان اٹھائے اپنی کمین گاہوں میں چلے گئے۔ انہوں کی غداری کا ہمارا یہ پہلا تجربہ تھا۔ جس سے ہمیں افسوس تو بہت ہوا۔ لیکن دل برداشتہ نہ ہوئے۔ جوان ہو یا افسر ہر ایک کی تمنا تھی کہ جان جائے خواہ رہے لیکن کسی طرح وہ مشن پورا ہو جس کے لئے ہم نے جہاد شروع کیا ہے۔ جس بے جگری سے میرے جان باز کمانڈو ایکشن کر رہے تھے اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہ تھا کہ انھیں زندگی کی نہیں موت کی تلاش ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں تقریباً ہر محاذ پر تقریباً ہر سپاہی اور افسر کا یہی رویہ تھا۔

اصل سپاہی کا دل تو راہ کو پرخار دیکھ کر ہی خوش ہوتا ہے ابھی ہم لوگ دشمن پر مزید کاری ضربیں لگانے کے منصوبے بنا ہی رہے تھے کہ ایک روز مجھے وائرلیس پر پیغام ملا۔ کہ بٹالین کو واپس لے آؤ۔ واپس بٹالین کو۔ اب جبکہ ہم اتنے دور آ چکے ہیں اور اتنے مرحلے طے کر چکے ہیں؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال میسج صاف اور واضح تھا۔ میرا دل تو خون ہو گیا لیکن اس سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اپنے ساتھیوں اور جوانوں کو یہ خبر کیسے سناؤں اور انھیں شکار پر جھپٹنے کے بجائے شکار گاہ سے واپس جانے پر کیسے آمادہ کروں۔ بہرحال میرے لیے حکم کی تعمیل کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ سپاہی کی شان ہی یہ ہے کہ اسے جو حکم دیا جائے اس کی تعمیل کرے۔ جب میں نے جوانوں اور ساتھیوں کو اکٹھا کر کے بتایا کہ تازہ حکم یہ ہے۔ تو پہلے تو وہ پتھر کے بت بن گئے پھر غم و اندوہ کی تصویر، سخت مایوسی ان کے چہرے مہرے سے عیاں تھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے کہا ہمیں

اپنی جانوں کی پرواہ نہیں ہم اپنے طور پر جہاد جاری رکھیں گے میں نے انھیں بہت سمجھایا کہ افسران بالا بہتر سمجھتے ہیں کہ قومی مفاد کیا ہے اور کیا نہیں۔ ہمارا کام تو ان کے فیصلوں کی پیروی کرنا ہے۔

مختصر یہ کہ اسی خشک نالے کے راستے سے واپسی ہوئی جس راستے سے گئے تھے۔ جب دو کمپنیاں میرے آگے چلی گئیں تو میں اپنے کمان ہیڈ کوارٹر کے دستے کے ساتھ روانہ ہوا اب صورت حال یہ تھی۔ دو کمپنیاں میرے آگے تھیں اور دو پیچھے اور میں بیچ میں اپنے مختصر اسٹاف کے ساتھ تھا۔ رات اور وہ بھی اندھیری ہم خشک نالے کے بیچ میں چل رہے تھے۔ جس کے کنارے تقریباً چالیس فٹ گہرے تھے۔ دشمن نالے کے کنارے پر پوزیشن لئے بیٹھا تھا۔ جوں ہی ہم پوری طرح اس کی زد میں آئے دشمن نے پوری طاقت سے فائر کھول دیا میری دو کمپنیاں آگے جا چکی تھیں۔ اور دو پیچھے تھیں۔ میں درمیان میں دشمن کے فائر کی زد میں تھا۔ چنانچہ میں زخمی ہو گیا ایک گولی ٹانگ میں لگی اور ایک ہاتھ میں۔ لیکن میرا انٹیلی جنس کا نائیک وہیں شہید ہو گیا۔ زخموں کی شدت سے میرا چلنا محال تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پھر بھی میرا واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا عجیب والہانہ سی خواہش تھی کہ مروں بھی تو یہیں لیکن حالات پر تو کسی کو اختیار نہیں۔ مجھ سے آگے والی کمپنی کے سردار صوبیدار شیر خان نے جب اس فائر کی آواز سنی تو بجائے اور آگے جانے کے وہ شیر ہماری خبر لینے پیچھے آیا۔

مجھے اس حالت میں دیکھ کر پوچھا سر یہ کیا۔ میں نے کہا جو حکم خدا۔ مختصر یہ کہ شیر خان نے مجھے فرسٹ ایڈ دی اور پوچھا سر اب کیا حکم ہے۔ میں نے جواب دیا اس نائیک شہید کی لاش تو ہر صورت میں پاک مٹی میں دفن کرنی ہے دوسرے یہ کہ دشمن کا مقابلہ کرنا ہے رہا میں آپ میری فکر نہ کریں یہ وقت بچنے بچانے کا نہیں لڑنے اور مارنے کا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس منظر کی تصویر نہ لی جا سکتی تھی نہ لی گئی اور لفظوں سے اندازہ نہیں ہو سکتا کہ وہ صورت حال کتنی افراتفری، کتنی گھمبیر اور دل ہلا دینے والی تھی بہر حال ہمارے جیالوں نے جی نہیں چھوڑا۔ ہمارا ہر سپاہی عزم واستقامت کی تصویر بنا ہوا تھا

ہوا تھا۔ لیکن صوبیدار شبیر خان نے غیر معمولی ہمت ہی نہیں غیر معمولی سمجھ بوجھ کا ثبوت بھی دیا۔ نہ صرف شہید نائیک کی لاش کو سنبھالا بلکہ مجھے لکڑیوں کا اسٹریچر بنا کر لے چلے اس طرح یہ پرخطر اور پر آلام سفر مزید ایک دن جاری رہا۔ دوسری رات ہم نے پاک سرزمین پر قدم رکھا۔ تو جنرل اختر ملک میری بٹالین کا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے ہمارا اس طرح استقبال کیا۔ جیسے کوئی باپ اپنے بچھڑے ہوئے بیٹوں سے ملتا ہے انھوں نے بڑھ کر میرے ماتھے کو چوما اور کہا I WISH YOU WERE MY SON وہ لمحہ میری زندگی کا ناقابل فراموش لمحہ تھا۔

چونکہ میرے زخم خراب ہو چکے تھے مجھے فوراً سی ایم ایچ کھاریاں بھیجدیا گیا وہاں کے ڈاکٹروں نے اپنی سی کی لیکن ٹانگ کے زخموں کی حالت کے پیش نظر انھوں نے فیصلہ کیا کہ زخمی ٹانگ کاٹ دی جائے۔ میں موت کے منہ سے بچ کے آیا تھا۔ ٹانگ کٹنے کی مجھے کیا پرواہ ہوتی پھر بھی میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی یا اللہ یا میدان جنگ کی موت دینا تھی یا اب اس معذوری کی زندگی سے مجھے بچا۔

ٹانگ کاٹنے کے آپریشن کے لئے مجھے سی ایم ایچ جہلم منتقل کیا گیا میں نے پھر رب کریم ذوالجلال والاکرام کو پکارا۔ یا اللہ کچھ کر مجھے معذوری کی زندگی نہیں چاہیئے۔ دل سے جو دعا نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ میرے رب نے میری سنی۔ اور یکایک کچھ ایسے معجزاتی اتفاقات رونما ہوئے کہ سرجنوں نے ٹانگ کاٹنے کا فیصلہ ملتوی کر دیا۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اور میرا یہ یقین پختہ سے پختہ تر ہو گیا کہ خدا حیّ اور قیوم ہے۔

اسی دوران میری بٹالین ۱۹، اے کے کو دوبارہ چھمب جوڑیاں محاذ پر بھیج دیا گیا جہاں میری بٹالین نے جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر شہادت حاصل کرنے کی مثال قائم کردی۔ انھوں نے وطن کے ناموس کی خاطر اور قوم کے وقار کے لیے بڑھ کر قربانیاں پیش کیں۔ افسوس کہ اس دوران میں ہسپتال تھا اور ان کی قیادت نہ کرسکا۔ جب جنگ ختم ہوئی اور بٹالین کے جوانوں سے واپسی پر ملاقات ہوئی تو ۵۰ فی صد شہادتیں سن سن کر میرے کان سن ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ جس کا میں پوچھتا تھا وہی

شہید ہوا تھا۔ جس کا نام لیا وہی اللہ کے نام پر نثار ہو چکا تھا۔ مجھے اس بٹالین کا جذبہ جہاد اور قربانی کا بے مثال شوق ہمیشہ یاد رہے گا۔ ان کی یاد آخری سانس تک باقی رہے گی۔ ۱۹۔ اے کے کے ہر جوان کو تا عمر یاد کرتا رہوں گا۔ کاش ایک بار پھر اس بٹالین کی قیادت نصیب ہو سکتی۔

۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کا دن تھا کہ ایک دوست نے مجھے آ کر مبارک باد دی کہ آپ کو للحال فیچر کی فتح پر ستارۂ جرأت عطا ہوا ہے۔ یہ فتح میری نہیں ۱۹، اے، کے، کے جوانوں کی فتح تھی اور اس کامیابی کا سہرا حقیقتاً ان کے جذبہ جہاد کے سر بندھتا ہے، میری دلی دعا ہے کہ ۱۹۔ اے کے بٹالین آئندہ مستقبل میں بھی اپنے ملک وملت کی خاطر اس سے بڑھ کر شہادت کی مثال قائم کرے جو دین اسلام میں فرض اولین ہے پاکستان پائندہ باد

ستارہ جرأت کا فرمان

لفٹیننٹ کرنل احمد خاں اپنی پوری بٹالین دشمن کی صفوں میں سے گزار کر دشمن کے علاقے میں لے گئے اور تقریباً ایک ہفتے تک چھمب سیکٹر کے علاقے میں دشمن کی صفوں کے پیچھے ضروری کارروائی کرتے رہے۔ کرنل احمد خان کے ایکشن کے نتیجے میں نہ صرف دشمن نے سخت جانی نقصان اٹھایا بلکہ ان کارروائیوں کی وجہ سے دشمن حیران و ششدر رہ گیا اور اس کا حوصلہ پست ہو گیا۔ اور اس طرح چھمب آپریشن کی کامیابی میں کرنل احمد خان کی کارروائیوں نے اہم کردار ادا کیا۔

اس کارنامے کے لیے کرنل احمد خان کو ستارۂ جرأت فوری طور پر دینے کی سفارش کی جاتی ہے۔ ۱۲ ڈویژن کے کمانڈر نے یہ سفارش ۲۱ ستمبر ۶۵ء کو کی اور ۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو ستارۂ جرأت عطا ہوا۔

میجر جنرل (ریٹائرڈ) ممتاز علی

ستارۂ جرأت (دوبار)

میجر جنرل (ریٹائرڈ) ممتاز علی ستارہ جرأت (دو بار)

خاندانی پس منظر

میرا تعلق موضع بجھہ کے ایک قدیم فوجی خاندان سے ہے۔ یہ گاؤں گوجر خان تحصیل اور ضلع راولپنڈی میں ہے۔ نسل کے اعتبار سے بھی ہم لوگ بھٹی راجپوت ہیں۔ میرے والد مرحوم کیپٹن باغ علی نے دونوں بڑی جنگوں (۱۸-۱۹۱۴) اور (۴۵-۱۹۳۹) میں حصہ لیا۔ انھیں سرکار سے سردار بہادر، آرڈر آف برٹش انڈیا ڈسٹینگوئشڈ سروس میڈل کے اعزازات ملے تھے والد بلند قد و قامت کے تھے مجھے یاد ہے کہ وہ وردی پر دس میڈل سجاتے تھے اور بڑے بارعب نظر آتے تھے۔ وہ میرے پہلے ہیرو تھے۔

ابتدائی زندگی

میں ۲۹ر اگست ۱۹۲۷ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوا۔ میرے آبائی گاؤں بجھہ

میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ اس لیے قریبی گاؤں کے مڈل اسکول میں پانچ برس پڑھا اس کے بعد کنگ جارجز رائل انڈین ملٹری اسکول جہلم میں داخل ہوا۔

کے۔جی۔آر۔آئی۔ایم۔سی جہلم

کے جی آر اسکول جہلم (اب ملٹری کالج جہلم) میں، میں ۱۹۳۹ میں چھٹے درجے میں داخل ہوا۔ میرا کالج نمبر ۸۵۶ تھا۔ میں ایک دیہاتی اسکول سے آیا تھا۔ یہاں کا ماحول طرز تعلیم اور ذریعہ تعلیم مختلف تھا۔ اس لیے شروع کے دو تین سال میں میں ایک اوسط درجے کا طالب علم رہا لیکن کالج میں اپنی تعلیم کے آخری تین سالوں میں اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنی کلاس میں اوپر کے چند لڑکوں میں رہا آٹھویں اور نویں جماعت ایک سال میں پاس کی۔ ۱۹۴۴ء میں پانچویں سال تک مجھے کوئی انتظامی ذمہ داری یا قیادت کا عہدہ نہیں دیا گیا۔ اس وقت اپنی کلاس میں میں تنہا کیڈٹ تھا جو کسی عہدے سے محروم تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ میری جسمانی اور قیادتی صلاحیتوں کی نشو ونما کی رفتار قدرے سست تھی۔ لیکن جونیئر پریفیکٹی میرے لیے ایک نعمت ثابت ہوئی۔ جوں ہی مجھے جونیئر پریفیکٹ بنایا گیا میری قوتیں اور صلاحیتیں تیزی سے ابھرنے لگیں اور سال بھر کے اندر اندر مجھے سینیئر پریفیکٹ یا ہاؤس ہیڈ بوائے بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں میں نے انڈین آرمی اسپیشل سرٹی فکٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں کالج کے ارباب اختیار اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ میٹرک یا آرمی اسپیشل کے بعد کیڈٹس کو کیا پڑھایا جائے۔ یا کون سا کورس کرایا جائے۔ اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ کچھ منتخب لڑکوں کو کمیشن کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ باقی فرسٹ کلاس کے بعد یا اسپیشل کے بعد اپنی آبائی رجمنٹوں میں بھرتی ہو جاتے تھے پھر وہاں سے کمیشن کے لیے کوشش کرتے تھے۔ یا پھر رینکس

میں نوکری کرتے تھے بہرحال ۱۹۴۴ء میں جن لڑکوں کو سیلیکشن بورڈ کے سامنے جانے کے لیے منتخب کیا گیا ان میں، میں بھی تھا۔ اس گروپ کے لیے سینئر کیمبرج کی کلاس شروع کی گئی۔ کچھ دنوں بعد یہ ارادہ ترک کر دیا گیا اور ہم نے ایف ایس سی کا نصاب پڑھنا شروع کیا۔ جو خاصا مشکل تھا انگریزی میں گولڈن ٹریژری کی کچھ نظمیں بھی تھیں اور اردو میں مجھے یاد ہے کہ تاریخ نظم و نثر اردو اور غالب کے خطوط کی کتاب اردوئے معلّٰے بھی شامل نصاب تھی اس زمانے میں انگریزی بولنا لازمی تھا۔ اس لیے انگریزی پڑھنے پڑھانے کا معیار خاصا بلند تھا البتہ بعض اوقات انگریزی کا صحیح لفظ یا فقرہ نہ جاننے سے عجیب وغریب اور مضحکہ خیز جملے اور فقرے سننے میں آتے تھے۔

کالج میں میری دلچسپیاں

اس زمانے میں پی ٹی پریڈ اور جھاڑ پونچھ سے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی تھی کہ کوئی اور بات سوچی جائے۔ کم از کم میرا کوئی خاص مشغلہ نہیں تھا۔ پڑھنا اور اپنے عہدے کی ذمہ داریوں کو نبھانا ہی سب کچھ تھا۔ اس دائرے میں اللہ کا شکر ہے کہ میری ترقی کی رفتار اس حد تک اچھی تھی کہ میری آخری رپورٹ میں کرنل اسٹینگ نے لکھا۔

ممتاز کی شخصیت کی نشوونما اس حد تک ہو چکی ہے کہ سروسز سیلیکشن بورڈ کے سامنے بھیجنے کی سفارش کی جائے" کھیلوں یا اسپورٹس کے دائرے میں بھی میری نشوونما قدرے دیر سے ہوئی کالج میں مجھے کھیلوں وغیرہ میں کوئی امتیاز نہیں مل سکا۔ لیکن کمیشن کے بعد، میں نے آرمی کی سطح پر ان کھیلوں میں شرکت کی اور اللہ کے فضل وکرم سے بڑا نام پیدا کیا۔

ڈسپلن اور سزائیں

کرنل اسٹیننگ ڈسپلن کے معاملہ میں اتنے سخت تھے کہ کوئی لڑکا شرارت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک بار ایک دو سینئر پریفیکٹس نے ذرا ہاتھ پاؤں نکالے تو کمانڈانٹ نے انھیں سزا کے طور پر چھٹیوں میں کالج ہی میں رکھا۔ بچاروں نے بڑی معافی مانگی لیکن سزا معاف نہ ہوئی۔ میں بتا چکا ہوں کرنل اسٹیننگ اسپارٹا کے کلاسیکی ڈسپلن کے قائل تھے۔ سپاہیوں کی طرح لمبی لمبی مارچیں کرائی جاتی تھیں۔ ڈسپلن سے جو ذرا بھی روگردانی کرتا یا چوں وچرا کرتا وہ گھر کا راستہ دیکھتا ایک مرتبہ ذرا سی سرکشی پر چند لڑکے کالج سے خارج کر دیئے گئے اور انھیں ان کی یونٹوں میں سپاہیوں کی حیثیت سے بھرتی کرا دیا گیا۔ بعض اوقات سزائیں دلچسپ حد تک عبرتناک ہوتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ایک مرتبہ ایک لڑکے نے شارٹ کٹ کیا۔ ایک جھاڑی کو پھلانگتے ہوئے ایک اینٹ اکھڑ گئی شامتِ اعمال کمانڈانٹ نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ جب اسے دفتر میں پیش کیا گیا۔ تو سامنے وہ اینٹ موجود تھی۔ کمانڈانٹ نے سزا یہ سنائی کہ تین دن تک تم یہ اینٹ ہر وقت اپنے ساتھ رکھو گے اب بچارہ جہاں جاتا اینٹ ساتھ لے جاتا۔ مسجد میں، کلاس میں، میس میں، ہاؤس میں سوتے آتے جاتے وہ اینٹ اس کے ساتھ ہوتی۔ عجیب مضحکہ خیز صورت تھی بے چارہ اس اینٹ سے عاجز آ گیا تھا۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس سختی کے پیچھے بھی ایک فلسفہ تربیت تھا۔ یہ ذاتی مزاجی تلخی یا برہمی کا نتیجہ نہیں تھی۔ اور یہ سزا بے لاگ تھی۔ اس میں رعایت نہیں ہوتی تھی بلکہ سینئر کیڈٹس پر زیادہ سختی تھی۔ اتفاق یا بد قسمتی سے ایک بار میں نے بے حساب بید کھائے گو بالکل بے قصور تھا۔ جب ہم کیڈٹ آفیسرز میس میں رہتے تھے

وہاں ایک کیپٹن کوارٹر ماسٹر ہماری کٹ چیک کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب کٹ چیک ہونے لگی تو مجھے پتہ چلا کہ میرے پاس تو ایک موزے کا جوڑا کم ہے کٹ کی کسی چیز کو کھو دینا اور گم شدگی کی رپورٹ نہ کرنا قابلِ سزا جرم تھا۔ میں اسی پریشانی میں تھا کہ اب کیا کیا جائے کہ میرے ساتھی خالد نے پوچھا کیا بات ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ موزے کا ایک جوڑا نہیں مل رہا ہے۔ اس نے کہا میرے پاس فالتو جوڑا ہے تم اس سے کام چلاؤ۔ پھر مجھے واپس کر دینا لیکن یہ نہ بتانا کہ یہ جوڑا میرا ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ تم مجھے مستعار دے دو میں تمھارا نام نہ لوں گا۔ جب کوارٹر ماسٹر ہیڈ بوائے کے ساتھ کٹ چیک کرنے آئے تو حسنِ اتفاق سے ان کی نظر تو نہ پڑی لیکن ہیڈ بوائے نے دیکھ لیا کہ موزے پر خالد کا نمبر ہے اور کمانڈانٹ کو رپورٹ ہوگئی۔ خالد نے مجھ سے کہا میرا نام نہ لینا میں نے کہا میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ صبح پیشی ہوئی کرنل اسٹیبنگ بہت غصے میں تھے بار بار کہتے تھے۔ ممتاز تم نے ایسا کیوں کیا بغیر اجازت کسی کی چیز کیوں اٹھائی وغیرہ وغیرہ۔ کافی جھاڑ پڑی۔ اور حکم ہوا شام کو چار بجے بنگلہ پر رپورٹ کرنا اس رپورٹ کرنے کے معنی سب کو معلوم تھے کہ سخت پٹائی ہوگی۔ اسٹیبنگ کا طریقہ تھا کہ جونیئرز کو دفتر میں سزا دیتے تھے اور کیڈٹ آفیسرز کو بنگلہ پر بلاتے تھے اور اس کا وقت بھی مقرر تھا۔ جب میں بنگلہ پر پہنچا تو پہلے بیگم کرنل اسٹیبنگ سے ملاقات ہوئی۔ بیگم اسٹیبنگ بڑی شفیق خاتون تھیں۔ کیڈٹ آفیسرز کی بڑی خاطر تواضع کرتی تھیں اور بہت محبت سے پیش آتی تھیں۔ بہر حال اس وقت تو موقعہ دوسرا تھا۔ جوں ہی میں نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا کرنل اسٹیبنگ نے دو ایک سوالات پوچھے میں کیا جواب دیتا۔ چپ رہا۔ انھوں نے کہا بینڈ ڈاؤن جھک جاؤ۔ میں جھک گیا۔ پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ کتنے بید پڑے

ان کا شمار مجھے یاد نہیں جب میرے اوسان بحال ہوئے تو بیگم اسٹیبنگ نے مجھے جوس کا ایک گلاس پلایا۔ اس کے بعد کرنل اسٹیبنگ نے مجھے سمجھایا۔ اگر تمہیں افسر بننا ہے تو اس قسم کی خامیوں سے اپنے آپ کو پاک کرنا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب اسٹیبنگ کا دوسرا رخ دیکھیے۔ جب میں سلیکشن بورڈ کے سامنے جانے سے پہلے ڈاکٹری کے لئے سی ایم ایچ جہلم گیا تو ایک انتہائی متعصب ہندو ڈاکٹر نے گلے کی خرابی کو بہانہ بنا کر مجھے فیل کر دیا۔ میں بہت مایوس ہوا اور واپس آکر خاموشی سے اپنے کمرہ میں آکر لیٹ گیا تھوڑی دیر میں ایک دوست نے جھنجوڑ کے اٹھایا "تم یہاں منہ لپیٹے لیٹے ہو اور تمہیں اسٹیبنگ سائیکل پر سارے کالج میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں"۔ دوسرے روز اسٹیبنگ نے مجھے ایک میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش کروایا جس میں ایک کرسچین لیڈی ڈاکٹر بھی تھی اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ واٹ اے ہینڈسم بوائے! مختصر یہ کہ خوب تفصیلی معائنہ کرکے بورڈ نے مجھے فٹ قرار دے دیا ورنہ ہندو نے تو ڈنڈی مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

کمیشن

میں ۱۹۴۵ء میں سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ اور منتخب ہو کر مجھے دہرہ دون انڈین ملٹری اکیڈیمی میں رپورٹ کرنے کا حکم ملا۔ حالانکہ اس میں بظاہر رکاوٹ موجود تھی۔ وہ یہ کہ اکیڈمی میں داخلے کی کم سے کم عمر ۱۸ سال تھی اور میں ابھی ۱۸ سال سے کم کا تھا۔ انتخابی بورڈ کے صدر نے جو ایک انگریز سینئر افسر تھا مجھ سے میری عمر کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔ اس سے میرا خیال تھا کہ مجھے کچھ عرصے کے لیے انتظار کرنے کو کہا جائے گا۔ لیکن بورڈ کے صدر نے کچھ دیر میری طرف غور سے دیکھا۔ (وہ لمحہ مجھے اب تک یاد ہے) اور عام قاعدے کے برخلاف کہ امیدوار کو فوراً نتیجہ نہ بتایا جائے۔ صدر بورڈ نے مجھ سے کہا میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ میرے کاغذات

صدر بورڈ نے یہ رائے دی کہ یہ امیدوار گو عمر میں کم ہے لیکن جسمانی اور ذہنی اعتبار سے مطلوبہ معیار پر پورا اترتا ہے۔ اور اکیڈمی میں داخل ہونے کا مستحق ہے۔
جب ڈیرہ دون اکیڈمی پہنچا تو دیکھا واقعی سب کیڈٹ خاصی پکی عمر کے تھے۔ اور میں تنہا کیڈٹ تھا جس کی عمر ۱۸ سال سے کم تھی۔ میری سلیکشن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انگریز سینئر افسروں کو یہ اختیارات تھے کہ وہ قواعد وضوابط میں اپنی صوابدید کے مطابق ترمیم کر سکیں۔ کچھ دنوں کے بعد آئی ایم اے سے ہمارا پورا کورس او ٹی ایس بنگلور منتقل کر دیا گیا۔ جہاں سے مجھے ۱۶ پنجاب میں کمیشن ملا۔
بنگلور میں ۲۰۰ کیڈٹوں میں صرف ۲۰ فیصد ہندوستانی کیڈٹ تھے باقی انگریز تھے۔ اور ان ۲۰ فیصد میں سے صرف ۱۰ مسلمان تھے۔

پنجاب رجمنٹ

گو مجھے ۱۶ پنجاب میں کمیشن ملا تھا جس کا سینٹر سیالکوٹ میں تھا۔ لیکن میں زیادہ عرصہ ۷/۱۶ پنجاب میں رہا ہوں۔ یہ ایک پرانی رجمنٹ ہے۔ اس کے پاس وکٹوریہ کراس بھی ہے۔ میں نے ۱۸ پنجاب کی کمان بھی کی ہے۔ چونکہ میرے کورس کو دوسری جنگِ عظیم کا ایمرجنسی کمیشن ملا تھا۔ اس لیے ہم سب سے کہا گیا کہ اگر ہم مناسب سمجھیں تو ریگولر کمیشن کے لیے درخواست دیں چونکہ اس میں بھی کم سے کم ۲۱ برس عمر کی شرط تھی اس لیے میں نے بجائے ریگولر کمیشن کے شارٹ سروس کمیشن کیلیے درخواست دی۔ سلیکشن بورڈ کے سامنے دوسری بار جانے کے بعد میں ریگولر کے قصے کو بھول گیا تھا۔ کہ ایک روز جی ایچ کیو کا سگنل ملا کہ مجھے ریگولر کمیشن کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔ غالباً میرے شارٹ سروس کمیشن کے نتیجے کی روشنی میں جی ایچ کیو نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے دو بار نمایاں طور پر

منتخب ہونے کا اعزاز ملا۔

اعزازات

مجھے دو بار ستارۂ جرأت کا اعزاز ملا ہے۔ ایک ستارۂ جرأت ۶۱-۱۹۶۰ میں ملا تھا۔ دوسرا ۱۹۶۵ میں کھوکھرا پار آپریشن میں عطا ہوا۔

بیجوڑ آپریشن

۶۱-۱۹۶۰ کے دیر بیجوڑ آپریشن میں، میں شاہی کے مقام پر ۱۹ پنجاب کی "سی" کمپنی کمان کر رہا تھا۔ ایک دن مجھے اشارہ ملا کہ آج رات دشمن کا حملہ آنے والا ہے میں فوراً سب سے آگے والی پلاٹون پوسٹ میں پہنچ گیا۔ تاکہ تمام رات وہاں رہوں اور وہاں سے لڑائی لڑوں اس رات چھ چھ سو آدمیوں کے دو لشکروں نے تین بار "سی" کمپنی پر حملہ کیا ان لشکروں کے ساتھ سویلین کپڑوں میں افغان آرمی کے سو ریگولر سپاہی بھی تھے گویا تمام حملہ آوروں کی تعداد تیرہ سو کے قریب تھی۔ انھوں نے مشین گنوں اور مارٹروں سے حملے کئے لیکن سارے حملے پسپا کر دیئے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آخری حملہ ہینڈ گرنیڈز سے پسپا کیا گیا۔ ایک لحاظ سے یہ دستی بموں کی لڑائی تھی۔ دونوں طرف سے دستی بم استعمال ہو رہے تھے میں خود کئی بار بال بال بچا۔ دست بدست لڑائی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ صبح سویرے دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس تمام معرکے میں میرے تمام جوان معجزانہ طور پر محفوظ رہے۔ جبکہ دشمن کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس ایکشن کے نتیجے میں پاک افغان سرحد پر اس وقت سے سکون ہے اس معرکے میں غیر معمولی بسالت اور قیادت کا مظاہرہ کرنے پر مجھے ستارہ جرأت دیا گیا۔ اس وقت میرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو بریگیڈیئر) محمد رفیق تھے جو دو سال پہلے ملٹری کالج جہلم میں کمانڈنٹ رہ چکے تھے اور جو خود جرأت کا ایک نشان تھے۔

دوسرا ستارۂ جرأت

دوسرا ستارۂ جرأت مجھے جنگ ستمبر ۱۹۶۵ میں عطا ہوا جب میں راجستھان سیکٹر میں ۱۸ پنجاب کمان کر رہا تھا۔ دشمن پاکستانی سرحد کے اندر ایک جگہ "ڈالی" تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ایریج کا دفاع ۱۸ پنجاب کی بی کمپنی تھوڑے سے مجاہدوں اور رینجرز کے ساتھ کر رہی تھی۔ ۱۸ پنجاب کے باقی دستے کھوکھراپار کے سارے علاقے کے دفاع پر مامور تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ ۱۸ پنجاب کی "بی" کمپنی پر ناقابلِ برداشت دباؤ ہے تو میں نے ایک جرأت مندانہ فیصلہ کیا اور ۱۸ پنجاب کے باقی دستوں کو کھوکھراپار سے لیکر دشمن کو پیچھے سے جالیا۔ یہ فاصلہ ۲۵ میل کا تھا۔ اور ہم نے پہلے سے اسکی ریکی بھی نہیں کی ہوئی تھی۔ بہرحال تیزی سے جاکر ہم نے پیچھے سے دشمن پر جوابی حملہ شروع کر دیا۔ اب دشمن دو پاٹوں میں پس رہا تھا۔ سامنے "بی" کمپنی دفاع کر رہی تھی باقی پلٹن اس کے پیچھے سے حملہ کر رہی تھی۔ دشمن کی دو پلٹنیں ۵ مرہٹہ رجمنٹ اور ۱۷ مدراس رجمنٹ مکمل طور پر تباہ کر دی گئیں۔ ہم نے سات افسر ۱۱ جے۔ سی۔ اوز اور ۱۶۱ اور رینکس گرفتار کئے۔ ۳ ٹینک، ۳۰ سے زیادہ گاڑیوں کے علاوہ ان دو پلٹنوں کا بڑی مقدار میں اسلحہ بارود بھی ہمارے ہاتھ آیا۔ اس کے مقابلہ میں ۱۸ پنجاب کا صرف ایک جے سی او شہید اور چار جوان زخمی ہوئے۔ جنگی تاریخ میں ایسا کبھی شاید ہی ہوا ہو کہ اتنی بڑی کامیابی اتنے کم نقصان سے حاصل کی گئی ہو۔ ۱۸ پنجاب اپنی اس تاریخی کامیابی کی یاد میں اب بھی ہر سال یوم ڈالی مناتی ہے۔ ۱۸ پنجاب کے اس کارنامے کے نتیجے میں دشمن کا خاصا علاقہ ہمارے قبضہ میں آیا تھا۔ اس معرکے پہ ۱۸ پنجاب کو سرکاری طور پر صحرائی عقاب کا لقب ملا ہے۔ اور مجھے اس معرکے کی کمان کرنے پر ستارۂ جرأت عطا ہوا۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

لیفٹیننٹ کرنل ممتاز علی ستارۂ جرأت کمانڈر ۱۸ پنجاب رجمنٹ کو مندرجہ ذیل

کارنامہ پر فوری طور پر ہلالِ جرأت عطا کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

۱۲ ستمبر ۶۵ کی صبح کو لیفٹیننٹ کرنل ممتاز سے کہا گیا تھا کہ وہ کھوکھرا پار سے ڈالی کی طرف بڑھیں۔ اس وقت ان کے ساز و سامان و نفری کی کیفیت یہ تھی کہ ان کی اپنی ۱۸ پنجاب بٹالین میں سے بھی ایک کمپنی کم تھی۔ انھیں صرف ایک فیلڈ بیٹری اور ایک مارٹر ٹروپ کا تعاون حاصل تھا۔ ۳۷ میل کا یہ فاصلہ لیفٹیننٹ کرنل ممتاز نے آناً فاناً طے کرکے اپنے توپ خانے اور ٹینک ٹروپ کے فائر سے دشمن کو نشانہ بنایا اور اس کی ایک بٹالین اور دو ایس پی بٹالینوں کو تباہ کر دیا۔

کرنل ممتاز کا طریقِ کار یہ تھا کہ انھوں نے ایک کمپنی کی مدد سے دشمن کو گڈرا ڈالی چھپر و کے علاقے میں سامنے سے الجھائے رکھا اور باقی دستے سے دشمن کے پیچھے سے اس پر کاری ضرب لگائی۔ اس طرح ایک ہی دن میں انھوں نے اس اہم اور مشکل مشن کو بہت کامیابی سے پورا کیا اور کمین گاہوں میں چھپے بچے کھچے دشمن کا صفایا کرنا شروع کر دیا۔ جو دوسرے روز تک مزاحمت کرتا رہا۔

یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جس کی مثال عسکری تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ یہ کارنامہ بغیر اعلیٰ جنگی منصوبہ بندی عزم صمیم، جرأت، ناقابل شکست جذبے، اور مؤثر قیادت کے ممکن نہ تھا۔ کرنل ممتاز نے ان صفات کا بدرجہ اتم مظاہرہ کیا۔ اس مشن کو پورا کرنے میں انھیں ایک دن ایک رات کا عرصہ لگا۔ اس تمام عرصے میں انھوں نے ایک لمحے کے لیے آرام نہیں کیا اور ان کے جوان دیکھ رہے تھے کہ ان کا کمانڈر کس جرأت اور بے خوفی سے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر، حملے میں ان کی قیادت کر رہا

سے ہے ان کو دیکھ کران کے جوانوں کے حوصلے بلند رہے۔ اور انھوں نے دشمن پر برابر دباؤ جاری رکھا۔

کرنل ممتاز کی اس پرجوش پرعزم قیادت کا نتیجہ تھا کہ ان کی بٹالین وہ کارنامہ کرسکی جس کی مثال پاکستان آرمی کی بے مثال تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ اس معرکہ میں دشمن کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس کے تین افسر مارے گئے اور بہت بڑی مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود ہمارے ہاتھ لگا۔ دشمن کے ۱۶۶ افراد جنگی قیدی بنائے گئے جن میں سات افسر اور گیارہ جے سی اوز شامل تھے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا صرف ایک جے سی او شہید ہوا اور چار او آرز زخمی ہوئے یہ سب کچھ کرنل ممتاز کے عزم جرأت اور اعلیٰ جنگی منصوبہ بندی کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ اس امتیازی اور بے مثال کارنامے کے لیے کرنل ممتاز کے لیے ہلال جرأت کے اعزاز کی پر زور سفارش کی جاتی ہے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۵ کو ستارہ جرأت دوسری بار عطا ہوا۔

ستمبر ۶۵ کے بعد کے مرحلے: مختصر طور پر یہ کہ بریگیڈیئر کے طور پر ۱۲۶ اور ۲۰۷ بریگیڈ کمان کیئے۔ دسمبر ۷۱ء کی جنگ میں حصہ لیا میجر جنرل کے عہدے پر ترقی ملی۔ ۷ اڈویژن کو کمان کیا بعد ازاں ڈائریکٹر ملٹری ٹریننگ کے منصب پر فائز رہا۔ اگست ۱۹۷۵ء میں ریٹائرمنٹ سے پہلے پاکستان رینجرز کا ڈائریکٹر جنرل بھی رہا۔ اللہ کا شکر ہے کہ فرض نے جب کبھی اور جہاں کہیں پکارا میں نے لبیک کہا۔ میں نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ وہ قوم کے سامنے ہے۔

مصنف کا تبصرہ: جنرل ممتاز کا شمار پاکستان کے عسکری ہیروز میں ہوتا ہے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک پاکستان میں جب کبھی مسلح جدوجہد ہوئی جنرل ممتاز اس میں شریک رہے۔ ۴۸-۱۹۴۷ء کا کشمیر آپریشن ۶۱-۱۹۶۰ء کا دیر باجوڑ آپریشن، اپریل ۱۹۶۵ء کا رن کچھ آپریشن ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ، دسمبر ۷۱ء کی جنگ ان سب میں جنرل ممتاز کا خون جگر کسی نہ کسی طرح شامل رہا ہے۔ دیر باجوڑ کے ستارۂ جرأت کے بعد جنگ ستمبر میں ان کے لئے ہلال جرأت کی سفارش ہوئی تھی لیکن ستارۂ جرأت عطا ہوا۔

جنرل ممتاز نے یہ اعزازات اور امتیازات صرف اور صرف اپنے عزم اور جفاکشی سے حاصل کیے۔ اپنے خون جگر سے حاصل کئے۔ وہ محض اپنی ہمت، اپنے حوصلے، اپنے کام کے سہارے آگے بڑھے اور ان بلندیوں تک پہنچے۔ سبحان اللہ۔

چند دلچسپ واقعات : جنرل ممتاز کو جو سوانحی سوالنامہ بھیجا گیا تھا اس کے آخر میں ایک سوال تھا۔ آپ کی عسکری زندگی کا کوئی ایسا دلچسپ واقعہ یا واقعات جن کی کوئی تاریخی اہمیت بھی ہو۔ اس سوال کے جواب میں جنرل ممتاز لکھتے ہیں ۶۲-۱۹۶۱ء میں جب میں میجر تھا۔ مجھے افریقی ملک کانگو میں جہاں خانہ جنگی ہو رہی تھی یونیٹیڈ نیشنز فورس ہیڈ کوارٹر میں آپریشنل پلاننگ کے کے اسٹاف آفیسر کے طور پر پوسٹ کیا گیا تھا۔ بہت سے ملکوں کے دستوں پر مشتمل اقوام متحدہ کی اس فورس میں جس کو ایک آئرستانی جنرل کمان کر رہا تھا پاکستان دستے کے علاوہ ہندوستان کا پورا ایک بریگیڈ شامل تھا جو باغیوں کے صوبے کٹنگا میں بری طرح الجھا ہوا تھا اور اس کا خاصا نقصان ہو رہا تھا۔ اس وجہ سے آپریشنل پلاننگ کے افسر کی حیثیت سے مجھے انڈین بریگیڈ کو کئی بار وزٹ کرنا پڑا۔ جب بات زیادہ بگڑی تو صورت حال کا جائزہ لینے فورس کمانڈر خود وہاں گیا میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس موقع پر بالکل غیر متوقع طور پر سینئر انڈین افسروں نے اس آئرش جنرل سے درخواست کی ہیڈکوارٹر کے آپریشنل پلاننگ کے خاص افسر یعنی مجھے انڈین بریگیڈ کے بی۔ ایم کے طور پر پوسٹ کیا جائے اور انہوں نے اس پوسٹنگ پر اتنا اصرار کیا کہ جنرل نے پوسٹنگ کی حامی بھرلی اور ہیڈ کوارٹر جاکر میری پوسٹنگ کے احکامات صادر کر دیئے ایک ایک لحاظ سے تو یہ پوسٹنگ پاکستانی دستے کے لئے فخر کی بات تھی لیکن اس کے کچھ اور مضمرات بھی تھے۔ اس لئے میں نے فورس کمانڈر سے کچھ مہلت مانگی اور اپنے سینئر افسروں سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ ان دنوں کرنل حاجی بھائی چارج دے رہے تھے اور کرنل عبدالوحید قاضی چارج لے رہے تھے۔ ان دونوں تجربہ کار افسروں نے میری اس پوسٹنگ کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ میرا وہاں نہ جانا میرے اور پاکستانی دستے کے حق میں بہتر ہو گا کرنل حاجی بھائی خود فورس کمانڈر کے پاس گئے اور اسے صاف صاف بتا دیا کہ ہندوستان اور پاکستان کی پرانی دشمنی

چلی آرہی ہے۔ اس وجہ سے میجر ممتاز کو انڈین بریگیڈ میں بی ایم کی حیثیت سے ضروری تعاون ملنا محال ہے دوسرے اس پوسٹنگ پر اصرار میں بظاہر چال یہ ہے کہ انڈین بریگیڈ کو جو ناکامیاں ہوئی ہیں اور جو نقصانات اٹھانے پڑے ہیں ان میں پاکستانی دستے کو بھی ملوث کیا جائے۔ کرنل حاجی بھائی نے فورس کمانڈر سے یہ بھی کہا اگر آپ ممتاز سے کوئی خاص کام لینا چاہتے ہیں تو اسے کوئی خود مختار مشن دیجئے جس کے لئے وہ براہ راست آپ کے سامنے جواب دہ ہو۔ آئرش جنرل نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور انڈین بریگیڈ کی پوسٹنگ سے میری جان چھوٹی۔

اسی زمانے کے دو ایک واقعات اور بھی ہیں وہ بھی تاریخ کے حوالے کرتا ہوں ایک بار میں اسی انڈین بریگیڈ کے دورے پر آیا تھا کہ یکایک زبردست شیلنگ شروع ہوگئی میرے ساتھ جو انڈین افسر تھا وہ بے تحاشا بھاگنے لگا اور جو پہلا مورچہ نظر آیا اس میں دبک گیا میں اپنی نارمل رفتار سے چلتا رہا۔ جوں ہی میں اس افسر کے مورچے کے قریب پہنچا اس نے تقریباً زبردستی مجھے کھینچ کر اندر کر لیا عجیب اتفاق تھا کہ دو ازلی دشمن ایک ہی مورچے میں تھے۔ پھر وہ افسر بڑی ہمدردی جتلاتے ہوئے بولا۔ سر اتنی زبردست شیلنگ میں آپ کو یوں رزک نہیں لینا چاہیئے تھا۔ ایک بار وہیں ایک افسر ملا جس کی شکل صورت کچھ مانوس معلوم ہوئی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر کچھ ٹھٹھکا میں چونکہ پنجاب رجمنٹ کا بیج لگائے ہوتے تھا۔ وہ سمجھا شاید میں انڈین پنجاب رجمنٹ کا ہوں۔ بہرحال جب بات چیت شروع ہوئی تو یہ راز کھلا کہ ۱۹۴۵ء میں ملٹری کالج جہلم میں میرا ہمعصر تھا گو ایک سال جونیئر۔ نام اس کا بلوندر سنگھ تھا کالج کے زمانے میں اس کے کیس تھے۔ اب بال کٹوا دیئے تھے۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا اور بڑی دوستی جتلانے لگا ہندوستانی پاکستانی بھائی بھائی ہیں وغیرہ۔ میں نے کہا۔ بلوندر! ایم سی کے رشتے سے میں بھی تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں لیکن رہی بات ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے بھائی بھائی ہونے کی تو تم اپنی حکومت سے کہو کہ وہ ہمیں واقعی بھائی سمجھے اور پاکستان کو دل سے قبول کرے۔

اسی دورے میں ساہیوال کا ایک سکھ میجر ملا تھا۔ کہنے لگا۔ "آپاں غلطی کر چھوڑی۔ نی تاں دہلی تک آپاں ہوناسی۔" گویا اس وقت سے سکھوں کو اپنی سیاسی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ آخر میں ایک اور واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کانگو میں ہندوستانیوں نے ایک چھوٹا سا اسپتال

بھی قائم کر رکھا تھا۔ اس کی نرسیں بھی انڈین تھیں۔ وہ پاکستانی افسروں کو خاص طور پر توجہ کا نشانہ بنانے لگی تھیں۔ انڈین افسر بہت چڑتے تھے۔ ایک روز ایک افسر صاحب نرسوں پر بہت گرجے برسے "لمبختو! ان مسلوں کو کیوں لفٹ کراتی ہو۔ ان میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہے" ایک لڑکی ذرا شوخ بلکہ زبان دراز تھی جھٹ بول اٹھی "پاکستانی افسر سر سے پاؤں تک افسر ہوتا ہے تمہاری طرح نہیں کہ افسری کندھے کے پھولوں سے شروع ہوئی اور وہیں ختم ہو گئی" بعد کو یہ فقرہ بہت چلا۔ دیارِ غیر میں اس طرح کے شگوفے بھی دل بہلانے کو بہت تھے۔ لیکن جس طرح ہر لطیفے کی تہہ میں کوئی نہ کوئی سنجیدہ بات ہوتی ہے۔ اس شوخ فقرے میں بھی ایک حقیقت پنہاں تھی۔ پاکستانی افسر کی انفرادیت، ہر طرح کی انفرادیت!"

اس سوال کے جواب میں کہ آپ کی غیر معمولی کامیابیوں اور کامرانیوں کا راز کیا ہے؟ جنرل ممتاز نے کہا:۔

جو کچھ اب میں ہوں اور جو کامیابیاں میں نے زندگی اور ملازمت میں حاصل کی ہیں وہ اس تعلیم اور تربیت کا فیض ہے جو میں نے ملٹری کالج میں حاصل کی۔ ان دنوں بظاہر رسمی تعلیم سے زیادہ فوجی نوعیت کی تربیت پر زور دیا جاتا تھا۔ ڈسپلن، احساسِ فرض، جفاکشی، دیانتداری اور منظم طرزِ زندگی جیسی قدریں خاص طور پر سکھائی جاتی تھیں لیکن تعلیم کا معیار بھی کچھ ایسا کم نہ تھا۔ انڈین آرمی سپیشل کا امتحان خاصا مشکل امتحان ہوتا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں جب میں داخل ہوا ہوں تو تقریباً سب ملٹری کے انسٹرکٹرز تھے پھر آہستہ آہستہ اعلیٰ تعلیم یافتہ سویلین انسٹرکٹرز نے انکی جگہ لے لی بظاہر ایک نقص جو نظر آتا تھا کہ ضبط و نظم میں ضرورت سے زیادہ سختی برتی جاتی تھی اور ضرورت سے زیادہ رجمنٹل فضا تھی اس کی وجہ سے طلبہ کچھ بھنچے بھنچے دبے دبے رہتے تھے اور انکا نقطہ نظر اتنا وسیع نہیں ہو پاتا تھا جتنی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس خامی کے باوجود یہی وہ ادارہ تھا جس نے پاکستان بننے پر پاکستان آرمی کو اچھے افسر دیئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ انگریز افسروں کے جانے کے بعد یہی ایک ادارہ تھا جس نے بڑی حد تک افسروں کی کمی کو پورا کیا۔ تعداد اور کوالٹی دونوں کے اعتبار سے عالمگیرنز کی خدمات ماشاء اللہ قابلِ فخر ہیں اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ ادارہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نئے قسم کی لیڈر شپ پیدا کرے۔

آنریری کیپٹن سُلطان سکندر خاں ستارۂ جرأت پنجاب رجمنٹ

آنریری کیپٹن سُلطان سکندر خاں ستارۂ جرأت ۱ پنجاب رجمنٹ

پرانی باتیں

ہم جنجوعہ راجپوت ہیں۔ یہ قبیلہ آریوں کے زمانے سے جنگجوئی اور حکمرانی کیلئے ممتاز رہا ہے۔ ہمارے خاندان کے جدِّ اعلیٰ راجہ حاکم خاں تھے۔ جنھوں نے تلہ گنگ اور جہلم کے سرحد پر ڈانگرہ قوم کو فیصلہ کُن شکست دی اور دھرابی گاؤں قلعہ کی شکل میں آباد کیا۔

میرے دادا کا نام راجہ مقرب خاں تھا وہ ۲ پنجاب (قدیم ۱۶ پنجاب) میں حوالدار تھے دوران ملازمت اِنتقال کیا۔ مَیں نے انھیں نہیں دیکھا لیکن سنا ہے کہ وہ بڑے اچھے شاہسوار تھے اور نیزہ بازی کرتے تھے۔ میرے والد خاندانی روایت کے مطابق فوجی ہی تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کے محاذ پر صف آرا ہُوئے تھے۔ صُوبیدار کے عہدے سے ریٹائر ہُوئے اپنے وقتوں میں ہاکی کے

بڑے اچھے کھلاڑی تھے ۔ اصل میں کھیل ہمارے گھرانے کی خصُوصیّت ہے ۔ میرے دو چچا صُوبیدار راجہ نواب خاں اور حوالدار میجر راجہ لال خان ہاکی کے بہترین کھلاڑی تھے ۔ لال خان کا قد ساڑھے چھ فٹ تھا۔ چھریرے بدن کے تھے اور اپنے زمانے میں ڈویژن کی ٹیم میں کھیلتے تھے ۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ کھیل کا میدان اصل میں زندگی کا میدان ہوتا ہے جو کھیل کو کھیل کی طرح کھیلے وہ کندن بن جاتا ہے ۔ ہمارے گھرانے میں جو کھیل کی روایت تھی اس نے مجھے جان توڑ کر کوشش کرنا اور مقابلہ کرنا سکھایا۔ کھیل کی جو جسمانی قدر و قیمت ہے اِس کا ذکر ہی کیا۔

آبائی گاؤں اور ابتدائی تعلیم

ضلع جہلم، تحصیل چکوال میں ایک گاؤں ہے دھرابی ، وہی میرا آبائی گاؤں ہے۔ مَیں دھرابی میں یکم دسمبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہُوا ۔ ابتدائی چند جماعتیں پرائمری اسکول دھرابی میں پڑھیں۔ پھر ۱۹۳۹ء سال جونیئر گورنمنٹ ہائی اسکُول تلہ گنگ میں بھی ایک آدھ سال گزارا ۔

بچپن کا ایک واقعہ

والد ۱۹۲۰ء میں صُوبیدار کی حیثیت سے پنشن آ گئے تھے اور ریکروٹنگ افسری کر رہے تھے ۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ مَیں تعلیم حاصل کروں اور کچھ بنوں، آپ جانتے ہیں کہ گاؤں کا ماحول پڑھنے لکھنے کے شوق کا نہیں ہوتا۔ پھر بچپن میں پڑھنے لکھنے کی افادیت کی بات کہاں سمجھ میں آتی ہے ۔ چنانچہ میرا دل بھی کتابوں میں کوئی خاص نہیں لگتا تھا ۔ بلکہ بالکل ہی نہیں لگتا تھا۔ بلکہ جتنا والد اصرار کرتے اتنا ہی میں

کتابوں سے اور بھاگتا۔ وہ مجھے اکثر اخروٹوں سے کھیلنے کو منع کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ میں اس طرح وقت ضائع کرتا ہوں بہرحال ایک روز شامت اعمال ایسا ہوا کہ میں اخروٹوں سے کھیلنے میں محو تھا کہ والد صاحب اوپر سے آن پہنچے۔ ان کے ہاتھ میں گنے تھے۔ غصے میں آکر انھوں نے ایک گنا میرے دے مارا۔ میں بلبلا اٹھا اور فوراً بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن پھر جلدی ہی مجھے سمجھ آگئی اور میں نے تعلیم میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس مار کو بڑے ایک عرصہ گذر گیا لیکن اس کی یاد اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خلوص سے کی ہوئی سختی بھی اثر رکھتی ہے۔

ایک اُستاد کی یاد

تلہ گنگ ہائی سکول میں ماسٹر عبداللہ تھے ان کے پاس کھونڈی ہوتی تھی۔ بچے کو بلانے کی بجائے گلے میں ڈال کر گھسیٹ لیتے تھے۔ ویسے بے حد قابل تھے۔ بچوں کو بڑے شوق سے پڑھاتے تھے اور ان کی تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔

ملٹری کالج کے زمانہ تعلیم کی کہانی

میں ملٹری کالج میں ۱۹۴۰ء میں داخل ہوا۔ چھٹے درجے میں اور ۸۸۸ کالج نمبر ملا۔ میرا پہلا ہاؤس برڈووڈ ہاؤس اور صوبیدار فتح خاں پہلے ہاؤس ماسٹر تھے۔

کالج میں میرا پسندیدہ کھیل فٹ بال تھا۔ اس دور کی صرف ایک بات یاد ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک بار چھ بید لگے تھے۔ اس سزا کی وجہ بھی بڑی انوکھی تھی۔ اس زمانے میں کیڈٹوں کو سر میں تیل لگانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں ایک بار یہ غلطی کر بیٹھا، تیل بھی بد قسمتی سے خوشبودار تھا۔ بھانڈا پھوٹ گیا اور تیل لگانے کی عیاشی کا خاصہ عبرتناک انجام ہوا۔ کمانڈانٹ میجر اسٹیبنگ نے ۶ کرارے بید رسید کیے۔

اسٹاف

اس زمانے میں ماحول مکمل طور پر فوجی تھا۔ جمعدار ایجوٹینٹ، جمعدار منگا خان تھے۔ جو انگریزی، اُردو، پنجابی ایک ساتھ پی جاتے تھے۔ ان کے کاشن کی آواز ہوا کو چیرتی ہوئی دور دور تک جاتی تھی۔ کمانڈانٹ کی تو گویا ناک کا بال تھے۔ بڑا دبدبہ تھا ان کا۔ ہمارے ڈرل انسٹرکٹر پٹھان نائیک بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ سلیوٹ سکھاتے وقت بڑے مزے سے کہتے ایک دو تین چار چھ مارا اگراؤ۔ اس زمانے کے بارے میں میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ وہ بڑی سخت زندگی تھی۔ وہ سخت کوشی ہمارے بہت کام آئی۔ پھر نوکری میں کبھی کوئی کام سخت نہیں لگا۔ میں نے ۱۹۴۵ء میں کالج چھوڑا بدقسمتی سے میں آٹھویں جماعت سے آگے نہ بڑھ سکا۔ آرمی کے ایک دو امتحانات ضرور پاس کیے۔ اس دور کے نمایاں طالب علم ۸۳۵ حق نواز کیانی ہیڈ بوائے تھے۔

کالج چھوڑنے کے بعد کی روئداد

کالج سے جانے کے بعد قاعدے کے مطابق میں بھی اپنے والد کی رجمنٹ ۲ پنجاب میں بھرتی ہو گیا اور ۱۹۴۵ء میں رنگروٹی سے فوجی زندگی کا آغاز کیا۔ رنگروٹی ہی کے زمانے میں، میں نے آرمی اسپیشل کا امتحان پاس کیا ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنتے وقت میں امرتسر میں مسلمانوں کی واگذاری کی ڈیوٹی پر تھا۔ مسلمان بوڑھوں اور بچوں کو تو جتنا ہم بچا سکتے تھے بچایا۔ لیکن اس تجربے نے خود مجھے اور میرے ساتھیوں کو پکا پاکستانی بنا دیا۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے جو نشانات اور آثار ہم نے دیکھے اور مسلمان مہاجروں کو جس حالت میں ہم نے دیکھا وہ دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے مناظر لفظوں میں نہیں بیان کیے جا سکتے۔ آپ نے نوٹ کیا ہو گا کہ ابھی

میں نے صرف مسلمان بوڑھوں اور بچوں کا ذکر کیا۔ مسلمان جوان تو ہندو اور سکھ درندوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو چکے تھے۔ جوان عورتیں اغوا کر لی گئی تھیں۔ اس لیے قافلوں میں زیادہ تعداد معذروں اور بوڑھوں کی تھی۔ جن کے بیٹے ان کے سامنے بے دردی سے قتل کر دیئے گئے تھے۔ بیٹیاں اور بہوئیں ان کے سامنے بے آبرو کر دی گئی تھیں یا چھین لی گئی تھیں۔ ان ہی دنوں میں، میں نے عہد کر لیا تھا کہ زندگی میں کبھی موقعہ ملا تو پاکستان اور انسانیت کے ان دشمنوں سے انتقام لوں گا۔ ۱۹۶۵ء میں مجھے یہ موقعہ ملا۔ ۱۹۴۸ کے اوائل میں، میں کشمیر کے جہاد میں مصروف تھا کہ یکایک والد کے حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر جانے کی خبر ملی۔ جب گھر آیا تو والدہ نے کہا بیٹے، نوکری چھوڑ کر گھر آ جاؤ۔ اب گھر میں تم ہی بڑے ہو تمہارے چاروں بھائی چھوٹے ہیں ان کو اور گھر کو سنبھالو۔ میں نے سر جھکا کر کہا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن فوج میں نوکری کرنے کا وقت تو اب ہی آیا ہے۔ پاکستان بن چکا ہے۔ کشمیر میں لڑائی جاری ہے۔ یہ موقعہ نوکری چھوڑنے کا نہیں والدہ نے کہا۔ اور بھائیوں کا کیا بنے گا۔ میں نے جواب دیا اللہ مالک ہے لیکن میں اس بات کا آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاءاللہ ان سب کی دیکھ بھال میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ آخر کار انھوں نے مجھے نوکری جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ بھائیوں کی پرورش اور کفالت کے سلسلے میں جو وعدہ میں نے والدہ سے کیا تھا وہ میں بڑی حد تک پورا کر سکا۔ الحمدللہ۔ آج چاروں بھائی خوشحال ہیں اور عزت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ۱۹۵۶ میں والدہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اگر آج وہ زندہ ہوتیں تو دیکھتیں کہ ان کے بیٹے نے جو ذمہ داری قبول کی تھی اسے نبھایا بھی ہے۔ ۱۹۶۵ میں خدا نے مجھے ہندو کے مقابلے میں سرخ رو بھی کیا اسی لڑائی میں ایک معرکے میں حصہ لینے پر مجھے ستارہ جرأت ملا تھا۔

اس معرکے کی تفصیل

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو میری پلٹن ۲ پنجاب چونڈہ کے محاذ پر ۲۱ بریگیڈ کے ساتھ لڑائی میں شامل ہوئی۔ اس بریگیڈ کی کمان مشہور کمانڈر بریگیڈیئر عبدالعلی ملک کے ہاتھ میں تھی۔ ۶ ستمبر کی رات کو دشمن نے بھاری ٹینکوں سے حملہ کیا۔ ہماری پلٹن کی ڈی کمپنی دشمن کے گھیرے میں آگئی۔ بڑی جدوجہد کے بعد کمپنی دشمن کے گھیرے سے نکلی لیکن اس کشمکش میں ہمارے ۱۵ جوان شہید ہوئے۔ ۷ ستمبر کو ہماری بی کمپنی کو ایڈوانس کا حکم ملا۔ میں بھی کمپنی کی ایک پلاٹون کو کمان کر رہا تھا۔ جو ہراول دستے کا کام کر رہی تھی۔ میں اپنی پلاٹون کو لے کر چونڈہ سے فلورہ اور گڈگور سے آگے دشمن کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ بی کمپنی کے کمانڈر میجر محمد افضل بہت باہمت، ہوشیار تھے ان کے حکم پر میں نے دفاعی پوزیشن لے لی۔ اور اپنے ساتھ دو ٹینک شکن توپیں اور دو مشین گنیں رکھیں۔ شام کو دشمن نے میری پوزیشن پر ٹینکوں کے ساتھ حملہ کیا۔ حملہ بہت سخت تھا۔ ایسے ہی موقعوں پر انسان کا امتحان ہوتا ہے۔ میرے آباؤ اجداد کے خون نے اور میرے والدین اور اساتذہ کی تربیت نے اس وقت جوش مارا اور میں نے دشمن کے حملے کا منہ توڑ جواب دیا۔ بعد کو میں خود حیران ہوا تھا کہ حملے کے وقت غیر معمولی قوت و حرارت میرے اندر کہاں سے آگئی تھی۔ اتنا مجھے ضرور یاد ہے کہ اس وقت جب کہ موت کے بازوؤں کی پھڑپھڑاہٹ بہت قریب سے سنی جا سکتی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں بالکل ہراساں نہیں تھا۔ بڑے اطمینان سے اپنے جوانوں کو بڑھاوا دے رہا تھا نہ صرف یہ بلکہ موقعہ پا کر میں نے اینٹی ٹینک گنوں سے دشمن کے دو ٹینک ڈھیر کر دیئے۔ دشمن کے ٹینکوں سے آگ کے شعلے بلند ہوتے ہی دشمن کے حوصلے پست پڑ گئے۔ وہ کافی جانی نقصان اٹھا کر پسپا ہو گیا۔ دشمن کے دس جوان بھی ہم نے قیدی بنائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اپنا

کوئی نقصان نہ ہوا۔ اس طرح اس معرکے میں ہمیں مکمل فتح نصیب ہوئی۔ اس کارنامے خدمت یا فرض کی ادائیگی کے صلے میں مجھے ستارہ جرأت کا مستحق سمجھا گیا۔ میرے دو اور ساتھیوں نائیک غلام علی اور نائیک محمد تاج کو بھی تمغہ جرأت دیا گیا۔ یہ دونوں اب نائب صوبیدار ہیں۔

مجھے اس اعزاز کے ساتھ اضافی پوائنٹ ملے تھے جب میں صوبیدار میجری سے ریٹائر ہونے لگا تو ان نمبروں کی وجہ سے ۱۴ اگست ۱۹۷۷ء کو آنریری کیپٹن کا عہدہ بھی دیا گیا۔ مجھے ریٹائر ہونے سے پہلے جنرل ضیاء الحق صاحب کی طرف سے اچھی کارکردگی پر تعریفی سند بھی ملی۔

مصنف کا تبصرہ

ہمارے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کے اس کارنامے کے پیچھے کونسی قوت تھی؟ سلطان سکندر صاحب نے کہا۔

صرف ایمان کی قوت! بڑا سخت وقت تھا۔ دشمن تعداد اور سامان میں بہت زیادہ تھا۔ بظاہر اس کا ہماری پوزیشن کو روند ڈالنا مشکل کام نہ تھا۔ لیکن ادھر ایک ایک جوان شیر بنا ہوا تھا۔ یہ میرا کمال نہیں میرے جوانوں کے ایمان اور حوصلے کا کمال تھا اور اللہ تعالیٰ کا فضل کہ ہمیں کامیابی نصیب ہوئی۔ سب بے جگری سے لڑے۔ پیچھے ہٹنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ میری پلاٹون کا ایک این۔ سی۔ او نائیک محمد حسین اور تین جوان سپاہی محمد اکرم، سپاہی محمد انور، سپاہی فدا حسین اس معرکے میں شہید ہوئے۔ ایمان ہی پاکستان کی فصیل اور قوت ہے اور رہے گا۔

میجر (ریٹائرڈ) عاقل داد، ستارۂ جرأت
پنجاب رجمنٹ

میجر (ریٹائرڈ) عاقل داد۔ستارۂ جرأت۔پنجاب رجمنٹ

خاندان

ہم نسلاً راجپوت ہیں اس لیے پیشہ آباؤ اجداد تو ظاہر ہے کہ سپہ گری ہے۔ میرے والد مولا بخش اور ماموں فضل احمد، نیک عالم کے علاوہ علاقے اور گاؤں کے بیشتر افراد ۲۳ پنجاب رجمنٹ (اب ۱۵ پنجاب) کے ساتھ پہلی جنگِ عظیم میں لڑے تھے۔ یہ ہماری اپنی پلٹن شمار ہوتی تھی۔ جب مَیں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو بزرگوں کے کارناموں کی داستانیں سُنیں۔ میرے بڑے بھائی صاحب داد جو اپنے وقت (۳۲ - ۱۹۲۸) میں اس وقت کی انڈین آرمی میں ایک ممتاز کھلاڑی اور اتھلیٹ تھے ان کے کارنامے بھی اکثر گھر میں سُنے جاتے تھے۔ گویا بہادریوں اور جرأتوں کے سائے میں پل کے بڑا ہُوا۔

بچپن

ضلع جہلم میں دینہ کے قصبے کے نزدیک ایک گاؤں ہے کورلان، مَیں وہاں

۴ ستمبر ۱۹۲۷ء کو پیدا ہُوا۔ بچپن کی کوئی خاص بات مجھے یاد نہیں سوائے اِس کے کہ کھیل کُود کا بہُت شوق تھا۔ زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا تھا۔ بدن کا مضبوط تھا لڑائی بھڑائی روز ہوتی رہتی تھی۔ پٹتا بھی تھا مارتا بھی تھا۔ لیکن گھر پہ روتے ہُوئے آنے کی اجازت نہیں تھی۔

ابتدائی تعلیم

ضلع ساہیوال میں ایک گاؤں ہے گگو منڈی۔ ۱۹۳۳ء میں وہاں کے ورناکیولر مڈل سکُول میں پہلی جماعت میں داخل ہُوا اور ساتویں جماعت تک وہیں تعلیم حاصل کی۔

اسکول کی یادیں

اِس زمانے میں، اِس علاقے میں کُشتی اور کبڈی کا عام رواج تھا۔ چنانچہ مجھے بھی ان مردانہ کھیلوں سے دلچسپی تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔ اپنی عُمر کے لڑکوں کو آسانی سے پچھاڑ لیتا تھا۔ کبڈی میں بھی برا نہیں تھا۔ شرارتیں کرنے اور لڑنے جھگڑنے سے بھی اچھا خاصا نیک نام ہو گیا تھا۔ اور اس کا انعام ملتا رہتا تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن لڑنے بھڑنے میں، مَیں نے کبھی بزدلی نہیں دکھائی۔ اگر کبھی پٹائی ہو جاتی۔ تو گھر آکر مَیں نے شکایت کبھی نہیں کی والد کے دربار میں صرف دو جُرم ناقابلِ معافی تھے ایک جُھوٹ بولنا دُوسرے کچے پن کا مظاہرہ کرنا۔ پڑھنے میں درمیانہ تھا۔ لیکن حساب کمزور تھا۔ اُردو انگریزی مقابلتاً اچھی تھی اُستاد بہُت شفیق و مہربان تھے۔ یہ بھی اِن کا کرم تھا کہ پڑھائی پر توجہ نہ کرنے کی بنا پر مجھے اکثر سزا دیتے رہتے تھے۔ جو کسر رہ جاتی وہ گھر پہ پُوری ہو جاتی۔ وہ اِس طرح کہ والد بھی مزاج کے سخت تھے نمبر کم آنے پہ یا کوئی شکایت ملنے پہ خاصی تواضع کرتے تھے۔ اسکول اور گھر کی دو طرفہ

ئی کا نتیجہ یہ تھا کہ سالانہ امتحان میں لشتم پشتم پاس ہو جاتا تھا۔ مَیں کہہ چکا ہُوں کہ
والد کا مزاج فوجی تھا۔ گھر میں بھی ڈسپلن کی پابندی کراتے تھے ۔ اسکُول اور گھر کی سختیوں
سے بچنے کے لیے مَیں ملٹری کالج میں داخلے کی دُعائیں مانگا کرتا تھا۔ اصل میں یہ گھر سے
راہِ فرار تھی ۔چنانچہ کالج میں داخلے کے وقت میری خُوشی کا ٹھکانہ نہ تھا کہ اب چَین کی
بنسی بجاؤں گا لیکن جب کالج پہنچا تو چند دِنوں ہی میں دِن کو تارے نظر آ گئے ۔
کالج کا ماحول اور ڈسپلن پچھلے اسکول اور گھر سے دس گنا زیادہ سخت اور صبر آزما تھا۔

کالج کے دور کی روئداد

مَیں ۱۵ اگست ۱۹۴۰ء کو کالج میں داخل ہُوا۔ ۹۱۴ کالج نمبر ملا۔ رابرٹس ہاؤس
کی نمبر ایک ڈارمیٹری کے لاکر نمبر دو سے میرا کالج کا سفر شروع ہُوا۔ اسکین ہاؤس اور
برڈوڈ ہاؤس میں بھی رہا۔ جلد ہی جونیئر پریفیکٹ بن گیا۔ تیسرے سال میں ایک معمولی
سی غلطی کرنے پر میں اس عہدہ سے معزول بھی کر دیا گیا تھا ۔ معزول ہونے کی وجہ یہ
تھی کہ مَیں نے اپنے سیکشن کی پریڈ اسٹیٹ غلط بنائی تھی ۔ وہی حساب کی مار۔ جمع
تفریق میں غلطی ہو گئی تھی ۔ بات چھوٹی سی تھی ۔ مَیں نے کمانڈانٹ سے فریاد کی ۔
انھوں نے کہا ۔ لڑکے لڑائی میں چھوٹی سی چھوٹی غلطی بھی معاف نہیں ہوتی۔ اس لیے
تمھیں کیسے چھوڑوں ۔ اِس غلطی کی سزا تو بھگتو اور ٹھیک چلو۔ کچھ دِنوں میں تمھیں
دیکھوں گا۔ جب مجھے اطمینان ہو جائے گا۔ کہ تُم نے اپنی اصلاح کر لی ہے۔ تو پھر
تمھیں کوئی ذمہ داری دوں گا ۔ بچے یاد رکھو۔ غلطی کرنا تو ترقی کرنے کی ایک منزل ہے۔
اِس کے بعد پھر مجھے مختلف ذمہ داریوں سے نوازا گیا۔ مَیں نے مقدور بھر کوشش کی کہ
اپنے منصب کا حق ادا کروں۔ ۱۹۴۶ میں کالج سے رُخصت ہوتے وقت کمپنی کمانڈر
/ ۰ ٹ انڈر آفیسر تھا۔

کالج کی زندگی کے تاثرات

جنگ شروع ہو چکی تھی کالج میں زیادہ زور میدانی سرگرمیوں اور فوجی تربیت پر تھا۔ لڑکوں کو جسمانی طور پر مضبوط اور فوجی ڈسپلن کا پابند بنانے پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ ہاؤس کا زیادہ وقت لاکر کو سجانے سنوارنے، بستر کو بنانے اور کمرے کو اور ہاؤس کو صاف ستھرا رکھنے میں گزر جاتا تھا۔ رجمنٹ کے انداز کی تنظیم کے تحت روز و شب گزرتے تھے۔ گویا اسکول ایک یونٹ تھا۔ پڑھانے والے بھی زیادہ تر فوجی تھے۔ لیکن جنگ کے دوران میرے ہوتے ہی اسکول نے کالج کا درجہ پایا۔ اور پڑھانے کے لیے سویلین اُستاد آئے۔ ان کے آتے ہی کالج کی تعلیمی فضا یکسر بدل گئی۔ تعلیم کو زیادہ اہمیّت دی جانے لگی۔ اور تعلیم کا معیار بہت اُونچا ہو گیا۔

حیدری صاحب، انصاری صاحب، بخاری صاحب، حکیم صاحب سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور فنِ تدریس سے خُوب واقف تھے۔ سب سے بڑھ کر ان کا روّیہ تھا جو تعلیمی تھا۔ ان میں سے دو ایک تو ایسے تھے کہ جن پر اس کالج کو ہمیشہ فخر رہے گا اور جنھوں نے اس کالج کو بنانے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔

فضل حق حیدری صاحب جو ایف ایچ حیدری کے نام سے مشہُور تھے۔ بے نظیر اُستاد تھے۔ انگریزی پڑھانے میں کمال حاصل تھا۔ لب و لہجہ اور تلفظ انگریزوں سے بڑھ کر تھا اور بولنے کا انداز اتنا خُوبصُورت تھا کہ تقریر اور ڈرامے کا لطف آجاتا تھا۔ دوسروں کے بارے میں تو مَیں کُچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مَیں ان کی انگریزی سحر زدہ سا ہو کر سنتا تھا۔ ان کا لباس اتنا صاف و نفیس اور بات کرنے کا انداز اتنا شائستہ تھا کہ مَیں بیان نہیں کر سکتا۔ ہر کلاس میں اکثر مکالمے اور ڈرامے ہوتے رہتے تھے۔ باہر سے جو مہمان آتا اور وہ ان کی کلاس میں ضرور لایا جاتا۔ حیدری صاحب کا

انگریزی ہینڈ رائٹنگ بھی اتنا اچھا تھا کہ ان کا لکھا چھپا ہُوا نظر آتا تھا ۔ اس زمانے کی وہ کاپیاں جن پر حیدری صاحب نے اصلاح دی ہُوئی ہے ۔ مَیں نے یادگار کے طور پر رکھی ہُوئی ہیں کبھی اپنے بچّوں کو دکھاتا ہوں اور کہتا ہوں دیکھو ہم نے کیسے کیسے اُستادوں سے پڑھا ہے ۔ افسوس ہے اُس زمانے میں آواز کو ٹیپ کرنے کی سہولتیں میسر نہیں تھیں ورنہ اگر ان کی کلاس رُوم کی آواز کو محفوظ کر لیا جاتا تو ایک یادگار چیز ہوتی ۔ اگر کالج میں کسی نے میرے ذہن پر نقش چھوڑا ہے تو وہ حیدری صاحب ہی کی شخصیت کا نقش ہے ۔ میرے یہ کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ دُوسرے اساتذہ کم مرتبے کے تھے ۔ وہ بھی بہت اچھے تھے لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میری نظر میں وہ ایک مثالی اُستاد تھے ۔ وہ میری یادوں میں ایک آئیڈیل اُستاد کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے ۔

باکسنگ

آزٹ دور میں سب ہی لڑکے اچھے ہوتے تھے میں بھی ہاکی، فٹ بال، پی ٹی اتھلیٹکس میں اچھا تھا ۔ لیکن امتیاز باکسنگ میں حاصل ہُوا ۔ ۱۹۴۱ء میں جب وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کالج میں آئے تو منجملہ دُوسری چیزوں کے انھیں ہماری باکسنگ بھی دکھائی گئی تھی ۔ ۱۹۴۴ میں ، مَیں نے خُود ہیوی ویٹ میں کالج کی چیمپئن شپ جیتی ۔ ۱۹۴۲ء میں دہلی میں آل انڈیا باکسنگ چیمپئن شپ کا مقابلہ ہُوا تھا جس میں جالندھر، اجمیر کے ، کے جی کالجوں کے علاوہ انڈین آرمی ، نیوی ، ایئر فورس کی برانز کمپنیز نے بھی حصّہ لیا تھا ۔ غرض بہت بڑا اجتماع تھا اور زبردست مقابلہ تھا ۔ وائسرائے مہمانِ خصُوصی تھے ۔ اِس میں ہمارے کالج کی ٹیم جیتی ۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا اور اس کامیابی کا سہرا کمانڈنٹ کرنل اسٹیبنگ کے سر بندھتا ہے ۔ اسٹیبنگ

باکسنگ کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اِس کھیل میں وہ ذاتی دلچسپی لیتے تھے۔ باکسنگ کی تربیت کی نگرانی کرتے تھے اور باکسنگ رنگ میں ہمارے کھیل کو کردار سازی کے نقطہ نظر سے جانچتے اور پرکھتے تھے کہا کرتے تھے رنگ تُمھارا میدان جنگ ہے اگر یہاں جم کر لڑ گئے تو پھر میدان کارزار میں بھی پیچھے نہ رہو گے اور بعد کے واقعات نے ان کا یہ قول صحیح ثابت کیا اِس کا ایک بہت واضح ثبوت موجُود ہے سپاہی کا اصل امتحان تو میدان جنگ ہی میں ہوتا ہے۔ ہماری اس باکسنگ ٹیم میں جس نے دہلی میں کالج کا جھنڈا گاڑا آٹھ لڑکے تھے اِن میں سے چار ۵۲۷ رشید۔ ۸۳۵ حق نواز کیانی۔ ۹۱۴ عاقل داد اور ۱۲۲۱ اسلم جنجوعہ نے ۱۹۶۵ء میں ستارہ جُرأت لیا۔

کرنل اسٹیبنگ کا کین

کرنل اسٹیبنگ کا کین بہت مشہُور تھا۔ جو بہت جلد حرکت میں آجاتا تھا میَں نے کئی بار اسکا مزہ چکھا۔ گو میں خُود شرارتی ہونے کی نعمت سے محرُوم تھا۔ لیکن میرے دوست اِس فن میں طاق تھے۔ بس اس طرح گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا تھا۔

اب بات چھڑی ہے تو وہ پُرانے سنگی ساتھی بُری طرح یاد آرہے ہیں۔ نمبر ۷۶۱۔ اسلم اور نمبر ۸۱۱ ارجاسب یہ دونوں خاص طور پر شرارتی تھے۔ اسلم کی طبیعت میں خاص طور سے شوخی تھی۔ کسی طور نچلا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ ڈارمیٹری، میس، کلاس رُوم غرض ہر جگہ، بلّی کی سی آنکھوں والا اسلم، باز نہیں آتا تھا۔ کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتا رہتا تھا۔ ہم سے سینیئر تھا لہذا ٹارگٹ ہم جونیئر بنتے تھے۔ برسہا برس کے بعد جب مجھے اِس کے ساتھ بلکہ اس کے ماتحت کام کرنے کا موقعہ ملا تو اِس وقت بھی آفس

کے بعد اس کی خوش طبعی رنگ لاتی تھی۔ میں کہتا بھی کہ سر، اب بریگیڈئر ہو گئے ہیں کچھ سنجیدہ بنئیے۔ تو جواب ملتا عاقل۔ سنجیدگی دفتر تک، میدان کارزار تک بہت ہے۔ باقی کچھ جینے بھی دو۔ اب یہ الفاظ یاد آتے ہیں تو کلیجہ کٹ کے رہ جاتا ہے کہ ہمارا زندہ دل اور خوش طبع اسلم پھر زیادہ عرصے جیا نہیں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

نمبر ۹۱۱ ارجاسب۔ اس کا عملی مذاق میں جواب نہیں تھا اور پھر ماشاءاللہ ڈیل ڈول بھی اچھا خاصا تھا۔ طاقت و توانائی کا چلتا پھرتا مجسمہ اس زمانے میں بڑے رستم لڑکے بھی اس سے ذرا بچ کر چلتے تھے۔ ارجاسب کے دو چار واقعات تو ایسے ہیں کہ افسانہ کا گمان ہوتا ہے۔ مثلاً ایک بار فٹ بال کھیلتے فٹ بال کو اتنی زور دار کک لگائی کہ پہلے تو بال قریب سو ڈیڑھ سو فٹ اُوپر اُچھلا پھر وہاں پھٹ گیا اور نیچے دھپ سے آگرا۔ ارجاسب کے ہاتھوں غریب فٹ بال کا یہ حشر ہُوا۔

چند دُوسرے افراد

جمعدار ایجوٹینٹ منگا خان، مولوی غلام نبی، صُوفی عزیز احمد، بگلر تاج، لانگری عبداللہ۔ ڈرائینگ ماسٹر احمدین صاحب، ڈرم ماسٹر کالے خان، رسالدار میجر عبدالوہاب خاں، ڈرل ماسٹر حوالدار کالا خان وغیرہ وغیرہ اپنی خوبیوں اور خصوصیات کی وجہ سے بہت یاد آتے ہیں۔ کالج ہمارا گھر ہے اور گھر کی کیا بات ہے۔ گھر کا چپہ چپہ پیارا ہوتا ہے۔

ایک بات تو میں بتانا بھُول ہی گیا۔ ہماری پہلی کلاس تھی جس نے ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دیا دُوسرے سال اپریل ۱۹۴۶ء میں کمیشن کے لیے کالج کے دُوسرے لڑکوں کے ساتھ، دہرہ دون میں سلیکشن بورڈ کے سامنے پیش ہُوا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اس وجہ سے یا کسی اور سبب سے بات بنی نہیں اور مئی

۱۹۴۶ء میں اپنی آبائی یونٹ ۱۶ پنجاب میں چلا گیا۔

کمیشن اور اس کے بعد

اوائل ۱۹۵۰ء میں، مَیں کمیشن کے لیے منتخب ہُوا۔ اپریل ۱۹۵۰ء میں پری کیڈٹ اسکُول کوئٹہ گیا۔ اگست ۱۹۵۰ء میں ۶ پی ایم اے کورس میں شرکت کی۔ اگست ۱۹۵۲ء میں بی/۲ فرنٹیئر فورس رائفلز، بعد کو ۸ ایف ایف میں شامل ہُوا۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک اِسی پلٹن میں رہا۔ پھر ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک ملٹری پولیس اسکُول کے اسٹاف پر رہا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک ڈھاکہ میں انٹر سروسز انٹیلی جنس سے وابستہ رہا۔ اپریل ۱۹۶۵ میں جب رن آف کچھ میں پہلی جھڑپ ہُوئی تو دوبارہ ۸ ایف ایف کے ساتھ شریک کارزار ہُوا۔ جولائی ۱۹۶۵ میں حیدر آباد چھاؤنی میں واپس آنے کے تقریبًا ایک ماہ یا ڈیڑھ ماہ بعد ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں حصّہ لینے کا موقعہ اور شرف ملا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ کا معرکہ

۱۶ ستمبر کو میری اے کمپنی کو دشمن کے علاقہ میں ایک رکاوٹ راستے سے ہٹانے کا حکم ملا۔ رات کو ہم دشمن کے علاقے میں چلتے رہے کوئی آٹھ میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ صُبح سویرے وہ رکاوٹ دیکھی تو ہوش اُڑ گئے۔ وہ رکاوٹ کا ٹیلہ نہیں ہمالیہ تھا یعنی دشمن کی ایک تازہ دم بٹالین وہاں مورچہ بند تھی۔ میری کمپنی تمام رات کی مارچ کے بعد خستہ حال تھی۔ لیکن جب دُشمن سامنے ہو تو خستہ حالی نہیں دیکھی جاتی جان لڑائی جاتی ہے۔ جب سامنے سے فائر کھلا تو معلُوم ہوتا تھا کہ ہماری کمپنی پر دوزخ انڈیل دیا گیا۔ اس حالت میں بچاؤ کا ایک ہی طریقہ تھا کہ دشمن کو ختم کر دو پیشتر اس کے کہ وہ آپ کو ... ے۔ چنانچہ ہم نے بھی غیر روائیتی طریقہ سے اس پر دھاوا بول دیا۔ ہمارے حق میں

جو بات تھی وہ یہ تھی کہ ہم نے اس کے عقب سے اسے جالیا جس کے لیے وہ تیار نہ تھا گو اس نے اپنا حفاظتی فائر بڑی فیاضی سے گرایا۔ لیکن اس کی پوزیشن میں کھلبلی مچ گئی ایک گھنٹہ کی دست بدست لڑائی میں ہم نے دشمن کے ۲۰۰ آدمی جہنم رسید کیے اپنا بھی نقصان ہُوا۔ مشن کی تکمیل کے بعد ہمیں واپس بلا لیا گیا۔

مصنّف کا تبصرہ

اب تک جو کچھ آپ نے پڑھا یہ وہ خود نوشت سوانح حیات ہے جو عاقل داد صاحب نے ہمارے سوال نامے کے جواب میں قلم بند کی۔ ۱۹۶۵ کی جنگ کی اس مہم میں میجر عاقل داد کو جو ستارۂ جرأت عطا ہُوا اس کا سرکاری فرمان پیش کیا جاتا ہے۔

ستارۂ جُرأت کا فرمان

۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی درمیانی رات کو میجر عاقل داد کی زیر کمان کمپنی کے سپرد یہ مشن کیا گیا کہ وہ دشمن کے علاقے میں ۸ میل اندر جا کر دشمن کی ایک چوکی نشانہ بنائیں مقصد یہ تھا کہ دشمن کی صفوں میں خوف وہراس کی فضا بیدار کی جائے تاکہ اِس کی منصوبہ بندی کا رُخ خود حفاظتی کی طرف ہو جائے۔ میجر عاقل داد نے یہ چیلنج قبول کیا اور اپنی کمپنی کو لے کر دشمن کے علاقے میں اتنی دُور تک چلے گئے کہ یہ دشمن کی ایک پوزیشن کے پیچھے جا پہنچے۔ دُشمن کی ایک بٹالین کی پوزیشن تھی۔ دشمن نے قریب دوسو گز کے فاصلے سے میجر عاقل داد کی حملہ آور کمپنی پر زبردست فائر کھول دیا۔ دُشمن کی ایک گولی میجر عاقل داد کے کندھے میں لگی بھی لیکن یہ اپنی کمپنی کی قیادت کرتے ہُوئے دُشمن پر جھپٹ پڑے اور سخت دست بدست لڑائی کے بعد پوزیشن پر قبضہ کر لیا اِس لڑائی میں دشمن کے دوسو آدمی مارے گئے جو بچے وہ قیدی بنا لیے گئے۔

ابھی یہ دشمن قیدیوں کو سنبھالنے اور اپنی زخمیوں کی ابتدائی دیکھ بھال میں لگے تھے کہ دشمن نے دو کمپنیوں اور چوتھی کمپنی کے توپ خانے کی مدد سے جوابی حملہ شروع کر دیا۔ یہ بڑی نازک صورت حال تھی کمپنی کا کمانڈر خود زخمی تھا۔ ابھی کمپنی پچھلا کامیاب وار کر کے اپنے آپ کو دفاع کے لئے منظّم نہیں کر پائی تھی کہ دشمن نے بھرپور جوابی حملہ شروع کر دیا۔ میجر عاقل نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تیزی سے اپنی کمپنی کو منظّم کیا اور اپنے جوانوں کو اس نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے للکارا جوان دیکھ رہے تھے کہ کمانڈر کے شانے سے خون بہہ رہا ہے کہ اس کے باوجود وہ حملے کا مقابلہ کرنے میں سب سے آگے ہے۔ یہ دیکھ کر ان کی کمپنی کے جوانوں کے جوش و جذبے میں چوگنا اضافہ ہو گیا انہوں نے جی توڑ کر مقابلہ کیا اور آخر کار دشمن کا سخت جانی نقصان کرنے کے بعد اس کے حملے کا زور توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ دشمن چوٹ کھا کر پسپا ہو گیا اور پھر اس نے مزید جوابی حملے کرنے کی جرأت نہیں کی۔

اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد میجر عاقل داد نے نہایت اطمینان سے اپنی کمپنی کو دوبارہ منظّم کیا اور بہت منظّم طریقے سے زخمیوں اور ایک جنگی قیدی کو لے کر اپنے مرکز پر پہنچ گئے۔ اگرچہ اب بھی ان کے کندھے سے خون رس رہا تھا۔ لیکن انہوں نے اس وقت تک ہسپتال جانے سے انکار کر دیا۔ جب تک ان کا ایک ایک جوان صحیح و سلامت اپنے مرکز پر واپس نہ پہنچ گیا۔

اس معرکہ کی کامیابی میں میجر عاقل کی جرأت، فراست عزم جوش، جذبے اور قائدانہ صلاحیت نے ایک کلیدی کردار ادا کیا۔ میجر عاقل داد کی اس کامیاب یلغار سے دشمن کا حوصلہ ایک دم بیٹھ گیا اور وہ خوف و ہراس کا شکار ہو گیا۔ یہی اس مہم کا مقصد تھا۔

اس بے نظیر کارنامے کے لئے میجر عاقل داد کے لئے ستارۂ جرأت کی پرزور سفارش کی جاتی ہے۔ ۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو انہیں ستارۂ جرأت عطا ہوا۔

اس فرمان کی روشنی میں میجر عاقل داد سے انٹرویو کرتے ہوئے ہم نے ان سے پوچھا

بڑا کام نہ بڑا کام ہے۔ کوئی چھوٹا کام بھی از خود نہیں ہو جاتا۔ انسان جو کچھ کرتا ہے ا
کے پیچھے اس کا ذہن اس کا شعور۔ اس کی شخصیت ہوتی ہے۔ جس کی جڑیں اس کی ابتد
تربیت اور ماحول میں ہوتی ہیں۔ آپ نے جو یہ غیر معمولی کارنامہ انجام دیا اس کی جڑیں ک
تھیں؟ میجر عاقل نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔ راشد صاحب کوئی اتنی بڑی بات نہیں جسے
کارنامہ کہا جا سکے۔ بہرحال اگر آپ اسے کارنامہ کہنے پر بضد ہی ہیں اور اس کی جڑوں کا
لگانا چاہتے ہیں تو میرا جواب یہ ہے کہ یہ کامیابی دو وجہوں سے ممکن ہو سکی۔ ایک تو تائید ا
دوسرے تربیت۔ ہمارے دفتروں میں فارغ کا ماٹو عمل نہ کہ قول تھا۔ میں اسی ماٹو کے ساتھ
کام کرتا رہا ہوں۔ ۱۹۴۷ میں کالج چھوڑا تھا۔ آج میں فوج کو بھی خیرباد کہہ رہا ہوں۔
سال کے اس عرصے میں بڑے بڑے کٹھن مرحلے آئے۔ ۱۹۴۸ء کا کشمیر آپریشن ۱۹۶۵ء کی ج
دسمبر ۱۹۷۱ کی جنگ۔ دتا۔ میں ہر مرحلے سے اس طرح گزرا جس طرح مچھلی طوفانی لہروں سے گ
جاتی ہے۔ یہ سب اللہ کے کرم اور ابتدائی تربیت کا فیض تھا۔ لیکن یہ میرا اکیلا کارنامہ نہیں
یہ ایک جانباز بٹالین کی ایک جانباز کمپنی کی کامیابی تھی۔

میرے ساتھی جس جذبے سے سرشار تھے اس کا کمال یہ تھا کہ انہیں حکم کی نہیں اتنا
کی ضرورت ہوتی تھی۔ آج میں ان جوانوں کو سلام کرتا ہوں جنہوں نے میرے اشارے پر د
کے علاقے میں جا کر اس کی گولیوں کا مینہ برساتی ہوئی مشین گنوں کے منہ بند کر دیئے جر
جسموں کے ٹکڑے میں نے آندھی کے پتوں کی طرح اڑتے دیکھے لیکن جو پیچھے نہیں ہٹے۔ جن
نے جان کو جان نہیں سمجھا۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! اور جن کی یلغار کے نتیجے میں ہندوستانی سور
نے اپنے مورچوں سے بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی۔

یہ میرے ساتھی، یہ میرے ہمدم، میرے پیارے جوان یہ گمنام شہید یہ سب
اس معرکے کے ہیرو تھے۔ اصل ہیرو میری کمپنی کے اور رینکس تھے میں ایک ایک کو خوب
ہوں۔ ان میں وہ بھی تھے جنہیں بات کرنا نہیں آتی تھی۔ وہ بھی تھے جو عموماً ڈھیلے ڈ

نظر آتے تھے۔ وہ بھی جن کے چہروں پر ذہانت کی کوئی چمک دمک نظر نہیں آتی تھی۔ ،
بھی جو سمارٹ لوگوں کی تیزی وطراری سے بھی عاری تھے۔ جو عام سے سپاہی تھے۔ بہت :
عام سے۔ لیکن جن میں ایک ہی چیز غیر معمولی تھی۔ وہ جس کے نتیجے میں وہ توپوں پر شیروں کی ط
جا پڑے۔

——— انٹرویو کے آخر میں ہم نے عاقل داد صاحب سے سوال کیا کہ آپ کو زندگی میں کہ
لوگوں نے اس حد تک متاثر کیا کہ آپ کی زندگی بھی اس سے متاثر ہو؟

مجھے قرونِ اولیٰ کے جرنیلوں سے عقیدت رہی ہے۔ خاص کر خالد بن ولید جو بیک وقت بڑ
بڑے سپاہی اور جرنیل تھے۔ انہوں نے ذاتی طور پر فرداً فرداً دست بدست لڑائی میں اور اجتما
طور پر فوج کی کمان اور سپہ سالاری میں ہمیشہ لڑائی کا میدان اپنے حق میں رکھا۔ پیدائش سے
آخری دم تک سپاہی اور جرنیل رہے۔ فتح ہر حال میں ان ہی کی رہی۔ سپاہیانہ زندگی کے باہران
کوئی اور دلچسپی نہ تھی اپنے وقت کی شخصیتوں میں سے جنرل افتخار جنجوعہ سے بہت متاثر رہا
جو ہر مشکل ذمہ داری کو ذوق شوق سے نبھاتے تھے۔ وہ نڈر بہادر۔ ذہین معاملہ فہم۔ اور اپنے
ماتحتوں کے مددگار تھے۔ جو کہتے تھے کر کے بھی دکھاتے تھے اور اپنے ماتحتوں سے وہی کچھ کرنے
کو کہتے تھے جو خود کر سکتے تھے۔ صرف گفتار کے غازی نہ تھے جس قسم کے لوگ آج ہماری قوم م
کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ انکسار اور کم گوئی آجکل ناپید ہے۔ موجودہ دور میں صرف چرب ز
کے ذریعہ ہر کوئی اپنے کم سے کم کام کی زیادہ سے زیادہ اجرت وصول کرتا نظر آتا ہے حقیقت کم
لیکن پبلسٹی۔ اشتہار بازی زیادہ ہے۔ آخر میں میں یہ صرف کہوں گا ہمیں تربیت کے روایتی
سانچوں کو بدلنا چاہیے اور قیادت اور شخصیت کی صلاحیت اور کارکردگی کو ناپنے تولنے
کے لئے روایتی پیمانوں میں اس طرح کانٹ چھانٹ کرنا چاہیئے کہ کھوٹے سکے نہ چل سکیں۔ م
کارواں کا، پہچان تو علامہ اقبال بنا گئے ہیں۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اپنے گھروں میں اور اداروں میں ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کریں جس میں ایسے میر کارواں پروان چڑھیں۔

کرنل (ریٹائرڈ) محمد اکبر امتیازی سند

آرٹلری

کرنل ریٹائرڈ محمد اکبر امتیازی سند-آرٹلری

روشنی طبع تو کبھی کبھی بلا بنتی ہے لیکن جرأت کردار جہاں انسان کو بہت سی کامیابیوں اور عزتوں سے ہمکنار کرتی ہے وہاں آج کی دنیا میں یہی صفت اسے اکثر و بیشتر بہت سی، الجھنوں، آزمائشوں اور مشکلات سے بھی دوچار کرتی ہے۔ لیکن باحوصلہ لوگ تندیٔ باد مخالف سے گھبرایا نہیں کرتے۔ اور کبھی کبھی بظاہر ان کی ہار میں بھی ان کی جیت ہوتی ہے۔

جرأت ـــ سوچ کی، اظہار کی اور عمل کی ـــ کرنل اکبر کی شخصیت کی پہچان ہے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی

کرنل اکبر کی اب تک کی زندگی کی داستان اجمالی طور پر پیش کی جاتی ہے۔

نسلی اور آبائی پس منظر

پنجاب کی جنگجو قوموں میں جاٹوں کا شمار بھی ہوتا ہے۔ جاٹوں کا اقتدار شروع سے پنجاب کے دریاؤں کے دوآبوں میں رہا ہے۔ ان دوآبوں کو "بار" بھی کہا جاتا ہے جیسے نیلی بار، گنجی بار، ساندل بار، اور گوندل بار، دریائے جہلم اور چناب کے

درمیان وہ علاقہ ہے جسے گوندل بار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس میں قدیم جاٹوں کا ایک مضبوط قبیلہ گوندل، آباد ہے جس میں جنگجوئی جرأت مندی کی ایک مستحکم روایت عرصہ دراز سے چلی آتی ہے۔

گوندل بار میں دریائے جہلم کے شمالی کنارے گوندلوں کا ایک گاؤں غریب وال ہے۔ اسی گاؤں غریب وال، میں کرنل اکبر ۲۵ اگست ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے۔

گھرانہ

کرنل اکبر کے دادا، شاہ عالم صاحب مرحوم، غریب وال کے گوندلوں میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ اور خاص طور سے اپنی انصاف پسندی اور غریب پروری کے لیے مشہور تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی خاصی خوشحالی میں گزاری گو اپنے آخری ایام میں وہ قحط اور وبائی امراض کے ہاتھوں بہت مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن اپنی خاندانی روایتوں کو آخری دم تک نبھاتے رہے۔ ان کے دو بڑے بیٹوں نے ان کا کاروبار سنبھالا۔ اور چھوٹے بیٹے اللہ بخش نے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔ اور پہلی جنگ عظیم میں جرأت سے حصہ لیا۔ یہ اللہ بخش مرحوم ہی کرنل اکبر کے والد محترم تھے اللہ بخش صاحب کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں کرنل اکبر ان سب میں بڑے ہیں۔

—— اپنے والدین کے بارے میں کرنل اکبر لکھتے ہیں۔

میری خوش قسمتی کہ مجھے غیر معمولی صفات کے والدین ملے۔ والد مرحوم بڑی باوقار اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ بڑے دور اندیش اور باکردار انسان تھے۔ جاٹ اپنی ہٹ کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی ہٹ اصولوں، انصاف اور دادرسی کے لیے ہوتی تھی اسی خصوصیت کی بنا پر انھیں علاقے میں عزت سے دیکھا جاتا تھا انھیں مذہب سے محض جذباتی نہیں ذہنی لگاؤ بھی تھا۔ مذہبی مجلسوں میں وہ بہیں اہتمام سے اور تواتر سے لیجاتے تھے۔

مذہب کو زندگی میں برتنے کا گر میں نے انہی سے سیکھا۔ وہ ہر معاملہ میں مذہبی اپیروچ کے قائل تھے۔ لیکن ان کا رویہ تنگ دلی یا تنگ نظری کا نہیں تھا۔ ہمارے والد محترم کو اپنی اولاد کو تعلیم سے بہرہ ور کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ تعلیم سے ان کی گہری دلچسپی کا یہ نتیجہ ہوا کہ غریب وال ایسے پسماندہ علاقے سے میں اور میرے چھوٹے بھائی (بریگیڈیئر ریٹائرڈ) ۱۴۲۷ محمد اشرف کالج میں داخل ہو سکے۔ سب سے چھوٹے بھائی محمد انور نے بھی اس زمانے میں ایف اے کیا آگے بڑھنے سے پہلے میں اپنی والدہ کا تذکرہ کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ انھوں نے بچوں کی پرورش و پرداخت میں والد صاحب کا پورا ہاتھ بٹایا۔ اور انھیں وہ ضروری تربیت دی جو تعلیمی ترقی کی بنیاد ہے۔ چھوٹی موٹی زیادتی کو برداشت کرنا اور جہاں تک ہو سکے سب کے ساتھ ـــــ ان کے ساتھ بھی جو ٹیڑھے ہوں ـــــ مروت اور فیاضی کا رویہ رکھنا میں نے والدہ ہی سے سیکھا۔ اور اب اس معاملے میں ان کی تقلید کرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔"

ملٹری کالج میں داخلہ

جماعت پنجم تک اپنے گاؤں تعلیم حاصل کرنے کے بعد، میں ملٹری کالج جہلم میں جو اس زمانے میں ایک اسکول تھا اور جس کا پورا نام کنگ جارج رائل انڈین ملٹری اسکول جہلم تھا۔ اگست ۱۹۴۱ء میں چھٹے درجے میں داخل ہوا۔ اور ۹۴۹ کالج نمبر پایا۔

اپنی پہچان

ملٹری کالج میں، میں نے بہت کچھ سیکھا۔ لیکن کالج کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ گاؤں کے اسکول کے تنگ، اور حوصلہ شکن ماحول کے برعکس یہاں آکر میری صلاحیتوں کو صحیح معنوں میں ایک جولاں گاہ ملی۔ یہاں آکر میں نے اپنے کو پہچانا۔ کالج کی فضاؤں میں مجھے اپنے

پر پرواز کی قوتوں کا اندازہ ہوا۔ خوش قسمتی سے یہاں ہر میدان میں مقابلہ سخت تھا۔ جس سے میرے شوق کو مزید تحریک ملی۔ میں ہمیشہ سخت مقابلے کا قائل رہا ہوں۔ حریف کمزور ہو تو مقابلے کا مزہ نہیں آتا۔ بلکہ اپنی کارکردگی کا معیار بھی گر جاتا ہے اور انسان خواہ مخواہ کمتر معیار اور کمتر جدوجہد کا عادی ہو جاتا ہے جو ترقی و تکمیل کے لیے زہر ہے۔ شکر ہے کہ میرے چند ساتھی، ۹۴ محمد یوسف (لیفٹیننٹ کرنل) اور ۹۹۳ محمد صادق (بعد کو بریگیڈیئر) پڑھائی اور دوسرے میدانوں میں بہت اچھے تھے۔ یوسف نے پہلی پوزیشن پر جائز قبضہ جما رکھا تھا۔ دوسری پوزیشن کے لیے چھٹی سے آٹھویں جماعت تک میرے اور صادق کے درمیان سخت رسہ کشی رہی۔ کبھی وہ سیکنڈ آتے اور کبھی مجھے یہ اعزاز ملتا۔ تعلیم کے علاوہ جب میں نے کھیلوں وغیرہ پر توجہ دی تو باکسنگ، پی ٹی ڈرل اور اتھلیٹکس میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

ناقابل فراموش شخصیت

۱۹۴۱ء میں جب میں کالج میں داخل ہوا۔ تو کالج کے کمانڈانٹ میجر (بعد کو لفٹیننٹ کرنل) ٹی ایچ ایل اسٹبنگ تھے۔ وہ دوہرے جسم کے اور بلند قامت تھے۔ ان کو پہلی بار دیکھتے ہی میرے والد نے مجھ سے کہا۔

بیٹا، تمہارا کمانڈانٹ تو بڑا سخت گیر اور جابر شخص نظر آتا ہے۔ تم اتنے چھوٹے ہو کہیں اس کے خوف سے کالج چھوڑ کے نہ بھاگ جانا"

میں نے فوراً جواب دیا۔

"جب دوسرے بچے نہیں بھاگے تو میں کیوں بھاگوں گا۔" کہنے کو تو میں یہ کہہ گیا لیکن بعد کو میں نے اسٹبنگ کو ویسا ہی پایا جسکا اندازہ والد گرامی اپنی قیافہ شناسی سے کر چکے تھے۔ اس شخص سے لڑکے تو کیا اسٹاف کے اراکین بھی ڈرتے تھے۔ وہ جس راستے سے گزر رہا

ہوتا تو راہ بدل کر ادھر ہو جاتے بے ضرورت اس کا سامنا کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوتی تھی۔ وہ کالج پر چھایا ہوا تھا۔ کالج مکمل طور پر اس کی گرفت میں تھا۔ وہ حد درجہ محنتی، جفاکش، دور اندیش، خود ڈسپلن کا پابند، مستعد اور سب سے بڑھ کر یہ کہ باعمل انسان تھا اس نے کے جی سکول کو کالج بنا دیا اور پھر کالج میں اپنے کردار و عمل سے انمٹ نقوش چھوڑ گیا اس شخص سے اختلاف ممکن ہے۔ لیکن اس کو بھلانا ممکن نہیں جب بھی مجھے کالج کا خیال آتا ہے اسٹیبنگ کا تصور اس میں سب سے نمایاں ہوتی ہے۔ اسٹیبنگ کا ایک اپنا فلسفہ تربیت تھا جس میں ذمہ داری دینے کی اہمیت ضرور تھی۔ لیکن اس سے زیادہ اہمیت سزا کو تھی۔ ذرا ذرا سی کوتاہیوں پر سخت سزا دینے کا دستور تھا۔ جونیئرز کی کوتاہیوں کی بھی سینئرز سے سخت باز پرس ہوتی تھی۔ جس کے نتیجے میں سینئرز اپنے جونیئرز پر بے جا سختی بلکہ بعض اوقات ظلم کرتے تھے۔ بہر حال اس وقت تو میں اسٹیبنگ کے سزا پسندی کے فلسفے کی بات کر رہا ہوں۔ وہ سزا کو ٹریننگ کا ضروری حصہ سمجھتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے ایک رجسٹر کھول رکھا تھا۔ جس میں سب کی خاص طور سے سینئر کیڈٹس کی سزاؤں کا اندراج کرتے رہتے تھے۔

یہ واقعہ ۱۹۴۷ء کا ہے۔ غالباً جب انھوں نے دیکھا کہ چھ سال گزر چکے ہیں اور ۰۹۴۹ اکبر کا سزا کا خانہ خالی ہے تو انھوں نے کسی نہ کسی طور مجھے اس لذّت سے بہرہ ور کرنے کا تہیہ کر لیا۔ جب کسی کو پکڑنا ہی ہو تو کوئی نہ کوئی بہانہ تو مل ہی جاتا ہے۔ چنانچہ انھیں ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔ اور مجھے چارج شیٹ دیدی گئی۔ جس میں لکھا تھا۔ "بحیثیت سی ایس ایم تم نے اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی کی۔ یعنی سرکاری سامان کی ضروری دیکھ بھال نہیں کی۔" میں حیران تھا کہ مجھ سے ایسی کونسی کوتاہی ہوئی ہے کہ مجھے چارج شیٹ کیا گیا ہے۔ بہرحال جب میں کمانڈانٹ کے سامنے پیش ہوا۔ تو انھوں نے رسمی طور پر پوچھا اپنے جرم کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ میں نے جواب دیا۔ جناب ابھی مجھے اپنے جرم کی نوعیت

تو معلوم ہی نہیں۔ اعتراف کس کا کروں؟ یہ سن کر اسٹیبنگ صاحب نے فرمایا۔

کیا تمہیں علم نہیں کہ اسکین ہاؤس کی سیکشن نمبر تین میں ایک اسٹول ٹوٹا پڑا ہے جس کی ضروری مرمت کا انتظام نہیں کیا گیا۔

میں نے عرض کی۔

جناب، اس اسٹول کی مرمت کے بارے میں، میں نے معمول کے طریقے کے مطابق رجسٹر میں لکھ کر ہاؤس ماسٹر صاحب کو اطلاع دیدی ہے باقی کارروائی انھیں اور مرکزی دفتر کو کرنی ہے۔

ان دنوں ہمارے ہاؤس ماسٹر طلیسر مسرور تھے جو بعد کو نیوی میں چلے گئے۔ انھیں بلا کر پوچھا گیا۔ آفریں ہے مسرور صاحب پر کہ انھوں نے حاکم جابر کے سامنے حق بات کہی۔ نہ صرف میرے بیان کی تائید کی بلکہ یہ بھی کہا۔ اکبر اپنی ذمہ داری ادا کر چکا ہے۔ میں جمعدار کوارٹر ماسٹر کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اب اسٹول کی مرمت کروانے کی ذمہ داری ان کی ہے اکبر کی نہیں"

بہر حال اسٹیبنگ کہاں قائل ہونے والے تھے وہ تو مجھے سزا دینے کا تہیہ کر چکے تھے چنانچہ انھوں نے سزا دے ڈالی۔

اب دوسرا مرحلہ اعتراف جرم کا شروع ہوا۔

"تمہیں اپنے جرم کا اعتراف ہے؟"

"جناب نہیں۔"

دیکھو۔ ٹوٹے ہوئے اسٹول کی ایک ٹانگ انگیٹھی کے قریب پڑی تھی فرض کیا انگیٹھی میں کوئلہ نہ جلتا اور کوئی وہ خشک لکڑی اٹھا کر انگیٹھی میں ڈال دیتا تو؟

جناب اگر اجازت ہو تو عرض کروں یہ ایک مفروضہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور مفروضہ پر سزا دینا قرین انصاف نہیں" کمانڈانٹ کہاں ہار ماننے والے تھے۔

"فرض کرو کمانڈر انچیف جنرل آکنلک کالج کا دورہ کرتے اور اس اسٹول کو یوں پڑا

دیکھتے تو کیا کہتے۔

"جناب وہ اس کا نوٹس بھی نہ لیتے۔"

"نہیں وہ ضرور نوٹس لیتے کہ کالج کا کمانڈانٹ بہت سست ہے۔ اب جب میں نے تمہارے ہاؤس میں وہ اسٹول اس حالت میں دیکھا تو کیا سوچا ہو گا؟"

"یہی کہ کوارٹر ماسٹر بہت سست ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ ایک دم خوش ہو گئے۔ اور میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

شاباش۔ اب تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تم جا سکتے ہو۔"

لیکن میں اب اتنی آسانی سے ٹلنے والا نہ تھا۔ اپنی سزا کو میں سراسر ناواجب سمجھتا تھا۔ اس سے میری انا کو سخت دھکا لگا تھا۔ میری تربیت کچھ اس طرح ہوئی ہے اور خود میری طبیعت کچھ اس طرح کی ہے کہ بے عزتی میں برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ یہی ردعمل میرا اس وقت بھی تھا۔ میں نے پھر بات شروع کی۔ جناب۔ مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ چھ سال سے میں کالج میں ہوں۔ کسی لڑکے کی کوئی بات آپ سے چھپی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کو کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا اور نہ میرے کسی سینئر یا جونیئر نے آپ سے میری کوئی شکایت کی آج آپ نے پہلا موقعہ ملتے ہی مجھے بے جواز مارنا شروع کر دیا۔ اب میں خاصا سینئر ہوں۔ آپ ہی نے مجھے سی، کیو، ایم ایس بنایا ہے۔ اب میں کیا منہ لے کر اپنے ہاؤس جاؤں گا۔ اور اپنے جونیئرز کو کیسے سمجھاؤں گا۔ کہ مجھے ناحق سزا ملی ہے بہتر ہے کہ آپ مجھے کالج سے فارغ کر دیں تاکہ اور کچھ نہیں تو اپنے بوڑھے والدین کی خدمت ہی کر سکوں۔

کرنل اسٹیبنگ سے کسی نے غالباً اس وقت تک اس انداز سے گفتگو نہیں کی تھی میری بیباکی اور مدلل طرز گفتگو سے وہ حیران اور کسی حد تک متاثر ہوئے۔ پھر سمجھانے کے لب و لہجہ میں کہا۔

"اگر تمہیں یہ سزا میں نے تمہارے فائدے کے لیے دی ہے تم نے فوج میں افسر

بنا ہے۔ اور جس افسر کو خود سزا نہ ملی ہو وہ سزا دیتے وقت کیسے جان سکتا ہے کہ دوسروں پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ میں نے عرض کیا۔

سزا دیتے وقت شاید آپ ہر ایک سے یہی فرماتے ہوں لیکن ان میں سے کتنے افسر بنے اور کتنے اب تک خاک چھان رہے ہیں"۔ یہ سن کر وہ اتنے متاثر ہوئے کہ یکایک جوش میں آ گئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور کہا۔

"اکبر، آج تک میں نے کسی کو ایسا یقین نہیں دلایا۔ لیکن تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم ضرور افسر بنو گے۔"

یہ طویل گفتگو میں نے اپنی تعریف کے لیے نہیں۔ اسٹیبنگ کے ظرف اور سوچ کی تعریف کے لیے نقل کی ہے۔ وہ شخص جو اتنا سخت آمر اور جابر مشہور تھا اور واقعی تھا بھی۔ اس کا حوصلہ اور برداشت دیکھو۔ کہ اس نے محض ایک کیڈٹ کی اتنی باتیں سنیں نہ طیش میں آیا۔ نہ جھاڑ پلائی اور نہ کوئی انتقامی کارروائی کی۔ سچ ہے کہ ایک بلند مقصد سے وابستگی انسان کو ذاتیات سے بلند کر دیتی ہے۔

لیکن یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ دوسرے دن کرنل اسٹیبنگ مجھے باکسنگ رنگ کے قریب ملے۔ جہاں مجھے ٹائم کیپر کے فرائض انجام دینے تھے مجھے اپنے پاس بلایا اور اپنی گھڑی اتار کر مجھے دینے لگے۔ میں نے کہا ٹائم کیپری کے لیے میں نے کسی سے گھڑی لے لی ہے۔ انھوں نے فرمایا یہ گھڑی تم اپنے پاس رکھ لو۔ میں نے پھر عرض کیا جناب۔ مجھے گھڑی کی ضرورت نہیں۔ یہ سن کر وہ قدرے متفکر ہوئے۔

کیا تم ابھی تک اس بات کو نہیں بھولے ہو؟ اور پریشان ہو؟

"جی ہاں واقعہ تو یہی ہے۔"

"میں نے تمہیں ایک یقین دلایا ہوا ہے۔ ایک وعدہ کیا ہوا ہے کیا تم اسے بھول گئے؟"

"جی وہ مجھے یاد ہے۔

"اب میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس بارے میں تم مزید تردد یا فکر نہیں کرو گے":

جناب ہر ذی شعور کسی نہ کسی چیز کی فکر کرتا ہے۔ سوچ یا فکر کسی حکم کے تابع نہیں ہوتی ـــــ اس واقعہ یا حادثہ کے بعد کرنل اسٹیبنگ ہمیشہ میرے ساتھ شفقت سے پیش آتے رہے۔ اور میں اب اس واقعہ پر مزید تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے یہ کوشش ضرور کی ہے کہ پوری دیانت داری سے اس واقعہ کو پیش کروں۔ تاکہ ہم اس کے تجزیئے سے قیادت کے متعلق ضرور نتائج اخذ کر سکیں۔ اسٹیبنگ ایک غیر قوم کا فرد تھا۔ وہ کب کا مر کھپ چکا۔ اس کا تذکرہ محض اسلئے کیا ہے کہ وہ جنہوں نے اس ملک پر کبھی حکومت کی ان کا کردار کیا تھا۔

شاد باد منزل مراد

آزادی کی پریڈ کی تیاریاں

ملٹری کالج جہلم میں اگرچہ ہندو اور سکھ بھی تھے مگر اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ جب پاکستان بننے کے چرچے شروع ہوئے تو مسلمان ہر قیمت پر پاکستان بنتے دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر ہندو اور سکھ پاکستان بننے کے خلاف تھے۔ رفتہ رفتہ دونوں قوموں میں اختلافات بڑھتے گئے جس سے کالج کا نظام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ادھر لفٹیننٹ کرنل سٹیبنگ آزادی کے بعد انگلینڈ جانے کا فیصلہ کر چکے تھے اس لیے ان کی جگہ میجر اورنگ زیب آئے جو بظاہر سٹیبنگ کے زیر تربیت تھے۔ لیکن در پردہ مسلمان گروپ کی قیادت کر رہے تھے جبکہ کیپٹن نوٹیال اور کیپٹن مینن دوسرے گروپ میں پیش پیش تھے بہر حال یہ طے ہو چکا تھا کہ آزادی کی خوشی میں [illegible] اگست کو [illegible] پریڈ ہوگی چنانچہ پریڈ کیلئے ضروری تیاریاں بھی شروع ہو گئی تھیں۔

ہندوؤں اور سکھوں کی شرارت

اگست کے پہلے ہفتے میں اچانک پریڈ کی منسوخی کا حکم صادر ہوا جس میں کہا گیا کہ کمانڈنٹ چاہتے ہیں کہ اس مبارک موقعہ پر تمام لوگ اپنے اپنے خاندان کے ساتھ آزادی کی خوشی منائیں۔ چنانچہ کالج تین دن کے لیے بند رہے گا۔ ہر کوئی چھٹی ملنے پر خوش تھا مگر ۱۲ اگست کی شب جبکہ ہندو اور سکھ پریڈ کی منسوخی کی خوشیاں منا رہے تھے۔ پریڈ کی منسوخی کی اصل وجہ کا راز کھل گیا۔ دراصل ہندوؤں اور سکھوں نے پریڈ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ وہ پاکستان کے پرچم کو سلامی نہیں دے سکتے یہ راز کھلنے پر مسلمان لڑکوں نے کمانڈنٹ کے گھر جاکر مطالبہ کر دیا کہ ۱۴ اگست کو پریڈ رکھی جائے کیونکہ وہ چھٹی نہیں جانا چاہتے۔ کمانڈنٹ نے پریڈ کی منسوخی کے بارے میں کئی دلیلیں دیں مگر مسلمان نہ مانے۔ الغرض ان کا مطالبہ مان لیا گیا۔ ساتھ کمانڈنٹ نے واضح کر دیا کہ ہندو اور سکھ پریڈ میں حصہ نہیں لیں گے۔

شب انتظار

کیپٹن نوٹیال اور منین کے خلاف جنہوں نے پریڈ منسوخ کروانے میں بڑا حصہ لیا تھا اور اس سے پہلے بھی مسلمان دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھے مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ ان دو افسروں کو فوراً کالج سے نکالنے کا مطالبہ کیا جائے۔ ۱۳ اور ۱۴ اگست کی رات کو یہ مطالبہ مختلف زبانوں میں ہزاروں کی تعداد میں لکھ کر کالج کے کونے کونے میں پھیلا دیا گیا۔ اور دوسرے دن یہ مطالبہ مان لیا گیا۔ مسلمان گروپ کا کوئی فرد بھی اس رات نہ سویا۔ پہلے مطالبہ لکھنے کا کام، پھر پریڈ کی تیاری، اور اس تاریخ ساز صبح کا انتظار جس نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی تقدیریں بدل دینی تھیں، لوگوں کو بیدار رکھنے کے لیے کافی تھا۔ آخر کار شب انتظار ختم ہوئی اور وہ صبح طلوع ہوئی جس نے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو

وجود میں لاکر ہمیشہ کے لیے دنیا کے نقشے کو بدل کر رکھ دیا۔

ہلالی پرچم

ملٹری کالج میں شروع سے ہی یونین جیک لہرایا کرتا تھا مگر آج وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کالج سے روپوش ہو رہا تھا اور اس کی جگہ ہلالی پرچم پوری شان وشوکت کے ساتھ سربلند ہو رہا ۱۴ اگست کو پہلی بار پاکستانی پرچم لہرانے کی سعادت اب ریٹائرڈ لیفٹننٹ کرنل محمد اکرم خان اور مجھے نصیب ہوئی۔ بہت سویرے ہم دونوں اپنی بہترین وردیاں پہن کر سٹور پہنچے جہاں ہم نے پاکستان کا جھنڈا حاصل کرنا تھا۔ صوبیدار غنی سٹور انچارج پہلے سے سٹور میں موجود تھے شاید وہ بھی ساری رات نہ سو سکے تھے۔ کہ انھوں نے سٹور کی سب سے قیمتی چیز ہمارے حوا کرنی تھی۔ بصد احترام ہم دونوں نے یہ تحفہ وصول کیا، چوما اور سر آنکھوں سے لگایا اور کے مرکزی ہال کے سامنے فلیگ پوسٹ پر آہستہ آہستہ بلند کیا۔ جب وہ اپنے عروج پہنچ کر پہلی بار کالج کی فضا میں لہرایا تو یوں محسوس ہوا جیسے کالج کے درو دیوار اور سبزہ زار کے سامنے تعظیماً جھک گئے ہیں۔ ہم دونوں نے حب الوطنی، خلوص اور عقیدت کے جوش اور ولولے کے ساتھ سلام شوق ادا کیا اور نم آلود آنکھوں سے پیچھے مڑ کر عجیب دیکھا۔ لفٹیننٹ کرنل سٹیبنگ اپنی بہترین وردی زیب تن کئے تمغے لگائے نہایت ا سے ہلالی پرچم کو سلامی دے رہے تھے۔ ان کی وہاں موجودگی کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے ان کے لیے تو یہ ایک منحوس دن ہونا چاہیے تھا۔ جس نے یونین جیک کو ہمیشہ کے ملک بدر کر دیا تھا۔ ان کیلئے تو سبز پرچم کا عروج ان کے اقتدار کے خاتمے کی علامت مگر وہ اسے بڑے احترام سے سلام کر رہے تھے۔ فرض کی پکار ان کے ذاتی جذبات غالب آچکی تھی۔ جبکہ مسلمان افسران وہاں موجود نہ تھے۔ جو من حیث القوم ہ اعتنائی کی انتہا تھی۔ یہ دیکھ کر ہمارے سینوں سے ایک طوفان اٹھا جو آنسو بن کر آنکھ

۱۰ پڑا ۔

آزادی کی پریڈ

پرچم کشائی کا مقدس فریضہ انجام دینے کے بعد میں اپنی کمپنی کے ساتھ پریڈ کے میدان پہنچا۔ ۱۴ اگست کا مبارک سورج پوری تمکنت کے ساتھ ہمارے دلوں اور کالج کے ماحول کو گرما رہا تھا۔ وہ اعلان کر رہا تھا کہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں اور اب نئی مملکت کے ننھے مجاہد پریڈ کے لیے صف آرا ہو جائیں۔ لفٹیننٹ کرنل اسٹیبنگ سلامی کیلئے پریڈ گراؤنڈ میں سبز ہلالی پرچم کی چھاؤں تلے کھڑے۔ اور پریڈ کے دستے نے مارچ پاسٹ کرتے ہوئے پاکستان کے پرچم کو سلامی دی۔ تالیاں بجیں اور کالج نو کیا پورے سرائے عالمگیر کی فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ ہندو اور سکھ لڑکوں نے گو پریڈ میں حصہ نہ لیا مگر ان کے سر شرم سے جھکے ہوئے تھے۔ پاکستان ملٹری کالج کی تاریخ میں بڑاتوں کے پہلے نشان تھے جو ننھے مجاہد اپنے پاؤں کی ایڑیوں سے نقش کرتے ہوئے اپنی کمپنیوں میں پہنچے۔ مگر ابھی تو اس تاریخ ساز دن کا آغاز ہی ہوا تھا۔ ابھی تو چند اور واقعات رونما ہونے کے منتظر تھے۔

جذبات کی یلغار

پریڈ ختم ہونے پر مسلمان لڑکے میجر اورنگ زیب کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے ان کے گھر پہنچے انھوں نے باہر نکل کر صرف اتنا کہا کہ میرے گھر کیا لینے آئے ہو کیپٹن نوٹیال اور منین کا گھر تو ادھر ہے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ اچانک لڑکوں کا رخ ان دونوں کے گھروں کی طرف ہو گیا۔ نوٹیال اور منین تو بھاگ گئے مگر لڑکوں نے ان کے گھروں میں گھس کر توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ سنیئر لڑکوں نے بمشکل ان پر قابو پایا مگر اسی اثنا میں چند لڑکوں نے کیپٹن نوٹیال کو ڈھونڈھ نکالا اور کمانڈانٹ کے دفتر کے عین پیچھے اس کی تواضع کر دی۔ اس واقعہ کا پتہ

چھینے پر امان اللہ ۱۰۴۰ اور میں بھاگ کر وہاں پہنچے کیپٹن نوٹیال کو چھڑایا اور تمام لڑکوں کو بھگا دیا دریں اثنا سٹیشن کمانڈر جہلم کرنل فرانی ملٹری کالج میں پہنچ گئے اور پہچان پریڈ کے بعد کیپٹن نوٹیال کی نشاندہی پر تین لڑکوں ۱۲۲۱ (ریٹائرڈ بریگیڈیئر) محمد اسلم جنجوعہ ۱۰۱۱ (ریٹائرڈ میجر) جبار اور ۱۲۱۱ محمد عالم کے خلاف کارروائی شروع ہوگئی۔ شام تک گواہوں کے بیانات ہوتے رہے۔ اور جب کرنل فرانی نے یہ فیصلہ دیا کہ ان تینوں لڑکوں کو فوراً جہلم پہنچا دیا جائے جہاں ان کے خلاف مزید کارروائی ہوگی۔ تو سب مسلمان لڑکے ملٹری کالج کی حدود سے باہر چلے گئے۔ ساتھ ہی سرائے عالمگیر کے نیشنل گارڈ اور مسلم لیگ سے رابطہ قائم کیا گیا۔ ان کے وفد نے کمانڈانٹ سے ملاقات کی اور کالج کے اردگرد کے دیہات کے نمبرداروں نے بھی مراسلے بھیجے۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت کمانڈنٹ نے ہمیں یقین دلایا کہ ان تین لڑکوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوگی۔ مزید براں کمانڈانٹ خود دو دن کے اندر کالج چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اور چارج میجر اورنگ زیب کو دے دیں گے۔

آزادی کے بعد

قافلے

ملٹری کالج چونکہ شاہراہ پاکستان پر واقع ہے جس پر ہندوستان سے آنے والے مظلوم مسلمانوں کے لٹے پٹے قافلے گزرا کرتے تھے اس لیے ہمیں ان مظالم کا پتہ چلتا رہتا تھا جو ہندو اور سکھ ان قافلوں کے افراد پر ڈھایا کرتے تھے۔ لڑکے ظلم وستم کی داستانیں سن سن کر اور اپنی بے بسی پر رو رو کر تنگ آچکے تھے وہ ان تمام زیادتیوں کا یہاں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں سے انتقام لینا چاہتے تھے مگر کچھ نہ کرسکتے تھے۔ کیونکہ کالج کا ڈسپلن ان کی راہ میں حائل تھا اور کسی بڑے پیمانے پر پلان بنا کر کوئی اقدام کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کے باوجود

دو چار چار لڑکوں نے اپنے گروپ بنا کر کچھ پلان بنائے لیکن ان پر پوری طرح عمل نہ کر پائے۔

ٹیوب ویل

ایک گروپ نے سوچا کہ کالج کی واٹر سپلائی پر ایک سکھ ملازم ہے اگر وہ پانی میں زہر ملا دے تو سب مسلمان مر جائیں گے۔ کیوں نہ اسے ہی ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ لوگ سکھ ملازم کو مار دینے کے ارادے سے ٹیوب ویل کے پاس گئے جہاں اسے سوئے ہوئے پایا۔ اس نے اپنے منہ پر کپڑا تان رکھا تھا۔ ان لوگوں نے ایک بھاری پتھر اٹھایا اور اسکے سر پر مارنے والے تھے کہ گروپ میں سے کسی نے کہا ٹھہرو مجھے دیکھنے دو کہ یہ کون آدمی ہے۔ جب اُس نے اس کے منہ سے کپڑا ہٹایا تو وہ ایک باریش مسلمان نکلا۔ سکھ اس وقت ڈیوٹی پر نہ تھا۔

ہرنام سنگھ

ملٹری کالج جالندھر کا ایک مسلمان کنٹین ٹھیکیدار سب کچھ لٹا کر اور اپنے بچے قربان کر کے جہلم پہنچا اس نے اپنی درد بھری کہانی سنائی اور مسلمان لڑکوں کو طیش دلایا کہ آپ لوگوں نے ہرنام سنگھ ٹھیکیدار رکھا ہوا ہے جبکہ ہماری جائیداد اور اولاد ہندو لیڈروں نے لوٹ لی ہے۔ یہ سن کر ایک گروپ نے رات کے وقت ہرنام سنگھ کی کنٹین لوٹ لی اور سب سامان لڑکوں میں بانٹ دیا۔ تمام لڑکوں کی تلاشی بھی لی گئی مگر کسی کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملا۔ ہرنام سنگھ کنٹین کا ٹھیکہ چھوڑ کر جہلم سے چلا گیا۔

ٹلّہ کی پہاڑیاں

ایک دن ارجاسب علی میرے پاس آیا اور کہنے لگا آج ایک بہت بڑا تماشہ ہو رہا ہے جسے ضرور دیکھ آئیں۔ میں نے تفصیل پوچھی تو کہنے لگا آج سکھوں کا ایک قافلہ جہلم سے

ہندوستان جا رہا ہے۔ اور سرائے عالمگیر کے ارد گرد کے سینکڑوں دیہاتی پبی کی پہاڑیوں پر مورچے لگائے ان کے منتظر ہیں۔ لیکن ہوا یوں کہ مسلمانوں کے پبی میں مورچہ بند ہونیکی خبر لالہ موسے میں ایک ڈوگرہ پلٹن کو مل گئی۔ انہوں نے ایک صوبیدار کی کمان میں چالیس پچاس سپاہی بھیجے جنہوں نے سویلین مسلمانوں کو مار بھگایا۔ دس مسلمان مارے گئے۔ پندرہ بیس زخمی ہو گئے۔ اور باقی بھاگ گئے۔ جائے حادثہ پر پہنچ کر ہمیں بڑا دکھ ہوا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ کچھ لوگ برلب سڑک سکھوں کا سامان لوٹنے کے منتظر تھے۔ کہ ڈوگروں نے آتے ہی ان پر دھاوا بول دیا۔ وہ لوگ اپنے مورچہ بند ساتھیوں کی طرف بھاگے ڈوگروں نے ان کا پیچھا کیا اور اپنی سنگینوں سے ان کو کاٹ کر رکھ دیا۔ جن مورچہ بند مسلمانوں کے پاس بندوقیں اور گرنیڈ تھے وہ بھی اس افراتفری میں اپنے ہتھیاروں کو صحیح طور پر استعمال نہ کر سکے۔ مرنے والوں اور زخمیوں کی چیخ و پکار نے وہ دہشت پھیلائی کہ سب لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔

جب ہم سرائے عالمگیر پہنچے تو عجب سماں تھا۔ ایک طرف سے لوگ مجاہدوں کا کھانا لا رہے تھے تو دوسری طرف سے لاشیں لائی جا رہی تھیں۔ ایک طرف سے اللہ اکبر کے نعرے گونج رہے تھے تو دوسری طرف سے مردہ باد کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم دونوں واپس کالج پہنچے اور فیصلہ کیا کہ اگر ہمیں کہیں سے ہتھیار مل گئے تو ہم پبی کی پہاڑیوں میں جائیں گے اور مرنے والوں کا بدلا لیں گے۔ چنانچہ مسلم لیگ اور نیشنل گارڈ سے رابطہ قائم کیا گیا مگر کہیں سے ہتھیار نہ مل سکے دوسرے دن جب سکھوں کا قافلہ کالج کے پاس سے گزرا ہم برلب سڑک کھڑے تھے۔ وہ نعرے مارتے ہوئے اور ہماری جانب اشارے کرتے ہوئے گزرے تو ہمیں بڑا دکھ ہوا اور ہم بے بسی کے عالم میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

گنّے کا پھوک

پاکستان بننے کے فوراً بعد ہندوستان سے آئے لٹے پٹے قافلے کالج کے سامنے کی جی ٹی

روڈ سے گزرتے رہتے تھے۔ جب کبھی وقت ہوتا ہم برڈوڈ ہاؤس کی طرف کے گیٹ سے لگے یہ دلدوز منظر دیکھتے رہتے۔ ایک روز مغرب کی نماز کے وقت میں وہاں اکیلا کھڑا تھا کہ مہاجروں کی ایک بیل گاڑی سامنے آکے رکی۔ گاڑی بان نے پکار کے کچھ کہا۔ نہ بیچ کا فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے میں سن نہ سکا۔ کہ اس نے کیا کہا۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں تھا کہ اس آدمی نے اگر مجھ سے کچھ کہا تو کیا کہا۔ کہ اتنے میں بیل گاڑی سے دو چھوٹے بچے اترے اور سڑک کے کنارے پڑے گنے کی گنڈیریوں کے پھوک کو جلدی جلدی اٹھا کے چوسنے لگے۔ بھلا پھوک میں رس کہاں۔ مگر بھوکے بچے جس ذوق و شوق سے پھوک کو چوس رہے تھے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے بھی نعمت سمجھ رہے ہیں اس خاندان کے دوسرے لوگ بچوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ بھی پھوک چوسنے کی کوشش کرتے۔ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر مجھے رونا آیا۔ میں نے گاڑی بان سے پوچھا رات کہاں بسر کرو گے وہ بولا۔ یہیں کہیں جہاں سر چھپانے کو جگہ مل جائے یا پھر کھلے آسمان کے نیچے۔ ہم اسی طرح یہاں تک پہنچے ہیں۔ میں نے کہا۔ تم لوگ کچھ دیر سرائے میں ٹھہرو۔ ان لوگوں کی بیکسی دیکھ کر میں بے چین ہو گیا تھا۔ میں فوراً ہاؤس آیا۔ میں کیڈٹ کوارٹر ماسٹر تھا۔ میس کا راشن میرے کنٹرول میں تھا۔ میں نے دو چار دوستوں کو صورت حال سے آگاہ کیا پانچ سات آدمیوں کا پکا ہوا راشن یعنی کھانا میس سے لیا۔ اتنے ہی آدمیوں کا۔ آٹا۔ گھی اور چاول وغیرہ کچا راشن، دودھ کی بالٹی یہ سب سامان لے کر جب ہم سرائے کے راجہ بازار کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ وہ لوگ ایک دکان کے سائبان کے نیچے اس طرح بیٹھے تھے جیسے وہ کسی مرنے والے کا ماتم کرنے بیٹھے ہوں۔ خاموش، اداس اور بے حس کھانے پینے کا اتنا سامان جب میں نے ان کے سامنے رکھا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ دراصل انھیں یقین نہیں تھا کہ میں کچھ لے کر واپس آؤں گا۔ جب غیر متوقع طور پر اتنا بہت سا کھانا اور سامان اپنے سامنے دیکھا تو شادی مرگ کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ بچے تو فوراً کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ تین چار بوڑھے

مرد اور دو بوڑھی عورتیں ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگے۔ شاید وہ میرا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن شدت جذبات سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ میں وہاں سے جلد چلا آیا تاکہ وہ اطمینان سے کھانا کھا لیں۔

اس واقعہ نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ لیکن جب میں نے ان مظالم کی لرزہ خیز داستانیں سنیں جو تقسیم ہند کے وقت بے گناہ مسلمانوں پر ڈھائے گئے تھے۔ تو مجھے احساس ہوا کہ جس واقعہ کو اتنا بڑا حادثہ سمجھ رہا تھا وہ اصل حادثات کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ بہرحال میرے دل و دماغ پر قیام پاکستان کے وقت کے واقعات وحادثات نے بڑا گہرا اثر ڈالا۔ اور جب میں نے باقاعدہ فوجی وردی پہنی تو میری سوچ ہی اور تھی۔

کالج کے آخری ایام

میں آرمی اسپیشل پاس کر کے کمیشن کی تیاری کر رہا تھا۔ اور قیام پاکستان کے وقت کے واقعات کے جذباتی اثرات سے گزر ہی رہا تھا کہ اوائل ۱۹۴۸ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں اُلجھ کر بے قصور لیکن ایک اصول کی خاطر مجھے کالج کے تین اور دوستوں ... احمد اقبال، ۱۰۳۹ محمد خاں، ۱۰۴۰ امان اللہ کے ساتھ کالج کو خیر باد کہنا پڑا۔ کچھ عرصہ سرگشتہ و پریشان رہنے کے بعد ہم تینوں اقبال، محمد خاں اور مجھے کمیشن مل گیا۔ امان اللہ بھی نیشنل گارڈ میں چلے گئے تھے۔ کالج سے ہم چاروں کے نکالے جانے کی ڈرامائی داستان میں نے کالج کی ہسٹری کے لیے علیحدہ قلم بند کی ہے۔

فوج کی زندگی

۱۰ فروری ۱۹۵۱ء کو ریگولر کمیشن حاصل کر کے میں پاکستان آرٹلری میں لفٹیننٹ ہوا بعض دوستوں نے کہا کہ توپ خانہ میں جا کر میں نے غلطی کی ہے۔ منجملہ اور باتوں کے ان کی

کی بڑی دلیل یہ تھی کہ چونکہ توپخانے میں حساب کا کام زیادہ ہوتا ہے۔اس لئے انفنٹری یعنی پیدل فوج میں جانا چاہیے تھا۔ جہاں جسمانی برتری کی وجہ سے میرے کامیاب ہونے کے زیادہ امکانات تھے۔ ان کی بات معقول تھی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ جس کو واپس لانا ممکن نہ تھا بہرحال آرٹلری کو ایک چیلنج سمجھ کر میں نے نہایت جانفشانی سے کام کیا اور نہ صرف ایک کامیاب آرٹلری افسر بنا بلکہ آرٹلری افسروں کو پڑھانے کے لیے آرٹلری سکول میں انسٹرکٹر منتخب ہوا۔ اس کے بعد میں نے سٹاف کالج کوئٹہ کا کورس کیا اور بہت اچھا نتیجہ حاصل کیا۔ سٹاف کورس کرنے کے بعد آرٹلری میں مجھے بہت کم عرصہ رکھا گیا اور یکے بعد دیگرے بڑے اہم انفنٹری عہدوں پر آزمایا گیا۔

کشمیر کی جھڑپیں

۱۹۶۳ میں مجھے کشمیر کے محاذ پر برگیڈ میجر لگایا گیا۔ ۱۹۶۴ میں، میں نے مقبوضہ کشمیر میں مختلف جگہوں پر شبخون مارنے میں اپنے کمانڈر کی مدد کی جس کا اعتراف انہوں نے ان الفاظ میں کیا۔

میجر اکبر نے برگیڈ میجر ہونے کی حیثیت سے کشمیر میں بڑی محنت اور دیانتداری سے کام کیا اور نہایت مشکل حالات میں کارکردگی کا ایک بلند معیار قائم کیا۔ جن دیگر افسروں کو میجر اکبر کے ساتھ کام کرنے یا ملنے کا اتفاق ہوا وہ سب اس افسر کی فرض شناسی، مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت اور محنت سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ میجر اکبر میں بہت سی خوبیاں سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہیں جو فوج میں اس افسر کو بہت بلند عہدے پر لے جائیں گی۔ کشمیر کی بلاعنوان لڑائی میں میجر اکبر کے کارنامے قابل تعریف ہیں جنہوں نے پورے برگیڈ میں ایک نیا جذبہ پھونک دیا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ اور امتیازی سند

۶۵-۱۹۶۴ء میں مجھے ایک انڈیپنڈنٹ بریگیڈ گروپ میں بریگیڈ میجر کی ڈیوٹی سونپی گئی۔ وہاں ہم نے سلیمانکی کے محاذ پر ۱۹۶۵ء کی جنگ لڑی۔ سلیمانکی محاذ پر میرے ساتھ بریگیڈیئر ریٹائرڈ محمد اکرم ظفر کالج نمبر ۲۳ ۲۱ کمپنی کمانڈر تھے۔ میری کارکردگی سے میرے کمانڈ اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے میرا نام ستارہ جرأت کے لیے بھیجا مگر مجھے امتیازی سند عطا کی گئی۔ بریگیڈ کمانڈر نے میرے کام کو ان الفاظ میں سراہا۔

میجر اکبر نہایت قابل اور بالغ النظر افسر ہیں۔ بریگیڈ میجر کی حیثیت سے ان کا کام امن اور لڑائی کے دوران قابل ستائش رہا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی تحمل مزاجی سے سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت ہر مشکل پر قابو پانا ہے جس سے ان کے اردگرد کے لوگ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لڑائی کے دوران میجر اکبر نے بردباری اور خود اعتمادی کا قابل مثال مظاہرہ کیا اور اپنے کام پر مکمل گرفت رکھی۔ میدان جنگ کی مختلف چالوں پر انہیں پورا عبور حاصل رہا اور ان کی رائے ہمیشہ بڑی وزنی اور صحیح ثابت ہوئی یہ افسر قوت کا معیار ثابت ہوا اور میرے خیال میں ۱۹۶۵ء کی لڑائی میں اس کی کارکردگی پر بجا طور پر ناز کیا جا سکتا ہے۔ فائر بندی کے وقت اس افسر نے دشمن کا دس مربع میل علاقہ حاصل کرنے کی بڑی اچھی تجویز پیش کی۔ مگر میں نے کہا کہ اتنا بڑا علاقہ فتح کرنے کیلئے نہ تو ہمارے پاس فوج ہے اور نہ کوئی تجربہ کار کمانڈر۔ میجر اکبر نے یہ خطرناک مہم اپنے ذمہ لے لی اور فقط چند آدمیوں کے ساتھ دشمن پر اس پھرتی اور اس شدت سے حملہ کیا کہ ہندوستان کی کئی گنا زیادہ فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس حملے میں میجر اکبر نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر ایک خطرناک مہم سر کی اور دس مربع میل علاقہ تقریباً اکیلے فتح کیا۔

۱۹۷ کی جنگ

۱۹۷۰ء کے سلیکشن بورڈ میں بریگیڈیئر بننے کیلئے میرا انتخاب ہو چکا تھا. مگر اس وقت کافی جونیئر تھا. چنانچہ ۱۹۷۱ء کی لڑائی میں مجھے ایک انفنٹری ڈویژن کا کرنل سٹاف بنایا ابا. ہماری ڈویژن کو مشرقی پاکستان بھیجا گیا۔ اور ہم راجشاہی بوگرہ رنگ پور کے علاقے بں تعینات کیے گئے۔ اس سیکٹر میں میجر شہید محمد اکرم کا بج نمبر ۱۸۱۱ نشان حیدر اور لفٹیننٹ کرنل ریٹائرڈ عبد اللہ خان ۷۹۶ اور لفٹیننٹ کرنل ریٹائرڈ محمد حسین بھٹی ۸۹۲ میرے ساتھ تھے۔ کچھ عرصہ مجھے ایک بریگیڈ کی کمان بھی سونپی گئی۔ میرے جنرل افیسر کمانڈنگ مجھے اعلیٰ کمانڈ کا مستحق سمجھتے تھے۔ اور بہادری کے تمغے کے لیے بھی میرا نام بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جنرل نذر نے ان الفاظ میں ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بارے میں میری کارکردگی پر اظہار خیال کیا۔

کرنل اکبر بہت قابل، محنتی اور وفادار افسر ہے جس کی کارکردگی ۱۹۷۱ء کی لڑائی بیں بہت عمدہ رہی۔ ہر مشکل میں یہ خاموش طبیعت، متحمل مزاج اور صبر و استقلال کا ستون ثابت ہوا. کرنل اکبر کا حوصلہ اور اس کی قوت برداشت ناقابل شکست ہیں۔ اس افسر نے پوری لڑائی میں بہادری اور جانفشانی کی عمدہ مثالیں قائم کیں اور کئی مرتبہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر دشمن کی چالوں کو ناکام بنا دیا. لال منیر ہاٹ سیکٹر میں جبکہ دشمن بڑی تعداد میں ہمارے علاقے میں گھس آیا تھا اور ہماری بہت ساری پوسٹیں گھیرے میں آ چکی تھیں. میں نے کرنل اکبر کو اس سیکٹر کی کمان سونپی۔ اس افسر نے بخوشی سیکٹر کی کمان سنبھال لی اور کرنل اکبر کا نام سن کر گھیرے میں آئے ہوئے لوگوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور دو تین دنوں میں دشمن کا صفایا کر دیا گیا۔ کرنل اکبر کو بلند اخلاق خوش مزاج اور فرض شناس ہونے کی وجہ سے تمام افسر قابل احترام سمجھتے تھے۔

اور پوری لڑائی میں یہ افسر میرے لیے جرأت کا نشان ثابت ہوا۔

الوداع اے فوج ۔ اے جانِ جاں الوداع !

ہم نے اپنے علاقے میں دشمن کو کامیابی سے روک لیا تھا۔ مگر کومیلا میمن سنگھ کے راستے دشمن ڈھاکہ پہنچ گیا۔ اور سب سے بڑے کمانڈر نے مشرقی پاکستان میں لڑنے والی فوج کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا۔ اس طرح ہمیں قید کی ذلت اٹھانی پڑی۔ دو سال قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے کے بعد جب وطن عزیز میں دوبارہ قدم رکھا تو حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ جانِ جاں فوج سے بچھڑنا پڑا لیکن صحیح قدم اٹھا کے کبھی ہم پچھتایا نہیں۔ ایک اصول پر اپنے شاندار کیریر کو قربان کر کے کبھی ملال نہیں ہوا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس روایت کو میرے چھوٹے بھائی ۲۰،۴۲ بریگیڈئر محمد اشرف نے بھی قائم رکھا۔ انھوں نے بھی اپنے ضمیر کی آواز کو سرخ پٹی سے زیادہ اہمیت دی۔

ہماری عدم صرف اتنی خطا ہے
خلاف روایات کرتے رہے ہیں

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد یعقوب ملک

ستارۂ جرأت، آرٹلری

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمّد یعقوب ملک ستارۂ جرأت آرٹلری

کرنل یعقوب ملک کا تعلق اعوان قبیلے سے ہے جو زیادہ تر ضلع جہلم، کوہستان نمک کے علاقے میں صدیوں سے آباد ہے۔ پیشہ آباؤ اجداد بھی ایک عرصے سے سپاہ گری ہے۔ ان کے دادا ملک ہاشم خان بھی فوج میں تھے۔ اپنے زمانے کے نامور اتھلیٹ تھے۔ انھوں نے انڈین آرمی میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ کرنل یعقوب ملک کے والد مرحوم صوبیدار نیک محمد نے ۲۴ بلوچ رجمنٹ میں خدمات انجام دی تھیں۔ انھیں آئی ڈی ایس ایم کا جنگی اعزاز بھی ملا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں انھیں جارج پنجم کا اے ڈی سی منتخب کیا گیا تھا انڈین آرمی کے کسی وی سی او کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ بادشاہ کا اے ڈی سی تمام آرمی سے چنا جاتا تھا۔ اس انتخاب سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے عہدے اور پیشے میں کس پائے اور شان کے آدمی تھے۔ افسوس کہ ان کی ناگہانی موت نے انھیں یہ اعزازی خدمت انجام دینے کا موقعہ نہیں دیا۔ ۱۹۳۹ء میں صوبیدار نیک محمد کی وفات کے وقت یعقوب ملک کے بڑے بھائی محمد ایوب کالج

میں زیرِ تعلیم تھے۔ صدبیدار مرحوم کے افسروں نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر محمد ایوب کو ڈائرکٹ وی سی او یعنی جمعدار بنا کے فوج میں بھرتی کر لیا۔ نائب صوبیدار محمد ایوب بھی بڑے جیالے اور جی دار تھے انھوں نے مئی ۱۹۴۵ میں برما کے محاذ پر عین عالم جوانی میں جان دی۔ انھیں بھی مرنے کے بعد ایم، آئی، ڈی کا اعزاز ملا تھا۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم

اس سلسلے میں کرنل یعقوب ملک لکھتے ہیں۔

ہمارا آبائی گاؤں خیر پور ہے جو ضلع جہلم میں واقع ہے۔ میں اگست ۱۹۲۹ء کی ۴ تاریخ کو اسی گاؤں میں پیدا ہوا۔ ابتدائی بچپن خیر پور میں کھیلتے کودتے گزرا۔ کہا جاتا ہے کہ میں بچپن میں خاصا شرارتی تھا۔ بلکہ خطرناک شرارتیں کرتا تھا اس لیے والدین میری خصوصی دیکھ بھال کرتے تھے۔ کہیں کسی پیڑ سے گر کر یا کوئی اور گڑبڑ کر کے اپنے ہاتھ پیر نہ توڑ لوں۔ جب ذرا بڑا ہوا تو جہاں والد کی پوسٹنگ ہوتی وہ تعلیم و تربیت کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے۔ اس طرح بچپن میں مجھے کئی شہر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ بچپن میں کھیلوں کا بہت شوق تھا۔ خصوصاً ہاکی کا تو میں دیوانہ تھا۔ ملٹری کالج میں داخلے سے پہلے، پرائمری کی تعلیم میں نے کراچی، بنوں، جہلم اور (والد کی وفات کے بعد) خیر پور میں حاصل کی۔

بچپن کا ہیرو

ویسے تو بچپن کی عمر ہی اثرات قبول کرنے کی ہوتی ہے۔ ہر واقعہ ذہن پر ایک نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ہر شخص جو ملتا ہے ذہن کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتا ہے۔ لیکن اب جب میں، اپنی زندگی کے اس دور کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں ایک ہی تصویر ابھرتی ہے، ایک ہی چہرہ سامنے آتا ہے اور یہ چہرہ میرے والد کا

ہے۔ حالانکہ جب ان کا انتقال ہوا تو میری عمر نو دس برس سے زیادہ نہیں تھی لیکن یہ نو دس برس کم و بیش میں نے ان کے ساتھ گزارے۔ اور ہر لحاظ سے انھوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ بلکہ اس وقت بھی جب میں خود افسر بن چکا تھا وہ اکثر ایک مثالی فوجی اور ایک مثالی انسان کے طور پر مجھے یاد آئے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ شاید بچپن میں، ان سے اتنا مانوس نہیں تھا۔ بڑے ہو کر شعور کے زمانے میں، میں نے انھیں زیادہ سمجھا اور زیادہ عزت کی۔ جسمانی طور پر تو نہایت مضبوط اور شاندار تھے ہی۔ کردار بھی شاندار تھا۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ لیکن ذہن صاف تھا۔ کیا کرنا ہے اور پہلے کرنا ہے کس کام کی کتنی اہمیت ہے یہ خوب جانتے تھے۔ منزل اور سمت کا احساس، ترجیحات کا احساس کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ چیز ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھی۔ ارادے اور دھن کے پکے تھے۔ جس کام کو ضروری سمجھتے اسے کرکے چھوڑتے تھے انھوں نے اپنے آپ کو خود بنایا تھا۔ پھر دین و دنیا دونوں کو نبھاتے تھے۔ ایک پہر رات گئے اٹھتے تھے۔ پابندی سے تہجد پڑھتے تھے۔ پھر دفتری کام کرتے اس کے بعد صبح کی نماز اور پھر نوکری پر جانے کی تیاری۔ اپنے کام پر حاوی تھے سوچ سمجھ کر بات کرتے تھے اور اپنے منصب کے وقار کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ ان کی ان خصوصیات کی وجہ سے ان کی بات ان کے انگریز اور دیسی افسر توجہ سے سنتے تھے۔ اپنے رینک میں ان کا شمار بہترین افسروں میں ہوتا تھا۔ اسی امتیاز کی وجہ سے انھیں پوری انڈین آرمی سے بادشاہ وقت کا اے ڈی سی منتخب کیا گیا تھا۔

مجھے انھوں نے بہت پیار اور توجہ سے پرورش کیا۔ اور میری عادات کی تربیت کا انھوں نے خصوصی خیال رکھا۔ میں آج جو کچھ ہوں اور جو کوئی اعزاز بھی میں نے حاصل کیا ہے۔ وہ سب کچھ ان کی رہ نمائی اور تربیت کی وجہ سے ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے بچے سیدھی راہ چلو، اور جم کے چلو، اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا سیکھو اور

اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرو۔ کسی سے کچھ نہ مانگو۔ اپنوں سے بھی بیجا توقعات نہ رکھو، محنت کرو، دیانت داری سے محنت کرو۔ اسی میں بہتری، بھلائی اور کامیابی ہے۔
یہ باتیں نئی نہیں لیکن میں نے ان ہی سے سیکھیں اور انہی کو ان کی مثال پایا۔
ان سے میں نے یہ بھی سیکھا کہ قومی، اور اجتماعی مفاد اور معاملات کو اپنے ذاتی مفاد اور معاملات پر ترجیح دینی چاہیے وُہ دلیر تھے۔ جرأت رکھتے تھے صحیح بات پر اڑ جاتے تھے اور میدان جنگ کے شیر بھی تھے۔ وزیرستان آپریشن میں حصّہ لیا اور خوب داد شجاعت دی۔ ان کی جرأت کے افسانے میں نے ان کے مرنے کے بہت عرصے بعد تک سنے۔
اپنے والد کا تذکرہ میں نے اتنی تفصیل سے اس لیے کیا ہے تاکہ میں یہ بتا سکوں کہ میرے ستارہ جرأت میں میرے والدین کا خون جگر اور ان کا کردار بھی شامل ہے۔
آگے چل کر میں اپنے کالج اور اپنے ان معزز استادوں کا تذکرہ بھی کروں گا جنکی تعلیم و تربیت نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جس کی داغ بیل میرے والدین نے ڈالی تھی۔

ملٹری کالج میں داخلہ۔ کاروان زندگی کی ایک اہم منزل

اس دور کے بارے میں کرنل یعقوب ملک لکھتے ہیں۔

میں ملٹری کالج میں ۱۹۴۱ میں چھٹے درجے میں داخل ہوا۔ مجھے ۹۷۱ کالج نمبر ملا اور برڈ وڈ ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری سیکشن کا نمبر چھ تھا۔ اپنے والد کی تربیت کی وجہ سے اپنی پڑھائی اور ڈسپلن کے بارے میں میں شروع سے سنجیدہ تھا۔ اور نہایت ذمہ داری سے رہا کرتا تھا۔ اس لیے سزا سے بچا رہا۔ اگرچہ تمام کھیلوں اور اسپورٹس میں شوق سے حصہ لیتا تھا لیکن میری خصوصی دلچسپی ہاکی

اور باکسنگ میں تھی۔ کالج میں سب سے اونچا عہدہ جو میں نے حاصل کیا وہ راٹس ہاؤس میں سارجنٹ میجر کا عہدہ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں، میں نے آرمی اسپیشل کا امتحان پاس کیا اور اپریل ۱۹۴۹ء میں مجھے پی ایم اے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ آرمی اسپیشل سے کمیشن کے لیے منتخب ہونے تک کا ڈیڑھ برس کا عرصہ میں نے، آرمی کلاس میں کمیشن کی تیاری میں گزارا۔

ایک تجرباتی شرارت

یہ واقعہ ۱۹۴۸ء کے اوائل کا ہے میں آرمی کلاس میں کمیشن کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک روز کلاس میں ہمت اور جرأت کی بات چل نکلی۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ جس میں گٹس نہیں وہ کچھ بھی نہیں۔ چونکہ میں اب تک پھونک پھونک کے قدم رکھتا رہا تھا۔ اور کسی ڈسپلن کے کیس میں نہیں پھنسا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے دوست میرے اوپر خاموش طنز کر رہے ہیں تعجب اگر تیرے اندر بھی کچھ گٹس ہیں۔ تو پھر کوئی ہاتھ دکھا۔ پتہ نہیں وہ کیا لمحہ تھا کہ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں بھی اپنے گٹس کا مظاہرہ کر کے دکھاؤں گا۔ کوئی اور بات تو ذہن میں آئی نہیں یہ خیال آیا کہ آج رات کالج اسپتال کی نرس، مس سدھو کے گھر میں گھس کر ان کو ڈرایا جائے۔ ان کے صحن میں پھلوں کے چند درخت بھی تھے۔ کچھ ان پر بھی ہاتھ صاف کرنا تھا۔ مس سدھو کا کوارٹر اسپتال سے ملحق ہی تھا۔ زیادہ رات نہیں گزری تھی کوئی دس گیارہ بجے کا وقت تھا کہ ہم تین دوستوں ـــ میں، افتخار قریشی اور عبدالجبار ـــ نے اپنا حملہ شروع کر دیا۔ چونکہ ناتجربہ کار تھے اس لیے غلط وقت چنا۔ دس بجے کا وقت اس طرح کی کارروائی کرنے کا نہیں ہوتا۔ مس سدھو کا نوکر کچن میں برتن صاف کر رہا تھا۔ اس نے دیکھ لیا۔ اسپتال کا نرسنگ اردلی نور خاں بھی پتہ نہیں کہاں سے آن ٹپک پڑا۔ بہرحال ہم بھاگے۔ دشمن نے ہمارا پیچھا کیا اور ہماری کمین گاہوں کا پتہ چلا

بیا۔ اور پھر وہی چکر چلا۔ جس کی توقع تھی۔ صبح کو کمانڈانٹ میجر اورنگ زیب خان کے سامنے یش ہوئے۔ شاید ان کو اندازہ ہو گیا کہ ہم نے یہ ڈرامہ کیوں کیا تھا بہرحال شکر ہے کہ وں نے ہمیں سمجھا بجھا کے چھوڑ دیا۔ ورنہ اگر یہی حرکت ہم نے سال بھر پہلے کرنل اسٹیبنگ ، زمانے میں کی ہوتی تو کالج سے نکلے بغیر ہرگز نہ بچتے۔ ڈسپلن کے معاملہ میں اسٹیبنگ ت سخت تھا۔

ٹیبنگ میں کونسا سرخاب کا پر تھا

کرنل اسٹیبنگ کا ذکر آجائے اور ان کے عہد کا کوئی طالب علم ان کو یاد کئے بغیر ؐگے بڑھ جائے۔ ناممکن۔ سوچنے کی بات ہے سٹیبنگ باہر کا آدمی تھا۔ انگریز، غیر ملکی سلطنت برطانیہ کا وفادار اور یہ نہیں کہ فرشتہ ہو، اس میں خامیاں بھی تھیں پھر کیا وجہ تھی کہ اس کا اتنا زبردست اثر پڑا۔ کہ جو ہے اسٹیبنگ اسٹیبنگ کرتا ہے۔ اس مسئلہ پر میں نے لے اپنی کرنیلی کے زمانے میں بہت غور کیا۔ جس نتیجے پر میں پہنچا وہ عرض کرتا ہوں۔

سب سے پہلے یہ کہ وہ اندر باہر سے ایک تھا۔ کھرا، سچا۔ ہم سب کو شعوری اور لاشعوری طور پر یقین تھا کہ یہ شخص مخلص ہے۔ ہماری بھلائی چاہتا ہے۔ کوئی اس پر ریاکاری کا شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے مقاصد محدود تھے۔ ذہن کو سوچنے کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ طلبہ کی تخلیقی قوتوں کے پروان چڑھنے اور انفرادیت کے اظہار کی سہولتوں کا فقدان تھا۔ لیکن جفاکشی، ذمہ داری، جرأت، دیانت اور وفاداری کی قدروں کو اس باکمال شخص نے ہمارے کردار کی بنیاد بنا دیا۔ باکمال میں نے اس لیے کہا کہ اس میں لیڈرشپ کی اتنی قوت اور صلاحیت تھی کہ اس نے ان قدروں کی تربیت کے لیے ایک سسٹم یا نظام زندگی وضع کیا اور اس نظام میں جان ڈالی ایک اچھے لیڈر کی طرح سب سے پہلے خود اس کی مثال قائم کی۔ جو کہتا وہ کر کے دکھاتا۔ یہ معمولی بات نہیں۔

اسٹیبنگ میں یہ خوبی تھی۔ کبھی کبھی جاڑوں میں سوئمنگ پول کے ٹھنڈے یخ پانی میں کیڈٹ آفیسرز کو ڈبکی لگانے کی سزا یا مشق کا حکم ملتا تھا۔ تو جناب۔ اسٹیبنگ بھی وہاں موجود ہوتا بلکہ خود تیرتا۔ صبح بہت سویرے ریوالی کے فوراً بعد کیڈٹ آفیسرز کا انسپکشن فلیگ اسٹاف پر ہوتا تھا۔ مجال ہے کہ کبھی اسٹیبنگ کو وہاں ایک منٹ کی بھی دیر ہو جائے۔

یوں تو سارے انسان ہی انصاف اور دیانت داری کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن نوعمر طلبہ اس سلسلہ میں زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ نااہل آدمی کو تو برداشت کر لیتے ہیں لیکن بے انصاف یا بد دیانت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ حضرت علی مرتضیٰ کا قول ہے کہ کفر سے تو حکومت قائم رہ سکتی ہے لیکن بے انصافی سے نہیں۔ یہ بات ہر سطح کے صاحب اختیار لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے۔

تو مختصر یہ ہے کہ اسٹیبنگ میں یہ صفات تھیں جن کی وجہ سے وہ اتنا مقبول تھا۔ مقبولیت ذات سے نہیں صفات سے ہوتی ہے۔ اسٹیبنگ میں کوئی اور سرخاب کا پر نہیں لگا تھا۔ اگر تھا تو یہی جفاکشی۔ خلوص۔ دیانت۔ ایثار کا پر۔ میں نے سنا ہے کہ آگے چل کر اسی ملٹری کالج میں کرنل رفیق بھی بہت مقبول و محمود ہوئے۔ ان کے اولڈ بوائز ان کے گن گاتے ہیں۔ کیوں۔ ان کے کردار اور قدروں کی وجہ سے۔"

کمیشن سے جنگ ستمبر تک

۱۹۴۹ء کرنل یعقوب ملک کمیشن کی ابتدائی تربیت کے لیے پری کیڈٹ اسکول کوئٹہ گئے۔ وہاں تقریباً چھ مہینے گزار کر پی ایم اے کاکول گئے۔ وہاں سے اچھی پوزیشن کے ساتھ اگست ۱۹۵۱ء میں پاس آؤٹ ہوئے۔ اس کے بعد آرمی کے مختلف کورسز کرتے رہے۔ اس طرح سے کل گیارہ کورس کئے۔ جن میں سے دو قابل ذکر ہیں۔ انٹیلی جنس کورس اور سنیئر آفیسرز ایڈمنسٹریشن کورس جن مناصب پر

کرنل ملک فائز رہے ان کی تفصیل یہ ہے ۔ چند برس تک اپنی یونٹ میں اسٹاف کام کیا۔ ڈویژن ہیڈ کوارٹرز میں تین سال تک ڈپٹی اسسٹنٹ ایجوٹینٹ جنرل اور کوارٹرماسٹر جنرل کے فرائض انجام دیئے لیفٹیننٹ کرنل کی حیثیت سے دو اہم یونٹس کی کمان کی۔ آرٹلری کے عارضی کمانڈر بھی رہے۔ آرٹلری کمانڈر بریگیڈئر کے عہدے کا ہوتا ہے ۔اس منصب پر کرنل ملک کی عارضی تقرری بھی ان کے لیے ایک اعزاز تھا۔ستمبر ۱۹۶۵ء میں کرنل ملک نے سیالکوٹ سیکٹر میں جنگ میں حصہ لیا۔لیکن کرنل ملک کی عسکری زندگی کا بہترین لمحہ وہ تھا جب انھیں دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان میں اپنا زور بازو دکھانے کا موقعہ ملا۔ یہ اشوگنج بھاب بازار کا معرکہ تھا۔ اس میں مثالی کارکردگی کے لیے انھیں ستارہ جرات سے نوازا گیا اور جرات کی تعریفی سند (کمنڈیشن سرٹی فیکٹ فار گیلنٹری) بھی عطا ہوئی۔

اشوگنج کا معرکہ

اس کی تفصیل خود کرنل ملک سے سنئے۔

مارچ ۱۹۷۱ کی بغاوت میں کومیلا کینٹ کے گیریزن کمانڈر کی حیثیت سے میں نے اس چھاؤنی کا کامیاب دفاع کیا تھا۔ دسمبر ۷۱ء میں اشوگنج کے مقام پر جو ٹینک لڑائی ہوئی اس میں، میں بریگیڈئر سعد اللہ خان ہلال جرأت کے ساتھ شریک کار زار تھا۔ اشوگنج میں دشمن ہماری پوزیشن کو تقریباً پامال کر چکا تھا۔ دشمن نے ایک بٹالین اور ٹینکوں کی مدد سے بھرپور حملہ کیا۔ اس حملہ کو ناکام بنانے اور اشوگنج پوسٹ کا کامیاب دفاع کرنے میں میرے توپ خانے نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اس لڑائی میں پندرہ ہندوستانی ٹینک اور کم از کم ایک سو ہندوستانی سپاہی مارے گئے تھے۔اب میں اپنی تعریف میں کیا کہوں۔ بہر حال کچھ کیا ہی ہوگا ۔

جس کے صلے میں مجھے ستارۂ جرأت عطا ہوا۔

یہ امیجیٹ (فوری) ایوارڈ تھا۔ اس کی کاغذی کارروائی اختتام جنگ سے چند روز پہلے شروع ہوئی تھی۔ پھر تو سارا نظام مواصلات ہی درہم برہم ہوگیا اور وہ کاغذات بھی گم ہو گئے۔ پھر جنگی اسیری کا دور شروع ہوا۔ اپریل ۴، ۱۹ء میں ۔ جب ایران جنگ واپس آئے تو میجر جنرل عبدالمجید جی او سی ۱۴ ڈویژن نے دوبارہ میرے ایوارڈ کے کاغذات مرتب کئے۔ اور ۴، ۱۹ کے اواخر میں مجھے باضابطہ طور پر ستارہ جرأت کا اعلان ہوا۔

تبصرہ

چرچل کا ایک مشہور فقرہ ہے کہ لائف از اے ہول، اور لک از اے ہول آخر کار انسان کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ اس امر پر ہوتا ہے کہ اس نے زندگی سے کیا لیا اور زندگی کو کیا دیا۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کرنل ملک سے پوچھا۔ اب جبکہ آپ اپنی اننگز کم وبیش کھیل چکے ہیں آپ کا کیا احساس ہے۔ ہارے کہ جیتے یہ سوال سن کر پہلے تو کرنل ملک کچھ چونکے۔ پھر بڑے اطمینان اور اعتماد سے کہا۔

راشد صاحب، اللہ کا شکر ہے کہ زندگی سے شرمندہ نہیں ہوں۔ جتنا کچھ دے سکتا تھا ذوق و شوق سے دیا۔ جھولی میں جو کچھ تھا وہ قوم و ملک کی نذر کر دیا۔ جس طرح اور جتنی ہو سکی انسانوں کی خدمت کی۔ میں اپنے رب کے سامنے اپنا حساب پیش کرنے کو تیار ہوں۔ اور اس سے اس کے کرم بلکہ رحم کا طلب گار ہوں۔ آخر میں یہ کہ آج میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ تھوڑا بہت حاصل کیا اسکے لئے میں اپنے بہت ہی نیک والد مرحوم صوبیدار نیک محمد اور کالج کا ممنون ہوں۔ خدا کالج کو سدا پھولا پھلا رکھے اسکو پاکستان کی تعمیر و ترقی کا وسیلہ بنائے۔ اور اسکے ذرے ذرے سے تعمیر حرم ہو۔ آمین۔

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) محمد اکبر خان، امتیازی سند

بریگیڈئر (ریٹائرڈ) محمّد اکبر خان امتیازی سند

آزاد کشمیر کے ضلع پونچھ میں ایک معروف تحصیل پلندری ہے۔ جس کے علاقے میں ایک کوہستانی گاؤں ہے جھنڈا بگلا۔ اس چھوٹے سے گاؤں بگلا کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں بڑے بڑے سورما پیدا ہوئے۔ بریگیڈئر محمد اکبر خان کی جائے پیدائش بھی یہی گاؤں ہے اور تاریخ پیدائش ۲٦ فروری ۱۹۳۰۔

نسلی اعتبار سے ان کا تعلق اس علاقے کے مشہور قبیلے سدّھن سے ہے۔ سدّھن قبیلے کو سرزمین کشمیر کا بازوئے شمشیر زن سمجھا جاتا ہے اور عرصہ دراز سے یہ قبیلہ پیشہ سپہ گری سے وابستہ رہا ہے اور عسکری روایات کا حامل ہے۔

بریگیڈئر محمّد اکبر خان کے والد آنریزی کیپٹن برھان علی خان تھے۔ انھوں نے ۹ جاٹ رجمنٹ کے ساتھ نوکری شروع کی۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں اپنی مردانگی کے جوہر دکھاتے ترقی کرتے کرتے آنریزی کیپٹن کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور سرکار

سے او، بی، آئی کا خطاب پایا۔ جو اس زمانے کا خاصا اہم اعزاز تھا۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس آن بان کے آدمی ہوں گے اور نوکری کس انداز سے کی ہوگی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ علاقے کی سماجی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ ۱۹۷۰ میں انھوں نے عُمرِ طبعی کو پہنچ کر اِنتقال کیا۔

اپنے والد مرحُوم کے بارے میں اکبر خان لکھتے ہیں۔

ہر بیٹے کا پہلا ہیرو اس کا باپ ہوتا ہے۔ میرے والد برہان علی خان میرے پہلے ہیرو ہی نہیں آخری ہیرو بھی تھے جب میں نے آنکھ کھولی تو ان کے کشادہ اور فراخ سینے پر تمغے جھلملاتے دیکھے۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کے تمغے تھے دُوسری جنگِ عظیم میں ان تمغوں میں مزید اضافہ ہُوا۔ جن میں او، بی، آئی بھی شامل تھا۔ والد مرحُوم خاصے دراز قد تھے اور غیر معمولی طور پر وجیہہ انسان۔ سب سے پہلے انھیں ہی شاندار وردی میں دیکھ کر مجُھے وردی پہننے اور فوج میں جانے کا خیال پیدا ہُوا۔

ان کا نام برہان علی خان بھی بڑے دبدبے کا ہے۔ لیکن اصل دبدبہ ان کی شخصیت میں تھا۔ آزادی سے پہلے بہت تھوڑے مسلمان ڈوگرہ مہاراجہ کی قلمرو کشمیر میں سر اُٹھا کر چلنے کی ہمّت وجرأت رکھتے تھے برہان علی خان ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی عزت و حرمت کا علم بلند رکھا۔ ان کے اس رویّے سے دُوسرے عام مسلمانوں کا حوصلہ بھی بلند ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں مُسلمانوں کو اپنی علیحدہ قومیّت کا احساس خاص طور سے زیادہ تھا۔ جہادِ کشمیر میں پلندری راولاکوٹ کے مجاہدوں نے خصُوصی کردار ادا کیا۔ والد مرحُوم کو میں کئی اعتبار سے اپنا آئیڈیل سمجھتا ہوں۔ فوج میں نوکری کی تو بہت آن بان سے کی۔ ریٹائر ہو کر گھر آئے تو اپنی سپاہیانہ شان کو برقرار رکھا اور سارے علاقے کے لیے وسیلۂ رحمت ثابت ہُوئے۔ ۱۹۷۰ء میں اِن کا انتقال ہُوا تھا۔ آج دس گیارہ برس کے بعد بھی پلندری راولاکوٹ میں ان کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔

اصل عزت تو وہی ہے جو آدمی کے پیچھے ہو۔ خصوصاً اس کے مرنے کے بعد جب کسی کو نہ فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے اور نہ نقصان عزت کا یہ مقام حاصل کرنے کے لیے انسان کو جیتے جی بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے یہ جدوجہد خود انھوں نے بھی کی تھی اور اسی کی تلقین وہ ہمیں بھی کرتے رہتے تھے وہ کہا کرتے تھے، "اکبر! اچھا افسروہ ہوتا ہے جسے لوگ اسے اس کے یونٹ سے پوسٹ ہونے کے بعد یاد کریں اور حسرت سے یاد کریں۔ کندھے کے پھولوں کو تو ہر کوئی سلام کرتا ہے۔ مزہ تو جب ہے کہ لوگ خالی کندھے کو بھی سلام کریں۔ والد مرحوم کی زندگی میرے لیے زندگی کے سفر کے ہر موڑ پر روشن ستارہ کی طرح میرے سامنے رہی ہے۔

ابتدائی تعلیم

اکبر خان نے چھٹی جماعت تک تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول پلنڈری میں حاصل کی اسکے بعد وہ ملٹری کالج میں داخل ہو گئے۔ ملٹری کالج جہلم میں اپنے زمانہ تعلیم کے بارے میں بریگیڈیئر اکبر خان لکھتے ہیں۔

مَیں ملٹری کالج میں ساتویں درجے میں داخل ہُوا تھا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو یہ اگست ۱۹۴۱ کی پندرہ تاریخ تھی۔ ۹۶۵ کالج نمبر ملا اور پہلا ہاؤس رابرٹس ہاؤس تھا۔ کالج میں میری تعلیمی حالت بُری نہیں تھی نویں درجے کا امتحان اعزاز سے پاس کیا۔ اپریل ۱۹۴۷ء تک میں ایف ایس سی فرسٹ ائیر یا آرمی کلاس میں رہا۔ اسی سال میں نے کالج کو خیرباد کہا۔

پی۔ ایم۔ اے سے ۱۹۶۵ء تک

میرا کمیشن ۲ پی ایم اے کا ہے کمیشن کے بعد ان تمام مرحلوں سے گزر کر جن سے

ہر نیا افسر گزرتا ہے۔ ۶۳-۱۹۶۲ء میں نے اسٹاف کالج پاس کیا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں، میں سیالکوٹ سیکٹر میں ۱۹ پنجاب کی ایک کمپنی کمان کر رہا تھا۔ اسی دوران مجھے امتیازی سند عطا ہوئی۔

امتیازی سند کا فرمان

میجر محمد اکبر خاں ستمبر ۱۹۶۵ء کے دوران اپنی پلٹن کی اے کمپنی کمان کر رہے تھے۔ دشمن ان کی پوزیشن پر دس روز تک متواتر حملے کرتا رہا۔ دشمن کی اس تمام گولہ باری اور خود کار ہتھیاروں کے فائر کی زد میں ہونے کے باوجود میجر محمد اکبر خان نے غیر معمولی جرأت کا ثبوت دیا۔ وہ مکمل طور پر پُرسکون رہے۔ ان کی ذاتی مثال فرض سے لگن اور لڑائی کے صحیح مطالعہ سے ہمارے توپ خانے کو حملہ آور دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقعہ ملا اور اس طرح اس بٹالین کے محاذ پر دشمن کو پیش قدمی نہیں کرنے دی۔

اس کارکردگی کے لیے ۹ مارچ ۱۹۶۶ کو امتیازی سند عطا کی گئی۔

جنگ سے بعد کی منزلیں

جنگ ستمبر کے بعد اکبر خان لیفٹیننٹ کرنل ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں یہ ڈھاکہ میں ایسٹرن کمانڈ کے ہیڈ کوارٹرز میں کرنل اسٹاف تھے۔ بریگیڈئر کے عہدے پر ترقی پا کر اکبر خان لیہ اور دلی میں تعینات رہے۔ ۱۹۷۶ سے ۱۹۷۹ تک کوئٹہ اور کراچی لاگ ایریا کمانڈر رہے۔ اس کے بعد ۱۹۸۱ میں مظفر آباد سے نیشنل گارڈز کے سیکٹر کمانڈر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

حاصل زندگی تجربہ

آخری سوال جو ہم نے بریگیڈئر اکبر خان سے پوچھا یہ تھا۔ اب جبکہ تیس برس کے بعد

آپ نے یونیفارم کو خیرباد کہا ہے اور فوجی زندگی کو زمانہ امن اور زمانہ جنگ میں بہت قریب سے دیکھا ہے تلوار کے اس پیشے سے متعلق آپ کا وہ تجربہ کیا ہے جسے حاصل زندگی کہا جا سکے۔

ہمارے اس سوال کے جواب میں، اُنھوں نے جو کچھ کہا وہ ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے۔

تجربات و تاثرات تو بے شمار ہیں مگر وہ ایک تجربہ جو اس پیشے کے نوواردوں کے کام آسکتا ہے یہ ہے کہ زمانہ امن میں جُرأت سے صحیح قدم اُٹھانا اور اُٹھاتے رہنا جنگ میں ایک جرأت مندانہ اقدام کرنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ جنگ میں صُورتحال کا اپنا دباؤ ہوتا ہے میدان جنگ کی جُرأت اضطراری بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن زمانہ امن کی جُرأت مندی بڑی حد تک اختیاری اور شعوری ہوتی ہے۔ اس لیے اگر جنگ کی جُرأت کو یقینی بنانا ہے تو امن کے رویّوں اور کردار پر نظر رکھنی ہوگی۔ لڑائی چھڑتے ہی کوئی بزدل بہادر نہیں بن جاتا اور نہ بن سکتا ہے مختصر یہ کہ ہیرو بیرکوں میں بنتے ہیں میدان جنگ میں نہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل اصغر علی راجہ، ستارۂ جرأت

پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل اصغر علی راجہ ستارۂ جرأت پنجاب رجمنٹ

راجہ اصغر علی کا شمار ۶۵ء کی جنگ کے ہیروز میں ہوتا ہے۔ سیالکوٹ سیکٹر میں سیالکوٹ کو بچانے کی جو تاریخی جنگ لڑی گئی اس میں جسٹر پل کی کلیدی اہمیت تھی۔ ہ کی پہلی یلغار میں دشمن نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کو دشمن سے آزاد کرانے کا اہم تر فرض راجہ اصغر کی کمپنی کو سونپا گیا تھا۔ ان کی کمپنی نے جس طرح اور جن حالات میں یہ کاز انجام دیا اس نے عسکری مبصروں کو حیرت میں ڈال دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ جذبہ ایمانی بظا ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اصغر علی راجہ کا سوانحی خاکہ انہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

بزرگوں کے حالات

ہمارا نسلی تعلق چب راجپوتوں کی اس گوت سے ہے جو بھمبر اور کھاریاں کے علاقے میں عرصہ دراز سے آباد ہے۔ غالباً میرے پردادا نے بھمبر کے علاقے کو خیرباد کہہ کے تحصیل کھاریاں کے ایک گاؤں پران کو اپنا مسکن بنایا۔ پران، نہر اَپر جہلم کے مغربی کنارے پر سرائے عالمگیر سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میرے دادا نے بھی فوج میں نوکری کی تھی۔ میرے والد راجہ سجاول خاں ۱۹۱۶ء میں انڈین آرمی میں بھرتی ہوئے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں انھوں نے مڈل ایسٹ میں جنگ میں حصہ لیا۔ بعد کو وہ مہمند اور وزیرستان آپریشنز میں بھی شریک ہوئے اور دوبار جنگی مراسلوں میں جگہ پانے کا اعزاز حاصل کیا ان کا تعلق ۶۹ پنجاب سے تھا۔ ۱۹۲۲ء میں اس پلٹن کو ۲/۲ پنجاب کا نام دیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں میرے والد صاحب کو جمعداری (نائب صوبیداری) کے عہدے پر ترقی ملی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں وہ صُوبیدار ہو گئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں حسن ابدال کے مقام پر جہاں ان دنوں ان کی پلٹن تھی۔ ان کا ایک حادثہ میں انتقال ہُوا۔

راجہ سجاول خان کی شخصیّت کا جائزہ

میرے والد راجہ سجاول خاں بڑی پُر رُعب شخصیّت کے مالک تھے۔ ۵ فٹ گیارہ انچ کا قد، سُرخ و سپید رنگ، گٹھا ہُوا جسم پُر رعب چہرہ۔ بھری بھری تاؤ دار مونچھیں، گرجدار آواز وہ نام ہی کے راجہ نہیں تھے چہرے مہرے سے بھی سردار نظر آتے تھے۔ جوانی میں پہلوانوں کی طرح زور کرتے تھے۔ جسمانی قوّت کا یہ عالم تھا کہ ایک روز جسمانی توانائی کے ایک مظاہرے میں اپنے حریف محمد خاں کے مقابلے میں کنوئیں کا پورا ہٹ

اٹھا کر دکھادیا۔ ہمارے آبائی گاؤں پہ ان کے سامنے دریائے جہلم کا پاٹ برسات میں ایک میل سے کم نہیں ہوتا۔ وہ اس کو دونوں طرف سے تیر کر پار کرتے تھے اور پھر کُرتا پہن کر کام میں لگ جاتے تھے۔

میدانِ جنگ میں ان کی شجاعت کا ثبوت ۳۷ء کے مہمند آپریشن کے وہ جنگی مراسلے ہیں جن میں دوبار ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اصل میں ان کے لیے ملٹری کراس کے اعلیٰ تمغہ کی سفارش کی گئی تھی۔

لیکن جسمانی قوت اور جنگی شجاعت سے بڑھ کر ان کے کردار کی سب سے نمایاں اور ممتاز خصوصیت ان کی اخلاقی جرأت تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ انہیں اپنی آن اور اپنے وقار کا بڑا احساس تھا جسے انھوں نے انگریز کی نوکری میں بھی برقرار رکھا اور بڑھے دھڑلے سے برقرار رکھا۔ وہ کہا کرتے تھے بیٹا نوکری اور غلامی میں فرق ہے۔ نوکری کرو تو سر اٹھا کر کرو۔ اور سر اٹھا کر وہ چل سکے گا جو کام کا بھی پکا ہو اور دیانت دار بھی ہو۔ انکی غیرت مندی اور خود داری کے واقعات بے شمار ہیں لیکن اس وقت میں صرف دو کا ذکر کروں گا جو فوری طور پہ میرے ذہن میں آرہے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کی یونٹ میں نیا سی او، آیا، اسے ان کی عادت اور خصلت کا پتہ نہیں تھا اس نے ایک موقع پہ پلٹن کے جے سی اوز کو جو ذرا فاصلے پہ تھے اشارے سے بلایا۔ دُوسرے بھاگ کر سی او کے سامنے پہنچے لیکن والد نے اپنے قدم کو تیز نہیں کیا۔ حالانکہ یہ اس وقت محض جمعدار (نائب صوبیدار تھے) وہ زمانہ انگریز افسروں کی فرعونیت کا تھا۔ ان کے سی او، کو ان کا اس طرح آہستہ آہستہ وقار سے چل کر آنا بہت ناگوار گزرا۔ اس نے پوچھا ویل۔ جمعدار صاحب۔ تم بھاگ کر کیوں نہیں آیا۔ انھوں نے سیلوٹ مارا اور اپنے کندھے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ سر اس عہدے کا پاس تھا۔ میری کمپنی کے سپاہی سامنے کھڑے ہیں ان کے سامنے میرا اسطرح بھاگ کر آنا مناسب نہ تھا۔ سرداری بھی کوئی چیز ہے۔

دُوسرا واقعہ ۱۹۴۲ء کا ہے۔ والد اس وقت تک صُوبیدار ہو چکے تھے۔ اپنی پلاٹون کو سکھلائی کے پیریڈ میں کوئی کھیل کھلا رہے تھے۔ ان کا کمپنی کمانڈر کوئی انگریز چھوکرا کیپٹن نیا نیا آیا تھا۔ اس نے بڑی افسرانہ شان سے انھیں ٹوکا کہ وہ میک اینڈ مینڈ کے پیریڈ میں جوانوں کو کھیل کیوں کھلا رہے ہیں۔ انگریز کپتان کا لب و لہجہ توہین آمیز تھا۔ ان سے برداشت نہ ہُوا اور وہیں اس کے ایک پہلوانی کا ہاتھ دیا۔ اتنی زور سے کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کے بعد وہ سیدھے اپنے سی او کرنل لیری کے دفتر میں چلے گئے اور اپنی کراس بیلٹ اُتار کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے پوچھا صُوبیدار صاحب خیر تو ہے۔ کیا ہُوا۔ انھوں نے پُورا قِصّہ بیان کر دیا اور کہا میری غلطی ضرور ہے کہ مَیں نے اسے مارا لیکن اس نے ساری پلاٹون کے سامنے میری توہین کی تھی۔ صاحب۔ ہم نے نوکری عزت کے لیے کی ہے بے عزتی کرانے کے لیے نہیں۔ اب جو حکم ہو۔ اس عرصے میں وہ انگریز کپتان بھی ایجوٹینٹ کے دفتر میں رپورٹ کرنے پہنچ چکا تھا۔ کرنل لیری انکے مزاج کے کھرے پن دیانت داری اور خودداری سے خوب واقف تھا۔ ویسے بھی جنگ کا زمانہ تھا۔ ٹروپس کو بددل کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو۔ اس نے سارے واقعہ کی خود تفتیش کی اور اس کپتان کو قصوروار پا کر اس سے معافی منگوائی اور شام تک اسے فرنٹیئر میل پر بٹھا دیا۔

ان دو واقعات سے ان کے کردار کے سانچے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میری سوچ پر بلکہ پوری زندگی پر میرے والد کی شخصیّت کے اس پہلو کا بہت گہرا اثر ہے۔ پنتیس چھتیس سال وردی پہنی یہ سارا وقت اسی کشمکش میں گذرا کہ عزّت سے سر اُٹھا کر نوکری کس طرح کروں۔ یہ میں بہت گھٹا کر بہت تکلف سے بات کر رہا ہوں ورنہ کھری اور سچی بات یہ ہے کہ نوکری کا بڑا حِصّہ لڑتے بھڑتے گزرا۔

میرا زندگی بھر کا اصُول یہ رہا ہے کہ اگر خوش کرنا ہے تو اپنے ساتھیوں اور ماتحتوں

کو خوش کرو۔ ان کے کام آؤ۔ ان کی خدمت کرو وہی میدانِ جنگ میں تمھارا ساتھ دیں گے اور پسینے کی جگہ خون بہائیں گے۔ جنرل ٹیوکر کا تبصرہ بالکل صحیح ہے کہ جنگ میں رینک کام نہیں آتا سپاہی اس کے ساتھ اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں گے جس کے بارے میں انھیں یقین ہو کہ وہ واقعی دلیر ہے اور انھیں لیٹ ڈاؤن نہیں کرے گا۔ خواہ وہ سینئر کمانڈر ہو یا جونیئر سے جونیئر۔ میدان جنگ کی لیڈر شپ کا معیار ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

داستان زندگی

میری تاریخ پیدائش ۲۰ نومبر ۱۹۲۹ء ہے اور جائے پیدائش آبائی گاؤں پران ہے جس کے بارے میں میں پہلے بتا چکا ہوں میری پیدائش کے زمانے میں میرے والد ۲/۲ پنجاب میں بی۔ ایچ۔ ایم تھے اور یہ یونٹ اس وقت جنوبی ہند کے شہر مدراس میں مقیم تھی۔ اس لیے بچپن کے ابتدائی سال میں نے پران میں اپنی دادی اماں کے زیر سایہ گزارے۔ وہ بالکل اَن پڑھ تھیں لیکن فہم و فراست میں ان کا بڑا مقام تھا۔ گاؤں بھر کے لوگ اپنے دکھ سکھ میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ سہ پہر کو ان کی کچہری سی لگتی تھی اور وہ گھریلو جھگڑے تنازعے نمٹاتی تھیں۔ ان کا دل ہی آئینہ نہیں تھا ان کا ہاتھ بھی فراخ تھا۔ ضرورت مندوں کو اس طرح دیتی تھیں کہ دائیں ہاتھ کی خبر بائیں ہاتھ کو نہیں ہوتی تھی۔ میری زیادہ تر پرورش انہی کے ہاتھوں ہوئی۔ بعد کو بھی میں ان سے فیض یاب ہوتا رہا۔ اس بات کو میں اپنی زندگی کی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ گھر کی اچھی تربیت کا کوئی نعم البدل نہیں۔ بڑے ہو کر جب بھی میں ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگانے ان کے پاس جاتا تو بڑے پیار سے سر پہ ہاتھ رکھ کر دعائیں دے کر یہ ضرور کہتیں۔ بیٹا اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔ بچپن اور جوانی میں تو یہ جملہ بار بار سنتا رہا اور زیادہ غور نہیں کیا۔ لیکن جب زندگی کو اور اس کی اونچ نیچ کو قریب سے دیکھا تو اس جملے کے اسرار کھلے۔ مانگنے کی بہت

سی قسمیں ہیں اور ہر قسم آخرکار انسان کو ذلیل کرتی ہے۔ اسی طرح ہاتھ کو اوپر رکھنے کے بہت سے طریقے ہیں اور ہر طریقہ انسان کو سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

ابتدائی تعلیم

مَیں نے اپنی تعلیم کا آغاز ۱۹۳۵ء میں کینٹونمنٹ بورڈ اسکول جالندھر سے کیا۔ جہاں ان دنوں میرے والد کی پوسٹنگ تھی۔ ہمارے گھر کے سامنے ہی کے جی آر آئی ایم اسکول جالندھر تھا۔ مَیں صبح و شام اس کے جی آر اسکول کے لڑکوں کو وردی میں پی ٹی کرتے دیکھتا تھا ان کو پی ٹی پریڈ کرتے دیکھنا میرے لیے اتنا دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا کہ مَیں اکثر اپنا کھیل بھی بھول جایا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک روز مَیں نے والد سے کہا۔ مجھے بھی اس اسکول میں داخل کرادیں اور بہت ضد کی۔ داخل تو خیر کیا ہونا تھا لیکن والد نے میرے شوق کو دیکھ کر مجھ سے وعدہ کیا کہ جب ذرا بڑے ہو جاؤ گے تو ضرور کے جی آر اسکول میں داخل کرادیں گے۔ کوئی سات سال بعد میری یہ آرزو پوری ہوئی۔

۱۹۳۸ء میں یکایک میرے والد کا تبادلہ ۲ پنجاب کے رجمنٹل سنٹر میرٹھ میں ہوگیا۔ وہاں مجھے فیض عام ہائی اسکول کی تیسری جماعت میں داخلہ ملا یہ اسکول صرف مسلم طلبہ کیلئے تھا۔ ۱۹۴۰ء میں دُوسری جنگِ عظیم کے ابتدائی دور میں والد کا تبادلہ کسی ایسی جگہ ہوگیا جہاں فیملی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے مجھے اپنے گاؤں پران واپس آنا پڑا اور چونکہ پران میں اسکول چوتھی جماعت تک تھا اس لیے پانچویں جماعت میں پڑھنے کے لیے مجھے گاؤں سے تین میل دُور مڈل اسکول کھوہار جانا پڑتا تھا۔

بچپن کی چند یادیں

والد مرحوم نے شروع سے میری تربیت اس انداز سے کی کہ مَیں اپنے پیروں

پر کھڑا ہو سکوں اور مشکلات کا مقابلہ کر سکوں۔ وہ بچوں کو ضرورت سے زیادہ تحفظ دینے کے قائل نہیں تھے۔ میں چوتھے درجے میں تھا کہ مجھے پران سے میرٹھ جانا تھا بیٹنکر وں میل کا یہ طویل سفر میں نے والد صاحب کے اصرار پر تنہا کیا۔

دوسری جنگ عظیم چھڑنے پر میں اپنے گاؤں پران آگیا تھا۔ پران کے قریب سے اپر جہلم نہر گزرتی ہے۔ اس میں گاؤں کے بہت سے جوان نہانے اور تیرنے آتے تھے۔ میں پانچویں میں تھا لیکن مجھے تیرنا نہیں آتا تھا اور کوئی مجھے سکھانے پر تیار نہ تھا۔ ایک روز میرے ماموں میرے ساتھ آئے ہوئے تھے میں نے کہا میں خود تیرنا سیکھتا ہوں۔ جب ڈوبنے لگوں تو نکال لینا۔ وہ اسے مذاق سمجھے لیکن دوسرے لمحے میں نے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ گو کنارے پر ہی رہا۔ چھ سات دن زیادہ وقت میں نے نہر میں گزارا غرضیکہ آٹھ دس دن میں، میں نے نہر کو تیر کر پار کرنا سیکھ لیا۔

کام کوئی ہو اگر میں اسے کرنا چاہوں تو اسے کرنا میرے لیے عزت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ میں چھٹے درجے میں تھا کہ میں نے دریائے جہلم کو تیر کر پار کیا۔ یہ بھی ایک چیلنج بن گیا تھا۔

ملٹری کالج میں داخلہ

ملٹری کالج جو اس وقت تک کے جی آر آئی ایم اسکول تھا۔ میں ۱۵ اگست ۱۹۴۲ء کو داخل ہوا۔ 1018 کالج نمبر ملا اور رابرٹس ہاؤس گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی اور بات کروں یہ بتانا چاہوں گا کہ کالج میں داخلے کا دن وہ آخری دن تھا جب میں نے اپنے والد کو دیکھا۔ وہ یوں کہ وہ مجھے کالج میں چھوڑ کے واپس اپنی یونٹ میں چلے گئے جو ان دنوں واہ میں تھی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو حسن ابدال کے قریب وہ ایک حادثہ کا شکار ہو گئے اس طرح وہ اس پودے کو پروان چڑھتے نہ دیکھ

سکے جسے اُنھوں نے بڑے ارمانوں سے لگایا تھا۔ میرے لیے دوہرا صدمہ تھا میں صرف شفیق اور دلیر باپ سے محروم ہوگیا بلکہ ان کے انتقال کے ساتھ ہی میرا بچپن بھی ختم ہوگیا۔ ٢٧۴

شروع سے مَیں ایک کھلنڈرا لاابالی قسم کا لڑکا تھا جس کے سر پر نہ کوئی ذمہ داری تھی اور جسے نہ کسی ذمہ داری کا احساس تھا۔ والد کے انتقال کے بعد نئی ذمہ داریوں نے مجھے آن گھیرا۔ تین بھائیوں اور ایک بہن میں، مَیں سب سے بڑا تھا۔ کسی نے مجھے خاص طور پر بتایا نہیں لیکن مجھے خود ہی احساس ہوگیا کہ اب مجھے بڑا بننا ہے اور باپ کی جگہ لینی ہے۔ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی یہی کوئی تیرہ برس اور کچھ مہینے لیکن اس چھوٹی سی عمر میں خُدا نے مجھے حوصلہ دیا اور میں نے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا شروع کیا۔ رہا یہ سوال کہ مَیں نے اپنی ذمہ داریوں کو آئندہ سالوں میں کس طرح نبھایا اسکا جواب یا تو میرے بہن بھائی دے سکتے ہیں یا میرا خدا جانتا ہے میں خود یہ کہہ سکتا ہوں کہ مَیں اپنے ضمیر کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں۔ مَیں اپنے تجربے کی بنا پر کہا کرتا ہوں کہ جو اپنے بہن بھائیوں کا نہ ہو وہ کسی اور کا کیا ہوگا۔ جو اپنے خون کے رشتے داروں کے لیے کچھ نہ کر سکے وہ ملک و قوم کے لیے خون کیا دے گا۔ جو آدمی اپنے گھر کے اندر ایثار نہ کر سکے وہ گھر سے باہر ایثار کیا کرے گا۔

والد کے انتقال نے مجھے پڑھائی کے بارے مَیں سنجیدہ بنا دیا تھا۔ کلاس میں میری پوزیشن دُوسری یا تیسری ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے ۱۰۴۶ امیر محمد (اب لیفٹیننٹ کرنل) نے فرسٹ پوزیشن اپنے لیے ریزرو سی کروا رکھی تھی دوسری اور تیسری پوزیشن میرے اور ۱۰۱۷ سلطان محمود (اب لیفٹیننٹ کرنل ریٹائرڈ) کے درمیان گردش کرتی رہتی تھی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرا دل پڑھنے میں نہیں کھیلنے میں تھا۔ ہاکی میرا من بھاتا کھیل تھا اسکا شوق مجھے اس درجہ تھا کہ مَیں دوپہر آرام کے وقت جب بھی موقعہ ملتا سرک جاتا اور میلان

میں پتھر کے ٹکڑوں ہی سے کھیلتا رہتا۔ کارنر اور پنلٹی کارنر کی مشق کرتا رہتا اور اکیلے دُھوپ میں' اس طرح پتھروں سے کھیلتے رہنا ہے تو پاگل پن لیکن بغیر پاگل بنے کام بھی نہیں بنتا۔ اسی شوق کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۴۴ ہی سے میں کالج کی ٹیم میں کھیلنے لگا تھا اور پھر فوج میں جاکر آرمی کی ٹیم تک پہنچا۔ اوائل ستمبر ۱۹۴۶ میں' میں کالج سے رُخصت ہُوا اور ۱۶ ستمبر ۱۹۴۶ء کو میں میرٹھ میں جہاں ۲ پنجاب کا سنٹر تھا بحیثیت رنگروٹ بھرتی ہو گیا۔

۲۸۵

ملٹری کالج کے طرزِ تربیّت پر تاثرات

۱۹۴۷ سے پہلے تک ملٹری کالج میں تعلیم و تربیّت کے مقاصد محدود ضرور تھے لیکن ان محدود مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے جو طریق کار اور جو سسٹم وضع کیا تھا وہ انتہائی مؤثر اور کارگر تھا۔ اگر میں اس زمانے کے معمولات (روٹین) کی تفصیلات بیان کرنے لگوں تو نہ آج کے طلبہ کو یقین آئے گا اور نہ شاید آج کل کے کارپردازوں کو۔ کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور ایسا بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً صبح سویرے چوا کریالے اسٹیشن کے سامنے ۹۸ سنگ میل تک۔ سُورج نکلنے سے پہلے ننگے پاؤں اور جاڑوں میں بھی بغیر بنیان کے دوڑ کے جانا اور پھر اسی طرح واپس آنا ہمارا روز کا معمول تھا اور اس دوڑ کے لیے ایک انتہائی وقت مقرر تھا۔ صحت صفائی کا اتنا اہتمام تھا کہ جاڑے گرمی ہر موسم میں ہر لڑکے کے لیے صبح و شام ٹھنڈے پانی سے نہانا لازمی تھا۔ ہر سیکشن میں ایک رجسٹر پڑا رہتا تھا۔ جس میں اس غسل پریڈ کی حاضری لگتی تھی اور سیکشن کمانڈر باقاعدہ چیک کرتا تھا کہ بندے نے پورا غسل کیا ہے یا نہیں۔ یا دو چار چھینٹے مار کے باتھ رُوم سے واپس آ گیا ہے۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں جو لڑکے ٹھنڈے یخ پانی سے غسل کو ڈاج کرنا چاہتے انھیں اس کی باقاعدہ سزا ملتی تھی۔

دانتوں کی صفائی کا بھی اتنا اہتمام تھا کہ ہر روز ہر کھانے کے بعد ٹوتھ برش پریڈ ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ رابرٹس ہاؤس کے ڈائننگ ہال کے سامنے بیچ میں ایک نلکا تھا اور اس کے پہلو میں ایک نالی تھی اس کے دونوں طرف کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر ہم دانتوں کو پیسٹ سے صاف کرتے تھے اور پوری کارروائی ایک ڈرل تھی۔ جس سے ہر روز گزرنا ہوتا تھا۔ اسی طرح ڈریس انسپکشن بڑے تواتر سے ہوتا تھا۔ جمعے کی نماز کے ڈریس انسپکشن کے لیے سارا کالج کمانڈانٹ کے دفتر کے سامنے فال ان ہوتا تھا اور کمانڈانٹ کرنل اسٹیبنگ خود بااس کی جانچ پڑتال کرتے تھے۔

کالج کو ایک بٹالین کے طور پر منظم کیا گیا تھا اور پلاٹون کمانڈر اور کمپنی کمانڈر کیڈٹ آفیسرز کہلاتے تھے اور انہی کے سے اختیارات رکھتے تھے۔ کیڈٹس سے سیلوٹ لیتے تھے یہ صرف چند مثالیں ہیں جن سے خوب اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کا تربیتی ماحول کیا تھا۔ تعلیم آرمی اسپیشل یعنی میٹرک کی سطح تک کی ضرور تھی لیکن اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ ہاؤسوں میں کتابیں لانے کی اجازت نہیں تھی۔ کتابیں کلاس کی الماریوں میں رکھی جاتی تھیں پریپ بھی وہیں ہوتے تھے۔

مَیں کہہ چکا ہوں کہ وہ دستورِ تربیّت اس دور کے مخصوص تقاضوں کو پُورا کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا اور خامیوں سے خالی نہ تھا۔ مثلاً اس میں تخلیقی قوتوں کے ارتقاء ذاتی اُپج اور قومی و وطنی جذبات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن اس کمی کے باوجود اپنے دائرے میں یہ نظامِ تربیّت درجہ کمال کو پہنچا ہُوا تھا اور اس کو چلانے والے اس کو انتہائی خلُوص، یکسوئی اور محنت سے چلا رہے تھے۔

رنگروٹی کے دور کی کہانی

جیسا کہ مَیں پہلے بتا چکا ہوں ۱۶ ستمبر ۱۹۴۶ کو میں ۲ پنجاب رجمنٹ میں بھرتی

ہُوا تھا۔ تقسیم ہند کے موقع پر یہ رجمنٹ انڈین آرمی میں چلی گئی تو اس رجمنٹ کے مسلمان سپاہی فرسٹ پنجاب سے منسلک کر دیئے گئے جس کا سنٹر جہلم میں تھا پاکستان بننے کے بعد جب کشمیر آپریشن شروع ہوا تو اس میں میں نے والنٹیر کی حیثیت سے حصہ لیا۔

کمیشن

دسمبر ۱۹۴۹ء میں میں پی آر سی سے ۱/۱۴ پنجاب میں پوسٹ ہُوا جو ان دنوں حیدر آباد میں تھی۔ ۱۹۵۰ کی ایمرجنسی میں یہ پلٹن پہلے چاند پور میں پھر کومیلا مشرقی پاکستان میں رہی۔ اسی دوران مجھے کمیشن کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ اور ۲۸ جنوری ۱۹۵۲ء کو چوتھے او ٹی ایس کورس میں شرکت کی ۷ ستمبر ۱۹۵۲ء کو کمیشن ملا اور فرسٹ پنجاب رجمنٹ کی تھرڈ پیرا بٹالین سیالکوٹ میں پوسٹ ہُوا۔ چونکہ پلٹن سکھیکی ضلع شیخوپورہ میں ٹریننگ پر تھی اس لیے وہیں ٹریننگ کیمپ میں پہلی رپورٹ کی۔ اس کے بعد پلٹن کے ساتھ سیالکوٹ اور آزاد کشمیر میں رہا۔ اگست ۱۹۵۸ء سے اکتوبر ۱۹۶۰ء تک مجھے ای پی آر میں خدمت بجالانے کا موقعہ ملا۔ وہاں سے میں ۔ ایک انفنٹری بریگیڈ کے اسٹاف کیپٹن کے طور پر متعین ہُوا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ پی آر سی میں گزارا اور پھر دسمبر ۱۹۶۳ میں دوبارہ ۲ پنجاب میں پوسٹ ہُوا۔ جہاں میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد تک رہا۔ ۴ مئی ۱۹۶۵ میں میری پلٹن کو سیالکوٹ جانے کا حکم ملا۔ ۵ مئی کو وہاں پہنچنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ ناڑوال کے قریب کوٹلی باجوا جانا ہے۔ ۶ اور ۷ مئی کی رات ہم نے وہاں دفاعی پوزیشن لی۔ مجھے یاد ہے کہ اس رات وہاں شدید بارش ہو رہی تھی۔ چونکہ اس کے قریب ہی دھرم کے علاقے میں دشمن موجود تھا۔ اس لیے ہمیں بغیر روشنی کے آگے بڑھنا پڑا تھا۔ جولائی ۱۹۶۵ تک ہم انہیں پوزیشنوں پر رہے اس کے بعد ہمیں جسٹر پل کے علاقے میں جانے کا حکم

جنگ ستمبر کا معرکہ

اگست ۱۹۶۵ء کے آخر میں میری کمپنی اس جسٹر پُل پر متعین کی گئی۔ ہر قیمت پر اس پُل کا دفاع کرنا میری کمپنی کی ذمہ داری تھی اور مجھے اس ذمہ داری کے مضمرات کا پُوری طرح اندازہ تھا۔ یہی بات میں اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا رہا۔ کہ جسٹر پُل نارووال سیالکوٹ کے دفاع میں خصُوصی اہمیّت رکھتا ہے۔ اس لیے اس کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانی ہوگی۔ یہ ڈبل پُل دریائے راوی پر جسٹر کے مقام پر واقع ہے۔ اوپر سے سڑک کا راستہ ہے اور اس کے نیچے ریل گزرتی ہے۔ یہ پُل نارووال کو ڈیرہ بابا نانک امرتسر گورداسپور سے ملاتا ہے۔ اسی سے اس کی جنگی اہمیّت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس پُل کی لمبائی ۵۳۵ گز ہے۔ ہند و پاک سرحد اس سے صرف ۵۰۰ گز کے فاصلے پر ہے۔ دریا کے اس طرف اور پُل کے قریب ہندوستانیوں کا کچھ علاقہ ہے۔ جس کا نام دھرم ہے۔ اس علاقے میں ان کی ایک ایک کمپنی کی نفری کی سات چوکیاں تھیں۔

۳ پنجاب ۱۱۵ بریگیڈ کا ایک جز تھی جو نارووال کے علاقے میں تعینات تھا۔ اس میں صرف دو پلٹنیں تھیں۔ ۳ پنجاب اور ۴ ایف ایف اور توپ خانے کی ایک بیٹری اور شرمن ٹینکوں کا ایک دستہ شامل تھا۔ ۴ ایف ایف بریگیڈ ریزرو کے طور پر نارووال کے قریب متعین کی گئی تھی۔ گویا لڑائی کا سامنا صرف ۳ پنجاب کو کرنا تھا۔ ۳ پنجاب کی ۴ کمپنیوں کی پوزیشن یہ تھی۔ بی کمپنی بٹالین ہیڈکوارٹر کے ساتھ، جسٹر گاؤں میں تھی اور سی کمپنی یعنی میری کمپنی جسٹر پُل پر مامور تھی۔ ڈی کمپنی پلٹن کی ریزرو کمپنی کے طور پر جسٹر برج سے تقریباً ۱۲ سو گز پیچھے تھی۔ تین اور چار ستمبر ۶۵ کو ہند و پاک سرحد کے اُس پار غیر معمولی نقل حرکت کی وجہ سے ہمیں چوکنا رہنے کو کہہ دیا گیا تھا۔ لیکن کوئی نئی بات نہیں

ہوئی۔ ۵ ستمبر کی شام میں حسب دستور پل کے اُس پار اپنی چوکی کے معائنے کے لیے گیا تو میں نے دیکھا کہ دریا میں پانی کی سطح پہلے کی نسبت بلند ہو گئی ہے۔ چونکہ ان دنوں میں آس پاس بھی کہیں بارش نہیں ہوئی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ یہ دشمن نے مادھوپور ہیڈورکس سے زائد پانی چھوڑا تھا۔ میں نے اس امر کی فوراً اطلاع اپنے سی او کو دی اور ایک پلاٹون دریا کے پار بھیج دی۔ اب صورت یہ تھی کہ میری کمپنی کی دو پلاٹونیں دریا کے پار تھیں اور ایک دریا کے اس طرف تھی چونکہ بعض مواصلاتی اور دوسری مجبوریوں کی وجہ سے میں نے اپنے کمپنی ہیڈکوارٹر کو اس پار منتقل نہیں کیا تھا اگر میں ایسا کر چکا ہوتا تو ۶ ستمبر کی صبح کو دشمن یقینی طور پر پل کو پار کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ ۶ ستمبر کو صبح سویرے کوئی ساڑھے چار بجے دشمن نے ایک بریگیڈ اور توپ خانے کی مدد سے ہماری دریا پار کی چوکی پر دھاوا بول دیا تھا اور ہماری پلاٹون نے مقدور بھر اس کی مزاحمت کی لیکن کب تک۔ میری پُوری کمپنی اس وقت ۵۶ افراد پر مشتمل تھی۔ جوسطے شدہ تعداد کے مقابلہ میں ایک تہائی تھی۔ اسی نسبت سے اس پار کی دو پلاٹون کی نفری بھی کم تھی۔ بہرحال اتنے بڑے حملے کو روکنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ حملے کے وقت میری سی کمپنی کو توپ خانے کی براہِ راست امداد حاصل نہیں تھی۔ پھر بھی ہمارے توپ خانے نے دشمن پر اپنی گولہ باری جاری رکھی جس سے اسے خاصا نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس چوکی کو لینے کے بعد دشمن نے اپنے آپ کو دوبارہ منظم کرنے کے لیے کوئی آدھ گھنٹے کا وقت لیا۔ اس وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہُوئے مَیں نے اپنی طرف کے دفاع کو منظم کیا۔ خوش قسمتی سے ۱۰۶ ایم ایم کی ایک آر۔ آر میرے ہاتھ آ گئی اور میں نے اسے دفاعی بند پر نصب کرا دیا۔ یہ آر آر ایک جیالے این۔ سی۔ او حوالدار منظور حسین کے زیر کمان تھی۔ اس نے پہلے ہی فائر میں دشمن کی پل پر لگی ایم جی پوزیشن کے پرخچے اڑا دیئے۔ دشمن کی اس ایم جی کی وجہ سے دریا کے اس پار ہماری نقل و حرکت میں بڑی رکاوٹ تھی۔ دشمن اس عرصے میں جتڑ برج پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ میرے کہنے پر حوالدار منظور نے دشمن پر پے در پے چار پانچ راؤنڈ فائر

کیئے۔ اس کے نتیجے میں دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ جانیں بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اس کے بعد دشمن نے ۶ ستمبر کو صبح ساڑھے ۸ بجے دوبارہ اور پُل کو پار کرنے کیلئے یلغار کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہُوا تو اس نے ہماری پوزیشنوں پر گولہ باری شروع کردی جو دریا کے دفاعی بند کی وجہ سے کارگر نہ ہوئی۔

اس عرصے میں مَیں نے سوچنا شروع کیا مجھے پُل کے پار جاکر بیلہ میں اپنے محصور اور مقتول ساتھیوں تک پہنچنا چاہیئے کوئی پونے نو بجے میرے سی او کرنل ذوالفقار علی میرے کمپنی ہیڈ کوارٹر میں آئے اور میں نے اپنے پار جانے کے منصوبے پر ان سے مشورہ کیا۔ ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے اطلاع آئی کہ ۲۴ ٹینک رجمنٹ سے شرمن ٹینکوں کا ایک سکواڈرن ہماری مدد کو بھیجا جا رہا ہے یہ خبر ملتے ہی مَیں نے سی او سے کہا آپ ایک ٹینک مجھے دیں مَیں اس کو لے کر پُل کے اُوپر سے پار جاؤں گا وہ تو تیار ہو گئے لیکن جب ٹینکوں کا اسکوڈرن مشہور کرکٹر میجر رحمان کی قیادت میں پہنچا تو انھوں نے معقول وجوہ کی بنا پر ایک ٹینک اس مقصد کے لئے دینے میں کچھ پس و پیش کیا۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ ۱۱۵ بریگیڈ کے کمانڈر بریگیڈئر مظفرالدین کا ایک ذاتی پیغام میرے سی او کو موصول ہُوا۔ کہ ہر قیمت پر دریا کے پار جانا ہے اور دشمن کی یلغار کی مزاحمت کرنا ہے اس پیغام کی روشنی میں میجر رحمان اس جوابی حملے کے لیے ایک ٹینک دینے پر راضی ہو گئے۔ اسی دوران میں ۳۱ فیلڈ رجمنٹ کی ایک بیٹری بھی ہماری مدد کے لیے آ گئی جس کی کمان میجر ایوب کر رہے تھے۔ پلان سیدھی سادھی تھی۔ ٹینک کو اپنی تمام گنوں کے ساتھ فائر کرتے ہُوئے آگے بڑھنا تھا اور اس کے پیچھے ٹروپس کو جانا تھا۔ چنانچہ اس منصوبے کے مطابق جوابی حملہ شروع کر دیا گیا۔ جب دشمن نے ٹینک کو اس طرح دندناتے آتے دیکھا تو چار آر آر گنیں پل کے قریب لے آیا۔ یہ بہت نازک لمحہ تھا۔ اگر یہ ٹینک ناکارہ ہو جاتا تو سارا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔ اس وقت جیلے

حوالدار منظور حسین کی مشاقی اور دلیری کام آئی اور اس نے اپنی آر آر کے ڈائریکٹ ہٹ سے دشمن کی آر آر گنوں کو اڑا کے رکھ دیا ایسا ہونا ہرگز ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی نصرت تھی کہ یہ معجزہ رونما ہو سکا۔ دشمن کی آر آروں کی تباہی سے ہمارے حوصلے بہت بلند ہوئے۔ یہ غیبی اشارہ تھا کہ خُدا کی نصرت ہمارے ساتھ ہے۔ چونکہ میرے پاس سوائے ایک پلاٹون کے کوئی اور ٹروپس نہیں تھے اور یہ پلاٹون بھی اپنے طرف کے بند پر اس مقصد کے لیے متعین کر رکھی تھی کہ اپنے حملہ آور دستے کو چھوٹے ہتھیاروں کی مدد دے اور دشمن کو اس پار سر اُٹھانے کا موقعہ نہ دے۔ اس لیے مَیں نے میجر ایوب سے کہا وہ حملے کے لیے ایک پلاٹون بھیجیں ہم پیش قدمی کے لیے تیار تھے لیکن اس پلاٹون کو آنے میں دیر ہو رہی تھی چونکہ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اس لیے میں نے سوچا کیوں نہ اپنی پلاٹون ہی کو لے کر آگے بڑھوں۔ ابھی مَیں سوچ ہی رہا تھا کہ مَیں نے دیکھا کہ ہماری پلٹن کے ٹو آئی سی میجر غلام رسُول پلاٹون کے آگے آگے چلے آ رہے ہیں مَیں نے شکر ادا کیا یہ پلاٹون جیولین کے مشہور انٹرنیشنل اتھلیٹ صوبیدار جلال خاں کے زیر قیادت تھی۔ مَیں نے صوبیدار صاحب کو مختصراً جوابی حملہ کی پلان سے آگاہ کیا۔ ٹینک پہلے ہی آ چکا تھا۔ چنانچہ ساڑھے گیارہ بجے دوپہر ہم نے نعرہ اللہ اکبر اور نعرہ حیدری لگا کر حملے کا آغاز کر دیا۔

دشمن نے اپنے تمام ہتھیاروں سے فائر کھول دیا۔ دشمن نے اپنی مدد کے لیے چار جہاز بھی منگوائے جو ہم پر فائر کرتے رہے ان کی گولیاں ہمارے ہتھیاروں سے ٹکراتی رہیں ہماری وردیوں کو چھید کر اِدھر سے اُدھر نکلتی رہیں۔ لیکن ہماری پیش قدمی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ صورت حال دشمن کے لیے اتنی ہیبت ناک ثابت ہوئی کہ جوں ہی ہم نے پُل عبور کیا دشمن کے حوصلے پست ہو گئے اور اپنی پوزیشنوں کو چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ اس عرصے میں دو اور ٹینک ہماری مدد کو پہنچ گئے تھے اور ہماری دو پلاٹونوں کے باقی ماندہ افراد

جو بیلہ میں اِدھر اُدھر چھپے ہُوئے تھے وہ بھی ہم سے آملے ۔ پھر تو ہم دشمن پر ٹوٹ پڑے ۔ تھوڑے ہی عرصے میں سارے علاقے میں دشمن کی لاشوں اور چھوڑے ہُوئے ہتھیاروں کے ڈھیر لگے ہُوئے تھے ۔ آرٹلری کا ایک آبزرور لفٹیننٹ دیوندر کمار سنگھ اور ۵/۱ گورکھا رائفلز کے ۱۶ دوسرے عہدیدار قیدی بنائے گئے ۔ تمام چھوڑے ہُوئے ہتھیاروں کے بڑے بڑے بنڈل بنا کر بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو بھیجے گئے ۔ اس تمام کارروائی میں ایک افسر (میں خود) ایک جے سی او (صوبیدار جلال خان) اور ۱۵ دوسرے عہدیداروں نے حصّہ لیا ۔ یہی خدمت بجا لانے کے لیے مجھے ستارۂ جرأت کے قابل سمجھا گیا ۔

جسّڑ کے پل کی اہمیّت

جسّڑ کے پل کی اہمیّت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ یہ نارووال سے سات میل کے فاصلے پر ہے اور نارووال ۔ شکرگڑھ کی شاہراہ سے صرف ڈیڑھ میل دُور ہندوستان کی طرف ۔ ڈیرہ بابا نانک سے دو میل سے بھی کم ہے ۔ گورداسپور کا فاصلہ ۲۳ میل ہے اور امرتسر کا ۳۳ میل ان اہم مقامات سے جسّڑ پُل کے فاصلے کو مدنظر رکھتے ہُوئے اس پُل کی جنگی اہمیّت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

ہندوستانیوں کو اندیشہ یہ تھا کہ ہم امرتسر یا گورداسپور پر اپنا بکتر بند حملہ اسی پُل سے کریں گے ۔ اس لیے انھوں نے اپنا سیکنڈ انڈیپینڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ گروپ جسّڑ سے دس میل کے فاصلے پر جسّڑ امرتسر روڈ پر متعین کیا ۔ انڈین ہائی کمان ہر قیمت پر ہمارے متوقع حملہ کو روکنا چاہتی تھی اس لیے ہندوستانیوں نے ۶ ستمبر کی صبح اس پر اچانک حملہ کر کے اس پُل پر قبضہ کر لیا ۔

ہندوستان کا سیالکوٹ پر حملے کا منصُوبہ بھی جسّڑ پُل پر قبضے سے مربُوط تھا ۔ ان کے اصل منصُوبے میں سیالکوٹ پر حملے کے لیے ۶ اور ۷ ستمبر کی درمیانی رات کا وقت مقرر کیا گیا

تھا۔ ۶ ستمبر کی دوپہر کو جسڑ پُل پر ہمارے دوبارہ قبضے سے انھیں اپنے منصوبے میں مجبوراً ردوبدل کرنی پڑی اور آخر کار وہ یہ حملہ ۷ اور ۸ ستمبر کی درمیانی رات کو کرسکے۔ اس تاخیر سے ہمارے اعلیٰ ہیڈ کوارٹرز کو بہت قیمتی ۲۴ گھنٹے مل گئے۔ جن کی ہمیں اشد ضرورت تھی۔ دشمن نے بھی اپنا سیکنڈ انڈی پنڈنٹ آرمڈ گروپ کھیم کرن میں پہنچا دیا جس نے بعد کو اس طرف سے امرتسر کی طرف ہماری پیش قدمی کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کاش کہ ہمارے پاس اتنے دستے ہوتے کہ ہم ڈیرہ بابا نانک پر قبضہ کرسکتے اور پُل پر اپنا قبضہ رکھ سکتے۔ اس سے جنگی صورت حال ڈرامائی طور پر بدل جاتی۔ میرا خیال ہے کہ اس اقدام سے دشمن اپنے سیالکوٹ پر حملہ کرنے کے منصوبے کو ترک کرنے پر مجبور ہو جاتا اور کھیم کرن کی طرف سے امرتسر کی طرف ہماری پیش قدمی آسان ہو جاتی۔ چونکہ اس صورت میں دشمن اپنے سیکنڈ انڈی پنڈنٹ آرمڈ بریگیڈ کو جسڑ سے کھیم کرن کی طرف منتقل نہ کرسکتا۔

مجھے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بارے میں ایک ہندوستانی کی کتاب دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس میں جہاں ہندوستانی مصنّف نے جنگ کو اپنے نقطۂ نظر سے لکھا ہے وہاں اپنے جنگی اعزاز یافتہ افسروں کے سند نامے (سائیٹیشن) بھی نقل کئے ہیں۔ جسّڑ کے محاذ پر ہندوستانی ہائی کمان نے اپنے ایک انفنٹری لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو میجر جنرل) چھجورام کو ویرچکّر (وی۔سی) دیا تھا کرنل چھجورام کے سائیٹیشن کے الفاظ اس کتاب کے مطابق یہ ہیں۔ ۶ ستمبر کی صبح کو ڈیرہ بابا نانک برج (جسڑ برج) کو سر کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ لیکن پاکستانیوں نے بکتر بند اور بھاری توپ خانے کی مدد سے جوابی حملہ کیا (واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پاس حملہ کی سپورٹ کے لیے ۳۱ فیلڈ رجمنٹ کی صرف ایک فیلڈ بیٹری تھی اور صرف ایک شرمن ٹینک تھا اور برج کو عبور کرنے کے بعد ہمیں دو ٹینکوں کی مدد حاصل تھی) پاکستانی ہماری پوزیشنوں کو سر کرنے کے بعد ڈیرہ بابا نانک گورداسپور امرتسر کے چوراہے تک پہنچ چکے تھے۔ ڈیرہ بابا نانک سے ہماری پسپائی یقینی سی ہو

چکی تھی کہ لفٹیننٹ کرنل چھجورام نے صورت حال کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ کرنل چھجورام نے دستوں میں اعتماد بحال کیا اور پاکستانیوں کی پیش قدمی کو روکا اور اس طرح آخر کار جنگی اہمیت کے ڈیرہ بابا پُل کو دوبارہ سر کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا"۔

حقیقت یہ ہے کہ ۶ ستمبر کی صبح ۱۱ بجے جسڑ پُل پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد میں پُل سے چند سو گز سے آگے بڑھا ہی نہیں تھا ایسا کرنے کے لیے میرے پاس دستے ہی نہیں تھے ڈیرہ بابا نانک گورداسپور امرتسر تک پہنچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ کرنل چھجو کے سائٹیشن میں دعویٰ کیا گیا ہے۔

مجھے آپریشنل ایوارڈ دیا گیا تھا جو فوری طور پر سگنل کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔

ستارہ جرأت کا سگنل

پی ٹی سی ۱۳۰۰۲ کیپٹن راجہ اصغر علی ۳ پنجاب نے جسڑ پُل کا بڑی جرأت سے دفاع کیا پھر ۶ ستمبر کو جوابی حملہ کر کے اس پر دوبارہ قبضہ کیا اور اس طریقے سے اس پُل کو تباہ کر دینے میں آسانی ہوئی۔ اس سلسلہ میں وہ ۷ ستمبر کو زخمی ہوئے: اس کامیاب کارروائی کے لیے ستارۂ جرأت دیا گیا:

مصنّف کا تبصرہ

چونکہ اس کتاب کا ایک مقصد مجاہدوں اور غازیوں کی نفسیات کا مطالعہ کرنا ہے اس لیے ہم نے کرنل اصغر سے خاص طور سے پوچھا کہ اس معرکے کے دوران ان کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔ کرنل اصغر کا جواب یہ تھا: ہرا واقعہ یہ ہے کہ اپنے سے پچاس گنا زیادہ دشمن سے ٹکرانا دن کے وقت کھلے میدان میں ۵۲۵ گز لمبے پُل کو عبور کرنا اور پھر دشمن پر جا پڑنا اور اس کی بیخ نکالنا۔ بغیر اللہ کی نصرت کے ہرگز ہرگز ممکن نہیں تھا۔ جب میں ٹینک کو لے کر پُل کی طرف چلا ہوں تو بظاہر یہ

خودکشی کے مترادف تھا۔ ایک ایسا اقدام جس میں کامیابی کا تناسب ایک فی صد سے بھی کم تھا اسی لیے دو ایک آوازیں میرے کان میں ایسی پڑیں۔ اصغر سوچ لو کہاں جا رہے ہو۔ لیکن یہ میرا فرض تھا۔ اس ملک کی مٹی کا قرض تھا جو مجھے چکانا تھا اور پھر جان اسی لیے ہوتی ہے کہ موقعہ پڑنے پر حوصلے سے دیدی جائے۔ سپاہی کی تو شان ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ موقع و محل پر مرنا جانتا ہے جان جوکھوں میں ڈالتا ہے۔ اس لیے جسے آپ کارنامہ کہتے ہیں میں کوئی ذاتی کریڈٹ نہیں لیتا صرف اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے حوصلہ دیا۔ ہمت دی کہ اس موقعہ پر میں اپنے فرض کو ادا کروں یہاں میں صوبیدار جلال خان، حوالدار منظور حسین شاہ اور ٹینک کے کریو، کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا کہ جن کے عزم و حوصلے جذبے سے یہ منزل سر ہوئی۔

اس واقعہ سے اور اس واقعہ کے بعد جو جنگ میں نے دیکھی اور چھوٹے بڑے ہر رینک کے سینکڑوں ہزاروں فوجیوں کو میدانِ کارزار میں دیکھا اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جو سر اُٹھا کر نوکری کرتا ہے وہی سر اُٹھا کر لڑتا بھی ہے۔

ایک واقف حال کا تبصرہ

آخر میں ہم جسّڑ برج کے معرکے پر بریگیڈئر نیاز عظیم جو اس وقت راجہ اصغر علی کے بی۔ایم تھے کے تاثرات نقل کرتے ہیں۔

۸ ستمبر کو دشمن نے سیالکوٹ سیکٹر میں اپنے حملے کا آغاز جسّڑ کے پُل کے علاقے سے کیا۔ جو نارووال سے پانچ میل کے فاصلے پر ڈیرہ بابا نانک کے سامنے واقع ہے۔ جسّڑ پُل کا علاقہ ۳ پنجاب رجمنٹ کے زیر دفاع تھا۔ یہ پُل تقریباً پانچ سو گز لمبا ہے اور پُل کے اس پار ہندوستان کی طرف ہمارا بہت تھوڑا علاقہ ہے اس کی دفاعی لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ اس لیے ۳ پنجاب نے پُل کے اس پار تھوڑے سے آدمی

متعین کر رکھے تھے۔ بیشتر دفاع پُل کے اس طرف تھا۔

۱۱ ستمبر کی صبح ۴ بجے کے قریب دشمن نے ہماری پُل پار کی چھوٹی سی چوکی کو سر کر لیا۔ اور وہ پُل کے دوسرے کنارے تک آگے بڑھ گیا۔ یہ صورت حال خطرناک تھی۔ دشمن کا اگلا قدم کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا دشمن کی یلغار کو روکنے کے لیے فیصلہ کیا گیا کہ پُل پار کا ٹکڑا ہر قیمت پر واگذار کیا جائے۔ جوابی حملہ صرف پُل کو پار کر کے کیا جا سکتا تھا اور ایسا کرنا بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ چونکہ پُل پار دشمن پوزیشن لے چکا تھا۔ سامنے سے اور دونوں بازوں کی طرف سے پُل براہِ راست دشمن کے فائر کی زد میں تھا۔

آگ کے اس طوفان سے گزر کر جوابی حملہ کرنے کی جُرأت کوئی جاں باز ہی کر سکتا تھا۔ کیپٹن راجہ اصغر علی نے جو اپنی عام زندگی میں بھی اپنی جرأت بے باکی اور مشکل پسندی بلکہ خطر پسندی کے لیے مشہور تھے۔ اس مہم کا بیڑہ اٹھایا اور اپنی کمپنی سے اپنے جاں نثاروں کی ایک پلاٹون لے کر جوابی کارروائی کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہراول کے طور پر انھیں دو ٹینکوں کی مدد بھی حاصل تھی۔ اس طرح تقریباً دوپہر کے وقت کھلے آسمان کے نیچے چمکیلی دُھوپ اور دشمن کی آنکھوں کے عین سامنے جوابی حملہ شروع ہُوا۔ جُوں ہی ٹینک پُل پر پہنچے اصغر راجہ اور ان کے آدمی سر و قد کھڑے ہو گئے اور یا علی کا ایک پُر جوش نعرہ لگا کر پُل پر چڑھ دوڑے۔

ٹینکوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر دشمن نے پُورا فائر کھول دیا۔ ٹینک کی گنیں بھی جوابی فائر کرنے لگیں۔ عجب قیامت کا سماں تھا۔ ہر طرف گولیاں تھیں۔ دھماکے سے گو لپیٹ رہے تھے۔ لیکن حملہ آور دستہ جانی نقصان اُٹھانے کے باوجُود رکا نہیں۔ بظاہر یہ حملہ خودکشی کے مترادف تھا۔ دشمن کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دیوانے یوں جاں جوکھوں میں ڈال کے آگے آنے کی جُرأت کریں گے۔ بہر حال جب دشمن نے دیکھا کہ یہ جن تو اتنے فائر میں بھی آگے ہی بڑھتے آتے ہیں تو وہ بوکھلا گیا اور اپنی پوزیشنوں کو چھوڑ کر بھاگنے لگا۔

دشمن کی بدحواسی سے ہمارے ٹینکوں نے خوب فائدہ اُٹھایا اور اسے اپنے پورے ہر رکھ لیا نتیجۃً دشمن کے پرخچے اُڑ گئے۔ پُل پار کی چوکی پر دوبارہ قبضہ کر کے صورۃ کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ سارا علاقہ دشمن کی لاشوں اور اسلحے سے پٹا ہُوا ہے اس میں دشمن کے کم و بیش دو سو سپاہی کھیت رہے ہمارے اپنے سات مجاہد شہیدؑ اور بارہ زخمی۔

اس کارروائی کو جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا انھیں اپنی آنکھوں پہ نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے کہ ناممکن کو ممکن ہوتا دیکھنا حد درجہ حیرت کا باعث ہوتا خود اپنے حواس پہ یقین نہیں آتا۔ لیکن جذبہ، جُرأت اور ایمان ناممکن کو ممکن بنا ہیں۔ اس کا مظاہرہ اصغر علی راجہ اور ان کے آدمیوں نے کیا۔

جنگ میں اس طرح کی جُرأت اور جذبے کے مظاہرے ہوا کا رُخ بدل د ہیں اس معرکہ میں بھی یہی ہُوا۔ جُرأت کا وہ ستارہ جو اصغر علی کو ملا۔ اس نسبت سے بلند ہو گیا ہے۔

جنرل محمد اقبال خان نشان امتیاز، ستارۂ بسالہ
ستارۂ قائد اعظم، امتیازی سند

جنرل محمد اقبال خان

نشان امتیاز، ستارۂ بسالت، ستارۂ قائد اعظم، امتیازی سند

مشہور امریکی مصنف وارڈ جسٹ WARD JUST نے اپنی کتاب

ملٹری مین MILITARY MEN میں امریکہ کے سابق چیف آف آرمی

جنرل ویسٹ مورلینڈ کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ صرف کیپٹن تھا تو اس کے طور ط

اور اٹھان دیکھ کر اس کی یونٹ کے اور رینکس کہا کرتے تھے کہ یہ کپتان ایک روز سی ۔ ا

ایس بنے گا۔

جنرل محمد اقبال کے ساتھ بھی یہی صورت تھی۔ جب وہ محض کپتان تھے تو ان کی یونٹ

اور رینکس بھی ان کے بارے میں اسی طرح سوچتے تھے۔ کچھ عرصہ ہوا گائیڈز انفنٹری کے ا

سپاہی سے ہماری ملاقات ہوئی۔ جواب صوبیدار میجر سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ انہوں

اقبال کے متعلق کم و بیش وہی الفاظ کہے جو وارڈ جسٹ نے جنرل ویسٹ مورلینڈ کے

نقل کئے ہیں۔

اس کتاب میں ان کی شخصیت کا ایک بھرپور نفسیاتی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں اس سوال کا جواب بھی موجود ہے کہ کپتان میں جرنیل کس طرح نظر آجاتا ہے۔

آباؤ اجداد

ضلع اٹک کی تحصیل پنڈی گھیب کے علاقے میں جودڑہ راجپوتوں کا بڑا نام ہے۔ پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ جنرل اقبال کے آباؤ اجداد کا اصل مسکن، پنڈی گھیب سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں جا تنگلہ ہے۔ ریونیو ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے شروع میں جا تنگلہ کے ایک معزز راجپوت نے اسلام قبول کیا۔ اور شیخ احمد اسلامی نام پایا۔ ان کے بیٹے کا نام اقبال عرف "بالا" تھا۔ اقبال کے بیٹے پیر بخش تھے۔ اور پیر بخش کے بیٹے صوبیدار درویش محمد خان، جنرل محمد اقبال انہی درویش محمد خان مرحوم کے بلند اقبال صاحبزادے ہیں۔

چونکہ آدمی کی زندگی پر اس کی نسلی روایتوں، والدین کی قدروں، رویوں اور ماحول کے رجحانات کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے ہم نے جنرل اقبال سے انٹرویو کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی جڑوں (ROOTS) کے بارے میں کچھ بتائیں۔ اور اپنے بزرگوں کے مخصوص ناموں کے پس منظر پر کچھ روشنی ڈالیں۔ ان کا جواب یہ تھا۔

نسلاً ہم جودڑہ راجپوت ہیں جو راجپوتوں کی ایک معزز شاخ ہے۔ شروع سے ہمارا آبائی پیشہ سپاہ گری اور زمینداری رہا ہے۔ شمشیر زنی تو ہمارے خون میں تھی ہی۔ جب ہمارے نکڑ دادا مسلمان ہوئے تو ہم اسلام کی نعمتوں سے بھی بہرہ یاب ہوئے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے کرم و فضل سے ہمیں حسب و نسب کے امتیاز کے ساتھ دین و ایمان کا شرف بھی نصیب ہوا۔ ہمارے علاقے میں ہر خاندان کا کوئی نہ کوئی مرشد ضرور ہوتا ہے میرے پڑدادا اقبال خان نے اپنے بیٹے یعنی میرے دادا کا نام پیر بخش رکھا۔ میرے دادا پیر بخش یقیناً فقر و درویشی کے اسرار و رموز سے واقف ہوں گے تبھی تو انہوں نے اپنے ایک بیٹے (میرے والد) کا ایک

نیا نام رکھا یعنی درویش محمد۔ اور دوسرے بیٹے کا نام دوست محمد رکھا۔ ان ناموں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میرے آباؤ اجداد کے ذہن کا رخ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول سے ان کا کیا تعلق تھا۔

میرے والد مرحوم اپنے دادا یعنی میرے پڑدادا اقبال خان شہید کی باتیں کبھی کبھی کیا کرتے تھے۔ وہ بڑے وجیہہ و شکیل اور خوش لباس انسان تھے۔ بڑے ٹھاٹھ باٹھ اور آن بان سے رہتے تھے۔ سنا ہے کہ منّت کا سونے کا ایک کڑا ہاتھ میں پڑا رہتا تھا یہ ان کی شخصیت کا ایک رخ تھا۔ دوسرا رخ یہ تھا کہ بڑے غیور اور دلیر تھے۔ اپنے علاقے میں سکھوں سے تعاون کرنے سے انکار کیا اور ان کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ وہ صدقہ خیرات کے لئے بھی مشہور تھے۔ اور نومسلم ہونے کے ناطے شعائرِ اسلام کے سختی سے پابند تھے ان کی وصیّت تھی کہ ان کی قبر پکی نہ بنائی جائے۔ وہ پنڈی گھیب میں ہمارے آبائی قبرستان میں دفن ہیں ان کے پہلو میں بعد کو میری پڑدادی دفن ہوئیں۔ ان سے کچھ دور میرے والد درویش محمد خان مرحوم ایک علیحدہ احاطے میں دفن ہیں۔

میرے پڑدادا ہی اپنے جدّی گاؤں جانگلہ سے پنڈی گھیب آکر آباد ہوئے تھے۔ وہ نہ صرف بڑے دل گردے بلکہ بڑے ظرف کے آدمی تھے جب انہوں نے اپنے جدّی گاؤں جانگلہ کو خیرباد کہا تو وہاں اپنی زمین جائداد سب کچھ اپنے بھائیوں کے لئے چھوڑ آئے۔ گویا جب وہاں سے اٹھے تو دامن جھاڑ کر اٹھے اور یہاں اپنی ہمّت اور محنت سے اپنے لئے ٹھکانہ بنایا اور معاشرہ میں اپنے لئے جگہ پیدا کی۔ انیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ اس علاقے میں سکھوں کے اقتدار کے عروج کا زمانہ تھا سکھ لشکریوں نے اس علاقے میں خوف و ہراس پھیلایا ہوا تھا۔ بہت سے نمبردار جاگیردار اپنی جان و مال بچانے کے لئے ان کے مطیع اور تابع فرمان ہو گئے تھے۔ لیکن جن جیالوں اور غیوروں نے سکھوں کا مقابلہ کیا ان میں میرے پڑدادا اقبال خان پیش پیش تھے۔ اسی تگ و تاز میں وہ شہید ہوئے۔

فیاضی اور فراخ دلی ان کے کردار کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ راجپوتوں کی بہت پرانی روایت ہے کہ خواہ جان جائے۔ آن نہ جائے اس روایت کو بھی انہوں نے تازندگی نبھایا اور خوب نبھایا۔ اسی طرح انہوں نے عزّت کو بھی دولت پر ہمیشہ مقدم رکھا۔ یہ صفات والد مرحوم میں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں انہوں نے ٹیڑھی بات کسی کی نہیں سہی وہ آن پر مر مٹنے والے انسان تھے۔ پیسے کو وہ ہاتھ کا میل سمجھتے تھے وہ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ بیٹا، پیسہ نہیں، عزت بڑی چیز ہے۔ جس میں غیرت نہیں اس میں کچھ بھی نہیں۔ ان کی ساری زندگی اسی جدوجہد میں گزری۔ ان کا نام ہی درویش محمد نہیں تھا وہ کردار کے بھی درویش تھے۔

۱۹۰۶ء میں مڈل پاس کرکے (جو اس زمانے اور اس علاقے کا سب سے اونچا امتحان تھا) انہوں نے پولیس کی ملازمت اختیار کی اس دور میں پولیس کا بڑا دبدبہ تھا۔ ہر کس وناکس کو اس میں بھرتی بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے ان کا پولیس سروس میں جانا ان کے لئے اور خاندان کے لئے ایک اعزاز کا باعث تھا۔ لیکن انہوں نے ڈیڑھ سال کے بعد پولیس کی نوکری سے ازخود استعفیٰ دے دیا لوگ اکثر ان سے پوچھا کرتے تھے کہ آپ نے پولیس کی نوکری کیوں ٹھکرادی۔ یہ سوال میں نے خود بھی ایک بار ان سے کیا تھا۔ کہنے لگے میں نے وہ نوکری عزّت کے لئے کی تھی۔ پیسے کے لئے نہیں جب میں نے دیکھا کہ یہاں بد دیانتی اور ظلم کے بغیر گذارہ نہیں تو میں نے نوکری کو چھوڑ دینا ہی بہتر سمجھا حالانکہ لوگوں نے سمجھایا بھی کہ ایسے رعب دبدبے اور شان کی نوکری انگریزوں کے دور میں روز روز کہاں ملتی ہے لیکن میرا جواب یہی تھا کہ مجھے خاندان ہی کو نہیں خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ عزّت کی خاطر انہوں نے پولیس کی نوکری چھوڑی۔ اسی عزّت اور آن کے لئے انہوں نے فوج کو بھی خیرباد کہا اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۰۸ء میں والد محترم گائڈز انفنٹری میں بھرتی ہو گئے تھے۔ گائڈز انفنٹری ایک لحاظ سے ہمارے قبیلے اور علاقے کی پلٹن تھی۔ نہ صرف ہمارے بہت سے رشتہ دار بلکہ ہمارے علاقے کے اور بہت سے لوگ بھی اس پلٹن میں تھے۔ اس زمانے میں گائڈز کا سنٹر مردان میں تھا۔ ۱۹۱۷ء میں وہ نو سال کی قلیل مدت میں وی، سی، او

ہو چکے تھے جو اس زمانے میں دیسی فوجیوں کے لئے سب سے بڑا عہدہ تھا۔ آٹھ برس کی مدت میں والد اسے کمیشن کی منزل تک پہنچ جانا ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔ انہوں نے ہر عہدہ میں ایکسیلیریٹیڈ پروموشن لیا پہلی جنگ عظیم میں انہوں نے مڈل ایسٹ میں جنگ میں حصہ لیا تھا اوران کا داریکارڈ بہت اعلیٰ تھا۔ سروس ریکارڈ بھی کم ممتاز نہیں تھا آگے ترقی کے امکانات بہت روشن تھے لیکن ایک بار پھر ان کی راجپوتی رگ پھڑکی اور انہوں نے آن کی خاطر اس نوکری کو بھی خیر باد کہا۔

یہ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے کہ کوئی جنگی مشق ہو رہی تھی کسی نکتے پر ان کا اپنے انگریز کمپنی کمانڈر سے اختلاف ہو گیا اس دور میں انگریز افسر اپنے ماتحتوں کا اختلاف کہاں گوارا کرتے تھے۔ ان کا او۔سی ان کے اختلاف رائے سے چراغ پا ہو گیا اور اس نے توہین آمیز رویہ اختیار کیا۔ والد محترم نے اسی وقت بیلٹی اتار کر میز پر رکھ دی۔ اور کہا۔ جناب، فوج کی نوکری عزت کے لئے کی تھی بے عزتی کروانے کے لئے نہیں۔ اپنی نوکری اپنے پاس رکھیئے۔ مجھے بے عزتی منظور نہیں چنانچہ انہوں نے صرف ۱۳ سال سروس کے بعد ریلیز لے لی۔

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں

والد مرحوم اپنی پولیس کی نوکری چھوڑنے اور فوج سے ریلیز لینے کے واقعات اکثر سنایا کرتے تھے اور پھر کہتے بیٹا میں نے اس زمانے میں پولیس کی نوکری ٹھکرادی جب پولیس کا وہ دبدبہ تھا جس کا تم لوگ اب تصور بھی نہیں کر سکتے ایک طرح سے حکومت پولیس ہی کی تھی۔ آن بان، اثر ورسوخ اور دولت سب کچھ تھا لیکن دیانتداری کی فضا نہیں تھی۔ اس لئے میں نے اس نوکری کو خیر باد کہا میں تم سے بھی کہتا ہوں کہ خدا کے لئے پیسے کے پیچھے کبھی مت بھاگنا عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ پیسے کی دوڑ میں پگڑی کو سنبھالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیانتداری سے کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ اگر تمہاری نیت صاف ہے اگر تم اپنا کام جانتے ہو اور اسے محنت اور لگن سے ادا کرتے ہو تو اللہ کے کرم سے ترقی و کامیابی اور عزت کے دروازے

تمہارے اوپر راز خود کھلتے جائیں گے۔" والد مرحوم کے اس نظریئے کو میں نے بھی اپنے تجربے سے صحیح پایا۔ اگر کوئی اپنا کام جانتا ہے اور اسے محنت وشوق و دیانت داری سے کرتا ہے۔ تو کوئی لاکھ بُرا چاہے اللہ کے کرم سے وہ ضرور آگے بڑھے گا۔

والد گرامی کو شکار کا بھی بڑا شوق تھا۔ شکاری کتے بھی رکھے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کتوں کی لڑائی کا تماشا بھی دیکھتے تھے۔ بڑے مجلسی آدمی تھے شام کو بیٹھک میں بیس تیس دوست احباب ضرور جمع ہوتے۔ اور وہ ان کی دل کھول کر خاطر تواضع کرتے۔ چونکہ سرداری ان کے مزاج میں تھی۔ یہ مجلس آرائی بھی اسی کا ایک اظہار تھا وہ جہاں رہے ممتاز بن کے رہے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہم کوئی پشتینی جاگیردار نہیں میرے پڑدادا نے جب اپنا آبائی گاؤں چھوڑا تو اپنی زمینیں اپنے عزیزوں کو دے دی تھیں۔ پنڈی گھیب میں ایک طرح سے انہوں نے نئے سرے سے زندگی شروع کی بعد میں میرے والد نے اپنی محنت سے زمینیں خریدیں اور جائداد بنائی۔ اور اپنے خاندان کی روایتی سماجی برتری کو قائم رکھا۔

۱۹۲۱ء میں فوج سے ریلیز لیتے وقت والد گرامی کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ ان کی ریلیز لینے کے بعد کی زندگی جدوجہد، خدمت اور مروّت کی ایک طویل داستان ہے۔ زمینوں کی دیکھ بھال کے علاوہ ان کا زیادہ وقت سماجی کاموں میں گزرتا تھا۔ وہ ضلع کی ایکس سروس مین کمیٹی کے سرگرم کارکن تھے گاؤں کی پنچایت کے پنچ ہونے کے علاوہ ڈسٹرکٹ سیشن کورٹ کے جیوری کے طور پر بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد بہت دیر تک وہ ضلع کے اعزازی ریکروٹنگ افسر بھی رہے۔ سماجی سرگرمیوں اور ایکس سروس مین کی خدمت کی کارکردگی پر حکومت نے ۱۹۴۴ء میں ایک مربع زمین بطور ایوارڈ دی تھی۔ والد صاحب نے بڑی فعّال اور بھرپور زندگی گزاری۔ ۱۹۶۹ء میں تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں انہوں نے انتقال کیا ہر شخص کا پہلا ہیرو باپ ہوتا ہے۔ مجھے زندگی میں اور بہت سے غیر معمولی انسانوں سے واسطہ پڑا لیکن والد مرحوم میرے پہلے ہیرو ہی نہیں آخری ہیرو بھی تھے۔"

بچپن اور ابتدائی تعلیم

جنرل محمد اقبال ۱۷ نومبر ۱۹۲۶ء کو ضلع اٹک کے قصبے پنڈی گھیب میں پیدا ہوئے۔ اپنے بچپن کے ماحول اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں انہوں نے بتایا۔

"ہمارے گھر میں قرآن شریف پڑھنے کا دستور تھا والدہ بہت سویرے اٹھ کر قرآن شریف پڑھتی تھیں۔ والد بھی تواتر سے قرآن شریف کی تلاوت کرتے تھے ہوش سنبھالتے ہی پہلی آواز جو میرے کان میں پڑی وہ قرآن حکیم کی تلاوت کی آواز تھی میں نے خود بھی خاندان کے رواج کے مطابق پہلے قرآن مجید کے چند سپارے قصبہ کی مسجد میں پڑھے مجھے یاد ہے کہ مولوی صاحب کا نام حافظ عبدالرحمٰن تھا۔ بزرگ صورت تھے مسجد میں قصبے کے جتنے بچے قرآن مجید پڑھنے آتے تھے ان سب کو شفقت سے پڑھاتے تھے بعض لڑکے قرآت بھی سیکھتے تھے۔ میری کتابی تعلیم تو پنڈی گھیب ہائی اسکول میں ہوئی لیکن میری تربیت میں بڑا ہاتھ میرے والد صوبیدار درویش محمد خان مرحوم کا ہے۔ تربیت کے بارے میں ان کے تصورات بہت واضح اور طریق کار سائنٹیفک تھا۔ مثلاً مجھے بچپن سے صرف یہ شوق تھا کہ فوجی بنوں گا۔ کیسا فوجی اور کس درجے کا فوجی۔ اس کا تعین انہوں نے اپنی فراست سے کیا اور اپنے تجربے کی روشنی میں میرے کیریر کی بنیادیں رکھیں۔ مضبوط جسم، جفاکشی کی عادت، جرأت اور خود اعتمادی کی ضرورت تو ہر درجے کے فوجی کو ہوتی ہے لیکن اگر کسی کو آگے بڑھنا ہے تو اس کے لئے بیدار ذہن بھی چاہیئے۔ کردار اور قیادت کی اعلیٰ صفات کی نشوونما بھی لازمی شرط ہے۔ ان سب ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے میری تربیت محض ایک عام باپ کی طرح نہیں بلکہ ایک ہمہ وقتی اتالیق کی طرح کی۔

ان کی صحت بہت اچھی تھی اور صحت کو اچھا رکھنے کا وہ بڑا اہتمام کرتے تھے۔ انہیں شکار کا بہت شوق تھا سیر و شکار کو وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ شکار ملے یا نہ ملے شکار کو جاتے وہ ضرور تھے کہا کرتے تھے شکار نہ سہی سیر تو ہو ہی جاتی ہے گی۔ جفاکشی اور سخت کوشی کی زندگی

انہیں پسند تھی۔

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

میرا بچپن تھا ہر روز سیر و شکار کی مصلحتوں کو میں کیا سمجھتا کبھی دیر سے سو کر اٹھتا اوقت پر تیار نہ ہوتا تو وہ میرا انتظار کرتے لیکن صبح کی لمبی سیر قضا نہ ہوتی۔ انہیں اعلیٰ قسم کے شکاری کتے رکھنے کا شوق بھی تھا۔ شکار کی مہم میں دو چار شکاری کتے بھی ضرور ساتھ ہوتے تھے۔

شام کا وقت اسپورٹس کے لئے مخصوص تھا۔ ہر کھیل میرے ساتھ خود کھیلتے تھے اور کھیلنا سکھاتے تھے۔ خصوصاً ہاکی سے انہیں بہت دلچسپی تھی تیرنا بھی انہوں نے مجھے سکھایا۔ گاؤں کا تالاب ہی ہمارا سوئمنگ پول تھا۔ اسی طرح ایتھلیٹکس کی مشق بھی کراتے تھے۔ گاؤں میں دوڑوں کے لئے ٹریک تو ہوتے نہیں اس مسئلہ کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ کھیتوں اور کھلیانوں کے گرد دوڑاتے اور خود ہاتھ میں گھڑی لے کر کھڑے ہو جاتے اور میرا ٹائم نوٹ کرتے۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ والد مرحوم جسمانی توانائی اور قوّت برداشت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ جفاکشی اور سخت کوشی میں نے انہی سے سیکھی اور انہی نے مجھے اس کا عادی بنایا۔ وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر اسپارٹا کے طرز تربیت پر عمل پیرا تھے اس انداز تربیت نے نہ صرف مجھے جسمانی طور پر مضبوط اور سخت کوش بنایا بلکہ میرے اندر وہ ضروری خود اعتمادی بھی پیدا کی جو زندگی میں کامیابی کی پہلی اینٹ ہے۔

ناشکر گزاری ہوگی اگر میں یہاں اپنی والدہ مکرمہ کا ذکر نہ کروں۔ بچپن میں بھی مجھے صاف ستھرا رہنے اور اچھا کپڑا پہننے کا جنون سا تھا انہوں نے اکثر خود تکلیف اٹھا کر بھی مجھے صاف ستھرا رکھا۔ آٹھ برس کی عمر میں میں نے اپنے رہنے اور پڑھنے کا کمرہ الگ کروالیا تھا اور اصرار کرتا تھا کہ میرے کمرے میں میری چیزوں کو نہ چھیڑا جائے وہ میرے کمرے کی صفائی ستھرائی اس طرح کرتی اور کرواتی تھیں کہ میری کوئی چیز ادھر سے ادھر نہ ہو۔

ڈسپلن اور ضبط کے معاملے میں وہ بہت سخت تھیں سچ پوچھیے تو ہم بہن بھائی ۔۔۔

زیادہ ان سے ڈرتے تھے۔ لیکن محبت و مروت میں بھی یکتا تھیں اور ہیں۔ اللہ تعالیٰ سایہ عاطفت ہم پر قائم رکھے ہاتھ اور دل ان کا ہمیشہ سے فراخ تھا اور ہے۔ گھر بڑ پکتی تھی ضرورت سے زائد پکتی تھی۔ آج بھی گاؤں میں چائے بھی بنتی ہے تو ان کے حکم سے چائے زائد بنتی ہے فرماتی ہیں رزق میں دوسروں کا حصّہ بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہما گاؤں میں ہمارے کچھ ملازم خاندان ہیں پشت ہا پشت سے آرہے ہیں ان کی دیکھ بھا شادی بیاہ بھی وہ بڑی شفقت اور فراخ دلی سے کرتی رہی ہیں۔

ہر گھر میں بچوں کو بعض باتیں بار بار بتائی جاتی ہیں ان کا ایک فقرہ مجھے آج بھی یاد کرتیں بیٹا کبھی کسی کے آگے جھکنا نہیں پھر کہتیں۔ کھرے اور سچے آدمی کو کسی کے آگے نہیں پڑتا۔"

پنڈی گھیب اسکول

انسان کا پہلا مدرسہ تو اس کا گھر ہی ہوتا ہے والدین ہی پہلے استاد ہوتے ہیں کے تجربات و تاثرات زندگی بھر سائے کی طرح ساتھ رہتے ہیں لیکن اگر والدین کے بعد کو یا افرادانسان کی بنیادی قدروں اور رویّوں کو متاثر کرتے ہیں تو وہ اساتذہ ہی ہوتے وہ بھی ابتدائی تعلیم اور اسکول کے زمانے کے۔

اس سلسلے میں جنرل اقبال نے اپنے انٹرویو میں کہا۔

"میری رسمی تعلیم پنڈی گھیب ہائی اسکول سے شروع ہوئی۔ یہ اسکول اس علاقے سے اچھا اسکول تھا۔ خصوصاً اس لحاظ سے کہ اس میں غیر نصابی سرگرمیوں پر بھی زور دیا جات ڈرل اور کھیلوں کا باقاعدہ انتظام تھا۔ کھیلوں میں اساتذہ بھی حصّہ لیتے تھے مہینہ میں ایک بزم ادب کا اجلاس بھی ہوتا جس میں خاصے لڑکے حصّہ لیتے تھے تقریر کرنا میں نے پنڈی گ اسکول کی بزم ادب ہی میں سیکھا۔ اسکول میں صبح کی اسمبلی بھی پابندی سے ہوتی تھی۔ جس

کی نظم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری"۔ سب لڑکے کورس کی شکل میں پڑھتے تھے اقبال سے میرا پہلا تعارف اسی نظم کے ذریعہ ہوا۔ یہ بڑی بھرپور دعا ہے۔ اگر کوئی طالبعلم اس کو تھوڑا بہت بھی سمجھ لے تو اس کی زندگی سنور سکتی ہے اس چھوٹی سی نظم میں تعلیمی، اخلاقی سماجی ہر طرح کی رہنمائی بڑی خوبصورت اور موثر انداز میں کی گئی ہے۔

میٹرک کے امتحان میں پہلی بار ناکامی

والد محترم کا اصرار تھا کہ میں سائنس پڑھوں اس لئے ہائی کلاسز میں، میں نے سائنس کا اختیاری مضمون لے لیا تھا۔ لیکن مجھے اس مضمون سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۳ء میں جب میں نے پہلی بار میٹرک کا امتحان جو اس زمانے میں انٹرنس کہلاتا تھا دیا تو سائنس کی وجہ سے میں ناکام رہا دوسرے سال میں نے اردو کے ساتھ امتحان دیا۔ اور سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

پنڈی گھیب کے چند اساتذہ

اب جبکہ پنڈی گھیب اسکول کا تذکرہ آیا ہے تو وہاں کے اساتذہ کو یاد کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یا تو اس زمانے میں سب ہی استاد اچھے ہوتے تھے یا پھر حسن اتفاق سے اس اسکول میں بہت ہی اچھے استاد جمع ہو گئے تھے۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ اس عمر میں مجھے ایسے لائق استادوں سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اب یاد کرتا ہوں تو سب سے پہلے تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر گنڈا سنگھ کا نام ذہن میں آتا ہے گنڈا سنگھ نام ذرا عجیب سا لگتا ہے لیکن وہ خود عجیب آدمی نہیں تھے۔ میرے خیال میں کسی کی انتہائی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے کام کو جانتا ہے اور دل لگا کر کرتا ہے۔ یہی کیفیت گنڈا سنگھ کی تھی وہ بہت کامیاب ہیڈ ماسٹر تھے۔ اسکول پر ان کی پوری گرفت تھی۔ بہت سخت تھے۔ لیکن ساتھ ہی ہمدرد اور ایمان دار،

جس کی وجہ سے سارا اسکول ان کی عزت کرتا تھا۔ آج چالیس برس کے بعد بھی میں انہیں احترام سے یاد کر رہا ہوں۔ اچھا استاد کبھی نہیں مرتا۔ وہ اپنے شاگردوں میں زندہ رہتا ہے۔

اسی طرح انگریزی کے استاد کابل سنگھ کا اپنا مقام تھا۔ ان کے احسان کو میں تازندگی نہیں بھول سکتا۔ وہ ہونہار طلبہ پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ مجھ پر خاص نظر کرم تھی شام کو گھر پر بلا کر بڑے پیار سے پڑھاتے تھے۔ خاصا وقت اور توجہ صرف کرتے۔ لیکن سب اپنے شوق سے بغیر معاوضہ اور فیس کے۔ زمانہ بدل گیا ہے قدریں بدل گئی ہیں اب ایسے استاد کہاں۔

لتر بندال حساب پڑھاتے تھے۔ میانوالی کے مطیع اللہ نیازی صاحب بھی حساب کے بہت اچھے استاد تھے۔ پرائمری کلاسوں میں حساب کے ماسٹر رسول خان تھے۔ محنت سے پڑھاتے تھے لیکن بڑے سخت بھی تھے۔ ہاتھ پر قمچی مارتے تھے۔ جغرافیہ کے استاد، سرخ روخان ابھی حیات ہیں جب کبھی پنڈی گھیب جاتا ہوں تو ان کی خدمت میں بھی حاضر ہونے کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

اسکولی زندگی کے چند واقعات

انسان کی شخصیت کا نفسیاتی سانچہ کبھی نہیں بدلتا جو کچھ وہ بچپن اور لڑکپن میں ہوتا ہے وہی وہ جوانی اور پختگی کے زمانے میں ہوتا ہے اس لئے کسی انسان کو سمجھنے کے لئے ان واقعات وحادثات کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ جن سے وہ ابتدائی عمر میں گزرا ہو۔ جنرل اقبال نے اپنی اسکولی زندگی کے چند واقعات وحادثات کے بارے میں کہا۔

یہ واقعہ ۱۹۴۲ء کا ہے۔ میٹرک کا امتحان قریب تھا۔ امتحان کی تیاری کے لئے تقریباً سب استادوں نے فری کر دیا تھا۔ لیکن انگریزی کے ایک استاد کلاس کو فری کرنے پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔ جس سے طلبہ میں بے چینی سی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ باہر دھوپ میں ایک دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں ماسٹر صاحب آئے کچھ برہم سے تھے۔ آتے ہی کہنے لگے مجھے معلوم ہوا

ہے کہ تم میں سے بعض لڑکے فری ہونے کے لئے شور مچا رہے ہیں۔ دیکھوں تو بھلا وہ کون ہیں؟ یہ سن کر اور ماسٹر صاحب کے موڈ کو دیکھ کر سب لڑکوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا سب کو چپ دیکھ کر میں ایک دم کھڑا ہو گیا اور کہا جناب! سارا کورس ختم ہو گیا ہے۔ مہربانی کریں ہم کو فری کر دیں تاکہ ہم اپنے طور پر امتحان کی تیاری کر سکیں۔

ماسٹر صاحب نے اسے میری گستاخی پر محمول کیا اور غصے میں کلاس چھوڑ کر چلے گئے۔ اور ہیڈ ماسٹر گنڈا سنگھ سے شکایت کی کہ اقبال بڑا گستاخ ہو گیا ہے انہوں نے والد صاحب کو بلوا لیا اور ان سے گلہ کیا۔ والد مرحوم شاید زندگی میں پہلی بار مجھ سے ناراض ہوئے اور ماسٹر صاحب سے معافی دلوائی۔

والد صاحب کے کہنے پر میں نے معافی تو مانگ لی۔ لیکن آج تک میرا خیال ہے کہ میں غلطی پر نہ تھا۔ تعلیم اور فرماں برداری کے معنی یہ نہیں کہ طالب علم ادب سے اپنی رائے کا اظہار بھی نہ کر سکے میں سمجھتا ہوں کہ استادوں کو بڑا باحوصلہ، عالی ظرف اور متحمل مزاج ہونا چاہیئے۔ اور لڑکوں کو اپنے طور پر سوچنا سکھانا چاہیئے۔ میٹرک کے زمانے کا ایک اور واقعہ بھی مجھے یاد آ گیا۔ میں میٹرک میں تھا تو کسی نے مجھے بتایا کہ عربی کے مولوی صاحب تم سے ناخوش ہیں میں چونکہ عربی کا طالب علم نہیں تھا اور مولوی صاحب سے براہِ راست کوئی واسطہ نہیں تھا مجھے یہ سن کر کچھ تعجب ہوا جب یہی تاثر کئی اور ذریعوں سے بھی ملا تو مجھے کرید ہوئی کہ پتہ چلے کہ مجھ سے کیا فروگذاشت ہوئی ہے۔ جب میں نے اس کا کھوج لگایا تو بات ہی اور نکلی۔ اس زمانے میں طلبہ شلوار قمیض پر پگڑی باندھتے تھے۔ میرا لباس بھی یہی تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ میری پگڑی کا طرہ قدرے اونچا ہوتا تھا اور اچھا کلف لگا ہونے کی وجہ سے ذرا زیادہ نمایاں ہوتا تھا مولوی صاحب کو اسی پر اعتراض تھا فرماتے تھے کہ اونچا طرّہ غرور و سرکشی کی علامت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے اپنی انفرادیت کا احساس بچپن سے تھا لیکن پگڑی اور طرّہ کو صاف ستھرا اونچا اور کلف دار رکھنے میں شعوری طور پر کسی غرور کا شائبہ نہ تھا خودداری

اور ۱۹۶۰ء علیحدہ علیحدہ احساسات ہیں۔

کمیشن کے لئے پہلا انٹرویو

اپنی داستان حیات کی اس منزل کے بارے میں جنرل اقبال نے کہا۔

مئی ۱۹۴۳ء میں میٹرک کرنے کے بعد میں نے کیمبل پور گورنمنٹ انٹر کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلے کی درخواست دی اور ساتھ ہی کمیشن کے لئے سلیکشن بورڈ کے سامنے بھی پیش ہوا اس انٹرویو کی تصویر آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ راولپنڈی میں کمشنر کے دفتر کے بارو میں ڈسٹرکٹ کورٹ کے دفاتر ہیں۔ یہاں کمشنرز آفس میں انٹرویو ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کمشنر کا نام مسٹر کنگ تھا۔ اس دن پندرہ بیس امیدوار پیش ہوئے اور صرف چند منتخب ہوتے۔ میرا خیال تھا کہ میں منتخب ہو جاؤں گا چونکہ میرا انٹرویو بہت زوردار ہوا تھا لیکن جب منتخب امیدواروں میں میرا نام نہیں پکارا گیا تو مجھے حیرت اور مایوسی سی ہوئی۔ لیکن اسی لمحے مجھے دوبارہ بورڈ نے اندر بلایا۔ کمشنر کنگ نے کہا ہم نے تمہیں منتخب کر لیا ہے لیکن کمیشن کے لئے فی الحال سفارش نہیں کر سکتے تمہاری عمر مطلوبہ معیار سے ابھی کم ہے۔ تم ذرا انتظار کرو پھر درخواست دینا۔ اس ناکامی پر میرا پہلا تاثر مایوسی کا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ منتخب تو ہو گیا ہوں۔ مجھے خوشی ہوئی پر میرے والد کو بہت ملال تھا۔ میرے کزن محمد شریف سال بھر پہلے کمیشن کے لئے منتخب ہو چکے تھے غالباً اس لئے اور بھی والد صاحب کی خواہش تھی کہ مجھے بھی جلد سے جلد کمیشن مل جائے جس کے لئے انہوں نے سالہا سال مجھ پر محنت کی تھی اب انڈر ایج ہونے سے نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ والد محترم نے ایف ایف آر کے سنٹر کمانڈانٹ کرنل ریڈنگ کو سیالکوٹ خط لکھا اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ پھر سیالکوٹ جا کر ان سے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے انہوں نے کہا کہ بجائے کسی سول کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لینے کے بہتر ہو گا کہ ملٹری کالج میں داخلہ لیا جائے تاکہ فوجی تربیت سے ربط رہے اور آئندہ کمیشن لینے میں آسانی ہو۔ ان

دنوں ملٹری کالج جہلم میں ایکسپنشن انٹری نئی نئی کھلی تھی اور کمیشن کے اہل طلبہ کا بائی کلاسنر میں داخلہ ہو رہا تھا۔ اس انٹری میں مجھے بھی داخلہ مل گیا۔"

ملٹری کالج میں داخلہ

جنرل اقبال ملٹری کالج میں کم و بیش پونے دو سال اگست ۱۹۴۳ء سے اوائل ۱۹۴۵ء تک زیر تعلیم رہے۔ ان کا کالج نمبر ۱۱۸۰ تھا اور ان کا پہلا ہاؤس آکنلک ہاؤس تھا (یہ کیا ہاؤس ۱۹۴۲ء میں فیلڈ مارشل آکنلک کے نام پر توسیعی داخلے کے لئے بنایا گیا تھا۔ اور کالج کی مسجد کے سامنے بائیں طرف واقع تھا۔ اس کی شکستگی کے باعث ۱۹۵۸ء میں اسے گرادیا گیا) چند ماہ آکنلک ہاؤس میں گزارنے کے بعد وہ تقریباً سال بھر جونیئر پریفیکٹ کی حیثیت سے رابرٹس ہاؤس (حال شیر شاہ ہاؤس) کی چوتھی سیکشن (اب علم الدین شہید ڈارم) میں رہے اسی دوران کسی پریڈ میں لیٹ ہونے کی وجہ سے سزا کے طور انہیں برڈووڈ ہاؤس (حال محمود غزنوی ہاؤس) میں بھیج دیا گیا۔ اور عہدہ میں بھی تخفیف کردی گئی۔

ملٹری کالج میں اپنے زمانہ تعلیم کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے جنرل اقبال نے کہا:۔

میں کالج میں میٹرک اور کمیشن کا انٹرویو پاس کر کے گیا تھا۔ پھر بھی کالج کے دستور کے مطابق مجھے میپ ریڈنگ فرسٹ کلاس اور رومن اردو فرسٹ کلاس کے امتحانات پاس کرنے پڑے۔ میپ ریڈنگ سے تو خیر میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ اور یہ مضمون میرے لئے نیا بھی تھا۔ لیکن رومن اردو فرسٹ کلاس کرنا مضحکہ خیز سی بات تھی بہرحال یہ بھی کرنا پڑا۔ ۱۹۴۵ء کے اوائل میں، میں آرمی اسپیشل کے امتحان میں بھی بیٹھا۔ سچی بات یہ ہے کہ کالج کا تعلیمی معیار میرے لئے کوئی چیلنج نہیں تھا۔ اور یوں بھی اس زمانے میں کالج ایک کیڈٹ بٹالین کے طور پر کام کر رہا تھا۔ تعلیم ثانوی چیز تھی اصل زور ملٹری ٹریننگ پر تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کمانڈ اینڈ کنٹرول اور ذمہ داری کی صفات کی نشو و نما کے لئے کیڈٹس کو مختلف ذمہ داریاں

ضروری دی گئی تھیں۔ لیکن اس صورت حال سے بھی میں مطمئن نہیں تھا۔ چونکہ اس وقت یہاں شدید قسم کے ریجی مینٹیشن کی فضا تھی چھوٹا بڑا ہر وقت سزا کے خوف میں مبتلا نظر آتا تھا سزا کا مسلسل خوف کردار پر جو منفی اثرات ڈال سکتا ہے ان کا اندازہ کرنے کے لئے کسی ماہر نفسیات کی ضرورت نہیں۔ جس چیز کو INITIATIVE کہتے ہیں اس کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ صحیح ڈسپلن بغیر انتخاب کی تھوڑی بہت آزادی فریڈم آف چوائس FREEDOM OF CHOICE کے پیدا نہیں ہوتا۔ اور انتخاب کی یہ آزادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ میری طبیعت کی جولانیوں کو نئی سمتوں کی تلاش تھی۔ گھٹن کا وہ احساس جو شروع میں مجھے ہوا تھا آخر تک جاری رہا۔ اسی گھٹن کے احساس اور اپنے وقت کے ضائع ہونے کے احساس کا نتیجہ تھا کہ جوں ہی میری عمر کمیشن کے قابل ہوئی میں نے کمانڈانٹ سے ایک انٹرویو کی درخواست کی۔ اس زمانے میں غالباً میں پہلا اور آخری سینئر کیڈٹ تھا۔ جس نے کرنل اسٹیبنگ سے انٹرویو مانگا۔ اسٹیبنگ کی سختی غلط مشہور نہیں تھی۔ وہ واقعی ایک ٹیرر Terror سے کم نہیں تھے۔ ہر لڑکا ان سے کانپتا تھا۔ لیکن میری اٹھان کچھ اس طرح سے ہوئی ہے کہ میں کسی سے بے جا خوف نہیں کھاتا خصوصاً اس وقت جب مجھے یقین ہو کہ میں حق پر ہوں۔ چنانچہ کمانڈانٹ نے مجھے انٹرویو کا موقعہ دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ہیڈ بوائے ۸۳۵ حق نواز کیانی نے مجھے کمانڈانٹ کے سامنے پیش کیا۔ میں باقاعدہ مارچ ان کیا گیا۔ میں نے کمانڈانٹ کو بتایا کہ سر، میں میٹرک پاس کر چکا ہوں۔ اب میری عمر بھی ٹھیک ہے میں یہاں محض وقت گزاری کر رہا ہوں۔ مجھے سلیکشن بورڈ کے سامنے جانے کا موقعہ دیا جائے۔ میں کمانڈانٹ کی تعریف کروں گا کہ انہوں نے میرے انٹرویو مانگنے کی جسارت کا برا نہیں مانا میری بات توجہ سے سنی۔ اور مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے مجھے آگے جانے کی اجازت دے دی۔ اس زمانے میں انٹر سروسز سلیکشن بورڈ پنڈی میں تھا۔ پری کیڈٹ کالج کے لئے میں کالج کے کئی اور لڑکوں کے ساتھ بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ کامیاب ہوا۔ کالج کے دنوں کی یہ

ادھوری رہے گی اگر میں ان غیر نصابی سرگرمیوں کا تذکرہ نہ کروں جن میں، میں نے شوق سے حصّہ لیا اور فائدہ اٹھایا۔

میں اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے بتا چکا ہوں کہ تمام کھیلوں میں مجھے ہاکی سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اور اس کھیل کی اے بی سی کو میں نے اپنے والد محترم سے سیکھا تھا جو خود بھی ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے ان کی خواہش تھی کہ میں ہاکی میں کچھ نام پیدا کروں۔ کالج میں آ کر میرے ہاکی کے شوق کو جلا ملی۔ اس زمانے میں کالج کی ہاکی کی ٹیم بہت مضبوط تھی اور دور دور تک اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ دھیان چند کے خلاف کھیلنے اور ہارنے کی عزت بھی انہیں حاصل تھی ایک ہندو استاد مسٹر نند لال اور چیف انسٹرکٹر کیپٹن لیوس ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے یہ دونوں کالج کی ہاکی ٹیم میں لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے اور ساتھ ہی کوچ بھی کرتے تھے کالج میں داخلے کے کچھ عرصے بعد ہی میں کالج کی ہاکی ٹیم میں کھیلنے لگا تھا۔ میں نے ان دونوں انسٹرکٹروں سے بہت کچھ سیکھا۔ کیپٹن لیوس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا تیس سے اوپر عمر تھی۔ لیکن بہت تیز ہاکی کھیلتے تھے۔ یہی حال مسٹر نند لال کا تھا۔ کھیل اور شکار کا رشتہ بہت مضبوط رشتہ ہوتا ہے ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور رفاقت کا احساس پیدا ہوتا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ والدین کو بچوں کے ساتھ، استادوں کو شاگردوں کے ساتھ اور افسروں کو جوانوں کے ساتھ کسی نہ کسی کھیل یا مہم میں ضرور شریک ہونا چاہیئے۔

میرے زمانے میں کالج میں غیر نصابی سرگرمیاں بہت محدود تھیں۔ کالج کے سنٹرل ہال میں جہاں آجکل میوزیم ہے کبھی کبھی شعر و شاعری کی محفلیں ہوتی تھیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کالج نمبر ۸۰۵ غلام محمد (بعد کو میجر جنرل) ہیڈ لوائے تھے۔ مجھے شاعری کا شوق ہنڈری گھیب اسکول سے ہو گیا تھا جب میں نے میٹرک میں اردو لی تھی۔ اور کلام غالب سے تعارف ہوا تھا میرے اردو کے استاد ماسٹر غلام محمد تھے۔ وہ شاید خود بھی شعر کہتے تھے۔

بہرحال پڑھاتے خوب تھے۔ ملٹری کالج کے استادوں میں، میں مسٹر نند لال اور کیپٹن ہیون کے علاوہ مسٹر حیدری سے متاثر ہوا۔ ڈسپلن کے معاملے میں یہ بھی سخت تھے۔ لیکن بحیثیت استاد بہت کامیاب بلکہ کامل تھے۔ انگریزی پڑھانے کا انداز اور لب و لہجہ منفرد تھا۔ بہت ہی خوش وضع اور خوش لباس تھے موسیقی اور ڈرامہ اور فوٹوگرامی وغیرہ میں مہارت رکھتے تھے۔ جب میں برڈووڈ ہاؤس میں گیا تو حیدری صاحب وہاں کے ہاؤس ماسٹر تھے کچھ دنوں میرا ان سے واسطہ رہا میں نے انہیں بہت ہی نفیس اور شائستہ پایا۔

اچھے استاد ایک نعمت سے کم نہیں ہوتے اور ایک ادارہ عمارتوں سے نہیں اپنے استادوں سے بنتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی دور میں ملٹری کالج بہت ہی اچھے لائق اور فائق استادوں سے خالی نہیں رہا۔

آخر میں، کالج کے کمانڈانٹ کرنل اسٹیبنگ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے اس زمانے کے بیشتر طلبہ اسٹیبنگ کے زبردست مداح ہیں لیکن میرا تاثر ان سے مختلف ہے منتظم وہ بہت اچھے تھے نظم و نسق کی انتہائی جزئیات پر ان کی نظر رہتی تھی۔ اسپارٹا کے طرز تربیت پر یقین رکھتے تھے۔ اور اس پر سختی اور دیانت داری سے کاربند تھے۔ اپنے مقصد میں وہ یقیناً مخلص تھے لیکن میرے نقطۂ نظر سے وہ ضرورت سے زیادہ سخت اور جابر تھے۔ اتنی بے لچک سختی سے استاد شاگرد کا وہ رشتہ قائم نہیں ہو سکتا جو ہمدردی محبّت اور دوطرفہ عزّت کی بناء پر استوار ہوتا ہے۔

ملٹری کالج کی یادوں کا یہ ذکر ختم کرنے سے پہلے، مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ کالج نے ملک اور افواج پاکستان کی زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ اس ادارے کے ہر سطح کے فرزندوں کو میں نے زمانہ جنگ اور زمانہ امن میں دیکھا ہے اور میں ان کی کارکردگی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ مجھے ان پر اور اس ادارے پر فخر ہے۔ تعلیمی و تربیتی نتائج کے اعتبار سے بھی اب اس کا ایک ممتاز مقام ہے اور اس وقت بھی تھا جب گو یہاں کتابی تعلیم پر توجہ کم تھی لیکن

سخت کوشی اور جفاکشی ذمہ داری اور خود اعتمادی کی تربیت کی کمی نہیں تھی اور کردار کی یہی صفات ہیں جو انسان کو عملی زندگی میں کامیاب کرتی ہیں۔

کچھ دن بلگام کالج میں

کمیشن کی ابتدائی تربیت کے لئے مجھے بلگام کالج بھیجا گیا تھا۔ بلگام کالج جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر بلگام کے مقام پر کچھز کالج نوگانگ کی طرز کا ایک پری کیڈٹ کالج تھا۔ بلگام کالج میں ملٹری کالج کے ہم پانچ یا چھ طلبہ تھے جن میں میرے علاوہ اسلم (بعد میں میجر) اور غوث ملک (بعد میں کرنل) بھی تھے۔ باقی کے نام میرے ذہن سے اتر گئے ہیں۔ ہم وسط ۱۹۴۵ میں بلگام پہنچے تھے۔ ابھی ہمیں وہاں گئے چند ہفتے بھی نہیں گذرے تھے کہ جنگ عظیم دوم ختم ہو جانے سے یکایک بلگام پری کیڈٹ کالج توڑ دیا گیا۔ اس وقت وہاں تقریباً آٹھ سو، طلبہ زیر تربیت تھے۔ او۔ ٹی۔ ایس بنگلور کے لئے ان کا پھر امتحان ہوا یہ انتخاب اور امتحان اتنا سخت تھا کہ آٹھ سو کیڈٹس میں سے صرف آٹھ منتخب ہوتے اور باقی اپنے گھروں اور یونٹوں کو واپس بھیج دیئے گئے ان آٹھ میں سے صرف میں ایک واحد مسلمان تھا۔

او۔ ٹی۔ ایس بنگلور

او۔ ٹی۔ ایس بنگلور کی ایک برٹش کمپنی میں ۱۱۰ کیڈٹس تھے جن میں سے سو انگریز اور دس ہندوستانی تھے۔ جس میں ہم صرف دو مسلمان تھے۔ یہ کورس اکتوبر ۱۹۴۵ء سے جولائی ۱۹۴۶ء تک نو مہینے جاری رہا اس کورس میں خدا کے کرم و فضل سے میری آتنی اچھی پوزیشن تھی کہ اعزازی تلوار کے لئے یونی فارم بنوانے کے لئے میرے کمپنی کمانڈر نے مجھ سے کہہ دیا تھا بعد کو انگریز اسٹاف نے کمانڈانٹ سے کہا کہ برٹش کمپنی سے اعزازی تلوار ایک غیر برٹش کو ملے۔ یہ بڑی بے عزتی کی بات ہو گی۔ چنانچہ انگریز نے جو اپنے انصاف کے لئے مشہور تھا۔ ڈنڈی ماری اور اعزازی تلوار ایک

انگریز سی۔ایس۔ایم کو عطا کی گئی۔حالانکہ نمبرون کی پوزیشن پر میں ہی پاس آؤٹ ہوا۔یہ بہت بڑی ناانصافی تھی کہ پہلی پوزیشن تو کوئی اور لے اور اعزازی تلوار کسی اور کو دی جائے۔ ۱۹۴۶ء میں سروس کے شروع میں مجھے اس بے انصافی کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن خدا تو دیکھتا ہے خدا کا شکر ہے کہ آگے چل کر میں اپنا امتیازی مقام برقرار رکھ سکا۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ گائیڈز انفنٹری ایف ایف آر سے ہمارے خاندان، اور علاقے کا پرانا تعلق رہا ہے۔اسی تعلق کی بناء پر اور والد محترم کی درخواست پر پاس آؤٹ ہونے سے پہلے ہی میری پوسٹنگ ایف ایف آر کے سنٹر سیالکوٹ کے لئے آگئی تھی۔

جولائی ۱۹۴۶ء میں او،ٹی،ایس بنگلور سے پاس آؤٹ ہو کر میں پہلے مدراس گیا۔پھر مدراس سے ریل کے ذریعے سفر شروع کیا۔متھرا آکر پروگرام کے برخلاف ہمیں دو روز رکنا پڑا۔ غالباً کوئی گاڑی پٹڑی سے اتر گئی تھی اس لئے دو روز متھرا میں ٹھہرے اور اسی حساب سے سیالکوٹ دو روز دیر سے پہنچا۔سنٹر کے ایجوٹینٹ نے بازپرس کی۔اس زمانے میں آر۔ٹی۔او سسٹم تھا۔وہ سرٹیفکیٹ دکھا کر جان چھوٹی۔

رزمک ایک واقعہ

ایف ایف کے سنٹر سیالکوٹ میں چند دن گذارنے کے بعد میں اپنی یونٹ گائیڈز میں پوسٹ ہوا جو ان دنوں سرحدی علاقے گردئی میں تھی میں گردئی میں اپنی یونٹ میں پہنچا ہی تھا کہ پہلے دن ہی قبائلیوں کے فائر کے نیچے آگیا۔وزیرستان کے قیام کے دوران ایسے مواقع کئی بار آئے اس طرح کے تجربات نے میرے لئے بیٹل ان آکیولیشن کا کام کیا۔یہ فرنٹیئر فورس کی ٹریننگ کا دور تھا۔اس سے میں نے پورا استفادہ کیا۔کچھ دنوں بعد میری یونٹ گردئی سے رزمک منتقل ہوگئی۔

یہ اوائل ۱۹۴۷ء کی بات ہے کہ تقسیم ہند کے امکانات کے پیش نظر بعض برٹش افسروں نے میس پراپرٹی کو ہتھیانا شروع کر دیا وہ یہ قیمتی سامان اپنے ساتھ انگلینڈ لے جانا چاہتے تھے۔

یہ سراسر زیادتی تھی میں نے اس پر اعتراض کیا بات بڑھی دوستوں نے مجھے سمجھایا کہ کیوں الجھتے ہو۔ کوئی تمہارا مال تو نہیں لے جا رہے ہیں نے کہا اگر میرا مال ہوتا تو شاید میں چپ رہتا لیکن یہ یونٹ کا مال ہے، اس لئے میں چپ نہیں رہ سکتا۔ میری طبیعت شروع سے کچھ ایسی تھی کہ غلط اقدام کو میں برداشت نہیں کر سکتا اصول پر میں قائم رہتا ہوں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن اس وقت میری سروس ۱ سال بھر کی بھی نہیں تھی اور عہدہ کیپٹن کا تھا لیکن میں نے اس معاملہ میں احتجاج کرنا ضروری سمجھا یونٹ کے سی او کرنل میک ین نے مجھے یونٹ کا ایجوٹینٹ مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس واقعہ کے بعد اسنے اپنا حکم واپس لے لیا میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ قیمت خواہ کچھ ہی ہو اپنے ضمیر ہی کی آواز کو سننا بہتر ہوتا ہے۔ بے ضمیر آدمی کی عزت نہ اپنے کرتے ہیں نہ غیر۔

کشمیر آپریشن

۱۹۴۸ء میں میں نے گائیڈز انفنٹری کے کوارٹر ماسٹر اور ایجوٹینٹ کی حیثیت سے کشمیر آپریشن میں حصہ لیا۔ یہ تجربہ ایک نہیں کئی اعتبار سے میرے لئے ایک اہم تجربہ تھا۔ پہلے تو اس اعتبار سے کہ میں نے پہلی بار جنگ کو دیکھا اور جنگ میں حصہ لیا۔ پہلی بار موت کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ قریب سے سنی۔ اور یہ یقین پختہ ہوا کہ موت کا وقت جگہ اور طریقہ واقعی متعین ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے لوگوں کو موت کے منہ سے نکلتے اور موت کے منہ میں جاتے دیکھا اسی آپریشن میں، میں نے بعض کو موت کو للکارتے، موت کو پچھاڑتے اور موت پر فتح پاتے دیکھا اس تجربے سے مجھے اندازہ ہوا کہ جذبہ انسان کو کتنی قوت دے سکتا ہے۔ ذوق یقین سے انسان کیا سے کیا ہو جاتا ہے اور کیسے کیسے ناممکن کاموں کو وہ اپنے عزم و حوصلے سے ممکن بنا دیتا ہے۔ کشمیر آپریشن کے بعد کئی بھی دو لڑائیاں میں نے دیکھیں لیکن جو جذبہ، جو ذوق شہادت، جو جوش و جنون کشمیر میں نظر آیا اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔

کشمیر میں ہماری تعداد ہی بہت ہی کم نہ تھی۔ بغیر توپ خانے کے صرف رائفل سے لڑ رہے تھے۔ بھاری تو بھاری ہلکے ہتھیار بھی مطلوبہ تعداد میں موجود نہیں تھے۔ یہ لڑائی واقعی اور حقیقتاً بے تیغ لڑی جا رہی تھی۔ ایک جھڑپ میں ایک سپاہی ولایت خان دشمن کی ایل ایم جی سے براہ راست زخمی ہوا تھا۔ اس کی آنتیں پیٹ سے باہر آ گئی تھیں لیکن صاحب کیا حوصلہ تھا کیا عزم تھا کیا جذبہ تھا اس جوان مرد کا، اپنی آنتوں کو سنبھالتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا میری فکر نہ کرو، بے شک میں مر جاؤں پاکستان زندہ رہے۔ اس شیر دل نے کوئی فرسٹ ایڈ نہیں لی کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کیا۔ جب تک اپنی جگہ ڈھیر نہیں ہو گیا اس کی آواز کے طنطنے میں کمی نہیں آئی۔ وہ جو اقبال کا شعر ہے۔

کشاد در دل سمجھتے ہیں اس کو ہلاکت نہیں، موت ان کی نظر میں

اس ایمان و ایقان کی وہ سپاہی ولایت خان ایک زندہ تصویر تھا۔

اس طرح کا یہ تنہا واقعہ نہیں تھا۔ جان بازی اور جاں نثاری کے ایک دو اور واقعات بھی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ چونکہ اس طرح کے واقعات قومی تاریخ کا ایک حصہ ہیں یہ گمنام مجاہد اور شہید ہمارے عظیم محسن ہیں۔ ان کے کارناموں کو تاریخ میں محفوظ کر لینا ہماری قومی سلامتی کی ضمانت ہے۔ اس لئے ان واقعات کو ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً اس آپریشن کے دوران ٹتوال سیکٹر کے علاقے میں ہماری کمپنی کی ایک پلاٹون پر دشمن نے ایک بٹالین کی قوت سے حملہ کیا۔ یہ پلاٹون جمعدار دوست محمد کے زیر کمان تھی۔ اور حوالدار جلال خان ان کے نائب تھے۔ جب دشمن کی یلغار کو روکنے کی کوئی صورت نہیں رہی اور دشمن ان کے مورچوں تک چڑھ آیا تو جمعدار دوست محمد اور حوالدار جلال خان کی سرکردگی میں ساری پلاٹون کے افراد خندقوں سے نکل آئے اور رائفلوں پر سنگینیں چڑھا کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ کہاں ایک حملہ آور بٹالین اور کہاں ایک دفاعی پلاٹون دونوں کا کیا مقابلہ تھا۔ لیکن ساری پلاٹون بپھرے شیروں کی طرح دشمن پر چڑھ دوڑی۔ پھر خود ان کے پرخچے اڑ گئے۔ لیکن دشمن کو بھی پسپائی قدمی کا مزہ چکھا دیا۔ اس معرکے میں

بلیس کی پلاٹون کا ایک فرد واحد بھی زندہ نہ بچا۔ لیکن دشمن کی سخت مزاحمت کر کے جو مقصود وہ حاصل کرنا چاہتے تھے وہ انہوں نے حاصل کر لیا۔ قومیں ایسے ہی جاں نثاروں سے بنتی ہیں جمعدار دوست محمد شہید اور حوالدار جلال خان شہید کو میں کبھی نہیں بھول سکتا عسکری تاریخ میں اس طرح کی قربانی کی مثالیں شاذونادر ہی ملتی ہیں۔

ایک اور واقعہ سے میرا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ موت وقت سے پہلے نہیں آتی۔ یہ بھی ٹیٹوال سیکٹر کی بات ہے ہم نے ایک بہت ہی ڈھلوان پہاڑی جس کا نام بہاری رفیچر تھا حملہ کیا جو بد قسمتی سے کامیاب نہ ہوسکا اس میں ہمارا خاصا نقصان ہوا۔ اس حملہ میں ہمارے ایک سپاہی کی آنکھوں میں سرنگ کا بارود لگا اور وہ آنکھیں کھو کر دریائے کشن گنگا کی طرف پھسل گیا۔ پھسل کر گرتے ہوئے اسے کئی آدمیوں نے دیکھا تھا چونکہ اس طرح گر کر بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہذا سب اس کی موت کو یقینی سمجھ کر اس پر فاتحہ پڑھ چکے تھے۔ لیکن جس کو خدا رکھے اسے کون چکھے وہ نیچے جا کر کہیں جھاڑیوں میں پھنس گیا اور اسی طرح بے ہوش یا نیم بے ہوش دو چار گھنٹے نہیں، اڑتالیس گھنٹے یعنی پورے دو دن وہاں پڑا رہا۔ تیسرے دن وہ وہاں سے اٹھ سکا اور چونکہ اس کی آنکھیں جا چکی تھیں وہ محض اٹکل سے ہماری طرف منہ اٹھا کر چلنے لگا یہ محض حسن اتفاق تھا کہ اس کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ ورنہ اس کا رخ ہندوستانی سپاہیوں کی طرف بھی ہوسکتا تھا۔ جس کے نتیجے میں اس کی موت یقینی ہوتی۔ ہر سال ہم نے دیکھا کہ ایک سپاہی آہستہ آہستہ ہماری طرف آرہا ہے اس کے چلنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کو نظر نہیں آتا جب وہ قریب آیا اور ہم نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو وہی بندہ ہے جو تین دن پہلے پہاڑی سے نیچے گرا تھا اور جسے ہم مردہ سمجھ چکے تھے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ کشمیر کی لڑائی میں جو جذبہ، جو ذوق جہاد اور شوق شہادت نظر آیا۔ پھر اس کی نظیر دیکھنے میں نہیں آئی کشمیر میں فائر بندی کے بعد میں اپنی یونٹ کے ساتھ ایبٹ آباد گیا۔ کچھ دنوں کوہاٹ میں رہا۔ اس کے بعد پی ایم اے میں تبادلہ ہو گیا۔

پی۔ ایم۔ اے کا دور

پی۔ ایم۔ اے میں میں دو سال سے کچھ دن زائد عرصہ اگست ۱۹۵۲ء تک رہا۔ وہاں میں چھٹے پی۔ ایم۔ اے کورس کا انسٹرکٹر تھا۔ میں خالد کمپنی کی نمبر دو پلاٹون کا کمانڈر تھا۔ پی۔ ایم۔ اے میں اپنی تعیناتی کے آخری ایک مہینے میں وہاں کا ایجوٹینٹ بھی رہا جو میری عمر اور سروس کو دیکھتے ہوتے بہت بڑا اعزاز تھا اس زمانے میں اکیڈمی کے کمانڈانٹ بریگیڈیئر انگل تھے انہیں نے مجھے اس منصب کے لئے منتخب کیا تھا۔ اس منصب سے میرا حوصلہ بلند ہو گیا۔ اور مجھ میں ایک نیا اعتماد پیدا ہوا۔ جو آگے چل کر زندگی کے بہت سے مراحل طے کرنے میں میرے بہت کام آیا۔ میں اپنے تجربے سے کہتا ہوں کہ سینئر افسروں کو جونیئرز کی رہنمائی کرنے اور ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں کبھی بخل سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ خلوص سے کہے ہوئے ایک توصیفی جملے سے بھی کبھی کبھی دنیا بدل جاتی ہے۔ پی۔ ایم۔ اے کے زمانہ قیام کو میری زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس نے میری ذہنی زندگی کو نئی وسعتیں اور میرے احساسات کو نئی گہرائیاں دیں۔ اب تک میں رجمنٹل لائف سے واقف تھا اور میرا علم بیشتر اپنے پیشہ کی کتابوں تک محدود تھا۔ پی۔ ایم۔ اے نے میرے ذہن کے دریچے کھولے۔ خوش قسمتی سے اس زمانے میں پی۔ ایم۔ اے میں ایک سے ایک فاضل سویلین اکیڈیمک انسٹرکٹرز موجود تھے۔ جو نہ صرف بہت ہی نفیس و اعلیٰ انسانی قدروں کے حامل تھے بلکہ علم و فضل، تہذیب و شائستگی میں بھی یکتا و یگانہ تھے۔ اگرچہ میں خود وہاں ملٹری انسٹرکٹر تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں وہاں ایک طالب علم بھی تھا۔ میں نے ان عالم و فاضل شخصیتوں سے بالواسطہ طور پر بہت کچھ سیکھا۔ مسٹر آفتاب، ڈاکٹر ایم ایم احمد، ڈاکٹر اسحاق مسٹر رضوی، سب ایک سے ایک بڑھ کر تھے۔ آرمی افسروں میں اختر ملک، سعید الدین، قاضی رحیم اور فضل مقیم بھی بہت خوب تھے۔ ان سب نے آگے چل کر بہت ترقی کی۔

پی۔ ایم۔ اے میں مجھے اپنے پروفیشن کے گہرے مطالعہ کا موقعہ بھی ملا۔ چونکہ میں یہاں آنے

سے پہلے کشمیر آپریشن میں حصّہ لے چکا تھا۔ اس پس منظر میں جب جنگی تاریخ اور اسٹریٹیجی کا مطالعہ کیا تو نئی روشنی ملی۔

اپنے پی۔ایم۔اے کے تجربہ کی بنا پر میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ جونیئر افسروں اور طلبہ کی تربیت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تعلیمی و تربیتی اداروں میں بہترین اور روشن ترین شخصیتوں کو یکجا کیا جائے۔ ایسے لوگ پارس پتھر کا اثر رکھتے ہیں۔ کہ جو چھو جائے سونا بن جاتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں دو سال

پی۔ایم۔اے کے بعد میں اپنی یونٹ کے ساتھ ۵۴-۱۹۵۲ء تک دو سال مشرقی پاکستان میں رہا۔ میں نے وہاں کے آپریشن جوٹ میں حصّہ لیا۔ تین مہینے میں نے ای پی آر کے ونگ کمانڈر کے طور پر کام کیا۔ وہاں کے عام لوگوں سے ہمارا ربط ضبط تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ کہیں آتے جاتے انہیں فاصلے سے دیکھتے تھے اور خود وہ فوجیوں سے خوف زدہ نظر آتے تھے۔ اور شعوری طور پر دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور بنگالی رینکس ضرورت سے زیادہ فرماں بردار تھے یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ضرورت سے زیادہ اطاعت شعاری خوف یا بیگانگی کی علامت ہوتی ہے۔ اب رہے بنگالی افسر تو وہ اس وقت بھی خوش نہیں تھے وہ سمجھتے تھے کہ انہیں نظر انداز کیا جارہا ہے۔ فوج کے اعلیٰ منصبوں پر بنگالی کم تھے۔ اور ہوتے بھی کیسے، اعلیٰ عہدوں پر پہنچتے پہنچتے کچھ وقت لگتا ہے لیکن جہاں علاقائی عصبیت کا جوش و جذبہ کارفرما ہو وہاں دلیل سے کام نہیں چلتا۔ مختصر یہ کہ ایک طرف نہیں دونوں طرف باہمی اعتماد کی کمی تھی۔ مثلاً اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب آپریشن جوٹ شروع ہوا تو مجھے عارضی طور پر ای پی آر سے منسلک کیا گیا اور ایک ونگ کی کمان دی گئی اس سے اعتماد کی کمی ہی ظاہر ہوتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زیادہ تر شکایتیں بے جا تھیں یا غلط فہمی پر مبنی تھیں۔ لیکن جو کچھ جائز شکایتیں تھیں ان کو وہاں کے سیاسی لیڈروں نے اپنے مفاد کی خاطر بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور عوام کے جذبات کو خوب بھڑکایا

بدقسمتی سے ہمارے سول افسروں نے بھی جن کا بنگالی عوام سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا۔ اپنے آپ کو لیئے دیئے رکھا زبان اور کلچر کے فرق کو عبور کرنے کی انہوں نے شعوری طور پہ منروری کوشش نہیں کی۔ ہمارے دشمنوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ واقعہ یہ ہے کہ جذباتی طور پر نئی نسل ہم سے بہت پہلے علیحدہ ہو چکی تھی۔ ویسے اگر ہم شعوری طور پر چاہتے تو یقیناً نتائج مختلف ہوتے۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ ای پی آر کے بعد میں تین مہینے انٹرنل سیکورٹی ڈیوٹی پر ای پی آر کے ساتھ سلہٹ میں رہا۔ اس بنگالی کمپنی نے میرے ساتھ مکمل طور پر تعاون کیا مجھے کوئی گلہ شکوہ نہ اس وقت تھا اور نہ اب ہے۔ اس کی سیدھی سی وجہ یہ تھی کہ میں نے شروع دن سے ان کو اپنا سمجھا ان سے جتنا گھل مل سکتا تھا ملا۔ ان کے دکھ درد میں شریک رہا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں ہر حال میں اپنی کمپنی کے ساتھ رہتا تھا میں نے ان مراعات سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جن سے بحیثیت کمپنی کمانڈر کے استفادہ کرنے کا میں مجاز تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بارڈر ڈیوٹی کے مرحلے میں میں ان کے ساتھ ہوتا تھا حتیٰ کہ جب وہ باہر کھلے میدان میں سوتے تھے تو میں بھی باہر ہی سوتا تھا۔ مشرقی پاکستان میں عام لوگوں سے ہمارا واسطہ کم بلکہ بہت ہی کم تھا لیکن جو کچھ بھی تھا اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم پکی عمر کے لوگ بہت مذہبی تھے۔ شعائر اسلام کا بہت لحاظ کرتے تھے بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور بیشتر افراد لرزہ خیز حد تک غریب تھے۔ ان کو دیکھ کر دکھ ہوتا تھا یا اللہ یہ بھی تیرے بندے ہیں۔ اس وقت کی مشرقی پاکستان کی تمام صورت حال پر میں یہ تبصرہ کروں گا کہ دونوں طرف کی سول لیڈرشپ ناکام ہوئی۔ یہاں مجھے ایک شعر یاد آیا۔

کچھ ان کا تغافل بھی تھا باعث بربادی
کچھ تاک بسر ہونا ہم کو بھی گوارا تھا

میں وہاں کم و بیش دو سال رہا اس عرصے میں چھٹی لے کر رنگون بھی گیا جہاں بہادر شاہ ظفر کا خستہ مزار بھی دیکھا اس کے علاوہ شارٹ کورس پر مغربی پاکستان بھی آتا رہا۔ اس دوران ایک بار میرا تبادلہ ڈیو ہیڈکوارٹرز میں بھی کر دیا گیا تھا لیکن میں نے درخواست دی کہ مجھے تبدیل

نہ کیا جائے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ سپاہی کے جوہر نو تنگ و دو کی زندگی ہی میں کھلتے ہیں۔اس لئے اسٹاف افسر بننے کی بجائے میں نے اپنی یونٹ میں رہنا پسند کیا۔مشرقی پاکستان سے واپسی کے سفر کی ایک دلچسپ بات یاد آئی۔ہوا یوں کہ ہم جس بحری جہاز سے واپس آرہے تھے اس کا نام سفینۂ نصرت تھا۔اس میں چوہے بہت تھے اور انہوں نے بہت پریشان کر رکھا تھا کوئی کیبن ان کی یلغار سے محفوظ نہیں تھا ان چھوٹے کمروں میں کھانے پینے کی چیزیں نو خیر کیا ہوتیں بستر کے ساتھ ہینگر پر پتلونیں قمیضیں ٹنگی ہوتیں اب ایک عجیب تماشا ہوا کہ صبح کو سو کر اٹھتے اور کپڑے تبدیل کرنے لگتے تو قمیض اور پتلون کے بٹن غائب ہوتے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے بٹن کون غائب کرتا ہے اور کیوں؟ بعد کو پتہ چلا کہ یہ چوہوں کی کارستانی تھی ایک صاحب جن کے کپڑوں کے بٹن اکثر غائب ہوتے بہت بھناتے ہوئے تھے وہ دشمن کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتے تھے۔لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔کوئی ظالم رات کی تاریکی میں اپنا کام کر جاتا اور ایک روز اتفاق سے وہ صاحب لائٹ آوٹ کئے بغیر سوتے تو ان کے بٹن محفوظ رہے۔اس طرح تجربے سے معلوم ہوا کہ روشنی میں چوہے حملہ آور نہیں ہوتے تو سب لوگ روشنی کر کے سونے لگے اور اس مصیبت سے نجات ملی۔اس تجربے سے میں نے ایک اور نتیجہ بھی نکالا وہ یہ کہ دشمن کوئی بھی ہو تاریکی اس کو بہت راس آتی ہے ہر قسم کی تاریکی، اور یہ کہ دشمن کے طریقہ واردات کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے اور پھر اس کا توڑ نکالنا چاہیئے ہر تاریکی کا جواب روشنی ہے۔فہم و فراست، عزم و ہمت کی روشنی۔

اسٹاف کالج کوئٹہ

ستمبر ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۵ء تک میں اپنی یونٹ کے ساتھ ملتان میں رہا۔۱۹۵۶ء میں میں نے اسٹاف کالج کیا وہ بھی کیپٹن کی حیثیت سے۔ اس کی بھی الگ اپنی کہانی ہے۔وہ یوں کہ مجھے کیپٹن سے میجر کے عہدہ پر ترقی ملنی تھی۔اور مجھے اسٹاف کالج بھی جانا تھا۔میری اپنی بٹالین میں کوئی آسامی خالی نہیں تھی۔

اس کا حل ایم ایس برانچ نے یہ نکالا کہ مجھے ایک اور ایف ایف بٹالین میں پوسٹ کیا تاکہ میں وہاں جاکر رینک لوں اور پھر وہاں سے اسٹاف کالج کے لئے کوئٹہ جاؤں۔ میں نے پھر درخواست کی مجھے اپنی یونٹ سے تبدیل نہ کیا جائے میں رینک میں دیر قبول کرنے کو تیار ہوں اور یہ کہ مجھے بحیثیت کیپٹن کے کورس کرنے میں کوئی اعتراض نہیں چنانچہ میں نے اسٹاف کالج کیپٹن کے رینک میں کیا۔ یہ غالباً ریکارڈ ہے کہ میں نے رینک چھوڑا لیکن یونٹ نہیں چھوڑی۔ ایک بار اور بھی جب ایسٹ پاکستان گیریژن کے ہیڈکوارٹرز میں پوسٹ کیا گیا تھا۔ تو اس وقت بھی وہاں جانا میں نے پسند نہیں کیا تھا۔ اور یہ بے وجہ نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ جہاں تک ہوسکے افسر کو اپنے یونٹ میں رہنا چاہیئے تاکہ ساتھیوں اور جوانوں سے اس کا رشتہ اور تعلق نہ صرف قائم رہے بلکہ مضبوط تر ہوتا جائے۔ جب لڑائی چھڑتی ہے تو ملٹری قانون کام نہیں آتا بلکہ یہ تعلق، یہ رشتہ کام آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایکٹو ڈیوٹی پر رہنے سے نہ صرف آدمی ایکٹو رہتا ہے۔ بلکہ اپنے پروفیشن کا بھی عملی تجربہ تازہ رہتا ہے بہرحال اپنا اپنا خیال ہے۔ میں ٹروپس کے قریب رہنا پسند کرتا ہوں۔

اسٹاف کالج سے آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسٹاف کالج کوئٹہ میں ایک سال کا کورس کرنے سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس کے ذریعہ سے میں جنگ کے ٹیکٹیکل اور عملی اسرار و رموز سے آگاہ ہوا اور جب دوبارہ جنگ میں عملی طور پر حصّہ لینے کا موقعہ ملا تو یہ علم و تجربہ میرے بہت کام آیا۔ اس لئے اسٹاف کورس اور وار کورس کو میں یونٹ کی کمان اور اس سے اوپر کی ذمّہ داریوں کے لئے ایک ضروری تجربہ سمجھتا ہوں۔

ایس ایس جی

۱۹۶۰ء میں، جنرل اقبال ایک مختصر کورس کے لئے اسپیشل سروس گروپ چراٹ گئے اس زمانے میں وہاں کے کمانڈانٹ جہاں خود بہت فعّال اور سخت کوش تھے اپنے نام کی مٹھاس کے عکس اپنے بے حد سخت بلکہ درشت اور بے لچک رویّے کی تلخی کے لئے بھی خاص شہرت

رکھتے تھے (گو دل کے بہت فیاض اور دوستوں کے دوست بھی تھے) چنانچہ اقبال صاحب کا بھی ان سے اختلاف ہوا۔ چونکہ اس واقعہ سے اقبال صاحب کے مزاج اور کردار پر خصوصی روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے ہم یہ واقعہ یا حادثہ ان ہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

"ہوا یوں کہ ایک اکسرسائز تھی اس سلسلے میں کمانڈانٹ نے میری اور میجر اسلم کی کارکردگی پر کچھ ایسے انداز اور ایسے الفاظ میں تبصرہ کیا جو مجھے ناگوار گذرا۔ وہ ٹیرر Terror مشہور تھے اور ان کے سامنے کسی کو زبان کھولنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے ان کے اس رویئے پر ان سے احتجاج کرنا ضروری سمجھا یہ میرا حق تھا۔ اور اخلاقی فرض بھی، اخلاقی فرض اس لحاظ سے کہ جب میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو بجائے اس کے کہ میں پیٹھ پیچھے برا بھلا کہوں اور دل کے پھپھولے پھوڑوں اخلاقی جرأت کا تقاضا یہی تھا کہ دوٹوک سامنے بات کروں اور اپنے ساتھ کی ہوئی زیادتی کا انصاف چاہوں۔ چنانچہ میں نے ان صاحب سے انٹرویو مانگ لیا۔ دوستوں نے کہا بھی کہ کیوں شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالتے ہو۔ نوکری میں گرم و سرد باتیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ لیکن میں نہ مانا۔ اور جناب ان کے دفتر میں پیشی ہوگئی۔ میرے ساتھ کالج کے میجر اسلم بھی تھے (جو بعد میں بریگیڈیئر اسلم بچہ کے نام سے مشہور ہوتے اور اب مرحوم ہو چکے ہیں) کمانڈانٹ صاحب نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں پوچھا۔ اقبال تمہیں کیا شکایت ہے۔ میں نے نہایت ادب سے کہا سر، جو رویّہ آپ نے ہم فیلڈ افسروں کے ساتھ روا رکھا ہے وہ ناقابل برداشت ہے۔ ان حالات میں کم از کم میں یہاں رہنا پسند نہیں کروں گا۔ براہ کرم مجھے تو پوسٹ آؤٹ کرا دیا جائے۔ شکریہ۔ انہوں نے یہ الفاظ ایک جونیئر افسر سے کہاں سنے تھے ان کے چہرے کا ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ پھر ایک دم کرسی سے اٹھے۔ دو تین قدم ٹہلے اور پھر اسلم سے پوچھا تم کیا کہتے ہو؟ اسلم نے کہا، سر، میں میجر اقبال سے سراسر متفق ہوں میں بھی پوسٹنگ چاہتا ہوں اور اس مکالمے پر یہ انٹرویو ختم ہوگیا۔ میں کمانڈانٹ کی داد دیتا ہوں کہ کم از کم اس موقعہ پر انہوں نے کسی غیر معمولی برہمی کا اظہار نہیں کیا اور نہ کوئی انتقامی کارروائی

کی۔ چند دنوں کے بعد ہم دونوں ایس ایس جی سے پوسٹ کر دیئے گئے۔ یہاں میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ بعد کے زمانے میں ہم بہت اچھے دوست ہو گئے تھے۔ زندگی میں ایسے چند اور مواقع بھی آئے جب کسی سینئر سے اتفاق نہ ہوا۔ حدود کے اندر رہتے ہوئے میں نے ہمیشہ اس اختلاف کا برملا اظہار کیا اس سے ایک دوبار بہت نازک صورت حال بھی پیدا ہوئی لیکن میں نے اپنی انا کا ہمیشہ احترام کیا میں یس مین کو اور یس مین ہونے کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ اصل وفاداری یہی ہے کہ آدمی کام کا کھرا بھی ہو اور بات کا کھرا بھی۔

اسٹاف کالج سے رن کچھ تک

اسٹاف کالج سے فارغ ہونے کے بعد جنرل اقبال آزاد کشمیر کے ایک بریگیڈ میں بریگیڈ میجر کے طور پر پوسٹ ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے فرانسیسی زبان میں ترجمانی کا ایک کورس کیا جس کی تکمیل فرانس میں جا کر کی۔ ۱۹۵۸ء میں دوبارہ ایک بریگیڈ کے بی ایم رہے۔ ۶۳-۱۹۶۲ء کے دوران کانگو میں پاکستانی دستے کے ہیڈکوارٹرز میں جی ایس او ٹو کے منصب پر فائز رہے۔ وہاں سے آنے کے بعد ۲ ایف ایف کے سیکنڈ ان کمانڈ مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں انہیں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی۔ اور جس یونٹ میں کمیشن ملا تھا اسی کی کمان کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے مینگل آپریشن میں حصہ لیا اور اس سے نہایت کامیابی سے عہدہ برآ ہوئے۔

مینگل آپریشن کے چند قابل ذکر واقعات

اس کارروائی میں اپنے بعض اہم تجربات کے بارے میں جنرل اقبال نے کہا۔

ایک دفعہ میں بٹالین ہیڈکوارٹر سے ۱۶ میل دور ایک کمپنی کے معائنہ کے لئے گیا وہ کمپنی کھلے میدان میں خیمہ زن تھی۔ میری چھٹی حس نے کہا یہ تو دشمن کو شب خون مارنے کی دعوت دینا ہے صبح کا وقت تھا میں نے حکم دیا کہ ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر پوری کمپنی کو اس جگہ سے ہٹا کر

دوسرے محفوظ تر مقام پر پہنچایا جائے۔ حکم کی تعمیل تو کی گئی۔ لیکن افراتفری میں ٹرانسپورٹ کے اونٹ وہیں بندھے رہ گئے۔ دوپہر کو جیساکہ میرا خیال تھا باغیوں نے بڑی زبردست فائرنگ کی کمپنی کے اس پڑاؤ کی جگہ پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی۔ ایک اونٹ مارا گیا۔ اس واقعہ سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کمانڈر کو اپنی چھٹی حس کو بھی کام میں لانا چاہیئے بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ جب تک کسی بھی کام میں انسان کی چھٹی حس کام نہ کرنے لگے وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا یہ علم اور تجربے سے بعد کی منزل ہے۔

ایک ناقابل فراموش واقعہ

اس کے تیسرے دن میری زندگی کا وہ ناقابل فراموش واقعہ پیش آیا جسے میں بطور خاص بیان کرنا چاہتا ہوں ہم کوہ زندہ کو گھیرے میں لینے کے لئے رات کو گئے۔ جب صبح ہوئی تو ہم چوٹی کی طرف بڑھنے لگے میں بٹالین ہیڈکوارٹر کے ساتھ تھا۔ سب لوگ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر چلتے آگے بڑھ رہے تھے۔ اتنے میں یکایک گولیاں آنے لگیں اور بہت قریب گرنے لگیں۔ میرے این۔سی۔او۔ اور آفیسر نے بھاگ کر ایک بڑی چٹان کے نیچے پناہ لی۔ یہ بہت نازک لمحہ تھا خطرہ کا احساس مجھے بھی تھا۔ بولڈر کے نیچے اور ادھر ادھر پناہ گاہوں سے میرے جوانوں اور افسروں نے چلّانا شروع کردیا۔ سر۔ رن فاسٹ۔ سر، رن فاسٹ، لیکن میں نے اپنی رفتار کو قائم رکھا۔ ایک قدم تیز نہیں اٹھایا۔ موت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنی جاسکتی تھی۔ لیکن یہی لمحہ میری جرأت اور فراست کے امتحان کا بھی تھا۔ اگر جان بچانے کے لئے بھاگتا تو جان بچتی نہ بچتی، کمانڈری ضرور بھینٹ چڑھ جاتی لڑائی میں فضا کچھ ایسی ہوتی ہے کہ ڈرے ہوئے سب ہوتے ہیں لیکن جو اس کا برملا اظہار کرے وہ مارا جاتا ہے۔ تو مختصر یہ کہ گولیاں آس پاس چند قدم کے فاصلے پر گرتی رہیں اور میں چھڑی ہاتھ میں لئے بے نیازی سے چلتا رہا۔ اتفاق دیکھئے کہ میرا نہ بھاگنا ہی مجھے بچا گیا۔ جدھر پناہ لینے کے لئے بھاگتا تھا اسی طرف بوچھاڑ زیادہ تھی

اگر میں ادھر بھاگتا تو یقیناً کسی گولی کا شکار ہوجاتا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ لڑائی میں بے شمار لوگوں کو اتفاقاً بچتے دیکھ دیکھ کر یہ یقین پختہ ہوجاتا ہے کہ جب موت آنی ہے تو آتی ہے۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ جو گولی میرے لئے بنی نہیں وہ مجھے لگ نہیں سکتی۔ لڑائی میں حالت یہ ہوتی ہے کہ دوسرے لمحہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ جب تک آواز آتی رہے زندگی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد میں بٹالین کو کوئٹہ لے آیا۔ اس بنیگل آپریشن میں مجھے کمانڈر انچیف کا کمنڈیشن کارڈ بھی ملا تھا۔

کمانڈر کا رول

لوگ اکثر مجھ سے لڑائی میں کمانڈر کے رول کے بارے پوچھتے رہتے ہیں۔ ان کو میرا جواب یہ ہوتا ہے چونکہ جنگ میں ساری بٹالین کی نگاہیں کمانڈر پر مرکوز ہوتی ہیں۔ اس لئے میدان کارزار میں وہ اس طرح اپنے آدمیوں کے ساتھ ہو کہ اسے سنا بھی جا سکے اور دیکھا بھی جا سکے۔

میں سمجھتا ہوں کہ قیادت کو موثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ کمانڈر قصداً اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کے دکھائے تاکہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ ان کا کمانڈر کچی مٹی کا نہیں یوں تو عام زندگی میں بھی انسان کی چھٹی حس کام کرتی ہے کہ کون کیا ہے۔ لیکن جنگ میں یہ حس کچھ زیادہ ہی تیز ہوجاتی ہے۔ خطرے کے وقت لوگ بہت کم بولتے ہیں۔ لیکن ایک لفظ سے یا چہرے کے ایک تاثر سے لوگ ایک دوسرے کے دل کی حالت کو بھانپ لیتے ہیں اس لئے اصل ہیرو وہی ہوتا ہے جسے اس کے ماتحت ہیرو مانیں۔"

۱۹۶۴ء کے اس بنیگل آپریشن سے فارغ ہو کر جنرل اقبال نے تقریباً سال بھر اسٹاف کالج کوئٹہ میں انسٹرکٹری کے فرائض انجام دیئے۔ مارچ۔ اپریل ۱۹۶۵ء میں انہوں نے رن کچھ کے معرکے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

رن کچھ کی روئداد

رن کچھ کے علاقے میں کئی تاریخی لڑائیاں لڑی گئی ہیں۔ محمود غزنوی نے ۱۰۲۶ء میں کچھ کے شہر اور مندر سومنات پر تاریخی حملہ کیا تھا۔ ۱۶۵۸ء میں جے سنگھ کی سرکردگی میں ۲۰ ہزار مغل فوج نے دارا شکوہ کا اس علاقے میں پیچھا کیا تھا۔ ۱۷۶۲ء میں سندھ کی کلہوڑا فوج نے میاں غلام شاہ کی کمان میں کچھ پر حملہ کر کے بھوج تک کے علاقے کو فتح کر لیا تھا۔ تقریباً دو سو برس کے بعد پھر اس علاقے میں تلواروں کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ یہ علاقہ بحر عرب کے کنارے نمکین پانی کی وسیع و عریض دلدل ہے۔ سارا علاقہ ہموار ہے۔ کہیں کہیں چار چار پانچ فٹ کے ٹیلے ہیں جنہیں بیٹ کہتے ہیں بارش کے موسم میں ہر جگہ پانی ہی پانی ہوتا ہے۔ کچھ کے علاقے کنگر کوٹ میں ۱۹۴۷ سے ویسٹ پاکستان رینجرز وہاں دیکھ بھال کی گشت کرتے تھے۔ مارچ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے یکایک ان کے کام میں مداخلت کرنا شروع کر دی نہ صرف یہ بلکہ جلد ہی انہوں نے کنگر کوٹ کے قلعہ پر بھی اپنی ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔ اور طاقت کے زور پر اس پر قبضہ کرنے کے لئے رن کچھ کے علاقے میں فوج جمع کرنا شروع کر دی۔

اس صورت حال سے نپٹنا رینجرز کی طاقت سے باہر تھا اس لئے فوج کو میدان میں اترنا پڑا اور فوج کے چند جانباز دستے اس علاقے میں فوراً بھیج دیئے گئے۔ جنہوں نے ڈپلو اور رحیم بازار کے علاقے میں پوزیشن سنبھال لی۔ رن کچھ کے معرکے کی داستان بیان کرتے ہوئے جنرل اقبال اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

" رن کچھ میں صرف ابتدائی جھڑپیں مغربی سیکٹر کنگر کوٹ اور سردار پوسٹ پر ہوئیں۔ باقی بیشتر لڑائی کچھ کے مشرقی سیکٹر میں لڑی گئی۔ جس کے کمانڈر بریگیڈیئر افتخار خان جنجوعہ ہلال جرأت تھے۔ میں دو فرنٹیئر فورس بٹالین کی کمان کر رہا تھا۔ مشرقی سیکٹر میں ہندوستانیوں نے کلو تلاؤ چھنڈ بیٹ پوائنٹ ۸۴ اور بیار بیٹ کی چوکیوں پر قبضہ کر رکھا تھا اس کے علاوہ کچھ کے

اندر بھوٹ تک انہوں نے دفاعی قلعے سے بنا رکھے تھے۔ بارڈر سیکورٹی فورس کے علاوہ جو پہلے سے اس علاقے میں متعین تھی دشمن نے اپنی جارحانہ قوت کو مزید مستحکم کرنے کے لئے اپنا ناسور ۰۵۰ پیرا بریگیڈ بھی بلالیا تھا۔

بریگیڈیئر افتخار نے ابتدا میں کئی بار کوشش کی کہ دشمن کو اپنی قلعہ بندیوں سے نکل کر چھوٹے چھوٹے ایکشن لڑنے کی ترغیب دی جائے۔ اس کی چوکیوں پر توپ خانے سے بار بار گولہ باری بھی کرائی لیکن دشمن کسی طرح جوش میں نہ آیا۔ بلکہ جب بھی فائر جاتا ہندوستانی اپنی چوکیوں سے نکل کر ادھر ادھر بھاگنے اور اپنے مقتول، اسلحہ اور ساز و سامان پیچھے چھوڑ جاتے بعد کو یہ اسلحہ اور سامان ہمارے گشتی دستوں کے ہاتھ آتا۔

ایک روز پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین نے کلونلاؤ اور چھڈ بیٹ کی چوکیوں کو نشانہ بنایا اور خوب پٹائی کی۔ توپ خانے اور ایل ایم جی فائر سے وہاں کی گھاس کو آگ لگ گئی اس چال سے ہندوستانی ایسے خوف زدہ ہوئے کہ اپنی خندقوں سے نکل کر بھاگنے لگے۔ انہیں اس طرح بدحواسی کے عالم میں بھاگتے دیکھنے ہنسی آتی تھی۔ کہ دیکھو یہ سپاہی ہیں کہ گھاس کی آگ سے خوف زدہ ہیں۔ کچھ دیر بعد بریگیڈیئر افتخار نے اور میں نے ہیلی کاپٹر میں ہندوستانی چوکیوں پر پرواز کی ہم آگ کے نتائج دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے کافی نیچے پرواز کی لیکن ہندوستانی ایسے حواس باختہ تھے۔ کہ انہوں نے ہمارے ہیلی کاپٹر پر چھوٹے ہتھیاروں کا فائر تک نہیں کیا۔ اس روز شام کو ایک اور تماشا ہوا۔ پنجاب رجمنٹ کی اس بٹالین نے جس نے گلونلاؤ پر حملہ کیا تھا۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ دی کہ ان کا بارود کا ذخیرہ جوں کا توں ہے۔ جس نے سنا یہی کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے ساتھ ہی یہ بھی خیال آتا تھا کہ بٹالین کی رپورٹ غلط بھی نہیں ہو سکتی۔ اس معمے کو حل کرنے کے لیے جب تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ بٹالین نے جتنا ایمونیشن صرف کیا تھا اس سے زیادہ گلونلاؤ کی چوکی میں اس کے ہاتھ لگا تھا۔ لڑائی کے اس مرحلے میں ایک اور پنجاب بٹالین کے ایک نوجوان لیفٹیننٹ نادر پرویز نے پوائنٹ ۸۴ کے شمال میں دشمن کی ایک چوکی پر بڑی دلیری سے

حملہ کیا اور اسے مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ ہمیں یہ کامیابیاں نصیب ہو رہی تھیں لیکن لڑائی میں مزہ نہیں آ رہا تھا۔ چونکہ دشمن اپنی قلعہ بندیوں سے باہر آ کر لڑنے پر آمادہ نہ ہو رہا تھا۔ اس صورت حال سے نبٹنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اندر جا کر دشمن کی سرکوبی کی جائے پہلے منصوبہ یہ تھا کہ پوائنٹ ۸۴ کو سر کرنے کے بعد چھڈ بیٹ کی دشمن کی چوکی پر قبضہ کرنا ہے لیکن بعد کو بعض اسباب کی بنا پر بریگیڈیئر افتخار نے یہ فیصلہ کیا پوائنٹ ۸۴ پر قبضہ کرنے کے بعد بیار بیٹ پر حملہ کیا جائے چنانچہ ۲۴ اپریل ۱۹۶۵ء کو پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین نے پوائنٹ ۸۴ پر یلغار کی۔ لیکن ایک بار پھر ہندوستانیوں نے تھوڑی سی مزاحمت کے بعد راہِ فرار اختیار کی۔ چنانچہ اس بٹالین نے پوزیشنوں کو سر کر لیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک افسر لیفٹیننٹ شرما اور تین او۔ آر ز کو جنگی قیدی بھی بنالیا اسی معرکے میں بریگیڈیئر افتخار کے بازو میں بم کے ایک ٹکڑے سے معمولی زخم بھی آیا۔ لیکن وہ بدستور شریک کارزار رہے اب تک کے معرکوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ دشمن جم کر لڑنا نہیں چاہتا۔ اور نہ اس میں لڑنے کا حوصلہ ہے بریگیڈیئر افتخار نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔

۲۵ر اپریل ۱۹۶۵ء کو مجھے بریگیڈیئر افتخار جنجوعہ نے حکم دیا کہ میں بیار بیٹ پر حملہ کروں میری بٹالین کے ساتھ چند ٹینک اور ۱۵ ایف ایف بٹالین کی ایک کمپنی تھی۔ اس معرکے میں میرا یہ پہلا مکمل ٹکراؤ تھا اس وقت میری مثال اس باکسر کی سی تھی جسے اپنے زورِ بازو پر بھروسہ ہو اور جو ریفری کی آواز سیکنڈز آؤٹ آف دی رنگ اور باکس آن سننے کے لئے بیتاب ہوتا ہے۔ چونکہ سارا علاقہ فٹ بال گراؤنڈ کی طرح ہموار ہے اور کہیں کوئی چھپاؤ کا ذریعہ نہیں لہٰذا ہم نے طے کیا کہ دوسرے روز صبح سویرے حملہ کا آغاز کیا جائے۔ اس وقت ہم پوائنٹ ۸۴ پر بیار بیٹ سے تقریباً ۸ میل کے فاصلے پر تھے۔ اس روز سہ پہر کو ایف ایف کے میجر شکور جان بیار بیٹ کی طرف گشتی دستے کو لیکر گئے دشمن نے سمجھا کہ یہ دن ڈھلتے حملے کی تیاری ہے اپنے تمام ہتھیاروں سے فائر کھول دیا۔ اس طرح اس کی ساری پوزیشن آشکارا ہو گئی۔

میجر شکور جان کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں ہم نے اپنے اقدامات کا تعین کیا۔ یہ ۲۵ اپریل کی شام تھی۔ کچھ پر ۲۵ اپریل کا تابناک سورج غروب ہو رہا تھا۔ حد نظر تک پھیلے میدان پر آہستہ آہستہ اندھیرا اتر رہا تھا۔ پہلے سی پھیلی ہوئی خاموشی اور گھمبیر ہو گئی تھی۔ لیکن میں اور میرے ساتھی جلد سے جلد کارروائی شروع کرنے کے لئے بے چین تھے لڑائی سے پہلے کے لمحات بڑے صبر آزما کھنچاؤ کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن جب حملہ شروع ہو جائے تو اعصاب پر اتنا دباؤ نہیں رہتا۔ بہرحال رات کا پچھلا پہر گزرنے پر ۳ بجے میرے زیر کمان تمام دستے حرکت میں آگئے وہ رات بہت اندھیری اور پراسرار حد تک خاموش تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ستاروں نے چمکنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے مقصود کی طرف بڑھ رہے تھے۔ توپچی ہدف (ٹارگٹ) پر اکادکا فائر کرتے رہے اس سے ہمیں سمت کا اندازہ ہوتا رہا۔ ۲۶ اپریل کی صبح کچھ کا افق توپوں اور مشین گنوں کے فائر سے سرخ ہو رہا تھا۔ اور ان کی گھن گرج سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ فرنٹیئر فورس اور کیولری کے جوان اور افسر اپنے شکار پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تیار کھڑے تھے اور کوڈ ورڈ ایڈوانس خاکی سننے کے لئے بیتاب تھے۔ لیکن شکار پر جھپٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگی جوں ہی "بزن" کا اشارہ ملا ہم بھوکے شیروں کی طرح جھپٹ پڑے ظاہر ہے کہ اس عرصے میں دشمن سویا ہوا نہیں تھا۔ لڑائی میں سویا ہوا کون ہوتا ہے اپنی جان اور ملک سے پیار کسے نہیں ہوتا۔ دشمن بھی چوکس تھا۔ اور پوری طرح چوکس تھا اور انصاف کی بات یہ ہے کہ اس نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور اپنی پوزیشنوں کو بچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن فرنٹیئر فورس کے شیر دلوں کا مقابلہ کون کرتا۔ ذوق یقین سے تو زنجیریں بھی کٹ جاتی ہیں۔ جوش ایمانی کی ٹھوکر سے تو صحرا و دریا بھی دونیم ہو جاتے ہیں۔ فرنٹیئر فورس کی اس کریک بٹالین کے سامنے دشمن کیا ٹھہرتا اس موقعہ پر چھوٹے بڑے مختلف ہتھیاروں کے فائر سے وہ حشر برپا تھا کہ حملہ آور دستے کی رفتار میں قدرے کمی آگئی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر دستے کا کمانڈر گرجا۔ اور اس نے وہ تاریخی الفاظ دہرائے۔ جنہوں نے جوانوں

میں بجلی دوڑا دی۔ وہ اتاترک کا یہ تاریخی فقرہ تھا یعنی میں حملہ کرنے کو نہیں کہہ رہا جوانو! میں جان دینے کو کہہ رہا ہوں۔"

اور واقعی جوان جان دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ جوانوں نے علی! علی! کا نعرہ لگایا اور چند منٹ بعد ہراول دستہ بیاربیٹ پر جا پڑا۔ ہندوستانی فوج سے پاکستانی دستے کا یہ پہلا کھلا اور باقاعدہ ٹکراؤ تھا۔ یہاں تلوار سے تلوار ہی نہیں ٹکرا رہی تھی۔ بلکہ حوصلے، لڑنے کے عزم اور ایمان و یقین کا امتحان بھی تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم سرخ رو ہوئے گویا پوری قوم سرخ رو ہوئی پورا پاکستان سرخ رو ہوا۔ اور دشمن نے میدان چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا اور پیچھے بے شمار اسٹورز ایمونیشن، کرہ اور پوڑی چھوڑ کر بھاگے۔ ہم نے کچھ قیدی بھی بناتے۔ ہم نے بیاربیٹ پر ہی قبضہ نہیں کیا بلکہ اس سے پانچ چھ میل آگے کا علاقہ بھی دشمن سے صاف کر دیا اس مرحلہ پر بریگیڈ کمانڈر کو احکامات موصول ہوئے کہ مزید پیش قدمی نہ کی جائے۔ غالباً پیش قدمی کے سیاسی مضمرات کی وجہ سے ورنہ کریم شاہی سے چھڈبیٹ تک دشمن کے سارے دستے ہماری یلغار کی زد میں تھے۔

بیاربیٹ پر دشمن کے مورچے قلعہ بندیوں کی شکل میں تھے گہرے، اندر سے ملے ہوئے اور اوپر سے ڈھکے ہوئے ہر مورچہ کے سامنے راکٹ لانچر تھے۔ غرض دفاع کا پورا اور مکمل سامان اور اہتمام تھا اور ان کے اونچی علاقے میں جو اکا دکا درخت تھے ان پر چھپے بیٹھے تھے۔ لیکن لڑائی تو سامان سے نہیں حوصلہ سے لڑی جاتی ہے۔

دن کے تقریباً نو بجے جب ہم بیاربیٹ کے بنجر علاقے میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے میں مصروف تھے تو میدان جنگ میں تھوڑی سی تفریح کا موقعہ بھی ملا اور وہ اس طرح کہ افق پر انڈین ایئرفورس کے دو نیٹ طیارے نمودار ہوئے انہوں نے ہماری پوزیشنوں پر کئی بار غوطہ لگایا لیکن ہر بار ان کا نشانہ خطا گیا۔ ہماری طیارہ شکن توپوں نے ان کا صحیح استقبال کیا لیکن ہمارے چند رائفل برداروں کا جوش و خروش بھی دیدنی تھا انہوں نے اپنے نشانے باندھے بعد کو قسمیں کھاتے تھے کہ بس انچ دو انچ کی کسر رہ گئی اس سے آپ ان کے مورال کا اندازہ کر سکتے ہیں

۲۷-۲۹ اپریل کو ہم نے دشمن کی سات مرسڈیز گاڑیوں کو گھیرے میں لے کر پکڑا جو قیمتی اور ضروری سازوسامان سے بھری ہوئی تھیں۔

اس طرح بیاربیٹ کا معرکہ انجام کو پہنچا۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ جو قیدی ہم نے پکڑے تھے وہ انڈین آرمی کی ایک کمانڈو کمپنی کے بہادر تھے جوان کے پیرا بریگیڈ کے ساتھ منسلک تھی۔ اس معرکے کے دو مہینے بعد تک دشمن نے اپنی خندقوں سے باہر آنے کی جرأت نہیں کی اس ٹکراؤ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ جنگ صرف سازوسامان کا تصادم ہی نہیں عزم و حوصلہ کا امتحان بھی ہوتی ہے رن کچھ کے معرکہ میں عزم و حوصلہ کے بے نظیر مظاہرے میں نے دیکھے وہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ ان واقعات میں سے میں صرف ایک کا ذکر کروں گا۔

جس دن پوائنٹ ۸۴ پر حملہ کیا بیٹری کمانڈر میرے ساتھ جا رہا تھا۔ ایک سپاہی راکٹ لانچر اٹھائے ہوئے جا رہا تھا۔ سپاہی نوجوان تھا۔ لیکن قدرے کمزور تھا۔ راکٹ اور لانچر لے کر چلنا اس کے لئے خاصا دشوار تھا۔ بیٹری کمانڈر نے ازرہ ہمدردی کہا لاؤ لانچر مجھے دے دو، یہ سن کر اس غیور نے جواب دیا۔ سر، گائیڈ بٹالین کا سپاہی اپنا ہتھیار کسی کو نہیں دیتا۔

مجھے اس سپاہی کا یہ بے ساختہ جواب پسند آیا۔ جنگ میں آدمی کا سارے ملمع اتر جاتا ہے۔ شرافت اور ذلالت دونوں کے ایسے مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ کہ آدمی بھی کیا چیز ہے ایسی بلندی، ایسی پستی۔

امتیازی سند

رن کچھ کے اس معرکہ میں امتیازی کارکردگی کے لئے اقبال صاحب کو امتیازی سند عطا کی گئی تھی۔

اسٹاف کالج کوئٹہ میں دوسرا دور

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد، جنرل اقبال، لیفٹیننٹ کرنل کی حیثیت سے صدر پاکستان

کے مشیرِ دفاع کے اسٹاف پر رہے۔ ۱۹۶۶ء میں وہ ایک بار پھر اسٹاف کالج کوئٹہ میں واکورس میں انسٹرکٹر کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں انہیں کرنل کے عہدے پر ترقی ملی اور وہیں اسٹاف ونگ میں سینئر انسٹرکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔

۱۹۶۹ء میں اقبال صاحب بریگیڈیئر ہوتے اور پشاور میں ۱۰۲ بریگیڈ کو تقریباً ایک سال کمان کیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء کی انٹر سروسز پریڈ کی قیادت بھی کی۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں وہ ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس مقرر ہوئے۔ جی۔ ایچ۔ کیو میں یہ ان کی پہلی پوسٹنگ تھی۔ ۱۹۷۱ء کے اواخر تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ اس منصب پر امتیازی کارکردگی کے لئے انہیں ستارہ قائداعظم کے اعزاز سے نوازا گیا۔

۱۹۷۱ء کے بعد کچھ عرصے کے لئے جنرل اقبال نے آپریشن کے شعبہ میں جی ایچ کیو ہی میں وائس چیف آف جنرل اسٹاف کے طور پر بھی کام کیا۔ مارچ ۱۹۷۲ء میں انہیں میجر جنرل کے عہدہ پر ترقی ملی اور سندھ میں ۳۳ ڈویژن کی کمان سنبھالی۔ اور اس حیثیت میں ۷۱ء کی جنگ کے بعد کے سرحدی مذاکرات میں اپنے ملک کی نمائندگی کی۔

کچھ عرصے کے بعد جب یہی ڈویژن بلوچستان میں کاونٹر انسرجنسی آپریشن کے لئے حرکت میں آیا۔ تو وہ قومی مفادات کے تحفّظ کے لئے مصروف رہے۔ اس خدمت کے لئے انہیں ستارۂ بسالت کا تمغہ دیا گیا۔ جو زمانہ امن میں شجاعت کا اعزاز ہے۔

۱۹۷۴ء میں، جنرل اقبال نے بہاولپور میں ۳۵ ڈویژن کی کمان کی۔ اور ۱۹۷۵ء میں انہیں چیف آف جنرل اسٹاف بنایا گیا۔ یہ جی ایچ کیو میں ان کی دوسری پوسٹنگ تھی۔ مارچ ۱۹۷۶ء تک جنرل اقبال اس عہدے پر فائز رہے۔ ایک کیریئر افسر کے لئے یہ عہدہ ایک بہت بڑے اعزاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مارچ ۱۹۷۶ء میں اقبال صاحب لیفٹیننٹ جنرل ہوئے۔ اور انہوں نے لاہور میں ایک کور کی کمان سنبھالی۔ اس منصب پر وہ اوائل ۱۹۷۸ء تک فائز رہے۔

جولائی ۱۹۷۷ء جنرل اقبال نے پنجاب کے ایم ایل اے کی اضافی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں جنوری ۱۹۷۸ء سے چند ماہ تک وہ سندھ میں کور کمانڈر اور ایم ایل اے رہے۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۷۸ء میں انہیں ڈپٹی چیف آف آرمی اسٹاف کے منصب پر فائز کیا گیا۔ اور اسی سال انہیں ہلال امتیاز عطا ہوا۔ اپریل ۱۹۸۰ء میں وہ جنرل کے عہدہ کے ساتھ جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۸۱ء کو جنرل اقبال کو نشان امتیاز ملٹری کے اعلیٰ ترین اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

—— تو یہ ہے قطرہ سے گہر ہونے کی مختصر داستان۔

یہ تمام ترقی یہ تمام سرفرازی اور سربلندی محض تقدیر کا کھیل نہیں اور نہ یہ سراسر حالات کی مرہون منت ہے یہ مرتبہ —— طویل جدوجہد، جفاکشی ایک مخصوص لائف اسٹائل، چند خاص قدروں اور روایتوں کا ثمر ہے۔ اور ارشاد ربانی بھی یہی ہے۔

لیس للانسان الا ماسعیٰ

کامیابی و کامرانی اور عزت و شرف کے اس سفر کے پیچھے جو طرز احساس ہے جو ذہن ہے جو سوچ ہے اس کا جواب ان اثرات اور تبصروں میں ہے جو جنرل اقبال نے انٹرویو کے آخر میں ہمارے سوالوں کے جواب میں تفصیل سے بیان کئے۔

جنگ اور جرنیل

جنگ کا فن بنیادی طور پر انسانی کردار کا مطالعہ ہے وہ لوگ جو لڑائی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو لڑتے ہیں قومیں ان ہی دو عناصر کے ہاتھوں ترقی کرتی یا تباہ ہوتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم دنیا کی تاریخ میں بہت بڑی جنگ تھی اس میں بہت سے ہیرو سامنے آئے اور بہت سے بنے ہوئے ہیرو ناکام ہوئے دوسری جنگ عظیم میں بحیثیت مجموعی برٹش جرنیلوں کی کارکردگی بہتر رہی۔ گو انفرادی طور پر جرمن جرنیل بھی کم نہیں تھے۔ اس سوال کا جواب کہ کیا

چیز جرنیل کو جرنیل بناتی ہے؟ آسان نہیں کامیاب جرنیل کا کوئی ایک سانچہ نہیں ہوتا۔ ہر کامیاب جرنیل اپنے طور پر ایک کلاس ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے طور پر ایک علیحدہ کلاس نہیں تو پھر جرنیل ہی نہیں۔ جرنیل کا کام لڑانا ہے لیکن ہر جرنیل کے لڑانے کا طریقہ اپنا ہوتا ہے۔ یہ انفرادیت ہی اسے جرنیل بناتی ہے۔ لیکن کچھ مشترک صفات بھی ہوتی ہیں۔ عزم Determination لڑنے کی امنگ WILL TO FIGHT عسکری فراست وغیرہ میں برٹش جرنیلوں میں آکنلک کو ترجیح دیتا ہوں گو میں جانتا ہوں کہ آکنلک چرچل کو سخت ناپسند تھا اس کی وجوہ سیاسی تھیں آکنلک کا قصور یہ تھا کہ وہ جیتا نہیں جبکہ ان حالات میں کوئی اور بھی جیت نہیں سکتا تھا۔ جرنیلی کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب حالات ناسازگار ہوں جب آدمی بھی کم ہوں اور اسلحہ بھی کم۔ آکنلک کو تندی بادِ مخالف کا سامنا تھا۔ آکنلک کے کیریر کا وہ فیصلہ کن لمحہ تھا جب وہ ریچی کے ہیڈکوارٹرز میں گیا اور اس نے اسے جوابی حملے کا حکم دیا جو یقیناً ایک اہم فیصلہ تھا۔ آکنلک نے اس فیصلہ سے رومیل کا اٹیک پسپا کر دیا شمالی افریقہ کے معرکے میں جنرل ویول کی کارکردگی بھی قابلِ تعریف ہے۔ اگرچہ کامیابی کا سہرا منٹگمری کے سر بندھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب حالات کا رخ موافق ہو، تو جیتنا کمال نہیں ہوتا۔ شمالی افریقہ کے معرکے میں رومیل کی کارکردگی بھی حیران کن تھی۔ رومیل تو عسکری دنیا کا ایک فسانوی کردار بن چکا ہے اس کے عسکری جینیئس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے لیکن اصل میں کچھ ال جرمن ملٹری سسٹم کا بھی ہے جس سے گزر کر ایک اوسط درجے کا جرنیل بھی چمک اٹھتا ہے من قدیم پروشین عسکری روایتوں کے وارث ہیں۔ قومی روایتوں کا اثر بھی پڑتا ہے۔ جفاکشی نت کوشی بدترین حالات میں جمے رہنا۔ اور اپنی برتری پر یقین، اس روایت کی اہم خصوصیات ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں جرمنوں کو شکست ضرور ہوئی لیکن رومیل کے علاوہ ان کے بعض دوسرے نیل بھی عسکری تاریخ کے صفحات پر اپنا نام چھوڑ گئے ہیں۔ مثلاً مینسٹین نے سخت ناسازگار الات بلکہ بدترین حالات میں بھی حوصلہ نہ ہارنے اور اپنی قوت مدافعت پر یقین رکھنے کی تاریخی

مثال قائم کردی جس وقت روسی یلغار کرتے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ اور اس کے ہیڈکوارٹرز سے صرف چند سو گز پر پہنچ چکے تھے منسٹین کے اسٹاف آفیسرز نے کہا سر، اب ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیئے۔ تو اس نے پُرسکون لہجے میں کہا صرف پانچ منٹ اور، اور روسیوں کے پرخچے اڑ جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے اس معرکہ پر ایک کتاب بھی لکھی جسکا عنوان ہے Lost victories

کمان کا لطف

میں نے تقریباً تیس برس ٹروپس کو مختلف سطحوں پر کمان کیا ہے اس سوال کا جواب کہ کمان کا لطف کہاں آیا۔ آسان نہیں اصل میں ہر سطح پر کمان کا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ ان میں آپس میں مقابلہ ٹھیک نہیں۔ پھر بھی محض کمان کے لحاظ سے دیکھا جائے تو میں کہوں گا کہ پلٹن کی کمان اس لحاظ سے بہتر ہوتی ہے کہ یہ براہ راست کمان ہوتی ہے۔ اونچی سطح پر یہی بات ڈویژن کی کمان کے لئے کہی جا سکتی ہے۔ ڈویژن کی کمان میں براہ راست فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کمان کی حس اور خصوصی صلاحیت بھی کسی کسی میں ہوتی ہے یہ کہنا بالکل صحیح نہیں کہ یہ محض خداداد چیز ہے۔ یا اس کا تعلق محض تجربے اور تربیت سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ کامیاب کمان کے لئے تجربہ اور تربیت ضروری عنصر ہے۔ گویا بنیادی شے خداداد صلاحیت ہی ہے۔

یونٹ کی کمان

یونٹ کی کمان ایک ڈائریکٹ کمان ہے۔ کمان پر کمانڈر کی پوری گرفت ہونی چاہیئے۔ چونکہ یونٹ کمان میں مسلسل فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ (قیادت نام ہی کچھ کرنے کا ہے) اس لئے کمانڈر کو بے لچک نہیں، لچکدار ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ صورت حال کے مطابق فیصلہ کر سکے۔

جرأت کا راز

کشمیر اور رن کچھ میں جنگ کا مجھے براہِ راست تجربہ ہے اس کے علاوہ بھی چند

دوسرے آپریشنز میں حصہ لیا ہے۔ لوگوں نے اکثر مجھ سے یہ سوال پوچھا ہے کہ جنگ میں بہادری کے پیچھے کون سی طاقت ہوتی ہے۔ اس کا جواب میں ہمیشہ یہ دیتا ہوں کہ جب فائر کھلا ہوا ہو۔ اور آس پاس آگ برس رہی ہو تو کون انسان ہے جسے خوف محسوس نہ ہوگا۔ لیکن یہ احساس کہ سارے جوانوں کی نگاہیں آپ پر جمی ہوئی ہیں آپ کو مجبور کرتا ہے کہ کوئی ہلکا قدم نہ اٹھے۔ دوسرے اس میں کوئی شک نہیں کہ احساس ذمہ داری اور ملک و قوم سے وفاداری کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے اس سلسلے میں میرا یہ خیال بھی ہے کہ میدان جنگ میں کوئی بیکایک بہادر اور بزدل نہیں ہو جاتا اصل میں میدان جنگ میں بھی انسان وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ زندگی کے کھیل کے میدان میں ہوتا ہے جو وہ اپنی یونٹ میں ہوتا ہے۔ بہادری یا بزدلی اصل میں دو ذہنی رویے ہیں فرق یہ ہے کہ جنگ میں سارے چھلکے اتر جاتے ہیں۔ جنگ میں فریب، ملمع یا ریاکاری نہیں چلتی انسان جیسا اندر سے ہوتا ہے ویسی وہ باہر سے بھی نظر آتا ہے اور دنیا کو صاف نظر آتا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

جرنیل کی اٹھان

کیا جرنیل کی اٹھان ہی کچھ اور ہوتی ہے؟ یہ دلچسپ سوال ہے جو تجربہ اور تحقیق چاہتا ہے میں تعریفاً نہیں واقعتاً بتاتا ہوں کہ میں ۱۹۴۶ء میں بنگلور او ٹی ایس سے نمبر ون پاس آؤٹ ہوا تھا۔ اس کے بعد جب میں سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا تو میرے بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر جانسن نے لکھا تھا۔ کہ یہ افسر بہت ترقی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور جب میں کیپٹن تھا تو جنرل قاضی رحیم نے بھی اسی قسم کی توقعات کا اظہار کیا تھا ٹھیک یاد نہیں کچھ اسی قسم کے الفاظ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے کسی شعبے میں بلند ترین عہدوں پر پہنچنے کا انحصار ایک نہیں کئی عناصر پر ہوتا ہے۔ کچھ اندرونی اور کچھ بیرونی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک سروس پیٹرن SERVICE PATTERN اور لائف اسٹائل LIFE STYLE ضرور ہوتا ہے۔ جو کہ یہ افسر کے لئے اونچائیوں پر پہنچنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔

ذاتی زندگی کی جھلکیاں

جنرل اقبال کی یہ داستان حیات، جو بشیتر ان کے اپنے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ نامکمل رہے گی اگر ان کے پروفیشن سے باہر ان کی دلچسپیوں شوقوں، مشاغل اور پسند و ناپسند کا ذکر نہ کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالیں تاکہ ان کی شخصیت کا یہ مطالعہ کسی پہلو سے تشنہ نہ رہے۔

شکار کا شوق

مجھے بچپن سے شکار کا شوق رہا ہے۔ والد مرحوم کو بھی شکار کا شوق بلکہ جنون تھا۔ شکار ملے یا نہ ملے۔ صبح یا شام چار چھ میل گھومنا ضرور۔ ابھی میں چھوٹا سا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ شکار ان کے نزدیک تفریح ہی کا نہیں تربیت کا ذریعہ بھی تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شکار کی اپنی نفسیات ہوتی ہے ہر آدمی شکاری نہیں بن سکتا۔ اپنی منصبی مصروفیات کی بنا پر اب مجھے شکار پر جانے کا بہت کم وقت ملتا ہے لیکن شوق میں کمی نہیں آئی۔ شکار میں برڈ شوٹنگ میری ترجیح ہے۔

سگریٹ نوشی اور فلم بینی

طالب علمی کے زمانے میں سگریٹ پینے کا شوق مجھے بالکل نہیں تھا۔ ملٹری کالج میں تعلیم کے دوران جب بہت سے لڑکے چوری چھپے سگریٹ پیتے تھے مجھے سگریٹ کی بو سے بھی نفرت تھی۔ بنگلور او۔ ٹی۔ ایس کے زمانے میں بھی میں نے سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ۱۹۴۷ء کے اوائل میں جب اپنے یونٹ کے ساتھ دنک میں تھا وہاں بیشتر برٹش افسر سگریٹ پیتے تھے۔ اس وقت مجھے یہ عادت پڑی اب کو کثرت سے سگریٹ پیتا ہوں۔ فلم دیکھنے کا بھی مجھے شوق نہیں۔ ایک بار بنگلور میں تان سین فلم دیکھی تھی پھر پی۔ ایم۔ اے کی پوسٹنگ کے زمانے میں فلم دیکھتا رہا۔ اب ٹی۔ وی پر بھی نہیں دیکھتا

ٹی۔وی پر صرف خاص خاص پروگرام دیکھتا ہوں اب مسئلہ وقت کا ہے وقت ملے تو مطالعہ کرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

مطالعہ کی سمتیں۔تاریخ اور کلام اقبال

ملٹری ہسٹری اور جنرل ہسٹری کے مطالعہ کے علاوہ مجھے اقبال کے اردو کلام سے دلچسپی رہی ہے۔کلام اقبال سے تعارف تو اسکول کے زمانے ہی میں ہوگیا تھا۔لیکن اقبال سے میری دلچسپی صحیح معنوں میں ان دنوں شروع ہوئی جب میں ۱۹۴۸ء میں کشمیر میں تھا۔میرے سی او کرنل لطیف کا تعلق بھوپال سے تھا وہ اقبال کے عاشق تھے۔کلام اقبال سے موٹیویشن کا کام لیتے سب سے پہلے میں نے انہی کو دیکھا انہوں نے یونٹ میں جگہ جگہ اقبال کے اشعار لکھوا رکھے تھے۔یونٹ کا ماٹو بھی انہوں نے اقبال ہی کے ایک شعر کو بنایا تھا۔وہ شعر تھا۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ

اقبال کے یہ دو شعر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

میرے پسندیدہ اشعار ہیں اور مجھے اکثر یاد آتے ہیں اور ہر بار ان کا نیا تاثر ہوتا ہے۔شاعری۔تاریخ کے بعد میری دوسری محبت ہے۔غالب کی غزلیں میں نے میٹرک کے زمانے میں پڑھی تھیں۔اسکول میں ہمارے اردو کے استاد ماسٹر غلام محمد صاحب خود بھی شاعر تھے۔اور غزلیں بڑے ڈوب کر پڑھاتے تھے۔پھر ملٹری کالج میں آکر بھی شاعری سے تھوڑا بہت تعلق رہا۔کمیشن کے بعد مجھے

قوالی سننے کا شوق بھی ہو گیا تھا۔ اس زمانے کے شاعروں میں، میں نے جگر مراد آبادی اور حفیظ جالندھری کو دلچسپی سے سنا ہے جگر صاحب خوب جھوم کر پڑھتے تھے۔ حفیظ جالندھری سے ان کے شاہنامے کے ذریعے تعارف ہوا تھا۔ جب میں پاکستان ملٹری اکیڈمی میں انسٹرکٹر تھا۔ تو حفیظ صاحب وہاں آئے تھے۔ اور انہوں نے اپنا مشہور پی۔ ایم۔ اے کا ترانہ ہمیں سنایا تھا۔ مجھے وہ ترانہ اتنا پسند آیا تھا کہ ان سے درخواست کی وہ اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کاپی مجھے عطا فرمائیں ایک عرصہ دراز تک حفیظ صاحب کی وہ تحریر میرے پاس رہی۔ نہ جانے پی۔ ایم۔ اے کے کمانڈانٹ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ ترانے کی اصل کاپی میرے پاس ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے لکھا کہ وہ اسے پی ایم اے کے تاریخی نوادرات میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے وہ قیمتی مسودہ پی۔ ایم۔ اے کو پیش کر دیا۔

—— حفیظ صاحب نے جس موثر انداز سے ترانہ پڑھا تھا اس کی یاد اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے دو شعر اب بھی یاد رہ گئے ہیں۔

یہی اک مدرسہ مرکز ہے پاکستان کی فوجوں کا
یہی سرچشمہ ہے ملت کی ذرہ بار موجوں کا
جسے کہتے ہو کیڈٹ اصل میں لفظ قیادت ہے
قیادت اس کو ملتی ہے جسے ذوق شہادت ہے

حفیظ کے شاہنامہ کے علاوہ ان کی غزلیں اور گیت بھی سنے ہیں ابھی تو میں جوان ہوں ملکہ پکھراج نے گایا ہے اور بہت بھرپور گایا ہے۔ اس کو ایک آدھ بار سنا ہے۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی، خبروں اور اہم قومی پروگراموں کے علاوہ بہت کم دیکھتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی مشاعرہ بھی سن لیتا ہوں، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، مظفر وارثی وغیرہ میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔

قرآن حکیم کی تلاوت

میں اس بات کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ الحمدللہ قرآن حکیم کے مطالعہ اور تلاوت کی

سعادت مجھے ہر صبح نصیب ہوتی ہے لیکن محض اس خیال سے بتا رہا ہوں کہ نوجوان افسروں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کو معلوم ہو جاتے کہ میں جو کچھ ہوں وہ کیوں ہوں۔ میری جڑیں کہاں ہیں۔ مجھے توانائی اور روشنی کس چشمے سے ملتی رہی ہے۔ ہر چند کہ میں نے بچپن میں قرآن شریف پڑھا تھا اور گھر میں والدین اس کی تلاوت کیا کرتے تھے مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس کی تلاوت کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اسی طرح وقت گزرتا گیا اور قرآن شریف سے میرا تعلق محض واجبی ہی سا رہا۔ ۱۹۵۰ء میں صورت حال یکایک یکسر بدل گئی۔ ہوا یوں کہ ۱۹۵۰ء میں میں اپنے پھوپھی زاد بھائی کرنل شریف (بعد کو جنرل شریف) کے ہاں پنڈی میں چند روز کے لئے ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ ہر روز صبح سویرے یونی فارم پہننے کے بعد ناشتہ سے پہلے قرآن شریف کی تھوڑی سی تلاوت کرتے تھے انہوں نے مجھے باترجمہ قرآن حکیم کا ایک نسخہ دیا اس وقت سے اب تک میں بھی وردی پہن کر ناشتے سے پہلے خواہ چند آیات ہی پڑھوں قرآن حکیم پڑھتا ضرور ہوں۔ قرآن حکیم کی تلاوت کے ذریعے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ خیریت اور عزت سے دن گزرے، راہ راست پر رہوں، کسی سے زیادتی نہ ہو، اس عادت کی وجہ سے مشکل لمحوں میں بھی میں نے اپنے آپ کو پُرسکون اور مطمئن پایا

اے گردش ایام تیرا شکریہ

جو بلندیوں تک پہنچتا ہے صرف وہی جانتا ہے کہ بلندیوں تک پہنچنے کے لئے کن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور وہاں پہنچ کر کیا احساسات ہوتے ہیں اور زندگی کا کون سا شعور حاصل ہوتا ہے اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے جنرل اقبال سے پوچھا۔

اس منزل پر پہنچ کر زندگی کے بارے میں آپ کے عام تاثرات کیا ہیں؟

ان کا جواب یہ تھا۔

زندگی ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے اب تک اپنی کتاب زندگی کے جو واقعات و حالات میں نے بیان کئے وہ ایک طرح سے صرف میری کامیابیوں اور کامرانیوں کی داستان ہیں یہ صحیح

ہے کہ کامیابی و کامرانی کے پہلو کو نمایاں کرنے سے دل کو اطمینان ہوتا ہے اور مزید منزلیں طے کرنے میں دل کو تقویت بھی ملتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ روشن پہلو دوسرا رخ، یعنی تاریک رخ بھی ایک حقیقت ہے۔ اس کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس کی اپنی اہمیت ہے جس طرح سونا بھٹی میں تپ کر کندن بنتا ہے اسی طرح انسان ناکامیوں اور مایوسیوں اور شدید مشکلات کے مرحلوں سے گزر کر ہی کامیابی اور سربلندی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

زندگی میں مجھے بھی کئی بار مشکلات اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن خداوند کریم نے ہر بار مجھے ان سے نبٹنے کا حوصلہ بھی دیا۔ میں زندگی کے کئی مشکل دوروں سے بھی گزرا ہوں۔ ان موقعوں پر میں خدا کے حضور سربسجود ہو کر دعا مانگتا تھا کہ وہ مجھے ہمت دے اور سیدھی راہ پر چلائے میں نے اپنی نیک نیتی، ہمت اور محنت میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ انسان نیک نیتی سے کام لے تو ہر مشکل پر قابو پا لیتا ہے۔

میں نے اپنی طویل سروس میں ہر قسم کے اور ہر قابلیت کے افسروں کے ساتھ نوکری کی جہاں میں نے اعلیٰ معیار کے ہر افسر سے صحیح طریقے سے کام کرنا سیکھا۔ وہاں ہر نا اہل کی نا اہلیت سے بھی سبق سیکھا۔

مجھے سروس میں اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا اور خدا کا شکر ہے کہ کم سے کم مطلوبہ سروس کے ساتھ میرا اہم منصبوں پر تقرر ہوا مثلاً جب میں پی ایم اے میں انسٹرکٹر مقرر ہوا تو میری سروس چار سال سے زیادہ نہ تھی۔ اسی طرح کیپٹن کے رینک میں بریگیڈ میجر تعینات ہونے کا اعزاز بھی مجھے ملا۔ بغیر کورس کئے وار کورس کا انسٹرکٹر بنا اور انٹیلی جنس کورس کئے بغیر ڈائریکٹر آف انٹیلی جنس کے منصب پر فائز رہا۔ دو ڈویژنوں اور دو کوروں کو کمان کیا لیکن سروس میں جوں جوں انسان سینئر ہوتا جاتا ہے اس کے حاسد بڑھتے جاتے ہیں۔ کچھ ایسے واقعات و حادثات بھی پیش آتے ہیں جن کے رونما ہونے ہی بظاہر بڑے اچھے دوست ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر خدا

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) محمد اسلم جنجوعہ ستارۂ جرأت

تمغۂ قائداعظم

لحہ ناصاف پہچانا جاتا ہے۔ اور برے بھلے میں آسانی سے تمیز کی جاسکتی ہے۔ ایسے موقعوں پہ میں نے اپنے معاملات ہمیشہ خدا پر چھوڑے اور اسی کی ذات والا سے انصاف کا خواہاں رہا۔ اور اس ذات پاک نے میری مدد کی۔

زندگی کا ہر لمحہ ایک چیلنج ہے۔ ایک آزمائش اور بے شمار امکانات سے بھرپور موقعہ۔ اب یہ انسان کا اپنا حوصلہ ہے، اپنی ہمت ہے۔ کہ وہ اس چیلنج کا کس طرح مقابلہ کرتا ہے۔ اس آزمائش پہ کس طرح پورا اترتا ہے اور امکانات سے بھرپور موقعہ سے کتنا فائدہ اٹھاتا ہے۔

فوج ایک ایسا پیشہ ہے جس میں زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے اور انسانی فطرت کے بہترین پہلو سامنے آتے ہیں خاص طور سے جنگ کے دوران اور خود انسان کو ہر قسم کے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔

اے گردش ایام تیرا شکریہ۔ میں نے ہر پہلو سے دنیا دیکھلی ہر پہلو سے دنیا دیکھ لینے سے زندگی کا جو شعور ملتا ہے اس کا کوئی بدل نہیں۔ آخر میں اقبال کا یہ شعر پڑھوں گا۔

تیری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں ‏ ‏ نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ!

خداوند کریم سے دست بدعا ہوں کہ وہ ہمیشہ سرخ رو رکھے۔ نیک راہ پر لگاتے۔ اور اس کام کی طرف مائل کرے جو ملک و ملت کی بہتری کے لئے ہو۔ (آمین ثم آمین)

بریگیڈئر (ریٹائرڈ) محمد اسلم جنجوعہ ستارۂ جرأت تمغۂ قائدِ اعظم

اصل و نسل کا تذکرہ

جنجوعے اصل میں راجپوت النسل ہیں ان کا تعلق آریوں کے اس پہلے گروہ سے ہے جو کئی ہزار سال قبل شمال مغرب سے اس علاقے میں وارد ہوئے اور بزورِ شمشیر صدیوں اِس علاقے میں حکمرانی کی۔ اِس نسلی رشتے کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ سپاہ گری اور حکمرانی جنجوعوں کے خون میں ہے۔ آج بھی پاکستان بری فوج میں آٹھ جرنیل ہمارے قبیلے کے ہیں جو ریٹائر ہو چکے ہیں۔ ان کو مَیں نہیں گن رہا ہوں میجر جنرل افتخار شہید ہلالِ جرأت کا نام آپ نے سُنا ہو گا وہ بھی جنجوعہ تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے عہدوں کے افسروں کا اور سرداروں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ یہ بات مَیں بڑے اعتماد اور فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ قومی زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے قبیلے نے خدمت کا بھرپور حق ادا کیا ہے۔ خاص طور پر تلوار کے پیشے کی حُرمت کا پاس رکھا ہے۔ میرے اپنے آباؤ اجداد بھی سپہ گری کے پیشے سے متعلق رہے ہیں۔

میری اِن باتوں سے یہ نہ سمجھا جائے کہ مَیں کوئی نسل پرست ہوں یا نسلی برتری کے جنون میں مبتلا ہوں نہیں یہ بات نہیں حقیقت یہ ہے کہ جس کو ہم خون کا اثر کہتے ہیں وہ اصل میں ماحول روایت اور تربیت کا اثر ہوتا ہے۔ اور اس کا ثبوت مَیں خود ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے وہ تربیت نہ ملتی جو ملی اور اگر میرے والد وہ نہ ہوتے جو وہ تھے تو یقیناً مَیں وہ نہ ہوتا جو مَیں ہوں اور کم از کم ستارہ جرأت مجھے نہ مِل سکتا۔ اِس عظیم اعزاز کو مَیں بالواسطہ طور پر اپنے والد مرحوم کی تربیت کا فیض سمجھتا ہوں۔

میرا بچپن۔ ماں کی محبت، باپ کی شفقت اور میرے شوق کی ایک افسانوی کہانی

میرا آبائی گاؤں وگھہ تحصیل پنڈ دادنخان ضلع جہلم ہے۔ یہ گاؤں موضع جلال پور شریف سے تقریباً ۶ میل شمال میں سلسلہ ہائے کوہ کے دامن میں واقع ہے۔ اَب تو وہ گاؤں اچھا بھلا بڑا گاؤں ہے لیکن اَب سے چالیس پچاس برس پہلے وگھہ تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ عام لوگ پگڈنڈیوں پر پیدل آتے جاتے تھے۔ کھاتے پیتے لوگ گھوڑا سواری کرتے تھے۔ مَیں اِس گاؤں میں فروری ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوا۔ شروع کے چار پانچ برس مَیں نے یہیں گذارے۔ ۱۹۳۵ء میں ہم لوگ رینالہ خورد ضلع ساہیوال منتقل ہو گئے۔ وہاں میرے والد صاحب راجہ فیروز خان، ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے لیکن وہاں والد نے کچھ زمین ٹھیکے پر لے رکھی تھی تھوڑا بہت پڑھنا تو میں نے وگھہ ہی میں شروع کر دیا تھا۔ باقاعدہ داخلہ میں نے رینالے کے قریب ایک جگہ کوٹھی تھی وہاں کے اسکول کی پہلی جماعت میں لیا۔ یہ اسکول مجھے پسند آیا۔ کیونکہ یہ وگھہ گاؤں کے اسکول سے بہت بہتر تھا۔ مَیں یہاں ذوق و شوق سے پڑھنے لگا۔ اَبھی وہاں پڑھتے چند ماہ بھی نہیں گذرے تھے کہ ہم باپ بیٹے کو پھر وگھہ جانا پڑا۔

ماں کو آخری سلام

وہاں آ کر معلوم ہوا کہ میرے ماموں کی شادی ہے۔ اس لئے

پروگرام یہ بنا کہ والد صاحب تو وہاں میں کام ختم کر کے رینالے واپس چلے جائیں اور والدہ ہم بہن بھائی وگھہ میں ماموں کی شادی تک ٹھہرے رہیں۔ شادی پر جب والد آئیں تو شادی سے فارغ ہو کر ہم سب ان کے ساتھ رینالے واپس جائیں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ والد رینالے واپس جا رہے ہیں اور مجھے یہیں وگھے میں تین چار ماہ رہنا ہے تو مَیں مچل گیا، اور ضد کرنے لگا کہ میں بھی رینالے واپس جاؤں گا۔ والدہ نے مجھے بہت سمجھایا۔ بیٹے تم ہمارے ساتھ رہو۔ کھیلو کُودو، کھاؤ پیو، ماموں کی شادی ہے۔ بڑے مزے آئیں گے۔ لیکن مَیں نہ مانا۔ مجھ پر ایک ہی دُھن سوار تھی کہ رینالہ جاؤں اور ضرور جاؤں۔ بے جی کو میری ہَٹ سے کچھ مایوسی ہوئی۔ انہوں نے والد سے کہا اسلم کو سمجھائیں یہ نہ جائے۔ والد نے مجھ سے پُوچھا بیٹے کیا بات ہے، وگھے میں کیوں رہنا نہیں چاہتے۔ یہاں تو تمہیں زیادہ مزہ آئے گا۔ مَیں چُپ رہا۔ جب اُنہوں نے دوبارہ پُوچھا تو مَیں نے کہا بے جی سالانہ امتحان قریب ہے۔ یہ سُن کر ابا جی ہنس پڑے۔ مَیں اس وقت کچی میں تھا۔ میرے مُنہ سے امتحان کی بات سُن کر انھیں یقیناً خوشی ہوئی ہو گی۔ تھوڑا سا میرے گال کو تھپتھپایا۔ پھر کہا ماں کے پیار اور بیٹے کی تعلیم کا معاملہ ہے۔ میں اِس میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ بے جی یہ سُن کر بجھ کے رہ گئیں۔ جب ابا جی نے گھوڑے کو نکالا اور مَیں ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہونے لگا تو بے جی کے صبر کا بند ٹوٹ گیا وہ رو پڑیں اور مجھے گلے سے لگا کر کہنے لگیں۔ محمد اسلم (وہ ہمیشہ مجھے محمد اسلم کہا کرتی تھیں) دیکھو مَیں بیمار ہوں زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ تم چلے گئے اور میرا آخری وقت آگیا تو مَیں تمہیں دیکھ بھی نہ سکوں گی۔ یہ سُن کر ان کے گلے میں باہیں ڈال کے میں بھی رونے لگا۔ اب عجب منظر تھا۔ بے جی رو رہی تھیں اور ساتھ ساتھ مجھے پیار کرتی جاتی تھیں۔ میں بھی ان کے گلے سے لگا رو رہا تھا۔ میرے ماموں کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ ابا الگ گھوڑے کے پاس سُن کھڑے تھے شاید ان کا خیال تھا کہ اَب مَیں پگھل جاؤں گا لیکن جب وہ گھوڑے پر چڑھنے لگے تو میں ایک

بے جی کی گود سے اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا بے جی آپ مجھے جانے کی اجازت دے دیں۔ میں امتحان ختم ہوتے ہی آپ کے پاس بھاگ کے آجاؤں گا۔ انہوں نے بہت ضبط کر کے اوڑھنی کے پلو سے آنسو پونچھے۔ مجھے دُعائیں دیں اور والد چونکہ گھوڑے پر بیٹھ ہی چکے تھے اور میرے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ اِس لئے میں والدہ کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر جلدی سے والد کے ساتھ پیچھے گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ اور گھوڑا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ بے جی چونکہ دُور تک چل نہیں سکتی تھیں گھر سے قریب ایک اُونچی جگہ پر ایک کیکر کا درخت تھا اس کے نیچے بیٹھ کر وہ جاتے دیکھتی رہیں جب تک وہ نظر سے اوجھل نہیں ہو گئیں پیچھے مُڑ مُڑ کے میں اُنہیں دیکھتا رہا۔ آخری بار مَیں نے انہیں دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتے دیکھا۔ شاید میرے امتحان کے لئے دعا مانگ رہی تھیں۔ یا میری سلامتی کے لئے دعا گو تھیں۔ قصہ مختصر یہ کہ رینالے جا کر مَیں پڑھائی میں محو ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اطلاع آئی کہ بے جی کی کچھ زیادہ طبیعت خراب ہے۔ والد نے کہا بیٹے تم امتحان دے لو۔ اس کے بعد فوراً گاؤں چلیں گے۔ اسی آج کل میں امتحان آ گیا۔ اور خدا کا شکر کہ مَیں اوّل آیا۔ اُستاد صاحب نے خوش ہو کر مجھے ڈبل پروموشن دے دیا مجھے کچی سے دوسری جماعت میں چڑھا دیا۔ میں بڑا خوش تھا کہ میری مُراد بر آئی ہے۔ میری ماں کو بڑی خوشی ہوگی۔ مَیں نے اسکول سے آتے ہی والد کو نتیجہ بتایا اور کہا اب فوراً گھر چلیں۔ انہوں نے کہا بیٹے نوکری کا معاملہ ہے دو ایک دن اور لگیں گے۔ میں دو تین دن کلاس میں بیٹھا تھا کہ نوکر آیا اور کہنے لگا راجہ صاحب بُلاتے ہیں۔ گاؤں جانے کی تیاری ہے۔ جب میں گھر پہنچا تو چند لوگ جمع تھے۔ لیکن والد نے یہی کہا کہ گاؤں سے بلاوا آیا ہے جلدی پہنچنا ہے یہ تو مجھے گاؤں جا کر پتہ چلا کہ ماں کی شفقت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکا ہوں۔ دو ایک روز بعد مجھے بڑے ماموں نے بتایا کہ میرے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی میری بے جی کیکر کے پیڑ کے نیچے بہت دیر تک بیٹھی رہی تھیں۔ اور بار بار کہتی تھیں میرا محمد اسلم اللہ نے چاہا پاس تو ضرور ہو جائے گا اور پڑھ لکھ کر افسر بھی بن جائے گا لیکن میری اس سے ملاقات یہ آخری ہے جو صحیح

ثابت ہوا۔ بے جی، آہ میری بے جی اَب نہیں مَیں کہاں سے لاؤں۔

دُعا کی تاثیر

چونکہ والد کی پھُوپھی خُود بے اولاد تھیں اس لئے مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھیں اور صُبح و شام رو رو کر میرے لئے دُعائیں کرتی تھیں۔ کہا کرتی تھیں اللہ نے چاہا تو میرا محمّد اسلم (وہ بھی میری بے جی کی طرح میرا پورا نام لیتی تھیں) ایک دن بڑا افسر بنے گا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا۔ اور نام پائے گا۔ ان کی بڑی عمر ہوگئی تھی۔ لیکن اللہ پاک سے دعا یہ کرتی تھیں کہ اللہ مجھے اتنی زندگی اور دے کہ محمّد اسلم کو لفٹین بنتا دیکھ لوں۔ اس کے بعد بے شک مر جاؤں۔ اور ڈرامائی طور پر ہوا بھی یہی۔

خاندان میں یہ بات آج تک مشہور ہے کہ جب میں کاکول سے پہلی بار چھٹی گھر آیا تو رات کا وقت تھا۔ پھوپھی اندر کوٹھے میں مصلّے پر بیٹھی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ مَیں باہر صحن میں چچی سے باتیں کرنے لگا۔ پھوپھی نے وہیں سے پُوچھا محمّد اسلم آیا ہے۔ کیا لفٹین بن گیا ہے۔ چچی نے کہہ دیا۔ ہاں آپ کی دُعا قبول ہوگئی ہے۔ مُبارک ہو۔ یہ سُننا تھا کہ اللہ تیرا شکر ہے کہا اور سجدے میں گر پڑیں جب اُٹھیں تو کہنے لگیں اللہ نے میری دُعا قبول کر لی اب بیشک مجھے دُنیا سے اُٹھا لے۔ دوسرے روز فجر کی نماز کے وقت مصلّے پر بیٹھیں تو پھر اٹھی نہیں۔

سدا رہے نام اللہ کا

خُدا انہیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ ان کی دعاؤں سے میں یہاں تک پہنچا ہوں

ملٹری کالج میں داخلہ ایک نئی اور شاندار زندگی کی طرف پہلا قدم

مَیں نے "الف بے" پڑھنا تو اپنے آبائی گاؤں دگھہ ضلع جہلم میں شروع کیا تھا پھر چند سال ریناله خورد ضلع ساہیوال اور این سی اے ہائی اسکول منڈی بوریوالہ ضلع ملتان میں

پڑھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۳ء میں ملٹری کالج جہلم میں داخل ہوا اور ۱۲۲۱ کالج نمبر ملا۔ مَیں ساتویں درجے میں داخل ہوا تھا اور میرا پہلا ہاؤس برڈ وڈ ہاؤس تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے پہلے سیکشن پریفیکٹ کا نام اقبال تھا اور کالج نمبر ۸۳۸ اور جونیئر پریفیکٹ کا نام سلیمان تھا۔ یہ دونوں کالج کی کراس کنٹری ریس میں بالترتیب دوسری اور تیسری پوزیشن لیا کرتے تھے۔ مَیں کالج میں اگست ۱۹۴۳ء سے مارچ ۱۹۵۰ء تک تقریباً آٹھ سال رہا۔ دراصل کالج میں داخلے کے وقت میں عمر اور قد میں بہت چھوٹا تھا۔ مَیں اس وقت کے ان چار چھوٹے لڑکوں میں سے تھا۔ جنہیں کالج کی پریڈ معاف تھی۔ اور لاکر میں سامان اور کپڑے رکھنے اور اٹھانے کے لئے ایک ایک اسٹول ملا تھا۔ جس پر چڑھ کر ہم لاکر کے دوسرے تیسرے خانے تک پہنچتے تھے۔ ہمارے لاکرز کا معائنہ بھی کم ہوتا تھا جو اس زمانے میں بہت بڑی رعایت تھی۔ میرے دُوسرے ہم قد کا نام ۱۲۲۴ محبوب ملک تھا۔ تیسرا ۱۲۳۲ انعام الدین تھا جو بعد کالج ہیڈ بوائے بنا۔ چوتھے کا نام میرے ذہن سے اُتر گیا ہے۔

ایک تاریخی اِحتجاج

میرے زمانے کا اور غالباً کالج کی پُوری تاریخ کا سب سے اہم واقعہ وُہ تحریک ہے جو مُسلم طلبہ نے ۱۹۴۷ء کو پاکستان ڈے پریڈ کے لئے چلائی۔ جس نے ثابت کر دیا یہ ادارہ ایک قومی ادارہ ہے۔

واقعہ کا پس منظر اور تفصیل

جب ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان ہوا اور پاکستان کا بننا یقینی ہو گیا تو ہم میں سے بہت سے سینئر طلبہ نے صلاح کی کہ کالج میں ۱۴ اگست ۴۷ء کو پاکستان ڈے پریڈ ہونا چاہیئے۔ جب یکم اگست ۴۷ء کو لڑکے گرمیوں کی چھٹی سے واپس آئے

تو یہ سوال سنجیدگی سے اُٹھایا گیا کہ پاکستان ڈے پر پاکستانی پرچم کو سلامی دی جائے اور باقاعدہ پریڈ ہو۔ لیکن یہ کام آسان نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کالج میں خاصی تعداد ہندو، سکھ، مرہٹہ، گورکھے، غیر مُسلم کیڈٹس کی موجود تھی۔ اسی طرح اسٹاف میں بھی کچھ غیر مسلم آفیسرز تھے۔ اگرچہ میجر اورنگ خان، لیفٹیننٹ کرنل اسٹیبنگ سے چارج لینے آگئے تھے لیکن کمان اَب بھی انہی کی تھی۔ ایجوٹینٹ کیپٹن فلپ بھی غیر مُسلم انگریز تھا۔ جونہی یہ تجویز سامنے آئی اور اس کا چرچا ہوا تو اس کی موافقت اور مخالفت میں ہر جگہ بحث و مباحثہ شروع ہو گیا۔ مسلمان طلبہ میں جو انتہا پسند تھے ان کا کہنا تھا کہ سارے مسلم اور غیر مسلم طلبہ واسٹاف کو جو اس وقت موجود ہیں پریڈ میں حصّہ لینا چاہیئے اور پاکستانی پرچم کو سلامی دینا چاہیئے۔ دوسری طرف کے انتہا پسندوں کو اصرار تھا کہ یہ پریڈ بالکل نہیں ہونا چاہیئے۔ پریڈ کی مخالفت میں ایک گورکھا افسر کیپٹن نٹیال پیش پیش تھا۔ ایک اور مرہٹہ افسر کیپٹن مینن بھی کیپٹن نٹیال کے ساتھ شریک تھا۔ کیپٹن نٹیال بہت متعصب تھا وہ یوں بھی پاکستان کے خلاف زہر اُگلتا رہتا تھا۔ اسے ذرا خیال یا لحاظ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے اِرد گِرد اکثریت کس قومیت کے طلبہ کی ہے۔ اس کی مُسلم دشمن اور پاکستان دشمن باتوں اور حرکتوں کی وجہ سے بیشتر مُسلم طلبہ کو یقین ہو گیا تھا کہ فتنہ فساد کا باعث یہی شخص ہے اس کو سبق سکھانے سے سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ ایکشن کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ نٹیال کی اس کی پاکستان دشمن حرکتوں پر کمبل پریڈ سے تواضع کی جائے۔ چنانچہ بادل نخواستہ یہ کام بھی کرنا پڑا۔ بات تو ٹھیک تھی۔ جذبہ بھی صحیح تھا لیکن گرم خون نے جو طریقہ اختیار کیا اس سے وہ قومی مقصد پُورا نہیں ہو سکا۔ جس کے لئے اِتنی تگ و دو کی گئی تھی۔ اِس ڈرامے کے تین اہم کردار تھے۔ ۱۰۱۱ ملک عبدالجبار، ۱۲۱۱ ملک محمّد عالم اور مَیں، ۱۲۲۱، اس کی پاداش میں، مَیں نے کالج میں ایک دن قید بھی کاٹی۔ رابرٹس ہاؤس میں جو درمیانی کمرہ ہے۔ اس میں مجھے قید رکھا گیا تھا۔ باہر دو گورکھا سکھّ سپاہیوں کا پہرہ تھا عبدالجبار اور عالم ہاؤس کے ساتھ جو کوارٹر ہے اس میں بند تھے۔ یہ احتجاج ہم نے صرف قومی جذبے

سے کیا تھا۔ اور اپنا سارا کیریئر داؤں پر لگا دیا تھا۔ اس واقعہ کو میں اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے صرف ایک بات کا افسوس رہا کہ اس حادثے سے کرنل اسٹیبنگ بالکل ٹوٹ کے رہ گئے۔ ہمیں بھی ان کا بہت لحاظ تھا لیکن بات ہی ایسی آپڑی تھی کہ یہ اقدام کرنا ضروری ہوگیا۔ اگر بعض ہندو اور سکھ تعصب سے کام نہ لیتے تو حالات یہ رُخ اختیار نہ کرتے۔ سیاسی دباؤ کے تحت جب جی ایچ کیو نے ہمیں معاف کر دیا تو کرنل اسٹیبنگ نے یہ بتانے کے لئے ہمیں بنگلے پر بلایا۔ مجھے وہ منظر اچھی طرح یاد ہے کہ ہم ان کے بنگلے کی پورچ میں کھڑے تھے۔ کرنل صاحب اندر سے نکلے اور ہم تینوں کو مخاطب کر کے کہا You have, bad-named me, have bad named the College and you have bad named yourselves یہ کہنے کے بعد وہ رو پڑے انہیں روتا ہوا دیکھ کر ہم بھی رو پڑے۔ چند لمحے بعد رندھی آواز میں انہوں نے کہا بہتر ہے کہ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔ پھر ہم چلے آئے۔ بہرحال تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

جہادِ کشمیر اور ملٹری کالج

پریڈ کے واقعہ کے کچھ عرصہ بعد جب کشمیر میں جہاد شروع ہوا تو بہت سے سینئر لڑکے اس میں حصہ لینے کے لئے بے چین تھے۔ یہاں تک کہ کئی منچلے کیڈٹ جیسے آفیسر رحیم اللہ خاں (کالج نمبر ۹۰۸) اور محمد اسلم جنجوعہ (۱۱۶۲) کالج سے بھاگ کر جہادِ کشمیر میں شریک ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد جب یہ کالج میں واپس آئے تو ان کے غیر قانونی اقدام کو ان کے قومی جذبے کے پیشِ نظر معاف کر دیا گیا۔

کالج میں میری کارکردگی

والد صاحب کی توجہ اور اپنے شوق سے اللہ کا شکر ہے کہ میں پڑھائی میں شروع سے

اچھا تھا۔ آٹھویں نویں، اور دسویں جماعت میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ دسویں جماعت میں اوّل آنے پر جو کتابیں مجھے انعام میں ملی تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب "اے ٹیل آف ٹو سٹیٹز" بھی تھی جو اب بھی میرے پاس ہے۔ فرسٹ ائر میں میری پوزیشن دوسری تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال تک کالج میں پڑھا لیکن امتحان نہیں دے سکا۔

ابھی ہم انٹر کے سالانہ امتحان کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ پی۔ ایم۔ اے کے کمانڈانٹ بریگیڈئر انگل کالج میں آئے اور ہمارے کمانڈانٹ سے کہا۔ فوج کو فوری طور پر زیادہ سے زیادہ افسروں کی ضرورت ہے۔ آپ ان لڑکوں سے درخواستیں دلوائیں۔ چنانچہ ہم سب لوگوں نے درخواستیں بھجوا دیں اور جو بیشتر لڑکے آئی ایس ایس بی سے منتخب ہو گئے۔ ان میں مَیں بھی شامل تھا میرے ساتھ ۱۵۹۹ علم الدین اور ۱۶۶۰ علی عابد بھی تھے۔ یہ دونوں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں میجر ہو کر شہید ہوئے۔

باکسنگ میں اِمتیاز

کالج میں داخل ہوتے وقت میرا قد بہت چھوٹا تھا۔ لیکن جلد ہی مَیں نے قد نکال لیا۔ اور ایک مضبوط بدن کی حیثیت سے اُبھرا۔ اور باکسنگ کے رِنگ میں خاص طور پر اپنا مقام پیدا کیا۔ کالج میں اپنے قیام کے آخری تین سالوں میں کالج کی باکسنگ ٹیم کا کپتان ہونے کا اعزاز مجھے ہی حاصل رہا۔ قیادت کے میدان میں کیڈٹ آفیسر کے عہدے تک پہنچا۔

ایک یادگار مقابلہ

یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے میرا مقابلہ فرسٹ پنجاب رجمنٹل سنٹر کی بوائز کمپنی کے ایک مضبوط باکسر سے تھا۔ پہلا راؤنڈ ایسے ہی گیا۔ جب گھنٹی بجی اور میں اپنے کارنر میں آیا تو میرے سیکنڈ نے میرے کان میں کہا کرنل صاحب نے کہا ہے اسلم سے کہو، یہ مقابلہ جیتنا ہے اسی پر ہار جیت کا فیصلہ

ہوتا ہے۔ میرے لئے یہ سب سے بڑا اعزاز تھا۔ کہ کرنل اسٹیبنگ مجھے پیغام بھیجیں اور میری ہمت افزائی کریں۔ چنانچہ سیکنڈ آؤٹ آف دی رنگ کی گھنٹی بجتے ہی مَیں چیتے کی طرح مدِ مقابل پر جھپٹا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دوسرے اور تیسرے راؤنڈ میں میں اپنے حریف پر چھایا ہوا تھا۔ جب ریفری نے کہا وّیل ڈن گرین ریڈ از دی وِنر تو کالج والوں نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ میں نے نظر بچا کے کرنل اسٹیبنگ کی طرف دیکھا۔ تو ان کی گھنی مونچھوں کے نیچے مجھے مسکراہٹ کی ایک کرن نظر آئی جو میرا سب سے بڑا انعام تھا۔ بعد کو اسٹیبنگ صاحب نے مجھے بہت شاباش دی اور لانس کارپول کے عہدے پر ترقی دی۔

ایک کام دیوانہ اِنسان

ملٹری کالج میں میرے شب و روز کا یہ تذکرہ نامکمل رہے گا۔ اگر مَیں اس انسان کا ذکر نہ کروں جس نے میری سوچ اور میرے لائف اسٹائل اور میرے کام کرنے کے طریقوں کو شدت سے متاثر کیا۔ جو خُود اعلیٰ درجے کا قائد تھا اور جس سے مَیں نے قیادت کے بہت سے گُر سیکھے۔ میری مراد کالج کے کمانڈانٹ کرنل اسٹیبنگ سے ہے۔ کالج اور وہ ایک جان دو قالب تھے۔ کالج کے علاوہ ان کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دن رات وہ تھے اور کالج اور کالج کے لڑکے۔ ہر وقت ہر موقعہ پر ہر جگہ موجود ان کے معیار بہت سخت تھے۔ اور سختی سے ان کی پابندی کراتے تھے۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی قدر جفاکشی تھی اس لئے کھیلوں' خاص طور پر باکسنگ کو بہت اہمیت دیتے تھے اور اس کی نگرانی خود کرتے تھے ملٹری کالج میں جب بھی میں کسی کام میں مصروف ہوتا تو عام طور پر کرنل اسٹیبنگ کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا۔ لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جب مَیں کاکول' میں زیرِ تربیت تھا تو بھی میں اکثر یہی محسوس کرتا جیسے کرنل اسٹیبنگ پیچھے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ کالج میں جب وہ منہ بند کر کے ناک سے سانس لیا کرتے تھے تو ان کی ناک سے شاں شاں کی' آواز آیا کرتی تھی۔ حد یہ کہ کاکول میں جب مَیں محسوس کرتا کہ کرنل اسٹیبنگ مجھے کھڑے دیکھ رہے ہیں

تو اس وقت بھی یہ شاں شاں کی آواز آتی محسوس ہوتی تھی۔ مَیں اندھی ہیرو ورشپ کا قائل نہیں ہوں۔ مَیں خواہ مخواہ ایک غیر ملکی کو آسمان پر نہیں چڑھا رہا ہوں لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ہمارے نوجوان قائد سوچیں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اسٹیبنگ کو ایک لیجنڈ بنا دیا۔ مختصر یہ کہ گو اسٹیبنگ کے مقاصد بہت محدود تھے لیکن کردار بہت بلند تھا۔ سنا ہے کہ بعد کو بریگیڈیر رفیق نے اپنے افکار و طریق کار دونوں کے اعتبار سے کالج میں اسٹیبنگ سے بڑھ کر نام پیدا کیا۔ سبحان اللہ!

الوداع مادرِ درسگاہ، الوداع

مَیں پہلے لکھ چکا ہوں کہ کس طرح ہم ۱۹۵۰ء کے اوائل میں انٹر کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے کہ پی ایم اے کے کمانڈانٹ بریگیڈئر انگل کے کہنے پر ہم لوگوں نے پی ایم اے کے لئے درخواستیں دیں اور آئی ایس ایس بی سے کامیاب ہو کر مارچ ۱۹۵۰ء میں کالج کو الوداع کہا۔

باپ کی وصیت

والد مرحوم کا گو کتابی علم زیادہ نہیں تھا لیکن دُنیا دیکھی تھی۔ زندگی کا تجربہ بہت تھا۔ اور زندگی کی قدروں کا بڑا گہرا شعور رکھتے تھے۔ آج وہ باتیں یاد کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان کی نظر کتنی دُور تک تھی اور کتنی گہری تھی۔ مثلاً میں ان کی صرف ایک گفتگو نقل کرتا ہوں۔ جب مارچ ۱۹۵۰ء میں کمیشن کی ابتدائی تربیت کے لئے جے ایس پی سی ٹی ایس کوئٹہ جانے کیلئے لاہور سے گاڑی میں سوار ہوا تو والد بھی میرے ساتھ تھے۔ انہیں ساہیوال تک میرے ساتھ جانا تھا۔ رات کا وقت تھا جب گاڑی آگے چلی تو مجھے اُونگھ آنے لگی۔ ابھی میری آنکھ پُوری طرح نہیں جھپکی تھی کہ والد نے جھنجھوڑا محمد اسلم ابھی مت سو۔ مجھے تجھ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ مَیں آنکھ مَل کے متوجہ ہوا تو کہنے لگے۔

زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، خدا جانے مالک کی طرف سے کب بلاوا آجائے۔ پھر موقعہ ملے یا نہ ملے اس لئے دو تین باتیں جو مَیں نصیحت اور وصیت کے طور پر کرنا چاہتا ہوں غور سے سُن لو۔

پہلی بات یہ ہے کہ انشاءاللہ بہت جلد تم لیفٹیننٹ بن جاؤ گے۔ میرے علم کے مطابق تمہاری ابتدائی تنخواہ بھی چار ساڑھے چار سو روپے ماہوار ہوگی۔ اس کے برعکس جب میں نے نوکری شروع کی تو مجھے پہلی تنخواہ میں صرف سات روپے ملے تھے۔ یہاں سے شروع کرکے میں نے اپنی تنخواہ ہی سے زندگی کی تمام اہم ذمہ داریاں پوری کی ہیں۔ مثلاً تم دونوں بھائیوں کو تعلیم دلوائی۔ تمہاری بہن کی شادی کی اور اپنے پیسے سے ایک چھوٹا موٹا مکان بھی بنوایا۔ لیکن میں خدا کو حاضر ناظر جان کر تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ میں نے رزقِ حلال سے کیا ہے۔ تم کسی محفل میں بیٹھ کر سر اُٹھا کر فخر سے کہہ سکتے ہو کہ تمہارے خون میں ایک قطرہ بھی حرام کے رزق کا نہیں ہے جو بات میں تم پر واضح کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جب میں اتنی معمولی ابتدائی تنخواہ سے اتنا کچھ کر سکا تو تم اپنی پچاس گنا زیادہ تنخواہ سے یقیناً حلال کی روٹی کھا سکتے ہو بیٹے مجھے تمہاری آمدنی سے ایک پیسہ بھی نہیں چاہیئے لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم ذہنی اور رُوحانی اطمینان سے عزت کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ جو بغیر رزقِ حلال کے ممکن نہیں۔ میں کوئی صوفی درویش نہیں ہوں لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ رزق میں حرام کی ذرا سی ملاوٹ سے آدمی کا قلبی اطمینان غارت ہو جاتا ہے۔ دیر سویر عزت بھی داغدار ہو جاتی ہے اور یاد رکھو صرف حلال کی روزی میں برکت ہوتی ہے۔ اس لئے بیٹے اپنی ضروریات کو بے ضرورت نہ بڑھانا۔ اور نفس کے ناروا مطالبات کے جال میں مت پھنسنا۔ یاد رکھو جو اپنے آپ سے ہار جائے وہ کسی اور سے جیت نہیں سکتا۔

دوسری بات جو میں تمہارے ذہن میں بٹھانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ افسری میں ترقی کے ساتھ ساتھ تمہارے اختیارات میں بھی اضافہ ہوگا۔ لیکن جس عہدے پر بھی تم فائز ہو کوشش کرنا کہ تمہارے ماتحتوں کی دعائیں تمہارے شاملِ حال ہوں۔ کبھی اپنا منصب یا اختیار ماتحت کے مفاد کے خلاف استعمال نہ کرنا جب کبھی سزا دینی یا تادیبی کارروائی کرنی پڑ جائے تو اپنے سارے اختیارات اور طاقت بیک وقت استعمال کرنے کی ضرورت نہیں دُشمن پر حملہ کرتے وقت بھی اپنی ساری قوت داؤں پر نہیں لگائی جاتی۔ دو ایک ہاتھ بچا کر رکھے جاتے ہیں۔ ماتحت دشمن نہیں ہوتے۔ ان کی

خطاؤں پر بھی اپنے اختیارات کو احتیاط سے ضرورت کے مطابق استعمال کرنا چاہیئے۔ یوں سمجھو کہ جب فوج میں ایک جوان کو آر آئی دی جاتی ہے تو اس کی تنخواہ بھی بند ہو جاتی ہے۔ جس کا اثر اس کے والدین بیوی بچوں پر بھی پڑتا ہے۔ اس لئے اگر سات دن کی آر آئی سے کام چل سکتا ہو تو اٹھائیس دن آر آئی دینا ظلم ہوگا۔

میرا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ خدا کرے تمہیں جلد کمیشن ملے اور اس میں اعلیٰ ترین عہدے تک ترقی کرو لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ تمہارے سب عزیز رشتے دار کمیشن نہیں لے سکتے۔ کوئی سپاہی ہوگا، کوئی حوالدار، کوئی دوکاندار تو کوئی زمیندار۔ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ تم اپنے عہدے کو ان سے رشتے داری کے بیچ میں نہ آنے دینا۔ ہر ایک کی اس کے رشتے اور عمر کے مطابق عزت کرنا اور خدمت کرنا کہ اسی میں انسانیت اور شرافت ہے۔ عہدہ ایک دفتری چیز ہے۔ اس کا تعلق پیشے سے ہے۔ عزت سے نہیں۔ پرانے زمانے میں عزت شرافت سے ہوتی تھی۔ انگریزوں کے زمانے سے یہ تبدیلی آئی کہ عزت کو عہدے یا دولت سے منسلک کر دیا گیا۔

والد مرحوم کی اس گفتگو کو میں نے اس تفصیل سے اس لئے لکھا ہے کہ ریکارڈ پر آ جائے کہ جن جیالوں نے لڑائیاں لڑیں اور بہادری کے جوہر دکھائے اور تمغے حاصل کئے وہ کیا تھے ان کا خمیر کس مٹی سے اٹھا تھا۔ ان کے ماں باپ کیا تھے۔ ان کی سوچ کیا تھی۔ ان کی تربیت کس طرح ہوئی۔ آئندہ جو شخص اس ملک کی عسکری تاریخ لکھے گا یہ مواد اس کے کام آئے گا۔ ویسے میں تو یہ اُمید بھی رکھتا ہوں کہ ان واقعات و حالات سے بہت سے نئے چراغ جلیں گے بہت سے فیروز خان پیدا ہوں گے۔ میرے والد فیروز خان محض ایک علامت تھے۔ ایک نشانی تھے۔ ان ایسے بے شمار لوگ ان کے زمانے میں ان کی طرح سوچتے تھے۔ ان ہی لوگوں کی اولاد کا لہو سنہ ۴۸ء سنہ ۶۵ء اور سنہ ۷۱ء کی داستانوں کو رنگین کر گیا۔ آئندہ بھی اسی طبقے، اسی سوچ، اسی احساس کے لوگ اس مملکتِ خداداد کو سُرخ رو کریں گے۔ انشاء اللہ ضرورت اس روایت، اس سوچ، اس اندازِ نظر کو زندہ رکھنے کی ہے۔

کاروانِ زندگی آگے بڑھتا ہے۔ پی ایم اے اور اس سے بعد کی روئیداد

میرا سکس پی ایم اے لانگ کورس تھا جو ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا اور اگست ۱۹۵۲ء میں ختم ہوا۔ پی ایم اے میں بھی میری کارکردگی اللہ کے کرم سے اچھی رہی۔ باکسنگ میں پی ایم اے کلر لیا۔ اور پلاٹون انڈر آفیسر رہا۔ اس کورس میں ملٹری کالج کے پندرہ لڑکے تھے۔ ۱۵۹۹ علم الدین، ۱۶۶۰ علی عابد، ۱۲۲۳ اکرم، محمد زمان، ۱۲۰۵ محمد شریف، توفیق مرزا، ۱۶۸۷ رزاق مرزا، عاقل داد، راجہ عبداللہ، ۱۳۰۵ حق نواز، محمد مبارک، ۱۰۳۱ شیر افضل کیانی، ۱۰۴۶ امیر ملک، فتح محمد یوسف زئی اور میں خود ۱۲۲۱ اسلم جنجوعہ۔ ان میں سے تین اکرم شریف اور میں بریگیڈئر کے عہدے تک پہنچے۔ سات لیفٹیننٹ کرنل ہوئے۔ پانچ میجر ہوئے۔ ان میں سے دو علم الدین اور علی عابد نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شہید ہوئے۔ اور عاقل داد اور میں نے ۱۹۶۵ء میں ستارۂ جرأت لیا۔

کمیشن تو مجھے ۵ پنجاب رجمنٹ فیلڈ مارشل محمد ایوب کی رجمنٹ شیر دل میں ملا تھا لیکن جلد ہی ۱۰ پنجاب سے منسلک ہو گیا۔ اس بٹالین کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ وہ واحد انفنٹری بٹالین تھی جسے بابائے قوم قائدِ اعظمؒ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے قومی اور رجمنٹل پرچم عطا کیا تھا۔

باقی داستان مختصر طور پر یہ ہے کہ سٹاف کالج پاس کیا۔ پی ایم اے، انفنٹری سکول کوئٹہ اور اسٹاف کالج کوئٹہ میں انسٹرکٹر رہا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں فاضلکا کے محاذ پر ۱۰ پنجاب کی ایک کمپنی کمان کی۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں سیالکوٹ نارووال محاذ پر ۳۸ پنجاب کو کمان کیا۔ ۱۹۷۶ء میں بریگیڈئر کے عہدے سے ریٹائرمنٹ سے پہلے دو انفنٹری بریگیڈ بعد ۱۴ پیرا بریگیڈ کمان کئے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں دو دفعہ ستارہ جرأت کے لئے سفارش کی گئی تھی۔ لیکن دونوں ایکشنوں کو ملا کر ایک ہی ستارہ جرأت عطا ہوا۔ میں ۱۰ پنجاب کی ایک رائفل کمپنی کمان کر رہا تھا۔ یہ بٹالین اس وقت ایک مایہ ناز بٹالین کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو میجر جنرل) امیر حمزہ خان ہلالِ جرأت، ستارہ جرأت

کے زیر کمان تھی۔ اور ہمارے بریگیڈ کمانڈر کالج نمبر ۴۶ بریگیڈیئر بعد کو لیفٹیننٹ جنرل محمد اکبر خان تھے اور بریگیڈ میجر کے منصب پر کالج ہی کے ایک اولڈ بوائے کالج نمبر ۹۴۹ میجر بعد کو کرنل محمد اکبر فائز تھے۔ میری کمپنی نے دشمن کی جھنگر پوسٹ پر یلغار کر کے اس پر قبضہ کیا۔ میرے ایکشن کی خاص خاص باتیں یہ تھیں۔ ہم نے یہ حملہ بغیر ہوائی جہاز توپ خانے ٹینک، یا بٹالین مارٹر کی امداد سے کیا۔ ہمارے جھنگر پوسٹ پر حملے اور قبضے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں سب سے پہلے ہم ہی نے دشمن کی ایک چوکی پر قبضہ کیا۔

نفری میں ہم اور دشمن برابر تھے۔ میری ایک کمپنی نے دشمن کی ایک کمپنی پر حملہ کیا جو قلعہ بند دفاعی پوزیشن میں تھی۔ اس معرکے میں سنگین اور ہینڈ گرنیڈ کا آزادانہ استعمال ہوا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس حملہ کی نوعیت کیا تھی۔

جھنگر پوسٹ پر حملے میں میری کمپنی کے انتخاب اور حملہ کے منصوبے میں میرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل امیر حمزہ خاں کے علاوہ بریگیڈ کمانڈر محمد اکبر خاں کا مشورہ پورے طور پر شامل تھا۔ جنرل اکبر مرحوم کہا کرتے تھے کہ اسلم کی کمپنی ۱۰۵ بریگیڈ کا امرت دھارا ہے۔

جھنگر کا معرکہ

اِس معرکے میں، چونکہ مَیں خود مرکزی کردار تھا۔ اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی کارکردگی کے بارے میں اپنے ستارہ جرأت کا سرکاری فرمان نقل کروں اور اس معرکے کی تفصیلات خود بیان کروں۔

ستارہ جرأت کا فرمان

پی اے ۴۴۰۴ میجر محمد اسلم جنجوعہ ۱۰ پنجاب کی اے کمپنی کمان کر رہے تھے۔ ۶ ستمبر کو انہیں ایک ہندوستانی چوکی جھنگر پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس چوکی پر دشمن کی

کم و بیش ایک کمپنی متعین تھی۔ جو کنکریٹ بنکرز میں، تاروں اور بارودی سرنگوں کے حصار میں قلعہ بند تھی۔ چونکہ ۱ پنجاب کا توپ خانہ بٹالین کو اس کے کسی اور جگہ کے حملے میں مدد دے رہا تھا میجر جنجوعہ نے اپنے ہی کلوز سپورٹ ہتھیاروں سے جھنگر پر طوفانی حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا ایک بند کو اپنی فائر بیس بنا کر وہ رات کی تاریکی میں اپنی کمپنی کما دکے کھیتوں میں سے گذار کر نشانہ کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ ابھی وہ اپنی منزلِ مقصود سے دو سو گز کے فاصلے پر ہی تھے کہ دشمن کی بازو کی چوکی کے دو بنکرز کے خودکار ہتھیاروں کے شدید فائر کی زد میں آکر ان کی کمپنی کو رُکنا پڑا۔ اس مرحلے پر کمپنی کمانڈر میجر جنجوعہ رینگ رینگ کر آگے بڑھے اور صورتِ حال کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک بازو کے ان دو بنکرز کو تباہ نہ کیا جائے حملے کا کامیاب ہونا مشکل ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک پلاٹون کے کمانڈر کو حکم دیا کہ وہ اپنی پلاٹون کے ایک سیکشن کو لے کر دشمن کے بائیں بنکر کو نشانہ بنائے اور اسی پلاٹون کے دوسرے سیکشن کو لے کر میجر جنجوعہ خود دُوسرے بنکر کی طرف بڑھے۔ اور غیر معمولی جرأت سے کام لیتے ہوئے اور اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ خود رینگ رینگ کے اس بنکر کے قریب پہنچے تاکہ اسے تباہ کر سکیں۔ اور بڑی جرأت و فراست سے کام لے کر دُشمن کے بنکر کو مکمل طور پر گھیرے میں لے لیا۔ یہ دیکھ کر دشمن نے مواصلاتی خندق کے راستے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ میجر جنجوعہ نے اپنے ایک آدمی سے بارے کر دُشمن کے چار سپاہیوں کو تو وہیں ٹھنڈا کر دیا۔ اس کے بعد وہ خاص چوکی کی طرف متوجہ ہوئے جہاں ان کے کچھ آدمی دِقت کا سامنا کر رہے تھے چونکہ دُشمن گھر کر ان پر ہینڈ گرنیڈ پھینک رہا تھا۔ میجر جنجوعہ اس خاص پوسٹ پر چڑھ دوڑے اور دُشمن کے ایک سپاہی پر جھپٹے جو گرنیڈ پھینکنے ہی والا تھا۔ اس کو پکڑ کر نہتہ کیا اور اس کے دو ساتھیوں کو ساتھ کے بنکر سے نکال کر نہتہ کیا۔ میجر جنجوعہ کی ذاتی دلیری اور حاضر دماغی کے سبب جھنگر پوسٹ بغیر کوئی جانی نقصان کے فتح کر لی گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس معرکہ میں بیس ہندوستانی کام آتے تھے۔ جب کہ تین کو قیدی بنا لیا گیا۔ باقی اپنے ہتھیار اور گولہ بارود پیچھے چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

دشمن نے ۷ اور ۸ ستمبر کی درمیانی شب کو ہماری پکا بلج کی پوزیشن پر دو بٹالین سے حملہ کیا۔ حملہ آور توپ خانے کے شدید فائر کی آڑ میں آگے بڑھے تھے۔ حملے کا زور زیادہ تر جھنگر کے علاقے میں تھا۔ میجر محمد اسلم جنجوعہ کی اے کمپنی کے جوابی فائر سے دشمن کا حملہ پسپا ہو گیا۔ دشمن نے ڈھائی بجے دوبارہ اس جگہ پر حملہ کیا۔ اگرچہ توپ خانے سے شدید گولہ باری ہو رہی تھی اور چھوٹے ہتھیاروں کا فائر بھی شدت سے کھلا ہوا تھا۔ میجر محمد اسلم جنجوعہ نے اور ان کی کمپنی نے حواس بجا رکھے اور دشمن کے حملے کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں دشمن ہماری توپ خانے کی آڑ میں پیچھے ہٹ گیا۔ چونکہ فاضلکا پہنچنے کے لئے جھنگر پوسٹ کی فوجی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اس لئے دشمن نے جھنگر پر اپنا دباؤ جاری رکھا۔

مختصر یہ کہ جارحانہ اور دفاعی دونوں حیثیتوں میں میجر محمد اسلم اور ان کی کمپنی کی کارکردگی، بہترین رہی۔ اس آفیسر نے اس معرکے میں ذاتی شجاعت، جرأت مندانہ قیادت، پیشہ ورانہ فراست کا ثبوت دیا اور ان کی کمپنی نے اجتماعی استقلال کا۔

اس کارگذاری کے لئے میجر محمد اسلم جنجوعہ کو ۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو ستارہ جرأت عطا کیا گیا۔

جھنگر کے معرکہ کے چند ناقابل فراموش واقعات

اس معرکے سے متعلق ایک نہیں کئی واقعات ایسے ہیں جو جھنگر کا نام یا خیال آتے ہی میرے ذہن کی اسکرین پر فلم کی طرح چلنے لگتے ہیں جو اپنی تمام تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ آج بھی مجھے یاد ہیں۔ ایک واقعہ جھنگر پر حملے سے پہلے کا ہے۔ دوسرا واقعہ جھنگر پر قبضہ کے فوراً بعد کا ایک سکھ سپاہی سے متعلق ہے اور تیسرا واقعہ ۷ ستمبر کا ہے۔ جب ہم جھنگر پوسٹ پر قبضہ کر کے اس پر دفاعی پوزیشن لئے ہوئے تھے۔ میں ان ناقابل فراموش واقعات کو اسی ترتیب سے بیان کروں گا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، ارنجاب سلیمانکی ہیڈ ورکس کے علاقے میں

مئی ۱۹۶۴ء سے سرحدی دفاع کی خدمات انجام دے رہی تھی۔ اور چپے چپے کی ریکی کر چکی تھی۔ سرحد کے اس پار انڈین بارڈر پوسٹ تھی۔ جو صاف نظر آتی تھی۔ مَیں دس پنجاب کی الفا کمپنی کو کمان کر رہا تھا۔ ۶ ستمبر کو لاہور سیکٹر کی صُورت حال سے بے خبر مَیں نے کمپنی کو اس کے معمول کی تربیت پر بھیجا اور مَیں خود اپنے سینیئر جے سی او اور کوت این سی او کے ساتھ کمپنی کے ہتھیار خانے کی پڑتال کرنے لگا۔ کوئی پونے سات بجے بٹالین کے سی او لیفٹیننٹ کرنل (بعد میں میجر جنرل) امیر حمزہ، میری کمپنی کے علاقے میں آئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا کمپنی کہاں ہے میں نے بتایا کمپنی پانی کی ٹریننگ میں مصروف ہے۔ کیمپ سے کوئی دو میل کے فاصلے پر۔ بٹالین کمانڈر اس وقت بہت خوشگوار مُوڈ میں تھے۔ مسکرا کر کہا اسلم اگر مَیں تم سے کہوں کہ انڈین پوسٹ جھنگر پر حملہ کرنا ہے تو تم، حملہ کرنے میں کتنا وقت لوگے۔ مَیں نے کہا، سَر، کاش۔ آپ ایسا حکم دیتے۔ میری تو حسرت ہی یہ ہے کہ اتنے دن ہو گئے مشقیں کرتے کرتے لیکن دُشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ سُن کر وہ سنجیدہ ہو کر کہنے لگے اسلم، حساب چکانے کا وہ وقت آ گیا ہے۔ حملے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ مجھے صحیح صحیح بتاؤ حملہ کرنے میں کتنا وقت لوگے مَیں نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور کہا اگر آپ مجھے ابھی واٹر ٹریننگ کی جگہ سے جھنگر کی پاکستانی پوسٹ تک کمپنی کو لے جانے کے لئے ٹرانسپورٹ مہیا کر دیں تو تقریبًا ڈھائی گھنٹے میں حملے کے لئے مکمل طور پر تیار ہو جاؤں گا۔ پھر مَیں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ گھنٹے کی سُوئی سات پر تھی مَیں نے کہا اب ٹھیک سات بجے ہیں۔ مَیں انشاءاللہ ساڑھے نو بجے ایف یو پی پر موجود ہوں گا میرے اندر کا جنگجو سپاہی پورے طور پر بیدار ہو چکا تھا۔ مَیں نے قاعدے کے مطابق کہا۔ سَر مجھے حملہ کرنے کے رسمی احکامات دیئے جائیں۔ اس پر کمانڈر نے کہا۔ تمہیں کسی ملٹری آرڈرز کی ضرورت نہیں۔ سیدھی سی بات ہے۔ تمہیں معلوم ہے جھنگر میں ہندوؤں کی پوسٹ ہے۔ اس پر حملہ کر کے انہیں واصل جہنم کرنا ہے۔ اور پوسٹ پر قبضہ کرنا ہے۔ ان کے آخری الفاظ یہ تھے۔

ہم ہندو کو بیخ کرے گا۔ توپ خانہ اس کے اُوپر پھلجھڑی چڑھائے گا تم اس کو

منڈ دینا۔ مختصر یہ کہ جب ساڑھے نو بجے کے قریب میں ایف یو پی کے قریب پہنچا تو سامنے جھنگر کی انڈین پوسٹ پر عجب نظارہ دیکھا۔ ڈھول بج رہا تھا۔ اور کشتیوں کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ دنگل کا سا سماں تھا۔ بہت سے سکھ سپاہی لنگوٹ کسے ہوئے دائرے میں کھڑے ہوئے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ تماشائی سپاہیوں میں سے کوئی سونے کے کپڑوں میں تھا۔ کسی نے کچھ پہنا ہوا تھا۔ کوئی کوئی پتلون بنیان میں تھا۔ مَیں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان ظالموں کو بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ مَیں نے سوچا اگر اس لاعلمی میں ہم ان پر چڑھ دوڑیں تو مزہ آجائے۔ لیکن مَیں بغیر حملے کے احکام ملے پہل نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے صُورتِ حال سے اعلیٰ افسروں کو آگاہ کیا اور کہا اس سے بہتر موقعہ پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ کچھ دیر کے بعد وُہ مضحکہ خیز واقعہ پیش آیا۔ جس کے لئے مَیں نے یہ لمبی تمہید باندھی ہے۔ ہوا یہ کہ کچھ دیر کے بعد جھنگر پوسٹ سے ایک سکھ سپاہی نکلا اور ہمارے سامنے باؤنڈری کے ستون پر پیشاب کرنے لگا۔ اس کی اس بدتمیزی پر مجھے بڑا غصہ آیا۔ لیکن موقعہ کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے چُپ رہا۔ لیکن جب اُس نے مجھے جنگی سازو سامان سے لیس دریائے ستلج کے حفاظتی بند کے بائیں کنارے پر پوزیشن لئے لیٹے دیکھا تو کچھ حیرت زدہ سا ہوا پھر ہنسا، اور پھر اپنی پتلون کے بٹن بند کرتے ہوئے مجھے سلیوٹ مارا اور پنجابی میں کہا :-

صاحب جی ! اَج کیوں وڈّے ویلے اپن بھوئیں تے ولدنیاں کردے پھر رہے او،

دُوسرا ناقابلِ فراموش واقعہ ایک سکھ سپاہی سے متعلق ہے :-

۱۷ ستمبر ہی کی بات ہے جھنگر پوسٹ پر قبضہ کرنے کے بعد، رات کے کوئی ۱۲ بجے کے وقت میں اپنے پلاٹون کمانڈر سے ضروری رابطہ قائم کرنے اور صُورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے جھنگر پوسٹ کے علاقے میں گشت کر رہا تھا۔ کماد کے ایک کھیت سے گذرتے ہوئے جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ میرا پاؤں کسی کے جسم پر پڑا۔ جب مجھے یہ احساس ہوا

تو مَیں نے فوراً دیا سلائی جلائی کہ دیکھوں کیا معاملہ ہے۔ مَیں نے دیکھا کہ ایک سِکھ سپاہی خون میں لت پت چت پڑا تھا بظاہر وہ نیم مُردہ سا نظر آرہا تھا۔ بس اُس نے رائفل دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھی جو اس کے سینے پر رکھی تھی۔ مَیں نے اپنے پاؤں سے اس کی رائفل دباتے ہوئے کہا۔ اگر تم زندہ ہو تو اپنی رائفل مجھے دے دو اور فرسٹ ایڈ کے لئے میرے ساتھ آؤ تاکہ تمہیں پھر پیچھے پہنچایا جا سکے۔ لیکن جب اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے ایک ہاتھ سے اپنی اسٹین پکڑ کر دُوسرے سے اس کی رائفل اس سے چھیننے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے رائفل کو اتنا کس کے پکڑا ہوا تھا کہ میں اسے اس کے ہاتھوں سے نہ چھین سکا۔ مَیں نے ایک بار پھر کوشش کی۔ لیکن رائفل پر اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ مَیں پھر بھی رائفل اس سے نہ لے سکا۔ یہ دیکھ کر مجھے غصہ آیا۔ مجھے اپنے کام سے دیر ہو رہی تھی۔ رائفل وہ دے نہیں رہا تھا۔ اور اس طرح بھری رائفل اس کے ہاتھ میں چھوڑ کر میں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ جس سے وہ کسی کو مار سکتا تھا۔ مَیں نے جھنجھلا کر کہا۔ دیکھو ہم مُسلمان ہیں زخمی اور بیمار سپاہیوں کو نہیں مارتے۔ یہ تیسری بار ہے کہ مَیں تم سے کہہ رہا ہوں کہ اپنی رائفل میرے حوالے کر دو۔ اگر اس بار بھی تم نے میرا حکم نہ مانا تو مجبوراً مجھے تمہیں گولی مارنی پڑے گی۔ یہ سُنتے ہی یکایک اس میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے بہت صاف آواز میں کہا:۔

تُسی مُسلے او، تہاڈے کوئی اصول ہون گے۔ اسی ہاں خالصے، ساڈے کوئی اصول نہیں۔ پَر سانوں باپو نے کہیا سی کہ پُت توں لڑائی تے جا رہیا ایں، اک گل یاد رکھیں جد توڑی جان وِچ جان رہوی، اپنا ہتھیار دُشمن نوں ناں دیویں۔ بابو آپاں تے باپو دی گل نوں پالنا اے۔ ہتھیار تے آپاں دینا نہیں۔ باقی گولیاں بھانویں سانوں ویہہ مار لو۔

مجھے بہت دیر ہو رہی تھی۔ عاجز آکر مَیں نے اپنی اسٹین گن سے اس پر ایک فائر کیا اور آگے بڑھ گیا۔

اینٹوں کے بھٹہ پر میری بٹالین کمانڈر سے ملاقات ہوئی۔ ہم اسی راستے سے واپس آئے
جب اس جگہ پر پہنچے جہاں پر وُہ سکھ سپاہی پڑا تھا۔ مَیں نے سی او کو بتایا کہ اس بہادر سکھ کو
مجھے محض اس کی ضد کی وجہ سے مارنا پڑا۔ ابھی مَیں یہ بات کر رہا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا
جیسے اس میں جان باقی ہو۔ مَیں نے اس کی نبض دیکھی تو نبض چل رہی تھی۔ گویا وہ سخت جان
ابھی زندہ تھا۔ میں نے اس کی موت کو آسان کرنے کے لئے ایک اور برسٹ اس کی گردن پر مارا۔
تب کہیں جاکر وہ ٹھنڈا ہوا۔ دوسرے دن جب دُشمن کے مقتولوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے
کا سوال پیدا ہوا تو مَیں نے باقی کو تو ایک بڑا گڑھا کھدوا کر دبوایا لیکن اس سپاہی کے لئے جو
بہادر بھی تھا اور اچھا فرماں بردار بیٹا بھی، مَیں نے اعزاز کے طور پر اس کے لئے ایک علیحدہ گڑھا کھدوایا
اور اس کے اُوپر ایک نشانی لگوا دی۔

فائر بندی کے بعد جب مقابل کے کمپنی کماندار سے ایک فلیگ میٹنگ ہوئی تو مَیں نے
سکھ سپاہی کا قصہ اسے سُنایا اور اس جگہ کی نشاندہی بھی کی جس جگہ اس کو گاڑا گیا تھا۔ دوسری
فلیگ میٹنگ پر مجھے معلوم ہوا کہ اسے مرنے کے بعد کا کوئی فوجی اعزاز دیا گیا ہے۔

تیسرا واقعہ بھی جھنگر کے معرکے کے دوران کا ہے۔

۷ ستمبر کی صبح سے میری کمپنی دُشمن کے جوابی حملے کی زد میں تھی۔ گو یہ جوابی حملہ
غیر متوقع نہیں تھا۔ اس لئے ہم دفاعی پوزیشن لے چکے تھے لیکن اس کی شدّت ہر ایک کی
توقع سے بہت زیادہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بلا کی گولہ باری کی زد میں آنے کا یہ پہلا
اتفاق تھا۔ جس کی شدّت ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آگ کا طوفان
آیا ہوا ہے۔ اس وجہ سے کمپنی کا ہر فرد جس گڑھے یا خندق میں تھا وہیں بندھ کے رہ گیا تھا
کوئی بھی ذرا سا بھی ہلتا جُلتا نظر نہیں آتا تھا۔ گذشتہ سہ پہر سے ساری کمپنی بغیر کھائے پیئے
برسرِ پیکار تھی۔ صبح دس بجے کے قریب مجھے ایک پلاٹون کمانڈر کا پیغام ملا کہ پانی کی کمی سے
جوان بے حال ہو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دُوسرے پلاٹون کمانڈر کا فون آیا کہ سرِ پیاسِر

سے جوانوں کا بُرا حال ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد تیسرے پلاٹون کمانڈر نے ٹیلی فون لائن پر رابطہ قائم کیا۔ یہ ایک افسر تھا۔ مَیں نے کہا کیا بات ہے۔ ادھر سے آواز آئی سر، پانی کا بڑا مسئلہ ہے ابھی وہ کچھ اور کہتا مجھے طیش آ گیا۔ پانی پانی تم لوگوں نے پانی کو میری چڑ بنا لیا ہے۔ میں تمہارا کمپنی کمانڈر ہوں یا ماشکی۔ جھنگر پوسٹ اور گاؤں میں نلکوں کی کوئی کمی ہے۔ بلڈی ڈیل اپنی پلاٹون کے لئے پانی کا انتظام خود کرو۔ ابھی میرا جُملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ادھر سے رسیور رکھنے کی آواز آئی۔ مَیں سمجھ گیا کہ پلاٹون کمانڈر سمجھ گیا ہے کہ مَیں کیا چاہتا ہوں اور اسے میرے مُوڈ کا اندازہ بھی ہو گیا ہے۔ میں توقع کر رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی نلکے کی طرف جو بہت دُور نہیں تھا جانے کی کوشش ضرور کرے گا۔ خاصی دیر گذر گئی اور پانی کی طرف کوئی جاتا نظر نہ آیا۔ تو مجھے فکر ہوئی۔ ایک تو دُشمن کی شیلنگ شدید تھی دوسرے پانی کی شدید قلت، تباہی کا پُورا سامان تھا لڑائی میں اکثر وہ لمحہ آجاتا ہے۔ جب کمانڈر کی جرأت اور قوتِ فیصلہ کا امتحان ہوتا ہے۔ میرے لئے وہ لمحہ آچکا تھا۔ میں نے دل میں فوراً فیصلہ کر لیا کہ اب مجھے پہلا قدم اُٹھانا چاہیئے۔ ورنہ یہ کمپنی دشمن کے گولوں سے نہیں تو اپنی پیاس سے ختم ہو جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی مَیں نے بیلٹ کے سوا، ہیلمٹ سمیت دوسرا سازو سامان جو وردی کے ساتھ ہوتا ہے اتارا، کندھے پر ٹاول ڈالا اور ہاتھ میں پانی کی بوتل لے کر مَیں پوسٹ کے نلکے کی طرف بڑے اطمینان سے جیسے یہ میدان جنگ نہیں، کھیل کا میدان ہے چلنے لگا۔ میرے ایس جے سی او نے کہا بھی سر، یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ ہم دُشمن کی براہِ راست شیلنگ کی زد میں ہیں لیکن مَیں نہ مانا۔ اور نلکے کی طرف چلتا رہا۔ جُونہی کھُلے میں آیا دُشمن کے او پی نے مجھے تاڑ لیا اور پوری بیٹری کا فائر گرانا شروع کیا۔ لیکن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے، مجھے احساس تھا کہ ساری کمپنی کی نفری مجھے دیکھ رہی ہوگی اس لئے مَیں نے اپنے اسٹائل یا رفتار میں ذرا فرق نہیں آنے دیا۔ اسی طرح خراماں خراماں مَیں نلکے تک گیا۔ اطمینان سے ہاتھ منہ دھویا۔ پھر تولیے سے چہرہ خشک کیا۔ پھر مَیں نے پائپ سلگایا اور بڑے مزے سے پائپ کے کش لیتا ہوا کندھے پر ٹاول ڈالے

اور بائیں ہاتھ میں واٹر باٹل تھامے اسی طرح بے نیازی سے قدم اُٹھاتا ہوا اپنے کمپنی ہیڈکوارٹر تک اللہ کے کرم سے زندہ سلامت واپس آگیا۔ مَیں نے یہ دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ میرا ڈرامہ کارگر ہوگیا ہے۔ کمپنی کے لوگ ایک ایک دو دو کرکے نالے کی طرف جا رہے ہیں اور کم از کم پانی کی پرابلم حل ہوگئی ہے۔ مَیں اس جرأت مندانہ اقدام کو ڈرامہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حقیقت میں مَیں ایکٹنگ کر رہا تھا۔ خوف زدہ مَیں بھی تھا۔ اندر سے میرے دل کی جو حالت تھی وہ مَیں ہی جانتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ خوف مجھ پر نہیں، مَیں خوف پر غالب تھا اور اسی کا نام بہادری اور جرأت ہے۔ ایک لیڈر اگر جرأت رندانہ کے مظاہرے کی جرأت نہیں رکھتا تو کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ لیکن مَیں یہ ضرور کہوں گا کہ اس تمام عرصے میں میرا یہ ایمان بھی مجھے تقویت دے رہا تھا کہ موت اور زندگی خدا کے ہاتھ ہے۔ اگر موت میرا مقدّر نہیں ہو چکی تو دشمن کے ہزار گولے بھی مجھے مار نہیں سکتے۔

ستارۂ جرأت کا پس منظر

کوئی بڑا کام از خود یا کسی اتفاق سے ظہور میں نہیں آتا اس کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی محرک قوت ضرور ہوتی ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی پس منظر بھی ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ہم نے بریگیڈیئر اسلم سے پُوچھا کہ وہ اپنے ستارہ جرأت کے نفسیاتی محرکات اور پس منظر سے پردہ اُٹھائیں تو ان کا جواب یہ تھا۔

" راشد صاحب۔ ۶ ستمبر کی صبح کو ہم سب کا جذبہ مشترک تھا کہ پاکستان کو دُشمن سے بچانا ہے۔ اور ہر قیمت پر بچانا ہے۔ جذبۂ جہاد اور جذبۂ شہادت اتنا شدید تھا کہ اس کو روکنا اور اس سے صحیح کام لینا مشکل ہو رہا تھا۔ کیا سپاہی کیا افسر سب بے چین تھے کہ پہلے ہم آگے بڑھیں اور اپنی جان نچھاور کریں۔ مَیں اس امر میں ذرّہ برابر مبالغہ نہیں کر رہا ہوں کہ اگر اس وقت کوئی یہ کہتا کہ پاکستان کے لئے آگ میں کود پڑنا ہے تو ہر کوئی بے

لمحہ کے لیۓ سوچے بغیر، آگ میں کُود پڑتا۔ اس وقت جنگ کا ہر محاذ آگ کے الاؤ سے کم نہیں تھا۔ اور اس میں کُود پڑنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرا جذبہ بھی وہی تھا جو دُوسروں کا تھا۔ رہی بات نفسیاتی محرکات اور پس منظر کی تو فلسفے کی اُلجھنوں میں پڑے بغیر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے ذہن و کردار کی تشکیل میں میرے والد مرحوم (خدا انہیں جنّت الفردوس میں جگہ دے) کا ہاتھ بہت زیادہ ہے۔ ایمان ان کا بہت پختہ تھا اور شہادت ان کا خاص موضوع تھا۔ شہید کے مرتبے پر اکثر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ شہید کی شہادت سے اس کے لواحقین کی عاقبت بھی سنور جاتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں حضرت امیر حمزہؓ، حضرت امام حسینؑ، حضرت بلالؓ اور صوفیا میں منصور حلاجؒ ان کے ہیرو تھے۔ چنانچہ وہ ان اکابر ہستیوں کا تذکرہ اکثر کیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے لاشعوری طور پر ہی نہیں شعوری طور پر بھی میں زندگی کا حاصل یہی سمجھتا تھا کہ زندگی خدا کی راہ میں کام آئے۔ والد مرحوم کے ہیرو کس طرح میرے ہیرو بن چکے تھے۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اولادِ نرینہ سے نوازا تو میں نے ان کے نام امیر حمزہؓ، شبیرؓ، بلالؓ اور منصورؒ رکھے

اَب میں سلیمانکی فاضلکا سیکٹر میں ایک حُسنِ اتفاق کا ذکر کروں گا۔ جس نے یقیناً میرے حوصلے کو بڑھایا۔ وہ اتفاق یہ تھا کہ سلیمانکی سیکٹر میں ۱۰۵ بریگیڈ کے کمانڈر ایک نامور عالمگیرین (۴۶۰) بریگیڈیئر (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) محمد اکبر خاں تھے۔ اور بی۔ ایم بھی ایک عالمگیرین (۹۴۹) میجر (بعد میں کرنل) محمد اکبر تھے۔ جب مجھے جھنگڑ پوسٹ سر کرنے کا حکم ملا تو یہ محض بٹالین کی عزت کا سوال نہیں تھا یہ کالج کی عزت کا سوال بھی بن گیا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ جھنگڑ کے معرکے میں ۴۔ پنجاب کی ایک کمپنی کو کمان کر رہا تھا اور یہ بٹالین اس وقت لیفٹیننٹ کرنل (بعد میں میجر جنرل) امیر حمزہ خاں، ہلالِ جرأت، ستارہ جرأت کے زیرِ کمان تھی۔ میں اپنی زندگی میں ہر عہدے کے کمانڈروں سے ملا ہوں۔ اور بعض کو جنگ میں بھی بہت قریب سے دیکھا ہے اس تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں

کہ حمزہ صاحب اپنے عہد کے بہترین کمانڈروں میں سے ہیں۔ اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں فخر محسوس ہو رہا ہے کہ اگر میری کامیابی کا کوئی کریڈٹ ہے تو یہ بڑی حد تک انہیں کو جاتا ہے ان کا نام ہی بڑا نہیں کردار بھی بڑا ہے۔ یہ ان کی قیادت ہی کا کمال تھا کہ ۱۰ پنجاب نے سلیمانکی سیکٹر میں اتنے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم کمانڈر ہیں۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھے ان کے زیر تربیت رہنے اور زیر کمان لڑنے کا موقعہ ملا۔

حقیقت یہ ہے کہ کمانڈر سے فرق پڑتا ہے اور بہت بڑا فرق پڑتا ہے۔

چند دلچسپ اور فکر انگیز واقعات: بریگیڈیر جنجوعہ سے ہمارا آخری سوال یہ تھا کہ اپنی عسکری زندگی کے کچھ ایسے واقعات بھی سنائیے جن پر آپ کی تربیت کی چھاپ ہو۔ ان کا جواب یہ تھا:

پہلا واقعہ اگست ۱۹۵۲ء کا ہے۔ مجھے کمیشن کے بعد پہلی چھٹی کاٹنے کے بعد انفنٹری اسکول میں رپورٹ کرنے کوئٹے جانا تھا اور دریائے جہلم کو کشتی پر پار کر کے منڈی بہاؤالدین سے ریل پکڑنی تھی۔ میرا سگا بھائی محمد اکرم اور محمد ایوب خدا حافظ کہنے ساتھ آئے تھے۔ جب پتن پر پہنچے تو پتہ چلا کہ ایک کشتی ابھی ابھی پار گئی ہے دوسری تین گھنٹے کے بعد جائے گی۔ آس پاس کوئی اور کشتی بھی نہیں تھی میں بہت پریشان ہوا اس طرح تو منڈی سے گاڑی نہ پکڑ سکوں گا ایک بوڑھا خرانٹ ملاح قریب ہی کھڑا تھا میں نے اس سے پوچھا کیوں چاچا جی۔ کیا دریا کو تیر کر پار نہیں کیا جا سکتا کہنے لگا دیکھ لو۔ برسات کا موسم ہے۔ گو دریا میں پانی نہیں چڑھا لیکن پاٹ نو میل سوا میل کا ہے پھر مجھے غور سے دیکھ کر مسکرایا۔ جوانا! کسی نے دل تو نہیں توڑ دیا کہ اس طرح جان دینے کا ارادہ ہے اسکو دل لگی سوجھی تھی میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ راجہ فیروز خان کا بیٹا اور ملٹری کالج کا پڑھا ہوا لفٹیننٹ پہلی چھٹی کاٹ کر ڈیوٹی پر لیٹ جائے، اس خیال ہی سے مجھے بے عزتی محسوس ہو رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ اسی الجھن میں گزر گئے کہ کروں تو کیا کروں۔ میری تربیت میرے دل پر دستک دے رہی تھی "حوصلہ کرو، اسلم حوصلہ!" یہ خاموش آواز مجھے ہر طرف سے آتی

محسوس ہو رہی تھی۔ پھر میں نے حوصلہ کر لیا۔ کپڑے اتارے۔ سوئمنگ کاسٹیوم پہنی اس میں ایک سو فانوٹ اڑسا۔ اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔ "بھائی جان اسلم کیا کر رہے ہیں؟" بھائی اکرم نے حیرانی سے پوچھا۔ میں نے کنارے سے جواب دیا "ذرا نہا لوں۔" لیکن جب میں نے اطمینان کر لیا کہ دریا کا بہاؤ قابل برداشت حد تک تیز ہے۔ تو میں نے ہاتھ ہلا کر بھائیوں سے کہا۔ "میں چلا۔ تم لوگ سامان لے کر گھر آ جانا۔" میرے والد کا ہم جماعت بوڑھا چاچا دادو بس کا ایک کان کٹا ہوا تھا چیختا ہی رہا "پتہ نہیں پار پہنچ بھی پائے یا نہ جائے" لیکن میں نے پار جا کر ہی دم لیا۔

دوسرا واقعہ ۱۹۵۱ء کا ہے۔ میں اٹک کے علاقے میں سمندری کمانڈو کا بقیہ کورس کر رہا تھا۔ وہاں آئی ایس ایف سی بریگیڈیئر (بعد کو لیفٹیننٹ جنرل) بختیار رانا آئے۔ تعارف ہوا پوچھنے لگے۔ "کس یونٹ کے ہو۔" میرا جواب تھا "پنجاب راشیہ دل ہوں۔" ان کا دوسرا سوال تھا "کہاں پڑھا ہے؟" میں نے سینہ تان کے کہا۔ "ملٹری کالج جہلم میں" "یہاں کیا کر رہے ہو؟" "ایس ایس جی کمانڈو کورس" "تیرنا تو خوب جانتے ہو گے؟" "اس میں کیا شک ہے۔" "یہ دریا تیر کر پار کر سکتے ہو؟" "یہ کونسی بڑی بات ہے۔" چڑھتی جوانی کی ترنگ میں تھا۔ بڑھ چڑھ کر جواب دیتا رہا۔ یونٹ اور کالج کی گڈی چڑھانے کیلئے۔ بریگیڈیئر رانا بھی ایک جہاندیدہ تھے انہوں نے سوچا ہوگا یہ نوجوان افسر بہت اونچی ہوا میں ہے۔ ذرا اس کا نشہ اتارنا چاہیئے۔ بولے۔ اچھا آدھ گھنٹے کے بعد ہم یہ تماشا دیکھیں گے۔ یہ خبر کہ لیفٹیننٹ اسلم جنجوعہ دریا پار کر کے دکھائے گا۔ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جو ملے یہی کہے "اسلم! یہ تم نے کیا کیا۔" لیکن میں چیلنج قبول کر چکا تھا۔ مختصر یہ کہ میں نے بیگم کی سرا کے کھنڈرات کے پاس سے چھلانگ لگائی تھی اس پار خیر آباد گاؤں کے قریب جا کر کنارہ پکڑا۔ خیر آباد میں جو میرا استقبال ہوا اسے میں نہیں بھول سکتا۔

اس کمانڈو کورس کے بعد میری پوسٹنگ مشرق پاکستان میں ہوئی تھی۔ مجھے لاہور سے پرواز کرنا تھا وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ جہاز دوسرے روز جائے گا۔ اسی عرصے میں کسی نے والد صاحب کی علالت کے بارے میں بتایا میں انکو دیکھنے دگھہ چلا گیا واپسی پر میں نے کھاریاں سے آگے پران والا اسٹیشن سے چناب ایکسپریس پکڑنا چاہی وہاں یہ گاڑی رکتی نہیں تھی۔ کانٹے والے سے سازباز کی کہ ایک لمحے کیلئے گاڑی روکے لیکن وہ صرف گاڑی کو آہستہ کرا سکا میں نے ایک ڈبے کا ڈنڈا پکڑنے کی کوشش کی لیکن کیچڑ میں گر پڑا۔ شکر ہے کہ چوٹ نہیں لگی اب پھر وہی صورت جو دو سال پہلے کوئٹے جاتے ہوئے تھی کہ یہ گاڑی مس کرتا ہوں تو ڈیوٹی سے بیٹ

ہوتا ہوں میں نے ایک لمحہ سوچے بغیر پٹری پر دوڑنا شروع کر دیا چار پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ گاڑی لالہ موسیٰ جنکشن پر ۲۵ منٹ ٹھہرتی تھی میں نے اسے وقت پر جا لیا یہ تینوں واقعات چیلنج کو قبول کرنے کے رویے کے ہیں انکے پیچھے میرے ملٹری کالج کے شب و روز تھے آگے چل کر ۶۵ء اور ۷۱ء میں بھی یہی تربیت رنگ لائی۔

اب ایک واقعہ ۱۹۶۹ء کا ہے۔ ۱۰ پنجاب کا سی او پروموٹ ہو کر لاہور میں مارشل لاء کی ڈیوٹی کر رہا تھا ایک روز شہید چوک کے قریب بڑا ہنگامہ تھا ٹریفک پولیس کے گول چکر پہ کمشنر لاہور مختار مسعود ڈپٹی کمشنر فتح محمد بندیال کھڑے تھے اور ایس پی حاجی حبیب الرحمٰن اپنی کاروائی کرنے میں مصروف تھے لیکن ہجوم اتنا تھا کہ بے قابو ہوئے جا رہا تھا جب قانونی طور پر مجھ سے چارج لینے کو کہا گیا تو میں نے اپنے تیس آدمیوں کو لائن اپ کیا اور میگا فون پر ہجوم سے صرف اتنا کہا ۱۰ پنجاب وہ پلٹن ہے جسے خود قائداعظم نے قومی پرچم عطا کیا تھا اس پرچم کی لاج آپکو اور مجھے رکھنی ہے لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ تین منٹ کے اندر اندر منتشر ہو جائیے اور وہ ہو گئے اس مارشل لاء ڈیوٹی کو میں نے اپنے لوگوں کی خدمت کے ذریعے کے طور پر استعمال کیا اس کارکردگی کے لئے اگست ۷۰ء میں مجھے تمغۂ قائداعظم عطا ہوا تھا۔

آخر میں ۷۱ء کی جنگ کا ایک انوکھا واقعہ بیان کرتا ہوں میں ان دنوں ۳۸ پنجاب کمان کر رہا تھا۔ حسن اتفاق سے اس وقت ۳۸ پنجاب میں ساری اہم پوسٹوں پر عالمگیرین ہی فائز تھے۔ سی او یعنی میرے علاوہ دو کمپنی کمانڈر میجر (بعد کو لیفٹیننٹ کرنل) افتخار کیانی اور میجر (بعد کو کرنل) زمرد اور یونٹ کے صوبیدار میجر غلام مرتضیٰ حسین شاہ بھی ایم سی کے تھے) سیالکوٹ سیکٹر میں جسڑ پل کی حفاظت ۳۸ کی خصوصی ذمہ داری تھی پل کا تو دفاع ہم نے کر لیا لیکن دشمن کے مسلسل ہوائی حملوں سے ہمارا بڑا نقصان ہو رہا تھا نہ ہمیں ائر فورس کی مدد حاصل تھی اور نہ ہی طیارہ شکن توپیں تھیں۔ ہندوستانی ہوائی جہاز لہر در لہر آتے اور ہمارے مورچوں کو نشانہ بنا کر چلے جاتے۔ ہر بار دو ایک شہید اور زخمی ہوتے یہ صورتحال ناقابل برداشت ہو رہی تھی اسکا بالکل غیر روایتی اور انوکھا حل میں نے یہ نکالا کہ حکم دیا کہ اب جب انڈین جہاز آئیں تو ساری پلٹن مورچوں سے باہر نکل آئے اور جو ہتھیار جسکے پاس ہو اس سے فائر کرے ہتھیار نہیں تو پتھر ہی پھینکے وہ بھی نہیں تو مکا دکھائے۔ گالی ہی دکھائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور ایک ایس یو سیون جہاز اس تدبیر کاری سے مار گرایا۔ جس کے کچھ ٹکڑے آج بھی میرے پاس

۔۔۔ ہیں اسکا پائیلٹ لیفٹیننٹ کاڈ ویل ہم نے پکڑ لیا تھا اسنے ہمیں بتایا کہ وہ یہ انوکھا منظر دیکھ کر اتنا بکرایا کہ مڑ کر دبانا بھول گیا اور ہٹ ہو گیا۔

ان واقعات کا تجزیہ میں ماہرین نفسیات پر چھوڑتا ہوں۔ اپنی طرف سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گھر کی روایات اور تربیت کا ماحول بہت دور رس اثرات رکھتا ہے۔

مصنف کا تبصرہ

اَب تک جو کچھ آپ نے پڑھا یہ وہ مواد تھا جو ہم نے بریگیڈئر اسلم سے انٹرویو کر کے کم و بیش ان ہی کے الفاظ میں پیش کیا۔ اَب ہم چھنگر کے معرکے کے وقت اسلم صاحب کے کمانڈنگ افسر، لیفٹیننٹ کرنل امیر حمزہ خاں کے تاثرات ان کی شخصیت کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔ بعد میں جب جناب حمزہ میجر جنرل ہوئے اور اسلم صاحب نے بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی پائی تو ایک بار پھر وہ حمزہ صاحب ہی کے ڈویژن میں ان کے زیر کمان رہے۔ اس طرح بریگیڈئر اسلم کے بارے میں میجر جنرل (ریٹائرڈ) امیر حمزہ خاں ہلالِ جرأت، ستارہ جرأت کے تاثرات ایک فنی مبصر کے تبصرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنرل حمزہ لکھتے ہیں :۔

بریگیڈئر اسلم جنجوعہ نے میجر کی حیثیت سے ۱۹۶۵ء میں میرے زیر کمان ۱۰ پنجاب کی ایک رائفل کمپنی کمان کی۔ یہ اپنے کام کو خوب جانتے تھے۔ اور اپنے جوانوں سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے ان کے جوانوں نے ان کی قیادت کا بڑا اثر قبول کیا۔ اور اپنی جانوں کی بازی لگا دی۔

اسلم دلیر ہیں اور خطرہ مول لینا جانتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انہیں خطرہ مول لینے کا جنون ہے لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ یہ خطرہ ضرور مول لیتے ہیں لیکن پُرخطر اقدام کے مثبت اور منفی امکانات کا خوب اچھی طرح جائزہ لے کر، جنگ میں جو لوگ تحفظ کو سب سے مقدم سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ کبھی کامیابی سے نہیں لڑ سکتے۔ جنگ نام ہی خطرہ لینے کے حوصلے کا ہے۔ اَب یہ

کمانڈر کی فراست ہے۔ وہ کہاں خطرہ مول لینا مناسب سمجھتا ہے اور کہاں نہیں۔ جرأت اور حماقت میں لکیر کھینچنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ جب بھی کوئی چیلنج سامنے آیا اسلم جنجوعہ نے اس کا مقابلہ کیا۔ اور بالکل غیر متوقع طور پر کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ ان کی حیرت انگیز کامیابیوں کا راز یہ ہے کہ ان کے اندر قیادت کی وہ صفات ہیں جو ان کے جوانوں کے مزاج اور ماحول کی توقعات کے عین مطابق ہیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جو بہت سے کمانڈر نہیں سمجھ پاتے ہیں۔ قیادت کی وہ صفات جو کتابیں پڑھ کر پیدا کی جاتی ہیں۔ ہمارے جوانوں پر اثر نہیں کرتیں۔

قیادت کی ان بنیادی صفات کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ میں نے اسلم جنجوعہ کو ڈسپلن نافذ کرنے کے معاملہ میں بھی بہت سخت پایا۔ وہ بغیر تعصب یا علاقائی جانب داری کے سب کے ساتھ انصاف کر سکتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد میجر اسلم نے ترقی پا کر میرے ڈویژن میں ایک بریگیڈ بھی کمان کیا۔ اس بلند تر کمان کا حق بھی انہوں نے ادا کیا اور خوب ادا کیا۔

(یہ تاثرات میجر جنرل ریٹائرڈ امیر حمزہ خاں ہلالِ جرأت، ستارہ جرأت نے ہماری درخواست پر اِس کتاب کے لئے قلم بند کئے۔ اِس نظرِ کرم کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں)

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد زمان کیانی

امتیازی سند، پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد زمان کیانی امتیازی سند پنجاب رجمنٹ

کرنل زمان اپنے نام کے ساتھ کیانی لکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا نسلی رشتہ گکھڑوں کے مشہور جنگجو قبیلے سے ہے۔ ان کو بھی وہی روائتیں ورثے میں ملی ہیں جو گکھڑوں اور کیانیوں کا عرصۂ دراز سے طرۂ امتیاز ہیں۔

زمان کیانی کے والد راجہ غلام حسین رائل انڈین آرمی کی بلوچ رجمنٹ میں نائب صُوبیدار تھے۔ جو اس زمانے کے لحاظ سے بڑا معزز عہدہ تھا۔ انہوں نے پہلی جنگِ عظیم میں عراق کے محاذ پر جنگ میں حصہ لیا تھا۔

ابتدائی زندگی اور تعلیم

اپنی ابتدائی زندگی اور تعلیم کے بارے میں کرنل زمان لکھتے ہیں، مَیں جہلم میں پیدا ہوا ۲۵ دسمبر ۱۹۲۰ء تاریخ پیدائش ہے۔ بچپن عام بچّوں کی طرح کھیل کُود میں گذرا۔ چونکہ والد اکثر اسلامی تاریخ کے واقعات اور جنگِ عظیم اوّل کے تجربات و مشاہدات سنایا کرتے تھے

اس لیئے اس چھوٹی سی عمر میں اس خواہش کی چنگاری دل میں پڑ گئی تھی۔ کہ بڑا ہو کر میں بھی کچھ کروں۔ میں نے ابتدائی تعلیم چک دولت ضلع جہلم کے اسکول میں حاصل کی۔ میرا رجحان آؤٹ ڈور اسپورٹس کی طرف تھا۔ بچپن کو لوگ سہانی یادوں کا زمانہ کہتے ہیں۔ میری یادوں کے صحرا میں کوئی ایسا نخلستان نہیں جس کو میں اب یاد کر کے کوئی بات پیدا کر سکوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ والد جو راجہ صاحب کے نام سے مشہور تھے بڑے سخت آدمی تھے۔ جو بات کہہ دیتے تھے یا جو ارادہ کر لیتے تھے وہ کر کے چھوڑتے تھے۔ والدین عموماً بچوں کو ان کی غلطیوں یا شرارتوں پر دھمکیاں دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کرو گے تو یوں پٹائی ہو گی وہ کرو گے تو یہ ہو گا۔ والد صاحب کی یہ عادت نہیں تھی۔ میں نے انہیں دھمکی دیتے نہیں دیکھا لیکن جب کوئی بات کہہ دیتے تو پورا کر کے چھوڑتے یہ ان کے کردار کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ وہ ارادے اور دھن کے پکے تھے۔ کہا کرتے تھے جو کرنا چاہتے ہو کر گذرو۔ اگر ڈرتے رہو گے سوچتے رہو گے تو کبھی قدم بڑھا نہیں سکو گے۔ میں ان کی اس خصوصیت سے متاثر ہوا۔ اور اب بھی ہوں۔ زندگی بھر میں نے ان کی تربیت کے اس اصول سے فائدہ اٹھایا۔ جو کام کرنا ہے اس پر شیر کی طرح جا پڑو۔

بچپن کی ایک اور یاد قابلِ ذکر ہے۔ وہ چک دولت اسکول کے ایک اُستاد راجہ اللہ داد کی یاد ہے۔ ہمارے ہم قوم تھے اور اس زمانے کے اُستادوں کی طرح بڑے سخت تھے۔ لیکن پڑھاتے بہت محنت سے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنّت نصیب کرے۔ ایسے مخلص اور محنتی استادوں ہی سے قومیں بنتی ہیں۔

ملٹری کا زمانۂ تعلیم

زمان کیانی ملٹری کالج میں ۱۹۴۴ء میں چھٹے درجے میں داخل ہوئے تھے۔ ۱۲۷۸ کالج نمبر تھا۔ ان کا پہلا ہاؤس رابرٹس ہاؤس تھا۔ ۱۹۴۸ء میں پی اے سپیشل کر کے یہاں سے رخصت ہوئے۔

کالج کی یادیں

زمان کیانی کالج میں اپنے دورِ تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں۔ جب میں کالج میں داخل ہوا تھا تو ۸۳۵ حق نواز کیانی ہیڈ بوائے تھے۔ کالج میں ان کا رُعب کسی افسر سے کم نہ تھا۔ اسمارٹ بھی بہت تھے۔ ان کا ٹرن آؤٹ کالج میں سب سے اچھا ہوتا تھا۔ وہ باکسر بھی بہت اچھے تھے۔ ان دنوں باکسنگ کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ اور سب کیلئے لازمی تھی۔ اور جو لڑکے باکسنگ میں اچھے ہوتے اکثر عہدے وغیرہ انہی کو دیئے جاتے تھے۔ کالج کی باکسنگ ٹیم میں اسلم جنجوعہ، محمد حسین وغیرہ بڑے زبردست باکسر تھے۔ آخر سالوں میں مجھے بھی کالج کی باکسنگ ٹیم میں ہونے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ اسی طرح میں کالج کی فٹ بال ٹیم میں کھیلتا تھا۔

کالج میں میرا نک نیم پٹھا تھا۔ چونکہ میں بدن کا مضبوط تھا۔ اور پٹھے سخت تھے اور جب باکسنگ کرتا تھا تو دھائیں دھائیں کی آوازیں آتی تھیں۔ شاید اسی لئے یاروں نے پٹھا کہنا شروع کر دیا تھا۔

چند اساتذہ

کیپٹن (بعد میں لیفٹیننٹ کرنل) عبدالحمید ابراہیم مسٹر (بعد کو میجر) سلطان حسین شمسی اور کمانڈانٹ کرنل اسٹیبنگ ان تینوں نے مجھے متاثر کیا۔ ابراہیم صاحب بہت اچھا پڑھاتے تھے اور چیف انسٹرکٹر کی حیثیت سے سختی بھی کرتے تھے، جس سے بہتوں کا بھلا ہوا۔ سلطان شمسی گو طبیعت کے تیز تھے لیکن بہت ہمدرد اُستاد تھے۔ کرنل اسٹیبنگ نظم و نسق میں ماہر تھے۔ کمال کا ڈسپلن رکھا ہوا تھا۔ بہت سخت تھے۔ لیکن اصول کے ساتھ، کالج کا سارا اسٹاف اپنی جگہ بہت اچھا تھا لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے ان تینوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ خاص طور سے شمسی صاحب نے۔ استاد کی شخصیت اسکے علم سے زیادہ اہم اور زیادہ موثر ہوتی ہے اور آئندہ زندگی میں ایک حوالہ

بن جاتی ہے۔

کمیشن سے جنگ ستمبر تک

کرنل زمان کا چھٹا پی ایم اے لانگ کورس تھا۔ آخری ٹرم میں زمان کو سی کیو ایم ایس کا عہدہ ملا۔ پی ایم اے سے اگست ۱۹۵۲ء میں پاس آؤٹ ہوئے اور پنجاب رجمنٹ سے وابستہ ہوئے۔ ۵۱ بریگیڈ میں اسٹاف کیپٹن رہے اور جی ایس او تھری کے طور پر خدمات انجام دیں۔ سی، اے، ایف میں ونگ کمانڈر بھی رہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں، میجر تھے اور فرسٹ پنجاب کی ایک کمپنی کمان کر رہے تھے۔ اسی جنگ کے دوران ایک اہم معرکے میں خصوصی جرأت اور جاں بازی کا مظاہرہ کرنے پر انہیں امتیازی سند کا اعزاز ملا۔ اس معرکے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کرنل زمان لکھتے ہیں۔

میرے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل نصراللہ خان نے میری کمپنی کو ایک اسپیشل ٹاسک فورس کے طور پر رکھا ہوا تھا۔

یہ ۱۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ سہ پہر کے وقت ۱۱۴ پیرا بریگیڈ کے کمانڈر بریگیڈیر امیر عبداللہ خاں نیازی فرسٹ پنجاب ہیڈ کوارٹر میں معائنے کے لئے آئے اور مذاق کے انداز میں مجھ سے پوچھا، زمان اگر تم سے کہا جائے کہ اپنی بدیانہ کی چوکی سے آگے بڑھ کر تیزی سے حملہ کرنا ہے تو تمہاری یہ کمپنی حملہ کرنے میں کتنا وقت لے گی۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ سیالکوٹ سے بدیانہ کا فاصلہ ۱۲ میل ہے اس کے باوجود میں نے کہا:

سر، یہ حملہ کرنے میں کوئی تیس منٹ درکار ہوں گے۔ میرے جواب سے بریگیڈیر نیازی کو خاصی حیرت ہوئی۔ انہوں نے کسی مصلحت سے مذاق مذاق میں پوچھا تھا شاید وہ مجھے تولنا چاہتے تھے۔ جب میں نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ سنجیدہ ہو گئے۔ کچھ دیر اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی۔ پھر میرے سی او سے کہا قصہ یہ ہے کہ ۲۰ بلوچ کو آج شام کو سدریکے، گاؤں

جو بدیانہ سے جنوب مشرق کی طرف دو میل کے فاصلے پر واقع ہے) پر حملہ کے لئے اے کے سے پہنچا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس کے بجائے میجر زمان کی کمپنی بدیانہ جا کے سدریکے پر حملہ کرے۔ بریگیڈ کمانڈر کا یہ جملہ میری کمپنی کے لئے ایک بڑا اعزاز اور اس سے بھی بڑا چیلنج تھا جو میں نے بخوشی قبول کیا۔ میں سیلوٹ کر کے پیچھے ہٹا اور آنِ واحد میں ضروری کارروائی شروع کی۔ سدریکے پر میری کمپنی نے ٹینکوں کے ایک اسکواڈرن کی مدد سے بجلی کی سی تیزی سے حملہ کیا۔ دشمن نے شدید مزاحمت کی۔ لیکن ہم بھی جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ دشمن نے سدریکے خالی کر دیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ سدریکے ایک طرح سے ان کا ایمونیشن سپلائی ڈپو تھا۔ اسلحہ کا وہ بھاری ذخیرہ ہمارے ہاتھ لگا۔ بچے کھچے، قیدی بھی بنائے۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے میں اس مہم میں سُرخ رُو ہوا۔ اور بریگیڈ کمانڈر نے جو اعتماد مجھ پر کیا تھا۔ میں اس پر پُورا اُتر سکا۔

اس کارروائی کے لئے مجھے امتیازی سند کا اعزاز عطا کیا گیا۔

امتیازی سند کا فرمان

۱۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بیدیاں سے ۱ پنجاب کے جوابی حملے کے ایک حصے کے طور پر ۱ پنجاب کی اے کمپنی کے کمانڈر میجر محمد زمان کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی تھی کہ وہ سدھریکے گاؤں پر جلد سے جلد قبضہ کر لیں۔ چونکہ پر دُشمن کا دباؤ جلد سے جلد کم کرنے کے لئے اور دُشمن کے دائیں بازو کی اضافی اور عارضی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے ۱۴ پیرا بریگیڈ کے کمانڈر نے حکم دیا تھا کہ سدھریکے پر فوراً قبضہ کر لیا جائے۔ چونکہ اس کارروائی میں وقت اور رفتار کی بہت اہمیت تھی۔ اس لئے میجر محمد زمان چند منٹوں میں اپنی کمپنی کو حرکت میں لے آئے۔ ۲۲ کیولری کے ایک اسکواڈرن اور محدُود قوت کے توپ خانے کی مدد سے وہ آگے بڑھے اور راستے میں دشمن کی غیر معمولی مزاحمت کو ٹھکراتے ہوئے انہوں نے آن کی آن میں دشمن کو

سدھریکے کے مضافات میں جالیا اور دیکھ بھال اور منصوبہ بندی میں کوئی وقت ضائع کئے بغیر
بریگیڈ کمانڈر کے اِس اندازے پر اعتماد کرتے ہوئے کہ وہاں دشمن کی کسی منظم مزاحمت کا سامنا نہیں
کرنا پڑے گا۔ انہوں نے سدھریکے گاؤں پر دھاوا بول دیا۔ اور دشمن کو سنبھلنے کا موقعہ نہیں دیا۔
دُشمن کو انہوں نے بے خبری میں جالیا تھا اس کو اپنے آپکو منظم کرنے کا کوئی موقعہ نہیں مل سکا تھا۔
اس حملہ کی قیادت انہوں نے خود کی اور وہاں پہنچنے کے تیس منٹ کے اندر اندر سدھریکے گاؤں پر
قبضہ کر لیا۔ دُشمن نے سخت افراتفری میں شمال مشرق کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔

میجر محمد زمان نے سدھریکے پر دوبارہ قبضے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس کامیابی سے
مزید فائدہ اُٹھانے کے لئے انہوں نے غیر معمولی جرأت اور پیش بینی سے کام لیتے ہوئے
سدھریکے کے شمال میں لالی والی کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی ریزرو پلاٹون کے کمانڈر حوالدار
محمد اکرم کو لالی والی تک دھاوا بولنے کا حکم دیا۔ اس پلاٹون نے دشمن سے ایک مختصر مگر شدید جھڑپ
کے بعد اور دشمن کے عقبی حصے کو چوٹ دینے کے بعد لالی والی پر قبضہ کر لیا۔

اس آپریشن میں جو امتیازی کامیابی ہوئی وہ براہِ راست میجر زمان کی تدبیرکاری
اور کمپنی کی جرأت مندانہ قیادت کا نتیجہ تھی۔ تنہا اس کارروائی میں ان کی کمپنی نے کئی مربع میل
کا علاقہ دشمن کے پنجے سے آزاد کرایا۔ دُشمن کو اس علاقے سے بھاگنا پڑا۔ اس معرکے میں
دُشمن کے آٹھ سپاہی کام آئے۔ سات قیدی بنے۔

اس معرکے میں غیر معمولی جرأت اور بہترین قائدانہ صلاحیت کا مظاہرہ کرنے پر میجر
زمان کے لئے ستارہ جرأت کی سفارش کی جاتی ہے جس کے وہ پوری طرح مستحق ہیں۔
۱۴ اگست ۱۹۶۶ء کو امتیازی سند عطا کی گئی۔

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد رفیق، ستارۂ جرأت

پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد رفیق ستارۂ جرأت پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمد رفیق کی تاریخ پیدائش ۱۵ ر اگست ۱۹۲۸ء ہے۔ اور جائے پیدائش پنڈدادنخان' اسی قصبے سے انہوں نے ۱۹۴۲ء میں میٹرک پاس کیا۔ اور آبائی پیشہ کی روایت کے مطابق سپاہ گری کو اختیار کرتے ہوئے جہلم میں پنجاب رجمنٹ کی بوائز کمپنی میں بھرتی ہوئے چونکہ میٹرک پاس تھے اور ذمہ دار تھے۔ بوائز کمپنی میں ہیڈ بوائے کے عہدے تک ترقی کی۔ ۱۹۴۴ء میں توسیعی منصوبے کے تحت ملٹری کالج جہلم میں داخل ہوئے۔ اور ۱۲۹۸ کالج نمبر پایا۔ پہلا ہاؤس رابرٹس ہاؤس تھا۔ داخلے کے دو ماہ بعد محمد رفیق کو کارپول بنا دیا گیا تھا۔ دو سال کے بعد انہوں نے ۱۹۴۶ء میں آرمی اسپیشل کا امتحان پاس کیا اور کمیشن کے لئے تیاری شروع کی۔ ملٹری کالج کے زمانۂ تعلیم کے بارے میں کرنل رفیق لکھتے ہیں۔

"جب ملٹری کالج کا ذکر آئے تو بید کی سزا کا ذکر ہونا لازمی سا ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی اس زمانے کے کالج کے کمانڈانٹ کرنل اسٹیبنگ سے کئی بار بید کھائے۔ کبھی کبھی سزا محض برائے سزا بھی ہوتی۔ کالج سے مشرق کی طرف جی ٹی روڈ پر ۹۶ اور ۹۸ سنگ میل ہوتے

دوڑ کر ان کو ہاتھ لگا کر واپس آنا آئے دن کی عام سزا تھی۔ جس سے عموماً سینئیر کیڈٹوں کی تواضع ہوتی تھی۔ جاڑوں میں بہت صبح سویرے تقریباً پانچ بجے سوئمنگ پول میں نہانا ایک مشغلہ بن گیا تھا جب کمانڈانٹ کرنل اسٹیبنگ نے تمام انڈر آفیسرز کو صبح سویرے تالاب میں نہانے کے احکام دیئے تو اکثر و بیشتر وہ خود بھی وہاں موجود ہوتے۔ اور ہم لوگوں کو ٹھنڈے یخ پانی میں تیرتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اس زمانے میں تو اس قسم کی حرکتوں کی معقولیت اور افادیت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اور ہم تو اس پریڈ کو سزا ہی سمجھتے تھے۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ وہ سخت اور جابر انسان ہمارا اور اپنی قوم کا محسن تھا۔ اور اس کا کوئی کام مصلحتوں سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ملٹری کالج میں اپنے دو ڈھائی سال قیام کے دور میں، مَیں نے باکسنگ میں کافی دلچسپی لی۔ چونکہ میرا وزن اپنے قد کی بلندی کی نسبت سے قدرے کم تھا۔ لہٰذا باکسنگ کے لئے میں نہایت موزوں ثابت ہوا۔ کالج کی باکسنگ ٹیم میں آنے کے بعد مجھے کالج ٹیم کے ساتھ دہلی جا کر آل انڈیا بوائز باکسنگ کے مقابلوں میں شرکت کا موقعہ بھی ملا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ جو کسی کیڈٹ کو مل سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں کالج کی تربیت کا سانچہ ایسا تھا۔ کہ اس نے مجھے مضبوط پُر اعتماد اور دُنیا کے طوفانوں کے تھپیڑے کھانے اور جمے رہنے کے قابل بنا دیا۔

کمیشن اور راجھستان کا معرکہ

۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء کو محمد رفیق انڈین ملٹری اکیڈمی دھرہ دون پہنچے۔ یہ کورس دو سال کا تھا۔ لیکن اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد پاکستانی کیڈٹوں کو پاکستان بھیجنے کے انتظامات کئے گئے۔ ستمبر ۴۷ء میں رفیق دوسرے کیڈٹوں کے ساتھ سہارنپور انڈیا سے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچے۔ چونکہ ابھی پی ایم اے نے کام شروع نہیں کیا تھا۔ اس لئے رفیق چند ماہ فسٹ پنجاب رجمنٹ سنٹر جہلم سے وابستہ رہے۔ جنوری ۴۸ء میں پی ایم اے کاکول پہنچے۔ اور باقی کورس مکمل کیا۔ اور نومبر ۴۸ء میں کاکول اکیڈمی سے کمیشن حاصل کیا۔

اور ۲۰ پنجاب رجمنٹ میں پوسٹ ہوئے۔ وہاں پانچ برس خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۵۲ء پنجاب رجمنٹ سنٹر پہنچے۔ وہاں سے چند ماہ بعد پی ایم اے کاکول میں پلاٹون کمانڈر کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ پی ایم اے میں دو سال گذارنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں رفیق ۱/۱۴ پنجاب سے وابستہ ہوئے پھر دو سال کے لئے مشرقی پاکستان گئے۔ وہاں سے ۱۹۶۰ء میں واپس آکر ۱۶ پنجاب سے منسلک ہوئے لیکن کچھ عرصے بعد ہی ۱۴ پنجاب کے ساتھ اقوام متحدہ کی طرف سے فرائض انجام دینے مغربی ایریان گئے وہاں سے آنے کے بعد ۱۸ پنجاب میں سیکنڈ ان کمانڈ کا منصب سنبھالا۔ اسی بٹالین کے ساتھ میجر محمد رفیق نے رن آف کچھ اور راجستھان میں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں حصہ لیا۔ اسی معرکے میں انہیں ستارۂ جرأت کا اعزاز دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۶۷ء میں میجر محمد رفیق نے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی کی اور ۳۲ پنجاب رجمنٹ کی کمان سنبھالی۔ اس کے بعد ۲۲ پنجاب کے کمانڈر بھی رہے۔ دو سال ویسٹ پاکستان رینجرز میں لگائے۔ اور ملازمت کے آخری دَور میں ۶۰ اور ۴۲ پنجاب سے بھی وابستہ رہے۔ اور جولائی ۱۹۷۷ء میں تیشہ و تلوار کے پیشے کو خیرباد کہا۔

ستارہ جرأت کا فرمان

۱۸ پنجاب کی بی کمپنی گرا ، ڈلی ، کھانیسر، بیچر و طور پر دفاعی مورچوں پر متعین تھی۔ دشمن نے اس پر   انفنٹری اور بکتر بند دستوں سے یکایک حملہ کیا۔ دشمن کی کوشش تھی کہ ہماری اس اگلی چوکی کو سب سے پہلے روند ڈالے۔ "بی" کمپنی نے دشمن کا مقابلہ کیا لیکن اس مزاحمت میں بی کمپنی کا کمانڈر شہید ہوگیا۔ کمپنی کمانڈر کی شہادت کی وجہ سے دشمن کو بی کمپنی کے زیر دفاع خاصے علاقے پر قبضہ کرنے کا موقعہ مل گیا۔ اس مرحلے پر ۱۸ پنجاب کے سیکنڈ ان کمانڈ میجر محمد رفیق کو بی کمپنی کی کمان سنبھالنے بھیجا گیا۔

کمپنی کی کمان پوسٹ پر پہنچتے ہی میجر رفیق نے نہ صرف دفاع کو منظم کیا بلکہ کھوئے ہوئے

علاقے کے خاصے حصے پر دوبارہ قبضہ کرلیا اور دشمن کی پیش قدمی کو روک دیا۔ دشمن نے دو بٹالینوں اور شرمن ٹینکوں کے ایک ٹروپ کی مدد سے بی کمپنی کے مورچوں پر بار بار حملے کئے لیکن میجر رفیق کی پُرعزم اور جرأت مندانہ اور ولولہ انگیز قیادت میں بی کمپنی نے دشمن کے ان حملوں کو کامیابی سے پسپا کر دیا۔

۱۸ ستمبر ۱۹۶۵ء سے لے کر ۲۲ ستمبر ۶۵ء تک دشمن نے متواتر پانچ دن تک سر توڑ کوشش کی کہ کسی طرح بی کمپنی کے دفاعی حصار کو توڑ کے کچھ آگے بڑھے لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ہر چند کہ بی کمپنی کو اسلحہ اور بارُود پہنچانے کے لئے سلسلہ نقل و حمل بہت پیچیدہ اور خطرناک تھا اس لئے کمک کا پہنچنا آسان نہ تھا۔ صرف ۳ انچ مارٹروں کی مدد سے اس کمپنی نے میجر رفیق کی مؤثر قیادت میں وہ کارنامہ کر دکھایا جو بظاہر ناممکن تھا۔

جب ۲۱ اور ۲۲ ستمبر ۶۵ء کی رات کو ۱۸ پنجاب کے باقی عناصر کو حکم دیا گیا کہ وہ ٹلی کے علاقے میں دُشمن کے عقب سے حملہ کریں تو منصوبہ کے مطابق میجر رفیق نے دُشمن کو بڑی کامیابی سے اس طرح الجھائے رکھا کہ ۱۸ پنجاب نے دُشمن کو بے خبری میں پیچھے سے جا لیا اور اسکی دو بٹالینوں ۱۷ مدراس اور ۵ مرہٹہ کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ میجر رفیق نے دشمن کی اس ایک کمپنی کو جو دُوسروں کے ہتھیار ڈالنے کے بعد برابر بے جگری سے مزاحمت کر رہی تھی۔ بڑی جرأت اور فراست سے گھیرے میں لے کر اسے بے بس کر دیا اور دُشمن کے کمانڈر سے ہتھیار رکھوا لئے۔ اور نتیجے میں دُشمن کے تین افسر، چار جے سی اوز، اور ۸۵ این سی اوز اور سپاہی جنگی قیدی بنا لئے۔ سخت دُشوار حالات میں اس مثالی کارگذاری، غیر معمولی جرأت اور عزم اور ولولہ انگیز قیادت کے اعتراف کے طور پر میجر محمد رفیق کے لئے فوری طور پر ستارۂ جرأت کی سفارش کی جاتی ہے

۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو ستارہ جرأت کا اعزاز عطا کیا گیا۔

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد یونس ستارۂ جرأت

پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمد یونس ستارۂ جرأت پنجاب رجمنٹ

بہادر باپ اور عبادت گذار ماں

ہمارا آبائی گاؤں کھیتل ضلع راولپنڈی کی تحصیل کہوٹہ میں واقع ہے۔ یہ زمانۂ قدیم سے فوجی خدمت کے لئے مشہور ہے۔ میرے والدگرامی اور چچاؤں نے بھی خاندانی روایت کے مطابق فوجی ملازمت اختیار کی۔ میرے والد مرحوم پہلی جنگِ عظیم میں توپ خانے میں تھے۔ اور وہیں سے ریٹائر ہوئے تھے۔ میں پانچ برس کا تھا جب میری والدہ کا انتقال ہوا۔ ان کے بعد ہماری پھوپھی نے ہماری پرورش کی۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ عاطفت ہم پر قائم رکھے۔ اب بھی ان کی دعائیں ہمارے شاملِ حال ہیں۔ میں نے بچپن میں اپنی والدہ کو جو ہر روز سالہا سال تک قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتے سُنا ہے۔ اس آواز کا نقش آج بھی میرے دل میں اور دماغ پر باقی ہے بلکہ قائم ہے۔ ان کی تلاوت کی آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ میری بدقسمتی کہ میں صرف پانچ یا چھ سال کا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ لیکن یہ پانچ چھ سال میں نے ان کی آغوشِ شفقت میں

گذارے۔ اس تجربے نے میری زندگی کی راہوں کو ایمان کی روشنی سے پُرنور کردیا ہے۔

سُورۂ رحمان سے تعارف

والدہ بہت سویرے اُٹھتی تھیں۔ اور فجر کی نماز پڑھ کر پہلے تلاوت کلام پاک کرتی تھیں پھر گھر کے دوسرے کام کاج پر ہاتھ ڈالتی تھیں۔ ان کی تصویر اب بھی میری آنکھوں میں پھرتی ہے۔ گھر میں بھی دوپٹہ اس طرح اوڑھتی تھیں کہ پیشانی تک نظر نہیں آتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد مَیں نے دُوسرے بزرگوں سے سُنا کہ وہ ہمیشہ باوضو رہتی تھیں۔ اَب دین سے جو لگاؤ مجھے ہے۔ ان ہی کا فیض ہے۔ یہ فیض صرف مجھ تک محدود نہیں میرے بڑے بھائی لیفٹیننٹ کرنل محمد یوسف جو اسی کالج کے پڑھے ہوئے ہیں۔ (کالج نمبر ۹۴) وُہ مجھ سے زیادہ دین سے قریب ہیں۔ جب وہ کالج میں تھے تو والدہ کے فیض تربیت سے نماز کے بڑے پابند تھے۔ ان کا نام ہی مُلاں پڑ گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے جو کچھ مَیں نے ۱۹۶۵ء میں روہی وال کے معرکہ میں کیا۔ اس کی بنیاد اس وقت پڑ گئی تھی۔ جب میں ۲۵-۱۹۲۴ء کی سردیوں میں رضائی میں لپٹا اپنی ماں کو سورہ رحمان تلاوت کرتے سُنا کرتا تھا۔

زندگی کا پہلا دن

۳۰ دسمبر ۱۹۲۰ء کو مَیں اپنے آبائی گاؤں کھتیل (کھوٹہ) میں پیدا ہوا۔ غالباً چونکہ میری والدہ قرآن بہت پڑھتی تھیں۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کے نام نبیوں کے ناموں پر رکھے تھے۔ بڑے بھائی کا نام محمد یوسف تھا۔ مجھے حضرت یونس کا ہم نام ہونے کا شرف ملا:

تعلیم کی ابتدائی منزلیں

ہمارے گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر دوسرے گاؤں میں

ایک مڈل اسکول تھا۔ اس میں پرائمری یعنی چوتھی جماعت تک پڑھا۔ ان دنوں کی کوئی بات کچھ یاد نہیں سوائے اس کے کہ پیدل آتے جاتے بچوں کی عام شرارتیں کرتے جاتے تھے۔ چوتھی کے بعد ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول پشاور میں گذارا جہاں والد بسلسلہ سول ملازمت مقیم تھے۔ اس دور کی کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ وہاں سے والد کے تبادلے کے بعد کوہاٹ گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ یہ ۱۹۴۶ء کے شروع کی بات ہے۔ یہاں زیادہ عرصہ نہیں لگا اور اگست ۱۹۴۶ء میں کے۔جی۔آر۔آئی۔ایم کالج اجمیر میں داخل ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد میں دوسرے مُسلم طلبہ کے ساتھ اجمیر سے ملٹری کالج جہلم منتقل ہو گیا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا تو اجمیر سے ہمارا قافلہ ۲۶ دسمبر ۱۹۴۷ء کو جہلم پہنچا تھا۔

ملٹری کالج اجمیر کی یادیں

اجمیر کے سینئر مسلم طلبہ میں ممتاز حیثیت عابد حسین کو حاصل تھی وہ بھی ہمارے ساتھ ہی پاکستان آئے تھے۔ ان کا کالج نمبر ۱۶۶۰ تھا۔ ۱۹۶۵ء میں میجر تھے کہ کیم کرن کے محاذ پر شہید ہوئے۔ اجمیر میں میری کلاس میں دو مسلمان لڑکے اور بھی تھے۔ ایک عبدالمجید اور دوسرے محمد لیسین۔ ہم تینوں کا اسلام کے رشتے سے ایک گروپ تھا اور ہندو، سکھوں سے کھیلوں اور پڑھائی میں خوب ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے۔

عابد بہت اچھے باکسر تھے۔ لیسین عموماً کلاس میں اول رہتے تھے۔ دوسرا نمبر میرا ہوتا تھا گو ذرا لاپرواہ تھا۔ یہ دونوں پُرانے ساتھی اکثر یاد آتے ہیں۔ اجمیر کے دوسرے لڑکوں میں، لیفٹیننٹ کرنل ۱۹۲۳ اختر حسین اور ۱۶۶۸ میجر گل بادشاہ سے مُلاقات ہوتی رہتی ہے۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ اجمیر میں مُسلم طلبہ میں اپنی علیحدہ قومیت کا شدید احساس تھا۔

ملٹری کالج میں میرے شب و روز

میں بتا چکا ہوں دسمبر ۱۹۴۷ء میں کے جی آر اجمیر سے کے جی آر جہلم آیا تھا۔ اور

نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ یہاں آکر نویں کا امتحان پاس کیا۔ اور اکتوبر ۱۹۴۸ء میں آرمی اسپیشل کے مرحلہ سے کامیابی سے گذرا۔ اس کے بعد کاغذوں میں ایف ایس سی فرسٹ ائیر میں آگیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں ایف ایس سی کی باقاعدہ کلاسیں نہیں ہوتی تھیں ہوتیں کیسے؟ کوئی پڑھانے والا ہی نہیں تھا۔ اور چونکہ کمیشن کے لئے آرمی اسپیشل کافی تھا اس لئے اسپیشل کا امتحان پاس کرنے کے بعد لڑکے عموماً کمیشن کی تیاری میں لگ جاتے تھے۔ یہ خاص کلاس آرمی کلاس کہلاتی تھی۔ اقبال صاحب یہ آرمی کلاس لیتے تھے۔ ویسے کاغذوں میں ہم ایف ایس سی میں تھے۔ مجھے یاد ہے اس کاغذی ایف ایس سی کلاس میں میرے ساتھ میرے دوست ۱۰۵۸ عبدالعزیز بھی تھے۔ سائنس لیبارٹری میں اپنے طور پر کچھ پڑھنے کی کوشش کی لیکن بات بنی نہیں۔ غیر نصابی سرگرمیاں یہ تھیں کہ میں کالج کی فٹ بال ٹیم میں کھیلتا تھا۔ ان دنوں کالج کے ہیڈ بوائے ۱۱۰۱ عبدالجبار تھے۔ میں ان کا سیکنڈ اِن کمانڈ تھا اور کیڈٹ آفیسرز میس میں رہتا تھا کالج میں اکثر و بیشتر لڑکوں کا کوئی نہ کوئی نِک نیم ہوتا ہے۔ میرے بھائی محمد یوسف ۷۹۷ مُلّاں کے نام سے مشہور تھے۔ مجھ میں چونکہ کوئی نمایاں خصوصیت نہیں تھی۔ غالباً اس لئے نک نیم کی عزت افزائی سے محروم رہا۔ ۱۹۵۰ء کے اواخر میں میں کمیشن کے لئے منتخب ہوا۔ اس طرح کالج میں کم و بیش تین سال گذار کر میں کالج سے رخصت ہوا۔

ملٹری کالج کا مجموعی تاثر

دسمبر ۱۹۴۷ء میں ملٹری کالج جہلم میں آنے سے پہلے ایک سال میں نے ملٹری کالج اجمیر میں بھی گذارا تھا۔ لیکن وہ غیروں میں تھا۔ اس کالج کی فضا پر غیر مسلم اثرات غالب تھے وہاں بھی ہم مسلم طلبہ ایک گروپ بنا کر رہتے تھے۔ لیکن یہاں آکر ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے گھر میں آگیا ہوں۔ اس کالج کی تعریف لوگ مختلف زاویوں سے کرتے ہیں لیکن مجھے ملٹری کالج کی جو چیز سب سے زیادہ اچھی لگی یہ ہے کہ عالمگیریز میں بھائی چارہ بہت ہے میں نے

اپنی زندگی کے بہترین دوست یہیں بنائے۔ اگر مَیں یہ کہوں کہ عالمگیرین ہونا بھی اب ایک ذات ہے ایک پہچان ہے ایک سماجی حوالہ ہے۔ایک کردار ہے۔ تو غلط نہ ہوگا۔ ملٹری کالج کا لڑکا الگ پہچانا جاتا ہے۔ اس کی اپنی خصوصیات ہیں۔ مثلاً وُہ محنتی ہوگا ، جفاکش ہوگا۔ پُر اعتماد ہوگا۔ وہ اپنی جگہ بنانا اور اپنی جگہ نکالنا جانتا ہوگا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وُہ ذمہ دار ہوگا۔ قابلِ اعتماد ہوگا۔ اور پھر یاروں کا یار بھی۔ جہاں ملٹری کالج کا نام آیا دو اجنبی گلے مل جائیں گے۔ بعض لوگ اس اولڈ اسکول ٹائی پر اعتراض کرتے ہیں لیکن مَیں اِس افراتفری خود غرضی کے زمانے میں یہ عالمگیری رشتہ پسند کرتا ہوں۔

پی۔ ایم۔ اے سے جنگ ستمبر تک

مَیں ساتویں پی ایم اے لانگ کورس میں تھا جو مارچ ۱۹۵۱ء میں شروع ہوا اور ۱۴ فروری ۱۹۵۳ء کو اختتام کو پہنچا۔ پی ایم اے میں کالج کی طرح فٹ بال الیون کا رکن تھا اور آخری ٹرم میں آر کیو ایم ایس بنا دیا گیا تھا۔ فروری ۱۹۵۲ء میں مجھے کمیشن ملا۔ اور ۷ پنجاب رجمنٹ سے وابستہ کیا گیا۔ مختلف پیشہ ورانہ کورسز کرتے اور دوسری فرائض بجا لاتے ہوئے وقت گذرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۵ء میں ۷ پنجاب کی ایک کمپنی کمان کرتے روہی وال کے معرکہ میں مجھے ستارۂ جرأت کے اعزاز سے نوازا گیا۔

روہی وال کے معرکے کی روئداد

قصور سیکٹر کے دفاع کے لئے روہی وال کی جو روہی نالہ کے کنارے واقع ہے۔ کلیدی اہمیت تھی۔ بات کو واضح کرنے کے لئے میں پہلے روہی نالہ اور روہی وال گاؤں کا محلِ وقوع بتاتا ہوں۔ بی آر بی نہر کے آگے تقریباً ہزار گز کے فاصلے پر روہی نالہ ہے۔ اس کے آگے بین الاقوامی سرحد ہے اور اس سے پانچ چھ سو گز پیچھے روہی وال گاؤں ہے۔

دفاع اور حملہ آوری کے نقطہ نظر سے اس نالے اور اس سے پیچھے کی جگہ کی بڑی اہمیت تھی۔ اس جگہ کے لیے جو لڑائی لڑی گئی وہ اس گاؤں کی نسبت سے روہی وال کی لڑائی کہلاتی ہے ۶ ستمبر ۶۵ء کو جب لڑائی چھڑی تو دشمن نے عملاً روہی نالہ اور روہی وال گاؤں کے درمیان ڈھال پر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ اس طرح روہی وال عملی طور پر دشمن کا مقبوضہ علاقہ ہو گیا تھا۔

میری پلٹن ۷ پنجاب کی اے کمپنی کا جو میرے زیر کمان تھی کام یہ تھا کہ میں جوابی حملہ کر کے روہی وال پر دوبارہ قبضہ کروں تاکہ قصور سیکٹر کا دفاع کیا جا سکے۔ میری اے کمپنی روہی نالہ سے کوئی چار ہزار گز پیچھے بی آر بی نہر پر پھیلی ہوئی تھی۔ ۶ ستمبر کی صبح کوئی ساڑھے نو بجے کا وقت تھا کہ میرے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو بریگیڈیر) سید شیرازی نے مجھے حکم دیا کہ روہی وال پر جوابی حملہ کیا جائے۔ اور اسے دشمن کے قبضے سے نکالا جائے روہی وال کے اس معرکہ پر بریگیڈیر شیرازی نے رسالہ "ہلال" میں تفصیل سے لکھا ہے نامناسب نہ ہو گا اگر میں ان کے مضمون سے ایک اقتباس نقل کروں۔

بریگیڈیر شیرازی لکھتے ہیں۔

میجر یونس کی عمدہ قیادت اور ان کی کمپنی کی اعلیٰ تربیت کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ چمکتی دھوپ میں دو میل بڑھتے چلے گئے مگر کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ یہاں تک کہ وہ دشمن کے سر پر پہنچ گئے۔ بھارتی ائیر فورس اس پہلے روز بہت ہی سرگرم عمل تھی مگر اس کے باوجود میجر یونس کی کمپنی کی یلغار دشمن کو نظر نہ آسکی۔ آخر فوجی سپاہیوں کی ایک کمپنی کوئی ایسی چھوٹی چیز نہیں ہوتی جو نظر نہ آسکے۔ اپنی چند گاڑیوں کے ساتھ غبار آلود کھیتوں سے ان کا گذرنا ان کی نقل و حرکت کا پتہ دینے کے لئے کافی تھا۔ یہ بات معمہ سے کم نہیں کہ دشمن کو ان کا سراغ کیوں نہ مل سکا۔ یہ سارا فاصلہ کمپنی نے تیس چالیس منٹ میں طے کیا۔ میجر یونس اور ان کے نوجوان جاں باز آرٹلری او بزرور آفیسر لیفٹیننٹ (اب لیفٹیننٹ کرنل) امتیاز نے گاؤں

کے بائیں ایک مقام سے ڈھال پر چڑھ کر دیکھا کہ بھارتی فوجی ڈھال پر بکھرے ہوئے ہیں۔ آرام آرام سے مورچے کھود رہے ہیں۔ اور اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ بھارتی بالکل کھلے میں بکھر رہے تھے اور توپچی کا بڑا عمدہ نشانہ تھے۔ میجر محمد یونس کی طرف سے ہدایت ملنے پر لیفٹیننٹ امتیاز نے پیچھے توپچیوں کو اشارہ کیا کہ توپوں کا مُنہ کھول دو اور غافل دُشمن پر نارِ جہنم برسا دو۔ ہم نے اپنے وائرلیس سیٹوں پر نوجوان افسر کو اپنے احکام توپچیوں تک پہنچاتے ہوئے سُنا تو ہم بڑی دہشت سے اس تباہی کا انتظار کرنے لگے۔ جو اگلے ہی لمحے دشمن پر برسنے والی تھی۔ گولوں کی پہلی بوچھاڑ ہمارے سروں سے گذرتی ہوئی دشمن کی طرف گئی۔ اَب ہم گولوں کے پھٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ دفعتاً ہم نے دُور گرج سُنی اور قیامت خیز دھماکے سے زمین کانپنے لگی۔ لیفٹیننٹ امتیاز نے اپنی توپوں کی ایسی ٹھیک ٹھیک رہنمائی کی تھی کہ گولے عین بھارتیوں کے سروں پر گرے۔ کچھ بھارتی واصلِ جہنم ہو گئے۔ کچھ ہاتھ ٹانگیں وغیرہ کھو بیٹھے اور باقی ڈر سے افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے

توپوں نے ایک بار پھر گولے اگلے اور دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے سپاہیوں نے جان بچانے کے لئے پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر اس علاقے میں ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ اسی مرحلے پر میجر یونس نے دھاوا بول دیا۔ "اللہ اکبر اور یا علیؑ" کے باطل شکن نعرے لگاتے ہوئے اے کمپنی کے جان بازوں نے سنگین لگا کر بھاگتے ہوئے دشمن پر یلغار کر دی۔ دشمن کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ وہ سخت ہراس اور سراسیمگی کے عالم میں بھاگ نکلا۔ اس میں لڑنے یا جم کر کھڑے ہو جانے کی کوئی سکت باقی نہ رہ گئی تھی۔ جوابی حملہ ایسی برق رفتاری سے اور اچانک ہوا کہ بھارتی حواس باختہ ہو گئے۔ انہیں عافیت اسی میں نظر آئی تھی کہ جس قدر تیزی سے ممکن ہو سکے وہ پیچھے ہٹ کر روہی نالہ سے پیچھے اپنے علاقے میں چلے جائیں۔

میجر یونس نے وائرلیس پر مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ اس طرح بیان کیا جس طرح کسی میچ

پر رواں تبصرہ کرنے والا آنکھوں دیکھا حال سُنا کر میچ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے انہوں نے بتایا کہ دشمن کا تعاقب ابھی جاری ہے۔ گو اَب توپوں کو گولے ذرا زیادہ فاصلے پر پھینکنے پڑ رہے ہیں۔ بعد کو مَیں نے خود دیکھا کہ سارا علاقہ بھارتی سورماؤں کی کٹی ہوئی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ اے کمپنی نے اپنے جوہر خُوب خُوب دکھائے تھے۔ روہی نالہ کی جنگ لڑی گئی اور جیتی گئی بھارتیوں کو قدم جمانے کے لئے بڑا موزوں علاقہ ہاتھ لگا تھا مگر وہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک بار پھر روہی نالہ ہمارے قبضے میں آ گیا۔

بات تو ناقابلِ یقین نظر آتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس معرکے میں ہمارا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ دوسری طرف ہم نے اس صبح دشمن کے بہت سے ہتھیاروں گولہ بارود اور متفرق سامان پر قبضہ کرنے کے علاوہ ایک بھارتی میجر اور سات دوسرے قیدی بنائے۔ مَیں نے اس بھارتی میجر سے دریافت کیا کہ تم نے جو اس قدر اہم کامیابیاں حاصل کر لی تھیں انہیں مستحکم کرنے کے لئے تم نے زیادہ محکم ارادے سے کوئی کوشش کیوں نہ کی؟ اس نے جواب دیا درحقیقت بات یہ ہوئی کہ سب کچھ ایسا غیر متوقع طور پر ہوا کہ ہم بالکل بھونچکا رہ گئے۔ جوابی حملہ اس قدر اچانک اور برق رفتاری سے ہوا کہ ہم بے خبری میں مارے گئے۔ ہمیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ ہو کیا رہا ہے۔ آپ کے توپ خانے نے ہمارا جو حال کیا وہ میری زندگی کا بدترین تجربہ ہے۔ آپ نے جوابی حملہ اِتنی زیادہ نفری کے ساتھ کیا تھا کہ اس کے سامنے ٹھہرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ مَیں نے اس پر اس کی غلط فہمی دُور کرتے ہوئے کہا کہ توت وغیرہ کوئی نہیں جوابی حملہ کرنیوالی فوج صرف ایک رائفل کمپنی پر مشتمل تھی مگر بھارتی میجر میری بات پر یقین نہ کر سکا۔

مجھے پُختہ یقین ہے کہ جس سطح پر یہ جوابی حملہ کیا گیا اس کے پیشِ نظر اسے غیر اہم سمجھتے ہوئے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد اس محاذ پر جو کچھ ہوا اس پر اس معرکہ کی کامیابی کا فیصلہ کن اثر پڑا۔ اگلے منصوبے اس کے نتائج کی روشنی میں مرتب کئے گئے۔ یہ جوابی حملہ کرنے میں دیر کر دی جاتی یا تذبذب سے کام لیا جاتا تو بھارتیوں نے جس علاقے پر قبضہ کر لیا تھا،

کے اندر اپنی فوج کو کسی دشواری کے بغیر کمک پہنچا دیتے اور سارے روہی نالہ پر ان کا
ہو جاتا جس کے بعد وہ اس علاقہ میں قدم گاڑ کر لڑ سکتے۔ بی آر بی نہر کے ساتھ بڑے
مورچوں پر بڑا حملہ کرنے کے لئے روہی وال کے علاقہ میں ڈھال ایک مضبوط مورچے
کا کام دے سکتی تھی اس کے بعد دشمن کے سامنے کئی راہیں کھل جاتیں جن کے نتائج ہمارے
میں بڑے بھیانک ہوتے۔ مگر اس کے بجائے ہوا یہ کہ ہمارے شیر بچوں نے جب یہ شل
کامیابی حاصل کی۔ اس نے حملے میں پہل کرنے کی راہ کھول دی جس سے جنگ دشمن کے
اپنے علاقے میں پہنچ گئی۔ ہم خدائے رحیم و کریم کے حضور سجدہ ریز ہیں کہ اس نے ہمیں صحیح راہ
دکھائی اور ہماری کوششوں کو کامیاب کیا۔

میدانِ جنگ میں فتح و کامرانی نے ہمارے قدم چومے تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ
ایک ایک فرد اس بات پر تلا ہوا تھا کہ وہ خاکِ پاک کے لئے اپنی جان تک وار دے گا۔
جس سپاہ میں اس طرح کے افسر اور جوان ہوں۔ ان کی موجودگی میں کس کی مجال ہے کہ وہ
پاکستان کی طرف میلی آنکھ بھی اُٹھا کر دیکھ سکے۔

مصنف کا تبصرہ

بریگیڈیئر شیرازی کے بیان کی تائید ستارۂ جرأت کے سرکاری فرمان سے بھی
ہوتی ہے۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

جب ۱۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ہندوستانیوں نے بین الاقوامی سرحد سے تقریباً ۔۔ گز
اندر واقع ، پنجاب کی بی کمپنی کی روہی نالہ پوزیشن پر صبح پونے ۵ بجے یکایک حملہ کیا تو
اسے کمپنی بی آر بی ایل پر ۳ سو گز پیچھے متعین تھی۔

تقریباً ساڑھے نو بجے ہندوستانیوں نے بی کمپنی کے بائیں بازو پر حملہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن نے بین الاقوامی سرحد کو دو مقامات پر عبور کیا۔ تقریباً ۹ سو گز دائیں طرف دو کمپنیوں سے۔ اور اس سے آگے ... ... دائیں رُخ پر ۱۱ ایف ایف کی سی کمپنی کی ایک پلاٹون کے ٹھیک سامنے مزید دو کمپنیوں سے دُشمن نے پیش قدمی کی۔

۱۳ ڈوگراز کی دو کمپنیوں کو جنھوں نے سرحد کو ۹ بجے بی کمپنی کے دائیں بازو کے دائیں طرف عبور کیا تھا کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ جب وہ ۱۱ ایف ایف کی سی کمپنی پلاٹون سے تین سو گز کے فاصلے پر اس کے پیچھے سے اور ایک بازو سے یکایک نمودار ہوئیں اور سی کمپنی پلاٹون اس اچانک حملہ کے لئے تیار نہیں تھی۔ اور ایس کمپنی پلاٹون کو مجبوراً دشمن پر سامنے کی طرف دائیں طرف اور پیچھے فائر کھولنا پڑا۔ اس پلاٹون نے مقابلہ تو بے جگری سے کیا لیکن زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا اور اس کو دو شہیدوں کو پیچھے چھوڑ کر پیچھے ہٹنا پڑا

روہی نالے کے انتہائی دائیں طرف کی دفاعی پوزیشن پر دشمن کا قبضہ ہو جانے پر دشمن اس کے پیچھے ۳ سو گز تک بڑھ آیا۔ گویا بین الاقوامی سرحد سے تقریباً ایک ہزار گز اندر دُشمن کی اس پیش رفت کی وجہ سے بی کمپنی کی نمبر ۶ پلاٹون کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس طرح روہی نالہ کی تمام ڈیفنس لائن کو جو بی کمپنی کے باقی اجزا کے زیر دفاع تھی۔ سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ نمبر ۶ پلاٹون کے پیچھے ہٹنے کے بعد دشمن نے بی کمپنی کی نمبر ۲ پلاٹون سے ۱۵۰۰ سے ۲۰۰۰ گز کے فاصلے پر اپنے آپ کو دوبارہ منظم کرنا شروع کر دیا۔ ۶ پلاٹون کے بعد دائیں طرف دوسرا دستہ بھی تھا۔ اس نازک موقعہ پر میجر محمد یونس کی اے کمپنی کو فوراً جوابی حملہ کرنے کا حکم دیا گیا یہ حکم ۱۱ ایف ایف کی سی کمپنی پلاٹون کے پسپا ہونے کی خبر ملنے کے فوراً بعد دیا گیا تھا۔

ایس۔ بی آر بی ایل پوزیشنوں سے جس تیزی سے میجر محمد یونس کی اے کمپنی نے حرکت کی اور دشمن پر جوابی حملہ کرنے کا حکم ملنے کے فوراً بعد سے جس تیزی سے انھوں نے پیش قدمی کے لئے فیصلے کئے اس سے اس افسر کے عزم، قوتِ فیصلہ اور قائدانہ صلاحیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے

دُشمن اس وقت تک سرحد سے دو ہزار گز اندر آکے اپنے نشانہ پر حملہ کرنے کے لئے
آپ کو دوبارہ منظم کر رہا تھا۔ دُشمن کے بازو پر بہت تیزی سے پہنچ کر میجر محمد یونس نے
بت حال کا جائزہ لیا اور فوراً حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انفنٹری کے پُرجوش حملہ سے اور
۔خانے کے صحیح فائر سے دُشمن بوکھلا اُٹھا۔ وہ حیران تھا کہ اس کے حملے کے بعد اتنی جلدی
ستہ کہاں سے نازل ہو گیا۔ اس جوابی حملے کی تاب نہ لا کر دُشمن پیچھے ہٹنے لگا۔ اپنی قبضہ
ہوئی چوکیوں کو چھوڑ کر دُشمن بھاگا۔ اور ۷ پنجاب کی اے کمپنی کے مجاہدوں نے اس کا
اکرتے ہوئے اسے سرحد کے پار کر کے ہی دَم لیا۔ اس کے بعد میجر محمد یونس کی اے
پنی نے روہی نالے کی دفاعی پوزیشنوں کو دوبارہ مستحکم کیا۔

اس طرح وہ صُورت حال جو اگر بر وقت کارروائی نہ کی جاتی تو ہمارے لئے انتہائی
ناک صُورت اختیار کر لیتی۔ آخر دشمن کی مکمل تباہی پر ختم ہوئی۔ ۱۲ ڈوگرہ رجمنٹ کا ایک
پنی کمانڈر میجر ملکیت سنگھ پوار اور پانچ اور قیدی بنے۔ اور دُشمن کے تقریباً ۸۰ آدمی کام
ئے۔ جن میں دو افسر سکینڈ لیفٹیننٹ شرما، پدم ناتھ بھی شامل تھے۔ یہ دونوں ۱۲ ڈوگرہ
۔ ایف او، او تھے۔

"یہ سب کچھ میجر محمد یونس کے بروقت، تیزی سے کئے گئے جرأت مندانہ اقدامات کی
بہ سے ممکن ہو سکا۔ میجر محمد یونس کے لئے ستارۂ جرأت کی پُرزور سفارش کی جاتی ہے۔
ا جنوری ۱۹۶۶ء کو ستارۂ جرأت عطا کیا گیا۔"

ستارۂ جرأت کا یہ فرمان پڑھ کر جب ہم نے کرنل یونس سے کہا، مُبارک ہو یہ بڑا
مرکہ تھا۔ جو آپ کے ہاتھوں سر ہوا۔ تو ان کا جواب یہ تھا۔

سر، میرے ہاتھوں کیا سر ہونا تھا یہ تو اللہ کا کرم تھا۔ اس کی نصرت تھی کہ اس نے
ہیں دن کے وقت اپنے سے چار گنا دُشمن پر حملہ کرنے کا حوصلہ دیا اور پھر اس میں کامیابی عطا کی
ذکچھ کرنل شیرازی نے لکھا ہے اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں۔ ۱۲ ڈوگرہ رجمنٹ کے میجر ملکیت سنگھ نے

جس کو ہم نے قیدی بنایا تھا۔ بعد میں مجھ سے پوچھا تھا۔ اِس حملہ میں آپ کی نفری کتنی تھی تو میں نے جواب دیا کہ یہاں پر افسر صرف میں ہوں اور میرے ساتھ توپ خانے کا آبزرور ہے۔ اب آپ خود اندازہ کرلیں کہ نفری کتنی ہے۔ (یعنی ایک کمپنی) یہ سُن کر میجر ملکیت سنگھ نے کہا میں یہ کبھی نہیں مان سکتا۔ مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ ایک بریگیڈ کا اٹیک ہے۔ لیکن خود میرا اندازہ تھا کہ ایک بریگیڈ تو نہیں البتہ ایک بٹالین ضرور ہے۔

کرنل یونس سے ہمارا دوسرا سوال یہ تھا۔

کہ آپ کے ہیروز کون ہیں ؟ کن شخصیتوں اور تصورات نے آپکے طرزِ احساس کو متاثر کیا ہے ؟

اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا :

مَیں علامہ اقبال سے بہت متاثر ہوں۔ ان کے اُردو اور فارسی کلام کو میں نے اِتنی بار اور اتنے شوق سے پڑھا ہے کہ اگر یادداشت اچھی ہوتی تو ان کا کلام حفظ ہوگیا ہوتا۔ جب مجھے ۳۸ پنجاب کو کمان کرنے کا موقع ملا تو مَیں نے بٹالین کا ماٹو رکھا تھا " مُومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی "

پھر ہم نے پوچھا " اس معرکہ میں کامیابی کا راز کیا تھا ؟ " اس راز سے کرنل یونس نے یوں پردہ اُٹھایا :

یہ ایمان کا کرشمہ تھا۔ گو ستارہ جرأت مجھے ہی ملا لیکن واقعتاً میری کمپنی کے سارے جوان جذبۂ جہاد سے سرشار تھے۔ حملہ کے وقت جتنے وہ خوش تھے اور جس طرح ان کے چہرے دمک رہے تھے۔ اس منظر کو مَیں کبھی نہیں بھُول سکتا۔ خوف اور بے چینی نام کی کوئی چیز ہمارے آس پاس نہیں تھی۔

اس حملہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ انتہائی تیزی سے کیا گیا۔ ساڑھے تین میل کا فاصلہ ہم نے اس تیزی سے طے کیا کہ دشمن جس جگہ پر توپوں کا فائر کرتا ہم اس پوائنٹ

سے بہت آگے نکل چکے ہوتے۔ اسی تیزی سے ہم دشمن پر جا پڑے کہ وہ بوکھلا گیا۔
اس ذکر کو ختم کرنے سے پہلے میں اپنے ساتھی لیفٹیننٹ امتیاز احمد (اب لیفٹیننٹ کرنل)
کی کارکردگی کا تذکرہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ میرے آبزرور تھے۔ اور انہوں
نے اپنا کام انتہائی ذمہ داری اور دلیری سے سرانجام دیا۔ ان کے لیے ستارہ جرأت
کی سفارش کی گئی تھی گو امتیازی سند کا اعزاز منظور ہوا۔

آخر میں یہ کہ آپ میرا پیغام نئی نسل کو پہنچا دیں کہ ہماری نجات ایمان، تقویٰ،
جہاد فی سبیل اللہ میں ہے لیکن خدا کے لیے اس کو دل میں جگہ دیں، دیواروں پر نہ لکھیں

لیفٹیننٹ کرنل محمد خان، امتیازی سند

بلوچ رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمّد خان امتیازی سند بلوچ رجمنٹ

نسلی پس منظر

ضلع جہلم میں پنڈ دادنخان چکوال کے علاقے میں اعوان قبیلے کے لوگ عرصہ دراز سے آباد ہیں۔ کرنل محمد خان کا نسلی تعلق اسی قبیلے سے ہے اور اس قبیلے سے وابستہ سپہ گری اور دینداری کی روایات کے امین محمّد خان کے آباؤ اجداد بھی رہے ہیں۔ یہی رویے اور روایات ان کو بھی ورثے میں ملی ہیں۔ ان کا آبائی گاؤں وسنال ہے جو تحصیل پنڈ دادنخان کے علاقے میں واقع ہے۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

محمد خان اپریل ۱۹۳۵ء کی ۱۶ تاریخ کو اپنے آبائی گاؤں وسنال میں پیدا ہوئے پرائمری کی چار جماعتیں اپنے گاؤں کے اسکول میں پڑھیں۔ پانچویں جماعت سے ساتویں

تک گورنمنٹ ہائی اسکول بوچھال کلاں میں تعلیم پائی - یہ سکول وسنال سے تقریباً ۶ میل کے فاصلہ پر ہے ۔ محمد خان کو یہ فاصلہ روزانہ بپیدل طے کرنا پڑتا تھا - آندھی جائے مینہ جائے سخت سردی ہو یا گرمی اسکول سے کبھی غیر حاضر نہیں ہوئے - پڑھنے لکھنے کے اسی شوق کی وجہ سے اسکول میں ان کی پوزیشن ہمیشہ اچھی رہی - لیکن بچے آخر بچے ہوتے ہیں - پرائمری اسکول کے زمانے میں ایک بار یہ اسکول گول کر گئے - باقی قصہ خود کرنل محمد خان کے الفاظ میں سُنیئے -

ہم دونوں بھائی ایک ساتھ اسکول جایا کرتے تھے - اسکول ایک آدھ میل کے فاصلہ پر تھا - اس لئے مزے مزے سے باتیں کرتے - آس پاس کا تماشا دیکھتے اسکول جاتے یہی ہماری عیاشی تھی - ہمارا ایک چچازاد بھائی اسی اسکول میں پڑھتا تھا - ہم سے ایک کلاس آگے تھا - اور بڑا ہوشیار تھا - اسکول تو کم ہی پہنچتا - ادھر اُدھر گھوم پھر کے گھر آجایا کرتا - ایک روز سویرے سویرے ہمیں مل گیا اور کہا - ادھر بیری پر بہت بیر لگے ہوئے ہیں چلو بیر اتارتے ہیں - ہم ادھر چلے گئے - کچھ دیر بیر کھاتے رہے - اسکول سے دیر ہو رہی تھی - مَیں نے کہا اسکول لگ چکا ہو گا - اب بس' لیکن وہ نہ مانا' کہنے لگا - تم بہت ڈرپوک ہو - ایک روز اسکول نہ گئے تو پتہ بھی نہ چلے گا - مجھے دیکھو کیسا شیر ہوں' اور واقعی وہ شیر تھا - کہ اسکول میں اپنی صورت کم ہی دکھاتا تھا - مختصر یہ کہ ہم دونوں اس کے ورغلانے میں آگئے - اور اسکول سے ناغہ کیا - ایک بار اس شیطان بھائی کے کہنے میں آکر ہم باقی وقت اس کے رحم وکرم پر تھے - جدھر وہ لے جاتا ہم اس کے پیچھے پیچھے جاتے - اس طرح گھومتے گھومتے ہم نے اسکول کا وقت گذارا - اور چھٹی کے وقت بستہ لیکر گھر پہنچ گئے -

دروازے پر والدہ انتظار کر رہی تھیں - یہ نئی بات تھی - ہم کچھ کھٹکے لیکن جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسل کا کیا ڈر - ہم آگے بڑھے تو ان کا پہلا سوال یہ تھا کہاں تھے

آج سکول کیوں نہیں گئے۔ ہم نے کہا۔ جی گئے کیوں نہیں تھے۔ اسکول ہی سے تو آ رہے ہیں۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے دوسرا جھوٹ تو بولنا ہی پڑتا ہے۔ انہوں نے ذرا سختی سے کہا۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہاں رہے ہو۔ ورنہ خبر لیتی ہوں۔ ہم نے ڈھیٹ ہو کر پھر کہا۔ جی اسکول گئے تھے۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اب کے میرے لب و لہجہ میں کچھ گھبراہٹ تھی۔ خصوصاً میری آواز متاثر تھی۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے تم یوں نہیں مانو گے۔ اُتارو کپڑے۔ کپڑے اُتروا کر انہوں نے ہم دونوں کو گھر کے درختوں سے باندھ دیا۔ سردی کے دن تھے۔ کئی گھنٹے ہم بندھے کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ سردی سے کانپنے لگے۔ امی گھڑی گھڑی دیکھنے آتی تھیں۔ لیکن کھولتی نہیں تھیں۔ یہاں تک کہ سُورج ڈوب گیا۔ رات ہونے لگی۔ اتفاق سے ایک رشتے دار آئے۔ اور انھوں نے ہماری حالت دیکھ کر ہماری سفارش کی۔ والدہ نے کہا جب تک یہ ٹھیک ٹھیک بات نہیں بتائیں گے اور معافی نہیں مانگیں گے ہرگز نہیں کھولوں گی۔ آخر کار ہم نے پوری بات سچ سچ بتادی۔ اور معافی مانگی۔ تو رہائی ملی۔ ۳۹۶

والدہ نے ہم دونوں کو گرم گرم دودھ پلایا۔ اور بستر میں لٹا کے لحاف اُوپر سے ڈال دیئے۔ کچھ دیر بعد میں نے سسکیوں کی آواز سنی۔ میں سویا نہیں تھا۔ انہوں نے دو بار لحاف اُٹھا کر میرا منہ دیکھا اور پیار کیا۔ یہ ماں کی مامتا تھی۔ اس سے پہلے جو کارروائی انہوں نے کی تھی وہ باپ کے بجائے تھی۔ چونکہ والد ان دنوں نوکری پر تھے۔

اب سُنیئے کہ ہماری چوری کُھلی کیسے۔ ہوا یہ کہ ہم اسکول سے تفریح کے وقت روز اپنی نانی اماں کے گھر جایا کرتے تھے۔ ان کا گھر اسکول سے قریب ہی تھا۔ کچھ کھا پی کر چلے آتے تھے۔ اس روز ان کے گھر نہیں گئے۔ تو انھیں فکر ہوئی۔ انہوں نے گھر آ کر ہماری والدہ کو بتایا کہ آج بچے نہیں آئے۔ اس طرح بات کُھل گئی اور اتنی سزا ملی۔ میں نے اپنی زندگی کے بظاہر اس چھوٹے سے واقعہ سے بڑا اثر لیا ہے۔ اور اس واقعہ کا گہرا تجزیہ کیا ہے

پہلی بات تو یہ کہ بہکانے کے لئے کوئی نہ کوئی شیطان ضرور ہوتا ہے۔ اصل میں یہ شیطان کہیں اور نہیں انسان کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے مفر نہیں۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ انسان اپنے اندر کے رحمان کو پختہ کرے۔ اپنے ایمان کو پکا کرے۔ دوسرے اس واقعہ سے پکی عمر میں آ کر میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ غلط قدم پربت کا پتھر ہے کہ ایک بار اُکھڑ جائے تو پھر نیچے ہی آتا ہے۔ اس لئے چھوٹے سے پہلے غلط اقدام کو چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ وہ سوتا ہے جس سے دریا نکلے گا۔ زندگی میں اس واقعہ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس واقعہ میں والدہ کا کردار بھی تجزیہ چاہتا ہے۔ خدا اُنہیں غریق رحمت کرے۔ وہ ماں ہی نہیں اور بھی بہت کچھ تھیں۔

ملٹری کالج اجمیر سے ملٹری کالج جہلم تک

محمد خاں ۱۹۴۶ء میں پہلے کے جی آر آئی ایم سی اجمیر میں چھٹی جماعت میں داخل ہوئے تھے۔ وہاں سال ڈیڑھ سال گذارا۔ قیام پاکستان کے بعد دسمبر ۱۹۴۷ء میں دوسرے مسلم طلبہ کے ساتھ کے۔ جی۔ آر۔ ایم۔ سی جہلم آئے۔ یہاں سے ۱۹۵۲ء میں پی اے اسپیشل پاس کیا۔ محمد خان کالج کی فٹ بال اور ہاکی ٹیم میں کھیلتے تھے۔ ایک بار فلائی ویٹ میں کالج کی طرف سے انٹر سروسز باکسنگ میں حصّہ لیا۔

ہمارے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کا نیک نیم کیا تھا۔ اور کالج کے زمانے میں کوئی سزا ملی، کرنل محمد خان نے لکھا۔

یار لوگوں نے ملاں تک نیم رکھ چھوڑا تھا۔ رہی شرارت اور سزا کی بات تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ مُلاں بیچارہ شرارتیں کیا کرتا۔ لیکن سزا کی نعمت سے محروم نہیں رہا۔ وہ اس طرح کہ میں اسکین ہاؤس میں (جو اِن دنوں بے بی ہاؤس تھا) لانس کارپورل تھا ان چھوٹے جونیئرز پر میں زیادہ سختی نہیں کرتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ شرارتیں کرتے تھے اور ان کی

غلطیوں کی سزا اس زمانے کے دستور کے مطابق ان کے سینیئرز کو ملا کرتی تھی۔ کریالے کے اسٹیشن کے قریب ۹۸ سنگ میل کو ہاتھ لگا کے ایک مقررہ وقت میں بھاگ کے آنا پڑتا تھا گرمی تو گرمی سردیوں میں بھی پسینے چھوٹ جاتے تھے۔

کمیشن سے اب تک

اپنے کالج چھوڑنے سے اب تک کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کرنل محمد خان لکھتے ہیں :

فوج میں چھ سال سروس کے بعد ۸ او۔ ٹی۔ ایس سے کمیشن حاصل کیا۔ ٹریننگ ستمبر ۱۹۵۸ء سے جون ۱۹۵۹ء تک کی۔ او۔ ٹی۔ ایس میں کراس کنٹری میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ہاکی الیون میں حصہ لیتا رہا۔ اتھلیٹکس میں ۴۰۰ میٹر کی دوڑ میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اور چوتھے نمبر پاس آؤٹ ہوا۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ۱۷ بلوچ رجمنٹ میں پوسٹ ہو کر آیا جو ان دنوں کومیلا مشرقی پاکستان میں تھی۔ ۱۹۶۱ء میں سیالکوٹ آیا۔ ۱۹۶۳ء میں سپیشل سروس گروپ کے لئے نامزد ہوا۔ ستمبر ۱۹۶۳ء سے جنوری ۶۹ء تک ایس ایس جی میں سروس کی۔ ۶۴ء میں امریکن ٹیم کے نیچے پاکستان میں پیرا جمپ کا کورس کیا اور ساتھ ہی پہلا ماسٹر پیرا جمپر کورس کامیابی کے ساتھ کیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ایس ایس جی کے تحت ایک کمانڈو ایکشن کرنے پر امتیازی سند ملی۔

اِمتیازی سند کا فرمان

پی ایس ۵۸۵۶ کیپٹن محمد خان ایک کمانڈو بٹالین کے ساتھ جبرالٹر فورس میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے دشمن کے علاقے میں کمالِ جرأت سے دو پلوں پر حملہ کیا۔ ان میں سے ایک سری نگر لداخ روڈ پر واقع تھا۔ دونوں پلوں کی حفاظت کے لئے

دشمن نے سخت دفاعی انتظامات کر رکھے تھے لیکن اس افسر کی ذاتی جرأت اور ہمت کی وجہ سے حملہ آور کمانڈو اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکے۔

ایک دوسرے موقعہ پر جب دشمن بڑی تعداد میں ہمارے مجاہدوں کی خاص کمین گاہ پر حملہ کرنے کے لئے آگے جا رہا تھا۔ کیپٹن محمد خان سے کہا گیا کہ پیش قدمی کرتے ہوئے دشمن پر چھاپہ ماریں۔ دشمن اپنی مارٹر فائر اور ہیلی کاپٹروں کی مدد کے باوجود اس چھاپہ کو غیر مؤثر نہ بنا سکا اور اس کی پیش قدمی تقریباً ۱۲ گھنٹے تک رکی رہی۔ اس چھاپہ میں دشمن کا خاصا جانی نقصان ہوا اور ایک ہیلی کاپٹر بھی تباہ ہوا۔

یہ کامیابی اس افسر کی جرأت مندانہ قیادت کی وجہ سے ممکن ہوسکی۔ اس اعلےٰ کارکردگی کے لئے کیپٹن محمد خان کے لئے سی ان سی کے کمنڈیشن کارڈ کی سفارش کی جاتی ہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۶۷ء کو امتیازی سند عطا کی گئی۔

جنگ ستمبر سے بعد کے مرحلے

۱۹۷۰ء میں، مَیں دوبارہ ایس۔ ایس۔ جی میں سروس کے لئے بلوایا گیا۔ ایس ایس جی میں سروس کے دوران بطور پلاٹون کمانڈر ٹریننگ ٹیم ایڈجوٹینٹ، سیکنڈ ان کمانڈ اور ڈی اے کیو ایم جی کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۷۴ء میں پرموشن پر ۱۱ بلوچ رجمنٹ میں بحیثیت کمانڈنگ آفیسر آیا جو کہ ان دنوں بلوچستان میں اپنے فرائض انجام دے رہی تھی۔ بلوچستان میں دو سال سروس کرنے کے بعد اپنی پہلی یونٹ یعنی ۱۷ بلوچ کی کمانڈ نصیب ہوئی۔ ایسا شرف ایک خوش نصیب آفیسر کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ پیرنٹ یونٹ کی دو سال سے زیادہ عرصہ کمانڈ کرنے کے بعد ۲۹ بلوچ رجمنٹ میں پوسٹ ہوا۔ جو سلسلہ ابھی جاری ہے۔ جنگ ہو یا امن ہمیں اپنے کام سے کام۔ اصل میں یونٹ میں روز کا کام وہ بنیاد ہے جس پر جنگ میں یونٹ کی کارکردگی کا انحصار ہوتا ہے۔ کچھ کرنے کے لئے

جنگ کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔ مجاہد کے لئے ہر صبح ایک نئے جہاد کا پیام لاتی ہے۔ اور جہاد کی ہزار صُورتیں ہیں۔

مصنف کا تبصرہ

محمّد خاں پر اچھی تربیّت کی پُوری چھاپ ہے۔ با اصول جفاکش، اور احسان شعار ان کی تربیت کے سرچشموں کے بارے میں جب ہم نے ان سے پوچھا تو ان کا جواب یہ تھا:

آدمی بڑا ہو کر اچھا یا بُرا جیسا کچھ بھی ہوتا ہے از خود نہیں ہو جاتا اس کی جڑیں اس کے بچپن تک اس کے والدین کے رویّوں تک جاتی ہیں۔ اپنی والدہ مکرّمہ کے رویے کی ایک مثال ابھی دے چکا ہوں۔ اب والد محترم کے رویّے اور طریق تربیّت کے دو واقعے سناتا ہوں۔

پہلے واقعہ کا تعلق میرے ملٹری کالج کے داخلے سے ہے۔ والد محترم کی شروع سے ہی بڑی خواہش تھی کہ میں ملٹری کالج میں پڑھوں اور پڑھ لکھ کر ترقی کروں۔ ان کے فلسفۂ زندگی میں سخت کوشی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس لئے انہوں نے مجھے ملٹری کالج کے لئے بڑی محنت سے تیار کروایا۔ اس تیاری میں جسمانی سخت کوشی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جو جسمانی طور پر مضبُوط نہ ہو اور سختیاں سہنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو وہ زندگی میں مار کھاتا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ میں نے کالج میں داخلے کا امتحان دیا اور اللہ کا شکر ہے کہ کامیاب ہوا مجھے یاد ہے کہ وہ خود مجھے ساتھ لے کر جہلم آئے تھے اور اس دن بہت خوش تھے۔ زندگی میں پہلی بار ان کا رویّہ میرے ساتھ ظاہری طور پر قدرے لاڈ پیار کا تھا۔ ورنہ ان کے طریق تربیّت میں ظاہری نرمی اور پیار کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ جو پُرانی مثل ہے کہ بیٹے کو نوالہ سونے کا دو لیکن دیکھو شیر کی نظر سے۔

...ی یا لاشعوری طور پر وہ اسی اصول پر کاربند تھے۔ اَب آگے کی بات سُنیئے۔ والد تو مجھے امتحان دلوا کر دہلی چلے گئے جہاں ان دنوں ان کی پوسٹنگ تھی۔ کچھ عرصے کے بعد جب کالج میں داخلے کی کال آئی تو پتہ چلا کہ مجھے ملٹری کالج اجمیر میں داخلہ ملا ہے۔ کہاں میرا دور افتادہ گاؤں وسنال اور کہاں اجمیر۔ نہ صرف سینکڑوں میل کا فاصلہ بلکہ جگہ بھی اجنبی اور نامانوس میرے اجمیر جانے کے خیال سے میری والدہ کا دل ڈول گیا اور انہوں نے صاف کہہ دیا کہ مَیں اپنے لال کو کالے کوسوں نہیں بھیجوں گی۔ مَیں خود اجمیر جانے کے خیال سے پریشان تھا۔ والدہ کے انکار سے مجھے بھی خوشی ہوئی کہ چلو جان چھوٹی۔ یوں بھی گھر کی ٹھنڈی چھاؤں کسے بُری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب والد کو اس صُورتِ حال کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئے اور میرے ایک چچازاد بھائی کو خط لکھا کہ محمد خاں کو لے کر فوراً اجمیر روانہ ہو جاؤ۔ اور میرے پاس دہلی آنے کی بھی ضرورت نہیں۔ والد کا حکم نامہ آتے ہی وہ بڑے بھائی مجھے لے کر روانہ ہو گئے۔ اجمیر کو ایک راستہ دہلی ہو کر بھی جاتا تھا۔ میرا بڑا دل چاہتا تھا کہ مَیں دہلی میں والد سے مل کر اجمیر جاؤں لیکن والد کے حکم سے سرتابی کی مجال کسے۔ اجمیر پہنچ کر جہاں مُسلمان لڑکے بھی چند ہی تھے۔ میرا دل بہت گھبرایا۔ میں نے بڑے درد بھرے خط لکھے کہ خدارا مجھے اس مصیبت سے نجات دلائیں لیکن وہ ذرا نہ پسیجے۔ وہ تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد اجمیر میں ہمارے علاقے کے دو چار لڑکے اور آ گئے۔ ان کے آنے سے ذرا دل بہلا اور راتوں کا رونا چھُوٹا۔

دوسرا واقعہ ملٹری کالج اجمیر میں میرے داخلے کے بعد کا ہے۔ میں گرمیوں کی چھٹی میں گھر آیا۔ اتفاق سے والد صاحب بھی ان دنوں چھُٹی پر آئے ہوئے تھے۔ ایک روز مَیں نے ان سے ایک میلہ میں جانے کی اجازت طلب کی۔ میلہ جس گاؤں میں تھا وہ کوئی چار میل دُور تھا وہیں والد صاحب کے ایک فوجی دوست بھی رہتے تھے۔ والد صاحب نے اجازت تو دیدی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ صوبیدار صاحب سے فلاں فلاں چیز لیتے آنا۔ میں چند دوستوں کے

ساتھ میلے کے گاؤں روانہ ہوگیا لیکن کھیل تماشے میں ایسا محو ہوا کہ صُوبیدار صاحب سے وہ چیزیں لانا یاد نہ رہا ۔ جب گھر پہنچا تو شام ہونے لگی تھی پھر بھی خاصی گرمی تھی۔ میں ہاتھ دھو کر کھانے پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ والد صاحب باہر سے آگئے اور آتے ہی پوچھا محمد خاں' صوبیدار صاحب سے ملا تھا۔ مَیں کیا جواب دیتا ۔ چُپ ہوگیا ۔ یہ دیکھ کر وہ جلال میں آگئے کہنے لگے اُٹھ ابھی جا ۔ اسی وقت' والدہ نے بہت کہا ۔ دن بھر کا بھوکا تھکا ہوا ہے۔ روٹی تو کھالے ۔ کل لے آئے گا۔ لیکن وہ نہ مانے اور مجھے اسی وقت جانا پڑا ۔ واپس آتے آتے خاصا اندھیرا چھا چکا تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی ۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ گاؤں سے خاصی دُور آکر پگڈنڈی پر میرا انتظار کر رہے تھے ۔

اس روز والد نے کھانے کے بعد مجھے اپنے پاس بلایا ۔ اور بڑی شفقت سے کہنے لگے۔ محمّد خاں ! میں چاہتا ہوں تو ذمہ دار بنے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھے ۔ تجھے افسر بننا ہے، بہت کچھ کرنا ہے۔ بیٹا میں نے دنیا دیکھی ہے ۔ کچا گھڑا پانی میں گھُل جاتا ہے۔ اسی طرح کچا آدمی زندگی میں بار بار مار کھاتا ہے ۔ میں جان بُوجھ کر ترے اُوپر سختی کرتا ہوں تاکہ تُو تپ کر پکا ہو جائے ۔

یہ تھا وہ ماحول اور یہ تھے وہ والدین جن کے ہاتھوں میں پل کر بڑا ہوا۔ اقبال کا یہ پیغام کہ "سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں" بہت بعد میں پڑھا لیکن اس کی تربیت بہت پہلے مل چکی تھی ۔

پیدائش، بچپن اور ابتدائی تعلیم

کرنل مرزا ۱۸؍اپریل ۱۹۳۱ء کو اپنے آبائی گاؤں دھمالی میں پیدا ہوئے۔ یہ ابھی چند برس ہی کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش ان کے نانا اور نانی نے کی۔ اور اس طرح کی کہ والد کی شفقت سے محرومی کا احساس ان میں نہ پیدا ہونے دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی تعلیم اور تربیت دونوں پر خصوصی توجہ دی اور انہیں صاف ستھری، جفاکشی کی زندگی کا عادی بنایا۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے متعلق کرنل مرزا لکھتے ہیں :

میں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں دھمالی کے پرائمری اسکول سے شروع کی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا تو وہ مارچ ۱۹۳۶ء کی ایک چمکدار صبح تھی جب میں نے اپنے نانا مرحوم کے ساتھ دھمالی کے اسکول میں پہلی بار قدم رکھا تھا۔ دھمالی سے میں نے شروع کی، چار جماعتیں پاس کیں۔ پانچویں سے آٹھویں تک مڈل کی کلاسیں میں نے خالصہ مڈل اسکول میں پڑھیں۔

تعلیم کے اس دور میں مجھے دو اُستادوں نے خاص طور سے متاثر کیا۔ ایک دھمالی پرائمری اسکول کے ماسٹر کرم داد اور دوسرے خالصہ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ٹھاکر داس یہ دونوں صحیح معنوں میں استاد تھے۔ ان کو یہ گر معلوم تھا کہ پڑھانے سے زیادہ بچے کو جگانا ضروری ہے تاکہ وہ خود پڑھ سکے۔ میں ان کو داد دیتا ہوں کہ خود زیادہ پڑھے نہ ہونے کے باوجود وہ اس راز سے واقف تھے کہ تربیت کی اہمیت تعلیم سے زیادہ ہے۔ جب تربیت ٹھیک ہو، تو تعلیم از خود ٹھیک ہو جاتی ہے۔ چھوٹے درجوں میں بچوں کو احساس تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے اور ماں کی طرح احساس تحفظ وہی دے سکتا ہے جو خود بھی ماں کا کردار ادا کر سکے۔ میرے یہ استاد اس معیار پر پورے اُترتے تھے۔ اچھی قومیں اچھے اُستادوں سے بنتی ہیں۔ افسوس کہ اب اچھے اُستاد پیدا کرنے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی۔

ملٹری کالج کا زمانۂ تعلیم

رزاق مرزا ستمبر ۱۹۴۵ء میں ملٹری کالج میں آٹھویں درجے میں داخل ہوئے اور ۱۴۷۸ کالج نمبر ملا۔ پہلا ہاؤس سکین ہاؤس تھا۔ ایف ایس سی کے دوسرے سال میں تھے کہ انہیں تیسرے بے ایس پی سی ڈی ایس کے لئے منتخب کرلیا گیا۔

ملٹری کالج کے زمانۂ قیام کے تاثرات کے بارے میں رزاق مرزا لکھتے ہیں :

کالج میں، مَیں تقریباً پانچ سال رہا۔ یہ پانچ سال میری تعلیم اور میری تربیت ہر لحاظ سے اہم تھے۔ یہاں کی زندگی سے، یہاں کے اساتذہ سے اور ساتھیوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ پایا۔ ڈسپلن کی سختیوں کے باوجود شب و روز دلچسپیوں سے خالی نہیں تھے۔ ملٹری کالج کی ایک نہیں بہت سی تلخ اور شیریں یادیں ہیں لیکن یہاں میں اس واقعہ کا ذکر کروں گا جسے میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ اور جس کا تعلق گو اب کالج کی تاریخ سے ہے لیکن جس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز کے لگائے اس پودے میں کٹر پاکستانی کیسے پیدا ہوئے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ پروگرام یہ بنا کہ ۱۴ اگست کو آزادی کی پریڈ کی جائے اور پاکستانی پرچم کو سلامی دی جائے۔ ہندو اور سکھ اساتذہ نے شدت سے مخالفت کی۔ کالج کے ہندو سکھ طلبہ نے گو اعلانیہ مخالفت نہیں کی۔ لیکن اندر اندر سے وہ اس تجویز کے خلاف تھے۔ کالج کے انگریز کمانڈانٹ کرنل اسٹیبنگ کا رویہ بھی گومگو کا تھا۔ مسلم طلبہ نے کالج کے نئے کمانڈانٹ میجر اورنگ زیب خان سے بات کی۔ انہوں نے یقین دلایا کہ در پردہ ہمیں ان کا تعاون حاصل رہے گا۔ آزادی کی پریڈ پہلے ملتوی ہوئی پھر مسلم طلبہ کے شدید اصرار پر یہ پریڈ منعقد ہوئی اور پاکستان کے سبز ہلالی پرچم کو سلامی بھی دی گئی۔ گو اس تقریب میں غیر مسلم انسٹرکٹرز اور طلبہ شریک نہیں ہوئے۔ بعد کو

بعض متعصب ہندو انسٹرکٹرز کے گھر بھی طلبہ کے غیض و غضب کا نشانہ بنے۔ کمانڈانٹ جن کا بڑا رعب و دبدبہ تھا اور جن کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی اس قومی معاملہ پر وہ بھی بے بس کر دیئے گئے۔ صورتِ حال اتنی نازک ہو چکی تھی کہ جہلم سے فوج کے دستے منگائے گئے۔ فوج کے آنے پر مسلم طلبہ نے کالج کا بائیکاٹ کر دیا اور سب اپنے بکس اُٹھا کر اپنے گھروں کو چلے گئے جو دُور کے تھے وہ قریب کے گاؤں میں مقیم ہو گئے۔ غرض خاصے ہنگامے کے بعد واپس آئے۔ اور کالج میں نارمل کام شروع ہوا۔

کالج میں پڑھتے ہوئے بہت سے دلچسپ، خوشگوار و ناخوشگوار واقعات پیش آئے لیکن وہ ذاتی یا معمولی نوعیت کے تھے۔ میں نے اس واقعہ کا تذکرہ بطور خاص اس لئے کیا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو کہ انگریز کمانڈانٹ کے زیرِ تربیت رہنے کے باوجود یہاں کے مُسلم طلبہ کا قومی معاملات میں موڈ کیا تھا۔

کمیشن سے باجوڑ اسکاؤٹس تک

رزاق مرزا کا چھٹا پی۔ ایم۔ اے کورس تھا۔ ۲۳ اگست ۱۹۵۲ء کو یہ پی ایم اے سے پاس آؤٹ ہوئے اور ۳/۱۴ پنجاب رجمنٹ (جس کا نام بعد میں ۷ پنجاب رجمنٹ ہوا) سے منسلک ہوئے۔ اگست ۱۹۶۲ء میں رزاق مرزا کا تبادلہ باجوڑ اسکاؤٹس میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس علاقے میں صُورتِ حال بہت خراب تھی۔ باجوڑ اسکاؤٹس کی گشت پارٹیوں پر کمین گاہوں سے حملے ہوتے رہتے تھے۔ حد یہ کہ باجوڑ اسکاؤٹس کے ہیڈ کوارٹر پر بھی ہر دوسری رات فائرنگ ہوتی۔ اس صورتِ حال سے ایک طرح سے فائدہ بھی پہنچا۔ اسکاؤٹس نے اسے جنگ کی عملی ٹریننگ ہی سمجھا اور جوانوں میں وہ ضروری اعتماد پیدا ہو گیا جو ایک مشکل مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

زہوب ملیشیا

ستمبر ۱۹۶۴ء میں رزاق مرزا کو میجر کے عہدے پر ترقی ملی اور انہیں زہوب ملیشیا میں سماباز اونگ کے ونگ کمانڈر کے طور پر پوسٹ کیا گیا۔ ان دنوں اس علاقے میں کرنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ اس دور کے بارے میں کرنل مرزا لکھتے ہیں :

ان دنوں پاک افغان سرحد پر ایک مسئلہ افغانی پاوندوں کے پاکستان میں غیر قانونی طور پر داخلے کا تھا۔ ان کو روکنے کے لئے میرے پیش رو ونگ کمانڈر نے کمانڈانٹ زہوب ملیشیا کے حکم سے حسین نکا کے مقام پر ایک چوکی قائم کی تھی جو افغان بارڈر سے بمشکل ایک میل کے فاصلہ پر تھی۔ اپنے ونگ کی کمان سنبھالتے ہوئے مجھے ابھی سات دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ مجھے حکم ملا کہ گل کچ کے علاقے میں ساؤتھ وزیرستان اسکاؤٹس کے آپریشن میں ان سے تعاون کرتے ہوئے میں تقریباً تین کمپنیوں کی مدد سے پاوندوں کا راستہ روکنے کے لئے ایک چوکی قائم کروں۔ پاوندوں کے خلاف اصل کارروائی ساؤتھ وزیرستان اسکاؤٹس کو کرنا تھی۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد اس مقام پر جہاں مجھے چوکی قائم کرنا تھی ہر طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے ان پہاڑیوں پر قبضہ جمایا جائے۔ چنانچہ میں نے ان پر اپنے سپاہیوں کو فوراً دفاعی پوزیشن لینے کو کہا۔ جونہی میرے ہراول دستے ان پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پہنچے تو انہوں نے اطلاع دی کہ وادی میں پاوندے بڑی تعداد میں جمع ہیں اور بازوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اپنے ہیڈ کوارٹر کے ساتھ اگلی چوکیوں پر پہنچنے کے بعد میں نے اپنے بازوں کے دستوں کو چوکنا کر دیا اور گل کچ کے توپ خانے کو خبردار کر دیا ابھی پندرہ منٹ نہیں گذرے تھے کہ پاوندوں نے میرے بازو پر حملہ کر دیا۔ جو بڑی کامیابی سے پسپا کر دیا گیا۔ پھر انہوں نے براہِ راست سامنے سے سامنا کیا۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ اس طرح لڑائی کوئی تین گھنٹے جاری رہی۔ میری پوزیشنوں کو سر کرنے کی کوشش میں پاوندوں

کا بڑا جانی نقصان ہوا۔ کوئی دس بجے کے قریب ساؤتھ وزیرستان اور ژہوب ملیشیا کے اسکاؤٹس کی کمک بھی پہنچ گئی اور پھر پاوندوں سے فیصلہ کن جھڑپ ہوئی۔ آخر کار پاوندوں کو شدید جانی نقصان اُٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

جنگ ستمبر

فروری ۱۹۶۵ء میں میجر رزاق مرزا کو ۷ پنجاب سے وابستہ کر دیا گیا۔ یہ بٹالین ان دنوں کوئٹہ (چمن) میں تھی۔ کچھ عرصے کے بعد یہ پلٹن اوائل مئی ۱۹۶۵ء میں حیدرآباد آئی اور جون ۶۵ء میں قصور سیکٹر میں منتقل ہوئی۔

مابعد کے واقعات کے بارے میں رزاق مرزا لکھتے ہیں :

قصور سیکٹر میں ہمیں آتے ہوئے ہمیں ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مرزا فورس کا قیام عمل میں آیا۔ جو میری کمپنی اور آر اینڈ ایس بٹالین کی ایک پلاٹون اور آرٹلری کے ایف او اور پر مشتمل تھی۔ میری ذمہ داری یہ تھی کہ قصور کھیم کرن محور پر روہی نالہ پر دفاعی پوزیشن لوں۔ جس علاقے پر مجھے دفاعی قبضہ کرنے کو کہا گیا تھا اس کی لمبائی تقریباً چھ ہزار گز تھی۔ ان چوکیوں پر صرف رات کو پوزیشنیں لینا ہوتی تھیں۔ صبح ہونے سے پہلے میرے دستے آرام کے لئے پیچھے آجاتے تھے۔ یہ رات کو آگے جانے اور دن کو پیچھے ہٹ جانے کا کھیل خاصے دنوں جاری رہا پھر ہم گرمائی اجتماعی تربیت میں مصروف ہوگئے۔

۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کو مجھے حکم ملا کہ مرزا فورس کے دستوں کے ساتھ روہی نالہ کی چوکیوں پر دفاعی پوزیشن لے لوں۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح میری فورس پر ہندوستان کی باقاعدہ فوج نے دو مختلف سمتوں سے حملہ کیا۔ ایک ہندوستانی بٹالین نے قصور، کھیم کرن روڈ کے پار سے یلغار کی جبکہ دوسری نے روہی وال کی طرف سے دھاوا بولا۔ میرے دستے اس وقت اپنے آرام کی جگہوں پر جانے کے لئے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ حملہ آتے ہی میں نے اپنے پلاٹون کمانڈروں کو حکم دیا کہ وہ

اپنی دفاعی پوزیشنوں پر واپس پہنچ جائیں۔ اور حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ میں نے فوراً بٹالین ہیڈکوارٹر کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ میرے دستوں نے بجلی کی سی تیزی سے اپنی پوزیشنیں سنبھالیں اور حملہ آوروں کا اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ وہ روہی کے نالے کو پار نہ کر سکے البتہ روہی وال کی چوکیوں پر دشمن کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ میں نے فوری طور پر اس صورتِ حال سے اپنے بٹالین کمانڈر کو مطلع کیا۔ انہوں نے اے کمپنی کے کمانڈر کو فوراً جوابی حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اے کمپنی نے بڑی تیزی سے جوابی حملہ کیا اور اپنی جرأت و ذہانت سے روہی وال کی چوکیوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اور دشمن کو بھاری جانی نقصان اُٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ جنگِ ستمبر کے شروع میں دشمن سے یہ پہلا اہم معرکہ تھا۔ دشمن کا مقصد قصور پر قبضہ کرنا تھا جو میری مرزا فورس اور ۷ پنجاب کی اے کمپنی نے شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیا اس لئے ان دستوں کو بلکہ ۷ پنجاب رجمنٹ کو قصور کا محافظ کہا جاتا ہے۔

کرنیلی کے عہدے پر ترقی

رزاق مرزا جون ۱۹۶۹ء میں کرنیلی کے عہدے پر ترقی پاکر ۷ پنجاب کے کمانڈنگ آفیسر مقرر ہوئے۔ دو برس اس منصب پر فائز رہے۔ جون ۱۹۷۱ء میں ۳۲ پنجاب کی کمان ان کے سپرد ہوئی۔ یہ بٹالین ان دنوں مشرقی پاکستان میں تھی۔ کرنل مرزا نے ۲۴ جون ۱۹۷۱ء کو ضلع میمن سنگھ کے علوہ گھاٹ کے مقام پر اس بٹالین کی قیادت سنبھالی۔ یہ بڑا پُرآشوب زمانہ تھا۔ اپنوں کی بے وفائی اور غیروں کے جور و استبداد نے مشرقی پاکستان میں پاکستانی افواج کی ذمہ داریوں کو مشکل سے مشکل تر بنا دیا تھا۔ یہ وقت صرف جرأت کے امتحان ہی کا نہیں عزم و ہمت و فراست کے امتحان کا بھی تھا۔

جون ۱۹۷۱ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک کی داستان کرنل رزاق مرزا کی زبانی سُنیئے :

میری بٹالین جس میں ایک ونگ رینجرز کا بھی شامل تھا۔ پچاس سے ساٹھ میل کے

علاقے میں پھیلی ہوئی تھی - ہمیں ای پی آر کی چھوڑی ہوئی چوکیوں پر قبضہ کرنا تھا اور دشمن کو روکنے کے لئے نئی دفاعی چوکیاں قائم کرنا تھیں۔

جولائی ۱۹۷۱ء سے میں نے دفاعی چوکیوں کو مستحکم کرنے کی کارروائی شروع کر دی تھی اور سرجاپور کے پار ھلوہ گھاٹ سے چھ سات میل پر متبادل دفاعی مورچے بھی تیار کر لئے تھے۔ یہ مورچے تین رائفل کمپنیوں، دو رینجرز کمپنیوں مارٹرز، اور بٹالین ہیڈکوارٹر کے لئے تھے۔ جنہیں صرف بوقت ضرورت، بریگیڈ یا ڈویژن ہیڈکوارٹرز کے احکامات صادر ہونے کے بعد استعمال کرنا تھا۔

اکتوبر ۱۹۷۱ء میں بالا ہیڈکوارٹر سے احکامات ملے کہ جب تک ۷۵ فیصد جانی نقصان نہ ہو جائے۔ کوئی پوسٹ خالی نہ کی جائے اور اس صورت میں بھی پہلے بالا کمان سے اجازت لی جائے۔ میں نے یہ احکامات اپنے زیر کمان تمام دستوں کو پہنچا دیئے۔ مقصد یہ تھا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ آخر دم تک لڑنا ہے اور ہر قیمت پر انچ انچ کا دفاع کرنا ہے۔ دوسری طرف ہندوستانیوں نے ہماری چوکیوں کو توپ خانے، مارٹر اور آر۔ آر سے نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ گولوں اور مارٹر اور گولیوں کی یہ بوچھاڑ وقفہ وقفہ سے تقریباً ہر وقت اور ہر روز ہوتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مکمل جنگ شروع ہو گئی۔

مثل مشہور ہے کہ کامیابی سے بڑھ کر کوئی پردہ نہیں۔ آخر کی کامیابی ہر خامی کو چھپا لیتی ہے۔ اور جو آخر میں جیتے وہی ہیرو بن جاتا ہے یا بنا دیا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں جن حالات میں اور جس طرح پاکستانی فوج نے دشمن کا مقابلہ جس حوصلہ سے کیا وہ ہماری عسکری تاریخ کا ایسا شاندار باب ہے جو اب تک کما حقہٗ لکھا نہیں گیا۔ قوم کو کیا خبر کہ مشرقی پاکستان کی گھاٹیوں، اور خندقوں میں ایک نہیں ہزاروں ستارۂ جرأت کا خون جذب ہے۔

نومبر ۱۹۷۱ء کے اوائل میں ہندوستان کی باقاعدہ فوج کی ایک بٹالین نے میری

ایک پوسٹ پر حملہ کیا۔ تمام دن شدید لڑائی ہوتی رہی۔ آخر کار دشمن اپنی عددی اور سامانی کثرت کے بل پر اس پوسٹ کے ایک حصّے پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے اس پوزیشن پر فوراً جوابی حملہ کیا اور اس کو واگذار کرایا۔ اور دشمن کو پسپا ہونا پڑا۔ لیکن دشمن نے اس پسپائی کو فراموش نہیں کیا۔ یہ پوزیشن دشمن کے توپ خانے کا مستقل نشانہ بنی رہی۔ اس پوزیشن کے قریب ہی ایک اور شگاف تھا۔ اس خالی جگہ پر میرے دستوں نے قبضہ کرلیا تاکہ دشمن کو آگے بڑھنے کا کوئی کھلا راستہ نہ مل جائے۔

بعد میں پتہ چلا کہ اس کارروائی کو ہندوستانی جرنیل بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے تین متبادل منصوبے تھے۔ آیا ان پوزیشنوں پر براہِ راست حملہ کیا جائے اور ان پر قبضہ کرکے مشرقی پاکستان میں پیش قدمی کی جائے یا شگافوں سے نکل کر پوزیشنوں کے پیچھے قوّت کو جمع کرکے حملہ کیا جائے۔ تیسرا زیرِغور متبادل منصوبہ یہ تھا کہ صرف چند پوزیشنوں پر قبضہ کرکے بڑے حملے کا آغاز کیا جائے۔

ہندوستانی فوج نے اپنے بڑے منصوبے کے مطابق یکم دسمبر ۷۱ء کو سارے مشرقی پاکستان پر تین طرف سے حملہ کیا۔ میرے زیرکمان حلوہ گھاٹ سیکٹر پر پہلے بھی انڈین بھاری توپ خانے کی نظرِکرم تھی۔ یکم دسمبر سے تو ان کی گولہ باری میں قیامت کی سی شدّت آگئی۔ دشمن نے بین الاقوامی سرحد عبور کرکے میری چوکیوں کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ دشمن کا ارادہ ان چوکیوں کو ایک ایک کرکے ختم کردینے کا تھا۔ لیکن ادھر سے ہم سوئے ہوئے تو نہیں تھے۔ ہم بھی جان کی بازی لگائے ہوئے بیٹھے تھے اور جو مرنا جانتا ہو اسے مارنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ہم نے دشمن کا جان توڑ کر مقابلہ کیا اور یہ لڑائی یکم دسمبر سے ۵ دسمبر تک جاری رہی۔ آخر کار ہم حملہ کا زور توڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ دشمن چند پوزیشنوں پر قبضہ کرسکا۔ اس کے بعد اسے رُکنا پڑا۔ اس ناکامی پر دشمن چوٹ کھائے سانپ کی طرح پھنکارنے لگا۔ اس لئے حلوہ گھاٹ میمن سنگھ محور پر دشمن کا دباؤ بڑھنے لگا۔

ہماری پوزیشنوں کو براہِ راست حملہ کرکے زیر کرنے میں ناکام ہوکر دشمن نے ایک نئی چال چلی۔ دشمن نے ہماری خاص دفاعی پوزیشنوں کو نظرانداز کرکے خالی شگافوں سے گذر کر ہماری پوزیشنوں کے پیچھے جاکر اپنی قوت کو جمع کرنا شروع کیا تاکہ ہمارے دستوں کو دوطرف سے حملہ کرکے مکمل طور پر تباہ کردیا جائے۔ مَیں اِس امکان سے بے خبر نہ تھا۔ اس لئے لڑائی چھڑتے ہی میں نے اپنے دستوں کو حکم دیدیا تھاکہ وہ دلیری سے دشمن کا مقابلہ کریں۔ اور جن دستوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم ملتاہے وہ سرجاپور کے اس پار پہلے سے تیارشدہ دفاعی مورچوں پر اپنی پوزیشنوں کو سنبھال لیں۔ چنانچہ ۵ دسمبر کو علواگھاٹ میں سنگھ مورسے پیچھے ہٹنے سے پہلے ہی میرے دستوں کا کچھ حصّہ اس دوسری دفاعی لائن پر پہنچ چکا تھا۔ اِن دستوں کو از سرِ نو منظم کرنے کے لئے میں نے اپنی بٹالین ہیڈکوارٹر سے ایک افسر کو بھی روانہ کردیا تھا۔ اس افسر نے تنظیمِ نو کا یہ کام بڑی تیزی اور تندہی سے کیا۔ لیکن لڑائی تو نام ہی ایک چال کو دوسری چال سے کاٹنے کا ہے۔ دشمن کو ہماری پوزیشنوں کا پورا علم تھا۔ دشمن کے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جب اس کے دستے اس دفاعی پوزیشن کی جانب بڑھنے لگے تو ان کو بڑی سے حیرت ہوئی۔ یہ دیکھ کر کہ ان پوزیشنوں پر تو پاکستان کے فوجی تعینات ہیں چونکہ دشمن بھی اپنے ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے ایک نئی چال چلی اور ریزرو RESERVE کمپنی کی تیارشدہ پوزیشنوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ چونکہ یہ پوزیشنیں ابھی تک خالی تھیں۔ سرجاپور میں دفاعی پوزیشنوں کا انداز کچھ ایسے تھا۔ تین کمپنیاں آگے تھیں۔ ایک کمپنی مارٹر پلاٹون ان کمپنیوں کے پیچھے۔ ان کے پیچھے بٹالین ہیڈکوارٹر اوران کے پیچھے رینجرز کی ایک کمپنی متعین کی گئی۔ چونکہ اگلی تین کمپنیوں کی دفاعی پوزیشنوں پر ہمارا جزوی طور پر قبضہ تھا۔ میں نے اس کمپنی کو جسے اگلی کمپنیوں اور بٹالین ہیڈکوارٹر کے درمیان پوزیشنیں لینا تھیں۔ حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی پوزیشن پر قابض ہو جائیں۔ اسی اثنا میں مَیں نے بٹالین ہیڈکوارٹر کے افراد سے

بھی کہا کہ وہ بھی اپنی طے شدہ پوزیشن پر چلے جائیں ۔ جونہی یہ دونوں دستے اپنی پوزیشنوں کی جانب بڑھے ۔ دشمن نے خود کار ہتھیاروں سے گولیوں کی بوچھاڑ کردی۔ اس بوچھاڑ کی وجہ سے اس کمپنی کی پیش قدمی رُک گئی۔ میں نے اس دوران مارٹر پلاٹون کمانڈر سے رابطہ قائم کیا۔ اور یہ تصدیق کیا کہ اس کا کوئی آدمی اپنی پہلے طے شدہ دفاعی پوزیشن پر تو نہیں گیا مجھے اب یقین ہوگیا کہ دشمن اپنی چال میں کسی حد تک کامیاب ہو چکا ہے۔ صورتِ حال کا تجزیہ کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ دشمن کو اس پوزیشن سے فوراً مار بھگانا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ میرا سارا آپریشن ناکام ہو جائے گا۔ اس لئے میں نے ریزرو کمپنی کے کمانڈر کو حکم دیا کہ وہ بائیں بازو سے دشمن پر جوابی حملہ کرے۔ میرے کمپنی کمانڈر نے تھوڑا سا بائیں طرف ہٹ کر حملہ کیا۔ لیکن دشمن نے اسے ناکام بنا دیا۔ میری اس کمپنی کے کچھ آدمی بُری طرح زخمی ہوئے۔ دشمن اپنے خود کار ہتھیاروں سے مسلسل گولیاں برسا رہا تھا۔ یہ لمحہ بہت نازک تھا۔ میں سارے آدمیوں کو لڑائی میں جھونک چکا تھا۔ ریزرو ایک آدمی بھی نہیں تھا۔ اگلی کمپنیوں کو پیچھے نہیں بلایا جا سکتا تھا۔ چونکہ دشمن سرجاپور کراسنگ کے اگلے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے باوجود دشمن کو اپنی دفاعی پوزیشنوں کے درمیان سے نکال باہر کرنا لازمی تھا۔

جنگ میں اکثر یہ لمحہ آجاتا ہے۔ جب کمانڈر کو اپنی صوابدید کے مطابق جرأت سے ایک قدم اٹھانا پڑتا ہے اور ایک فیصلہ کرنے کی پوری ذمہ داری لینی پڑتی ہے۔ میرے لئے وہ لمحہ آن پہنچا تھا۔ میں نے فوراً جوابی حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ میرے پاس ضروری دستے ہیں یا نہیں۔ اگر یہ سوچتا تو پہل نہ کر پاتا۔ میں نے اپنے بٹالین ہیڈکوارٹر کے افراد اور آس پاس کے دوسرے افراد ملا کر جنکی کل تعداد ۹۰ سے زیادہ نہیں تھی۔ حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ سڑک کے اُونچے کناروں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اپنے اس دستے کو پیچھے لے گیا۔ بٹالین ہیڈکوارٹر کی پوزیشنوں پر پہنچ کر میں نے اس دستے کو تین پلاٹونوں

میں تقسیم کیا ایجوٹینٹ اور دو کمپنی افسروں کی کمان میں دے دیا۔ اس کے بعد میں نے ادگروپ کو ضروری ہدایات دیں۔ ان کو دشمن کی پوزیشنیں دکھائیں اور ہر ایک کو اس کا نشانہ بتایا۔ حملے کا آغاز دائیں طرف سے ہونا تھا۔ جو دو کمپنیاں گھر گئی تھیں ان کو میں نے پیغام بھیجا کہ وہ خودکار ہتھیاروں سے دشمن کو مسلسل الجھائے رکھیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ حملہ منصوبے کے مطابق ہوا اور خدا نے مجھے سرخرو کیا۔

میرا یہ حملہ خودکشی کے مترادف تھا لیکن اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ اگر میں یہ جوابی حملہ کرنے کا فیصلہ نہ کرتا تو یقیناً دشمن اپنی پوزیشن کو مزید مستحکم کر لیتا اور میری تمام کمانڈ تباہ ہو جاتی۔ لڑائی میں سوچ سمجھ کر خطرہ لینا پڑتا ہے۔ اس موقع پر میں نے یہ خطرہ مول لیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے جوانوں اور ساتھیوں کی بے جگری اور جذبہ سے یہ معرکہ سر ہوا اور میرے بریگیڈ کمانڈر، بریگیڈیئر عبدالقادر خان نے میرے لئے ستارۂ جرأت کی سفارش کی اور میں اس عظیم اعزاز سے سرفرو ہوا۔ ستارۂ جرأت مجھ اکیلے کو ملا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کامیابی کا سہرا تنہا میرے ہی سر نہ باندھا جائے۔ میں اس اعزاز میں اپنے تمام گمنام شہیدوں اور غازیوں کو شامل کرنا چاہتا ہوں۔

یقینِ محکم ، عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) سلطان احمد ستارۂ جرأت (دوبار)

امتیازی سند

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) سلطان احمد ستارۂ جرأت دوبار

امتیازی سند

بریگیڈیئر سلطان ستمبر ۶۵ء اور دسمبر ۷۱ء دونوں پاک و ہند جنگوں کے ایسے ہیرو ہیں جن کے حیرت انگیز کارناموں سے تے بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور ملک و قوم کا نام روشن کیا ان کی دلیری اور جواں مردی کی داد اپنوں نے ہی نہیں بلکہ دشمنوں نے بھی دی ہے۔ کھالپور اور جمال پور کے ہیرو پر شعرائے نظمیں لکھی ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی وقائع نگاروں نے ان کا تذکرہ سونے کے حروف میں کیا ہے۔ بریگیڈیئر سلطان کے کارنامے ایک داستان کی حیثیت اختیار کرگئے ہیں۔ یہ مرتبہ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ بریگیڈیئر سلطان کی شخصیت و کردار اور کارناموں کا مطالعہ سب کے لئے خاص طور پر ان کے لئے جن کا پیشہ تلوار ہو۔ خصوصی اہمیت رکھتا ہے ہم نے اس مقصد کے لئے ایک طویل سوال نامہ ان کے پاس بھیجا۔ ان کے جوابات کی روشنی میں ہم نے ان سے مزید گفتگو کی۔ اس تمام مواد پر مبنی بریگیڈیئر سلطان ستارۂ جرأت کا سوانحی خاکہ انہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

جڑیں

تحصیل گوجر خان میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے موہڑی دلچیال۔ وہی ہمارا آبائی گاؤں ہے۔ ہم نسلاً منہاس راجپوت ہیں۔ شجاعت، فیاضی اور سخت کوشی ہمارے خون میں ہے۔ میرے پردادا راجہ فضل خان نے سواروں کے ایک دستے کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا۔ دادا راجہ خان محمد خان اپنی جرأت اور انصاف پسندی کے لئے مشہور تھے میرے والد صوبیدار راجہ عبدالرحمان اور ان کے تین بھائی برطانوی فوج میں ملک گیر شہرت کے اتھلیٹ اور تیراک تھے۔ میرے والد راجہ عبدالرحمان اور والدہ رحمت بی بی دونوں سچے پکے مسلمان ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو ایمان اور جس طرح ایمان ان کو ہے اس کی مثال کم ازکم اپنی زندگی میں میں نے نہیں دیکھی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے انہوں نے اپنی شعوری زندگی میں کوئی نماز قضا نہیں کی۔

تنگ دستی میں فیاضی

میرے والدین نے تنگدستی سے زندگی شروع کی۔ اللہ کا شکر ہے اب ان کا ہاتھ کشادہ ہے۔ لیکن اس وقت بھی جب ان کا ہاتھ تنگ تھا اور اب جب کہ ان کا ہاتھ کشادہ ہے۔ صبر و شکر کا وہی عالم ہے جو تھا۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ شجاعت کے ساتھ فیاضی ہمارے خون میں ہے۔ اس کا مظاہرہ میں نے اپنے گھر میں دیکھا۔ دینے کا فن مانگنے کے فن سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اس طرح دینا کہ لینے والے کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ اور وہ لینے میں خوشی محسوس کرے۔ اس طرح دینا کسی کسی کو آتا ہے۔ اس طرح دیتے میں نے اپنی والدہ رحمت بی بی کو دیکھا۔

پاکستان اور کشمیر

اسلام کے بعد پاکستان سے شدید تعلق کا احساس بھی مجھے گھر ہی ہوا - وہ ایسے کہ والد نے ۴۸ - ۴۷ کے جہاد کشمیر میں حصّہ لیا تھا - صرف رسمی طور پر ڈیوٹی کی وجہ سے نہیں بلکہ محسوس کر کے سوچ کے حصّہ لیا - بعد میں وہ اکثر اس جہاد کے قصّے سناتے تھے - کشمیر کے بغیر پاکستان نہ مکمل ہے اور نہ محفوظ اس بات کا شعور مجھے سب سے پہلے والد ہی کی باتوں سے ہوا -

گھر کا ماحول

میں اپنے آبائی گاؤں موہری دلچیال کا ذکر پہلے کر چکا ہوں - میں یہیں ۱۵ جنوری ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوا - موہری ایک چھوٹا سا گاؤں ہے - میرے بچپن میں اس کی آبادی کوئی ہزار سے زیادہ نہ تھی - والد نے مجھے بتایا کہ اب سے کوئی چالیس پچاس سال پہلے موہری کی کبڈی ٹیم دُور دُور مشہور تھی - جنگِ عظیم دوم کے زمانے سے ٹیم ٹوٹ گئی پھر معاشی حالات کا رُخ ایسا ہوا کہ نوجوان گاؤں میں ٹکتے ہی نہیں - ۴۸ - ۴۷ء میں ہمارے گاؤں میں بہار کے مہاجر خاصی تعداد میں آئے - ان کو ہمارے گاؤں کے لوگوں نے کھلے دل سے اور کھلے ہاتھوں سے قبول کیا اور ان کی ہر ممکن مدد کی - اس کارِ خیر میں میرے دادا راجہ خان محمد خان آگے آگے تھے - نہ صرف یہ بلکہ جب ہمارے گاؤں کے قریب کے دو گاؤں کنتریلا اور سرگ ڈھن سے ہندو اور سکھ جانے لگے تو راجہ خان محمد نے اپنے اثر و رسُوخ سے کام لے کر عام مُسلمانوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسلام کی روایتی رواداری، فراخدلی اور فیاضی سے کام لیں اور جانے والے غیر مسلموں کو زیادہ سے زیادہ تحفظ دیں - چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے علاقے کے ہندوؤں اور سکھوں کو کسی

نے نہ چھیڑا۔ ان کی جان بھی محفوظ رہی اور مال بھی محفوظ رہا۔ وہ گئے تو موہری کے راجگان کو دُعا دیتے ہوئے گئے۔ راجہ خان محمد کہا کرتے تھے کہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اپنے اخلاق وکردار سے غیر مسلموں کے دلوں پر اسلام کی برتری کا سکہ جمایا جائے جب کوئی ہندو یا غیر مسلم، کسی مسلمان کے کردار کی تعریف کرتا ہے۔ تو اسلام متعارف ہوتا ہے۔

بچپن کے چند واقعات: میں چھ سات برس کا تھا اور گھر کے برآمدہ میں لیٹا سو رہا تھا کہ کہیں سے بستر میں ایک کانتر گھس آئی اور پیٹھ پر کاٹ لیا۔ کانتر کے بیسیوں نوکیلے پاؤں ہوتے ہیں وہ سب گوشت میں اس طرح پیوست ہو گئے تھے کہ لوہے کی سلاخ کو گرم کر کے کانتر کو چھڑایا گیا۔ یہ تمام کارروائی کتنی تکلیف دہ ہو رہی ہو گی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن میں اس تمام عرصے میں رویا نہیں سب لوگ حیران تھے۔ اماں جی مجھے گود میں لئے بیٹھی تھیں اور بار بار کہتی تھیں میرا سلطان احمد کتنا پکا ہے۔ پکا تو خیر میں کیا تھا درد سے میرا بُرا حال تھا۔ لیکن وہ فقرہ جو ہوش سنبھالتے ہی میں نے بار بار سنا تھا کہ لڑکے رویا نہیں کرتے، وہ لاشعور میں جاگزیں ہو چکا تھا۔ اس فقرہ نے مجھے رونے نہیں دیا (ہمارے گھر کی روایت تھی کہ خواہ کھیل کود میں چوٹ لگے یا کسی سے لڑائی بھڑائی ہو گھر میں کوئی بچہ روتا ہوا نہیں آتا تھا) مجھے یاد ہے کہ میں کانتر کے زہر سے کئی ہفتے تک بستر میں رہا تھا۔ گاؤں کے جرّاح کے علاج کے علاوہ مولوی فیض عالم بھی دم کرنے آتے تھے۔

ایک اور واقعہ چوتھی کا ہے۔ میں کلاس میں تو مانیٹر تھا لیکن کلاس سے باہر شرارتی لڑکوں کے سرغنہ ہونے کی ڈیوٹی بھی سرانجام دیتا تھا۔ ایک روز اس شرارتی ٹولے نے خبر دی کہ فلاں گلی میں بھڑوں کا ایک بہت بڑا چھتہ لگا ہے۔ ان میں سے ایک شیطان نے یہ انکشاف کیا کہ چھتے کی شکر بڑے مزے کی ہوتی ہے میں نے کہا تو پھر دیر کیا ہے۔ جاؤ چھتہ توڑ لاؤ شکر نکال کے کھائیں گے۔ وہ بولا بھڑیں کاٹیں گی۔ میں نے لیڈری کی ترنگ میں آ کر کہا کہ چلو میں چلتا ہوں۔ اب سوال انا کا تھا۔ بھڑوں نے کاٹ کاٹ کے میرا جو حشر کیا سو کیا لیکن میں نے چھتہ توڑ کے دم لیا۔

بچپن کا ایک اور واقعہ بھی سناتا چلوں۔ یہ کانتر کاٹنے کے واقعہ سے پہلے کی بات ہے کہ نانی اماں نے مجھے کسی بات پر بے جا جھڑکا۔ مجھے تاب کہاں غصے میں بھر افوراً گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ سوہاوہ روڈ پر خاصی دور نکل گیا تھا کہ پیچھے سے چچا بوستان گھوڑی دوڑاتے ہوئے آئے۔ "سلطانا رُک جا۔ سلطانا رُک جا" میں اور تیز بھاگا لیکن آخر کار انہوں نے آن لیا۔ اور زبردستی گھر لے آئے۔

ابتدائی تعلیم

ہمارے گاؤں موہری سے شمال مشرق میں ہفیال پرائمری اسکول ہے۔ ابتدائی چار جماعتیں میں نے اسی اسکول میں پڑھیں۔ چوتھی جماعت کے آخر میں میں وظیفے کے امتحان کے لئے گوجر خان گیا۔ لیکن امتحان نہیں دیا۔ وہ بھی میری خود سری کی داستان ہے۔ وہ یوں کہ میں گوجر خان میں کسی دور کے رشتہ دار کے یہاں گیا تھا۔ دوپہر کو والد صاحب چھوڑ کر چلے آئے۔ میں روٹی کھا کے سو گیا۔ سہ پہر کو اٹھا کچھ دیر بعد دوسرے دن کے پرچے کی کتابیں ٹرنک سے نکال ہی رہا تھا کہ میرے میزبان صاحب نے کہا۔ یہ گھڑا لے اور کنوئیں سے پانی بھر لا۔ پانی میں اپنے گھر میں بھی بھر لاتا تھا۔ پانی بھرنے میں مجھے کوئی عذر نہ تھا لیکن جس انداز سے انہوں نے مجھے یہ حکم دیا مجھے بڑا ناگوار گزرا۔ میں نے اُن سے تو کچھ نہ کہا۔ اپنے ٹرنک میں کتابیں رکھیں۔ بستر ساتھ لیا اور بس میں بیٹھ کے گھر آ گیا۔ جب میں اکیلا اس طرح واپس پہنچا تو گھر والوں کو بڑا تعجب ہوا۔ میں نے والد کو ساری بات بتا دی۔ وہ میرے مزاج سے واقف تھے' چُپ ہو گئے۔ اس طرح وظیفے کا امتحان میری آن پر قربان ہو گیا۔

۱۹۴۷ء کے اوائل میں میرے ماموں راجہ غلام ربانی مجھے اپنے ساتھ بمبئی کے نزدیک پونہ لے گئے۔ اور مجھے پونہ کے قریب کرکی چھاؤنی اسکول میں پانچویں درجے میں داخل کرا دیا۔ اور میں اس نئے نسبتاً بہتر اسکول میں جانے لگا۔ لیکن چند دنوں کے بعد یہاں بھی میرا انا کا سوال پیدا ہو گیا۔

خودداری کا ایک اور امتحان

واقعہ یوں ہے کہ میرے ماموں کے کوارٹر سے اسکول تک جو راستہ جاتا تھا وہ
مدین آرمی کے برٹش آفیسرز کے بنگلوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ وہاں ان انگریز افسر
کے بچے کھیلتے تھے۔ وہ ہم کالے بچوں کو اس سڑک سے گزرنے سے روکتے تھے۔ اس پر
میری ان سے لڑائی ہوئی۔ بات بڑوں تک پہنچی میں چھوٹا تھا لیکن اتنا چھوٹا بھی
نہیں تھا کہ معاملہ کی نوعیت کو نہ سمجھ سکوں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا یہ سڑک ان کے
باپ کی جاگیر نہیں۔ ہم گزریں گے اور ضرور گزریں گے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو تیار کرلیا تھا
کہ جائیں گے تو ادھر ہی سے جائیں گے خواہ روز لڑنا پڑے۔ بہرحال میرے ماموں اور بڑے
انگریز افسروں میں کیا بات چیت ہوئی وہ مجھے نہیں معلوم۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر ہمارے گزرنے
پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

کے۔ جی۔ آر کالج بنگلور میں داخلہ

ابھی کرکی چھاؤنی اسکول میں پڑھتے مجھے چند ہی مہینے ہوئے تھے کہ مجھے
کے جی آر آئی ، ایم کالج بنگلور میں داخلہ مل گیا۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے۔ داخلے
کے وقت ایک لطیفہ بھی ہوگیا۔ وہ بھی سناتا ہوں۔ داخلے کے وقت تک میں نے انگریزی
بالکل نہیں پڑھی تھی۔ لیکن داخلے کے شوق میں دو چار فقرے انگریزی کے میں نے رٹ
لئے تھے مثلاً: "وَاٹ اِز یُور نیم" کا جواب، "سَر مائی نیم اِز سلطان احمد" وغیرہ۔ جب
میں داخلے کے انٹرویو کے لئے انگریز کرنل کے سامنے پیش ہوا تو ہر چند کہ وہ سوالات اُردو
میں کر رہا تھا۔ میری کوشش تھی کہ مجھے کسی طرح انگریزی جھاڑنے کا موقعہ مل جائے۔ چنانچہ
جب اس نے پوچھا تمہاری عمر کیا ہے، میرے منہ سے نکل گیا۔ "سَر مائی نیم اِز سلطان احمد"

یہ سُن کر کرنل مسکرایا۔ بورڈ کے باقی ممبروں سے کچھ انگریزی میں کہا۔ مجھے شاباش دی اور داخل کرلیا۔

ایک چھوٹا سا معرکہ

جب میں وہاں داخل ہوا تو پاکستان تازہ تازہ قائم ہوا تھا۔ ہندو مسلمانوں میں وہاں ایک خاموش کھنچاؤ تھا۔ بنگلور کالج میں ۱۱۰ ہندو اور ۴۲ مُسلم طلبہ تھے۔ گویا ایک اور تین کی نسبت تھی۔ تعلقات آہستہ آہستہ خراب ہورہے تھے۔ یہاں تک دسمبر ۴۷ کی ایک صبح میس میں ناشتہ پر کسی معمولی سی بات پر جھگڑا شروع ہوگیا۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ وہ ہمیں دبالیں گے۔ بہرحال خوب مار دھاڑ ہوئی۔ اور تعداد کم ہوتے ہوئے بھی ہم پیچھے نہیں ہٹے۔ یہاں تک اسٹاف کے تنہا مُسلم ممبر کیپٹن بخاری اور کمانڈانٹ جو ایک انگریز کرنل تھا۔ میس پہنچے اور لڑائی بند کرائی۔

اس واقعہ کے چند دن بعد ہی ہم ۳۶ طلبہ (۶ وہیں رہ گئے) بمبئی ہوکر بحری جہاز سے کراچی پاکستان روانہ ہوگئے۔ جونہی کراچی کا ساحل نظر آیا پاکستان زندہ باد، قائدِاعظم زندہ باد کے نعرے لگا کے ہمارے گلے بیٹھ گئے۔ ہم اپنے آپکو بہت اہم شخصیتیں سمجھ رہے تھے۔ جو بنگلور کے ہندوؤں کو ہرا کر پاکستان آ رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمارے استقبال کے لئے کچھ اہتمام تو ساحل کراچی پر ہوگا۔ جہاز لنگر انداز ہوا۔ ہم نے سیڑھی سے اُتر کر پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھ بھی دیا اور ایک استقبالیہ توپ بھی نہیں چلی۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ خواب کسی عمر کے ہوں بے معنی نہیں ہوتے!

ملٹری کالج کے شب و روز

جنوری ۱۹۴۸ء میں، مَیں نے ملٹری کالج جہلم میں اپنی تعلیمی زندگی شروع کی ملٹری

کالج میں، مَیں نے پانچ سال گزارے۔ جنوری ۱۹۴۸ء سے فروری ۱۹۵۳ء تک جب مَیں
۔اے اسپیشل کرکے پی۔ایم۔اے کے لئے منتخب ہوا کالج میں، میں نے تعلیمی میدان
یں، بہت امتیازات حاصل کئے۔ ہمیشہ اوّل دوم آتا رہا اور اس کے لئے انعامات ملتے
ہے۔ کالج میں بیشتر لڑکوں کا کوئی نہ کوئی نک نیم ہوتا تھا۔ اب بھی ہوتا ہوگا کہ یہ پبلک
سکول طرزِ زندگی کی ایک ضرورت ہے۔ میرا عرفی نام فلاسفر تھا۔ غالباً اس لئے کہ
کم و بیش ہر فارغ وقت میں میرے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ہوتی تھی۔ کالج کی لائبریری
سے میں نے بے شمار و بے حساب کتابیں پڑھی ہیں۔ کتابیں پڑھتا تھا اور اپنے آپ میں
ن رہتا تھا۔ یاروں نے فلاسفر کا لیبل چپکا دیا۔

روشنی کی تلاش

پڑھنے کا شوق مجھے بچپن ہی سے تھا۔ لیکن مطالعہ کو ایک سمت دینے اور اس کو
ہرائی عطا کرنے کا کام میرے شفیق اُستاد کیپٹن منظور الرحمان نے کیا۔ ان کا فنونِ لطیفہ
کا ذوق بھی بہت اعلیٰ تھا لیکن ان کا مجھ پر احسان یہ ہے کہ انہوں نے مجھے قاعدے سے پڑھنا
سکھایا۔ ساتویں اور آٹھویں میں وہ میرے انگریزی کے اُستاد تھے وہ ان باکمال استادوں میں
سے تھے جو طالب علم کے اندر علم کی طلب کو جگا دیتے ہیں جو خود سیکھنا سکھا دیتے ہیں۔ ان کا
ریقہ یہ تھا کہ ہر دوسرے تیسرے دن ایک کتاب دیتے اور کہتے اس کا خلاصہ لکھ کر دکھا نا
پنی رائے بھی لکھنا۔ اس طرح دو سال کے عرصے میں، مَیں نے بے شمار کتابیں پڑھ ڈالیں
دب اور تاریخ کے مطالعہ کا شوق مجھے اسی زمانہ میں ہوا تھا۔ آج ڈکنس ہارڈی، شا
لابیر، ٹالسائی، داستووسکی، شیکسپیئر میرے لئے اجنبی نہیں اس ذوق کی ابتدا اسٹوریز
رام شیکسپیئر سے ہوئی تھی۔ پطرس، مولوی نذیر احمد، سرشار، پریم چند کو میں نے انہیں دنوں
پڑھا تھا۔ میر، غالب، اقبال سے میرا تعارف وہیں ہوا تھا اسلامی تاریخ میں نے شرر کے ناولوں

سے شروع کی۔ اسی ذوق نے مجھے شبلی سے ابنِ خلدون، ابن رشد، ابن اسحاق، طبری، طبقات ابن سعد تک پہنچایا۔ اسکین ہاؤس میں برآمدے کی روشنی کے قریب میرا بستر تھا۔ لائٹس آؤٹ کے بعد بھی خاصی دیر تک رات کو میں پڑھتا رہتا تھا۔ پڑھنے کی یہ عادت اس وقت سے میرے ساتھ ہے۔ دورانِ جنگ بھی میرے تھیلے میں ایک آدھ کتاب ضرور رہی ہے جوں ہی موقعہ ملتا تھا۔ میں کتاب نکال لیا کرتا۔

اُستاد ڈرل ماسٹر نہیں ہوتا

میرا خیال ہے کہ اُستاد، ڈرل ماسٹر نہیں ہوتا کہ چند باتیں سکھادے یا بتادے اصل کام طالب علم کو واقعی علم کا طالب بنانا ہے۔ تاکہ وہ علم کی طلب میں خود آگے بڑھتا رہے اور زندگی بھر آگے بڑھتا رہے۔

شرارتیں

میں مطالعہ میں اس درجہ مستغرق رہا کہ میں نے کسی اور طرف توجہ نہیں دی۔ پی۔ٹی۔ ڈرل۔ کھیلوں وغیرہ میں مجھے اس وقت تک کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی — لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں بالکل سادھو تھا۔ اپنے حصے کی اور اپنی عمر کی شرارتیں بھی کرتا تھا۔ کالج کے مشرقی پہلو میں اپر جہلم نہر بہتی ہے۔ میرا محبوب مشغلہ چوری چھپے اس میں جاکر تیرنا تھا گو اس کی سختی سے مخالفت تھی، انڈہ کی طرح بعض پابندیاں بھی توڑنے کے لئے ہوتی ہیں!

چند محسنوں کی یاد

ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں اپنی کالج کی زندگی کا یہ جائزہ ختم کرنے سے پہلے کالج میں

میں، مَیں اپنے چند محسنوں کا ذکر نہ کروں ۔ کیپٹن منظور الرحمان ، مسٹر حیدری ، مسٹر سعید اللہ، مسٹر مظہر علی خان بہت اچھے اُستاد تھے ۔ اور اپنے اپنے دائرہ میں خُوب تھے اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ۔ ادارہ اینٹ پتھروں سے نہیں اپنے اُستادوں سے بنتا ہے ہماری یہ خوش قسمتی تھی کہ ایک نہیں کئی بہت اچھے اُستاد ان دنوں یہاں موجود تھے لیکن جہاں تک کسی سے متاثر ہونے کا تعلق ہے ۔ اس طرح کہ انسان کی پُوری زندگی بدل جائے۔ اس سلسلے میں، مَیں صرف ایک نام لوں گا اور وہ ۵۳-۱۹۵۲ء میں کالج کے کمانڈانٹ کرنل رفیق کا نام ہے ان کا اثر میری زندگی پر بہت گہرا اور دیرپا پڑا ۔ ڈسپلن میں تو خیر وہ مثالی حیثیت رکھتے ہی تھے لیکن جس چیز سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ ان کا احساسِ عدل تھا ۔ بہت با اصول، بہت سخت لیکن بہت ہمدرد تھے ۔ ان کے قول اور فعل میں تضاد نہیں تھا ۔ انہیں لڑکوں کو کچھ بنانے کی دھن تھی ۔ کردار سازی کا جنون سا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ملٹری کالج کے طلبہ سے اس ملک کی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں بہرحال انہوں نے جو صفات کیڈٹس میں پیدا کیں یا پیدا کرنے کی کوشش کی وہ وہی تھیں جن کی میدانِ جنگ میں ضرورت ہوتی ہے ۔ ناروے کے مشہور ڈرامہ نگار ایبسن کا ایک ڈرامہ بعنوان ماسٹر بلڈر ہے ۔ میں انہیں ملٹری کالج کا ماسٹر بلڈر کہتا ہوں ان کی تربیت کا امتحان ستمبر ۶۵ء اور ۷۱ء میں ہوا ۔ یہ واقعہ ہے کہ ان جنگوں میں ملٹری کالج کے طلبہ کا ریکارڈ بہت شاندار بلکہ قابلِ فخر رہا ۔ اس کا کریڈٹ کالج کو جاتا ہے خاص طور پر کرنل رفیق کو۔

پی-ایم - اے

پی - ایم - اے میں ، میں ایک اتھلیٹ کے طور پر اُبھرا ۔ ۱۰۰ اور ۲۰۰ میٹرز میں، مَیں نے چیمپئن شپ لی ۔ مجھے پاکستان ٹیم میں شامل کرنے کی پیشکش ہوئی ۔ میں نے دل سے کہا یہ دو علیحدہ راستے ہیں یا مَیں اتھلیٹ بنوں یا پیشہ ور سپاہی بنوں ۔ کوئی

ایک راستہ چننا ہوگا۔ ہر آدمی کسی خاص کام کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اسی میں اس کی نجات ہوتی ہے۔ مجھے احساس تھا کہ میری نجات تلوار میں ہے۔ اس لئے میں نے تلوار کو چن لیا اور پچیس برس کے بعد کہہ سکتا ہوں کہ میں نے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔ پی ایم اے میں میں نے ہاکی اور باکسنگ میں بھی امتیاز حاصل کیا۔ یہ دونوں چیزیں میرے لئے نئی تھیں۔ لیکن میری عادت ہے جب کوئی کام شروع کرتا ہوں تو اسے چیلنج سمجھ کر کرتا ہوں۔ چنانچہ ان میدانوں میں بھی سنجیدگی سے کامیاب ہونے کی کوشش کی اور کامیاب ہوا۔

اکتوبر ۵۳ء میں، مَیں ۱۲ لانگ کورس کے لئے کاکول گیا تھا۔ ستمبر ۵۵ء میں مَیں اس تربیت سے فارغ ہوا۔ ۹۱ کے کورس میں میری پوزیشن ۸۶ تھی۔ مجھے دیکھتے ہوئے یہ پوزیشن بدیہی طور پر حیرت انگیز حد تک کم تھی لیکن اس کی وجہ بھی میری افتادِ طبع میں پوشیدہ تھی۔ میں اپنی پسند کے مطالعہ خاص طور پر ملٹری ہسٹری میں اُلجھا رہا۔ اور نصاب کو دیکھا تک بھی نہیں۔ امتحان تو آپ جانتے ہیں مکھی پہ مکھی مارنے کا سلسلہ ہوتا ہے۔ نصاب میں، میں تقریباً کورا تھا۔ اس لئے یہ حشر ہوا۔

پی۔ ایم۔ اے سے ۶۵ء جنگ تک کی کہانی

کسی فن میں کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے۔ جب انسان اس کو اپنی پہلی محبت بنا لے۔ کسی مفکر کا یہ قول میرے تحت الشعور میں تھا۔ تو جب میں بہاولنگر میں ۸ بلوچ میں پوسٹ ہوا تو میرے دل نے کہا۔ سلطان لو زندگی بھر کا سودا کر لو۔ اپنی محبت چن لو۔ اگر اس پیشہ کو اختیار کیا ہے تو اسے اوڑھنا بچھونا بنانا پڑے گا۔ میں نے دل سے کہا، آمنّا و صدّقنا۔ یہ بٹالین کبھی بہاولپور رجمنٹ کی پہلی بٹالین ہوا کرتی تھی۔ میں نے پہلے دن سے اس پیشے کو سنجیدگی سے سیکھنا شروع کر دیا جب

پہلی اجتماعی تربیت کا دَور شروع ہوا تو میں ہر روز پڑول پر جایا کرتا تھا۔ جس دن کسی منظم پٹرولنگ مشق کا انتظام نہیں ہوتا تھا۔ میں اکیلا باہر نکل جاتا تھا تاکہ مجھے سمت کا احساس رہے۔ میپ ریڈنگ کی مشق بڑھے اور ریگستانوں سے میری واقفیت بڑھے۔ اس حقیقت کا مجھے اس وقت بھی احساس تھا کہ جہاں لڑنا ہو اس جگہ یا علاقے کے ماحول اور جغرافیائی ساخت سے گہری واقفیت اپنے مقاصد کے حصول میں بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس اصول کے تحت میں نے پٹرولنگ کو اپنی خود تربیتی کی بنیاد بنایا۔ خوش قسمتی سے مجھے اپنی کمپنی میں ایک بہت اچھے انسٹرکٹر مل گئے۔ ان کا نام صوبیدار عبدالعزیز تھا۔ صوبیدار عزیز صاحب نے مجھے اس دلچسپی اور شوق سے پٹرولنگ کا فن سکھایا جیسے مَیں ان کا بیٹا ہوں۔ میں تمام زندگی ان کا احسان مند رہوں گا۔ انہوں نے مجھے اتنا مشاق اور جفاکش بنا دیا کہ میری کمپنی نے ۵۷-۱۹۵۶ء کے تمام سرمائی پٹرولنگ مقابلے بڑی آسانی سے جیت لئے۔

میری دلچسپی کا دُوسرا مرکز جوان اور ان کی زندگی کا مطالعہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح میں ہی شعوری طور پر ان کا مطالعہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ بھی غیر شعوری طور پر مجھے پرکھ رہے تھے۔ اور سمجھ رہے تھے۔ میری اپنی زندگی بھی ان کے سامنے تھی۔ اس طرح ایک دوسرے کو ہم خوب جان پہچان گئے تھے۔ اگر میں کہوں کہ میرے جوان لاشعوری طور پر میری بات ماننے لگے تھے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ اس کی ایک مثال مجھے اس وقت یاد آرہی ہے۔ ایک بار ہم کوئٹہ کے قریب کول پور کے علاقے میں اجتماعی مشقیں کر رہے تھے کہ ایک جوان جو بڑا تنومند انفلیٹ تھا۔ یکایک اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ اس نے رائفل پر برچھی لگا دی۔ وہ بڑے جارحانہ مُوڈ میں تھا۔ شام کا وقت تھا۔ کمانڈنگ افسر بھی موجود تھے۔ سب لوگ پریشان تھے کہ ایسی صُورت میں اس دیوانے سے کون نبٹے؟ کم از کم دو چار کا زخمی ہونا یقینی تھا۔ میرا جب ادھر سے گزر ہوا تو صورتِ حال کی

نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے میں اس جوان کی طرف بڑے اطمینان سے بڑھنے لگا۔ میرے قریب پہنچنے پر اس نے مجھے فوراً سیلوٹ کیا۔ میں نے رائفل کی طرف اشارہ کیا اور اس نے رائفل چپکے سے میرے حوالے کردی۔ جیسے وہ موم کا بنا ہوا ہے۔ اس کا یہ تمام فعل لاشعوری تھا۔

نہ کوئی چھوٹے عہدے سے چھوٹا ہوجاتا ہے نہ بڑے عہدے سے بڑا

جوانوں کی طرف میرا رویہ ہمیشہ برادرانہ رہا ہے۔ فوجی خواہ وہ کسی عہدہ کا ہو سپاہی ہی ہوتا ہے۔ عہدوں کی تقسیم انتظامی ہوتی ہے۔ ذاتی نہیں۔ چھوٹے عہدہ سے نہ کوئی چھوٹا ہوجاتا ہے اور نہ بڑے عہدے سے بڑا۔ میرے والد، چچاؤں اور بہت سے رشتے داروں اور گاؤں کے بہت سے دوستوں نے رینکس میں ملازمت کی ہے۔ اس پر میں کبھی شرمندہ نہیں ہوا اور نہ افسری پر کسی برتری کا احساس ہوا۔ اس رویہ نے مجھے آگے چل کر جنگ کے زمانے میں بڑی مدد دی۔

۵۸ء میں ہماری بٹالین اتھلیٹک مقابلوں میں حصہ لے رہی تھی۔ فائنل مقابلے سے چند روز پہلے ہماری بٹالین کا بہترین دوڑ باز زخمی ہوگیا۔ کوئی اور نہیں تھا اور مقابلے میں حصہ بھی لینا ضرور تھا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں زخمی دوڑ باز کی جگہ دوڑوں۔ میرے حریفوں میں سے تین قومی کلر یافتہ تھے۔ اور مشہور قومی اور ایشیائی چیمپئن عبدالخالق کے بعد بہترین دوڑ باز شمار ہوتے تھے۔ جتنا وقت باقی تھا۔ میں نے تھوڑی بہت مشق کی۔ بہرحال جب دوڑ ہوئی تو خدا کے کرم سے میں ۱۰۰ میٹرز میں اوّل اور ۲۰۰ میٹرز میں دوم آیا۔ اور لانگ جمپ میں بھی مجھے دوسری پوزیشن ملی۔ پہلی پوزیشن محمد خان کی تھی۔ جو لانگ جمپ میں وقت کا قومی چیمپئن تھا۔ بی۔ایم۔اے سے فارغ ہونے کے بعد دوڑوں میں حصہ لینے کا میرا پہلا موقعہ تھا۔ اس کارکردگی سے

خود مجھے بھی حیرت ہوئی۔ میرے دوستوں اور مداحوں نے کہا۔ سلطان تم چاہو تو پریکٹس کر کے عبدالخالق کی جگہ لے سکتے ہو جو ریٹائر ہونے کے بارے میں سوچ رہے تھے میں نے کہا نہیں۔ میری منزل کہیں اور ہے۔ مجھے اپنے زورِ بازو کو میدانِ کارزار میں آزمانا ہے۔

جسم و جاں کا رشتہ

اس کے بعد بٹالین جیسور مشرقی پاکستان میں منتقل ہو گئی۔ اس وقت تک ۸ بلوچ سے میرا جسم و جان کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت ۸ بلوچ میں مجھے ذوالفقار اور مشتاق ایسے معرکے کے ساتھی افسروں کی رفاقت میسّر تھی۔ جن کی وجہ سے یونٹ اپنی کارکردگی کی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر کرنل سعادت نے ہم سے کہا۔ آپ لوگ ٹریننگ اور اسپورٹس پر ساری توجہ مرکوز کر دیں۔ یہ تو ہمارے دل کی بات تھی۔ ہم ٹریننگ میں اس طرح ڈوبے کہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ سوائے دو برس میں ایک بار کے ہم نے کبھی شہر کا رُخ ہی نہیں کیا۔ تمام دن اور پھر رات گئے تک ہم لوگ کام میں جتے رہتے۔ پھر جب رات بھیگنے لگتی تو آفیسرز ایک ایک کر کے اُٹھتے۔ سب سے آخر میں اُٹھنے والا ذوالفقار ہوتا۔ وہ اور میں منصوبے بناتے اور ان پر بحث کرتے رہتے۔ جنون کی حد تک یہ تمام کارروائی ہمارے لئے جنگ کا ریہرسل تھی۔ اس لئے ہم اس میں مگن رہتے تھے۔ اس ارتکاز کا فوری نتیجہ بھی بہت شاندار رہا۔ کراس کنٹری دوڑ میں ہر یونٹ سے ۶ دوڑنے والوں نے حصّہ لیا تھا۔ اس مقابلہ میں پہلی پانچ اور نویں پوزیشن ہماری یونٹ کی تھی باکسنگ کے سولہ مقابلوں میں سے تیرہ ہم نے ناک آؤٹ پر جیتے اور دو پوائنٹس پر۔ اور سولھواں، ہمارا نامی گرامی تین بار کا ہیوی ویٹ میں ایشیا کا طلائی تمغہ باکسر برکت تھا

جن کے مد مقابل نے بیمار بن کر اپنی جان چھڑالی تھی۔ اور کشتی میں تمام جیتنے والے اور آٹھ میں سے سات رنرز اپ ہمارے جوان تھے۔ ان کامیابیوں اور کامرانیوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری یونٹ کی لڑنے کی صلاحیت اور تیاری کس درجہ اور معیار کی تھی۔ ہماری کیفیت ان شیروں کی سی تھی جو شکار پر جھپٹ پڑنے کے لئے بے چین ادھر اُدھر پھرتے ہیں۔ جب چند سال کے بعد ۶۵ء کی جنگ چھڑی تو ہم کھل اُٹھے۔ کہ اب وہ وقت آن پہنچا جس کی تیاری اور تلاش برسوں سے تھی۔

ایک عملی مذاق

تفریح و تفنن بھی زندگی کا نمک ہے۔ اس کے بغیر بھی کام نہیں چلتا۔ جون جولائی تک یہ مقابلے ختم ہو چکے تھے۔ اور ان کے انعامات ہمارے بٹالین دفتر میں سجے تھے کہ ہمیں بلکہ مجھے ایک شرارت سی سوجھی۔ ہمارے ایک بڑے پکی عمر کے میجر تھے جن کا نام "ک" سے شروع ہوتا تھا۔ یوں تو خاصے دلیر تھے لیکن نہ جانے کیوں سانپ کے نام سے ہی ان کی جان جاتی تھی۔ اور ایسٹ پاکستان تو آپ جانتے ہیں کہ پانی سبزہ اور سانپوں کا خطہ ہے۔ اس لئے وہ سانپوں کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ ہمیں ان کی اس مخصوص کمزوری کا علم تھا۔ وہ حضرت غیر شادی شدہ تھے۔ افسروں کے مکانوں میں ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ ہم جوانوں کی رہائش گاہ اور ان کے کوارٹر کے درمیان ایک زنگ آلود لوہے کی چادر تھی۔ دوپہر رات گزرنے کے بعد مَیں نے اپنے نوجوان دوستوں سے کہا وہ اپنے بھاری بوٹ لائیں اور لوہے کی دیوار کو زور زور سے پیٹیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لوہے کی چادر کچھ دیر بعد بھاری بوٹوں کی ضربوں کی تاب نہ لاکر بیٹھ گئی۔ تمام علاقے کو خبر ہو گئی کہ بہت بڑا سانپ مارا جا رہا ہے لیکن میجر صاحب اپنے کمرے سے نہیں نکلے۔ لوہے کی چادر کا پردہ گرنے کے بعد

ہم خود ان کے صحن میں سے ہوتے ۔ ان کے برآمدے میں پہنچے دروازہ کھلا تھا۔روشنی ہو رہی تھی ۔ مچھر دانی کے اندر ہی سے بولے ۔ سانپ مرگیا ۔ ہم نے کہا بچ نکلا۔ کہنے لگے خدا خیر کرے ۔ پھر کہا تم لوگ آئے تو بے وقت ہو کچھ کھاؤ پیو۔ الماری میں شاید کچھ ہو۔ الماری کھولی تو اس میں کچھ نہیں، بہت کچھ تھا ۔ ہم سے جتنا ہو سکا اس سے جلدی جلدی انصاف کیا اور وہ ہمیں سانپوں کے بادشاہ مہاپدم کی کہانی سنانے لگے جس کے سر پر چھوٹا سا تاج ہوتا ہے ۔ اور جس کا کاٹا پانی تو کیا مانگتا خود پانی ہو جاتا ہے ۔

۱۹۶۱ء کی آزمائش

۱۹۶۱ء میں ۸ بلوچ سیالکوٹ گئی ۔ اس زمانے میں چھروا کے مقام پر سرحدی تنازعہ چل رہا تھا ۔ ہماری سرزمین کے ایک ٹکڑے پر ہندوستان نے دعویٰ کر رکھا تھا ۔ اس ٹکڑے کے دفاع کے لئے کئی دستے بھیجے گئے ۔ لیکن کوشش کے باوجود ۸ بلوچ کو سرحد پر جانے کا موقعہ نہیں ملا ۔ حالانکہ ساری بٹالین معرکہ آرائی کے لئے بے چین تھی ۔ میں نے بار بار اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر وہاں جانے کے لئے پیش کیا ۔ اور بہت اصرار کے ساتھ آخر کار مجھے سرحد پر دفاعی دستوں کے ساتھ شریک ہونے کی اجازت دے دی گئی ۔ متنازعہ علاقہ کے دفاع کے لئے ہم مورچہ بند تھے ۔ کوئی تصادم نہیں ہوا تھا لیکن ہندوستانی تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد اس علاقے میں مشین گن سے فائر کرتے رہتے تھے ۔ لیکن ہم اس سے چنداں خوف زدہ نہ تھے ۔ بلکہ بے خوفی کے مظاہرے بھی کرتے تھے ۔

وضاحت اس بات کی یہ ہے کہ ہم چند نوجوان افسروں نے کیپٹن ناصر ایف ایف، کیپٹن فیاض بلوچ اور میں نے ایک ہابی سی بنا رکھی تھی کہ ہم مورچوں سے باہر آکے

کھلے آسمان کے نیچے گھومتے پھرتے تھے۔ اور سگریٹ پیتے تھے۔ صرف یہ دکھانے کیلئے دیکھو ہم تمہاری گولیوں سے ڈرنے والی چیز نہیں۔ میں نے چرواچوکی پر چند ہفتے ہی گزارے تھے کہ مجھے کھاریاں میں جنرل رانا کے صدر دفتر میں پوسٹ کر دیا گیا۔ اپریل ۱۹۶۴ء تک میں یہیں رہا۔ اس وقت تک میری یونٹ ۸ بلوچ کشمیر پہنچ چکی تھی اور میری خواہش تھی کہ میں جلد سے جلد یونٹ کے پاس پہنچوں اور بہت جلد اس کا موقعہ مل گیا۔

۱۹۶۵ء کی تگ و تاز

۱۹۶۵ء میں ہندوستانی کشمیر میں فائر بندی لائن کے ساتھ ساتھ بہت گڑ بڑ کرتے تھے۔ اور اس کے جواب میں میں نے سوسے اُوپر تادیبی کارروائیاں کیں جن کی تفصیل میری داستان تگ و تاز بعنوان "داستان جرأت" میں بیان کی گئی ہے یہاں اتنا کہنا کافی ہو گا کہ اس عرصے میں جس جس طرح اور جتنی بار میں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنے بازو آزمائے۔ اتنا موقعہ شاید ہی کبھی کسی کو ملا ہو۔ کم از کم میرے علم میں نہیں۔ ہر کارروائی میں ہر بار میں سب سے آگے ہوتا تھا۔

پاکستانی سپاہی

مثل مشہور ہے کہ سونے کا حال کٹھالی میں کھلتا ہے۔ یہی بات سپاہی پر بھی صادق آتی ہے۔ سپاہی کا کھرا کھوٹا پن بھی جنگ کی آنچ میں کھلتا ہے۔ میں نے دو جنگوں اور انتہائی صبر آزما حالات میں پاکستانی سپاہی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس تجربے کی بنا پر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ پاکستانی سپاہی سوچ سمجھ کر لڑتا ہے۔ دلیری سے لڑتا ہے۔ اور وہ لڑائی میں فراخ دل اور فیاض ہوتا ہے

لڑائی میں فراخ دلی اور فیاضی دکھانا آسان کام نہیں ہے۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جو دوسرے ملکوں کے سپاہیوں میں کمیاب ہے۔ پاکستانی سپاہی کے عزم اور حوصلے اور دل کو دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں پاکستان کا دفاع پاکستانی سپاہی کے ہاتھ میں محفوظ ہے، مَیں نے پاکستانی سپاہی کو ۶۵ء میں کشمیر میں اور ۷۱ء میں کمال پور اور جمال پور کے معرکوں میں دیکھا۔ اِس ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ پاکستانی سپاہی ناقابلِ تسخیر ہے

توقعات کا حصار

ہر کارروائی میں میرا اصول یہ تھا کہ سوچ سمجھ کر انتہائی جرأت مندانہ قدم اُٹھایا جائے۔ ایسا کہ دُشمن بھی حیران رہ جائے۔ لڑائی میں دشمن کی توقعات کے حصار کو توڑنا پڑتا ہے۔ جو جواں مرد اس مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ وہی قبیلے کی آنکھ کا تارا بنتا ہے۔

میری پیہم کامیابیوں نے جنگ بندی لکیر کے دونوں طرف کے لوگوں کو متاثر کیا۔ ہمارے آدمیوں کا حوصلہ اِتنا بلند ہوا کہ وہ بڑی تعداد میں رضاکارانہ مِشن پر جانے پر تیار ہو گئے لیکن دشمن کا حوصلہ پست سے پست تر ہوتا گیا۔ اِن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ میری تگ و تاز سے کیسے نپٹیں۔ سیدھی سی بات ہے جو موت سے نہ ڈرتا ہو اس سے نپٹنا آسان نہیں ہوتا۔

عزّت ہی نہیں محبّت بھی

جو اِنسان بھی مرنے کے لئے تیار ہو وہ بڑے سے بڑا خطرناک کام کر سکتا ہے۔ یہی راز تھا میری کامیابیوں کا۔ مقامی کشمیری مسلمان مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے تھے۔ اسی لئے وہ میری عزّت ہی نہیں کرتے تھے۔ مُجھ سے محبّت بھی کرنے لگے تھے۔

مجھے اس سے پہلے تھوڑی بہت عزت حاصل ہونے کا تجربہ تھا لیکن کشمیر میں مجاہدانہ سرگرمیوں کے بعد جو مجھے محبت ملی۔ اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ بہت سوچ سمجھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عزت حاصل کرنا آسان ہے لیکن لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا مشکل ہے اور بہت مشکل ہے۔ لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کا راستہ خدمت، احسان اور ایثار کے سے خارزاروں اور ریگ زاروں سے گزرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بچے تعلق اور لاتعلقی، کو محبت اور نفرت کو سونگھ لیتے ہیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ یہ بات بڑوں پر بھی صادق آتی ہے ہر زمانے میں، خاص طور پر لڑائی میں کماندار آئینہ ہوتا ہے جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے وہ جوانوں کو دور سے نظر آجاتا ہے۔ لڑائی میں کوئی کسی کو بلف نہیں کرتا، کر ہی نہیں سکتا۔ میدانِ جنگ میں جہاں موت کی پھڑپھڑاہٹ ہر ایک کو بہت قریب سے سنائی دیتی ہے۔ ہر ایک کی حسیات بہت تیز ہو جاتی ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ محبت وعقیدت کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ اس طرح کا ایک واقعہ میری زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ ایک دن میرے کیمپ میں ایک بوڑھا کشمیری آیا۔ اس نے کہا بیٹے۔ میں نے تمہیں کلسیاں کے مقام پر لڑتے دیکھا۔ تم نے بہت تھوڑے آدمیوں سے دشمن کی کثیر تعداد کے چھکے چھڑا دیئے میرا دل خوش ہو گیا پاکستان میں کیسے کیسے مجاہد ہیں۔ دعائیں تو میں تمہیں اور تمہارے جوانوں کو بہت دیتا ہوں لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ میں کسی طرح تمہاری خاطر تواضع کروں۔ یہ کہہ کر اس بوڑھے کشمیری نے اپنی چادر کے اندر سے تین بوتلیں نکالیں اور پھر کہنے لگا "یہ خاص کشمیری شربت ہے۔ پھولوں اور پھلوں کا رس یہ تحفہ ہے میری طرف سے اور تمام کشمیریوں کی طرف سے۔ جن کے لئے آپ جان کی بازی لگا کر یہ جدوجہد کر رہے ہیں" لڑائی آخر لڑائی ہوتی ہے اس میں مرنا مارنا لگا رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان معرکوں میں ہمارا جانی نقصان بہت کم ہوتا تھا۔ اگر کبھی ہمارے دو چار جوان زخمی یا شہید ہو جاتے تو

میں خود آدمیوں کو لے کر جاتا اور زخمی یا شہیدوں کو اپنی پوزیشن پر لاتا۔ اور ضروری کارروائی کرتا۔ ایسا کرنا میری عادت تھی۔ اس عادت نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ اس وجہ سے میرے جوانوں کو مجھ پر بے انتہا اعتماد ہو گیا تھا کہ ہمارا افسر ہمیں دشمن کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گا۔ لڑائی میں سارا کھیل اعتماد کا ہوتا ہے جتنا جتنا دباؤ بڑھتا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے رسمی ڈسپلن کی گرفت ڈھیلی پڑتی جاتی ہے اور ایک وقت وہ آتا ہے جب جوان پی ایم ایل کے ڈر سے نہیں اپنی مرضی سے لڑتا ہے یا نہیں لڑتا۔

کمانڈو ایکشن کی نفسیات

کمانڈو ایکشن کے بارے میں عام لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ محض دیوانہ وار جرأت اور حوصلے کا کام ہے۔ اصولاً یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ حقیقت کا صرف ایک رُخ ہے۔ واقعہ یہ ہے کمانڈو اور گوریلا جنگ میں منصوبہ بندی، اور ریکی کی ضرورت روایتی جنگ سے زیادہ ہوتی ہے۔ میرا ایک اصول یہ تھا کہ ہر مہم سے پہلے میں کافی وقت بلکہ بہت زیادہ وقت منصوبہ بندی، دیکھ بھال کی گشت (ریکی) میں صرف کرتا تھا۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہوتا تھا۔ کہ مہم میں کامیابی اور اپنے جوانوں کے تحفظ کے لئے کون کون سے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ جان بڑی قیمتی شے ہے۔ بے ضرورت اپنے آپ کو یا اپنے آدمیوں کو خطرے میں ڈالنا بہادری نہیں بیوقوفی ہے۔ اس لئے میں منصوبہ بندی اور ریکی میں کئی کئی دن اور راتیں بغیر سوئے اور آرام کئے گزار دیتا تھا۔ یہ مشقت اصل معرکے میں بہت مفید ثابت ہوتی تھی۔

زیادہ خطرے کی جگہ عموماً فیصلہ کن جگہ ہوتی ہے

مَیں نے بار بار بلکہ بیسوں بار براہِ راست لڑائی میں حصّہ لیا ہے۔ میرے تجربے کا

پہلا نکتہ یہ ہے کہ کمانڈر کو سب سے زیادہ خطرناک جگہ پر بذاتِ خود موجود ہونا چاہیئے۔ میں نے اپنے مطالعہ، مشاہدہ، اور تجربے سے ایک چھٹی حس پیدا کرلی تھی۔ مجھے جیسے لاشعوری طور پر احساس ہو جاتا تھا کہ اس مہم میں سب سے زیادہ خطرہ کہاں ہے۔ عموماً زیادہ خطرہ کی جگہ، ہی لڑائی میں فیصلہ کن جگہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر ایسے موقعہ پر ہر بار میں خود موجود ہوتا تھا۔

کلسیان کا معرکہ

کلسیان کے معرکہ میں، میں اپنے جوانوں کے ساتھ ٹھیک دُشمن کے سر پر جا پہنچا۔ ہم اِس اطمینان سے اور اس لاپرواہی سے دشمن کی طرف بڑھ رہے تھے کہ جیسے ہم کوئی غیر نہیں۔ چنانچہ دشمن نے ہمیں بے فکری سے اپنے اندر آنے دیا۔ پھر جو ہم نے کرنا تھا کیا اس مہم میں بھی میں سب سے آگے تھا۔ لڑائی کا نکتہ یہی ہے کہ اگر آپ آگے ہیں تو بزدل سے بزدل اِنسان بھی آپ کے پیچھے پیچھے قدم بڑھائے چلا آئے گا۔

اپرلی کیرالی کے معرکے میں بھی یہی ہوا۔ دشمن ایک پہاڑی پر تھا۔ اس نے ایک مشین گن پہاڑی کی عین چوٹی پر لگا رکھی تھی وہاں تک پہنچنا اور مشین گن کو تباہ کرنا مشکل ترین کام تھا۔ میں نے اس نشانہ کو اپنے لئے چنا اور کامیاب ہوا۔ اور نسبتاً آسان پوزیشنیں اپنے جوانوں کو دیں۔ اسی طرح جب کبھی بارودی سرنگوں کے علاقے سے گزرنا ہوتا اور ایسا اکثر کرنا پڑتا۔ تو سب سے پہلا قدم میرا ہوتا تھا۔ میرے نقش قدم پر دوسرے آتے تھے۔ جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ لڑائی کا سارا کھل جا سم سم یہی ہے کہ لیڈر واقعی لیڈ کرے جو سینیئر ہے وہ واقعی ہر خطرہ میں، ہر مشکل میں اپنی سنیارٹی کا عملی ثبوت دے۔ میرا زندگی کا تجربہ ہے کہ لوگ بڑی خوشی سے پیچھے چلتے ہیں، اطاعت کرتے ہیں۔ جان دیتے ہیں، بشرطیکہ کوئی اپنی مثال سے ان کے لہو کو گرما دے۔

کمانڈر کا دوسرا نکتہ

جنگ کی کمان کے سلسلہ میں میرا دوسرا تجربہ یہ ہے کہ کمانڈر کو اپنے ذاتی تحفظ کے سلسلے میں زیادہ محتاط نہیں ہونا چاہیئے۔ زیادہ احتیاط کو دوسرے بُزدلی سمجھنے لگتے ہیں۔ میرا طریق کار یہ تھا کہ میں اپنے جوانوں کے تحفظ کے لئے انتہا درجہ کی احتیاط اور منصوبہ بندی سے کام لیتا تھا۔ جبکہ میں اپنے ذاتی تحفظ کے بارے میں اتنا محتاط نہیں تھا۔ وجہ یہ کہ لڑائی کام ہی جان جوکھوں کا ہے۔ جو کمانڈر سوچا سمجھا خطرہ مول نہیں لے سکتا وہ لڑائی میں سُرخ رُو نہیں ہوسکتا۔ غالب کا ایک مصرعہ ہے۔

ع جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

جب تک لڑنے والے کی یہ ذہنی کیفیت نہ ہو وہ دلاوری سے لڑ نہیں سکتا۔

ہاں تو مَیں کہہ رہا تھا کہ کشمیر کی لڑائی میں جہاں مجھے بے شمار کمانڈو ایکشن کرنا پڑے مَیں نے اپنی عادت بنا لی تھی کہ جب بھی کہیں حملہ کرنا ہوتا اور دشمن فائر کھولتا تو میں اپنے جوانوں کو حکم دیتا کہ وہ بہت احتیاط سے باڑوں میں چُھپ چُھپ کر اور جُھک جُھک کر آگے بڑھیں لیکن میں ہمیشہ سیدھا کھڑا ہوتا۔ جب کبھی دشمن ہماری پوزیشن پر بمباری کرتا یا توپوں سے حملہ کرتا تو میں بلا استثنیٰ مورچے سے باہر رہتا۔ تاکہ میں میدانِ جنگ کا جائزہ بہتر طور پر لے سکوں اور صحیح احکامات دے سکوں۔ خندق میں انسان محفوظ تو ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی محصور بھی ہو جاتا ہے۔ وقت پر ضروری جوابی کارروائی نہیں کر سکتا۔ مورچے سے باہر رہنے کا ایک مقصد اور بھی تھا کہ میرے ساتھی اور جوان مجھے دیکھ لیں کہ ان کے کمانڈر کا مورال کیا ہے۔ میدان جنگ کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ جوان کی نظر کمانڈر پر ہوتی ہے۔ وہ اس کے ہر موڈ سے دوگنا اثر قبول کرتا ہے۔ اور اس کی حسیات اتنی تیز ہو جاتی ہیں کہ وہ کمانڈر کے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی جذباتی لہروں کو پڑھ لیتا ہے۔

مورچے سے باہر رہنے میں جو شدید خطرہ ہوتا ہے اس کا احساس ضرور ہوتا تھا لیکن مجھے یہ یقین بھی ہوتا تھا کہ اگر خدا کو میری موت اب اور اس جگہ منظور نہیں تو بڑے سے بڑا خطرہ میرا بال بیکا نہیں کرسکتا۔ ایک بار نہیں کئی بار میں معجزاتی طور پر موت کے منہ سے بچا۔ اب جب کبھی میں ان حالات کے بارے میں سوچتا ہوں تو حیرت زدہ رہ جاتا ہوں کہ میں بچا کیسے۔ خدا بڑا حیّ اور قیّوم ہے۔

لڑائی میں تیسری چیز جو میرے کام آئی وہ میری جسمانی توانائی اور قوتِ برداشت تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کمیشن کے فوراً بعد میری جسمانی تاب و توانائی کا عالم یہ تھا کہ سپورٹس میں قومی ٹیم میں شریک ہوسکتا تھا لیکن میں نے تلوار کے پیشے سے وابستہ رہنا زیادہ مناسب سمجھا اور میرا یہ فیصلہ غلط نہ تھا۔ لیکن جو توانائی اور قوتِ برداشت میں نوجوانی میں پیدا کر چکا تھا وہ ۱۹۶۵ء کی تگ و تاز میں میرے کام آئی۔ مسلسل سخت کوشی کی زندگی نے مجھے اس قابل بنا دیا تھا کہ ایک لمبی تکلیف دہ مارچ جو ایک اوسط درجے کے سپاہی کو بے حال کر دیتی تھی۔ میرے لئے ایک خوشگوار چہل قدمی سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ میں ایسے موقعوں پر دوسرے تھکے ہوئے جوانوں کا بوجھ اُٹھا لیا کرتا تھا۔ (جوان ایسے افسر پر جان چھڑکتے ہیں جو مشکل وقت میں ان کی مدد کرے) سخت مشقت کے بعد جسمانی طور پر چاق و چوبند رہ سکتے میں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ میں ذہنی طور پر بھی تازہ ہوتا تھا۔ اور جنگی صورتِ حال کا بیدار ذہن سے جائزہ لے کر صحیح احکامات دے سکتا اور صحیح اقدامات کرسکتا تھا۔ امتیازی سند ہو یا ستارۂ جرأت اصل میں، میں اس طرح کے ذاتی اعزازات کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے میں اپنے سینیئرز سے کہا کرتا آپ لوگ بار بار میرے لئے اعزازات کی سفارش نہ کریں۔ میں ذاتی ایوارڈ کے لئے نہیں، قومی مفاد کے لئے جدوجہد کرتا ہوں۔ اگر میں بار بار اس خواہش کا اظہار نہ کرتا تو شاید کئی اور اعزازات مجھے مل سکتے تھے۔ اس کے باوجود، سرکاری کاغذات میں تو اتنے

میرا تذکرہ آیا۔ جنگ کے بعد میرے کمانڈنگ افسر نے ایک سرکاری رپورٹ میں میرے بارے میں لکھا :

اور یہ افسر ایک چیتے کی طرح لڑتا ہے

ستارۂ جرأت کا فرمان

جب ستمبر ۶۵ء کی جنگ چھڑی تو پی اے ۸۷۱۵ کیپٹن سلطان احمد ۸ بلوچ کی اے کمپنی کی کمان کر رہے تھے۔ جو ان دنوں ۱۰ اے کے انفنٹری بٹالین کے ساتھ منسلک تھی۔ اور اری پونچھ روڈ کے دونوں طرف دفاعی مورچہ بندی کئے ہوئے تھی۔

۴ ستمبر ۶۵ء سے ۹ ستمبر ۶۵ء تک دشمن نے اس کمپنی کو یہاں سے ہٹانے کیلئے مسلسل اور شدید دباؤ ڈالا۔ کمپنی کے مورچوں پر تقریباً ہر وقت گولہ باری ہوتی رہتی تھی۔ دشمن کی اس کارروائی سے ہراساں ہوئے بغیر کیپٹن سلطان نے یہ جرأت مندانہ اقدام کیا کہ الٹے دشمن کے علاقے میں جارحانہ انداز میں پٹرولنگ شروع کر دی۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے کمانڈو دستے بھیجتے تھے جو دشمن کی صفوں کے قریب جا کر اس پر چھاپے مارتے تھے۔ یا شب خون مارتے تھے۔

۶ ستمبر ۶۵ء کو کیپٹن سلطان نے دشمن کی دفاعی صفوں کے بہت نزدیک جا کر دشمن کی ایک کمپنی پر کامیاب چھاپہ مارا یہ کمپنی ان کے دائیں بازو کی طرف بڑھ رہی تھی دشمن اتنے قریب سے حملے سے بالکل ششدر رہ گیا اور اس کے تیس سپاہی کام آئے۔ اتنا کامیاب چھاپہ مارنے کے بعد کیپٹن سلطان حفاظتی دستے (کورنگ گروپ) کے ساتھ اس وقت تک دشمن کے علاقے میں رہے۔ جب تک ان کے اپنے سارے آدمی اپنے مورچوں تک واپس نہ چلے گئے۔

۷ ستمبر کو دشمن نے کیپٹن سلطان کی کمپنی کے بائیں بازو پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔

انہوں نے دشمن کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اس کشمکش میں پھر دشمن کے بیس سپاہی کھیت رہے۔

۹ ستمبر کو دشمن نے دونوں بازوؤں کی طرف سے اور توپ خانے کی مدد سے حملہ شروع کیا۔ دشمن نے اپنی توپیں ایک اُونچی پہاڑی پر نصب کر رکھی تھیں، جہاں سے نشانہ پر فائر آرہا تھا۔ اس کے باوجود کیپٹن سلطان نے دشمن کے پہلے دو حملے پسپا کر دیئے۔ تیسرے طوفانی حملے میں دشمن ان کی کمپنی کے دائیں بازو کے ایک سیکشن کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ دشمن وہاں اپنے قدم جما سکتا۔ کیپٹن سلطان نے جوابی حملے کی بنفس نفیس قیادت کی اور اپنے سیکشن کی اس پوزیشن کو دشمن کے قبضے سے چھڑا لیا۔

اس روز کی معرکہ آرائی کی وجہ سے کیپٹن سلطان کی کمپنی کا گولہ بارود ختم ہو گیا۔ جس کی وجہ سے دشمن کو ان کی کمپنی کو تین طرف سے گھیرے میں لینے کا موقعہ مل گیا۔ کیپٹن کے ذاتی ہتھیار بھی گولیوں سے خالی ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے دشمن کے مقتول سپاہیوں کے اسلحے سے لڑائی جاری رکھی۔ اس معرکے میں دشمن کے تین سو سپاہی مارے گئے۔ ان میں سے تیس خود کمپنی کمانڈر کیپٹن سلطان کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان میں سے چار کا تو انہوں نے بندوق کی سنگین سے کام تمام کیا تھا۔ اور جب کمپنی کو دوسری دفاعی لائن تک پیچھے ہٹنے کا حکم ملا تو کیپٹن سلطان حفاظتی دستے (کورنگ گروپ) کے ساتھ وہاں ٹھہرے رہے اور اپنی کمپنی کو اپنے سیکنڈ ان کمانڈ کے ساتھ پیچھے بھیجا۔

کیپٹن سلطان نے اپنے دستے سے پندرہ قیمتی منٹ تک دشمن کو اُلجھائے رکھا۔ اس وقت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے باقی کمپنی اپنے زخمیوں کو لے کر نہایت منظم طریقے سے اپنی دوسری دفاعی لائن تک پہنچ گئی۔ سب سے آخر میں کیپٹن سلطان اپنے کورنگ گروپ کے ساتھ پیچھے آئے اور آتے وقت اپنے شہیدوں اور زخمیوں کے ہتھیار بھی

لیتے آئے ۔ ۸ بلوچ کی اس کمپنی کا اتنا کامیاب انخلاء اس لئے ممکن ہو سکا کہ اس کے کمانڈر کیپٹن سلطان نے کورنگ گروپ کے ساتھ خود پیچھے رہے اور دشمن کو اُلجھائے رکھنے کا جرأت مندانہ فیصلہ کیا تھا۔

اس تمام معرکے میں اس افسر نے بے نظیر جرأت، جواں مردی، جارحانہ تدبیرکاری اور اعلیٰ درجے کی قائدانہ صلاحیت کا ثبوت دیا اور ہر پُرخطر موقعہ پر خود سب سے آگے رہا۔ اس غیر معمولی کارکردگی کی بنأ پر کیپٹن سلطان احمد کے لئے ستارۂ جرأت کے اعزاز کی سفارش کی جاتی ہے۔

اس ستارۂ جرأت کا اعلان ۹ مارچ ۱۹۶۶ء کو کیا گیا۔ اس پر بار کا اضافہ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد کی داستان

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد میں پی ایم اے میں ایک انسٹرکٹر کی حیثیت سے پوسٹ ہوا۔ اس تقرر سے میری مدتوں کی آرزو بر آئی۔ یہ کہ میں ہونہار افسروں کو اپنے تجربے کی بنأ پر یہ بتا سکوں کہ جنگ میں کامیابی کے لئے کن صفات اور رویوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پی ایم اے میں چند سال گزارنے کے بعد میں ۱۹۶۹ء میں اسٹاف کالج کوئٹہ گیا۔ سرراہ میں یہ بتا تا چلوں کہ اسٹاف کالج میں داخلے کے امتحان میں میں نے اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ اسٹاف کالج کے بعد میں برگیڈ میجر کے طور پر کومیلا پوسٹ ہوا۔ ہمارے برگیڈ کی مختصر سی نفری کے سپرد بہت بڑی ذمّہ داری تھی۔ جو سلہٹ کومیلا، نواکھلی، چٹاگانگ اور کوہستان چٹاگانگ کے اضلاع پر مشتمل سارا مشرقی علاقہ ہمارے برگیڈ کے زیرِ دفاع تھا۔ یہ ہمارے برگیڈ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے برگیڈیئر اقبال شفیع جیسے، روشن دماغ، دیانت دار اور دلیر کمانڈر کی قیادت میسر تھی۔ سُنتے آئے تھے کہ قائد کے

قائدانہ قد اور صلاحیت سے بہت کچھ فرق پڑتا ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں بہت جلد مل گیا۔ مشرقی پاکستان میں حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے اور ان کے نتائج کو سمجھنا مشکل نہ تھا۔ بریگیڈیئر اقبال شفیع نے اپنے افسروں کو بلایا اور انہیں صُورتِ حال سے آگاہ کیا اور ہر ایک کو اس کی ذمّہ داری کی نوعیت بتائی۔ میں چونکہ ہیڈ کوارٹر میں بریگیڈ میجر تھا اس لئے میری ذمّہ داریوں کا دائرہ نسبتاً وسیع تھا۔ مجھے میری چھٹی حِس نے بتا دیا تھا کہ ہم اپنی تاریخ کے ایک نازک موڑ پر آنے لگے ہیں اس لئے ہر شخص کو کمر کس لینی چاہیئے اور اپنی سی کرنے میں کسر نہیں چھوڑنی چاہیئے۔

اب تو وہ ورق ہی اُلٹ چکا ہے وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ اس لئے اپنی تعریف کے طور پر نہیں بلکہ امر واقعہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں تاکہ تاریخ میں محفوظ رہے کہ ہم نے مشرقی پاکستان میں کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔

آپ یقین کیجیئے کہ ایک ہفتہ میں کم از کم تین بار ایسا ہوتا تھا کہ میں صبح ۷ بجے سے دوسرے روز چھ بجے تک دفتر میں کام کرتا تھا۔ تیئیس گھنٹے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی۔ کہ اپنی توانائی کے ذرّے ذرّے سے مجھے کام لینا پڑا۔ اتنے وسیع علاقے کا دفاعی منصوبہ وضع کرنے کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ اس علاقے کے زمینی کوائف کا پُورا علم حاصل کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس مرحلے سے گزر سکا۔ اِس علاقے کو جاننے کا جو ذریعہ بھی تھا۔ مقامی ذرائع معلومات، انٹیلی جنس اور مطبوعہ مواد، ہوائی جہاز، کشتی، گاڑی سے سفر، ذاتی مشاہدہ ان سب سے میں نے فائدہ اُٹھایا۔ آخر کار اس علاقے کا کوئی دریا یہاڑ کیا نالہ، ٹیلہ، جنگل، پل گاؤں، دلدل، تالاب، غرض کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس سے مَیں واقف نہ ہو گیا ہوں اور نقشے پر جس کا میں نے نشان نہ لگا دیا ہو۔ غالباً دوست دشمن، اپنے غیروں میں کوئی اور ایسا آدمی نہ تھا جو اس علاقے کے چپے چپے سے ایسا واقف تھا جیسا میں ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مہم میں میں تنہا نہیں تھا۔ میرے ساتھ میرے جوان اور

رفیق کارافسر بھی تھے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ میرا پروجیکٹ تھا اور میری چھٹی حس بتارہی تھی کہ شاید بہت جلد ہمیں اِس قسم کی معلومات کی ضرورت پڑے ۔ میرا اشارہ ۱۹۷۱ء کے المناک واقعات و حادثات کی طرف بھی ہے اور اس سے پہلے جو آفت آئی اس کی طرف بھی۔ ۱۹۷۰ء کی گرمیوں میں مشرقی پاکستان میں قیامت کے سیلاب آئے ۔ ہمارے بریگیڈ کی ذمّہ داری کا علاقہ خاص طور پر متاثر ہوا۔ سیلاب کی تباہ کاریوں کے بعد ریلیف آپریشن شروع ہوئے۔ چنانچہ پورا بریگیڈ حرکت میں آگیا۔ اور جس حد تک بھی انسانی ہاتھوں سے یہ کام ممکن تھا ہم نے کیا۔ بریگیڈ میجر کی حیثیت سے میری ذمّہ داری کا دائرہ بہت زیادہ پھیلا۔ مَیں اِس کام کو ایک چیلنج سمجھ کے کر رہا تھا اس کام کو میں نے کس طرح انجام دیا۔ اس کا اندازہ اس فقرے سے ہوگا جو میرے بریگیڈ کمانڈر نے ریلیف آپریشن کے قریب الختم ہونے پر کیا۔

"سلطان بہتر ہے کہ تم ایک ماہ کی چھٹی پر چلے جاؤ۔ کام کر کے تم اپنے آپ کو مار ڈالو گے" مثل مشہور ہے کہ جب تباہی آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی۔ ریلیف آپریشن سے فارغ ہو کر ابھی ہم نے چین کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ نومبر ۱۹۷۰ء میں سائیکلون کا عذاب نازل ہوگیا بلکہ قہرِ خداوندی ۔

ایک قہرِ خداوندی

جس نے اس سائیکلون کی تباہ کاریوں کو دیکھا ہے وہ یہی کہے گا۔ جو المناک مناظر ان گنہگار آنکھوں نے دیکھے انہیں میں بیان نہیں کرسکتا۔ بدقسمتی سے یہی زمانہ نومبر دسمبر ۱۹۷۰ء میں پاکستان میں انتخابات کی گہما گہمی کا بھی تھا۔ مفاد پرستوں نے سائیکلون کی تباہ کاریوں کو بھی مغربی پاکستان کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اس حرکت سے ہماری ذمّہ داریوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔ بہر حال لاکھوں آدمیوں کی آبادکاری اور ریلیف بڑا صبر و ہمّت آزما کام تھا۔ ایسے موقعوں پر سب سے بڑا مسئلہ انتظامی منصوبہ بندی کا ہوتا ہے۔ آب و باد کے طوفان کے بعد اب ریلیف کا طوفان

ہوا تھا۔ ہر طرف سے ریلیف کا سامان آ رہا تھا۔ دوست ملکوں، سعودی عرب، ایران، برطانیہ، امریکہ، فرانس اور جاپان سے ریلیف ٹیمیں پہنچ رہی تھیں۔ ان سب کارروائیوں کو منظم کرنا اور متاثرہ علاقوں میں ریلیف کا کام کرنا ہمارے دائرہ کار میں شامل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں اوقات کار کا کوئی تصور نہیں تھا۔ دن رات کا کام تھا۔ جس کو جب موقعہ ملتا دوڑتے بھاگتے کچھ کھا پی لیتا یا ایک آدھ گھنٹے وردی ہی میں بیٹھ کر یا لیٹ کر آرام کر لیتا۔ اس لامتناہی کام کے باوجود سب خوش تھے اور مطمئن تھے کہ ہم انسانیت اور قوم کیلئے کچھ کر رہے ہیں۔ انسان کی فطرت بھی کچھ عجیب ہے کہ وہ زندگی بھر آرام کی خواہش کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس کو حقیقی سکون آرام میں نہیں کام ہی میں ملتا ہے۔ یہی حال ہمارا تھا۔ امریکہ کے ہیلی کاپٹر ریلیف اسکواڈرن کے کمانڈر میجر ھال نے اخبار پاکستان ٹائمز کے نمائندہ کو بیان دیتے ہوئے کہا :

پاکستان آرمی کے جو افسر اور جوان اس ریلیف آپریشن میں لگے ہوئے ہیں ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ حد درجہ تندہی اور خلوص اور جانفشانی سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔" یہ سب کچھ کرنے کے باوجود ہم سیاسی طوفان کا رُخ نہ بدل سکے اور مشرقی پاکستان علیحدگی کے ناقابلِ تبدیل راستے پر چلتا رہا۔ لیکن انسانوں سے ہمدردی کر سکنا، ان کی تکلیفوں کو کم کر سکنا اور ان کے دُکھ درد میں ان کے کام آنا خود اپنا انعام ہے اور سب سے بڑی تسکین ہے۔ یہ اطمینان مجھے تھا اور اب بھی ہے۔ سرکاری کاغذات میں بھی بار بار میری فرض کی حدوں سے بہت آگے مخلصانہ جانفشانیوں کا تذکرہ آیا لیکن وہ ضمنی سی بات ہے۔

فضا میں بارود کی بُو

مشرقی پاکستان میں دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات جس فضا اور پس منظر میں ہوئے اس سے صاف نظر آ رہا تھا کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے۔ بغاوت اور بارود کی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی لیکن جب مارچ ۱۹۷۱ء میں بغاوت کا دھماکا ہوا تو وہ ہر شخص کی توقع سے بہت زیادہ اور بہت

بے رحم تھا۔ اس کا نشانہ سب سے زیادہ خود ہمارا گیریزن بنا۔ ہمارے گیریزن کے اندر بغاوت ہوئی۔ اس وقت گیریزن میں ہمارے پاس باقاعدہ انفنٹری نہیں تھی۔ بہرحال بغاوت کو فرو کرنا اور باغیوں کی دست و برد سے بچوں اور عورتوں کو بچانا ایک زبردست چیلنج بن گیا۔ سول وار میں اپنی کاوشوں کے بارے میں کچھ کہوں تو اچھا نہ لگے گا۔ اس لئے میں اپنے گیریزن کمانڈر (اور ایک نامور عالمگیرین) لیفٹیننٹ کرنل یعقوب ملک ستارہ جرأت کا ایک قول نقل کرتا ہوں۔ کرنل یعقوب ملک ستارۂ جرأت نے ایک کانفرنس کے دوران کہا :

ناقابلِ یقین حد تک ناساز گار حالات میں صرف چند سپاہیوں نے گیریزن کو اپنی جرأت، ہمت اور فراست سے بچا لیا۔ اور گیریزن کے تمام "بچے" عورتیں نہایت بے رحمی سے قتل ہو جانے سے محفوظ رہے۔ سلطان کے بغیر یہ معجزہ ممکن نہ ہوتا۔ سلطان کی ڈیوٹی کمانڈ پوسٹ میں تھی۔ اس فرض کو تو انہوں نے بڑی کامیابی سے انجام دیا ہی۔ اس کے علاوہ کمانڈ پوسٹ سے باہر ہر اہم معرکے میں بے جگری سے حصہ لیا۔ اور گیریزن کو تباہی سے بچانے میں خاطر خواہ مدد دی "باقاعدہ دستے نہ ہونے کے باوجود ہم نے گیریزن کو تو بچا لیا۔ لیکن ہم اب بھی محاصرہ میں تھے۔ کئی دن کے بعد ہوائی جہاز بچوں اور خواتین کے انخلأ کے لئے آئے محاصرہ کی حالت میں انخلأ کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ مزید برآں ایک پرواز کے بعد دوسری پرواز کا کچھ پتہ نہ ہوتا تھا اس لئے کس کے بیوی بچے پہلے مغربی پاکستان منتقل کئے جائیں۔ ایک پیچیدہ جذباتی مسئلہ بن گیا تھا۔ انخلأ کی منصوبہ بندی میرے ذمے تھی۔ اس مسئلہ کا یہ حل تجویز کیا گیا کہ اس معاملہ میں سب سے جونیئر سے انخلأ شروع کیا جائے۔ چنانچہ پروازیں شروع ہو گئیں اور سب سے آخر میں میرے اور بریگیڈ کمانڈر کے اہل و عیال ہوائی جہاز میں سوار ہوئے جب میں نے اپنی بیٹی عائشہ کو اپنا سکول کا بستہ لئے ہوئے اور بیٹے حیدر کو اپنے کھلونے لے کر پی آئی اے کے جہاز میں مغربی پاکستان کے لئے پرواز کے لئے چڑھتے دیکھا تو وہ لمحہ میری زندگی کا پُرمسرت ترین لمحہ تھا۔ میرے بچوں نے جہاز میں داخل ہونے سے پہلے چڑھنے والی سیڑھی کے آخری تختہ پر کھڑے ہو کر ایک بار مجھے دیکھا۔ ان کے ننھے ننھے

ہاتھ ہلے جیسے خدا حافظ کہہ رہے ہوں۔ میرے دل سے بے اختیار آواز آئی خدا حافظ۔ یہ خدا حافظ رسمی نہ تھا۔ یہ حقیقی خدا حافظ تھا۔ ہم ایک دوسرے کو شعوری طور پر خدا کی حفاظت میں دے رہے تھے۔ مَیں اس لمحے کی جذباتی شدّت کو کبھی نہیں بھُول سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ سب بچے محفوظ رہے نہ صرف میرے بلکہ سارے گیریزن کے۔ ورنہ مجھے معلوم تھا اور بعد میں تفصیلات بھی معلوم ہوئیں کہ کس طرح بعض گیریزنوں میں عورتوں اور بچّوں کو بے رحمی سے قتل کیا گیا تھا۔

بغاوت کی مزید لہریں

برگیڈ میجر اسٹاف آفیسر ہوتا ہے اور اس حیثیت میں براہِ راست لڑائی میں حصہ لینا اس کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ لیکن بعد کے مہینوں میں دشمن سے جو جھڑپیں ہوئیں ان میں اس منصبی رکاوٹ کے باوجود مَیں نے از خود حصّہ لیا۔ ان لڑائیوں کے سرکاری تبصروں میں ایک بار پھر میری جرأت اور دلاوری کو سراہا گیا۔

کسی بغاوت کو کچلنا، کھُلی لڑائی سے زیادہ مُشکل کام ہوتا ہَے

وہ اس طرح کہ باقاعدہ لڑائی میں مرنے مارنے کا کھُلا کھیل ہوتا ہے۔ کوئی کسی کو ٹارچر نہیں کرتا۔ انسانیت سوز اذیتیں نہیں دیتا۔ مارنے میں ظلم نہیں کرتا۔ بغاوت میں غصّہ اور نفرت کی آگ بھڑکی ہوتی ہے۔ جو ظلم باغیوں اور ان کے حمائیتیوں نے مغربی پاکستانیوں پر کئے تھے ان کی تفصیلات انسانی تاریخ کا تاریک ترین باب ہیں۔ انسان تصوّر نہیں کرسکتا۔ انسان دوسرے معصوم اور بے گناہ انسانوں کو اتنی اذیّت دے سکتے ہیں۔ اتنا وحشیانہ ظلم کر سکتے ہیں۔ مَیں نے ان بعض غیرانسانی اذیّت گاہوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہاں کا جما ہوا سیاہ خون اور انسانی اعضأ کے مسخ شدہ ٹکڑے خود بتا رہے تھے کہ یہاں کونسا خونی کھیل کھیلا گیا ہے۔ یہ ہولناک مناظر کسی کو بھی انتقام سے پاگل بنا دینے اور نفرت کی آگ میں جلانے کے لئے کافی تھے۔ چنانچہ

ایسا ہوا بھی، کچھ انتقامی کارروائیاں بھی ہوئیں۔ جو افسوسناک تھیں اس لئے کہ ظلم بہرحال قابل مذمت ہوتا ہے، خواہ کوئی کرے اور خواہ کن ہی وجوہ سے کرے۔

لڑائی میں مارنا برحق ہے، ظلم برحق نہیں

لیکن خدا کا شکر ہے کہ قرآنِ حکیم اور حدیث کے گہرے مطالعہ نے جو میں نے کبھی کیا تھا۔ مجھے انتقامی جنون کا شکار ہونے سے بچا لیا۔ حدیث پاک ہے کہ جو ہتھیار رکھ دیں ان کے ساتھ رحم کرو۔ میں نے اس حکم کو سامنے رکھا۔ اور جو بھی ہتھیار رکھ دیتا میں اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہ کرنے دیتا۔ حالانکہ مجھے بعض صورتوں میں علم ہوتا۔ اور مجھے بتایا جاتا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمارے افسروں، جوانوں، بچوں اور عورتوں پر بڑے ظلم ڈھائے اور اذیتیں دی ہیں۔ اس کے باوجود میں نے اپنی انسانیت کو قائم رکھا۔ اس رویّہ کی وجہ سے باغیوں میں میری شہرت دوہری تھی۔ وہ سامنے آتے ڈرتے تھے اور جب گھر جاتے اور ہتھیار ڈالے بغیر چارہ نہ ہوتا تو پھر مجھے ڈھونڈتے تاکہ مابعد کے نتائج سے محفوظ رہیں۔

میرا ہمیشہ سے یہ خیال اور عمل رہا ہے کہ لڑائی میں مارنا برحق ہے لیکن ظلم برحق نہیں ہے، اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلے میں لاکھوں نہیں کروڑوں روپے کے نوٹ اور کروڑوں کا سونا میرے ہاتھ سے گزرا لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس بے حد بے حساب دولت سے میرا دامن آلودہ نہیں ہوا۔ اور جب اس آگ کے دریا سے گزر کر میں نے گھر میں قدم رکھا تو میرے پاس تن کے کپڑوں اور قرآنِ حکیم کے سوا کچھ نہ تھا۔

لوٹ مار کی چیکنگ

مشرقی پاکستان میں سول وار کے دوران لوٹ مار کی کہانیاں بھی عام ہوئیں۔ دوچار

واقعات ضرور ہوئے ہوں گے لیکن ان اکا دُکا واقعات کو مخالف ذرائع ابلاغ بہت بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے۔ اس لئے پاکستان فوج نے خصوصی اہتمام کیا کہ اس قسم کے واقعات رُونما نہ ہوں۔ چنانچہ اس رجحان کو روکنے کے لئے آرمی نے مختلف اطراف میں چیک ٹیمیں بھیجیں تھیں۔ ایک ٹیم ہمارے بریگیڈ میں بھی آئی۔ اس معائنہ ٹیم سے ہمارے بریگیڈ کمانڈر اقبال شفیع نے کہا :

آپ سب سے پہلے میری رہائش گاہ دیکھیئے اور خوب اچھی طرح دیکھیئے۔ اس کے بعد میرے بریگیڈ میجر کے کوارٹرز میں جائیے اور کونہ کونہ دیکھیئے۔ اس کے بعد باقی بریگیڈ کا معائنہ کیجئے۔ جس جگہ، جس گوشے میں، جس کے ہاں آپ جانا چاہیں ضرور جائیں۔ چنانچہ ٹیم نے بڑی تندہی سے اپنی چھان پھٹک کا کام شروع کر دیا۔ جب وہ اپنا معائنہ ختم کر چکے تو معائنہ ٹیم کے سربراہ کرنل صاحب میرے دفتر میں آئے اور کہا۔ مُبارک ہو۔ ہمیں آپ کے ریکارڈ پر فخر ہے۔ آپ کے تمام بریگیڈ میں کسی افسر یا جوان کے پاس لوٹ کی ایک چیز بھی نہیں ملی۔

اس دوران بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیر اقبال شفیع کا تبادلہ ہو گیا۔ انہوں نے اپنی الوداعی تقریر میں جو فقرہ میرے بارے میں کہا وہ یہ تھا۔

"میجر سلطان ہمیشہ میرے لئے تقویت کا ستون رہے ہیں" بریگیڈیر اقبال شفیع مبالغے کے عادی نہیں، اور بے جا تعریف کبھی نہیں کرتے۔ میں ان کے اس فقرے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہوں۔

جمال پور کا تاریخی معرکہ

ستمبر، ۱۹۷ء میں مجھے ترقی دے کر لیفٹیننٹ کرنل بنا دیا گیا اور ۳۱ بلوچ کی کمان میرے سپرد ہوئی۔ ۳۱ بلوچ ان دنوں جمال پور میں تھی۔ جمال پور دریائے برہم پترا پر مشرقی پاکستان کے شمال میں واقع ہے۔ اس وقت جنگ کو فضا میں سُونگھا جا سکتا تھا۔ سرحدی جھڑپیں

جس پیمانے پر ہو رہی تھیں اور ملک کے اس حصے کے اندر جو تخریبی کارروائیاں جاری تھیں سرحدوں پر جس طرح ہندوستانی فوجوں کا ہجوم تھا اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کھلم کھلا مکمل جنگ بہت قریب ہے۔ میں نے چارج لیتے ہی اپنی بٹالین کو حالات کے رُخ اور نوعیت سے آگاہ کیا اور جنگ کے لئے تیار ہو جانے کے لئے کہا۔ ۳۱ بلوچ کے جوانوں اور افسروں نے جس طرح اس پکار پر لبیک کہا اس کے نتیجے میں انہوں نے قومی تاریخ کے صفحات پر ۳۱ بلوچ کا نام سونے کے حروف میں لکھ دیا ہے۔

جمال پور پہنچتے ہی میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ جنگ کی صُورت میں دشمن ڈھاکہ پہنچنے کے لئے جمال پور سے ہو کر گزرنے کی کوشش کرے گا۔ جمال پور کی اس زبردست فوجی اہمیت کے پیشِ نظر میں نے فیصلہ کیا کہ جمال پور کو ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ کی صُورت میں تبدیل کرنا چاہیئے تاکہ دشمن کو اس طرف سے پیش قدمی کا موقعہ نہ مل سکے۔ اگلے دو ماہ میں سینکڑوں نہیں ہزاروں سویلین مشرقی پاکستانیوں نے جمال پور کو ایک دفاعی حصار بنانے میں ہمارے جوانوں کی رضاکارانہ طور پر مدد کی۔ مجھے معلوم تھا اور احساس تھا کہ مشرقی پاکستان کی خاموش اکثریت اب بھی دل سے پاکستانی ہے۔ چنانچہ جب آس پاس کے لوگوں کو علم ہوا کہ ہماری بٹالین امکانی ہندوستانی حملہ کو روکنے کے لئے مورچے تیار کرنے لگی ہے تو ہزارہا کی تعداد میں مقامی باشندے آگے بڑھے اور دفاعی انتظامات کو مستحکم کرنے میں دل کھول کر ہماری مدد کی۔ اس تمام جدوجہد کا نتیجہ نکلا کہ جنگ کی شام سے پہلے جنرل نیازی نے جمال پور کے دفاعی حصار کو دیکھ کر کہا :

"ہمیں یہ جذبہ ۔ یہ اسپرٹ اور یہ معیار چاہیئے۔ میں مشرقی پاکستان میں ہر یونٹ سے کہوں گا کہ وہ اس طرح کی تیاری کرے۔ لیکن اس معیار کو کون پہنچ سکے گا" یہ الفاظ تو اپنے کمانڈر کے تھے۔ لیکن جب دُشمن نے حملہ کیا اور اس کے دانت کھٹے ہوئے تو دُشمن کو ماننا پڑا کہ ہاں کسی نے کچھ جان ماری ہے۔ میرا اشارہ ۲ انڈین ڈویژن کے جی او سی جنرل ناگرہ کی طرف ہے۔ جب کچھ دنوں کے بعد اس کے ڈویژن نے جمال پور کو نشانہ بنایا اور اسے لوہے

کے چنے چبانے پڑے تو اس نے کہا: AN INSPIRED DEFENCE BY:
AN INSPIRED LEADER

جمال پور کی دفاعی تیاریاں

گو ستمبر ۱۹۷۱ء میں جھڑپیں بھی ہوتی رہیں لیکن ہمارا ارتکاز جنگ کی تیاری پر تھا اگر ایک چوکی دشمن سے اُلجھی ہوئی ہوتی تو باقی بٹالین اپنا ٹریننگ پروگرام جاری رکھتی۔ میں نے دفتر میں بیٹھنا چھوڑ دیا تھا اور ہر روز تقریباً سرحدی پوسٹ پر خود جاتا اور حالات سے اپنے آپ کو باخبر رکھتا۔ اصل میں تو میرا مقصد اپنے آدمیوں کے حوصلے بلند رکھنا تھا۔ سرحدی علاقوں سے گزرتے ہوئے بارہا مجھ پر فائر کھلا۔ راستوں میں جا بجا ٹینک شکن بارودی سرنگیں بچھی ہوتی تھیں۔ کسی وقت بھی میرے اور جیپ کے پرخچے اُڑ سکتے تھے۔ لیکن جنگ وہ کھیل ہے جس میں خطرہ تو ہوتا ہی ہے۔ میرے جوان بھی خطرات میں گھرے ہوئے تھے اور آگے چل کر انھیں اس سے بھی زیادہ سنگین خطرات کا سامنا کرنا تھا۔ لڑائی میں آدمی جب تک خطرہ سے بلند نہ ہو جائے وہ لڑ نہیں سکتا۔ میرے ہر روز ہر پوسٹ پر جانے کا مقصد یہی تھا کہ خطرے کا خوف ان کے دل سے نکال دوں۔ انھیں مجھے دیکھ کر یقین آجائے کہ پاکستانی سپاہی موت سے نہیں ڈرتا۔

نومبر ۱۹۷۱ء کی صُورت حال

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایک طرح سے بے اعلان جنگ شروع ہو چکی تھی۔ نومبر میں ہماری سرحدی چوکیوں پر دُشمن بار بار حملے کرنے لگا۔ ہمارے جوانوں اور افسروں نے ان حملوں کا پوری پیشہ وارانہ مہارت اور جرأت سے مقابلہ کیا۔ اور جوش میں اپنی جانوں تک کی پرواہ نہیں کی۔ ان کی جرأت مندانہ مقاومت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ نومبر کے معرکوں میں ہمارے تین افسر شہید اور کئی زخمی ہوئے۔ یہ نقصان بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ میں نے

اپنے افسروں کو بتایا کہ اس مرحلے میں ضرورت سے زیادہ جوش کا مظاہرہ نہ کریں کٹھن منزلیں تو آگے آنی ہیں۔ میرے جونیئر افسروں نے سرحد پر ناقابل فراموش جرأت اور فراست کے مظاہرے کئے۔ کمال پور کا معرکہ تو ایک لیجنڈ (افسانہ) بن گیا ہے۔

کمال پور کا ہیرو : سرحد سے صرف ہزار گز کے فاصلے پر دفاعی لحاظ سے نہایت اہم ۳۱ بلوچ کی یہ چوکی میجر ایوب کی "سی" کمپنی کی ذمہ داری کے علاقے میں تھی ایک پلاٹون کی طاقت کی اس چوکی کو تو تیرہ منیر احسن کئی افسروں نے کمان کیا لیکن آخری مرحلے میں اسکے کمانڈر کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) احسن صدیقی رستارۂ جرأت) نے جس طرح یہاں دشمن کا غرور خاک میں ملایا وہ عسکری تاریخ کا ایک قابل فخر صفحہ ہے۔ میجر جنرل سکھونت سنگھ نے اپنی کتاب "لبریشن آف بنگلہ دیش" میں کمال پور گیریژن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کیپٹن احسن ملک نے واصل میں احسن صدیقی) نے تین ہفتے تک بریگیڈیئر ہردیال سنگھ کلٹر کے ۹۵ ماؤنٹین بریگیڈ گروپ کے شدید ترین زمینی اور ہوائی حملوں کو سخت محاصرہ میں ہونے کے باوجود کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اور ۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہوائی جہازوں اور آرٹلری کے ان مسلسل اور سخت حملوں کا جنگی رہنمائی جی، او، سی میجر جنرل گوربخش سنگھ خود کر رہا تھا۔ بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ کمال پور کے کمانڈر نے جنرل کے یکے بعد دیگرے تین الٹی میٹموں کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور لڑائی جاری رکھی تا آنکہ اسے پوسٹ چھوڑنے کا حکم نہیں دیدیا گیا۔ بعد کو انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف مانک شا نے خود کمال پور گیریژن اور اس کے کمانڈر کی جرأت مندی کو ایک خط میں سراہا۔ اقتباس ختم ہوا میں اسمیں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ کمال پور پوسٹ یا جمال پور کا دفاعی حصار یہ جگہیں نہ صرف ۳۱ بلوچ بلکہ پاکستان آرمی کی تمام چھوٹی فارمیشنز کی قوت مدافعت کی علامتیں تھیں۔

ایک جانباز شہید : میں کوئی فرق نہیں کرنا چاہتا۔ ۳۱ بلوچ کا ہر افسر اور جوان جہاں تھا اسنے اسکا حق ادا کر دیا پھر بھی کوئی تخصیص کی ہی جائے تو میں بلاتامل میجر محمد ایوب شہید کا نام لونگا جو کمال پور پوسٹ کی روح رواں تھے اور جو خود بخشی گنج کا دفاع کرتے ہوئے ۴ دسمبر ۷۱ء کو شہید ہوئے اور جن کیلئے میں نے نشان حیدر کے اعزاز کی سفارش کی تھی۔ انکی شخصیت اور کارگزاریوں پر ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔

جمال پور کے تاریخی معرکہ کی روئداد جمال پور پر ہم آخری معرکہ کے لئے تیار تھے

دشمن کے ڈو بریگیڈ حملوں کو ہم نے مضحکہ خیز آسانی سے پسپا کر دیا۔ ہمیں نہ ائیر فورس کی کوئی مدد حاصل تھی، نہ توپ خانہ تھا، ٹینکوں کا تو نام ونشان نہ تھا اور ہمارے مدِمقابل دس بارہ پلٹنوں پر مشتمل پورا ڈویژن ان تمام سہولتوں اور ہتھیاروں سے لیس موجود تھا۔ دشمن نے ایک طرح سے ہمیں گھیرے میں لے لیا تھا۔ دشمن کے ہوائی حملے توپ خانے کی بمباری اور انفنٹری کے حملے تینوں ایک ساتھ جاری تھے۔ لیکن جمال پور کی پوزیشن پر ۳۱ بلوچ کے جوان اور افسر ڈٹے ہوئے تھے۔ دشمن کا خیال تھا کہ ان سہ طرفہ حملوں سے ہم دل شکستہ یا مایوس ہو گئے ہوں گے لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جمال پور کا ٹکراؤ پاکستانی عزم اور قوتِ مدافعت کی علامت بن گیا۔ اس کی بازگشت بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کے واسطے سے تمام دنیا میں سنی گئی۔

معرکہ کی تفصیلات

چونکہ اس معرکہ میں خود میری حیثیت مرکزی کی سی تھی۔ اس لئے بہتر یہ ہو گا کہ اسے میں دوسرے مبصروں کے حوالے سے بیان کروں۔ ۷ جنوری ۱۹۷۲ء کے "ہلال" میں ایک مضمون چھپا تھا۔ وہ نقل کرتا ہوں۔

پاکستانی کرنل بمقابلہ بھارتی بریگیڈئر

مشرقی پاکستان میں جمال پور کے مقام پر بھارت کی فوج کو ایک ایسے اولوالعزم پاکستانی فوجی افسر سے واسطہ پڑا جن کو نہ دشمن کی تعداد کی برتری کا کوئی خوف تھا۔ نہ ہی اس کی دھمکیوں سے وہ مرعوب ہونے کو تیار تھے بلکہ یقین اور عزم کی بدولت انہوں نے بڑی سی بڑی طاقت کے ساتھ ٹکر لینے میں ذرہ بھر بھی تامل محسوس نہیں کیا۔

یہ پاکستانی کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل سلطان احمد تھے۔

اس معرکے پر انہیں دنوں نیویارک کے ایک اخبار کے نامہ نگار کا ایک مکتوب چھپا تھا جس سے اس یادگار معرکہ کی کچھ تفصیلات کا پتہ چلتا ہے۔

جمال پور کا معرکہ ۹ اور ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا۔ جمال پور ڈھاکہ سے تقریباً ۱۲۰ میل شمال مغرب میں ہے۔ مشرقی پاکستان کے تمام محاذوں کے مقابلے میں یہاں سب سے زیادہ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ یہاں کی پاکستانی فوج کی کمان لیفٹیننٹ کرنل سلطان احمد کر رہے تھے۔ مخالف فوج کے کمانڈر بریگیڈیئر ایچ ایس کلیئر تھے اور اتفاق سے یہ دونوں افسر اس سے پہلے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کشمیر میں ایک دوسرے کے مقابلے پر رہ چکے تھے بریگیڈیئر کلیئر انڈین آرمی کے ۹۵ویں ماؤنٹین بریگیڈ کی کمان کر رہے تھے۔

مشرقی پاکستان میں جب جنگ بند ہوئی اور بھارت کے بڑے بڑے جرنیل ڈھاکہ پہنچے تو انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انہیں جمال پور کی فوج کے پاکستانی کمانڈر سے ملایا جائے دوپہر کے کھانے پر جب یہ افسر ایک دوسرے سے ملے تو ایک بھارتی افسر یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ تمہارے جوانوں نے تو کمال کر دیا۔

لنچ کے دوران سب سے زیادہ تذکرہ اس خط و کتابت کے متعلق تھا۔ جو کرنل سلطان احمد اور بریگیڈیئر کلیئر کے درمیان ہوئی۔

بھارتی بریگیڈیئر کا خط۔ جمال پور کے کمانڈر کے نام

ڈیئر کرنل — آپ اس وقت ہمارے گھیرے میں ہیں اور آپ کے بچ جانے کی کوئی صورت نہیں۔ میرے پاس اس وقت جو ٹروپس ہیں وہ آپ کی نفری کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ میرے پاس توپ خانہ بھی ہے اور میں ایئر فورس استعمال کر سکتا ہوں۔ میرا مشورہ آپ کو یہ ہے کہ اگر آپ اپنے دوستوں کو بچانا چاہتے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ آپ ہتھیار ڈال دیں۔ ہمارے بالا کمانڈر نے یہ پہلے ہی وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ آپ سے اور آپ کے افسروں اور سپاہیوں سے اچھا

سلوک کریں گے ۔ میں یہ خط ایک سویلین کے ہاتھ بھیج رہا ہوں مجھے امید ہے کہ آپ اس کو انسان سمجھ کر اس کو کوئی تکلیف نہیں دیں گے میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اگر آپ لوگ سویت لوگوں یا مکتی باہنی کے ہاتھ آگئے تو وہ آپ سے بہت برا سلوک کریں گے ۔ میں آپ کو اس کا جواب بھیجنے کے لئے آج شام ساڑھے چار بجے تک کا وقت دیتا ہوں ۔ بصورت دیگر آپ کو نتیجہ بھگتنے کے لئے تیار رہنا ہوگا ۔

بریگیڈیر ایس ایچ کلیئر

کرنل سلطان کا جواب اسی شام کو پانچ بجے کے قریب انہیں مل گیا تھا ۔

کرنل سُلطان کا جواب

ڈیئر ، بریگیڈیر آپ کے خط کا شکریہ ، مجھے امید ہے کہ آپ کا مزاج اچھا ہوگا ہتھیار ڈالنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ ہمیں خوشی ہے کہ وہ دن بالآخر آگیا ہے جس کا ہم سب انتظار کر رہے تھے اب ہمیں مزید انتظار کی ضرورت نہیں ۔ آئیے پھر دو دو ہاتھ ہو جائیں ۔ آپ نے ایئر فورس کی کمک بلانے کا جو ذکر کیا ہے میرا خیال ہے کہ شاید یہ بھی کافی نہ ہو آپ کو کچھ اور بندوبست بھی کرنا چاہیئے ۔ جہاں تک سویلین کے ساتھ سلوک کا تعلق ہے آپ ہمارے جوانوں سے شاید پوری طرح واقف نہیں آپ اس شخص سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر چائے پی ہے یا نہیں میری طرف سے مکتی باہنیوں کو سلام ۔ تو پھر لڑائی شروع کرنے کا کب تک ارادہ ہے ؟ میں امید کرتا ہوں کہ اب جب آپ سے ملاقات ہوگی تو آپ کے ہاتھوں میں اسٹین گن ہوگی ۔ بجائے اس قلم کے جس کا آپ نے بڑا باکمال استعمال کیا ہے

خدا حافظ

کمانڈر جمال پور

اس کے بعد لڑائی شروع ہوگئی دو دن تک پاکستان کے جوانوں نے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد

کے نعروں کی گونج میں بھارتیوں پر پے درپے وار کئے بریگیڈیر کلیرا ور کرنل سلطان بھی برابر خطرات میں گھرے رہے دونوں کے آس پاس گولے پھٹتے رہے بریگیڈیر کلیر کا بیان ہے کہ ان کی جیکٹ میں گولیوں کے کئی سوراخ ہو گئے ہیں کرنل سلطان کی جیپ ایک دفعہ سرنگ سے ٹکرا گئی جس سے ان کے کئی جوان زخمی ہوگئے۔ لیکن کرنل خود بچ گئے۔ بعد میں جب ان کی بٹالین کی نفری دو تہائی رہ گئی تو انہیں ڈھاکہ جانے کا حکم ملا ان کی بٹالین کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ صوبائی دارالحکومت میں بھارتی فوج کے داخلہ کا راستہ روکے رکھے۔ ان کے جوان لڑنے کو بالکل تیار تھے کہ پاکستانی ہائی کمان نے جنگ بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔

نامہ نگار نے آخر میں لکھا ہے کہ ۱۴ ڈویژن کے آفیسرز میس میں لنچ کے موقعہ پر جب بھارتی اور پاکستانی افسر اکٹھے تھے تو کرنل سلطان بڑے بدمزہ ہوتے کیونکہ وہ جنگ بند کرنے کے فیصلہ سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جنگ جاری رہنی چاہیئے تھی۔ بریگیڈیر کلیر کے ہر سوال کا جواب کرنل سلطان نے بڑے وقار اور اعتماد سے دیا۔

ایک دشمن کا تبصرہ

اس معرکے کے بارے میں ایک ہندو ڈی، آر، مینکیکر اپنی کتاب پاکستان کٹ ٹو سائز میں لکھتا ہے۔

At Jamalpur, the Pak 31 Baluch fought like the devils Early in the battle Brigadier Kler gave the encircled Pakistan force a chance to save lives and avoid a massacre by surrendering But the commander of the Pakistani battalion, Lt Col Sultan Ahmed sent back a spirited reply.

His proud reply read:

"We here in Jamalpur are waiting for the fight to commence. It has not started yet. So let's not talk and star it. Forty sorties, I may point out, are not adequate. Pleas ask for many more . . . Give my love to the Muktis. Hoping to find you with a sten in your hand next time, instead of th

pen you seem to have so much mastery over."

And the Pakistani colonel sent wrapped with his letter a 7.62 mm bullet.

Thereupon the Indians resumed the attack.

اس تبصرے پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں لیکن افسوس کہ یہ تگ و تاز بھی رائیگاں گئی۔

جمال پور کے المیہ کے بعد کی داستان

۹۔ دسمبر ۷۱ء کی شام کو مجھے حکم ملا کہ میں اپنی بٹالین کے ساتھ ڈھاکہ پہنچوں۔ مجھے معلوم تھا کہ حالات نے کیا رخ اختیار کر لیا ہے اور میری بٹالین کو کن حالات میں اور کیوں ڈھاکہ بلایا گیا ہے۔ اب سوال شہ رگ کو بچانے کا تھا۔ میری بٹالین اور ڈھاکہ کے راستے میں دشمن کے ہر طرح سے لیس ایک بریگیڈ کی چار پلٹنیں مورچہ بند تھیں ایک طرح سے انہوں نے راستے کو مہر بند کر دیا تھا۔ دشمن کے تصوّر میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ میری خستہ اور درماندہ پلٹن اس حصار کو توڑنے کی کوشش کرے گی۔ بہر حال میرے لئے ایسا کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ بازی ڈھاکہ پر لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے دشمن کے بریگیڈ پر حملہ کر کے راستہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اسی رات ہم نے حملہ کیا۔ عام طور پر حملہ میں ۳ اور ایک کی نسبت ہوتی ہے۔ ہم نے ایک اور چار کی نسبت کے ساتھ حملہ کرنے کی جرأت کی شروع میں ہندوستانی اس حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ پھر سنبھل گئے۔ مختصر یہ کہ راستے نکالنے کی لڑائی تمام رات ہوتی رہی۔ صبح سویرے سورج کی پہلی کرن سے بہت پہلے، پو پھٹتے وقت آخر کار ہم بھاری قیمت پر انڈین حصار کو توڑ کر راستہ نکالنے میں کامیاب ہو گئے اس تمام لڑائی میں، میں آگے آگے رہا اور خود حملے کی قیادت کی۔ لیکن ایک اکیلے سے کیا ہوتا ہے میں یہاں اپنے جوانوں اور افسروں کی بے مثال جرأت کی داد دیتا ہوں۔ وہ بہت بے جگری سے لڑے۔ میں مشرقی پاکستان کے رضا کاروں. خصوصاً بہاری حزب اللہ کے مجاہدوں کا تذکرہ بھی کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے شانہ بشانہ لڑے اور ہمارے ساتھ جانیں دیں۔ اس معرکے

میں شجاعت ودلاوری کے بڑے بڑے عظیم واقعات دیکھنے میں آئے جس طرح پاکستان کے فرزندوں نے جمال پور کا دفاع کیا اور جس طرح دشمن کے حصار کو توڑا اس پر پاکستان ہمیشہ فخر کر سکتا ہے پاکستانی سپاہی کا میدان جنگ میں جواب نہیں۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ صبح سویرے ہندوستانیوں نے میرے آدمیوں کی لاشیں گنی تو وہ تعداد میں ۲۳۴ تھیں۔

ایک ایک انچ پر مزاحمت

دشمن کے حصار کو توڑ کر صبح سویرے ہم نے ڈھاکہ کا رخ کیا ڈھاکہ اب بھی ۱۲۰ میل دور تھا اس فاصلے کے زیادہ حصے کو ہم نے پیدل طے کیا اس طرح کہ سڑک کے دونوں طرف سے فائر آتا رہتا تھا۔ اور اوپر سے ہندوستانی ایئر فورس مصروف تھی آرام کرنے کا کوئی وقت نہ تھا۔ سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں تھی لیکن ہر قدم آگے بڑھنا بھی ضروری تھا کہ وقت ہمارے خلاف تھا اور اللہ کا شکر ہے کہ پاکستانی سپاہی کا ہر قدم آگے ہی بڑھتا رہا۔

اس لانگ مارچ کے دوران دو ایک ایسے واقعات بھی پیش آئے جن کا تذکرہ ضروری ہے تاکہ تاریخ گواہ رہے کہ پاکستانی سپاہی بدترین حالات میں بھی کتنا فراخ دل اور فیاض ہوتا ہے۔ دلیری بغیر فیاضی کے جرأت بغیر شولری کے مزہ نہیں دیتی۔ پاکستانی سپاہی کی اس خصوصیت کو دنیا زیادہ نہیں جانتی اس لئے میں بطور خاص اس پہلو کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

شولری کا ایک نادر واقعہ

ہم ڈھاکہ کی طرف مارچ کر رہے تھے کہ ایک گاؤں سے گزرتے ہوئے ہم پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ فائرنگ گاؤں کے بعض شرپسند کر رہے تھے۔ جو رائفلیں سرحد پار سے لائے تھے۔ ان میں سے تین کو میرے آدمیوں نے بمع ہتھیاروں کے پکڑ لیا۔ جونہی ان کے بیوی بچوں کو ان کے پکڑے جانے کی خبر ہوئی وہ دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور رحم کی بھیک مانگنے لگے ان کا خیال

تھا کہ ہم انہیں کھڑے کھڑے گولی مار دیں گے۔ جو کچھ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا اس کا جواب بھی یہی تھا۔ اور یوں بھی ایسے موقعوں پر دشمنوں کے ساتھ زیادہ تکلف نہیں کیا جاتا۔ ہم ان کو مار دینے میں قطعاً حق بجانب ہوتے۔ ان کی بیویاں کہنے لگیں۔ "ہمارے بچوں پر رحم کرو ہمارا کوئی نہیں۔ ہمیں ٹھا کرنے بندوقیں لاکر دی تھیں۔ اسی نے چلانا سکھایا تھا۔" میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا میں نے کہا۔ چلو آگے بڑھو تو ان میں سے کسی نے پوچھا آپ ان کو گولی مار دیں گے؟ میں نے کہا نہیں۔ جاؤ اپنے آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ سن کر جو لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے حیران رہ گئے انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ہم انہیں یوں معاف کر دیں گے میرے صوبیدار میجر نے ان کی رائفلیں رکھوا کر انہیں ان کے بیوی بچوں کے ساتھ جانے دیا۔

ہم نے اس طرح لڑتے بھڑتے دو دن میں قریب سو میل کا فاصلہ طے کیا ڈھاکہ قریب بیس، تیس میل رہ گیا تھا۔ کہ ٹرکوں کا ایک قافلہ ہمیں لینے کے لئے آن پہنچا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت تک پلٹن کا ہر فرد تھک کر چور چور ہو چکا تھا۔ کچھ زخمی بھی تھے ایسے میں ٹرکوں کی آمد ہمارے لئے ایک نعمت سے کم نہیں تھی۔ میرے جوان ٹرکوں میں بیٹھنے کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ لٹے پٹے، تباہ حال بہاریوں کا ایک ہجوم آن پہنچا۔ ان میں عورتیں بچے اور بوڑھے بھی تھے۔ وہ پناہ کی تلاش میں تھے۔ اور ڈھاکہ جانا چاہتے تھے۔ ان میں سے چند میرے پاس آئے ان لوگوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی ادھر میرے جوانوں کا جو حال تھا وہ میرے سامنے تھا۔ جنگ کی اپنی نفسیات ہوتی ہے ایسے موقعوں پر لوگ بہت کم بات کرتے ہیں۔ سپاہیوں کے چہرے ان کی آنکھیں ان کی زبان بن جاتے ہیں میں نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا وہ سمجھ گئے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ بولا یا وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور قطاریں باندھنے لگے۔ یہ اشارہ تھا کہ ابھی ان کی ہمت جوان ہے۔ اور ٹرکوں کی انہیں پرواہ نہیں۔ جنگ میں ایسی خاموش گفتگو کے لمحے بہت عجیب ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ٹرکوں میں سویلینز بٹھانے کی اجازت دے دی۔ اور خود پیچھے بٹالین لے کر پھر مارچ شروع کر دی۔

میں ڈھاکہ کی طرف اس آخری مارچ کی ہیجانی کیفیت کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہم سب کو پتہ تھا کہ ڈھاکہ نے ہمیں ان لمحات میں پکارا ہے تو کیوں پکارا ہے۔ اور ہمارا مشن ہے تو کیا ہے۔ ہم سب خاموش تھے۔ لیکن ہمارے اندر ایک حشر برپا تھا۔ آس پاس سے گولیاں بھی آتی تھیں کبھی کبھار کوئی تھک کر یا زخمی ہو کر گرتا بھی تھا۔ ساتھی اس کو سہارا دیتے اس کا بوجھ سنبھال لیتے لیکن ہر قدم آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چونکہ ڈھاکہ ہمیں پکار رہا تھا۔

ڈھاکہ کے دروازہ پر

ڈھاکہ میں ہمارا ہیروز کی طرح استقبال ہوا۔ ہم نے کمال پور، بخشی گنج، شیر پور اور جمال پور میں جو معرکے مارے تھے ان کی خبریں ڈھاکہ بہت پہلے پہنچ چکی تھیں بی بی سی نے ان کا تذکرہ کیا تھا۔ پاکستان، یو ایس اے، عرب ممالک کے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کمال پور اور جمال پور کے تذکرے بار بار آتے تھے۔ جن میں مجھے اور میری بٹالین کو دل کھول کے خراج تحسین ادا کیا گیا تھا۔

جنگ کے بعد ہندوستانیوں نے بھی تقریباً نصف درجن کتابوں میں اعتراف کیا کہ ۳۱ بلوچ، اس کا کمانڈر، آفیسرز اور جوان، ماضی کی روایتی مسلم مجاہدوں کی طرح لڑے۔ میرے دوسرے ستارۂ جرأت کا اعلان جنگ کے آغاز میں ہوا تھا۔ نومبر ۷۱ء اور دسمبر ۷۱ء کے شروع کے چند دنوں کی کارکردگی کے لئے جس کا حال میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔

ڈھاکہ پہنچنے پر جنرل نیازی نے مجھ سے کہا کہ میں اعزازات کے لئے نام دوں۔ میری سفارش پر میری بٹالین کے پانچ افسروں کو ستارۂ جرأت دیئے گئے اور چند تمغۂ جرأت بھی وہ موقعہ اور وقت اعزازات لینے دینے کا نہیں تھا۔ میں نے جنرل نیازی سے اصرار سے کہا کہ اعزازات کی فہرست میں میرا نام شامل نہ کیا جائے۔ چونکہ جس علامتی اعزاز کی ضرورت ہو سکتی تھی۔ وہ مجھے مل ہی چکا تھا۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ میں اس مقام سے بہت آگے آ گیا تھا۔ جہاں

اعزازات کچھ کشش رکھتے ہیں۔ میرے لئے یہ احساس ہی بہت تھا کہ میں کچھ کر سکا ہوں۔ ڈھاکہ پہنچنے پر میں نے جنرل آفیسر کمانڈنگ ایسٹرن کمانڈ سے پوچھا میری بٹالین تو ۱۲۰ میل کے فاصلے پر۔ اور اتنے سخت محاصرہ میں تھی آپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا؟ انہوں نے میرے صاف صاف سوال کا، صاف صاف جواب دیا۔ محاصرہ میں کون سی بٹالین نہیں تھی۔ ساری بٹالینیں کٹر دشمن کے گھیرے میں تھیں مجھے فوری طور پر چند بٹالینوں کی ضرورت تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے ۳۱ بلوچ ضرور جلد سے جلد آسکے گی۔ ان کا یہ اعتماد بے جا نہ تھا۔ اسی اعتماد نے ۳۱ بلوچ کو آگ کے دریا کو عبور کرنے کا حوصلہ دیا۔

ڈھاکہ کی کمان

ڈھاکے میں مجھے ایک نوساختہ ایڈ ہاک بریگیڈ کی کمان دی گئی اور حکم دیا گیا کہ میں ڈھاکہ کے شمالی سیکٹر کا دفاع کروں۔ میں نے فوراً پوزیشن سنبھال لی۔ اور تین دن اور تین رات مورچہ بندی کرنے کے بعد میں نے بالا ہیڈکوارٹر کو اطلاع دی کہ پوزیشن تیار ہے اور میں ۳۱ بلوچ کے ساتھ ذاتی طور پر ٹنگی دریا پر صف آرا ہوں۔ انشاء اللہ دشمن ادھر سے دریا کو عبور نہ کر سکے گا ۔۔۔ ہرگز نہیں۔

لیکن اس یقین دہانی کے باوجود ۱۶ دسمبر ۷۱ء کو صدر وقت کی طرف سے ہتھیار رکھ دینے کا حکم مل گیا۔

اس کے بعد کی کہانی مختصر ہے۔ ہندوستان میں اسیری، اکتوبر ۱۹۷۴ء میں رہائی۔ ۱۹۷۶ء میں بریگیڈیئر ہوا۔ پھر بلوچستان میں دو سال خدمات انجام دیں۔ اور ۱۹۷۸ء میں تلوار کے پیشے کو خیرباد کہا۔ لیکن خالد بن ولید رضؓ کی طرح حسرت رہی کہ کارزار میں شہادت کا اعزاز کیوں نہ ملا۔

حرف آخر

آخر میں، میں ایک ضروری وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

اور وہ یہ کہ اس داستان میں مجھے بار بار "میں" کا لفظ استعمال کرنا پڑا ہے۔ "میں" کی تکرار خود میرے لئے باعث پریشانی رہی ہے۔

سوال نامے میں، سوالات براہ راست میرے بارے میں پوچھے گئے تھے اس لئے مجھے صیغہ واحد متکلّم میں جواب دینا پڑا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ لڑائی کوئی ایک فرد واحد نہیں لڑتا۔ خواہ وہ کسی او ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے جہاں جہاں "میں" آیا ہے۔ وہاں پوری پاکستانی فوج نہیں تو کم از کم ۳۱ بلوچ ضرور سمجھا جائے۔ جو کچھ میری کمان میں ۳۱ بلوچ کر سکی اس کا کریڈٹ اگر کسی کریڈٹ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ۳۱ بلوچ نے وہی کیا جو اس کو کرنا چاہیئے تھا۔ اور پاکستانی فوج کی اور بہت سی جوانمرد یونٹیں کر رہی تھیں ـــــ تو وہ کریڈٹ پوری پلٹن کو جاتا ہے۔ خاص طور پر ان اور رینکس کو جو آگ اور خون کے اس کھیل میں سب سے آگے تھے۔ اور جنہوں نے اس کھیل کا حق ادا کیا اور خوب ادا کیا۔ میں ایسے تمام ساتھیوں اور جانبازوں کو سلام کرتا ہوں اور خاص طور پر وہ جو مردانہ وار پاکستان پر اپنی جان وار گئے۔ لیکن جو بے تمغہ و نشان رہے ہمارے اصل ہیرو وہ ہیں۔ میں تمام ایسے گمنام مجاہدوں اور شہیدوں کو سلام کرتا ہوں۔

اے ارض وطن تو شاد رہے، آباد رہے

میجر جنرل پیر داد خان ستارۂ جرأت

میجر جنرل پیر داد خان، ستارۂ جرأت

میجر جنرل پیر داد خان ستارۂ جرأت کا شمار کالج کے نامور اور قابل فخر فرزندوں اور جنگ دسمبر ۱۹۷۱ء کے ہیروز میں ہوتا ہے۔ ان کی سوانح حیات کا خاکہ ان ہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

خاندانی پس منظر

اپنے خاندان اور خاندانی پس منظر کے بارے میں جنرل پیر داد لکھتے ہیں: "ضلع جہلم کی تحصیل پنڈ دادنخان میں ایک بڑا گاؤں دہولہ ہے۔ میجر جنرل غلام محمد، بریگیڈیئر غلام محمد بریگیڈیئر اکرم ظفر، بریگیڈیئر عاشق حسین، بریگیڈیئر عبدالرؤف، لیفٹیننٹ کرنل فتح خان لیفٹیننٹ کرنل احمد خان ستارۂ جرأت، لیفٹیننٹ کرنل محمد منیر، لیفٹیننٹ کرنل عبدالرزاق تمغۂ امتیاز ان سب کا تعلق دہولہ کی مردم خیز سرزمین سے ہے۔ میرا خمیر بھی دہولہ کی مٹی سے اٹھا ہے

میرے خون میں سپہ گری ہے۔ میرے والد راجہ کرم داد خان کا تعلق بھی فوج سے ہی تھا وہ پہلی جنگ عظیم میں شریک کارزار رہے۔ اور خوب داد شجاعت دی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے وردی تو اتار دی تھی لیکن فوج کے طرز زندگی کو تا حیات برقرار رکھا۔ ہمیشہ یہی کہتے تھے۔ بیٹا آن، جان سے پہلے ہے۔ جرأت اور جفاکشی ان کی زندگی کی بنیادی قدریں تھیں۔ یہی چیزیں انہوں نے ہمیں سکھائیں۔ کبھی جوانی میں کھیل کا شوق رہا ہوگا۔ ہمیں کھیلتے دیکھ کر وہ خوش ہوتے تھے۔ لیکن کھیل میں بھی جان مارنے کو کہتے تھے۔ کھیلوں میں ان کی اس دلچسپی کا ہی نتیجہ تھا کہ میں اور میرا بھائی رزاق دونوں ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی ہوئے۔

تعلیم کی ابتداء

میں نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری سکول میں حاصل کی۔ پھر کچھ دنوں ڈھلوال کے مشن ہائی سکول میں بھی پڑھتا رہا۔ یہ اچھا سکول تھا۔ ہمارے گاؤں سے کوئی چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ کچا راستہ جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ یہ چار میل کا فاصلہ آتے جاتے میں پیدل طے کیا کرتا تھا۔

کے۔ جی۔ آر، بنگلور سے کے۔ جی۔ آر جہلم تک

۱۹۴۲ء میں میں کے۔ جی۔ آر۔ آئی ملٹری کالج بنگلور میں چھٹے درجے میں داخل ہوا۔ پاکستان بننے سے پہلے انڈیا میں پانچ کنگ جارج رائل انڈین ملٹری کالج تھے۔ جہلم، جالندھر، اجمیر، بنگلور اور بلگام۔ دوسری جنگ عظیم سے یہ پالیسی بن گئی تھی۔ کہ ہر کے۔ جی۔ آر کالج میں ہر قوم کے کچھ لڑکے داخل کیے جائیں۔ چنانچہ میرے والد نے اپنی رجمنٹ کو

میرے داخلے کی درخواست دی تو مجھے بنگلور بھیجا گیا۔ اسی طرح بعض کو اجمیر اور جالندھر بھی بھیجا جاتا تھا۔ اسی پالیسی کے تحت کچھ ہندو اور سکھ لڑکے کے۔ جی آر جہلم میں بھی داخل ہوتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد بنگلور کے مسلم طلبہ کو جہلم بھیجنے کے انتظامات کئے گئے تھے۔ جو بہت ہی ناقص تھے۔ تحفظ کا تو اللہ ہی مالک تھا۔ بمشکل تمام ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا کر ہم انڈیا کے انتہائی جنوبی شہر بنگلور سے جہلم پہنچے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ جنوری ۱۹۴۸ء کا مہینہ تھا۔

ملٹری کالج کا دور تعلیم و تربیت

ملٹری کالج جہلم میں، میں نے تقریباً ۶ سال گزارے۔ اور بہت کچھ سیکھا۔ یہ سچ ہے کہ بچہ کا پہلا سکول اس کا گھر ہوتا ہے لیکن رسمی تعلیم کی بھی کم اہمیت نہیں۔ ملٹری کالج جہلم میں داخلہ سے پہلے میں ڈھلوال اور بنگلور کے اداروں میں پڑھ چکا تھا۔ لیکن میری شخصیت کو نشوونما پانے، نکھرنے اور چمکنے کا موقع ملٹری کالج جہلم ہی میں ملا۔ یہی وہ ادارہ ہے یہاں صحیح معنوں میں میرے کیریئر کی بنیادیں رکھی گئیں۔ خدا ملٹری کالج کو مزید پروان چڑھائے۔ اس کے طلبہ نے جنگ کے زمانے میں جو معرکے سر کئے ہیں اور امن کے زمانے میں ملک و قوم کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ اور قابل فخر بھی۔ نومبر ۱۹۵۴ء میں، میں نے کالج کو خیرباد کہا۔

چند عظیم اساتذہ

ایک ادارہ اپنے استادوں سے بنتا ہے جب بھی کالج کا ذکر آتا ہے تو میں

اپنے پرانے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ دیکھو اس زمانے کے استاد کس پائے کے تھے کس خلوص سے اپنے کام میں لگے تھے۔ اور کس اطمینان سے یہ خدمت انجام دے رہے تھے کیا ان کو مالی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا ہوگا۔ کیا ان کے راستے میں مادی طور پر بہتر مناصب کی ترغیبات نہ آئی ہوں گی لیکن اس کے باوجود کس شوق سے یہ لوگ ملٹری کالج میں تعلیم و تربیت کے مشغلہ میں مشغول رہے اور مشغول ہیں۔ پروفیسر سعید راشد پروفیسر عین الدین علوی اور پروفیسر شفیق احمد اپنی ذات سے تقریباً ایک ادارہ بن گئے ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ یہ چند تو کالج کے ستون ہیں جو برسہا برس سے اپنے کام میں لگے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ میں مسٹر اقبال، مسٹر ایوب، مسٹر مطہر، مسٹر حیدری، میجر اسماعیل اور بریگیڈیئر رفیق کمانڈانٹ کو بھی خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان حضرات نے بھی کالج کی بڑی خدمت کی ہے۔

پی۔ ایم۔ اے

میرا ۱۵ پی۔ ایم۔ اے لانگ کورس تھا لیکن پی ایم اے جانے سے پہلے میں نے نومبر ۵۴ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک جے ایس پی، سی ٹی ایس کوئٹہ میں بھی چھ مہینے گزارے۔ پی ایم اے میں سینئر ٹرم میں انڈر آفیسر رہا۔ ۵۷-۱۹۵۶ء میں پی ایم اے کی ہاکی ٹیم کے کپتان ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ہاکی میں پی ایم اے کلر بھی ملا۔

کمیشنڈ سروس کی روداد

مارچ ۱۹۵۷ء میں مجھے ۱۴ بلوچ میں کمیشن ملا۔ یہ بٹالین فائٹنگ فور بٹن اور چونڈہ

بٹالین کے نام سے مشہور ہے۔ میں اس پلٹن میں رہا۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں مجھے امریکہ میں کورس کے لئے بھیجا گیا۔ ۶۷-۱۹۶۲ء تک میں ایس ایس جی میں رہا۔ ۱۹۶۸ء میں اسٹاف کالج کوئٹہ کا کورس کیا۔ جنوری ۶۹ء سے مارچ ۷۱ء تک بریگیڈ میجر رہا۔ اس کے بعد مجھے ایک کمانڈو بٹالین میں سیکنڈ ان کمانڈ کے طور پر پوسٹ کیا گیا۔ یہ کمانڈو بٹالین مارچ ۷۱ء ہی میں مشرقی پاکستان جا چکی تھی۔ میں نے اس یونٹ میں جولائی ۱۹۷۱ء میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کا معرکہ

یہ ۲۴ نومبر ۱۹۷۱ء کا واقعہ ہے۔ کہ ہندوستانیوں نے مکتی باہنی کے غول کے ساتھ چٹا گانگ کے کوہستانی علاقے پر تین طرف سے حملہ کر دیا۔ اس علاقے کے شمالی اور مشرقی حصے کے دفاع کی ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ اس سلسلہ میں مجھے کالج ہی کے ایک نامور اور تجربہ کار مجاہد ۶۸۸ بریگیڈیر عطا محمد خان ستارۂ امتیاز کی راہنمائی حاصل تھی۔ میرے جوانوں اور افسروں نے اپنی دفاعی ذمہ داریوں کو کمال حوصلے اور جرأت سے پورا کیا۔ مشرق اور جنوب میں میرے معاون میجر بلال شہید تھے۔ (فرنٹیئر فورس رجمنٹ کے میجر بلال غیر معمولی عزم اور جرأت کو اور فرض سے عشق کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ اسی تگ ودو میں شہید ہوئے اور شہادت کے بعد انہیں ان کی غیر معمولی کارکردگی کے اعتراف کے طور پر ستارۂ جرأت کا اعزاز پیش کیا گیا۔

میجر بلال شہید ستارۂ جرأت کے بعد ایک اور افسر کی کارکردگی کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ تھے کیپٹن (اب کرنل) یعسوب علی ڈوگر فرنٹیئر فورس رجمنٹ جو دریائے کرنا فلی

کے قریب ڈیماگری کے مقابل ایک پوسٹ چھوٹا ہر بانہ پر متعین تھے۔ اس پوسٹ پر دشمن نے بار بار حملے کئے لیکن کیپٹن ڈوگر نے ہر حملہ کو ناکام بنایا۔ اور جب تک پوری دفاعی حکمت عملی کو نئے سرے سے منظم نہیں کیا گیا کیپٹن ڈوگر نے اس پوسٹ کا کامیاب دفاع کیا۔ اس معرکے میں کیپٹن ڈوگر کی کارکردگی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اس علاقے کے شمال میں مجھے میجر (اب بریگیڈیئر) محمد اقبال کا تعاون حاصل تھا۔ اقبال بھی اپنی ذمہ داری کے علاقے میں ڈٹے رہے اور جب تک جنگ کی صورت حال بالکل بدل نہ گئی۔ انہوں نے دشمن کو اپنی زیر دفاع علاقے میں قدم جمانے کا موقع نہیں دیا۔ میں دو اور افسروں کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں یہ تھے ریٹائرڈ کیپٹن ارجمند ستارۂ جرأت آرٹلری اور کیپٹن ریٹائرڈ اختر قادر ستارۂ جرأت اور بار۔ آرمڈکور جو چٹاگانگ کے شمالی علاقے میں دفاع کر رہے تھے۔ جس احسن طریقے سے انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا وہ واقعی قابل تحسین کارنامہ تھا۔ میں خود ابتداء میں اس آپریشن کو رنگامتی سے کنٹرول کر رہا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں بٹالین کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل محمد حنیف ملک، جو اس وقت ڈھاکہ میں مقیم تھے۔ آئے اور وہاں کی نازک صورت حال کا اندازہ کر کے انہوں نے وہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا (کرنل حنیف کے ساتھ کام کرنا اس وقت بھی میرے لئے باعث عزت تھا اور آئندہ بھی جنگ یا امن میں ان کی رفاقت میرے لئے ایک غیر معمولی اعزاز ہوگی) کرنل حنیف کے ہوتے ہوتے رنگامتی میں میرے لئے ٹھہرنا غیر ضروری تھا۔ اس لئے میں نے شمال میں جانے کا فیصلہ کیا اور گھاگھراچری کو اپنا مستقر بنایا۔ ہمارے پاس اس وقت افرادی قوت کی بے حد کمی تھی اس کے باوجود ہم نے دشمن کے ہر حملہ کو پسپا کیا۔ ابھی یہ لڑائی جاری تھی کہ مجھے دسمبر ۱۹۷۱ء کے پہلے ہفتے میں اپنی کمان میجر (اب کرنل) ۲۰۲۷ سعید ستارۂ جرأت کو سونپ

دینے کے بعد ڈھاکہ پہنچنے کا حکم ملا۔ وہاں ایک اور خدمت میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں ڈھاکہ سے ایک بم لے کر نوکنڈی جا رہا تھا۔ کہ راستے میں ہوائی حملہ ہوا اور میں اس میں زخمی ہوا۔ بعد میں مجھے سی ایم ایچ پہنچا دیا گیا۔ مذکورہ بالا آپریشن میں مجھے ستارۂ جرأت عطا کیا گیا تھا۔

لڑائی کے بعد کا دور

دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد ۱۹۷۲ء میں مجھے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی اور سٹاف کالج میں انسٹرکٹر کے طور پر پوسٹ ہوا۔ اس کے بعد ۷۶-۱۹۷۵ء میں میں نے ۴ بلوچ کو کمان کیا۔ جس بٹالین میں کمیشن لیا تھا اس کو کمان کرنا بہت بڑا اعزاز تھا۔ مجھے بڑا فخر محسوس ہوا۔ اس بٹالین کا جنگی ریکارڈ بہت شاندار ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے یہ بٹالین ۱۹۶۵ء میں چونڈہ محاذ پر کارہائے نمایاں سرانجام دینے پر چونڈہ بٹالین کے نام سے مشہور ہے۔

۱۹۷۶ء میں مجھے دوبارہ سٹاف کالج کوئٹہ میں سینئر انسٹرکٹر کے طور پر پوسٹ کیا گیا فروری ۱۹۷۷ء میں مجھے بریگیڈیر کے عہدے پر ترقی ملی۔ اور پشاور میں، میں نے ایک بریگیڈ کی کمان سنبھالی۔ وہاں سے مجھے نیشنل ڈیفینس کالج راولپنڈی میں وار کورس کے لئے نامزد کیا گیا۔ اپریل ۱۹۷۹ء میں مجھے اس کالج سے وار اسٹڈیز کی ایم ایس سی کی ڈگری عطا ہوئی۔

جون ۱۹۷۹ء میں ۲۰ بریگیڈ کی کمان سنبھالی۔ ۱۹۸۲ء میں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی ملی اور ایف سی این اے کی کمان سنبھالی۔ دو سال کے بعد مئی ۱۹۸۴ء میں جی ایچ کیو میں بطور ملٹری سیکرٹری پوسٹ ہوا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو پاکستان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی توفیق دے۔ اور خدمت کی کوئی ایک صورت نہیں ہے۔ جو جہاں ہے وہ اسی کام یا منصب کے حوالے سے پاکستان کی جڑوں کو پانی دے سکتا ہے۔ آخر میں، میں ایک بار پھر ملٹری کالج کا اور اپنے اساتذہ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے مجھے اس مقام تک پہنچنے کے قابل بنایا۔ میری دعا ہے کہ اس کالج کے طلبہ کو ایمان اور وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار کرے اور انہیں ملک و قوم کی سچے دل سے خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

پاکستان پائندہ آباد

لیفٹیننٹ کرنل محمد سعید ستارہ جرات تمغہ بسالت

بلوچ رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمد سعید ستارۂ جرأت، تمغۂ بسالت

بلوچ رجمنٹ

کرنل سعید کو ستارۂ جرأت، تمغۂ بسالت کے علاوہ میز و صدارتی ایوارڈ اور چیف آف اسٹاف کا توصیفی کارڈ بھی ملا ہے۔ ماشاءاللہ یہ عزتیں ہر ایک کے حصے میں نہیں آتیں۔ اور ان کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنے کی توفیق بھی ہر ایک کا مقدر نہیں ہوتی۔ قابل قدر ہیں وہ والدین جن کی آغوش میں ایسے سپوت نے آنکھ کھولی اور اس معیار کی پرورش پائی۔ قابل فخر ہے وہ ادارہ جہاں ایسے جیالے کی تعلیم و تربیت ہوئی اور قابل ستائش ہے وہ رجمنٹ جس کے افسروں اور جوانوں کے شانہ بشانہ یہ مجاہد یہ کارنامے انجام دے سکا۔ ہم نے کرنل سعید کی شخصیت اور کارنامے کے مطالعہ کے لئے جو سوال نامہ ان کے پاس بھیجا اس کے جوابات پر مبنی ان کا سوانحی خاکہ انہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

جرأت اور انصاف پسندی کی روایت

جرأت اور عہد وفا کو ہر قیمت پر نبھانا ہمارے خون میں ہے۔ میرے دادا راجہ شامان خان اپنے زمانے کے بڑے جیالے اور جی دار جوان تھے یہ جب کسی بات پر اڑ جاتے تھے تو کسی قیمت پر پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ اگر کسی پاسداری کی حامی بھر لیتے تھے۔ تو پھر خواہ جان جاتے حق وفا ادا کرتے تھے۔ اپنے علاقے میں جرأت کے ساتھ ان کی انصاف پسندی بھی مشہور تھی انہوں نے فوج میں بڑے ٹھسّے سے نوکری کی اور رسالدار میجری سے ریٹائر ہوئے ان کی شاندار کارکردگی کے لئے انہیں نائٹس شولری میڈل دیا گیا تھا میرے والد بزرگوار گلستان خان بھی فوج میں تھے۔ فرنٹیر فورس رجمنٹ میں انہوں نے ایک طویل عرصے خدمات انجام دیں اور آنریری کیپٹن کے عہدے سے پنشن پر آئے۔ دوسری جنگ عظیم میں امتیازی کارکردگی پر انہیں او۔ بی۔ آئی کے خطاب

سے نوازا گیا والد بزرگوار کے علاوہ میرے ماموں اعزازی لیفٹیننٹ لال خان کا تعلق بھی فوج سے تھا۔ انہیں بھی دوسری جنگ عظیم میں ایم سی کا تمغہ ملا تھا۔ میرے چچا بریگیڈیر گل نواز خان بھی ایم سی ہیں۔ ہم لوگ اکرہ راجپوت ہیں اور راجپوتوں کی روائتی جنگ جوئی ودلاوری ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ نسلی ورثے کے سلسلے میں، میں یہ کہوں گا کہ جس کردار اور رویئے کو ہم نسلی ورثہ کہتے ہیں وہ بھی اصل میں ماحول اور تربیت کا کرشمہ ہوتا ہے۔

کاروان زندگی کی پہلی منزل

ضلع جہلم میں جرنیلی سڑک پر پنڈی کی طرف راجپوتوں کی ایک مشہور قدیم بستی ہے اکرہ سوہڑہ وہی میری جائے پیدائش یعنی کاروان زندگی کی پہلی منزل ہے۔ آغاز سفر کی تاریخ کاغذوں میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۰ء درج ہے گویا یہی پیدائش کا دن ہے علم النجوم میں میں یقین نہیں رکھتا ورنہ یہ بھی بتاتا کہ میرا ستارہ کون سے برج میں تھا ستارہ کوئی بھی ہو بہرحال برا نظر نہیں آتا۔

بچپن

اوروں کا بچپن کھیلتے کودتے ہنستے ہنساتے گزرتا ہے میرا بچپن کھیلنے کودنے کے ساتھ ساتھ شرارتوں کی وجہ سے پٹتے پٹاتے بھی گزرا۔ کوئی دن نہیں جاتا تھا کہ والد، یا والدہ خاطر تواضع نہ کرتے ہوں۔ باہر سے لڑکر آنے کے بعد شکایت کرنے کی اور گھر میں پٹنے کے بعد رونے کی اجازت نہیں تھی۔ میرے والد بزرگوار جھوٹ اور بزدلی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ میری شرارتوں کو وہ برداشت کرسکتے تھے بلکہ نظرانداز کر دیتے تھے لیکن جھوٹ انکے یہاں ناقابل معافی جرم تھا۔ کہا کرتے تھے جھوٹے کا اعتبار نہیں۔ ہر جھوٹا بنیادی طور پر بزدل ہوتا ہے وہ کہا کرتے تھے بیٹا۔ اگر غلط کام کیا ہے تو پھر مردوں کی طرح سزا بھگتو، جھوٹ مت بولو، گڑگڑا کر معافی مت مانگو، یہ بزدلی ہے اس کے علاوہ چونکہ گھر میں دادا والد، چچا اور ماموں وغیرہ کے جنگی کارناموں اور تمغوں کا ذکر ہوتا رہتا تھا اس لئے میری بھی خواہش تھی کہ میں بھی کچھ کرکے دکھاؤں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے کئی بار سرخ رو کیا۔

سوہاوہ اسکول کی سہانی یادیں

چوتھی جماعت تک میں نے سوہاوہ کے مڈل اسکول میں پڑھا۔ ۴۶-۱۹۴۵ء میں جب میں نے اسکول جانا شروع کیا ہے تو اس وقت اسکول میں ہندو اور سکھ لڑکے بھی ہوتے تھے۔ ان سے لڑائی جھگڑائی بھی ہوتی رہتی تھی۔ سکھ لڑکے سر کے بالوں کو گوندھ کر چوٹی بناتے تھے اور اس پر پگڑی باندھتے تھے۔ میں ان کی پگڑی اکثر کھول دیا کرتا تھا وہ بہت تنگ پڑتے تھے۔ گاؤں میں کبڈی وغیرہ بھی ہوا کرتی تھی۔ میری سانس بہت لمبی تھی۔ بڑی پھرتی سے ہاتھ مارتا اور لمبا چکر لگا کر اپنی سائیڈ پر آجاتا۔ اچھے دن تھے۔ کھیلتے کھلاتے مارتے اور مار کھاتے خوب گزرے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

ایک شاندار مستقبل کی طرف پہلا قدم

میں اس عظیم ادارے میں جو ملٹری کالج جہلم کے نام سے معروف ہے ۹ جولائی ۱۹۵۱ء کو پانچویں جماعت میں داخل ہوا۔ اور ۲۰۲۷ کالج نمبر ملا۔ اسکین ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا۔ مسٹر حیدری اور مسٹر مظہر علی خان ہاؤس ماسٹر تھے یہ دونوں ہاؤس سے ملحق دو کوارٹروں میں رہتے تھے۔ اسکین ہاؤس کا کمپنی کمانڈر ایس سی اور ریاض تھا اور کالج کا ہیڈ لواتے سعید لیفٹیننٹ کرنل سید فیاض زیدی کالج کے کمانڈانٹ تھے۔ اور چیف انسٹرکٹر کیپٹن (بعد کو لیفٹیننٹ کرنل) عبدالحمید ابراہیم۔ زیدی صاحب کے بعد لیفٹیننٹ کرنل محمد رفیق کمانڈانٹ ہو کر آتے تھے۔ کرنل رفیق کا دو سرا دور بھی (۵۹-۱۹۵۵) میں نے کالج میں دیکھا۔ کالج میں چھ برس رہا۔ ۳۰ رجون ۱۹۵۷ء کو انٹرمیڈیٹ کر کے کالج کو خیر باد کہا۔ یہ دور میری زندگی کا تشکیلی زمانہ تھا۔ یہاں بہت کچھ سیکھا۔ باکسنگ میں کلر لیا بہت اچھے دوست بنائے۔ نذر، صغیر، رزاق (پیرا) اور شربت خاں وغیرہ بہت یاد آتے ہیں۔ اور بہت سی تصویریں ہیں جو ذہن کے پردے پر ابھرتی ہیں کسی کا نام نمبر یاد آجاتا

ہے کسی کا نہیں۔ دوستوں کا ذکر آئے اور ان کے ساتھ کی گئی شرارتیں یاد نہ آئیں ناممکن۔

شرارتوں کا فلسفہ

اگر زندگی سے شرارتیں نکال لی جائیں تو باقی تو چھلکا ہی رہ جاتا ہے۔ شرارت کیا ہے؟ ایک مہم، ایک ایڈونچر ایک تلاش، اپنے آپ کو ڈھونڈنے کی ایک کوشش، اپنی قوتوں اور اپنے حوصلوں کو آزمانے کا ایک بہانہ۔ وقت اور تجربے کے ساتھ ساتھ شرارتوں کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔

شرارت برائے شرارت ہونی چاہیئے۔ ایک مہم کے طور پر ایک چیلنج کی طرح۔ پر شرارت ایسی ہو جس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ بہرحال اپنی تو پرورش ہی شرارتوں کے سائے میں ہوئی تھی۔ کالج میں کرنل رفیق کا زمانہ بہت سخت ڈسپلن کا زمانہ تھا۔ اس میں شرارتوں کی گنجائش ذرا کم ہی تھی۔ لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ جب تک سخت پابندی نہ ہو شرارت کا مزہ نہیں آتا۔ جب خطرہ نہیں پکڑے جانے کا اور سزا پانے کا امکان نہیں تو پھر شرارت کیا ہوئی۔ پکنک ہوگئی۔ بہرحال ایک شرارت کا قصہ سناتا ہوں۔

ایک روز پکچر کا موڈ بنا تو بھیس بدل کے جہلم سینما کھسک گیا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ پہلے تو چار دانتے پی۔ پھر ریجنٹ میں ۶ سے ۹ بجے تک برسات دیکھی۔ وہاں منکر نکیر بھی آئے ہوئے تھے۔ انٹرول میں انہوں نے مجھے دیکھا اور نمبر نوٹ کر لیا۔ میں سمجھ گیا کہ نمبر نوٹ کرنے کا مطلب کیا ہے۔ میں نے دل میں کہا ٹھیک ہے سزا تو ملنی ہی ملنی ہے کیوں نہ موقعہ سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ پکچر ختم ہونے پر دوسرے سینما میں چلا گیا۔ وہاں کوئی فضول سی فلم چل رہی تھی۔ زبردستی وہ بھی دیکھی۔ ۱۲ بجے دوسرا شو ختم ہوا تو میں نے کالج کا رخ کیا۔ اس زمانے میں رات کو تانگے کیا بسیں بھی آسانی سے نہیں ملتی تھیں۔ چنانچہ جہلم کے پل پر میں نے ایک میل کی دوڑ کا تجربہ کیا سرائے آکر زمیندارہ ہوٹل میں پھر چائے پی اور بڑے اطمینان سے ہاؤس آیا۔ ہاؤس ماسٹر صاحب اور کمپنی کمانڈر دونوں انتظار کر رہے تھے۔ سب سے پہلے ہاؤس ماسٹر صاحب نے پوچھا۔ فلم دیکھ کر آتے ہو؟ میں نے کہا نہیں

سرا علم ہیں فلمیں دیکھی ہیں نہ کمپنی کمانڈر غرّایا۔ بہت چھٹے خان بنتے ہو کل صبح مزہ چکھنا۔" دوسرے دن کرنل رفیق کے سامنے پیشی ہوئی اور حسب توقع بیدوں سے تواضع ہوئی۔ باہر نکلا تو کالج ہیڈ لوائے نے کہا جاتے کہاں ہو ایک راؤنڈ اور ہو گا۔ میں ٹھہر گیا۔ دوسرے نمبر پر کوئی اور لڑکا تھا۔ تیسرے نمبر پر پھر مجھے پیش کر دیا گیا۔ کرنل رفیق بھی حیران ہوئے کہنے لگے ابھی ابھی تو اس کی کیننگ ہوئی ہے ہیڈ لوائے نے کہا۔ سر وہ پہلے شو کی تھی۔ اس نے دوسرا شو بھی دیکھا تھا۔ فرمایا اچھا یہ بات ہے۔ ایجوٹینٹ سے کہا۔ ایجوٹینٹ صاحب اس کو ایک ڈوز اور دیجئے" چنانچہ ایجوٹینٹ صاحب نے پوری دیانت داری سے ایک ڈوز اور دیا۔ جس کے نتیجے میں مجھے دس دن تک گرم پانی کی بوتل اور گرم اینٹوں کا استعمال کرنا پڑا۔

سی۔ آئی کیپٹن ابراہیم بھی اکثر کرم فرماتے رہتے تھے۔ لیکن دونوں حضرات گواہ ہیں۔ کہ میں رویا کبھی نہیں۔ نہ کبھی سزا سے بچنے کے لئے جھوٹ بولا۔ یہ چیز تو میرے خمیر ہی میں نہیں۔ کالج کی باتیں ختم کرنے سے پہلے میں۔ راشد صاحب کا تذکرہ ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت یاد آتے ہیں۔ وہ اس لئے کہ ان کی شفقت غیر مشروط تھی۔ میری شرارتوں کے باوجود ان کی شفقت اور ہمدردی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ انہوں نے کبھی ریجیکٹ نہیں کیا۔ مسترد نہیں کیا۔ عام طور پر استاد محنتی فرمانبردار لڑکوں کو پسند کرتے ہیں نالائقوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور شیطانوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں راشد صاحب کے پر شفقت دل میں سب کے لئے جگہ تھی۔ بلکہ شاید نالائقوں اور شیطانوں کے لئے زیادہ تھی۔ عجیب بات ہے کہ استادوں کا پڑھایا ہوا سبق انسان بھول جاتا ہے یا اس سے آگے نکل جاتا ہے۔ لیکن ان کا سلوک (اچھا یا برا) اور رویہ (تعلق یا بے تعلقی کا) بھلائے نہیں بھولتا۔ یہی حال بلگرامی صاحب کا تھا۔ اس محبت اور محنت سے پڑھاتے تھے کہ پڑھائی بوجھ نہیں بنتی تھی آرمی کے افسروں میں کیپٹن (بعد کو کرنل) این ڈی احمد اور صوبیدار عریف الحسن بھی بہت یاد آتے ہیں۔

پی۔ایم۔اے اور اس سے بعد کی منزلیں

میرا ۲۸ پی ایم اے لانگ کورس ہے میں اکیڈمی میں اپریل ۱۹۶۱ء سے ۱۰ راکتوبر ۱۹۶۳ء تک زیر تربیت رہا۔ باکسنگ میں پی ایم اے کلر لیا۔ پی ٹی میڈل لیا۔ اس کے علاوہ کراس کنٹری دوڑ میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ مجھے ۱۲ بلوچ رجمنٹ میں کمیشن ملا تھا۔ جو ان دنوں جیسور میں مقیم تھی۔ اس لئے دو ڈھائی سال پلٹن کے ساتھ جیسور میں گزارے اور اس تمام عرصے سیکنڈ لیفٹیننٹ ہی رہا کوئی پوچھے "کیوں"، تو میں جواب دوں گا کہ بس جی چاہتا تھا کہ کچھ چھیڑ چلتی رہے۔ جب بھی پرموشن کا وقت آتا میں کوئی ایڈونچر کر بیٹھتا۔ فوج کی پرانی روایت ہے کہ سیکنڈ لیفٹیننٹ کو ہمیشہ باملاحظہ باادب ہوشیار قسم کی چیز ہونا چاہئے۔ اپنی طبیعت مہم جو تھی۔ اس لئے چھوٹی موٹی بے ادبی ہو جاتی تھی۔ بکرا ڈالتا تھا۔ اور پرموشن پھر ملتوی۔ لیکن ۱۲ بلوچ میں میرے یہ شروع کے ڈھائی سال میری پروفیشنل تربیت کے لحاظ سے بہت اہم تھے۔ میں نے اپنے سی او کرنل اختر سے ڈسپلن، پلٹن کیلئے کام کرنا اور محنت کرنا سیکھا۔ اس دور کے دوستوں میں لیفٹیننٹ علی قلی خان خٹک اور لیفٹیننٹ کلیم خان کے نام سرفہرست تھے۔ دونوں یاروں کے یار تھے اور بڑے کام آنے تھے۔ مئی ۱۹۶۵ء میں آخر کار میں لیفٹیننٹ ہو ہی گیا کچھ دنوں کے بعد پلٹن لاہور آگئی۔ جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنگ چھڑی تو میں ۱۲ بلوچ کی ایک کمپنی کا پلاٹون کمانڈر تھا۔

کیکر پوسٹ کا معرکہ

۱۸ اور ۱۹ ستمبر ۶۵ء کی درمیانی رات کو میں نے کھیم کرن سیکٹر میں کیکر پوسٹ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کیا۔ دشمن اتنا بدحواس ہو کر بھاگا کہ اپنے کام آئے آدمیوں کی دس لاشوں کے علاوہ بہت سا اسلحہ بارود بھی پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ یہ سارا جنگی سازوسامان ہمارے ہاتھ لگا۔ اس معرکے میں میں گولیوں اور گرنیڈ کے ٹکڑوں سے زخمی بھی ہو گیا تھا۔ ۲۰ ستمبر کو مجھے ہسپتال بھجوایا گیا اسی

کارروائی کے لئے مجھے ستارہ جرأت عطا ہوا تھا۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

کیپٹن محمد سعید، جنگ ستمبر میں ایک محفوظ دستے کی کمان کر رہے تھے۔ جو ایک انفنٹری بلاٹون کے ریکی اور سپورٹ دستے پر مشتمل تھا۔ ۱۹ ستمبر ۶۵ء کی رات ساڑھے گیارہ بجے انہیں حکم ملا کہ وہ کھجیاں پوسٹ اور دیپال پور نہر کے مشرقی کنارے کے علاقوں میں دشمن کے خلاف کارروائی کریں۔ وہ مشین گن، چھوٹے ہتھیاروں اور مارٹروں کے شدید فائر کے زد میں ہوتے ہوئے دشمن کی کھجیاں پوسٹ سے تیس گز کے فاصلہ تک پہنچ گئے۔ اور دشمن کے بنکرز پر اپنے ہاتھوں سے ۳۰.۵" کے دو راکٹ پھینکے۔ ایسا کرتے ہوئے دشمن کی ایک گولی ان کے کندھے میں لگی اس زخم کے باوجود وہ دشمن کے بنکرز کی طرف اور آگے بڑھے اور ان میں ہینڈ گرنیڈ پھینک کر دو بنکر تباہ بھی کر دیئے۔ دشمن کے بنکرز میں گرنیڈ پھینکتے ہوئے کیپٹن محمد سعید کے بائیں ہاتھ میں دشمن کے خودکار ہتھیاروں سے گولیاں لگیں۔ اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے انہیں وہاں سے اٹھا کر لے جانا پڑا۔

اس افسر نے دشمن کے سامنے غیر معمولی جرأت اور جواں مردی کا ثبوت دیا اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہوئے اپنے فرض منصبی کو بے جگری سے ادا کیا۔ اس نمایاں اور ممتاز کارکردگی کے لئے ۹ مارچ ۱۹۶۶ء کو ستارۂ جرأت عطا کیا گیا۔" لوگ اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میرے اس ایکشن کا محرک جذبہ کیا تھا؟ میرا جواب یہ ہے کہ فوری طور پہ کوئی خاص جذبہ محرک نہیں تھا۔ میری تربیت اور شخصیت کی تعمیر جس طرح ہوئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ میں نے وطن سے وفا کا جو عہد کیا تھا اس کو نبھاؤں۔ اسلام اور پاکستان کی خاطر بے جگری سے لڑوں۔ جو کچھ میں نے کیا وہ میرے لئے بالکل فطری تھا۔ ویسے یہ اللہ کا کرم تھا کہ سرخ رو ہوا جس وقت میں نے حملہ شروع کیا تو والدین اور اساتذہ کی دعاؤں سے ہر خوف جاتا رہا تھا۔ اس وقت مجھے کسی چیز کی پرواہ

نہیں تھی۔ صرف ایک لگن تھی کہ کسی طرح یہ مشن پورا ہو جائے۔ جو اللہ تعالیٰ کے کرم و فضل سے پورا ہوا۔ اس معرکے میں، میری پلاٹون کے لانس نائیک نذیر خوب لڑے اور لڑتے لڑتے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ لانس نائیک نذیر شہید کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس وقت تو میں ایک نذیر شہید کا ذکر کر رہا ہوں جس کو میں نے شہید ہوتے دیکھا واقعہ یہ ہے کہ اس جنگ میں اور پھر ۷۱ء کی جنگ میں ایک نہیں ایسے ہزاروں نذیر تھے جو خاموشی سے ملک و وطن پر جان وار گئے۔ ہر ایک کو ستارہ یا تمغہ نہیں ملا لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے تمغہ و نشان مجاہدوں کی قربانی بھی کسی سے کم نہیں ہوتی۔ میں نذیر شہید ایسے تمام شہیدوں کو سلام کرتا ہوں۔

جنگ ستمبر کے بعد کی کہانی

جنگ کے فوراً بعد مجھے کیپٹن کے عہدے پر ترقی ملی۔ ۱۹۶۹ء میں میجر ہو گیا۔ اس عرصے میں معمول (روٹین) کے پروفیشنل فرائض انجام دیتا رہا لیکن کچھ مزہ نہیں آ رہا تھا۔ کہ ۱۹۷۱ء کا چیلنج آ گیا۔

۷۱ء میں ایس ایس جی کی دو کمانڈو بٹالین کے ساتھ مشرقی پاکستان میں بھیجا گیا۔ ۱۰ اور ۱۱ ستمبر کی درمیانی شب کو میں نے باغیوں کے ایک کیمپ پر حملہ کیا۔ یہ کیمپ کپتائی کے علاقے میں واقع تھا۔ کمانڈو ایکشن سے ان باغیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ میں نے ۵۶ باغیوں کو بمعہ اسلحہ گرفتار کر لیا اس کے علاوہ پانچ بھارتی سپاہی جو وائرلیس آپریٹر تھے۔ اپنے آلات جی آر سی ۹ کے ساتھ ہاتھ آئے۔ کمانڈو ایکشن میں صرف ہمت و حوصلے ہی کا نہیں حاضر دماغی کا امتحان بھی ہوتا ہے اللہ کا شکر ہے کہ اس امتحان میں کامیاب رہا۔ اس کارروائی کے لئے مجھے میرو پریذیڈنشل ایوارڈ عطا ہوا تھا۔ ۱۹۷۶ء میں مجھے کرنیلی کے عہدے پر ترقی ملی۔

تمغۂ بسالت

۱۹ر جنوری ۱۹۷۸ء کو پی آئی اے کا ایک طیارہ جو سکھر جا رہا تھا۔ اغوا ہو گیا۔ مجھے یہ طیارہ چھڑانے کا کام سونپا گیا۔ کافی جدوجہد کے بعد ۲۰ر جنوری کو تقریباً گیارہ بجے میں نے ایئر مارشل نور خان کی مدد سے ہائی جیکر پر قابو پا لیا۔ یہ کارروائی بھی ایک ایڈونچر کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور میرے مزاج کے عین مطابق! جہاں خطرہ ہو۔ چیلنج ہو اس کو سر کرنے کے لئے میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ مسلح ہائی جیکر کو زیر کرنا خاصی جرأت اور فراست کا کام تھا اللہ کا شکر ہے خدا نے ایک بار پھر مجھے سرخ رو کیا اس کارروائی کے لئے مجھے تمغۂ بسالت اور سی، او، ایس کا کمنڈیشن کارڈ بھی ملا تھا۔"

ہمارے سوال نامے کے آخر میں دو سوال یہ تھے۔

آپ کی محبوب تاریخی شخصیتیں کون سی ہیں اور آپ کی قدریں کیا ہیں۔

ان کے جواب میں کرنل سعید لکھتے ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر اور سلطان ٹیپو شہید میرے تاریخی ہیرو ہیں اورنگ زیب نے ہندوستان میں اسلام کو غیر اسلامی اثرات سے پاک کرنے کی کوشش کی تھی یہ گویا ہند میں مسلم قومیت کے تحفظ کی ایک شعوری کوشش تھی۔ ٹیپو سلطان نے بھی جرأت مندی سے جان کر یہی کام کیا انگریزوں کے خلاف اس کی جنگیں مسلم قومیت کو مرہٹوں اور انگریزوں کی جارحانہ سازشوں سے بچانے کے لئے تھیں۔ اورنگ زیب اور فتح علی ٹیپو دونوں سچے اور پکے مسلمان اور تلوار کے دھنی تھے۔ ان صفات کی وجہ سے وہ میرے محبوب تاریخی کردار ہیں۔ اپنے ذاتی قدروں کے بارے میں یہ کہ جب چھوٹا تھا تو والد کہا کرتے تھے بیٹے شرارتیں جتنی چاہے کر لو، کم پڑھو یا زیادہ لیکن جھوٹ نہ بولنا جھوٹ بولنا سب سے بڑی ذلت ہے، جھوٹا آدمی ذلیل ہو کے رہتا ہے۔ اسی طرح وہ کہا کرتے تھے سوچ سمجھ کے وعدہ کرو۔ آنکھ کھول کے دوستی کرو۔ لیکن اگر وعدہ کر بیٹھو اور دوستی ہو جائے تو پھر اسے نبھاؤ بھی۔ وفاداری شرافت کی نشانی ہے اور جرأت کی جڑوں سے

پھوٹتی ہے۔ بزدل اور خودغرض آدمی کبھی وفادار نہیں ہو سکتا۔ میرے خیال کے مطابق وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے۔ اس کے علاوہ میں فراخ دلی اور فیاضی کو بھی بہت اہمیت دیتا ہوں۔ کام کی قدر کرنا کسی کی محنت بالکل کی دل کھول کے تعریف کرنا بھی فراخ دلی اور فیاضِ طبعی کی نشانی ہے میں نے دیکھا ہے کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اپنے ماتحتوں کی تو خوبیوں پر تو چپ رہتے ہیں لیکن ایک خامی یا غلطی پر ضرور ٹوکتے ہیں۔ میں فراخ دلی اور ہمدردی کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے کھرے، بیباک اور نڈر قسم کے لوگ اچھے لگتے ہیں ایسے لوگ مخلص بھی ہوتے ہیں۔ ان دنوں میرے فرصت کے مشاغل میں شکار سرِفہرست ہے، تاریخی نوادرات جمع کرنے سے بھی دلچسپی ہے۔ وقت ملے تو باسکٹ بال کھیل لیتا ہوں۔

مصنّف کا تبصرہ

میں نے کالج میں کرنل سعید کا لاابالی لڑکپن بھی دیکھا ہے۔ اس وقت کسی کو سان و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ گہرے سانولے رنگ کا یہ گول مٹول سا لڑکا جس کے ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت ناچتی رہتی ہے جو کبھی کلاس میں نچلا نہیں بیٹھ سکتا اور شرارتیوں اور کھلنڈروں کا سرغنہ ہے۔ آگے چل کر اس قوم کے ہیروز میں سے ایک ہو گا جب ۱۹۶۶ء میں سعید کے ستارۂ جرأت کا اعلان ہوا، ۱۹۷۱ء میں جب ان کے میز و صدارتی ایوارڈ کے بارے میں سنا۔ اور پھر جب ۱۹۷۸ء میں سعید کے پی آئی اے کے جہاز کے ہائی جیکر کو کمانڈو ایکشن سے قابو کرنے کی داستان اخباروں میں پڑھی تو فخر سے سربلند ہوا اور یہ خیال بھی آیا کہ شہیدوں اور غازیوں کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ تھوڑے سے تجزیے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ شرارتیوں کا احترام کرنا چاہیئے زندگی کی بازی دماغ سے نہیں دل سے جیتی جاتی ہے۔ شوخ و شریر لڑکے کی اپنی نفسیات ہوتی ہے پہلے تو یہ کہ وہ دلیر ہوتا ہے۔ خطر پسند ہوتا ہے۔ فراخ دل ہوتا ہے اور اس کی یارباشی یہ ظاہر کرتی ہے وہ تنگ نظر اور خودغرض نہیں۔ جو یاری نبھا سکتا ہے وہ وطن سے اپنا عہدِ وفا بھی نبھا

سکتا ہے۔ میرا زندگی بھر کا تجربہ یہ ہے کہ بہت زیادہ محتاط آدمی بھی محتاط رہنا چاہیئے جو چانس نہیں لینا چاہتا جو کبھی خطرہ میں پڑنے کا خطرہ مول نہیں لیتا ہو آل ویز پلیز سیف WHO ALWAYS PLAYS SAFE (جو ہمیشہ اپنا تحفظ چاہتا ہے) وہ کیا میدان جنگ میں پلے سیف کی پالیسی پر کاربند نہ ہو گا۔ اس لئے نڈر بیباک بے ریا لوگوں کی کبھی کبھی کی خودسری اور تندی برداشت کر لینے میں کچھ حرج نہیں۔ ضرورت سے زیادہ فرماں بردار لیس مین ٹائپ مین میں کوئی اور خامی ہو یا نہ ہو لیکن وہ دلیر اور جری ہرگز نہیں ہو سکتا اور کارزار زندگی میں جرأت سب سے بڑا اور سب سے قیمتی ہتھیار ہے۔ بزدل آخر کار بدترین دوست اور بدترین دشمن ثابت ہوتا ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد عبد الحلیم امتیازی سند

بلوچ رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمد عبدالحلیم امتیازی سندھ بلوچ رجمنٹ

خاندانی پس منظر

میرے دادا حامد میاں پٹنہ (بہار) میں وکالت کرتے تھے۔ اور ان کا شمار شہر کے مسلمان اکابرین میں ہوتا تھا۔ وہ دینی مسائل میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے

میرے والد [illegible] نے اپنی تعلیم پٹنہ میں شروع کی اور کلکتہ میں جا کر مکمل کی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انہوں نے ایئر فورس میں ملازمت اختیار کی۔ پاکستان بننے پر انہوں نے اپنی خدمات پاکستان منتقل کرالیں۔

پیدائش اور بچپن

میں ۲۰ فروری ۱۹۴۱ء کو پٹنہ میں پیدا ہوا۔ شروع کے پانچ چھ سالوں کی کوئی خاص بات یاد نہیں سوائے اس کے کہ پاکستان آنے کے لئے ہم نے بار بار ریل کا طویل سفر کیا تھا۔ پہلے ہم نے پٹنہ سے بمبئی تک لمبا سفر کیا۔ ریل میں بیٹھے بیٹھے میں تنگ آگیا تھا۔ بمبئی سے بحری جہاز میں بیٹھے۔ چونکہ والد صاحب کی پوسٹنگ پشاور میں ہوئی تھی۔ اس لئے کراچی سے پھر ریل پکڑی اور تقریباً تیس گھنٹے میں پشاور پہنچے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد والد کا تبادلہ کراچی ہو گیا تو ہم سب کراچی آگئے گویا پاکستان میں میں نے اپنی زندگی کراچی سے شروع کی۔

ابتدائی تعلیم۔ ماری پور اسکول کی شوخیاں اور شرارتیں

میں نے اپنی تعلیم ماری پور (کراچی) کے ایک پرائمری اسکول سے شروع کی۔ یہاں چوتھی جماعت تک لڑکے اور لڑکیاں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ اور استانیاں پڑھاتی تھیں۔ جو آپا جان کہلاتی تھیں۔ میں پہلی جماعت ہی سے ایک چھوٹا سا فتنہ تھا۔ کسی وقت نچلا نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ہر دم نت نئی شرارتیں کرتا رہتا تھا۔ ان شرارتوں سے تنگ آکر یا قیادت کی کوئی رمق دیکھ کر میری دوسری آپا جان نے مجھے کلاس مانیٹر بنا دیا تھا چوتھی جماعت تک میں مانیٹر رہا۔ ساتھی لڑکوں لڑکیوں پر خوب حکم چلاتا تھا۔ اور رعب ڈالتا رہتا تھا۔ لیکن اپنی شرارتوں سے باز نہ آتا تھا اس وقت کوئی خاص واقعہ تو یاد نہیں آرہا۔ لیکن ایک شرارت اور سزا ضرور یاد آرہی ہے۔ وہ یہ کہ اس اسکول میں ایک گھنٹہ سلائی اور ہاتھ کے کام کا بھی ہوتا تھا۔ جس روز سلائی کا گھنٹہ ہوتا ہمیں سوئی دھاگہ اور کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی لانا پڑتا تھا۔ جو میں کبھی لے کر نہیں گیا۔ شروع میں دو چار مرتبہ آپا جان نے تنبیہ کی میرا ایک ہی جواب ہوتا مجھے درزی نہیں بننا۔ اس کے بعد وہ ہر بار مجھے بنچ پر کھڑا کر دیا کرتی تھیں۔ ایک روز اپنی ان مہربان آپا جان کے کلاس میں آنے سے پہلے میں بنچ پر کھڑا ہو گیا۔ آتے ہی پوچھا حلیم کیا بات ہے۔ کیوں کھڑے ہو؟ میں نے کہا آپا جان وہی پرانا قصہ ہے۔ ہنس پڑیں بولیں۔ حلیم! بیٹھ جاؤ۔ کچھ نہیں تو دوسروں کو کام کرتے دیکھو۔ لیکن جس روز دستکاری کا پیریڈ ہوتا اور سگریٹ اور ماچس کی خالی ڈبیاں، گتہ اور گڈی کاغذ کا لانا ہوتا تو میں یہ چیزیں بڑے شوق سے لاتا تھا اور ان سے چھوٹی میز کرسیاں وغیرہ بنانا سیکھتا تھا لیکن جو کچھ بناتا ادھر ادھر پھینک دیتا تھا۔ لیکن سہ ماہی ششماہی اور سالانہ امتحانات کے موقعہ پر یہ چیزیں دکھانا بھی ہوتی تھیں اس کا حل میں نے یہ نکالا تھا کہ ایسے موقعوں پر یہ چیزیں اپنی ساتھی لڑکیوں سے دو چار چیزیں لے کر دکھا دیا کرتا تھا اور میں ... لے لیتے ڈ... ایک ... لیتا تھا۔ چونکہ طبیعت میں شوخی تھی اس لئے لڑکیوں کو تنگ ... با مزہ آتا تھا مثلاً ...

تفریح یا آدھی چھٹی میں لڑکیاں رنگین چنے جن کے کھانے سے ہونٹ پیلے ہو جاتے تھے خریدتی تھیں اور املی نمک کے ساتھ کھاتی تھیں میں تاک میں رہتا تھا جہاں موقعہ ملتا دوپٹہ پر ہاتھ مارتا چنے نیچے گر جاتے اور املی چھین کر بھاگ جاتا۔ میری اس شرارت سے لڑکیاں بہت تنگ تھیں اور بعض تو بہت برا بھلا کہتیں مجھے یاد ہے کہ ایک موٹی سی لڑکی تو خاص طور سے مجھے کوسنے دیا کرتی تھی۔ عجب ناداتی کے دن تھے ان کی چیخ و پکار اور یہ شور سن کر کہ حلیم آ گیا احلیم آ گیا۔ مجھے بڑا مزہ آتا تھا میرا خیال ہے کہ اگر وہ مجھے بلا کر املی دیتیں تو شاید میں کبھی نہ لیتا۔ میرا شوق تو چھین کر کھانے اور تنگ کرنے میں تھا۔ میری وہ بہنیں اب میری عمر کی ہوں گی وہ جہاں کہیں بھی ہوں خدا ان کو خوش رکھے مجھے امید ہے کہ انہوں نے ایک شرارتی چھوٹے بھائی کو برسوں پہلے معاف کر دیا ہو گا۔ شرارت تو ایک اور بھی یاد آ رہی ہے۔ کہیں بات لمبی نہ ہو جائے تو وہ قصہ یوں ہے۔ کہ ہر اتوار کو ہمارے اسکول میں ایک طرح کی بزم ادب ہوتی تھی۔ جس میں اسکول کے بچے بچیاں تقریر، نعت، نظم یا لطیفے وغیرہ سناتے تھے۔ سب ایک دائرے میں بیٹھ جاتے اور گھنٹہ دو گھنٹے جلسہ ہوتا میں شرارتاً جگہ بدل بدل کر لڑکیوں کے پیچھے بیٹھتا اور چپکے سے دو دو کی چوٹیاں باندھ دیتا۔ جب بزم ختم ہوتی اور سب لڑکیاں لڑکے اٹھ کر بھاگتے تو چوٹی بندھی لڑکیاں کھنچ کر ٹکرا جاتیں یا گر پڑتیں۔ پھر مجھے کوسنے سننے کو ملتے۔ لیکن ان شرارتوں کے سوا میرا رویّہ ان سے بہت شائستہ تھا۔ کبھی کسی سے بدتمیزی نہیں کی اور چونکہ میں پڑھائی کے علاوہ کھیلوں اور ڈراموں میں بھی حصہ لیتا تھا اس لئے آپا جان اور ہم سبق لڑکیاں میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اوّل تو شکایت ہی بہت کم کرتیں اگر بات بڑھ جاتی تو آپا جان پیار سے سرزنش کر دیتیں یا کوئی معمولی سی سزا سنا دیتیں۔ پھر بھی اگر کسی سے کوئی زیادتی ہو گئی ہو تو خدا اور وہ بہن مجھے معاف کرے۔ بس وہ عمر ہی ایسی تھی کہ ان باتوں میں مزہ آتا تھا۔ ان شرارتوں میں ایک پہلو خطر پسندی اور ایڈونچر کا بھی تھا جو میری طبیعت کا ہمیشہ سے خاصہ رہا ہے یہی رجحان جنگ میں میرے بہت کام آیا۔ اسی جذبے نے اب میری زندگی کو تر و تازہ رکھا ہے۔

میرا پہلا آئیڈیل

ہر باپ اپنے بیٹے کو اپنے بہترین تصورات اور بہترین آرزوؤں کی تصویر دیکھنا چاہتا ہے۔ میرے والدگرامی نے میرا نام حلیم رکھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حلم کی صفت کو ان کے تصورات کی دنیا میں کیا اہمیت حاصل تھی میں اس نام کا اہل بن سکا یا نہیں یا الگ مسئلہ ہے لیکن جو حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ وہ خود سراپا حلم کی تصویر ہیں۔ جب میں ماری پور سکول میں پڑھتا تھا۔ تو انہیں شرارتوں لڑائی اور مار کٹائی کی خبریں اور شکایتیں پہنچتی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے میری ان حرکتوں کی نوعیت کو صحیح طور پر سمجھا اور میری توانائیوں کو تخلیقی راہوں پر لگانے کی کوشش کی۔ بہت کم والدین ایسے ہوتے ہیں جو سختی اور پیار میں وہ توازن قائم کرسکیں اور قائم رکھ سکیں جو انہوں نے کیا اس کے علاوہ انہوں نے ہم بھائیوں کو اوپر دیکھنا سکھایا بلندیوں کی آرزو بہت لوگ کرتے ہیں۔ لیکن بلندیوں کے قابل بننے کی کوشش بہت کم لوگ کرپاتے ہیں۔ ہمارے والد نے ہمیں بلندیوں کے قابل بننے کا راستہ دکھایا یہ ان ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ میرے بڑے بھائی عبدالرحیم (کالج نمبر ۲۰۷) آج ونگ کمانڈر ہیں اور صحیح ونگ کمانڈر ہیں میں نے بھی تھوڑا بہت فوج کی خدمت کا حق ادا کیا ہے جو سب کے سامنے ہے بچپن میں میرے اوپر دو ایک بار بڑی سخت مار پڑی ہے۔ زیادہ کھیلنے اور دیر سے گھر آنے پر والدہ تو اکثر تواضع کیا ہی کرتی تھیں۔ ایک بار والد کو بھی جلال آگیا تھا۔ تو اگلی پچھلی سب کسر پوری کر دی۔ یہ پی۔اے۔ایف کیمپ ماری پور میں ہماری سکونت کے زمانے کا واقعہ ہے میں غالباً تیسری جماعت میں تھا۔ ایک روز والد اور والدہ کیمپ کے سینما میں فلم دیکھنے گئے۔ اور کسی مصلحت سے ہم دونوں بھائیوں کو گھر پر چھوڑا اور بڑی تاکید کی کہ گھر ہی میں رہنا۔ باہر نہیں نکلنا۔ ادھر وہ گئے ادھر میں نے بھائی سے کہا چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ مجھے اب بھی یاد ہے زینت فلم تھی۔ سینما کا مینجر والد صاحب کے توسط سے ہمیں بھی جانتا تھا ہم وہاں پہنچے تو اس نے ہمیں اندر جانے دیا۔ کچھ دیر فلم دیکھی پھر چونکہ چھوٹے تھے نیند آئی اور وہیں سو گئے۔ جب فلم ختم ہوئی اور ہال خالی ہوگیا تو مینجر نے ہمیں

بھی گھر بھجوادیا۔ گھر پہنچے تو والد صاحب استقبال کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ پہلی بار اتنی پٹائی ہوئی کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا لیکن یہ پٹائی سینما دیکھنے پر نہیں نافرمانی پر ہوئی تھی پھر میں نے کبھی اس طرح کی نافرمانی نہیں کی خوف کی وجہ سے نہیں محبّت کی وجہ سے۔ وہ یوں کہ والد ہم سے اتنی محبّت کرتے تھے اور اتنی نازبرداری کرتے تھے ہمارے اس طرح سینما جانے سے وہ بہت پریشان اور اداس ہوگئے تھے مارا بھی انہوں نے وفورِ محبّت سے تھا۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ محبّت اور نفرت کی نگاہ کو فوراً پہچان لیتا ہے بچّے تو محبّت اور نفرت کے بارے میں بہت ہی حسّاس ہوتے ہیں۔ والد کی شفقت کا مجھے شدّت سے احساس تھا۔ گو میں بہت چھوٹا تھا لیکن پھر بھی مجھے احساس ہوگیا تھا کہ مجھے کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیئے جس سے میرے والد کو تکلیف ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ بچّے بھی بالکل بچّے نہیں ہوتے۔

کالج کی داستان

ماری پور اسکول سے چوتھی جماعت پاس کرکے میں ملٹری کالج میں داخل ہوا۔ مجھے ۶۹ ۲۰ کالج نمبر ملا۔ ۱۹۵۶ء میں میں نے کالج سے میٹرک پاس کیا۔ کالج سے باہر آکر مجھے کالج کی قدر و قیمت معلوم ہوئی خصوصًا اس وقت جب میں نے باہر کے تعلیمی اداروں کا معیار اور ماحول دیکھا۔

کالج کی دلچسپیاں

میری دلچسپی کھیل کے میدان سے تھی۔ داخل ہونے کے سال بھر بعد ہی میں کالج بینڈ کے ڈانس گروپ میں شامل کرلیا گیا تھا یہ گروپ بینڈ کی تال پر مختلف ایکسرسائیزیں کیا کرتا تھا۔ جلد ہی میں اس گروپ کا لیڈر ہوگیا۔ دوسرے سب لڑکے کمر پر پیلی پیٹی باندھتے تھے اور میں سرخ باندھتا تھا یہ سرخ پیٹی کالج میں میرا پہلا اعزاز تھا اس کے بعد میں کالج کے پی ٹی اور جمناسٹک اسکواڈ میں منتخب ہوگیا اس میدان میں حسن کارکردگی کے لئے مجھے ایک سرٹیفکیٹ بھی ملا تھا۔

کالج میں میری دلچسپی باکسنگ رنگ سے بھی تھی۔ ۱۹۵۱ء ہی سے میں نے باکسنگ شروع کر دی تھی اور میں نے دو بار ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۶ء میں گریفن انسٹی ٹیوٹ لاہور کے باکسنگ کے مقابلے میں کالج کی طرف سے شرکت کی اور انعام حاصل کیا۔ میں کالج میں باکسنگ کا کلر تو نہیں لے سکا تھا۔ لیکن کالج کی تربیت کی بنا پر ایڈورڈز کالج پشاور میں ضرور کلر حاصل کیا۔

شرارتوں کی داستان

میرا تجربہ ہے کہ ہوسٹل میں ٹیم ورک سے شرارت کرنے میں جو مزہ ہے وہ گھر پر تنہا شرارت کرنے میں نہیں۔ دوسرے یہ کہ جب تک شرارت میں ایڈونچر کا پہلو نہ ہو وہ شرارت نہیں ہوتی کوئی اور چیز ہوتی ہے۔

کالج کی زندگی کا بڑا حصہ میں نے اسکین ہاؤس میں گزارا وہیں کھیلوں، ڈراموں اور شرارتوں کے مزے لئے۔ مثلاً سبزی کی کیاریوں اور پھلوں کے درختوں پر ہماری ٹیم اکثر حملہ کرتی تھی۔ پانی کی ٹینکی کے پاس سبزی کے کھیت تھے اتوار کے دن دھاڑے اس پر دھاوا بولا کرتے تھے کبھی کبھی پکڑے بھی جاتے تھے۔ مال غنیمت کی مرچوں اور مولیوں کا مزہ جو لنچ کے وقت ہم بڑے ٹھاٹھ سے کھاتے تھے مجھے اب بھی نہیں بھولا۔

اس طرح کالج میں ایک مرتبہ نئے سال کا جشن منایا وہ بھی خوب ہنگامہ رہا تھا۔ یہ قصہ ۱۹۵۸ء کی آخری رات کا ہے میٹرک کے لڑکے سردیوں کی چھٹیوں میں امتحان کی تیاری کے لئے اسکین ہاؤس کی چوتھی سیکشن میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور سیکنڈ ایئر کے لڑکے پانچویں سیکشن میں تھے میں میٹرک کے لڑکوں کا سرغنہ تھا۔ رات گئے تک پڑھتے رہے۔ کوئی گیارہ بجے خیال آیا کہ نئے سال کا استقبال کیا جائے چنانچہ ہم بارہ بجے کا انتظار کرنے لگے ٹھیک بارہ بجے میٹرک اور سیکنڈ ایئر میں باجماعت پلو فائٹ شروع ہوگئی وہ شور اٹھا وہ ہنگامہ کہ الاماں والحفیظ۔ سردیوں کے دن تھے پھر بھی ہاؤس ماسٹر لیفٹیننٹ (اب کرنل) شاہد محمد احمد ہڑبڑا کر اٹھے کہ کیا قیامت

آگئی۔ باہر آئے تو یہ ہنگامہ دیکھا فوراً سب کو فالن کیا بہت ناراض ہوئے ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس کے بعد وہ تو جاکر سو گئے ہوں گے لیکن ہمیں چین کہاں میں نے دوستوں سے کہا چلو گنّے توڑ کر لاتے ہیں پہلے نہر کے پل تک گئے۔ ۳۱ دسمبر کی رات لیکن ہم تو ایڈونچر کے موڈ میں تھے وہاں سے چل کر سائفن پر آگئے۔ پھر قریب کے کھیت سے گنّے توڑے اور پھر نالے کے راستے واپس آکر آکنلک ہاؤس میں آکر گنّے چوسے۔ گو آنے جانے کا راستہ مختلف تھا۔ لیکن صبح کو کھیت کا مالک پہنچ گیا۔ اور اس نے شکایت کی۔ انہوں نے کہا ان بچوں کو دن رات پڑھنے سے فرصت نہیں پھر اس سردی میں کون باہر جائے گا۔ کوئی اور ہوگا۔ بہرحال جب جرم ثابت ہوگیا تو خوب تواضع ہوئی۔

آخر میں ایک اور شرارت کا ذکر کروں گا۔ وہ یہ کہ لڑکے چھٹی کے بعد گھر سے کھانے پینے کی چیزیں لاتے تھے۔ جو مل بانٹ کے کھاتے تھے وہ اچھے رہتے تھے۔ جس نے اپنی چیز چھپاکر لاکر میں تالا لگاکر رکھی اس کی خیر نہیں تھی۔ میرے ساتھ ۲۱۱۳ ہوتا تھا۔ اس کا نام یاد نہیں کیونکہ اس زمانے میں نمبر چلتے تھے۔ اس کے سونگھنے کی قوت بہت تیز تھی وہ ہر مشکوک لاکر کو سونگھتا تھا۔ اور پھر وہ چیز غائب ہوجاتی تھی۔ اس کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ سب لڑکے سب چیزیں مل بانٹ کر کھاتے تھے۔ کسی کو اکیلے اکیلے مال اڑانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

ایک بار ایک اور دلچسپ واقعہ ہوا۔ ایک روز دوپہر کے کھانے کے وقت میرے حصّے میں کھیر کی جو پلیٹ آئی اس میں مکھی پڑی تھی۔ اس دن ہمارے انگریزی کے بہت اچھے استاد حامد علی صاحب ڈیوٹی افسر تھے۔ وہ میری میز کے پاس سے گزرے تو پوچھنے لگے حلیم کھانا ٹھیک ہے۔ ہمیں نے کہا سر آپ خود دیکھ لیجئے۔ بولے اچھا اور میں نے پلیٹ آگے کردی انہوں نے فوراً لانگری کو بلوایا۔ اور اس کے آگے پلیٹ کرتے ہوئے پوچھا یہ کیا ہے۔ وہ بھی بڑا ڈھیٹ یا ستم ظریف تھا۔ بڑے اعتماد سے بولا جناب یہ الائچی ہے۔ یہ سن کر حامد علی صاحب نے جو اس کی درگت بنائی وہ نہ پوچھئے۔

کالج کی زندگی کا یہ تذکرہ نامکمل رہ جائے گا اگر مولوی عزیز احمد صاحب کا ذکر نہ کیا جائے۔ وہ کیڈٹوں میں بہت مقبول تھے۔ ذرا سی بات پر ناراض ہوجاتے۔ اور پھر ذرا سی بات پر خوش بھی

ہوجاتے نمازی لڑکوں کی امتحان میں بھی خاص رعایت کرتے تھے ۔ ۲۰۲۷ سعید ان کو بہت تنگ کرتا تھا۔ پھر کوئی نہ کوئی ڈرامہ کرکے بہت جلد منا بھی لیتا۔ کالج میں نک نیم سے کوئی نہیں بچتا ۔ پی ٹی اسٹاف مجھے "ڈکی" کہا کرتا تھا لیکن لڑکوں میں، میں گنجے کے نام سے معروف تھا۔ کبھی بچپن میں کوئی شرارت کرتے ہوئے گرا تھا۔ پیشانی سے اوپر زخم کا نشان تھا۔ اس جگہ کے بال اڑ گئے ہوتے تھے ۔ اس وجہ سے یہ لقب ملا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اس کا برا نہیں مانا۔ خود بھی اپنے آپ کو گنجا کہہ دیا کرتا تھا ۔ وہ اس طرح کہ اگر کسی کو پیغام دینا ہوتا تو کہتا کہ اس کو بتانا کہ گنجے نے کہا ہے ۔ غرض اس طرح ہنستے کھیلتے، شرارتیں کرتے اور سزائیں بھگتتے زندگی کا وہ پیارا دلچسپ اور حد درجہ تعمیری دور گزر گیا۔

دو ناقابل فراموش شخصیتیں

اب تو زندگی کا مجھے کافی تجربہ ہو گیا ہے ۔ ہزارہا لوگوں سے واسطہ پڑا ہے بعض اہم اور بلند رتبہ لوگوں کو قریب سے بھی دیکھا ہے ۔ اور ان میں سے بعض سے متاثر بھی ہوا ہوں لیکن سوائے ایک آدھ کے کسی کا رنگ جما نہیں۔ کسی سے اس طرح متاثر ہونا کہ اس کی یاد زندگی کا ایک تجربہ بن جائے ۔ اور بات ہے اس طرح میں صرف دو اشخاص سے متاثر ہوا ایک میرے استاد راشد صاحب اور دوسرے کالج کے کمانڈانٹ کرنل رفیق۔ ہو سکتا ہے کہ اس گہرے تاثر کی وجہ یہ ہو کہ انسان کم عمری میں جس سے متاثر ہوتا ہے اسے ہمیشہ یاد رکھتا ہے ۔ اور اس کی دل میں ایک تصویر سی رہتی ہے ۔ بہر حال ان دو شخصیتوں کے حوالے سے میں نے انسانی کردار کی قدروں اور رویوں کے بارے میں بہت کچھ شعور حاصل کیا ۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۹ء تک میں راشد صاحب کا شاگرد رہا ۔ ان کے ہاؤس میں بھی رہا ۔ اس دوہرے تعلق کی بنا پر میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ۔ اور مختلف موقعوں پہ دیکھا ۔ اور آہستہ آہستہ بہت متاثر ہوا اور ان سے بہت کچھ سیکھا ۔ میں ہی نہیں ہر وہ فرد جس نے بھی پچھلے ۲۴ سال کے عرصے میں ملٹری کالج میں پڑھا

ہے یا کام کیا ہے۔ گواہی دے گا کہ کس طرح انہوں نے اپنی زندگی کالج کے لئے وقف کر دی ہے۔ نالائق لڑکوں کے ساتھ جس تحمّل او شفقت سے پیش آتے تھے اس کا خیال کر کے مجھے اب حیرت ہوتی ہے انہیں لڑکوں کو سمجھانے اور بات کو دل میں اتارنے کا ایک عجیب و غریب ملکہ ہے۔

ان کی ایک ادا جو مجھے بہت اچھی لگی جسے میں نے بھی اپنا لیا وہ یہ ہے کہ ہم لوگ جب بھی انہیں السلام علیکم کہتے تو وہ بھی جواب میں ہمیشہ اسلام علیکم کہتے تھے۔ ایک روز ہمّت کر کے ہمیں نے پوچھ لیا کہ سر آپ بھی جواب میں السلام علیکم کیوں کہتے ہیں۔ جواباً فرمایا اسلام میں پہلے سلام کرنے کا ثواب زیادہ ہے۔ اس لئے میری کوشش ہوتی ہے کہ میں پہلے السلام علیکم کہوں۔ جو آپ لوگوں کے تیز تیز السلام علیکم سے ٹکرا جاتا ہے پھر کہا سلام کیا ہے۔ سلامتی کی دعا ہے اس لئے میرا جی چاہتا ہے اپنے بچوں کو میں پہلے دعا دوں میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی چھوٹے بڑے ہر ایک کو السلام علیکم کہتے ہوں گے پھر آدمی اپنی سوچ سے پہچانا جاتا ہے بہر حال اس وقت مجھ ایسا کھلنڈرا لڑکا بھی ان کی اس سوچ سے بہت متاثر ہوا اب میری بھی یہی عادت ہے کہ ہر ایک کو پہلے سلام کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور پہلے نہ بھی کر سکوں تو السلام علیکم ضرور کہتا ہوں۔ آج تقریباً ۲۰۔ ۲۵ برس کے بعد جب کہ میں زندگی میں بہت کچھ دیکھ چکا ہوں مجھے بار بار یہ خیال آرہا ہے کہ راشد صاحب نے جو کچھ پڑھایا تھا وہ کبھی کا پرانا ہو چکا۔ ان کتابوں سے آگے بہت سی کتابیں پڑھ لیں لیکن انہوں نے جو کچھ سکھایا تھا وہ آج بھی تازہ ہے بلکہ اسی سے زندگی بنی ہے۔ پہلے سلام کرنا ہی دیکھا جائے تو یہ ایک علامت ہے اس رویّے کی کہ آدمی اچھی بات میں پہل کرے۔ کارِ خیر میں پہلا قدم اٹھائے اگر میدان جنگ ہو تو خود سینہ سپر ہو۔

کرنل (اب بریگیڈیر ریٹائرڈ) محمد رفیق کے کالج میں پہلے دور ۵۲-۱۹۵۱ء میں، میں بہت چھوٹا تھا ان کے دوسرے دور (۵۹-۱۹۵۵) میں مجھے ان کے زیرِ تربیّت رہنے کا موقع ملا۔ قیادت کے جو سبق میں نے ان سے سیکھے وہ میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ کردار کی پختگی اور حب الوطنی ان پر ختم تھی یہ ان کی شخصیّت وکردار کا اعجاز نہیں تو کیا ہے۔ کہ ان کے دور کا ہر لڑکا آج بھی

فوج میں اور سول میں اپنے مخصوص کردار اور سوچ سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ خدا کرے ملٹری کالج کو رفیق ملتے رہیں۔

ملٹری کالج سے بعد کی منزلیں

ملٹری کالج کی زیر تربیت کے زیر اثر اور میرے اپنے رجحان طبع کی وجہ سے میری منزل تو فوج ہی تھی انٹرمیڈیٹ کا امتحان ایڈورڈز کالج پشاور سے پاس کرنے کے بعد نومبر ۱۹۶۱ء میں ۲۹ پی ایم اے لانگ کورس کے لئے منتخب ہوا۔ پی۔ایم۔اے کی تربیت جو بہت کٹھن مشہور ہے مجھے کالج کے تجربے کی وجہ سے بالکل آسان لگی۔ فزیکل ٹریننگ میں، میں اپنے کورس میں عموماً اوّل آتا رہا۔ خیال تھا کہ پی ٹی میں مجھے میڈل ملے گا جو کسی وجہ سے نہیں مل سکا۔ باکسنگ میں بھی میں نے نام پیدا کیا تھا۔ باکسنگ میں ایک مخصوص اسٹائل کی وجہ سے میرا نک نیم کلے (محمد علی) پڑ گیا تھا۔

کمیشن کے بعد کے مراحل

اپریل ۱۹۶۴ء میں کمیشن حاصل کرنے کے بعد میں ۲۰ بلوچ میں پوسٹ ہوا۔ جو اس وقت آزاد کشمیر میں متعین تھی۔ بلوچ رجمنٹ میں بھی جانے کی ایک وجہ تھی۔ اور وہ یہ کہ میں خالد بن ولید سے بہت متاثر تھا۔ وہ ہر معرکے میں غازی رہے لیکن شہادت کی آرزو انہیں تڑپاتی رہی مجھے ان کی اس خواہش نے بہت متاثر کیا۔ غازی یا شہید یہ دو لفظ تھے جو میرے لاشعور کے دروازے پر دبے پاؤں دستک دیا کرتے تھے۔ چونکہ بلوچ رجمنٹ کا ماٹو غازی یا شہید ہے۔ میرے دل سے آواز آئی یہ ٹھیک ہے اپنی منزل یہی ہے چنانچہ میں نے بلوچ رجمنٹ کے لئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ جسے ارباب اختیار نے ازراہ کرم پورا کر دیا۔

میں کشمیر میں آ کو بہت خوش ہوا کیونکہ میری یونٹ ایکٹو سروس پر تھی۔ میری برسوں کی خواہش تھی کہ اپنے زور بازو کو آزماؤں اور وہ دھرتی جس نے ہمیں سب کچھ دیا ہے اس کا کچھ حق ادا

کروں ۔ چنانچہ یونٹ میں رپورٹ کرنے کے چند دن کے اندر ہی میں نے اپنی یونٹ کے سامنے بارڈر کا تمام علاقہ دیکھ لیا۔ میں روزانہ پٹرولنگ پر جانے لگا۔ جب میں دشمن کے علاقے میں قدم رکھتا تو خوشی کی ایک لہر میرے رونگٹیں رونگٹیں میں دوڑ جاتی تھی۔ مگر بہت جلد مجھے یونٹ کے ساتھ ٹل جانا پڑا۔ وہاں مشکل سے سال گزرا ہوگا کہ ایمرجنسی کا اعلان ہوگیا اور اگست ۱۹۶۵ء میں میری یونٹ پھر اسی علاقے اسی جگہ صف آرا ہوگئی۔ جہاں سال بھر پہلے میں نے پٹرولنگ شروع کی تھی۔ جنگ کا اعلان ہوا تو ہمیں سیالکوٹ کے محاذ پر آنا پڑا اب غازی یا شہید بننے کا وقت آگیا تھا۔ دوسروں کے بارے میں کہہ نہیں سکتا لیکن میں شکار پر جھپٹ پڑنے کے لئے بے چین تھا۔ میری جذباتی حالت وہ تھی وہ جو ایک پرجوش اور پراعتماد باکسر کی ہوتی ہے جو اپنے پول پیڈ سے لگا کھڑا سیکنڈز آؤٹ آف دی رنگ کی آواز سننے کے لئے بے تاب ہورہا ہوتا ہے۔

جوانی تھی خون میں گرمی تھی اس لئے مشکل سے مشکل کام کے لئے اپنے آپ کو رضاکارانہ پیش کرتا خطرہ کی بو پاکر میں مست سا ہوجاتا۔ ایک عجیب سا جنون طاری تھا۔ غازی یا شہید یہ وہ خاموش آواز تھی جو ہر وقت میرے کانوں میں آتی محسوس ہوتی تھی۔ اس لئے ایک نہیں کئی بار میدان کارزار میں دیوانہ وار گھستا چلا گیا کئی بار موت کے جبڑوں سے بچ کے نکل آیا لیکن جوش میں کمی نہیں آئی۔ اسی تگ و تاز کے لئے میرا نام ستارۂ جرأت کے لئے بھیجا گیا۔ ارباب حل و عقد نے صرف امتیازی سند کے قابل سمجھا۔ یہ ان کا کرم ہے لیکن میری منزل اور تھی۔

معرکہ کی تفصیل

تفصیل اس امر کی یہ ہے ۱۹۶۵ء کی جنگ زوروں پر تھی میری یونٹ کو کشمیر سے سیالکوٹ بارڈر پر جانے کا حکم ملا۔ سیالکوٹ اور پسرور کا راستہ کٹ چکا تھا۔ دشمن بڑی تیزی سے پیش قدمی کررہا تھا۔ شہر جالکے سے چلنا شروع کیا اور پوری رات چلنے کے بعد تقریباً ۲۰ میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ صبح سویرے ہماری کمپنی کو حکم ملا کہ گاؤں بدیانہ پر حملہ کرنا ہے۔ حملہ تو ناکام رہا۔ مگر

میں جوش میں اپنی پلاٹون لے کر ان کے پیچھے چلتا ہوا دشمن کے علاقہ میں گھس گیا۔ جس کمپنی کا حملہ ناکام ہوا تھا اس کے آدمی پیچھے کی طرف بے ترتیبی کی حالت میں بھاگ رہے تھے۔ جس وجہ سے میرے بھی کچھ آدمی ان کے ساتھ نکل گئے۔ اب میں اپنے چند آدمیوں کے ساتھ دشمن کے بالکل منہ کے سامنے ساری رات اسی طرح پڑا رہا۔ صبح ہوتے میں نے چند سبز رنگ کی وردیوں میں ملبوس سپاہیوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ انڈین ہیں۔ خون نے جوش مارا اور میں اپنے چند آدمیوں کو لے کر ان کے پیچھے بھاگا تاکہ ان کو قیدی بنا لوں۔ دشمن کا ٹولا گنّے کے کھیت میں چھپ گیا۔ میں نے ان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ اور ان کو للکارا کہ ہتھیار ڈال دو اور سامنے آجاؤ۔ پہلے جو قیدی بنا وہ ایک ڈاکٹر تھا اس نے اپنے بازو پر پٹی باندھی ہوئی تھی اور ریڈ کراس کا نشان لگا ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ یہ میڈیکل کور سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا ہندو سپاہی جس نے میرے سامنے ہتھیار ڈالے وہ ہندوستان کی دوراجپوت بٹالین سے تھا اس کا نام چنیا لال تھا۔ بجائے ان دونوں کو مارنے یا تکلیف پہنچانے کے میں نے ان کو سگریٹ دیا۔ پانی پلایا۔ اور پھر ان سے خبریں حاصل کیں۔ میرے ساتھی ان کو مارنا چاہتے تھے۔ مگر میں نے انہیں اس سے باز رکھا۔ اور تاکید کی کہ اب یہ ہماری امانت ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کے جہاز آئے اور انہوں نے ہماری پوزیشن پر حملہ شروع کر دیا۔ مشکل سے جان بچائی اور واپس اپنے مورچوں میں آگیا۔ جب میں نے ان قیدیوں کو اپنے کمپنی ہیڈ کوارٹر میں بھیجا تو میرا کمپنی کمانڈر حیران رہ گیا۔ کیونکہ میں کسی کو بتلائے بغیر دشمن کے پیچھے بھاگ پڑا تھا۔ دوسری رات کو ہمیں آرڈر ملا کہ دشمن پر پیچھے سے حملہ کرو یہ کافی مشکل مرحلہ تھا۔ مگر رات کی تاریکی میں اپنے آدمیوں کو لے کر دشمن کے دفاع کے پیچھے چلا گیا اور فوراً مورچے کھودنے شروع کر دیئے تاکہ صبح ہوتے اگر گولہ باری شروع ہو جائے تو یہ کام آئیں گے تقریباً صبح کے ۵ بجے ہوں گے ابھی تک میری پلاٹون نے اپنے مورچے مکمل نہیں کئے تھے کہ سامنے تقریباً ۲۰ گز کے فاصلہ پر دشمن کے آدمی نظر آئے جو اپنے مضبوط مورچوں میں بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی میرے خون نے جوش مارا۔ میں اپنے پلاٹون کے چند سپاہیوں کو لے کر ان کی طرف بڑھا سوچا کہ

ان کو قیدی بنا لوں تاکہ دشمن کی صحیح خبریں مل سکیں۔ میں نے اپنی دونوں ایل ایم جی کو ایک طرف لگایا۔ اور للکارا کہ ہتھیار ڈال دو۔ اب تم لوگ قیدی ہو گئے ہو۔ مگر جواب میں انہوں نے ہم پر فائرنگ شروع کر دی۔ ایک گولی تو میرے دونوں پاؤں کے درمیان میں آکر گری میں فوراً گنے کے کھیت کی آڑ میں ہو گیا۔ وہیں پر میری ایک ٹینک شکن رائفل تھی جسے ۱۰۶ ملی میٹر آر آر کہتے ہیں ان سے ان پر فائر کرایا۔ ایک طرف سے ایل ایم جی نے فائر شروع کر دیا اور دوسری طرف سے میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان پر زوردار حملہ کر دیا۔ ہمارا پر زور نعرہ اور فائر کی آواز سن کر وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے لیکن پھر بھی ان کے ۹ آدمی مارے گئے۔ اور دو سپاہی پکڑے گئے۔ اس دوران صبح کا وقت ہو چکا تھا اور دھوپ بھی نکل چکی تھی۔ دشمن کا دیدبان الہڑ اسٹیشن کے ایک بہت بڑے درخت پر بیٹھا تھا۔ اس نے ہم پر آرٹلری کا فائر کرایا جس کی وجہ سے میں نے اپنے آدمیوں کو فوراً اپنے مورچوں کی طرف جانے کا حکم دیا۔ گو ہمارے مورچے پوری طرح مکمل نہیں تھے۔ پھر بھی میں نے دونوں قیدیوں کو اپنے ساتھ مورچے میں رکھا۔ تاکہ یہ لوگ آرٹلری کے فائر سے زخمی نہ ہو جائیں۔ ان کو دیکھ کر بڑا رحم آتا تھا۔ جب میں نے ان قیدیوں کو اپنے کمپنی کمانڈر کے پاس بھیجا تو وہ بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ ایکشن بھی میں نے انہیں بتائے بغیر کیا تھا۔ اس ایکشن پر میرا نام ستارہ جرأت کے لئے بھیجا گیا۔ گو بعد میں مجھے امتیازی سند ملی۔

امتیازی سند کا فرمان

۲۰ ستمبر ۶۵ء کو ڈی کمپنی اپنے نشانہ پر قبضہ کرنے کے بعد اسے آر ایس کے قریب جوار میں اپنے آپ کو دوبارہ منظم کر رہی تھی۔ صبح ساڑھے پانچ بجے انٹیلی جنس کے ذرائع سے اطلاع ملی کہ تھوڑے فاصلے پر دشمن کا ایک اجتماع ہے۔ نمبر ۱۰ پلاٹون کی کمان کیلئے سیکنڈ لیفٹیننٹ محمد عبدالحلیم نے رضاکارانہ طور پر پیش کش کی۔ کہ میں اس جگہ کو دشمن سے صاف کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ دس جوان اور دو لانس نائیک لے کر انہوں نے دشمن کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ دشمن نے فوراً ان پر خود کار

چھوٹے ہتھیاروں کا فائر کھول دیا۔ بعد کو پتہ چلا کہ وہاں دشمن کی پوری ایک پلاٹون موجود تھی۔ جو دفاعی پوزیشن لئے ان پر صرف ۶۰ گز کے فاصلے سے فائر کر رہی تھی۔ لیفٹیننٹ حلیم نے دشمن کے خودکار اور چھوٹے ہتھیاروں سے اتنے کم فاصلے سے فائر کی زد میں ہونے کے باوجود آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے اور آخرکار ایک ہلے میں دشمن پر دھاوا بول دیا اور دشمن کے دس آدمیوں کو وہیں ختم کیا اور دو کو جنگی قیدی بنالیا۔ باقی ماندہ افراد اونچی فصل کی آڑ میں بھاگ کھڑے ہوئے لیفٹیننٹ حلیم کی پارٹی یہ معرکہ سر کرنے کے بعد صحیح وسالم واپس لوٹی۔

دشمن کے فائر کی زد میں ہوتے ہی اس افسر نے جس طرح اپنی اور پارٹی کی جان جوکھوں میں ڈالتے ہوئے دشمن کو زیر کیا۔ اور جس دلیری عزم اور سمجھ کا ثبوت دیا اس سے کمپنی کا حوصلہ بہت بلند ہوا اس نمایاں کارکردگی کی بنا پر ۹ مارچ ۱۹۶۶ء کو امتیازی سند عطا ہوئی۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد میری یونٹ سیالکوٹ آگئی۔ اور دو سال بعد یہ یونٹ کومیلا (مشرقی پاکستان) چلی گئی۔ ایک سال کے بعد میرا تبادلہ ۱۴ ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں جی۔ایس۔او (تھری) کی حیثیت سے ہوگیا۔ ۱۹۷۰ء میں پھر میری تبدیلی ۴۴ بلوچ کوئٹہ میں ہوگئی۔ ابھی میں وہاں چند مہینے ہی رہا تھا کہ میری موجودہ یونٹ یعنی ۴ بلوچ اپریل میں کھڑی ہوتی اور میں یہاں آگیا۔ پہلے ایبٹ آباد پہنچا اور پھر یونٹ کے ساتھ کھاریاں آگیا۔ ۱۹۷۱ء میں جب ملک کے پھر حالات خراب ہوتے اور ہم لوگوں کو دوبارہ ہندوستان کے خلاف صف آرا ہونا پڑا تو ایک بار پھر مجھے اپنی پیشہ وارانہ صلاحیت دکھانے کا موقعہ ملا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں میں نے پلاٹون کمان کی تھی۔ اور اب کمپنی کی کمان کر رہا تھا۔ اس دفعہ ملک کا دفاع کرتے اور دشمن پر حملہ کرتے ہوئے شہادت تو نصیب نہ ہوئی پر زخمی ضرور ہوگیا اور اس طرح شہادت کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔

دسمبر ۷۱ء کی معرکہ آرائی

۱۹۷۱ء کی جنگ میں جب میں ایک کمپنی کی کمان کر رہا تھا۔ لاہور بارڈر پر سائفن کے پاس

مقبول پور سیکٹر میں میری یونٹ صف آرا تھی۔ مجھے میرے بٹالین کمانڈر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اگر جنگ ہوئی تو انڈیا کی طوطی پوسٹ پہلا ہدف ہوگی اس لئے میں رینجرز کے کپڑوں میں بارڈر کے ساتھ ساتھ دشمن کے علاقے کی ریکی کرتا اور اس کے مورچوں کی پوزیشن معلوم کرتا اس طرح مجھے دشمن کے مورچوں اور مائن فیلڈز کا مکمل علم ہوگیا۔ میں نے اپنا پلان اور ریکی تو پہلے ہی مکمل کر لیا تھا اور بٹالین کمانڈر سے اس کی منظوری لے لی تھی۔ ۳ر دسمبر کی شام کو تقریباً ۵ بجے مجھے حکم ملا کہ آج آدھی رات کو میں نے حملہ کرنا ہے۔ میرے دائیں اور بائیں کی دوسری یونٹیں شام کے چھ بجے حملہ کریں گی۔ ٹھیک ۸ بجے حکم ملا کہ میں رات کے بارہ بجے دشمن کی طوطی پوسٹ پر حملہ کروں اپنے منصوبہ کے مطابق میں نے تیاری کر لی تھی۔ جانے سے قبل میں نے دل میں خدا سے دعا مانگی کہ خدایا مجھے میرے مقصد میں کامیابی عطا کر ورنہ پھر میں اپنے ماتحتوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ اور شہادت کے لئے عاجزی سے دعا مانگی یہاں تک کہ میرے دونوں رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ میں اس وقت غیر شادی شدہ تھا۔ کسی قسم کا کوئی غم و فکر نہیں تھا۔ بس جوش تھا اور جذبہ تھا۔ اور سوچا کہ اب وقت آگیا ہے عہد وفا ایفا کرنے کا۔ ۳ر دسمبر کو جب میں حملہ کے لئے اپنے ساتھیوں کو لے کے چلا تو راستے میں، میں نے اپنے پلان میں تھوڑی سی تبدیلی کی اور وہ یہ تھی کہ میں دشمن پر بائیں طرف سے حملہ کروں۔ اس لئے میں نے ایف یو پی جو بنائی تھی اس کو تبدیل کر دیا۔ اور اب دشمن کے علاقہ میں ان کی پوزیشن کے پیچھے اپنے آپ کو منظم کرنا تھا کیونکہ بعد کی اطلاعات کے مطابق دشمن نے ہر طرف مائن بچھا رکھے تھے۔ اونچی اونچی گھاس اور دشوار گزار راستے سے ہوتا ہوا دشمن کی دفاعی لائن کے پیچھے چلا گیا۔ چاندنی رات تھی اس لئے رخ صحیح قائم رکھ سکا۔ اور پھر دشمن کی پوسٹ پر جو بڑے بڑے درخت تھے وہ بھی ہماری راہنمائی کر رہے تھے وقت مقررہ پر ہماری آرٹلری نے دشمن کی پوسٹ پر فائر کرنا شروع کر دیا۔ ایف یو پی تبدیل ہو جانے کی وجہ سے راستہ لمبا ہو گیا تھا اس لئے فائری امداد کی سخت ضرورت تھی جو کہ مل گئی جوں ہی ہم لوگ دشمن سے تقریباً دو سو گز دور تھے تو آرٹلری فائر بند ہو گیا۔ اور ہم نے ایک

زوردار نعرہ کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا اچانک ان پر حملہ ہو جانے کی وجہ سے دشمن گھبرا گیا کیونکہ وہ اس طرف سے حملہ آنے کی توقع نہیں کر رہا تھا جس طرف سے ہم لوگوں نے اس پر حملہ کیا۔ دشمن کے مورچے ۲۰ فٹ اونچے اور ۲۰ فٹ چوڑے بند پر بنے ہوئے تھے۔ میرے دو آدمی تو پہلے ہی ہلے میں دشمن کے ڈائریکٹ فائر سے شہید ہو گئے اور کچھ کھائی میں گر گئے جس کا ہمیں پہلے سے علم نہیں تھا۔ حملہ رک چکا تھا۔ میرے شور و غل کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا اور مجھے خطرہ تھا کہ میرا حملہ کہیں ناکام نہ ہو جائے۔ اس وقت میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ اگر میں ناکام واپس گیا تو پھر میں کیا منہ دکھاؤں گا۔ اگر میں نے مرنا ہے تو پیچھے بھاگتے ہوئے بھی گولی کھا کر مر سکتا ہوں اگر موت نہیں لکھی ہوئی ہے تو یہ گولیاں میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں اس وقت جب دشمن ہم پر فائر کر رہا تھا تو وہ بند کی اونچائی سے فائر کر رہا تھا۔ اور ہم لوگ نیچے تھے۔ اس لئے جو گولیاں ہم پر گر رہی تھیں وہ کمان کی طرح خم کھاتی ہوئی گر رہی تھیں۔ اس وقت میرے دماغ نے کام کیا اور میں سیدھا ان گولیوں کی بوچھاڑ کے نیچے سے ہوتا ہوا اکیلا بند کے اوپر چڑھ گیا اور اپنی سٹین گن سے پہلے مورچے کو خاموش کیا۔ بدقسمتی سے میری سٹین گن نے کام کرنا بند کر دیا تو میں نے ایک دستی بم نکالا۔ بائیں ہاتھ سے اس کا پن نکالا اور دوسرے مورچے کی طرف لپکا جس نے میری پوری کمپنی کی پیش قدمی کو روک رکھا تھا۔ چاندنی رات کی وجہ سے مورچہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ اور وہ سوراخ بھی جہاں سے دشمن گن فائر کر رہا تھا۔ سوچا کہ نزدیک جا کر سوراخ کے اندر گرنیڈ پھینکوں تقریباً پانچ چھ قدم آگے بڑھ کر جونہی میں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اسی مورچے سے پھر فائر آیا۔ اور میرا دایاں ہاتھ زخمی کر دیا۔ خدا کو میری زندگی منظور تھی اور میرا دماغ حاضر تھا۔ میں نے وہی گرنیڈ دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر بنکر میں پھینک دیا۔ اور اس کے پھٹتے ہی گن خاموش ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی میری پوری کمپنی بند کے اوپر آگئی۔ میں نے فوراً اپنی پٹی کی۔ اپنے آدمیوں کو تینوں اطراف بھیجا کہ جو دشمن بھی نظر آتے ختم کر دو۔ مگر رات کی تاریکی میں وہ لوگ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ادھر اونچی اونچی گھاس کا بھی فائدہ اٹھایا۔ میرے ساتھ سے دو سکھ

مارے گئے اور ایک پکڑا گیا۔ وہاں پہ کافی لاشیں اور گولہ بارود ہمارے ہاتھ آیا اس کے بعد دوسرے مرحلے میں دریا کے کنارے تک جانا تھا۔ دایاں ہاتھ زخمی تھا اس لئے میں نے بائیں بازو پہ ایک ایل ایم جی لٹکائی اور پوری پوسٹ میں گولیوں کی بارش کردی اس کے بعد میں اسی زخمی حالت میں دوسرے مرحلے کے لئے چل پڑا۔ لیکن میری کوئی مزاحمت نہیں ہوتی۔ کیونکہ دشمن دریا عبور کرکے راوی کے دوسرے کنارے پہنچ چکا تھا اور اس طرح پورے علاقے پر قبضہ کرکے صبح ۲ بجے کامیابی کا اشارہ دے دیا۔ بٹالین ہیڈکوارٹر جانے کے لئے مائن فیلڈ سے ہوکر جانا پڑتا تھا۔ اس لئے جس قیدی کو پکڑا تھا۔ اس کو ساتھ لیا اور وہ صاف راستے سے مائن فیلڈ سے باہر نکال لایا۔ اور میں اسے اپنے ساتھ لے کر بٹالین ہیڈکوارٹر پہنچا۔ وہاں میری مرہم پٹی کرکے مجھے ایم۔ڈی۔ایس بھیج دیا۔ اور پھر وہاں سے لاہور سی۔ایم۔ایچ چلا گیا۔ میرے اس ایکشن پر میرے بٹالین کمانڈر نے ستارہ جرأت کے لئے نام بھیجا۔ مگر ہر بھیجے گئے نام کو اعزاز نہیں ملتا۔ اور یہ ضروری بھی نہیں ہوتا جنگ میں بڑے بڑے جیالے قربان ہوجاتے ہیں اور کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ بڑی بڑی جرأتوں کے نشان بے نشاں رہتے ہیں۔

نے چراغ نے گلے لیکن اجر تو اللہ کے پاس ہے۔ جو علیم اور خبیر ہے

۱۹۷۱ سے بعد کی منزلیں

۱۹۷۱ میں میں نے اسٹاف کالج کا کورس کیا تھا۔ اور پھر دو سال بھی بریگیڈ میں اسٹاف ڈیوٹی پر مامور رہا۔ ۱۹۷۶ میں دوبارہ ۴۰ بلوچ رجمنٹ میں آگیا۔ اس وقت یہ یونٹ گوجرانوالہ میں تھی میرے آتے ہی پلٹن کاونٹر انسرجنسی کے سلسلے میں بلوچستان بھیج دی گئی اس طرح میں بلوچستان کے پہاڑوں میں خاک چھانتا رہا۔ اس کے بعد خدا نے مجھے بٹالین کی کمان کرنے کی عزت عطا کی اور ۱۹۷۷ سے اب تک اسی بٹالین کی کمان کر رہا ہوں۔

اظہارِ تشکّر

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ماں باپ صرف ضروریات زندگی ہی پوری کرتے ہیں۔ اصل کام یعنی ذہنی اور اخلاقی تربیت اور کردار کی تعمیر تو استاد کرتے ہیں اور یہ سب چیزیں مجھے ملٹری کالج میں ملیں۔ اور میں نے ان سے اپنی ہمّت بھر فائدہ اٹھایا۔ اس لئے میں اپنے استادوں کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ میں ان سب کا ممنون ہوں۔ اور ان آپا جانوں کا بھی جنہوں نے ماری پور سکول میں مجھے پیار سے پڑھایا۔ پیار سے سمجھایا۔ اور پیار سے سزائیں دیں۔ میری یہ محسن جہاں بھی اور جس حال میں ہیں انہیں میرا سلام پہنچے میری دعائیں پہنچیں۔ میری عقیدتیں پہنچیں۔

مصنّف کا تبصرہ

ہم نے اس کتاب کے سلسلے میں جو سوالنامہ اعزاز یافتہ مجاہدوں کو بھیجا تھا اس میں ان کے بچپن اور لڑکپن کے واقعات کو بطور خاص تفصیل سے بیان کرنے کو کہا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے اور یہ دکھایا جائے کہ غازی اور شہید بھی نارمل انسان ہوتے ہیں اور عام انسانوں کی سی نارمل زندگی گزارتے ہیں۔ شوخی اور شرارت کیا ہے۔ شخصیت کا ایک اظہار ہے بلکہ قیادت کی ایک صورت!

لیفٹیننٹ کرنل محمد یوسف ستارۂ جرأت

ایف ایف آر

لیفٹیننٹ کرنل محمد یوسف ستارہ جرأت۔ ایف ایف آر

پس منظر

ضلع مردان کی تحصیل صوابی میں ایک گاؤں لاہور نام کا ہے۔ یہ لاہور میرا آبائی گاؤں ہے میرے والد محمد ابراہیم خاں کا تعلق اسی لاہور کے ایک معزز پٹھان گھرانے سے تھا۔ مجھے ان کی زندگی کی تفصیلات کا تو زیادہ علم نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ وہ فرنٹیئر فورس رجمنٹ میں رہے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں حصّہ لیا تھا۔ ۱۹۲۲ میں صوبیداری سے ریٹائر ہو کر گھر آگئے تھے۔ اور کھیتی باڑی شروع کر دی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں اپنی وفات تک وہ اسی مشغلے میں مصروف رہے۔

میرے والد مرحوم ایک سیدھے سادے، صاف دل، اور صاف گو انسان تھے۔ تھوڑی بہت تعلیم فوج میں حاصل کی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً پچاس برس تک کھیتی باڑی کے علاوہ انہوں نے کچھ اور نہیں کیا وہ اسی میں مگن رہے۔ اپنی محنت سے حق حلال کی روزی ہی کو وہ سب کچھ سمجھتے تھے۔ ایک لحاظ سے ان کی دنیا بہت محدود تھی۔ لیکن قدریں بہت مستحکم

تھیں۔ گاؤں میں کیا چالاک، تیز، خود غرض اور تنگ دل اور جھوٹ کے دلدادہ نہیں ہوتے؟ ہو
اور ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ایک سادہ اور صاف گو انسان تھے لفظ "صاف گو" پر میں زور
دینا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ صاف گوئی کو کردار کی جان سمجھتا ہوں۔ انسان پہلے بہت کچھ ہو
ہے تب کہیں جا کر صاف گو بنتا ہے۔

اللہ تعالیٰ والدہ ماجدہ کو سلامت رکھے بہت ضعیف ہو چکی ہیں لیکن روزے نماز کی پابندی
میں فرق نہیں آیا۔ گھر سے کسی جاندار کو بھوکا پیاسا نہیں جانے دیتیں۔ پرندہ آیا تو اس کے سامنے دا
پھینک دیا۔ جانور آیا تو روٹی کا ٹکڑا ڈال دیا۔ اور اگر انسان نے دستک دی تو پھر اس کی تواضع
کرنی ہی کرنی ہے۔

پیدائش اور بچپن

میں اپنے گاؤں لاہور میں، ۱۲ رمئی ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوا۔ میرا بچپن عام پٹھان لڑکوں
کی طرح دن میں دوڑتے بھاگتے، غلیل سے پرندوں کا شکار کرتے، گھر کے پاس گلیوں میں گولیاں
کھیلتے یا جوہڑوں میں ڈبکیاں لگاتے گزرا۔ رات کو اکثر قصے کہانیاں سنا کرتے تھے والد دن بھر
زمینوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے والدہ گھر کے کام کاج میں لگی رہتی تھیں۔ مجھے یاد نہیں
کہ کبھی انہوں نے خاص طور پر اپنے پاس بٹھا کر کسی خاص قسم کی تربیت کی ہو۔ اب ستارۂ جرأت
کے بعد کہانیاں بنانے لگوں تو اور بات ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ والدین کے ساتھ بہت کم
وقت گزرتا تھا۔ لیکن اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ بچہ اس فضا اور اس ماحول سے سیکھتا ہے
جس میں وہ پرورش پاتا ہے اور والدین کا اصل سکھانا وہ ہوتا ہے جو وہ خاموشی سے بغیر کچھ کہے
یا بتائے اپنے رویے اپنے طرز زندگی سے لاشعوری پر سکھلاتے ہیں تو اس لحاظ سے میں کہوں گا
کہ سادگی، صاف گوئی اور قناعت پسندی کی فضا میرے گھر ہی میں نہیں اس ماحول میں رچی بسی
تھی، جس میں میں نے اپنا بچپن گزارا۔

ابتدائی تعلیم

چوتھی جماعت تک میں نے اپنے گاؤں ہی کے لوئر مڈل اسکول میں پڑھا۔ اس کے بعد قریبی گاؤں کے مڈل اسکول میں داخلہ لیا تھا۔ یہ قریبی گاؤں بھی پانچ میل کے فاصلہ پر تھا۔

بچپن یا اسکول کے زمانے کا کوئی واقعہ

جب راشد صاحب کا سوالنامہ مجھے سیالکوٹ میں ملا تو میں نے والدہ اور دیگر عزیزوں کو کہا تھا کہ میرے بچپن کا کوئی واقعہ یاد ہو تو لکھیں ان کا جواب نفی میں آیا۔ مجھے تو کوئی خاص بات یاد نہیں جس سے کوئی نفسیاتی نکتہ نکالا جا سکے۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ میں بچپن میں بالکل عام سا لڑکا تھا۔ کسی خصوصی صلاحیت کے کوئی خاص آثار نہیں تھے۔

ملٹری کالج کا دور

ملٹری کالج میں، میں چھٹی جماعت میں اگست ۱۹۵۱ء میں داخل ہوا۔ اور ۲۰۹۸ کالج نمبر ملا رہنے کے لئے برڈووڈ ہاؤس (اب محمود غزنوی ہاؤس) حصے میں آیا۔ اس ہاؤس کی نمبر چھ سیکشن میں میں سارے وقت رہا۔

کالج میں، میں ایک اوسط درجے کا گمنام سا طالب علم تھا۔ کسی میدان میں کوئی خصوصی امتیاز حاصل نہیں کیا۔ نہ کوئی ایسی ذاتی خصوصیت تھی جس سے شہرت ملے۔ کالج میں کم و بیش ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی نک نیم ضرور ہوتا ہے عموماً یہ کسی نمایاں خوبی یا خامی کو بنیاد بنا کر رکھا جاتا ہے۔ میں چونکہ خاموش طبیعت مرنجاں مرنج قسم کا بیک گراؤنڈ میں رہنے والا لڑکا تھا۔ اس لئے ساتھیوں کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا اور کوئی نک نیم میرے ساتھ نہیں چپکا۔ میں یوسف ہی کے نام سے معروف تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں درویش تھا اپنے حصے کی چھوٹی موٹی شرارتیں بھی کرتا تھا،

اس زمانے میں کالج کے آس پاس (اور کالج کے اندر بھی) کھیتوں اور پھلوں کے درختوں پہ رات کو ہاتھ صاف کرنے کی روایت چلی آ رہی تھی۔ میں نے بھی اسے برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص مزہ نہیں آیا۔ اصل میں، میں تنہائی پسند تھا اور وقت ملے تو تاریخ وغیرہ کچھ پڑھنا پسند کرتا تھا۔ نماز وغیرہ دباؤ سے نہیں اپنی مرضی اور خوشی سے پڑھتا تھا۔

ہاں تو میں رات کو مہم جوئی کی بات کر رہا تھا ایک آدھ بار پکڑا بھی گیا۔ ہر بار مختلف سزا ملی۔ خدا سلامت رکھے برڈوڈ ہاؤس میں ہمارے ہاؤس ماسٹر کیپٹن اسماعیل بڑے سخت آدمی تھے۔ کشتی کا شوق تھا۔ ہاؤس ہی میں اکھاڑہ تھا اس میں لڑکوں کو زور کرواتے تھے۔ لیکن سزا کے طریقے نت نرالے تھے۔ مثلاً سردیوں میں۔ صبح سویرے ٹھنڈے پانی سے نہانے کی سزا ملی لیکن اسی قصور پر گرمیوں میں سہ پہر کو فلیگ اسٹاف کے پاس کے بڑے کنویں کا رہٹ چلانا پڑا۔ مجھے یاد ہے ایک بار سردیوں میں صبح سویرے ننگے پیر جھنڈا لہرانے کی پریڈ کرنا پڑی تھی۔ اس زمانے میں سیکشنز میں پنکھے نہیں تھے۔ سب لڑکے گرمیوں میں باہر صحن میں سوتے تھے۔ جب میں نیا نیا داخل ہوا تھا اور بی سیکشن میں تھا تو شام کو کھیلوں سے پہلے بھاری چارپائیوں کو کھینچ کر صحن میں لانا اور صبح سویرے پی ٹی سے پہلے واپس پہنچانا بڑا مسئلہ تھا۔ کالج سے میں نے ۱۹۵۵ء میں پی اے اسپیشل کا امتحان پاس کیا۔

کمیشن اور اس کے بعد

اکتوبر ۱۹۵۹ء میں، مجھے ۲۵ پی ایم اے، لانگ کورس کے لئے منتخب کیا گیا۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں پاس آؤٹ ہوا۔ اور مجھے ۱۲ ایف ایف آر سے وابستہ کیا گیا جو عام طور پر واریرز کے نام سے مشہور ہے میری پہلی پوسٹنگ کے وقت ۱۲ ایف ایف پشاور میں تھی۔

ستمبر ۶۵ تک پیشہ وارانہ تربیت کے سلسلے میں مختلف آرمی اسکولوں میں کورسز کئے جب جنگ چھڑی تو ۱۲ ایف ایف آر جمب جوڑیاں سیکٹر میں برسرپیکار ہوئی اور واریرز نے وار پہ

ہونے کا بھرپور ثبوت دیا۔ ۶ ستمبر کو جب میرے کمپنی کمانڈر میجر منیر شہید ہو گئے تو ان کی جگہ میں نے کمپنی کی کمان کی ذمہ داریاں سرانجام دیں۔

۱۹۶۶ء میں مجھے ای، آر، ای پر ای، ایم، ای سنٹر میں تعینات کر دیا گیا۔ ۱۹۶۹ء تک وہیں رہا پھر مجھے اپنی پلٹن یعنی ۱۲ ایف ایف آر، وار ایریز میں پوسٹ کیا گیا جو اس وقت بھی پشاور ہی میں تھی۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں یہ پلٹن کھاریاں پہنچی۔ جہاں سے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان کے لئے رخت سفر باندھا۔ ۴ اپریل کو کراچی سے ڈھاکہ کے لئے پرواز کی۔ اسی روز شام کو ڈھاکہ ایئر پورٹ پر اترے اور جاتے ہی دفاعی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔

۱۴ اپریل ۱۷ء کو وہ معرکہ ہوا جس کو سر کرنے کے سلسلے میں مجھے میرے سینئرز نے ستارۂ جرأت کے اعزاز کے قابل سمجھا۔ بجائے اس کے کہ میں خود اس مہم کی کارروائی بیان کروں، ستارۂ جرأت کا سفارش نامہ نقل کر دینا زیادہ مناسب ہو گا۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

۱۲ ایف ایف کی اے کمپنی کے آفیسر کمانڈنگ پی اے ۶۵۱۶ میجر محمد یوسف کے سپرد قصبہ لکشم کو باغیوں اور اندر گھس آنے والے شرپسندوں سے صاف کرنے کی ذمہ داری کی گئی تھی۔ اطلاع یہ تھی کہ یہ قصبہ دشمنوں سے بھرا ہوا ہے۔ ۱۴ اپریل ۱۹۷۱ء کو صبح ۸ بجے کے قریب اس کمپنی نے (جس میں ایک پلاٹون کم تھی) کو میلا لکشم روڈ پر لکشم کی طرف آگے بڑھنا شروع کیا۔ سوا نو بجے کے قریب جب کمپنی کے ہراول دستے علی سوار بانار کے گردونواح میں پہنچے تو اگلی پلاٹون کے پٹرول سیکشن پر باغیوں نے بہت ہی قریب سے فائر کھولا کمپنی کمانڈر میجر محمد یوسف تیزی سے آگے بڑھے اور پلاٹون کے کمانڈر کے ساتھ، پٹرول کمانڈر کے پاس صورت حال کا جائزہ لینے پہنچے۔ اس وقت تک دشمن عناصر نے تقریباً ۲۰ خودکار ہتھیاروں سے اور ۳ انچ کے مارٹرز سے ساری کمپنی پر حملہ کر دیا تھا دشمن نے اپنے دفاع کو گھوڑے کے نعل کی شکل میں منظم کیا تھا۔ جو ۵۰۰ گز کے علاقے پر پھیلا ہوا

تھا۔ چونکہ بائیں بازو سے بہت گھن گرج کے ساتھ بہت صحیح فائر آرہا تھا۔ کمپنی کمانڈر نے فوراً اس سے نبٹنے کا فیصلہ کیا۔ میجر محمد یوسف، پٹرول سیکشن کو منظم کرنے کے بعد فوراً واپس آتے اور لیڈنگ پلاٹون ویپن سیکشن اور اندرونی سیکشن کو ساتھ لے کر دشمن عناصر کے دوسو گز کے قریب تک جا پہنچے۔ اور وہاں ان کے دائیں بازو کے خلاف فائر کھولا اس کے ساتھ کمپنی کمانڈر نے نمبر ۳ پلاٹون کو دشمن عناصر پر دائیں بازو سے حملہ کرنے کا حکم دیا اور خود ویپن سیکشن اور نمبر دو پلاٹون سے دشمن پر حملہ کیا اور دشمن کے دفاع کو صحیح صحیح نشانہ بنایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نمبر تین پلاٹون آگے بڑھ سکی اور دائیں طرف سے حملہ کرنے کی پوزیشن میں ہوگئی۔ اس پلاٹون کی پیش رفت، ویپن سیکشن اور لیڈنگ پلاٹون کے فائر کے ساتھ اتنی اچھی طرح مربوط تھی کہ دائیں بازو کے دشمن عناصر حیرت زدہ ہو گئے۔ اور ان کی توجہ اور ان کے فائر کا رخ دائیں طرف ہو گیا۔ تاکہ وہ نمبر تین پلاٹون کو آگے بڑھنے سے روک سکیں اب میجر محمد یوسف نے دشمن کے دفاع کو توڑنے کا ایک موقعہ پایا۔ اور انھوں نے نمبر دو پلاٹون کی خود قیادت کرتے ہوئے دشمن کے بائیں طرف حملہ کیا۔ اس تیز و تند کارروائی سے دشمن کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور پیچھے سات لاشیں چھوڑ گیا۔

اس تمام عرصے میں میجر یوسف نے اپنے ذاتی تحفظ کی قطعاً پرواہ نہیں کی اور بہت اطمینان سے بہت سوچ سمجھ کر خطرے مول لئے جس کی وجہ سے یہ کامیابی حاصل ہوسکی۔ اس تمام کارروائی کے دوران وہ اپنی کمان پر چھائے رہے اور اپنے جارحانہ عزم اور ولولے سے ہر درجہ کے رینکس کے حوصلے کو بلند رکھا۔ میجر یوسف کی منصوبہ بندی اور تکمیل دونوں اعلیٰ درجہ کی تھیں۔ انکی خود اعتمادی اور قوت فیصلہ سے ان کے جوانوں کا حوصلہ ہوا اور ان کے دل بڑھے۔

میجر یوسف کی غیر معمولی جرأت اور ولولہ انگیز قیادت کی بنا پر ان کے لئے ستارۂ جرأت کے اعزاز کی سفارش کی جاتی ہے۔

آج ۱۱ رمئی ۱۹۷۱ء کو کومیلا اسٹیشن سے کمانڈر نو ڈویژن میجر جنرل شوکت رضا کے دستخطوں

سے جاری ہوا، اس سائٹیشن پر دستخط تو قاعدے کے مطابق ڈویژن کے کمانڈر جنرل شوکت رضا صاحب کے ہیں لیکن اس کا ابتدائی مسودہ میرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو لیفٹیننٹ جنرل) خوشدل آفریدی نے لکھا تھا۔ ہمارے بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر سعداللہ خان تھے جن کی کتاب ایسٹ پاکستان ٹو بنگلہ دیش میں ہماری بٹالین واریرز کا ذکر بھی ہے اس کے بعد کے واقعات تو تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان کو دہرانے سے کیا حاصل بہرحال یہ میری خوش بختی ہے کہ میں اب اپنی پرانی یونٹ ۲۱ ایف ایف آر کو کمان کر رہا ہوں۔

مصنّف کا تبصرہ

کرنل یوسف نے اپنے سوانحی خاکے میں حددرجہ انکسار سے کام لیا ہے۔ اور اپنے زندگی کی تصویر کھینچنے میں بہت ہلکے رنگ استعمال کئے ہیں۔ اگر ستارۂ جرأت کے فرمان کی نقل شامل احوال نہ ہوتی تو ان کارناموں پر پردہ ہی پڑا رہتا۔ چنانچہ جب ہم نے کرنل یوسف سے شخصیت کا گہرا مطالعہ کرنے کے لئے ان سب سے تبادلہ خیال کیا تو اپنے آپ کو پس منظر میں رکھنے کا رویّہ بھی زیر بحث آیا۔ آپ نے اپنے کارنامے کے سلسلے میں اتنے انکسار سے کیوں کام لیا؟ یہ انکسار نہیں امر واقعہ ہے حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ میں نے کیا وہ کوئی غیر معمولی کارنامہ ہرگز نہ تھا۔ میری طرح اور مجھ سے بہتر بہت سے سپاہیوں نے کارنامے انجام دیئے ہوں گے۔ وہ سامنے نہ آسکے۔ درحقیقت لڑائی ایک ٹیم ورک ہے۔ سب کو مل جل کر لڑنا پڑتا ہے۔ سب میں جرأت ہو تو تب بات بنتی ہے۔ میرا کارنامہ اگر کوئی ہے تو یہ ہے کہ ٹیم میں جو کام میرے سپرد کیا گیا تھا اس کو اسی طرح انجام دیا جس طرح میرے دوسرے ساتھیوں نے انجام دیا۔ اگر میرے سینئر افسروں نے میرے کام کو قابل اعزاز سمجھا تو یہ ان کا نقطہ نظر ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سو میں سے مشکل سے ایک سپاہی کے کارنامے منظر عام پر آتے ہیں۔ اگر کسی معرکہ میں سب ہیرو نہ ہوں تو کوئی ایک بھی ہیرو نہیں ہو سکتا۔ تو سب کو اعزازات سے بھی تو نوازا نہیں جا سکتا۔ جی ہاں۔ یہ بھی ایک مجبوری اور

ضرورت ہے لیکن جب بھی جنگی کارناموں اور جنگی ہیروز کی بات ہو تو ہمیں ان بے شمار گمنام ہیروز کو نہیں بھولنا چاہیئے جن کی زندگی یا موت نے ان کارناموں کو ممکن بنایا۔

اب آخر میں، آپ یہ بتلایئے کہ آپ کے ہیروز کون کون سے ہیں ؟

"آپ کن لوگوں سے متاثر ہوئے ہیں ؟"

"میں اپنے والدین کی سیدھی سادی بے ریا پر مشقت اور پر خلوص زندگی سے بہت متاثر ہوا ہوں اور اب بھی ہوں۔ بڑے ہوکر جن تاریخی شخصیتوں سے متاثر ہوا ان میں سرفہرست نام ٹیپو اور افغانی کا نام ہے سلطان ٹیپو سے برصغیر کی آزادی کی جدوجہد شروع ہوتی ہے۔ سید احمد شہید علی برادران، اقبال قائداعظم اسی سلسلے کی چنگاریاں ہیں۔ جمال الدین افغانی کی احیائے ملت اسلامی کی تحریک اپنے وقت سے بہت آگے کی چیز تھی۔ اب کہیں سو برس بعد وہ تحریک عملی شکل میں ایک قوت بن کر ابھر رہی ہے۔ اور اسلامی امہ کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش بار آور ہوتی نظر آتی ہے۔ انشاء اللہ پان اسلام ازم کا تصور ایک حقیقت بن کے رہے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ملٹری کالج اپنے روایتی محدود مقاصد سے آگے نکل کر سوچے اور نئے قسم کے طلبہ پیدا کرے۔ اس سے میری مراد ایسے طلبہ سے ہے جو ذہنی اور فکری قیادت کے اہل بھی ہوں جو قومی اور ملی تقاضوں کا شعور بھی رکھتے ہوں۔ جو روایتی معنوں میں ہی اچھے افسر بننے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ جو صرف کیریر کے چکر میں نہ پھنسے ہوں بلکہ اس سے آگے بھی سوچ سکتے ہوں۔ جو سوسائٹی میں اعلیٰ انسانی اور اسلامی قدروں کے آئسوٹوپ کے طور پر کام کر سکیں یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن کرنے کا بھی ہے۔"

لیفٹیننٹ کرنل فضل حسین بھٹی، امتیازی سند

آرٹلری

لیفٹیننٹ کرنل فضل حسین بھٹی امتیازی سند آرٹلری

بعض لوگ پہلی نظر میں بالکل متاثر نہیں کرتے۔ باتوں کے بادشاہ وہ نہیں ہوتے۔ ان کی خوبیاں برتنے سے ظاہر ہوتی ہیں اور ان کے جوہر مشکل حالات، صبر آزما اور پرخطر مرحلوں میں کھلتے ہیں۔ فضل حسین بھٹی کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے ان کی ایک اور خصوصیت بھی ہے کہ وہ جس منزل تک پہنچے ہیں اور جو امتیاز انہیں حاصل ہے وہ انہوں نے اپنے زور بازو سے، اپنی ہمّت اور اپنے عزم سے حاصل کیا ہے۔ اپنی راہ کے کانٹے انہوں نے خود چنے ہیں۔ انہوں نے بڑے نامساعد حالات میں زندگی کا سفر شروع کیا اور کسی رکاوٹ کو رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ ہر مرحلے پر، اپنی سوچ کو مثبت رکھا اور تحریص و ترغیب کے مواقع پر بھی اپنے دل میں کھوٹ نہیں آنے دیا۔ فضل نے میدان جنگ میں جرأت مندی کا غیر معمولی مظاہرہ کر کے امتیازی سند بھی لی ہے لیکن ان کا اصل امتیاز ان کی پرعزم جدوجہد سے پر اور احسان و ایثار سے معمور طرز زندگی ہے۔ سبحان اللہ یہ سعادت بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل فضل حسین امتیازی سند کا سوانحی خاکہ ان ہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

آغاز سفر

ضلع جہلم تحصیل چکوال میں ایک چھوٹا سا گاؤں بھٹی گوجر ہے اسی دور افتادہ اور پسماندہ گاؤں میں، میں ۶ر اکتوبر ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوا۔ ابھی تین سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ ابّا جی دوسری جنگ میں کام آئے۔ اس طرح ہم دونوں بھائی بہت کم عمری میں باپ کی کفالت اور شفقت سے محروم ہو گئے۔ مگر آفریں ہے میری والدہ پر کہ انہوں نے ہمیں احساس محرومی نہیں ہونے دیا اور خود ہر تکلیف اٹھا کر ہمیں بڑے چاؤ سے پروان چڑھایا اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں ہمیں نانا جان کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔

لیکن اصل بوجھ والدہ محترمہ پر ہی تھا۔ اپنے ذاتی تجربے اور اب دنیا کے مشاہدہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کسی بچے کو بنانے یا بگاڑنے میں اس کی ماں کا بہت ہاتھ ہوتا ہے اصل چیز ابتدائی تعلیم نہیں ابتدائی تربیت ہے۔ گھر کی جذباتی فضا اور اخلاقی ماحول ہے جس کا تعلق پیسے سے بالکل نہیں میں سمجھتا ہوں جو بچے محبت کی چھاؤں میں پلتے ہیں ان کے لئے جفاکشی اور سخت کوشی کی زندگی گزارنا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ احساس تحفظ سے خود اعتمادی از خود پیدا ہو جاتی ہے اور جس کو خود پر اعتماد ہو وہ مشکلات سے بھاگتا نہیں ان سے ٹکر لینے میں اسے مزہ آتا ہے جو اس کی کامیابی کی بنیاد بن جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ زندگی میں جو بھی تھوڑی سی بہت کامیابی میں نے حاصل کی ہے اس کی جڑیں میرے گھر میں ہیں۔ اور پھر کسی حد تک ملٹری کالج میں ہیں جو میرا دوسرا گھر ہے۔

ابتدائی تعلیم

ان پڑھ ہونے کے باوجود میری والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ میں جلد سے جلد پڑھنے بیٹھ جاؤں۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں، میں اپنے گاؤں کے ٹوٹے پھوٹے پرائمری اسکول میں پڑھنے جانے لگا۔ پہلے دن میرے اسکول جانے سے میری والدہ اتنی خوش تھیں کہ آج بھی میں اس منظر کو بھلا نہیں سکتا غربت اور بیوگی میں مسکرانے کا موقعہ کہاں ملتا ہے۔ لیکن اس روز ان کی خوشی دیدنی تھی اس روز انہوں نے میرے ناشتے کا اہتمام بھی زیادہ کیا اور مجھے بھینچ کے پیار بھی کیا۔ اور جب نانا جان مجھے اپنے ساتھ اسکول میں داخل کرنے لے چلے تو ماں بہت دور تک ہمارے پیچھے پیچھے آئیں۔ ایک بار پھر گلے لگایا۔ ان کا بس چلتا تو وہ میرے ساتھ اسکول تک آتیں۔ لیکن نانا جان نے انہیں اشارے سے منع کر دیا۔

میں دعا کا بڑا قائل ہوں خصوصاً ماں کی دعا کا۔ یقیناً یہ میری عظیم ماں کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ میں جسے پہلے پڑھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی یکایک پڑھنے کا دلدادہ ہو گیا۔ اور پہلی سے چہارم تک پڑھائی میں اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر مانیٹر رہا۔ یہ مانیٹری افسری کی طرف میرا پہلا قدم تھا۔

بھون اسکول میں داخلہ

میرے گاؤں ہٹی گوریہ کا اسکول چوتھی تک تھا۔ یہاں سے چوتھی جماعت امتیاز سے پاس کر کے پنجم میں داخلہ لینے کا سوال پیدا ہوا۔ قریب ترین ہائی اسکول بھون میں تھا۔ اور وہ بھی ہمارے گاؤں سے کم از کم آٹھ میل دور تھا۔ پھر ایک مسئلہ رہائش کا بھی تھا۔ اگر بھون اسکول میں داخلہ لے لوں تو رہوں کہاں۔ ادھر میری ماں ایک کشمکش میں گرفتار تھیں میں اس سے پہلے کبھی گھر سے نہیں نکلا تھا۔ وہ مجھے اپنے سامنے بھی رکھنا چاہتی تھیں اور تعلیم بھی دلانا چاہتی تھیں۔ بہرحال ان کی فراست ان کی محبت پر غالب آئی اور انہوں نے ناناجان کے واسطے سے مجھے بھون ہائی اسکول میں پانچویں جماعت میں داخل کرا دیا۔ رہنے کا انتظام رہنہ میں ہوا یہ گاؤں بھی بھون سے دو میل کے فاصلے پر تھا بہرصورت یہاں سے بھون روز آجا سکتا تھا۔ جن صاحب کے یہاں میرے رہنے کا انتظام ہوا تھا ان کو ہر ماہ ماں گھی آٹا پابندی سے پہنچاتی تھیں۔ کبھی کبھی یہ سامان خود میں سر پر اٹھا کر گھر سے لاتا تھا۔ رہنہ میں تقریباً دو سال رہا اور یہ دو سال میرے اوپر سخت گزرے۔ ایک تو ہر طرح کے موسم میں ہر روز چار میل چلنا، دوسرے گھر سے سامان لاد کر لانا۔ تیسرے صاحب خانہ کی ہر روز کی فرمائشیں ہیں ان سے بڑا تنگ تھا۔ وقت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ جیسا بھی ہو گزر جاتا ہے۔ یہ سخت وقت بھی کچھ تلخ کچھ خوشگوار یادیں چھوڑ کر گزر گیا۔

خوشگوار یادوں میں ایک۔ یہ ہے کہ صاحب خانہ کا لڑکا بھی میرا ہم جماعت تھا اور میرے ساتھ ہی رہنہ سے بھون آتا جاتا تھا۔ خوب گپ شپ رہتی۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سے لڑکے رہنہ سے بھون پڑھنے جاتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ان سے یاد اللہ ہو گئی اور وقت اچھا گزرنے لگا۔

بھون اسکول کا زمانہ میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اسی اسکول میں، میں نے اپنے آپ کو دریافت کیا۔ یہیں مجھے اس امر کا مبہم سا شعور ہوا کہ میں بھی کچھ ہوں اور کچھ کر سکتا ہوں۔ اسکول کا اصل کام پڑھانا نہیں جتنا جگانا ہے بھون ہائی اسکول نے یہ احسان مجھ پر کیا۔

ذاتی امتیاز حاصل کرنے کا پہلا پھل میں نے یہیں چکھا۔ اور بڑے انوکھے طریقے سے۔ اس امر کی تفصیل یہ ہے کہ رہنہ گاؤں سے بھون جانے والے لڑکوں نے آپس میں یہ پروگرام بنایا ہوا تھا کہ اسکول سے واپسی پر گاؤں سے باہر گھنٹہ آدھ گھنٹہ کھیلا کرتے تھے۔ پھر گھر جاتے تھے۔ اس لئے ہم اسکول سے جلد سے جلد نکلنے کی کوشش کرتے تھے اس زمانے کے اساتذہ بھی بڑے عجیب ہوتے تھے۔ بہانے بہانے سے کام کراتے تھے۔ ہمارے اسکول کے اساتذہ کچھ زیادہ ہی پڑھانے کے شوقین تھے ان کا طریقہ واردات یہ تھا کہ آخری گھنٹے میں حساب پڑھاتے۔ اور مشکل سوال حل کرنے کے لئے دیتے۔ جو لڑکا صحیح حل کرتا جاتا تھا۔ اسے چھٹی مل جاتی۔ ایک روز حسب دستور یہ کھیل شروع ہوا۔ لڑکوں کو دھوپ میں بٹھا کر ایک سوال حل کرنے کو دے دیا گیا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ والدہ کی دعاؤں سے میرا ذہن کھل گیا تھا۔ ریاضی میں مجھے ہابی کا مزہ آتا تھا۔ اس دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ادھر مجھے سوال ملا ادھر اسے حل کر کے میں کھڑا ہو گیا۔ اتفاق سے اس دن جو استاد ڈیوٹی پر تھے وہ کسی سینئر کلاس کے تھے اور مجھے نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے مجھے یوں کھڑے دیکھا تو اس غلط فہمی میں کہ شاید میں نالائقی کی وجہ سے کچھ غیر ضروری پوچھ گچھ کر کے ان کا وقت ضائع کرنا چاہتا ہوں۔ وہ تیزی سے میری طرف آئے سونٹی ان کے ہاتھ میں تھی اور انداز جارحانہ دور سے چلائے۔ "کیا ہے؟ بیٹھ جا" میں نے کہا "جناب میں نے سوال حل کر لیا ہے۔"

"سوال کا بچہ۔ بیٹھ جا۔ نہیں تو دو لگاؤں گا۔"

"جناب آپ جواب تو دیکھیں۔"

"دیکھتا ہوں۔ دیکھتا ہوں۔ اگر غلط ہوا تو کھال ادھیڑ دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف بڑھے بلکہ جھپٹے اور کاپی میرے ہاتھ سے تقریباً چھین کر جلدی جلدی سوال چیک کیا۔ جواب کو صحیح پایا تو حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔

"یہ تم نے خود کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ ابھی آپ کے سامنے۔"

"تمہارا نام کیا ہے۔ کس کے بیٹے ہو؟"

میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اور والد صاحب مرحوم کے بارے میں بھی بتایا۔ تو وہ بغیر کچھ کہے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ پھر ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے بلاکر کچھ سوالات کئے۔ بہت خوش ہوئے لیکن وہ ماسٹر صاحب میری تعریف کئے نہیں تھکتے تھے۔ بار بار کہتے تھے اتنا مشکل سوال جو منٹوں میں حل کرے اس کی کیا بات ہے۔ آخر کار سارا اسکول جمع ہوا۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے سب کے سامنے میری ذہانت کی تعریف کی اور حد سے زیادہ تعریف کی۔ ایک فقرہ مجھے اب بھی یاد ہے اس دبلے پتلے لڑکے کے رنگ روپ پر مت جاؤ۔ اس کا نام فضل حسین ہے اس پر اللہ کا بڑا فضل ہے یہ لڑکا ایک روز ترقی کرے گا اور اسکول کا نام روشن کرے گا۔

وہ لمحہ میری زندگی کا ناقابل فراموش لمحہ تھا۔ اس بھرپور ہمت افزائی سے میرے اندر بڑا حوصلہ پیدا ہوا۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ

سچ ہے کہ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ ساتھ ہی میں یہ بھی کہوں گا کہ بڑوں کو اپنے چھوٹوں کی ہمت افزائی کرنے میں کبھی بخل نہیں کرنا چاہیئے۔ بروقت تھوڑی سی دل آسائی اور ہمت افزائی سے کبھی کبھی زندگی کا رخ ہی بدل جاتا ہے۔

اپنی داستان زندگی کو آگے بڑھانے سے پہلے میں بھون اسکول ہی کا ایک اور واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔

میرے گاؤں کے تقریباً بیس لڑکے بھون میں پڑھ رہے تھے۔ ہفتے کے دن کا ہفتے بھر انتظار رہتا تھا کیونکہ ہفتے کی شام کو ہم سب رہنہ سے اپنے گاؤں بھٹی گوجرا اتوار کی چھٹی منانے چلے جاتے تھے ایک ہفتے کی دوپہر کو جب چھٹی ہونے کو تھی ہم سب کو اسکول کے ایک استاد صاحب نے بلایا اور کہا سوموار کی آپ لوگوں کو چھٹی ہے۔ اس غیر متوقع چھٹی کے اعلان سے ہم پوری طرح خوش بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ان کے دوسرے فقرے نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔ بولے۔ چھٹی اس لئے ہے تاکہ آپ

سب لوگ اپنے گاؤں سے لکڑیاں کٹوا کر اور گدھے پر لدوا کر میرے گھر پہنچا دیں۔ برسات آنے سے پہلے مجھے لکڑی کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ یہ سن کر سب لڑکے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چپ ہو گئے مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا جناب، میرے ہاں لکڑی کاٹنے والا کوئی بڑا نہیں۔ ساتھ ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اس سے میری کچھ لگتی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔ نہیں جناب اسکے نانا ماموں گاؤں میں ہیں میں نے پھر کہا۔ ہمارے گھر کوئی جانور نہیں۔ وہ لڑکا پھر بولا۔ نہیں جناب۔ اس کے ماموں کے پاس ایک چھوڑ کے دو ہیں۔ اب صورت یہ کہ جو بہانہ بتاؤں وہ لڑکا کاٹ کر دے۔ تنگ آکر میں نے صاف صاف کہہ دیا جناب میں یہاں پڑھنے آیا ہوں۔ لکڑیاں لانے کے لئے نہیں ہر چند کہ میں نے یہ ایک فقرہ سر جھکا کر ادب سے کہا تھا وہ میرے منہ سے یہ انکار سن کر ایک دم طیش میں آ گئے نہ صرف مجھے گندی گالیاں دیں بلکہ یہ دھمکی بھی کہ بڑا پڑھا کو بنتا ہے۔ سالانہ امتحان آ رہا ہے دیکھوں گا کہ تو کیسے پاس ہوتا ہے۔ وہ دیر تک اپنا غصہ نکالتے رہے۔ ہم لوگ اس کے سامنے سے ہٹ گئے۔ راستے میں لڑکوں نے مجھ سے کہا۔ فضل اب تیری خیر نہیں۔ میں نے کہا۔ اللہ مالک ہے۔

مختصر یہ کہ سوموار کو سب لڑکوں نے ان استاد صاحب کے ہاں لکڑیاں پہنچائیں۔ میں سیدھا سکول آ گیا۔ ہاں یہ واقعہ نانا جی کے گوش گزار ضرور کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد ہی سالانہ امتحان ہوا نتیجہ نکلنے سے ایک دو دن پہلے اسکول کے ایک مہاجر استاد ہمارا گاؤں دیکھنے اور لڑکوں کے والدین سے ملنے آئے۔ ان کے آنے کی خبر سن کر بہت سے طلبہ کے والدین ان استاد صاحب کے اردگرد جمع ہو گئے اور اپنے اپنے بچوں کے پاس ہونے کی سفارش کرنے لگے۔ چونکہ میں اپنے نانا جی کو وہ واقعہ بتا چکا تھا۔ وہ خاص طور پر پریشان تھے۔ وہ بھی ان کے پاس آئے میں نے لاکھ کہا نانا جی آپ میرے لئے سفارش نہ کریں۔ میرے پرچے اچھے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ نہ مانے اور بڑی عاجزی سے ماسٹر صاحب سے درخواست کرنے لگے۔ کہ فضل کو فیل نہ کیا جائے۔ میرا نام سن کر وہ چونک کہنے لگے فضل حسین تو پنجم میں سارے اسکول میں فرسٹ آیا ہے۔

ملٹری کالج میں داخلہ

داخلے کے معروف مرحلوں سے گزرنے کے بعد میں جولائی ۱۹۵۲ء کو چھٹے درجے میں ملٹری کالج میں داخل ہوا۔ ۲۱۱۴ کالج نمبر ملا۔ اور رہنے کے لئے اسکین ہاؤس (جواب بابر ہاؤس ہے) بھیجا گیا مجھے یاد ہے کہ اسکین ہاؤس کی نمبر ایک سیکشن میری پہلی سیکشن تھی۔ میں ایک دورافتادہ گاؤں سے پہلی بار باہر نکلا تھا۔ انگریزی کیا میرے لئے تو اردو بولنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ شہری زندگی سے اور وہ بھی پبلک اسکول کی زندگی سے میرا یہ پہلا واسطہ تھا۔ میرا گھبرانا اور پریشان ہونا قدرتی امر تھا چنانچہ کالج میں شروع کے دن بڑی وحشت میں گزرے۔ لیکن خدا بھلا کرے میرے ہاؤس ماسٹر، مسٹر سعید راشد فیضی صاحب کا کہ انہوں نے میری ہمّت بندھائی۔ اور مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا اور مجھے وہ اعتماد و شعور دیا جس سے میری راہیں روشن ہوگئیں۔ بچپن میں والد صاحب کی شفقت سے محروم ہو جانے سے میری تربیّت میں جو کمی رہ گئی تھی۔ اس کو راشد صاحب نے پورا کیا۔ وہ پڑھاتے بھی بہت اچھا ہیں لیکن ان کی تربیّت کا انداز اور اسلوب اس سے بھی اچھا ہے ان کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ نفاست، شائستگی اور طرز زندگی بھی کوئی چیز ہے۔ راشد صاحب خود ایک ادارہ ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کی راہ پر لگا دیتے ہیں۔ اس وقت میں کیا سمجھتا لیکن اب سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ہمیں احساس تحفّظ دیا اور نئے افقوں کا تھوڑا بہت شعور بھی دیا ہمیں سوچنا اور قدروں کا احساس کرنا سکھایا۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ میں آج جو کچھ ہوں اس میں بہت کچھ ان کا اثر ہے۔ اس کتاب کو جس کے لئے یہ آپ بیتی لکھ رہا ہوں وہ خود مرتب کر رہے ہیں ان سطروں کو سب سے پہلے وہی پڑھیں گے۔ میری گذارش ہے کہ وہ ان سطروں کی کاٹ چھانٹ نہ کریں اور تاریخ کے حوالے کے لئے اپنا نام رہنے دیں۔ اصل میں یہ صرف ان کا نہیں ان قدروں کا ذکر ہے جن کی وہ علامت ہیں۔ ہر ادارے میں کوئی نہ کوئی سعید راشد ضرور ہوتا ہے یہ تعریف ذات کی نہیں صفات کی ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ چلتا رہے

کہ ادارے خصوصاً تعلیمی ادارے شخصیت ساز اساتذہ سے بنتے، جانے اور پہچانے جاتے ہیں
جب میں ملٹری کالج میں داخل ہوا ہوں تو اس وقت کمانڈانٹ کرنل رفیق تھے ۔ ۱۹۵۵ء کے اواخر سے چار سال کے لئے وہ دوبارہ کالج کے کمانڈانٹ رہے۔ اس طرح میری یہ خوش قسمتی ہے کہ کالج میں اپنے سات سالہ زمانہ تعلیم میں پانچ برس مجھے کرنل رفیق جیسے غیر معمولی آدمی کی شان قیادت کو قریب سے دیکھنے اور اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اقبال کے اس شعر کی وہ عملی تفسیر تھے۔ ان سے بہتر قیادت کی تجسیم کم از کم میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ وہ بہت ہی متضاد صفات کے حامل تھے بہت ہی سخت اور بہت ہی نرم وہ جو کہا جاتا ہے کہ جینیئس غیر معمولی ذہن اور توانائی رکھتا ہے۔ ان میں بھی یہ صفت تھی۔ انہوں نے طلبہ کی قدروں اور کردار کی تربیت جس طرح اور جس انداز سے کی اس نے کالج کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ وہ ہر جگہ ہر موقعہ پہ ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۹ء کی تراویح بھی انہوں نے ہمارے ساتھ پڑھیں کالج کی خاص دو پلی ٹوپی ان کے سر پہ ہوتی تھی وہ چین اسموکر تھے نہ جانے روزے کس مشکل سے رکھتے ہوں گے۔

میرے زمانے کے دوسرے اساتذہ بھی کم نہیں تھے۔ حیدری صاحب، مولوی محمد حسن صاحب مظہر صاحب، بلگرامی صاحب، علوی صاحب سب اپنی اپنی جگہ لاجواب تھے۔ میں نے ان سب سے فیض حاصل کیا۔ فوجی افسروں میں راؤ صاحب، اور کیپٹن شفیع، چیف انسٹرکٹر اے ایچ ابراہیم بھی خوب تھے۔

اس زمانے میں کالج کی زندگی میں بہت گہما گہمی تھی۔ آئے دن آؤٹنگ ہوتی رہتی تھی، کھیل ڈرامے، مباحثے ہر چیز کا زور تھا۔

کالج سے کاکول تک

۱۹۵۹ میں فرسٹ ڈویژن میں ایف ایس سی کر کے میں نے کالج کو خیر باد کہا۔ کالج کے دوسرے آٹھ لڑکوں کے ساتھ ۲۵ پی ایم اے لانگ کورس کے لئے آئی ایس ایس بی کے سامنے گیا۔ وہاں سے تو کامیاب رہا لیکن کان میں کچھ نقص کی وجہ سے ڈاکٹری میں رہ گیا۔ میرے چار دوست پی ایم اے چلے گئے میں نہ جا سکا۔ زندگی میں یہ پہلی اہم ناکامی تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ۱۹۶۰ میں اپنے گاؤں ہی کے اسکول میں پڑھانے لگا اور ساتھ ساتھ کمیشن کے لئے بھی کوشش جاری رکھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ آئی ایس ایس بی تو پاس کر لیتا لیکن ڈاکٹری میں ناکام ہو جاتا۔ آخر کار چوتھی بار اللہ کے فضل و کرم سے کامیاب ہوا اور مئی ۱۹۶۱ء میں ۲۸ پی ایم اے لانگ کورس میں تربیت لینا شروع کی۔ پی ایم اے جانے کی مجھے بڑی خوشی تھی کچھ اس لئے بھی کہ کالج کے پرانے دوست ملیں گے جن سے میں سال سوا سال پہلے بچھڑ چکا تھا۔ میں ان سے ملنے کے لئے بے چین تھا۔ اگرچہ حسب توقع یہ لوگ ملنے تو آئے لیکن ان کے تیور تھوڑے نہیں بہت بدلے ہوتے تھے۔ انہوں نے آتے ہی مجھ پر حکم چلانا شروع کر دیئے۔ کبھی ایک سزا دیتے کبھی دوسری۔ میں حیران اور پریشان۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ پہلے تو کچھ دیر میں کان دبا کے ان کے جا و بے جا حکم مانتا رہا پھر ادھر ادھر دیکھ کے کہ کوئی اور سینیئر تو نہیں ہے میں نے انہیں خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ خوب بے نقط سنائیں اور ان میں سے ایک جو پہلے کبھی یار غار ہوتا تھا اور اب سب سے زیادہ آنکھیں دکھا رہا تھا۔ اس کو تو میں نے نیچے ہی گرا لیا۔ یہ دیکھ کر کہ میں بہت سنجیدہ ہو گیا ہوں وہ چاروں ہنسنے لگے۔ اور مبارکباد دینے لگے۔ میں نے کہا ابھی چند منٹ پہلے تم لوگ میرے ساتھ کیا ڈرامہ کر رہے تھے۔ کہنے لگے کہ یہ پی ایم اے کا خاص مذاق تھا۔

میرے پی ایم اے دیر سے پہنچنے سے بہت سے لڑکے جو کالج میں مجھ سے جونیئر تھے وہاں بہت جابر قسم کے سینیئر بن چکے تھے۔ ان سے کئی بار ٹکراؤ ہوا۔ بعد کو دوستوں نے سمجھایا کہ یہاں کا

دستور اور ہے اس کے مطابق چلو میں بھی سینئر جونیئر کی روایت کی مصلحت سمجھ گیا اور اسی سانچے میں ڈھل گیا۔ پی ایم اے کی تربیت کے انداز اور ٹمپو سے دوسروں کی طرح میں بھی بہت تنگ تھا لیکن اب وہ سختیاں شکر گزاری کے ساتھ یاد آتی ہیں۔

کمیشن سے کارزار تک

۱۳ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو مجھے آرٹلری میں کمیشن ملا۔ میری پہلی پوسٹنگ ۱۱ فیلڈ رجمنٹ میں ہوئی جو ان دنوں کوئٹہ میں متعین تھی اور اس زمانے میں پشین میں معمول کی تربیت پر تھی۔ میں نے یونٹ کو وہیں پشین میں رپورٹ کی۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے آرٹلری سکول نوشہرہ بھیج دیا گیا۔ میرے نوشہرہ سے فارغ ہوتے ہوتے یونٹ پشاور منتقل ہو چکی تھی۔ میں یونٹ سے وہیں ملا۔ میرے سی او کو کھیلوں کا بہت شوق تھا اور کھیلوں کو جوانوں کی تربیت میں خاص اہمیت دیتے تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں ملٹری کالج اور پی ایم اے میں کھیلوں میں خصوصی دلچسپی لیتا رہا ہوں۔ تو وہ بہت خوش ہوئے۔ مجھے بلایا اور کہا فضل تمہاری بڑی تعریف سنی ہے۔ یونٹ کی ایتھلیٹک ٹیم کا چارج سنبھالو اور کچھ کر کے دکھاؤ۔ اور سنو محنت، شوق اور صحیح طریقے سے تیاری کا کوئی بدل نہیں۔ اس تکون کو یاد رکھو۔ میں نے "یس سر" کہا کھٹاک سے سلیوٹ مارا۔ اور سی او کے دفتر سے واپس آتے ہی کام شروع کر دیا۔ میری ملٹری کالج کے زمانے کی عادت ہے کہ مجھے کوئی کام ملے تو مجھ جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جب تک اپنا خون پسینہ ایک نہ کر دوں مجھے چین نہیں آتا۔ مختصر یہ کہ جب یونٹ کھیلوں میں فرسٹ آئی اور میں نے خود کئی مقابلوں میں امتیاز حاصل کیا تو سی او نے ازرہ کرم پھر مجھے دفتر میں بلایا۔ کرسی سے کھڑے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ مبارک باد دی۔ اور کہا۔ مجھے تم پر فخر ہے (آئی فیل پراوڈ آف یو) اور آخر میں مجھے ترقی دے کر لیفٹیننٹ بنا دینے کی خوش خبری سنائی۔

جب میں کمرے سے باہر آیا تو خیالوں ہی خیالوں میں پہلے میں نے اپنی ماں کے قدم لئے اور پھر کرنل رفیق کو سلیوٹ کیا۔ کہ میری یہ پہلی ترقی و کامیابی ایک کی دعا اور دوسرے کی تربیت کا نتیجہ تھی۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اپریل ۱۹۶۵ء میں رن آف کچھ کے حالات کے پیش نظر ہماری یونٹ کو پشاور سے پسرور بھیج دیا گیا اور ہم نے اس علاقے کی ریکی شروع کر دی۔ پھر ایک دن یونٹ کو حکم ملا کہ فوراً کھاریاں پہنچو۔ اس اچانک حکم سے کچھ اندازہ ہوا کہ اب شاید جلدی کچھ پھلجھڑی چھوڑنا پڑے۔ انہیں دنوں ریڈیو سے رن آف کچھ کے معرکہ میں لیفٹیننٹ نادر پرویز کو ستارہ جرأت ملنے کی خبر سنی۔ اس خبر سے میں بے چین ہو گیا۔ اور میرے دل میں بھی جلد از جلد شریک کارزار ہونے کی خواہش مچلنے لگی۔ پھر یونٹ کو کھاریاں سے میرپور آزاد کشمیر جانے کا حکم ملا۔ لیکن ہماری بیٹری کے لئے آرڈر یہ تھے کہ ہم مظفر آباد کی طرف چکوٹی چناری جا کر پوزیشن لیں۔ کھاریاں میں یہ لنگر گپ بھی سنی کہ جلد ہی آزاد کشمیر میں جنگ چھڑنے والی ہے۔ اس خبر سے میں بہت جوش میں تھا۔ ہم نے جلد ہی جلد جائے مقصود چکوٹی کے قریب پہنچ کر اپنی بیٹری کی گنوں کو سیٹ کر دیا۔ میں ان دنوں جی پی او کی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ کھاریاں میں بڑی گرم خبریں سنی تھیں۔ یہاں آ کر جو سناٹا دیکھا تو قدرے مایوسی ہوئی۔ بعد کو پتہ چلا کہ یہ خاموشی بے وجہ نہیں تھی۔

امتیازی سند کا پس منظر

اپنی گنوں کو سیٹ کرنے کے ایک ہفتے کے بعد ۱۳؍اگست کی صبح کو میں نے اپنی بیٹری کمانڈر سے کہا ۱۴؍اگست منانے کی اجازت دی جائے۔ مطلب دشمن کو یہ بتانا تھا کچھ شیر دل ادھر بھی ہیں۔ کچھ بارڈر کے اس طرف ضروری کارروائیاں کر رہے تھے۔ ہماری بیٹری ایک میڈیم رجمنٹ کے زیر کمان تھی جو اس علاقے میں پہلے سے موجود تھی۔ ۱۴؍اگست منانے کی اجازت ملنے پر ۱۳؍اگست کی رات کو ایک میڈیم گن اور دوسری گنز چکوٹی پہنچائی گئیں اور ۱۴؍اگست کی صبح سویرے سویرے دشمن کی خدمت میں پھلجھڑیاں پیش کر دیں۔ وہاں تو کھلبلی مچ گئی۔ پھر دشمن نے شدید گولہ باری

شروع کر دی۔ ہم اس کارروائی کے لئے تیار تھے۔ میں نے اپنی گن کی پوزیشن بدل دی اس نئی جگہ سے ایک پہاڑی بہت نزدیک تھی جس کی وجہ سے ہم فائر نہ کر سکے۔ ہماری ایک گاڑی دشمن کے فائر کی زد میں تھی۔ میں نے جب ڈرائیور سے وہاں سے گاڑی ہٹانے کے لئے کہا تو وہ کچھ پریشان سا ہوا۔ اور میری طرف دیکھنے لگا میں خود اس کے ساتھ گاڑی میں جا کر بیٹھا میرے ساتھ ہونے سے ڈرائیور کی کچھ ہمت بندھی اور ٹھیک اس جگہ سے جہاں سخت فائر آ رہا تھا ہم گاڑی کو حفاظت نکال لائے اگر ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو گاڑی کا تباہ ہو جانا یقینی تھا۔

اس کے کچھ دیر بعد میں بیٹری کمانڈر سے نئی صورت حال پر بات چیت کر رہا تھا کہ دشمن کا ایک گولہ ہمارے بالکل قریب آ کے گرا جس سے میں اور بیٹری کمانڈر دونوں زخمی ہو گئے۔ ان کی پشت پر زخم آئے تھے اور میرے منہ پر۔ یہ بڑا سخت وقت تھا۔ افراتفری میں ہر شخص جائے پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں جان بچانے کی کوئی تدبیر کروں میں نے دیکھا کہ میرے تین جوان شدید زخمی حالت میں زمین پر پڑے ہیں۔ ہر طرف خون بکھرا ہوا ہے۔ زخمی تو میں بھی تھا لیکن ان جوانوں کو تڑپتا دیکھ کر میں اپنا زخم بھول گیا۔ گوا کا دکا فائر اب بھی آ رہا تھا۔ اس کو نظر انداز کر کے میں نے ایک ایک کر کے ان تینوں کو ایک محفوظ مقام پر اٹھا کے پہنچا دیا۔ ان میں سے دو بعد کو زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔

جب میں تیسرے جوان کو بھی ایک ٹیلے کی اوٹ میں حفاظت سے لٹا چکا تو مجھے اپنا ہوش آیا۔ میرے چہرے سے گردن تک خون کی لکیریں تھیں اور میرے کپڑے زخمیوں کے خون سے تر تھے یہ سب آنکھ جھپکتے میں ہوا۔

میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بغیر سوچے، بغیر کسی کوشش کے ہوا۔ بس ہو گیا اس لمحے سوچنے اور ارادہ کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ بعد کو میری جرأت اور ہمت کی بڑی تعریف کی گئی۔ اس کارکردگی پر مجھے امتیازی سند کے اعزاز سے بھی نوازا گیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میں میری

شعوری کوشش کو کچھ دخل نہ تھا۔ اس کو آپ میری تربیت کا اعجاز کہہ سکتے ہیں۔ یا محض اللہ تعالیٰ کی شان کریمی کا اظہار کہ مجھ ناچیز سے یہ کام لیا گیا۔ بہرحال

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہ ہم سب کا لڑائی کا پہلا دن تھا۔ اس کے بعد تو تقریباً روزانہ دونوں طرف سے فائرنگ ہوتی تھی۔ میں اس کے بعد اگلے مورچوں میں انفنٹری کے ساتھ چلا گیا اور میری جگہ سیکنڈ لیفٹیننٹ قیوم نے سنبھال لی۔ کچھ عرصہ بعد باقاعدہ جنگ کا اعلان ہو گیا۔ جہاں میں تھا وہاں سوائے ایک دوسرے پر گن فائر کے کوئی بڑا حملہ نہیں ہوا۔ ایک دن ہم دشمن کے علاقہ کے اندر چلے گئے رات وہاں رہے۔ اس جگہ دشمن موجود نہ تھا۔ لیکن جلد ہی ہمیں واپس آنے کا حکم مل گیا۔

لڑائی کے دوران ہی میری بیٹری کو آرڈر ملا کہ جلد سے جلد پسرور کے علاقہ میں پہنچے۔ ہم پورا دن اور رات سفر کرتے ہوئے ۱۹ ستمبر ۱۹۶۵ء کو چونڈا کے محاذ پر پہنچے۔ میں ۲ پنجاب کے ساتھ آبزرور مقرر ہوا اس طرح چند دن ہی صحیح لڑائی لڑنے کا موقع ملا کہ جنگ ختم ہو گئی۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد توپ خانہ کی مختلف یونٹوں میں خدمات سرانجام دی اور مختلف کورس کئے۔

جولائی ۱۹۷۱ء میں میں کوہاٹ تھا۔ کہ اچانک حکم ملا کہ فوراً سیالکوٹ میں ۴۹ فیلڈ رجمنٹ میں رپورٹ کروں۔ یہ فوراً رپورٹ کرنے والا معاملہ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن جب سیالکوٹ پہنچا تو پتہ چلا کہ یونٹ کو مشرقی پاکستان جانے کا حکم ملا ہے۔ کمانڈنگ آفیسر اور چند دیگر افسران پہلے ہی مشرقی پاکستان کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔ میں اس نئی یونٹ میں سب سے سینئر آفیسر تھا۔ چند دن تو بنگال سے آنے والی یونٹ کے ساتھ لین دین میں گزر گئے۔

یونٹ میں چونکہ بنگالی ۲۵ فی صد تھے۔ ان کی جگہ اور آدمی آگئے۔ کچھ میل ملاپ والے اپنا تبادلہ کروانے میں کامیاب ہوئے۔ یہی حال افسروں کا تھا۔ گویا کہ یونٹ مشرقی پاکستان جانے سے پہلے بالکل نئی ہو گئی اس وجہ سے بہت کم لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ لڑائی سے پہلے یونٹ

کا بالکل نیا ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ بہرحال ہم اللہ اللہ کر کے ۲۴ جولائی ۱۹۷۱ء کو سیالکوٹ سے مشرقی پاکستان کے لئے روانہ ہوئے اور کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز ۱۴ اگست ۱۹۷۱ء کو کھلنا کے مقام پر پہنچے۔ وہاں سے ساری یونٹ تو کشتیا چلی گئی۔ مگر مجھے اپنی بیٹری کے ساتھ درسنا جانے کا حکم ملا یہاں سے کسی زمانہ میں ریل گاڑی کلکتہ کو جاتی تھی۔ کچھ عرصہ یہاں دفاعی تیاریاں کرنے کے بعد میری بیٹری کو سومیل دور ڈانگ کے مقام پر بھیجا گیا۔ لیکن جلد ہی ہمیں واپس درسنا آنا پڑا۔ کیونکہ اس جگہ دشمن کا حملہ یقینی ہو گیا تھا۔ میں نے دن رات مکنی باہتی سے بھرے ہوئے علاقہ میں سفر کیا اور اپنی بیٹری کو بحفاظت درسنا پہنچایا۔ ہمارے یہاں پہنچنے کے دوسرے دن لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ لڑائی کے پہلے دن ہی میری بیٹری کے ایک افسر کے ساتھ جو کہ او پی کی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ رابطہ منقطع ہو گیا میں نے آگے جا کر پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ دشمن کی سخت گولہ باری سے وہ گھبرایا ہوا ہے میں نے جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی جیپ کو پوری تیزی سے اس مقام پر پہنچایا اور ایک افسر اور تین جوانوں کو نکالنے میں کامیاب ہوا۔ جب میں اپنی بیٹری پوزیشن پر واپس پہنچا تو لوگوں کو عجیب پریشانی کی حالت میں دیکھا۔ اپنی انفنٹری گن پوزیشن سے گزرتی ہوئی واپس جا رہی تھی۔ اور ہر کوئی یہی کہے جا رہا تھا کہ دشمن آگیا۔ دشمن آگیا۔ اتنے میں دشمن کا ایک ہیلی کاپٹر نظر آیا۔ جس نے ہم پر اپنی گنوں کا فائر کر لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس افراتفری کے باوجود میں اپنی بیٹری کو بغیر کسی نقصان کے دوسری جگہ لے جانے میں کامیاب ہوا۔ دوسرے دن میں اور بٹالین کمانڈر دشمن کے گھیرے میں آ گئے۔ ہمارے چند ساتھی شہید بھی ہوئے لیکن ہم دونوں بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ درسنا کے علاقہ میں دشمن کا حملہ سخت تھا چنانچہ ہمارے دستوں کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا۔ کیونکہ دشمن ہمارے پیچھے آ کر بیٹھ گیا تھا وہاں سے ہم لوگ کشتیا کے مقام پر پہنچے اور یہاں دشمن کے ساتھ ایک زبردست لڑائی ہوئی جس میں میں نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو یہ خبر ملی کہ دشمن جنیدہ کشتیا سڑک پر تیزی سے کشتیا شہر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جنیدہ چونکہ ہمارے اپنے علاقہ کے بہت اندر

تھا۔ اس لئے اس طرف سے حملہ کی بالکل کوئی توقع نہ تھی۔ بہرحال مجھے یہ کام سونپا گیا کہ کشتیاں شہر سے باہر نکل کر دشمن کا پتہ لگاؤں میں شہر سے تقریباً ایک میل دور نکلا تھا کہ آگے سے سڑک پر ٹینک آتے دکھائی دیئے۔ میں یہ سمجھتے ہوئے کہ اس علاقہ میں اپنے ٹینک ہیں۔ آگے بڑھتا گیا اور ساتھ ہی وائرلیس پر اپنے ٹینکوں کے بارے میں پوچھا اتنے میں دشمن کے ٹینک نے میری جیپ پر فائر کیا لیکن ایک نشانہ خطا گیا۔ میں نے تیزی سے جیپ کو سڑک سے اتارا خوش قسمتی سے نزدیک ہی اپنی فوج کی ایک ٹینک شکن توپ ۱۰۶ آر آر موجود تھی میں وہ ٹینک شکن توپ جو ایک جیپ پر تھی سڑک کے نزدیک لے آیا۔ اور تقریباً پانچ سو گز سے دشمن کے ٹینک پر فائر کیا۔ گو ٹینک کو معمولی نقصان پہنچا۔ لیکن جب وہ سڑک سے نیچے اترا تو دلدل میں پھنس گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ دشمن ٹینک سے نکل کر بھاگ رہا ہے۔ میں نعرہ لگا کر دشمن پر جھپٹا ایک آدمی کو وہیں ہلاک کیا اور ٹینک پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی بیٹری کی گنرز کو سڑک پر آنے کا حکم دیا تھوڑی دیر بعد دشمن کا ایک ٹینک مجھے نظر آیا۔ سڑک کے دونوں طرف اتنے گھنے درخت تھے کہ سڑک ایک سرنگ کی طرح نظر آتی تھی۔ دشمن کے ٹینک کا فائر ہم پر اور ہمارا فائر ٹینک پر اتنا کارگر نہ تھا دشمن کے دوسرے ٹینک نے جب پہلے والے ٹینک کا حشر دیکھا تو اس کے عملہ نے ٹینک کو چلتی حالت میں چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ ہم نے بھاگتے ہوئے عملہ پر فائرنگ کی اور دشمن کے دو جوان موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ صرف ایک بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ میں پہلے والے ٹینک کو چھوڑ کر دوسرے ٹینک پر آ گیا۔ اور لڑائی کا آنکھوں دیکھا حال اپنے وائرلیس پر پیچھے بھیجتا رہا۔

دشمن کی انفنٹری سڑک کے دونوں طرف سے آگے کشتیاں کی طرف جا رہی تھی جب ہماری فوج سے اس کا آمنا سامنا ہوا تو وہ پیچھے بھاگی۔ جہاں میں ٹینک پر کھڑا تھا۔ دشمن کے چند سپاہیوں نے وہاں سے سڑک عبور کرنے کی کوشش کی میں نے ان پر فائر کھولا اور ساتھ ہاتھ اوپر کرنے کو کہا ایک سپاہی نے اپنے آپ کو ہمارے حوالہ کیا۔ اور بہت سے بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن سڑک کے اوپر لاشوں کا ڈھیر لگ گیا۔ کشتیا کی لڑائی میں چھ ٹینک۔ ایک ٹینک شکن

توپ بمعہ جیپ اور دیگر سامان ہم نے قبضہ میں لیا اور دشمن کا ایک افسر اور تقریباً چالیس جوان قیدی بنائے دوسرے روز چار افسروں کے نام ستارۂ جرأت کے لئے بذریعہ سگنل بھیجے گئے جن میں میرا نام سرفہرست تھا۔ گو مجھے یہ اعزاز ملا نہیں لیکن مجھے یہ اطمینان ہے کہ میں نے فرض کو لبیک کہا تھا اور اپنی سی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد اسیر جنگ رہا۔ رہائی کے بعد اسٹاف کالج گیا۔ پھر معمول کے مطابق مختلف منصبوں پر فائز رہا۔ ۱۹۸۱ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی۔ آج کل ایک پہاڑی رجمنٹ کی کمان میرے سپرد ہے۔

آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں ۱۹۶۵ء اور ۷۱ء میں میں نے بڑے بڑے بہادر، جرأت مند اور جانباز دیکھے۔ وہ جو جانوں پر کھیل گئے۔ ملک کی آن پر قربان ہو گئے۔ ان کی جاں بازی کو کسی نے دیکھا اور کسی نے نہیں دیکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض کو محض اس لئے اعزاز نہیں مل سکا کہ ان کے لئے کوئی زوردار انگریزی لکھنے والا نہ تھا بہرحال ان شہیدوں کا معاملہ اللہ سے ہے۔ جو نیتوں کا حال جانتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ راشد صاحب یہ تذکرہ ان گمنام مجاہدوں اور غازیوں کے نام منسوب کریں جن کو نہ کوئی اعزاز ملا اور نہ ان کا کسی کتاب میں ذکر آیا۔ اور ان گمنام شہیدوں کے نام بھی جن کا نہ کہیں سنگ مزار ہے اور نہ مٹی کا دیا ہے۔"

دسمبر ۷۱ء کی جنگ کے آخری ایام میں لیفٹیننٹ کرنل فضل کا نام ستارۂ جرأت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس معرکہ کی تفصیل اس کے چشم دید گواہ میجر صادق حسین سناتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں ۷۱ء کی جنگ جن حوصلہ فرسا حالات میں لڑی جا رہی تھی۔ ان کے نتیجے میں بہت سے لوگ مایوسی اور بے دلی کا شکار ہو گئے تھے۔ لیکن وہ افسر جن کے عزم و حوصلہ میں کوئی دراڑ نہیں آئی تھی اور جو پورے جوش ولولے کے ساتھ تندی باد مخالف کا سامنا کر رہے تھے ان میں ایک فضل بھی تھے۔

فضل اس وقت ۲۹ فیلڈ رجمنٹ میں میجر تھے اور ایک فیلڈ بیٹری کی کمان کر رہے تھے۔

اس وقت اس یونٹ کے ایکٹنگ سی او کی حیثیت سے مجھے فضل کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ دسمبر ۷۱ء کی کھلی جنگ میں اور اس سے پہلے کی تگ وتاز میں میجر فضل نے جس جرأت وہمّت کا مسلسل مظاہرہ کیا اس پر کوئی آرمی بھی فخر کر سکتی ہے۔

ان کے عزم وہمّت کے بہت سے واقعات میں سے یہاں میں صرف دو کا تذکرہ کروں گا۔

پہلا واقعہ ۸ ر دسمبر ۷۱ء کا ہے۔ میجر فضل کی بیٹری ۲۹ بلوچ اور ۱۸ پنجاب کو سپورٹ دے رہی تھی۔ یہ دو یونٹیں کشتیا شہر کا دفاع کر رہی تھیں فضل کی بیٹری کی گنیں کشتیا شہر کے اندر لگی ہوئی تھیں۔ اور فیلڈ آف فائر بہت محدود تھا۔ صبح ۸ بجے کے قریب فضل نے مجھ سے مشورہ کیا اور خود او پی پر چلے گئے۔ دشمن تمام دفاعی چوکیاں عبور کر کے کشتیہ جنیدہ روڈ سے شہر کے اندر داخل ہوگیا۔ دشمن کے چھ ٹینک آگے آگے تھے اور پیچھے انفنٹری کی بٹالین تھی۔ دشمن ہماری گن پوزیشن سے ۵۰۰ گز کے فاصلہ تک پہنچ چکا تھا جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ صورت حال کتنی نازک ہوتی ہے۔ دشمن یوں سر پہ پہنچ جائے تو بڑوں بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ فضل نے اس وقت کمال حاضر دماغی اور دلیری سے کام لے کر ایک آر آر پکڑی اور جو ٹینک بالکل سامنے آ گیا تھا اس پر فائر کروا لیا۔ یہ تابڑ توڑ حملہ دشمن کی توقعات کے بالکل خلاف تھا اس نے مزاحمت کی قوّت کا غلط اندازہ لگایا اور پسپا ہونے ہی میں عافیت سمجھی اور پسپا ہوتے وقت نہ صرف چھ کے چھ ٹینک وہاں چھوڑ سے بلکہ اپنے مقتولین کو بھی نہ اٹھا سکا۔ میجر فضل نے دشمن کے چند آدمی بھی پکڑے اور ہیڈکوارٹر کے حوالے کئے۔ اس معرکہ میں یوں تو سب کی کارکردگی بہت قابل قدر تھی۔ لیکن اصل کریڈٹ فضل کو جاتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ فضل کے لئے آپریشنل ایوارڈ ریکمنڈ کروں چنانچہ میں نے وائرلیس پر ہیڈکوارٹر ایسٹرن کمانڈ کو فضل کا نام ستارۂ جرأت کے لئے بھیجا۔ ریڈیو پر میں نے فضل کے لئے ستارۂ جرأت کا اعلان خود سنا۔ اس کے بعد سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آگیا۔ اور جب ہم لوگ ۷۴ء میں قید سے واپس آئے تو وہ سارا قصہ غتر بود ہو چکا تھا۔

یہاں ہیں، یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ فضل کے لئے ستارۂ جرأت کا ساتی ٹیشن لکھنے کے لئے جب میں نے ان کا پی اے نمبران سے پوچھا تو وہ بتاتے نہیں تھے۔ بار بار یہی کہتے تھے، سر چھوڑئیے یہ معمولی بات ہے۔ ہم سب مل کر لڑ رہے ہیں۔ میں تنہا اپنے آپ کو کسی اعزاز کا مستحق نہیں سمجھتا۔

دوسرا واقعہ ۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کا ہے۔ دشمن نے درستا شہر پہ ایئر فورس ہیوی آرٹلری، اور انفنٹری کی مدد سے بھرپور حملہ کیا۔ جب تک اپنی انفنٹری نے مورچے نہیں چھوڑے۔ میجر فضل اپنی بیٹری سے اسے فائر دیتے رہے۔ انفنٹری کے پیچھے ہٹنے پر ہم بھی اپنی گن پوزیشن چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ ایک کے سوا ساری گنیں دوسری پوزیشن پر ڈیپلائے ہونے کے لئے پہنچادی گئیں۔ جو گن مورچے میں رہ گئی تھی میں اس کے لئے فکر مند تھا اور آخری پوزیشن کے قریب کھڑا صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا کہ اتنے میں فضل آ گئے میں نے کہا ایک گن نہیں پہنچی، فضل نے کہا سر! پہنچ جائے گی۔ لیکن میری پریشانی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ گن پوزیشن دشمن کے فائر کی زد میں تھی۔ اس تمام علاقے پر دھڑا دھڑ دشمن کے گولے آ کر گر رہے تھے۔ اس صورت حال میں گن نکال کے لانا اگر نا ممکن نہیں تو سخت جان جوکھوں کا کام ضرور تھا ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فضل نے زن سے اپنی جیپ اسٹارٹ کی اور گن پوزیشن کی طرف روانہ ہو گئے اور دشمن کے عین سامنے سے گن کو جیپ سے ٹو کر کے بچا لائے۔ جب فضل گن کے ساتھ اس جگہ پہنچے جہاں میں کھڑا تھا تو میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں گن پوزیشن تک جانا اور اسے ٹو کر کے لانا بڑے حوصلے اور عزم کا کام تھا۔ جو فضل نے بڑے اطمینان سے بغیر کسی قلیپ کے انجام دیا۔

مشرقی پاکستان میں ہمارے بہت سے جوانوں اور افسروں نے جرأت اور حوصلے کے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے جن پر سقوط ڈھاکہ نے پانی پھیر دیا۔ لیکن عسکری تاریخ میں ان جرأتوں کو ہمیشہ عزت و قدر کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ میں مشرقی پاکستان کے گمنام مجاہدوں اور شہیدوں کو سلام کرتا ہوں۔ زندہ قومیں اپنے محسنوں کو فراموش نہیں کیا کرتیں۔

کرنل امتیاز احمد، ستارۂ جرأت

بلوچ رجمنٹ

کرنل امتیاز احمد ستارہ جرأت

بلوچ رجمنٹ

خاندان اور بچپن

ضلع راولپنڈی کا ایک گاؤں لدڑ، میرا آبائی گاؤں ہے۔ ۲۲ جولائی ۱۹۴۱ء کو میں اسی جگہ پیدا ہوا۔ میرے والد فرنٹیر فورس میں حوالدار تھے۔ آزادی سے پہلے ہی وہ ریٹائر ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ان کا انتقال ہوا اس وقت میں تقریباً چھ برس کا تھا والد کے انتقال کے بعد میری ماں نے میری پرورش کی اور ذمہ داریاں سنبھالیں مجھے گاؤں کے اسکول میں داخل کرایا۔ وہ خود زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن تعلیم کی قدر و قیمت سے واقف تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہر روز مجھ سے پوچھتی تھیں بیٹے آج کیا پڑھا ہے۔ پھر مجھے اپنے سامنے پڑھنے کے لئے بٹھاتیں۔ اٹھتے بیٹھتے زندگی کی اونچ نیچ بھی سمجھاتی جاتی تھیں۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ ان کی باتیں سمجھ میں کیا آتی ہوں گی۔ بہر حال اتنا ضرور ذہن نشین ہو گیا تھا کہ مجھے شوق سے پڑھنا ہے اور آگے بڑھنا ہے۔ اب میں جو کچھ ہوں وہ

میری عظیم ماں کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے مجھے پروان چڑھتے دیکھا ان کی خدمت میری زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ ناشکری ہوگی اگر میں یہاں اپنے چچازاد بھائی ابوذر خان کے اخلاقی، مادی اور معاشی تعاون کا ذکر نہ کروں۔ ابوذر بھائی نے ہر اعتبار سے ہمارے لئے بہت کچھ کیا۔ ہم ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔ میری والدہ ماجدہ اور ابوذر بھائی یہ دونوں میرے لئے زندگی کی بہترین قدروں خاص طور پہ ایثار اور احسان کی زندہ تصویریں ہیں۔ ان سے میں نے جفاکشی اور لگن سے کام کرنے کی قدر و قیمت سیکھی۔ ان کی زندگی میں، میں نے دیانت، ہمدردی، تحمل اور بردباری کا جلوہ دیکھا۔ ان دونوں کو میں اپنا محسن سمجھتا ہوں۔ انہوں نے مجھے جینا سکھایا۔

بچپن کے شوق، شرارتیں اور سزائیں

بس اتنا یاد ہے کہ بچپن میں میں بہت چاق و چوبند، تیز اور چونچال ہوتا تھا۔ اور کھیلوں وغیرہ میں اپنے ہم عمروں پر چھایا رہتا تھا۔ میرے بارے میں میری ماں اور ابوذر بھائی بہت محتاط تھے اس لئے باہر کھیلنے کی اجازت کم ہی ملتی تھی، لیکن میں، اکثر آنکھ بچا کے شام کو باہر نکل جاتا تھا۔ اور گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا۔ کبھی کبھار دیر تک باہر کھیلتے رہنے پر اور معمولی شرارتوں پر سرزنش بھی ہوتی تھی۔ بھائی ابوذر حقیقی بھائیوں سے بڑھ کر میری دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔

کالج کا دور

پانچویں درجے کا امتحان میں گاؤں کے اسکول سے پاس کر چکا تھا لیکن یہاں پھر پانچویں درجے ہی میں ۱۹۵۲ء میں داخل ہوا کالج ہی سے میں نے انٹر کیا میٹرک تک میں پڑھنے میں بہت اچھا تھا اور کلاس کے بہت اچھے لڑکوں میں سے ایک تھا۔ میٹرک کے بعد کھیلوں میں میری دلچسپی شاید ضرورت سے زیادہ ہوگئی۔ ہاکی میں مہارت کے لئے کالج کا ہاکی کلر تو مل گیا لیکن تعلیمی حالت وہ نہیں

رہی جو پہلے تھی۔ بہرحال ایف ایس سی پری انجینئرنگ میں نے کر لیا اور کمیشن کے لیئے منتخب ہو کر ۱۹۶۱ء میں پی ایم اے چلا گیا۔

کالج میں لڑکے کوئی نہ کوئی نک نیم ایک دوسرے کو ضرور دیتے ہیں۔ میرا نک نیم "حاجی" تھا۔ یہ لقب ملنے کی بظاہر کوئی خاص وجہ تو نہیں تھی غالباً میرے روزے نماز کی وجہ سے، یا میری مذہبی تربیت کی وجہ سے، بہرحال مجھے نہیں معلوم کہ کس وجہ سے کھیل کے میدان میں خاص طور پر لڑکے مجھے حاجی کہہ کر پکارتے تھے۔ ہماری کلاس میں، اس زمانے کے چند مشہور کیریکٹر تھے جن کی شہرت تمام کالج میں تھی۔ مثلاً شاہ پال اور شربت خان۔ شاہ پال اپنے مزاج کے بادشاہ تھے۔ شربت خان کا نام تو شربت تھا لیکن جثہ شیروں کا سا تھا شربت کے دل میں تو بہت مٹھاس تھی لیکن تن و توش دیکھ کر بڑوں بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ شربت خان کی باکسنگ دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔ کھیل میں بھی نام پیدا کیا تھا۔ آخر میں ہاؤس پری فیکٹ بھی ہو گئے تھے۔ اس وقت مجھے مرحوم ۲۱۵ جمشید بھی بہت یاد آ رہا ہے جو بابا کے نام سے مشہور تھا۔ وہ بھی ایک کردار تھا۔ ڈرامہ کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ بے حد سنجیدہ اور بے حد پر مذاق۔ سنجیدگی اور وقار کے ساتھ۔ مزاح میں نے باباہی میں دیکھا۔ بابا کی بڑی من موہنی شخصیت تھی۔ افسوس بابا اب اس دنیا میں نہیں بڑا اچھا دوست تھا اور بڑا پیارا انسان ایسے لوگ دنیا میں روز روز دیکھنے میں نہیں آتے۔ ہماری کلاس اس لحاظ سے بہت اچھی تھی کہ اس کا ڈسپلن بھی ٹھیک ٹھاک تھا اور لڑکوں میں آپس میں مفاہمت بھی بہت تھی لیکن اگر شرارتیں نہ ہوں تو پھر بچپن کیا ہوا۔ طالب علمی ہی کے تو مزے ہیں کہ پاسبان عقل ہمیشہ ساتھ نہیں رہتا اور (نہ رکھا جا سکتا ہے) اس زمانے میں ایک چیز ایڈونچر تھی۔ جس کا لطف اٹھانا ہمارے لحاظ سے ثواب کا کام تھا۔ اور نوجوانی کا ثبوت! ہمارے حصے میں ایڈونچر، کی جو شکل آئی تھی وہ یہ تھی کہ رات کو کھیتوں کو اپنی تگ و تاز کا نشانہ بنائیں۔ اس میں جو خطرات، مضمر تھے ان سے اس ایڈونچر کی کشش میں مزید اضافہ ہو گیا تھا بہرحال ہم لوگ کبھی کبھی اس مہم پر جاتے رہے اور خاصے کامیاب واپس آتے رہے۔ ایک شب

کا تذکرہ ہے کہ سرِ شام بارش ہوئی تھی۔ اندھیری رات تھی یاروں نے کہا آج اچھا موقعہ ہے چنانچہ اپنی چوکڑی، شکار کے لئے کمین گاہوں سے نکلی شکار ملا بھی لیکن واپس آتے وقت بارش کی وجہ سے اپنے پیروں کے نشان گیلی مٹی پر چھوڑتے آئے اور چونکہ ان دنوں چھٹیاں تھیں سوائے ہماری کلاس کے کالج کے باقی لڑکے چھٹی پر گئے ہوئے تھے اس لئے ہم باآسانی پکڑے گئے اور اس لئے وہی ہوا جو ہونا تھا اور جو بہرحال کھیل کا ایک حصہ تھا (پارٹ آف دی گیم)

مجھے ایک اور اجتماعی شرارت یاد آرہی ہے۔ ہم میٹرک میں تھے اور امتحان کی تیاری کرنے کے لیے چھٹی پر نہیں گئے تھے۔ اللہ بھلا کرے۔ ہمارے انگریزی کے استاد قاضی حامد علی صاحب تھے۔ سردیوں میں بہت سویرے کلاس لیتے تھے اور کسی روز معاف نہیں کرتے تھے۔ ایک روز پڑھنے کا موڈ نہیں تھا سب لوگوں نے صلاح کی کہ آج نہیں پڑھنا۔ اور ہائیڈ اینڈ سیک کھیلنے لگے۔ بابا (جمشید) ہمیں معلوم تھا کہ بہت فرماں بردار ہے ہم نے خاص طور پر اسے بریف کیا اور بابا بھی راضی ہوگیا کہ آج قاضی صاحب کے ہاتھ نہیں آنا۔ قاضی صاحب وقت پر آئے۔ لیکن کلاس غائب ادھر ادھر دیکھا تو بابا نظر آیا۔ انہوں نے آواز دی جمشید ادھر آؤ۔ اب جمشید کی سمجھ میں کچھ نہ آتے کہ کیا کرے اس نے بھاگنا شروع کردیا۔ اس کو بھاگتے دیکھ کر قبلہ قاضی صاحب اس کو پکڑنے کے لئے دوڑے اب عجیب سماں تھا آگے آگے جمشید اور پیچھے پیچھے ہمارے بزرگ بڑا مضحکہ خیز منظر تھا۔ بابا بھاگنے میں تیز تو نہ تھا لیکن اس روز اس نے بھاگنے کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے اور ہاتھ نہ آنا تھا نہ آیا۔ بہرحال دوسرے روز قاضی صاحب اپنے روایتی جلال میں تھے۔ اور غریب بابا کا اس روز جو حشر ہوا اس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال یہ تو بچپن کی موج تھی۔ قاضی صاحب بڑے شفیق استاد تھے بڑا اچھا پڑھاتے تھے ان کی انگریزی کا رعب آج تک دل پر ہے۔

کمیشن کی روئیداد

ایف ایس سی کرنے کے بعد میں نے ۱۹۴۸ء پی ایم اے کے لئے درخواست دی اور کامیاب ہوکر

پی ایم اے میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۲ء تک زیر تربیت رہا۔ پی ایم اے کی تربیت کا زیادہ حصہ میں نے طارق کمپنی میں گزارا۔ سوائے آخری چھ مہینوں کے جب میں صلاح الدین کمپنی میں تھا۔ پی ایم اے میں میری کارکردگی اللہ کا شکر ہے خاصی معیاری تھی۔ پاس آؤٹ ہوتے وقت میں شروع کے دس کیڈٹس میں سے تھا اور آخری ٹرم میں جونیئر انڈر آفیسر کے عہدے پر فائز تھا۔

۱۹۶۲ء میں مجھے ۴ بلوچ میں کمیشن ملا جو ان دنوں کوٹلی سیکٹر آزاد کشمیر میں متعین تھی۔

جنگ ستمبر

جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنگ چھڑی تو میں اپنی بٹالین کے ساتھ تھا۔ لڑائی کے دوران ہی ہمیں سیالکوٹ سیکٹر میں منتقل ہونے کا حکم ملا۔ بھرپور جنگ جاری تھی۔ ہماری بٹالین بھی جاتے ہی میدان کارزار میں کود پڑی۔ لڑائی کے دوران ہی ایک معرکہ میں ، اپنا فرض بجالاتے ہوئے میں زخمی ہوا اور ایک ٹانگ سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس معرکہ میں میری کارگذاری کو لائق تحسین سمجھا گیا۔ اور مجھے ستارہ جرأت سے نوازا گیا۔

معرکہ کی تفصیل

ستارۂ جرأت کے فرمان میں موجود ہے اس لئے اسے ہی نقل کرتا ہوں ایک نہ شد دو کا ج۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

۱۹ ستمبر کو کانیور پوائنٹ ۱۳۱ے پر حملے کے دوران دشمن کے مقابلہ میں لیفٹیننٹ امتیاز نے غیر معمولی جرأت اور قیادت کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ۴ بلوچ کی اے کمپنی کے کمپنی افسر کی حیثیت سے لیفٹیننٹ امتیاز کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اپنی کمپنی کے حملے کی موجوں کو آگے بڑھاتے رہیں ایف۔ یو۔ پی سے منزل مقصود کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے جب نمبر ۲ پلاٹون دشمن کے زبردست

مشین گن اور توپ خانے کے فائر کی زد میں آکر منتشر سی ہونے لگی اور لڑکھڑانے لگی تو اس نازک موقعہ پر لیفٹیننٹ امتیاز نے پلاٹون کی کمان خود سنبھالی۔ اور دشمن کی ایم جی کو بے اثر کر دیا۔ اسی ایم جی سے ہماری پیش قدمی رکی ہوئی تھی۔ اس کے بعد لیفٹیننٹ امتیاز نے بذات خود پلاٹون کی قیادت کی۔ اپنے آدمیوں کا حوصلہ بڑھایا اور ان کی رہنمائی کرتے ہوئے دشمن کی دفاعی مورچہ بندی کے فائر کے باوجود اپنے نشانہ پر ہلّہ بول دیا۔ اس لڑائی میں لیفٹیننٹ امتیاز نے بلند ترین معیار کی شجاعت کا مظاہرہ کیا اور اپنی ذاتی مثال سے اپنے جوانوں میں جوش و ولولہ پیدا کر دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس افسر نے دشمن کا بھرتی سے پیچھا کیا اور اسے نشانے سے مزید چار سو گز تک پیچھے ہٹا دیا اور اس کو میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ باوجود اس کے کہ اس تمام عرصے میں دشمن کا توپ خانہ مسلسل گولہ باری کر رہا تھا لیفٹیننٹ امتیاز اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر ایک ایک جوان کے پاس گئے تاکہ اپنے دستے کو دوبارہ منظم کر سکیں۔ اسی تگ و دو کے دوران لیفٹیننٹ امتیاز کی ایک ٹانگ سخت زخمی ہو گئی۔ اس شکستہ ٹانگ کے باوجود لیفٹیننٹ امتیاز اپنے جوانوں کو دفاعی مورچہ بندی کرنے میں مدد دیتے رہے اور اس وقت تک اپنے کام میں لگے رہے جب تک وہ بالکل بے ہوش نہیں ہو گئے اس کے بعد انہیں ہسپتال پہنچایا گیا اس شجاعت اور حد فرض سے آگے کی جان نثاری کے لئے لیفٹیننٹ امتیاز کے لئے فوری طور پر ستارۂ جرأت کی سفارش کی جاتی ہے۔" اس سفارش نامہ کی بنیاد پر مجھے ۹ مارچ ۱۹۶۶ء کو ستارۂ جرأت دینے کا سرکاری اعلان کیا گیا۔

میں نے اس معرکے میں لیفٹیننٹ کے رینک میں کمپنی افسر کی حیثیت سے حصّہ لیا تھا۔ کمپنی کمانڈر میجر (اب لیفٹیننٹ کرنل) افتخار علی شاہ تھے اور میرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو میجر جنرل) ایم آر خان تھے۔

جنگ ستمبر کے بعد

چونکہ جنگ ستمبر میں شدید زخمی ہونے اور ایک ٹانگ سے محروم ہو جانے سے میری میڈیکل شناخت مستقل طور پر "سی" ہو گئی تھی اس لئے اس وقت سے اب تک میں مختلف اسٹاف جاب کرتا رہا ہوں۔ ۱۹۷۷ء میں مجھے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی۔ اور ۱۹۸۳ء میں فل کرنل ہوا۔

صبر و شکر میری خاندانی قدریں ہیں میں شکر کرتا ہوں کہ خدا نے مجھے زندہ رکھا۔ ورنہ میں تو اپنی طرف سے اس کی راہ میں جان کی بازی لگا چکا تھا۔ میں اس بات کے لئے بھی شکر گزار ہوں کہ خدا نے مجھے اتنا حوصلہ اور توفیق دی کہ میں وہ کچھ کر سکا جو میں نے کیا۔

مصنّف کا تبصرہ

یہ حالات و واقعات جو ابھی آپ کی نظر سے گزرے ان جوابات سے مرتّب کئے گئے تھے جو کرنل امتیاز نے ہمارے سوالنامے کے جواب میں لکھ کر بھیجے تھے چونکہ اس کتاب کا بنیادی مقصد مجاہدوں اور غازیوں کے کردار کا نفسیاتی مطالعہ کرنا ہے اس لئے ہم نے کرنل امتیاز سے ان کی قدروں، تاثّرات، اور تجربات کے بارے میں مزید گفتگو کی جس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

انسان وہی ہوتا ہے جو اسے اس کا ماحول اور اس کی تربیّت بناتی ہے اور ماحول میں سب سے زیادہ اثر انسانوں کا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بچپن میں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے سب سے زیادہ میری ماں اور میرے چچازاد بھائی ابوذر خان نے متاثر کیا انہوں نے مجھے محنت کرنا سکھایا اور زندگی کی بنیادی قدروں کا شعور دیا اور جب میں ملٹری کالج میں داخل ہوا تو فطری طور سے میں اپنے استادوں سے متاثر ہوا۔

اس وقت خصوصًا وہ دور جب کرنل رفیق کمانڈنٹ تھے تقریبًا سارے اساتذہ خدمت

کے جذبے سے سرشار تھے۔ اور پڑھانے میں طاق تھے۔ ہر طرف عجیب روح پرور گہما گہمی تھی۔ وطن کی محبّت اور دیانت محنت اور ذمّہ داری کی جو اسپرٹ اس وقت کالج کی فضا میں رچی بسی تھی وہ بات زندگی بھر کہیں اور مجھے نظر نہیں آئی۔ وہ زمانہ میری زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ کالج میں نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں اور سارا زور ذمّہ داری اور دیانت اور ایثار کی قدریں کردار میں پیدا کرنے پر تھا۔ بد نظمی بد دیانتی اور بزدلی کو برداشت نہیں کیا جاتا تھا جس کیڈٹ نے یہ دور دیکھا ہے وہ اسے بھلا نہیں سکتا۔ جس قسم کی کردار سازی کی اس وقت پوری قوم کو ضرورت ہے وہ کردار سازی اس وقت کالج میں پورے جوش وخروش، خلوص و انہماک کے ساتھ ہو رہی تھی۔ یہ تو اس دور پر ایک عام تبصرہ ہوا۔ اب دو چار نام لینا چاہوں گا۔ جو میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ سب سے پہلے تو خود کمانڈانٹ کرنل رفیق کا عظیم نام ہے۔ جنہوں نے ہمیں پاکستان سے محبّت کرنا اور اس کی خدمت کرنا ایک مقصد زندگی کے طور پر سکھایا۔ جفاکشی اور سخت کوشی کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ دیانت کو پالیسی کے طور پر نہیں بلکہ اصول کے طور پر اختیار کرنے کی تلقین کی۔ خدمت کرنا اور ایثار کرنے کی تربیّت دی۔ میں نام نہیں لینا چاہتا لیکن نام لئے ہی جائیں تو مسٹر سعید راشد، مسٹر حامد علی، مسٹر شفیق کے نام فوراً ذہن میں آتے ہیں۔ پھر اپنی جگہ ایک کردار ہمارے مشفق ومکرم مسٹر مظہر علی خان تھے جو ہمیں فزیالوجی پڑھایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ بے ضرورت توانائی کو ضائع نہ کرو۔ تیز چلنے اور تیز بولنے میں بھی ان کے نزدیک اسی نقصان کا خطرہ تھا اس لئے خود بہت آہستہ بولتے اور اس سے بھی آہستہ چلتے۔ یہ ان کی ادا تھی۔ لیکن چھوٹے بچوں کے لئے ماں کی طرح تھے۔ شفقت اور محبّت ان پر ختم تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بچّوں کو خوش رکھتے تھے اور خود بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ بچّوں کی طرح خوش ہوتے تھے اسکین ہاؤس کے دوسرے کوارٹر میں رہتے تھے۔ ان کا ایک بوڑھا ملازم تھا جس کی آواز عورتوں کی سی تھی وہ بھی عجیب چیز تھا۔ ہمارے لئے وہ بھی ایک تفریح کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ اس زمانے میں آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر بھی بہت زوروں پر تھا ہر سال ڈرامے وغیرہ ہوتے تھے۔ مسٹر حیدری اور مسٹر علوی اس شعبے کی روح رواں

تھے ان کے علاوہ دینیات کے استاد مولوی عزیز احمد کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جن سے ہم امتحان پاس کرنے کا تعویذ لیتے تھے۔ ہماری عقیدت مندی سے خوش ہو کر وہ کم از کم دینیات میں ہمیں خوب نمبر دے دیتے تھے۔

مختصر یہ کہ بحیثیت مجموعی اس ادارے کے اسٹاف کی کوششوں اور کاوشوں ہی نے وہ کیڈٹس پیدا کئے جنھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں اور جنگ دامن میں کچھ کر کے دکھایا اور دکھا رہے ہیں۔

الا ماشاء اللہ

آخر میں اپنی مادر درس گاہ ملٹری کالج کے بارے میں یہ کہوں گا کہ اس روایتی کردار سازی کے علاوہ جو ملٹری کالج کی امتیازی خصوصیت رہی ہے میں سمجھتا ہوں کہ بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر طلبہ میں تخلیقی سوچ کی قوّت بھی پیدا کرنی چاہیئے۔ اور اندھے ضبط و نظم سے بچنا چاہیئے۔ کیڈٹوں کو سوچنا اور ہر چیز کو پرکھنا سیکھنا چاہیئے۔ تاکہ وہ تجرباتی و تجزیاتی ذہن پیدا کر سکیں۔ اور اپنی روزانہ زندگی میں بھی یہی رویّے روا رکھیں۔ اس طرح وہ اپنی زندگی کے مسائل کا موزوں حل سوچ سکیں گے اور اسلاف کی اندھی تقلید سے بچ سکیں گے۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد اقبال امتیازی سند

پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمدؐ اقبال امتیازی سند

پنجاب رجمنٹ

لیفٹیننٹ کرنل محمد اقبال کو امتیازی سند ستمبر ۱۹۶۵ء میں اس وقت ملی جب انہیں کمیشن ملے ہوئے سال بھر بھی نہیں ہوا تھا۔ اور وہ لفٹیننی کے دور سے گزر رہے تھے۔ سبحان اللہ کرنل اقبال کی سوانح حیات کا خاکہ ان ہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

راجپوتوں کے عسکری مزاج کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ جان سے پہلے آن۔ ان کا نسلی مقولہ ہے۔ جرأت اور مردانگی کا سبق ان کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی یہ چیز وہ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اپنے آباؤ اجداد کی جرأتوں کے افسانوی قصے اور لوک گیت راجپوت بچے ہوش کی آنکھ کھلتے ہی سنتے ہیں اور انہیں روایتوں کے سائے میں جوان ہوتے ہیں میں نسلی غرور کا قائل نہیں صرف ماحول اور روایتوں کے اثر کی بات کر رہا ہوں۔

میرا تعلق راجپوتوں کی چب ذات سے ہے جو تحصیل کھاریاں ضلع گجرات میں عرصہ دراز سے آباد ہیں اور پیشہ آباء پشتوں سے سپاہ گری رہا ہے۔ میرے والد انجنیئر کور میں صوبیدار تھے۔ اور دوسری جنگ عظیم میں مختلف محاذوں پر شریک کارزار رہے تھے۔ خاندان اور برادری کے دوسرے

بلیشتر افراد بھی مسلح افواج میں خدمات بجالاتے رہتے ہیں۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم

میری پیدائش اپنے گاؤں بھلوال تحصیل کھاریاں کی ہے۔ سالگرہ کی تاریخ ۲۶ر نومبر ۱۹۴۲ء ہے ابتدائی تعلیم بھلوال کے پرائمری اسکول ہی میں حاصل کی۔

میرے بچپن میں ایسا کوئی ڈرامائی واقعہ نہیں ہوا جسے یہاں نفسیاتی مطالعے کے لئے پیش کر سکوں۔ ہاں کوئی دس برس کی عمر میں ایک ایسا واقعہ ضرور پیش آیا جس کو یاد کرکے آج بھی مجھے جھرجھری آجاتی ہے۔

گرمیوں کے دن تھے اور میں شام کو معمول کے مطابق کھیل کود سے فارغ ہوکر اپنے گھر کے صحن میں ایک چارپائی کے پاس ننگے پاؤں کھڑا دودھ پی رہا تھا کہ مجھے اپنے پاؤں پر کچھ حرکت سی محسوس ہوئی۔ یہ سوچ کر کہ شاید کوئی مینڈک وغیرہ ہوگا بغیر نیچے دیکھے میں نے پاؤں کو جھٹک دیا تھوڑی دیر بعد پھر ایسا ہوا میں نے ویسا ہی کیا۔ جب میں دودھ پی چکا تو مجھے اپنے پاؤں پر وزن سا محسوس ہوا نیچے دیکھا تو ایک کالا کوبرا کنڈلی مارے میرے پاؤں پر بیٹھا تھا میں نے کوشش کی کہ کسی کو مدد کے لئے پکاروں لیکن بول نہ سکا خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد سانپ خود بخود نیچے کھسک کر ساتھ پڑی اینٹوں کے ڈھیر میں گھس گیا۔ اس واقعہ کا فوری اثر مجھ پر یہ ہوا کہ میں سانپوں سے بہت ڈرنے لگا تھا۔ وقت ناوقت اپنے پاؤں کی طرف دیکھتا رہتا کہیں کوئی کوبرا تو پیچھا نہیں کر رہا۔ اینٹوں کے ڈھیر سے تو میں دور ہی رہتا تھا کچھ دنوں بعد اس کوبرے کو مار ڈالا گیا تو میری جان میں جان آئی لیکن جب میں سن شعور کو پہنچا تو میں نے اس واقعہ پر بہت غور کیا کہ کوبرے نے مجھے کاٹا کیوں نہیں۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا تھا کہ کوبرا میرے پاؤں پر بیٹھا تھا اس کا پھن میری ٹانگ سے مس ہو رہا تھا اور ڈر کے مارے میری آواز نہیں نکل رہی تھی لیکن میرا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ اور کالے ناگ نے خاموشی سے اپنی راہ لی۔

اس واقعہ سے میں نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ موت وزیست نفع ونقصان خدا کے ہاتھ میں ہے اس کی رضا کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا۔ بل ہی نہیں سکتا۔ بعد کو یہ یقین میدان جنگ میں میرے بہت کام آیا۔

ملٹری کالج کے ناقابل فراموش شب وروز

ساڑھے دس برس کی عمر میں، میں پانچویں درجے میں داخل ہوا مئی ۱۹۵۳ء میں ۲۱۶۲ کالج نمبر ملا تھا۔ اسکین ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا۔ میں کالج میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۱ء تک آٹھ برس رہا اور ۱۹۵۹ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا اور چونکہ اس زمانے میں دستور تھا کہ میٹرک فرسٹ ڈویژن کو ایف ایس سی کراتے تھے ہر چند کہ مجھے سائنسی مضامین سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی مجھے بھی سائنس پڑھنا پڑی اس بنا پر جب ۱۹۶۱ء میں ایف ایس سی کا رزلٹ نکلا اور میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ فیل ہونے سے تو بچا۔ اس تجربے سے میری رائے ہے کہ کم از کم انٹرمیڈیٹ کی سطح پر ضرور طلبہ کے رجحان طبع کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ کالج میں آٹھ برس گزارے۔ اسکین ہاؤس برڈووڈ ہاؤس میں رہا اور آکنلک ہاؤس میں بھی۔ ہاکی اور فٹ بال کھیلتا تھا لیکن ان کھیلوں میں یا کسی اور کھیل میں کوئی نمایاں امتیاز حاصل نہیں کیا۔ ہاں ہائکنگ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ کتابیں بھی ہابی کے طور پر پڑھتا رہا۔

کالج کی ناقابل فراموش یادیں

کالج میں اپنی زندگی میں نے کالج کے بے بی ہاؤس، اسکین ہاؤس سے شروع کی تھی۔ اس وقت میری عمر بمشکل گیارہ برس تھی۔ اس لئے گھر کی یاد آنا اور ہوم سک ہونا ایک لازمی سی بات تھی۔ یہی حال دوسرے نوگرفتاروں کا تھا۔ شروع کے دنوں میں ہم اکثر باجماعت روتے تھے۔ دل بہلانے کے لئے ہمارے دونوں ہاؤس ماسٹر مسٹر مظہر علی خان اور راشدی صاحب بڑے بڑے جتن کرتے

تے۔ کہانیاں سناتے تھے، ٹافیاں بانٹتے تھے۔ چھوٹے موٹے ڈرامے کراتے تھے حقیقت یہ ہے کہ یہ استاد ماں باپ بنے ہوتے تھے۔ ٹھیٹھ دیہاتی بچوں کو ملک کا بہترین آفیسر میٹریل بنانے میں کالج کے اساتذہ نے کتنی محنت کی ہوگی اور کتنی لگن سے کام کیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا باہر کے لوگوں کے لئے مشکل ہے۔ کالج کے لڑکے جہاں بھی ہیں اور جیسے بھی ہیں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں ایک شخصیت رکھتے ہیں اپنی خوداعتمادی احساس ذمہ داری جفاکشی اور قومی شعور سے صاف پہچانے جاتے ہیں بہ حیثیت مجموعی زندگی میں ہر اعتبار سے کامیاب ہیں یہ سب کچھ ملٹری کالج کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔

کالج کی زندگی کا ایک اور حسن بھی ہے جس کی طرف کم کسی کی نظر جاتی ہے اور وہ یہ کہ یہاں زندگی بھر کے اچھے ساتھی اور دوست مل جاتے ہیں۔ چونکہ سب ایک ساتھ رہتے سہتے اور اٹھتے بیٹھتے ہیں اس لئے ایک دوسرے کی خوبی اور خامی سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ ایسے میں جو دوست بنتا ہے وہ کھرا ہی ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ ملٹری کالج ہو، یا پی ایم اے یا یونٹ کہیں بھی جہاں بہت سے لوگ ایک کمیونٹی کی شکل میں رہتے ہیں نہ خودغرضی چلتی ہے۔ نہ خودغرض آدمی کامیاب ہوتا ہے۔ ملٹری کالج میں ہم نے مقابلہ کرنا ہی نہیں تعاون کرنا بھی سیکھا۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا بھی سیکھا۔ خوداعتمادی۔ ذمہ داری زندگی میں آگے بڑھنے کی امنگ اور اپنے پیروں سے آگے بڑھنے کا حوصلہ۔ یہ سب کچھ ملٹری کالج کا کرم ہے۔ اپنے دوستوں میں علمدار، یامین، فہیم درانی محمود، فیاض اور سید زمان کے نام اس وقت یاد آرہے ہیں یہ ملٹری کالج کی تربیت کا فیضان ہے کہ یہ سب افواج پاکستان یا سول میں اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ اور جہاں بھی ہیں۔ ملٹری کالج کے جھنڈے کو بلند کئے ہوئے ہیں۔

شرارتیں

شرارتیں کی ہیں، اور بے شمار کی ہیں۔ میرا تو گروپ ہی شرارتیوں کا تھا۔ مہم جوئی ہمارا

مشغلہ تھا۔ شرارت اور سزا کا چکر چلتا رہتا تھا۔ رات کو چھپ چھپ کر سوئمنگ پول میں تیرنا اسٹاف کے بنگلوں سے آم اور مالٹے توڑ کر کھانا خواہ وہ کچے یا کھٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ کالج سے باہر کھیتوں پر دھاوے بولنا۔ رات گئے سینما دیکھنا یہ قصے چلتے رہتے تھے۔ رات کو نکلتے تو بستر اس طرح بنا کر جاتے جیسے کوئی سو رہا ہے۔ چپل کا جوڑا بھی چارپائی کے پاس رکھتے۔ ہماری طرف سے پوری منصوبہ بندی ہوتی تھی۔ پکڑنے والے بھی کم ہوشیار نہیں تھے۔ بہرحال یہ آنکھ مچولی ہوتی رہتی کبھی پکڑے جاتے کبھی جل دے جاتے۔ سزائیں بھی ملتی رہتی تھیں۔ چونکہ یہ سزائیں گروپ کی شکل میں ہوتی تھیں اس لئے اگر ایک ساتھی پکڑا جاتا تو دوسرے بھی رضاکارانہ اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کرتے۔ تاکہ گروپ سے وفاداری پر حرف نہ آئے۔ کیا دن تھے اور کیا باتیں۔ اے گزرے دنو! اب تمہیں کون واپس لائے۔ ساتھیو! تم بہت یاد آتے ہو۔

کالج سے بعد کی منزلیں

میرا پی ایم اے کورس تیسواں لانگ کورس ہے جو مئی ۱۹۶۲ء میں شروع ہوا تھا اور ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو پاس آؤٹ ہوا۔ اور میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ۱۰ پنجاب سے وابستہ ہوا ان دنوں یہ پلٹن ملتان میں تھی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ چھڑنے سے کچھ عرصہ پہلے ہم سلیمانکی کے علاقے میں آگئے تھے جب جنگ چھڑی تو سلیمانکی سیکٹر پر میں نے اپنی یونٹ کی کمانڈ دیپالپور کی کمان کی اس معرکہ میں ایک آپریشن کے لئے مجھے امتیازی سند کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں امتیازی سند کا سندنامہ نقل کروں۔ دل چاہتا ہے کہ چھ ستمبر کی شام کو جس نفسیاتی تجربے سے میں دوچار ہوا۔ اس کا حال بھی بیان کردوں۔

وہ قصہ یوں ہے کہ چھ ستمبر ہمارے حملے کا وقت شام سوا پانچ بجے تھا۔ ہم لوگ تمام تیاری مکمل کرکے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اور دل میں عجیب خیالات جنم لے رہے تھے۔ گھر والوں سے ملے ہوئے تقریباً پانچ ماہ ہو چکے تھے۔ اور اس سوچ سے تھوڑی سی پریشانی ہوئی کہ شاید اب ان

سے دوبارہ ملاقات ہو یا نہ ہو۔ پیچھے سے کھانے والی جیپ آئی اور ڈرائیور نے مجھے ایک خط دیا۔ خط کھولا تو پتہ چلا کہ والد بزرگوار کا خط ہے اور نہایت ہی مختصر سا جس کے الفاظ کچھ یوں تھے۔

حالات بتا رہے ہیں کہ پاک بھارت جنگ کسی وقت بھی ہو سکتی ہے میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم ایک فوجی کے بیٹے ہو عظیم روایات کے حامل فوجی کالج کے تعلیم یافتہ اور جبر راجپوت، بہادری راجپوتوں کو ورثے میں مل جاتی ہے اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ اور اپنی روایات پر اعتماد یہ دو چیزیں انشاء اللہ تمہاری ہر مرحلے پر رہنمائی کریں گی۔ یہ خط میں نے کافی عرصہ اپنے پاس رکھے رکھا اور مجھے اب بھی اس مختصر خط کا متن یاد ہے جو نہ صرف جنگ کے دوران بلکہ پوری زندگی میرے لئے مشعل راہ بنا رہا ہے۔

امتیازی سند کا فرمان

پی اے ۸۰۰۷ لیفٹیننٹ محمد اقبال آپریشن کے دوران کمانڈو پلاٹون کمان کر رہے تھے۔ اور ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات کو دشمن نے جھنگر کے مقام پر ہماری اے کمپنی کی پوزیشن پر بڑی جلدی میں جوابی حملہ کیا۔ جھنگر اس کے دفاعی انتظامات میں بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے وہ جھنگر پوزیشن پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے کوشاں تھا اس وقت جبکہ ہمارا دفاعی توپ خانہ دشمن کو اپنی فارورڈ ڈیفنیس لائن کے سامنے الجھائے ہوئے تھا۔ لیفٹیننٹ محمد اقبال اپنی پلاٹون کو فاصلہ کا نالے سے پار دشمن کے بازو پر لے گئے تاکہ حملہ آور پر اس طرف سے یکایک فائر کھول کے اس کو بدحواس کر سکیں۔ چنانچہ یہ اپنے طور پر اپنی پلاٹون کو دشمن کے بازو پہ ایک موزوں جگہ پر لے گئے۔ اور وہاں سے دشمن پر فائر کھولا لیفٹیننٹ اقبال کی اس پر فراست اور جرأت مندانہ کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف دشمن کے حملے کا زور ٹوٹ گیا بلکہ اسے عقب میں کافی دور تک پسپا ہونا بصورت دیگر وہ اتنے پیچھے ہٹ کر ایف ڈی ایل نہ سنبھالتا۔

۲۲ اور ۲۳ ستمبر کی درمیانی رات کو لیفٹیننٹ اقبال کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی کہ وہ اپنی

پلاٹون کو آگے پہنچائیں اور اس سے پہلے کہ فائر بندی کا حکم نافذالعمل ہو وہ دشمن کے زیادہ سے زیادہ علاقہ پر قبضہ کرلیں۔ چونکہ وہ اس علاقے میں گشت کرتے رہے تھے وہ اپنی پلاٹون کو دشمن کے علاقے میں دو میل اندر جھوک تک لے گئے جو دشمن کی مرکزی پوزیشنوں سے صرف ۴۰۰ گز کے فاصلے پر تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں ان کی مڈبھیڑ دشمن کے تین پیٹرولوں سے بھی ہوئی۔ جنہیں بڑی ہوشیاری سے آوٹ فلینک کرکے انہیں فائربندی کے حتمی وقت سے پہلے پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا اس کے بعد انہوں نے اس علاقے میں اپنی پلاٹون کو جما دیا۔ اس نوجوان افسر کی قیادت اور جرأت مندانہ کارروائی کی وجہ سے ہی دشمن کے مزید دو سے لے کر چار میل کے علاقے پر ہمارا قبضہ ممکن ہوسکا۔ اس کارکردگی کے صلے میں پی اے ۸۰۰۷ لیفٹیننٹ محمد اقبال کو امتیازی سند عطا کی گئی۔

جنگ ستمبر سے بعد کی راہیں

نومبر ۱۹۶۶ء میں کیپٹن اور دسمبر ۱۹۷۰ء میں میجر کے عہدے پر ترقی ملی۔ ۱۹۷۴ء میں اسٹاف کالج کیا۔ بریگیڈ میجر رہا۔ اسکول آف انٹیلی جنس میں چیف انسٹرکٹر رہا۔ ۱۹۷۷ء میں لیفٹیننٹ کرنل ہوکر پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین اور پھر ایک بٹالین کو گلگت ایریا میں کمان کیا۔

مصنّف کا تبصرہ

کرنل اقبال نے ۶ ستمبر کی شام جس نفسیاتی تجربے سے گزرنے کا تذکرہ کیا ہے وہ محل غور ہے حملہ شروع ہونے سے پہلے کے لمحات غالباً حملہ شروع ہونے کے بعد کے ہر لمحہ سے زیادہ جذباتی کھنچاؤ کے حامل ہوتے ہیں جب کوئی چیز یقینی نہیں ہوتی موہوم اندیشے دل پر یلغار کرتے ہیں اور دوسری طرف نبرد آزمائی کا جوش علیحدہ دل میں ہلچل ڈالتا ہے یہ تربیت کا اثر ہے۔ یہ روایت اور ایمان کی قوت ہے جب تک ایسے باپ، اور ایسے بیٹے موجود ہیں پاکستان کا مستقبل محفوظ ہے۔ انشاءاللہ۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد فہیم خان درّانی ستارۂ جرأت

آرٹلری

لیفٹیننٹ کرنل محمد فہیم خان درّانی ستارۂ جرأت

آرٹلری

ہر جنگ کچھ ہیروز کو سامنے لاتی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں جو ہیروز قومی افق پر ابھرے اور ان میں سے ایک فہیم درّانی بھی ہیں۔ ماشاء اللہ۔ چونکہ اس کتاب کا منشاء بہادری کے کارناموں کا نفسیاتی مطالعہ کرنا ہے اور اس بات کی ریسرچ کرنی ہے کہ جو لوگ جنگ میں جی توڑ کر لڑتے ہیں ان کا ذہنی و جذباتی سانچہ کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس ذاتی قلمی تصویر کے لئے جو سوالنامہ ہم نے فہیم درّانی کو بھیجا اس میں ذہنی اور جذباتی پس منظر کو ابھارنے کے لئے خاص طور پر لکھا گیا تھا۔ فہیم کے جوابات پیش خدمت ہیں۔

نسلی اور خاندانی پس منظر

جیسا کہ میرے نام سے ظاہر ہے ہم نسلاً درّانی پٹھان ہیں اور افغانستان ہمارا آبائی وطن ہے کئی صدیاں پہلے غالباً لودھی بادشاہوں کے زمانہ میں ہمارے آباؤ اجداد نے افغانستان سے ہجرت کی اور پنجاب کے شہر لدھیانہ میں آباد ہوئے۔ لودھی بادشاہوں کے زمانے کی تخصیص اس

لئے کر رہا ہوں کہ خاندانی شجرے کے مطابق میری والدہ کا تعلق لودھی خاندان سے ہے۔ انہی لودھیوں سے بابر نے ۱۵۲۶ء میں ہندوستان کا تاج و تخت چھینا۔

ہندوستان میں آباد ہونے کے بعد ہمارے اجداد نے بڑی جد وجہد سے معاشی اور سماجی مقام حاصل کیا۔ میرے دادا رائل انڈین آرمی میں رسالدار میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے اور نانا انڈین ریلوے میں انجینئر تھے۔ اتفاق سے دونوں کا نام سردار عثمان خان تھا۔ میرے دادا کے بھائی رائل انڈین آرمی میں اس وقت کیپٹن تھے جب کہ کوئی کوئی غیر انگریز کیپٹن ہوتا تھا۔ میرے خالو سردار اسلم خان درانی سیشن جج تھے اور ماموں سردار محمد حیات خان شعبہ تعلیم سے متعلق تھے۔ میرے پھوپھا کرنل نیاز الدین احمد ملٹری کالج جہلم کے کمانڈانٹ رہ چکے ہیں میرے ایک چچازاد بھائی نیوی میں کیپٹن رہے ہیں اس پس منظر سے آپ خود اپنے نتیجے نکال سکتے ہیں کہ میں نے کس ماحول میں آنکھ کھولی ہو گی اور کون سی قدریں اور رویے میرے شعور اور لاشعور میں ہوں گے۔

آبائی قدریں

پہلے تو یہ کہ ایک جنگجو قبیلہ سے نسلی تعلق رکھنے کی بنا پر ہمیں لڑنا آتا ہے۔ تلوار سے بھی قلم سے بھی اور کردار سے بھی۔ وفاداری ہمارے خون میں ہے ہم روایتی طور پر بڑوں کا احترام کرتے ہیں اگر عمر میں ایک دن کا بھی فرق ہے تو چھوٹا بڑے کے سامنے زبان نہیں کھولتا۔ علم کے علاوہ ہمارا خاندانی امتیاز مذہبی شعور ہے۔ دین کے معاملہ میں ہماری عصبیت ہمیشہ سے بہت شدید رہی ہے۔

والد گرامی

میرے والد صاحب سردار محمد شاہ خان درانی فوج میں صوبیداری سے ریٹائر ہوئے۔ دوسری

جنگ عظیم میں انہوں نے برما کے محاذ پر جنگ میں حصّہ لیا تھا۔ وہ درّانیوں کی بہترین نسلی صفات کے حامل تھے۔ بڑے غیور تھے۔ مجھ سے ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے۔ بیٹے جاہ و منصب کے بل پر سر کو اونچا رکھنا کوئی کمال نہیں۔ مزہ تو تب ہے کہ انسان مفلسی اور بدحالی میں سر کو اونچا رکھے۔ ان کی دوسری نصیحت یہ تھی کہ زندگی دھوپ چھاؤں ہے۔ حالات اچھے ہوں یا بُرے کبھی یکساں نہیں رہتے۔ اس لئے کبھی آپے سے باہر نہ ہونا اور کبھی ہمّت نہ ہارنا۔ میں نسلی برتری کا نہیں روایات اور کلچر کی برتری کا ضرور قائل ہوں صدیوں سے پنجاب میں آباد ہونے کے باوجود ہمارے خاندان نے اپنے خصوصی کلچر کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً فارسی ہماری مادری زبان ہے۔ اس کو ہم بڑی حد تک زندہ رکھے ہوتے ہیں۔ گو دوسرے خاندانوں میں شادیوں سے فارسی کا اثر کم ہو گیا ہے۔

ابتدائی زندگی

میں ۱۵ مئی ۱۹۴۲ء کو لدھیانے میں پیدا ہوا۔ چونکہ مزاج میں تندی تھی اور درّانی خون ذرا زیادہ جوش مارتا ہے۔ اس لئے بچپن ہنستے کھیلتے کم، لڑتے جھگڑتے زیادہ گزرا۔ تقسیم ہند کے موقعہ پر ہمارا خاندان لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی ابتدائی تعلیم مسلم ماڈل ہائی اسکول لاہور میں حاصل کی۔ لدھیانے میں اور لاہور میں میرے پسندیدہ کھیل باکسنگ۔ کرکٹ تھے۔ اسکیٹنگ کا بھی شوق تھا۔

مسلم ماڈل اسکول لاہور کے دو استادوں کی یاد اب بھی میرے دل میں تازہ ہے۔ ایک صاحب کا نام بھی عزیز تھا۔ دونوں بچوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اور بڑے پیار سے پڑھاتے تھے۔ مجھ جیسے شرارتی مار دھاڑ کرنے والے لڑکوں پر بھی انہوں نے اپنی محبت اور شفقت کے دروازے بند نہیں کئے تھے۔ انسان کی فطرت بھی عجیب سی ہے۔ آرام بھول جاتا ہے۔ تکلیف بھی بھول جاتا ہے۔ لیکن نہیں بھولتا تو پیار کا بول اور محبت کی نظر نہیں بھولتا۔

ملٹری کالج جہلم

میں اگست ۱۹۵۲ء میں ملٹری کالج میں داخل ہوا۔ چھٹے درجے میں اور ۲۱۸۱ کالج نمبر ملا (۲۱۸۰ افتخار جعفر شہید کا نمبر تھا جو میرے ساتھ کالج میں داخل ہوتے تھے) برڈ وڈ ہاؤس (حال ایم جی ہاؤس) میں رہنے کو جگہ ملی۔ آخر میں اسی ہاؤس کا ہاؤس پریفیکٹ بننے کا اعزاز بھی نصیب ہوا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ بچپن سے میرا رجحان آؤٹ ڈور سرگرمیوں کی طرف تھا یہاں آکر اس شوق میں مزید ترقی ہوئی چونکہ یہاں ان سرگرمیوں کے لئے وسیع مواقع میسّر تھے اس لئے اس میدان میں کارکردگی بہت نمایاں اور ممتاز رہی۔ مثلاً کالج کی ہاکی اور فٹ بال ٹیم میں شامل تھا۔ ایتھلیٹکس میں چار سو اور آٹھ سو گز کی دوڑ میں عموماً فرسٹ آتا تھا۔ کراس کنٹری ریس میں فرسٹ آنے کا میرا ریکارڈ تھا۔ کالج کی کرکٹ ٹیم کا کپتان اور اور کلر ہولڈر تھا۔ ۱۹۵۹ء میں کالج کی طرف سے مری میں ہونے والے انٹر کالجز یوتھ ہوسٹلنگ مقابلے میں حصہ لیا۔ اور ۲۶ میل کی دوڑ میں فرسٹ آنے پر کالج کے لئے آل پاکستان انٹر کالجز یوتھ ہوسٹلنگ ٹرافی جیتی۔ ۱۹۵۹ء میں میں نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا لیکن ایف ایس سی کا نصاب ٹیڑھی کھیر ثابت ہوا اور اس میں تھرڈ ڈویژن آئی۔ کھلاڑی بندوں کا یہی حشر ہوتا ہے

کالج میں نک نیم بہت چلتے تھے۔ مجھے لڑکے لاہور سے آنے کی نسبت سے لاہوری یا لاہوریا کہتے تھے۔ میں بھی بیشتر لڑکوں کو ان کے نک نیموں سے پکارتا تھا۔ نک نیم کی نفسیات بھی عجیب ہے۔ کبھی تو اسے موسوم سے کوئی تعلق ہوتا ہے کبھی یوں ہی نام پڑ جاتا ہے۔ میرے زمانے میں نیڈو، لوٹا، گھوڑا، توپ، شیخ جی، لوسی، خر دماغ، صوفی، پیرا وغیرہ مقبول نام تھے لیکن یہ نام دل آزاری کے لئے نہیں دل لگی کے لئے تھے۔ جو ہنستا بولتا نہ ہو اس کے لئے عام لقب "بور" تھا۔ کتابی کیڑے "گھوٹو" کہلاتے تھے۔

اساتذہ میں سے کس کس کو یاد کروں، بلگرامی صاحب، مظہر صاحب، حیدری صاحب

اور علوی صاحب کی وجہ سے برڈووڈ ہاؤس کے ڈرامے کالج کے لئے ایک مثال اور معیار بن گئے تھے۔ ایسے قابل، ماہر اور باکمال استاد ہر ادارے کو میسر نہیں ہوتے۔ اس زمانے میں ہم نصابی سرگرمیوں کی رفتار بہت تیز تھی۔ ہر مہینے کالج سے باہر دو دو دن کا سارے کالج کا کیمپ پک نک ہر ٹرم تاریخی مقامات کی سیر، ہر ہفتے فارمل ڈنر کے بعد ہر ہاؤس میں ورائٹی پروگرام، سال میں ایک بار ہاؤس کا ڈرامہ، ہر سیکشن کا ڈرامہ ہوتا تھا۔ ہر لڑکے کے لئے نہ صرف باکسنگ رنگ میں آنا ضروری تھا۔ اس کے لئے اسٹیج پر آنا تقریر کرنا اور ڈرامے میں حصّہ لینا بھی ضروری تھا۔ اخلاقی تربیت کے لئے آنر سسٹم تھا۔ آنر شاپ تھی۔ آنر کورٹ تھی۔

اور یہ سب کچھ بڑی حد تک اس عظیم شخصیت کی وجہ سے تھا۔ جس کا نام کرنل رفیق تھا جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۹ء تک کالج کے کمانڈانٹ تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ لیڈر شپ کیا ہوتی ہے دیانت کا مفہوم کیا ہے۔ ملک و قوم کی خدمت کیسے کی جاتی ہے۔ نظم و نسق کے طریقے کیا ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کردار کیسے بنتا ہے اور کیسے بنایا جاتا ہے۔ کالج کی زندگی کا یہ تذکرہ ختم کرنے سے پہلے میں اپنے ایک ساتھی کا ذکر بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ وہ جو بہت اچھا دوست تھا۔ وہ جو لالچ اور خود غرضی سے بلند تھا۔ وہ جو دوستی نبھانا جانتا تھا۔ وہ جس کا نام خادم حسین تھا۔ وہ اب جس کی یاد باقی ہے۔

کالج سے بعد کی منزل - پی ایم اے

میں نیسویں لانگ کورس میں تھا۔ جو اپریل ۱۹۶۲ء میں شروع ہو کر اکتوبر ۱۹۶۴ء میں ختم ہوا پی ایم اے سے میں نے بی اے (سیکنڈ ڈویژن) کی ڈگری بھی لی۔ اور پی ایم اے لانگ کورس کا فزیکل ایفی شنسی میڈل لیا اور ۱۰۸ کیڈٹوں کے کورس میں، میں چودھویں نمبر پر پاس آؤٹ ہوا۔ پی ایم اے سے میں ۱۳ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری میں پوسٹ ہوا تھا۔ یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے۔ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا۔ کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر جنگ میں حصہ لیا اور ایک مشکل مرحلے

سے گزرنا پڑتا۔

جنگ ستمبر

ستمبر ۱۹۶۵ء میں، میں اپنی یونٹ کا سب سے کم عمر افسر تھا۔ میری بیٹری بارڈر سے کوئی دو ہزار گز کے فاصلہ پر متعین تھی۔ ۷ اور ۸ ستمبر کی درمیانی رات کو اس محاذ پر دشمن کا بھرپور حملہ آیا۔ کوئی ڈھائی بجے رات کا وقت تھا۔ حکم ملا کہ ذرا پیچھے جاکر پوزیشن لینا ہے۔ چنانچہ ضروری کارروائی شروع کر دی گئی۔ بدقسمتی سے ایک توپ کھینچنے والی گاڑی گاؤں کے قریب جاکر خراب ہو جانے کی وجہ سے رک گئی۔ میرے بیٹری کمانڈر میجر رجب بٹ نے مجھے حکم دیا درانی تم گن کے ساتھ ہی رہو۔ اگر گن کو لا سکتے ہو تو لاؤ ورنہ گن کو چھوڑنا نہیں۔ اور گن کسی قیمت پر دشمن کے حوالے نہیں کرنی۔ تھوڑی دیر بھی نہیں گزری تھی کہ دشمن کے گولے آس پاس آکر پھٹنے لگے اور ان کی شدت میں اضافہ ہوتے لگا۔ میں نے اس سے پہلے صرف مشقی جنگ میں حصہ لیا تھا یہ اصلی جنگ تھی گولے آس پاس دھماکے سے گر رہے تھے۔ اور ان کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ بچنے کی امید ہر لمحے کم ہوتی جا رہی تھی۔ چونکہ میں گن کو چھوڑ کر ایک قدم جانا حرام سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے دل سے کہا درانی اب سوال جان کا نہیں آن کا ہے۔ ڈٹا رہ۔ جو قسمت میں ہوگا ہو کر رہے گا۔ لیکن اللہ کو تو مجھے بچانا منظور تھا۔ پو پھٹتے پھٹتے ایک ریکب ڈاؤن گاڑی آگئی۔ اس وقت ہمارے اور دشمن کے ٹینک ایک دوسرے پر شدید فائر کر رہے تھے۔ ایسے طوفان سے گن کو نکال کے لے آنا آسان نہ تھا۔ بہرحال خدا کی نصرت کے سہارے یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔

بعد کو اپنے ساتھیوں کو اس جنگ میں زخمی ہوتے اور شہید ہوتے دیکھا۔ اور یہ عجیب تماشا دیکھا کہ جنہیں بچ جانا چاہیئے تھا مر جاتے اور جو بظاہر محفوظ ہوتے تھے اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے وہ موت کا شکار ہو جاتے تھے۔ ایسے بہت سے مناظر کو دیکھ کر موت کا جو خوف تھا وہ میرے دل سے نکل گیا۔ اور یقین ہو گیا جو گولی میرے نام کی ہے صرف وہی مجھے لگے گی۔ ۱۹۶۷ء میں فیلڈ آرٹلری

سے اے، اے آرٹلری میں میرا تبادلہ ہو گیا اور ۱۵ر نومبر ۱۹۷۱ء کو میں ۶ لائٹ اینٹی ایئر کرافٹ رجمنٹ آرٹلری کے ساتھ میں ڈھاکہ پہنچا اور پھر ڈھاکہ ایئرپورٹ کے تحفظ کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی۔

ڈھاکہ ائرپورٹ کا معرکہ

شاید انڈین آرمی ہماری رجمنٹ کے ڈھاکہ پہنچنے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ ۲۲ نومبر سے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر بڑے پیمانے پر لڑائی ہونے لگی تھی۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ ابھی تک محفوظ تھا پھر تین اور چار دسمبر کی درمیانی رات تقریباً ڈھائی بجے سے پورے مشرقی پاکستان میں جنگ چھڑ گئی۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر پی اے ایف کے صرف ۱۴ جہاز تھے۔ وہ بھی ایف ۸۶ قسم کے۔ ادھر ہندوستان نے ہر قسم کے ہوائی جہازوں کے ۱۲ اسکواڈرن جنگ میں جھونک رکھے تھے۔ ہر روز ہوائی اڈے پر تقریباً ۹۰ سے ۱۰۰ حملے ہوتے تھے۔ ہمارے جہاز صرف ۴ تاریخ کو ۱۱ بجے تک ہمارا ساتھ دے سکے اور اس دوران انہوں نے ہندوستان کے ۱۳ جہاز گرائے۔ ۴ دسمبر کو ۱۱ بجے ہمارے ایئرپورٹ کو ناکارہ بنا دیا گیا۔ اس وجہ سے پھر ہمارے جہاز اڑ نہ سکے۔ پھر کیا تھا سارا بوجھ ہماری رجمنٹ پر آن پڑا۔ یہاں تک کہ رات کو ان کے سامان بردار جہاز بم لے آتے تھے۔ اور پوری رات کو سروں پر منڈلاتے رہتے تھے اور جہاں چاہتے گولے پھینک دیتے۔

پوری ۱۷، ۱۸ کی جنگ کے دوران ہر روز ان گنت ہوائی حملے آئے اور ہزاروں ٹن کے حساب سے بارود پھینک کر گئے۔ ہر جگہ آگ ہی آگ اور زبردست دھماکے ہوتے۔ عمارتیں زمین پر آکر پاش پاش ہو جاتیں۔ انسانی زندگیوں اور دوسرے نقصان کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ کیونکہ ڈھاکہ کا آسمان ہندوستانی جہازوں کے پاس تھا۔ وہ جب چاہتے جس وقت چاہتے اور جہاں چاہتے گولے گراتے۔ مگر ہماری طیارہ شکن توپیں ان کا مقابلہ کرتی رہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ سماں بسنت کا ہے جب آسمان پتنگوں سے بھرا ہوتا ہے اور ہر طرف سے وہ کاٹا کی صدا سنائی دیتی ہے

یعنی تنشر ہماری یونٹ کی توپوں نے ہندوستانی جہازوں کا کیا اور اڑھائی دن میں ان کے ۱۸ جہاز مار گرائے ۔ پھر کیا تھا۔ ہندوستانی جہاز نیچے پرواز نہیں کرتے تھے بلکہ تقریباً ۸ سے ۹ ہزار فٹ کی بلندی سے ہی گولے پھینک کر چلے جاتے تھے۔

یہ ذکر ۴ دسمبر کا ہے کہ تقریباً ۱۱ بجے ایک ہندوستانی ایس یو سیون نے میری بیٹری کی ایک ۳۷ ایم ایم گن پوزیشن پر گولیاں برسائیں جس کے نتیجے میں میری بیٹری کے سات آدمیوں کو زخم آئے کسی کا پاؤں کٹ گیا۔ کسی کا کندھا، کسی کا بازو۔ غرض کہ ساتوں کے ساتوں جوان شدید زخمی ہو گئے۔ مگر اس موقعہ پر بیٹری کے دو آفیسرز کیپٹن محمود اور لیفٹیننٹ عطا اعوان قابل ذکر ہیں یہ ٹروپ کمانڈر تھے انہوں نے فوراً یہ دیکھتے ہوئے گن پر جگہ سنبھال لی اور گن سے فائر کرتے رہے جب وہ جہاز دوبارہ حملہ کے لئے آیا تو دونوں افسروں نے بغیر کسی خوف وہراس کے گن سے فائر کیا اور نشانہ اتنا اچھا تھا کہ اس جہاز کو مار گرایا۔ میں ان افسروں کی فرض شناسی اور دلیری پر فخر کرتا ہوں انہوں نے یہ کارنامہ انجام دے کر میرے بیٹری اور رجمنٹ کے جوانوں کے حوصلے بلند کر دیئے۔ ڈھاکہ کی فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔

دوسرا واقعہ ۵ ر دسمبر ۱۹۷۱ء کا ہے تقریباً ۹ بجے ہندوستانی تمام جنیوا کنونشن کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میری پہلی والی گن پوزیشن پر نیپام بم پھینک گئے۔ چاروں طرف آگ لگ گئی۔ گن کے کئی حصے جلنے لگے لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں جن پر نیپام کا مادہ گرا تھا جلنے لگے۔ میرے جوانوں کے لئے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر میں اپنی کمانڈ پوسٹ سے جو تقریباً ۵۰ گز کے فاصلے پر تھی بھاگا اور فوراً اس گن پوزیشن پر پہنچ گیا۔

جہاں پر لوگ آگ اور دھوئیں کی تاب نہ لاتے ہوئے آگ میں جھلس رہے تھے۔ یہاں تک کہ بارود کے بکسوں کو بھی آگ لگنے لگی تھی۔ اور خطرہ اس چیز کا پیدا ہو گیا تھا کہ کسی وقت بھی ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا اور ہر چیز فضا میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے۔ مگر اللہ کا شکر ہے میرے اور دونوں افسروں کے وہاں پر بر وقت پہنچنے سے صورت حال پر قابو پا لیا گیا ساری آگ بجھا لی گئی۔

بارود کے بکس جو جل سکتے تھے ان کو بھی آگ سے بچا لیا۔ اسی میں ہماری سلامتی تھی۔ یہ نظارہ وہاں پر موجود سات پاکستانی پائلٹوں اور ایک گروپ کیپٹن نے دیکھا مجھے یاد ہے کہ جب اللہ کے فضل سے ہم نے اس بحران پر قابو پا لیا تو گروپ کیپٹن مجید نے مجھ سے کہا کہ یہ لوگ انسان ہیں یا لوہے کے ٹکڑے جس پر میں نے جواب دیا کہ یہ لوگ مومن ہیں۔ میں نے ویسے کچھ بھی نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ جب میں نے اپنے جوانوں کو خطرہ میں دیکھا تو میں فوراً ان کے پاس گیا اور ضروری کارروائی کی۔ اصل کام میرے جوانوں اور افسروں نے کیا۔

مصنّف کا تبصرہ

ڈھاکہ ایئرپورٹ کے اس یادگار معرکے کے لئے فہیم درّانی نے حد درجہ انکسار سے کام لیتے ہوئے گو خود کوئی کریڈٹ نہیں لیا اور سارا سہرا اپنے ساتھیوں کے سر باندھ دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سب فہیم درّانی کی ولولہ انگیز قیادت، جرأت، فراست اور ناقابل شکست عزم کے بدولت ممکن ہو سکا۔ جس کی تائید ستارۂ جرأت کے فرمان سے ہوتی ہے۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران میجر فہیم خان ۲۱ ایل اے اے بیٹری (سابق ۶ ایل اے اے) کمان کر رہے تھے۔ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے کے متعلق دفاعی ذمہ داریاں ان کے سپرد کی گئی تھیں اس لئے ان کی بیٹری کی ایئر ٹریفک کنٹرول بلڈنگ ہوائی جہازوں کے ہینگر ایندھن کے ذخیرے سگنل ریڈار اور پی اے ایف آپریشن روم —— جیسے اہم اور کلیدی مقامات کے آس پاس متعین تھیں اور یہی وہ چنے ہوئے مقامات تھے جو دشمن کے ہوائی حملوں کا خاص نشانہ بنے ہوئے تھے۔ اور دشمن یہاں مسلسل اور متواتر بمباری کر رہا تھا۔

جنگ کے پہلے دو دنوں میں دشمن نے ان مقامات پر ۳۵۰ ہوائی حملے کئے۔ اور ان

۲۱ لائٹ انٹی ایئرکرافٹ بیٹری نے بڑی جرأت اور حوصلے سے مقابلہ کیا - دشمن نے ایس یو سیون ہنٹر، ناٹ وغیرہ کئی قسم کے ہوائی جہاز ان حملوں میں استعمال کئے - اور بڑی دیدہ دلیری سے بہت نیچے آکر گولیاں چلائیں راکٹ پھینکے اور بمباری کی - میجر فہیم کی بیٹری کی توپوں پر دشمن نے نیپام بم بھی گرائے - گویا ہر وقت آسمان سے آگ برستی رہتی تھی - لیکن گولے بارود کا یہ طوفان میجر درانی کے حوصلے کو پست نہ کر سکا - دشمن کے شدید اور مسلسل ہوائی حملوں کے دوران میجر فہیم کمال بے خوفی اور بے جگری سے اپنی ایک گن سے دوسری تک آتے جاتے رہے - اور اپنے آدمیوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے اور ان کی رہنمائی کرتے رہے - ان کے اس جرأت مندانہ رویئے سے ان کی پوری بیٹری کا حوصلہ بہت بلند رہا ان کے دل بھی جوش و جذبے سے بھر گئے اور بیٹری کے ہر فرد نے جو جہاں تھا اپنی جان لڑا دی -

ہر اعتبار سے فہیم درانی کی بیٹری کی کارکردگی کا معیار بلند سے بلند تر رہا - جس پر پاکستان آرمی کی کوئی یونٹ بھی فخر کر سکتی ہے - اتنے مختصر عرصے میں دشمن کے ۱۸ ہوائی جہاز گرا کر اس بیٹری نے فائر ڈسپلن اور صحیح نشانہ اندازی کی ایک ایسی روایت قائم کی جس کی تاریخ میں مثال نہیں -

دشمن سے مقابلہ میں بہترین ذاتی کارکردگی ولولہ انگیز قیادت غیر معمولی جرأت فرض سے مثالی لگن ایسی صفات کا مظاہرہ کرنے کے لئے میجر فہیم درانی کے لئے ستارۂ جرأت کی سفارش کی جاتی ہے - جس کے وہ ہر طرح سے مستحق ہیں - ۲۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ستارۂ جرأت عطا ہوا -

فہیم درانی سے ان کے ستارۂ جرأت پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے ان سے پوچھا یہ شاندار کارنامہ جس پر پوری قوم اور فوج ہمیشہ فخر کرے گی آپ کس خاص وجہ سے انجام دے سکے - تو ان کا جواب یہ تھا -

ادائیگی فرض کے اس کام کو آپ کارنامہ کہتے ہیں تو اس کو شاید میں اس لئے انجام دے سکا کہ مجھے زندگی اور موت پر پورا بھروسہ ہے مجھے اپنے وطن سے محبت ہے - اگر وطن زندہ رہے گا تو ہر چیز زندہ رہے گی - آزادی، عزت اور روزگار -

اور جب ان کی ذاتی امنگوں اور قدروں کی بات چھڑی تو درّانی نے بے ساختہ کہا۔
میری تمنا ہے کہ ملک کے لئے کوئی بڑا کام کر سکوں۔کوئی بڑی قربانی دے سکوں۔میں چاہتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح کسی کے کام آؤں۔

قدروں کے بارے میں یہ کہ میں منافقت خوشامد اور بے انصافی سے خواہ وہ اپنوں ہی کے لئے کیوں نہ کی جائے نفرت کرتا ہوں۔میں کھری بات کہتا ہوں اور کھری بات سننا بھی پسند کرتا ہوں۔میں چاہتا ہوں کہ کوئی وار کرے تو سامنے سے کرے۔وفاداری اور جفاکشی میرے خمیر میں اور میرے خون میں ہے۔اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ میری اولاد نیک ہو اور ملک و قوم کے کام آئے۔آمین۔

آجکل تو ۲۳ ۱۲ اسی اینڈ آر یونٹ کی کمان ہی میں سارا وقت گزر جاتا ہے۔کرکٹ گو ایک عرصے سے نہیں کھیلی لیکن کرکٹ کے کھیل اور شوق کا یہ عالم ہے کہ کسی کو گراؤنڈ میں کھیلتے دیکھتا ہوں تو کھڑا ہو جاتا ہوں۔جی چاہتا ہے کہ دوڑ کر جاؤں اور کہوں یار دو چار اوور مجھے بھی کھلا لو کوئی غیر ملکی ٹیم پاکستان آئی ہو تو پھر میں اور ٹی وی ہوتے ہیں۔اور وہ سیزن اچھا گزر جاتا ہے۔میرے بیٹے کا نام فیصل ہے اس کو بھی کرکٹ کا شوق ہے۔خدا اس کو سلامت رکھے اور خدا اس کے شوق کو پروان چڑھائے۔

لیفٹیننٹ کرنل منیر احمد افضل امتیازی سند

انجینئرز

لیفٹیننٹ کرنل منیر احمد فضل امتیازی سند، انجینئرز

گھر کا ماحول

میرے والد کا نام فقیر محمد تھا۔ وہ آرمی ایجوکیشن کور میں صوبیدار تھے ۱۹۵۲ میں ایک حادثہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ آرمی ایجوکیشن کور میں ان کی شمولیت حادثاتی نہیں اختیاری تھی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق انہیں فطری طور پر تھا۔ ادب اور شاعری کا بہت ستھرا ذوق رکھتے تھے سائنس سے بھی دلچسپی تھی۔ قرآن حکیم کے مطالعے کا شغف بھی تھا یہ نام کی تاثیر تھی۔ یا کسی کی دعا کا اثر کہ وہ سراپا فقر تھے مزاج میں درویشی تھی۔ اقبال کے الفاظ میں وہ مال و دولتِ دنیا اور رشتہ و پیوند دونوں سے بلند تھے۔ بے شک انہوں نے اپنی اولاد کے لئے دولت کے انبار نہیں چھوڑے لیکن، علم کا شوق، محنت کی لگن، اور ایثار و احسان کا رویّہ ضرور ورثے میں دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑی دولت یہی ہے۔ جو لازوال ہے۔ اور زندگی میں کامیابی کی کنجی۔ اس ورثے کے لئے میں والد مرحوم کا شکر گزار ہوں۔ زندگی کی بنیادی قدروں اور رویّوں کا بھرپور شعور سب سے بڑی دولت ہے۔ جو کوئی باپ اپنی اولاد کو دے سکتا ہے۔ میری والدہ مکرمہ بھی۔ والد مرحوم کی طرح بہت پرہیزگار خاتون ہیں سب لو

کی طرح شفیق اور حلیم لیکن چونکہ والد کے بعد ان کے سر پر تربیت کی وہ ذمہ داریاں بھی آن پڑیں تھیں جن سے عہدہ برآ ہونا صرف باپ کا حصہ ہوتا ہے۔ غالباً اس لئے انہوں نے ہم پر ضروری سختی بھی کی اور گھر میں ڈسپلن کی اس فضا کو قائم رکھا جو والد نے اپنی زندگی میں قائم کر دی تھی۔ وضاحت اس امر کی یہ ہے کہ اپنی زندگی میں والد صاحب کا اصرار ہوتا تھا کہ گھر کے چھوٹے بڑے صبح سویرے اٹھیں، نماز پڑھیں اور پڑھنا لکھنا کھیلنا، کھانا پینا وغیرہ سب کام وقت پر کریں۔ والد کے انتقال کے وقت میں دس برس کا تھا۔ میرے دو چھوٹے بھائی اور ایک بہن تو بہت ہی کم عمر تھے اب آپ خود اندازہ لگالیں کہ چار چھوٹے بچوں کی تربیت کتنا مشکل مرحلہ تھا۔ اور اس چیلنج کو انہوں نے جس طرح قبول کیا اس کا اندازہ اس امر سے لگالیں۔ کہ آج میں اس عہدے پر ہوں۔ ایک چھوٹا بھائی مکینکل انجینئر ہے، دوسرا بھائی چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہے اور بہن ماشاء اللہ پڑھ لکھ کر اپنے گھر میں خوش ہے۔ مجھ سے بڑی بہن بھی آباد و شاد ہیں یہ سب کچھ والدہ کا اعجاز ہے۔ ذاتی طور پر، میں نے ان کی دو عادتیں لی ہیں۔

پہلی یہ کہ میں بھی ان کی طرح کم گو ہوں، کسی حد تک میں نے ان کی حلیم الطبعی سے بھی حصہ پایا ہے۔ وہ خود صبر و ضبط کی تصویر ہیں اور اس کا عکس ان کے بچوں میں بھی نظر آتا ہے خدا ان کے سائے کو ہمارے اوپر تا ابد قائم رکھے۔ میں ان کی خدمت کو زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہوں۔ جب کبھی فوج میں مجھے جوانوں یا جونیئر افسروں سے بات کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ تو میں یہی کہتا ہوں کہ ملک سے وفاداری بھی گھر سے شروع ہوتی ہے۔ جو اپنے والدین کی خدمت دل و جان سے نہیں کرتا وہ ملک و قوم کی خدمت کیا کرے گا جو اپنے گھر کے پیاسوں کی پیاس نہیں بجھاتا وہ شاہراہ پر پانی کی سبیل کیا لگائے گا۔ جس کے اپنے گھر میں اندھیرا ہے۔ وہ پاس پڑوس میں چراغاں کیسے کرے گا۔

ابتدائی تعلیم

مجھے ابتدائی تعلیم گھر میں والد صاحب کی زیر نگرانی حاصل کرنے کی سعادت ملی۔ والد گرامی

چونکہ خود بہت خوشخط لکھتے تھے۔ اس لئے میرا خط بھی بہت اچھا ہوگیا۔ ریاضی ان کا پسندیدہ مضمون تھا۔ مجھے بھی ریاضی سے خصوصی تعلق پیدا ہوگیا۔ جو آگے چل کر میرے بہت کام آیا۔ والد نے مجھے کبھی کھیلنے سے نہیں روکا۔ بلکہ روز کی مقررہ پڑھائی کرنے کے بعد وہ کہا کرتے تھے کہ جاؤ بیٹے اب باہر جاکر کھیلو۔ کبھی کبھی خود بھی ہمارے کھیل میں شریک ہوجاتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے مجھے کوہاٹ کے ایک اسکول میں چوتھے درجے میں داخل کرایا اسی سال میں نے پرائمری اسکول میں وظیفے کا امتحان دیا۔ اور اچھے نمبروں سے کامیاب ہوا۔ پانچویں جماعت کے لئے مجھے والد کے تبادلے کی وجہ سے پنڈی کے ایک اسکول میں داخلہ لینا پڑا۔ یہ بہت اچھا اسکول تھا یہاں ہم نصابی سرگرمیوں کا چرچا بھی تھا۔ چنانچہ یہاں کے تقریری مقابلوں اور ڈراموں میں بھی حصّہ لیتا رہا۔ کھیلوں کی طرح ان سرگرمیوں میں حصہ لینے کی تاکید بھی والد مرحوم کرتے رہتے تھے۔ والد کی رہنمائی اور اساتذہ کی ہمّت افزائی کی بدولت اس اسکول میں، میں نے بڑے بھرپور دو سال گزارے۔ بھرپور سے میری مراد یہ ہے کہ میں نے رسمی تعلیمی نصاب میں امتیاز حاصل کیا غیر رسمی تعلیمی مشاغل میں کامیابی حاصل کی اور کھیلوں کے میدان میں بھی نمایاں رہا۔ اس لئے جب میں ملٹری کالج میں داخل ہوا تو اس تعلیم و تربیت سے استفادہ کرنے کے لئے ضروری زمین تیار ہوچکی تھی۔

ملٹری کالج کے زمانے کی داستان

۱۹۵۴ء میں، میں ساتویں جماعت میں داخل ہوا۔ کالج نمبر ۲۲۶۲ ملا۔ ۱۹۵۸ء میں میٹرک اور ۱۹۶۰ء میں ایف ایس سی امتیاز کے ساتھ پاس کیا کالج کے دوران تعلیم ہر کلاس میں میری پوزیشن پہلی دوسری ہوتی تھی۔ کالج کی فٹ بال اور کرکٹ ٹیم کا ممبر تھا۔ ۵۸ - ۱۹۵۷ء میں کرکٹ کا کالج کلر لیا۔ اس کے علاوہ کالج کے انٹر ہاؤس تقریری مقابلوں اور ڈراموں میں امتیاز کے ساتھ حصہ لیا اس زمانے میں کالج میں ایک ہفت روزہ اخبار کا اجرا ہوا تھا اس کا پہلا ایڈیٹر ہونے کا اعزاز بھی اس خاکسار کو نصیب ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۲۳ ، مارچ ۱۹۵۶ء کو ہم نے نیوز اینڈ ویوز کا یوم جمہوریہ

نمبر نکالا تھا اس میں آئین پاکستان پر بزرگ استاد قبلہ حسن صاحب کی ایک نظم بھی شائع تھی ۔
اور دوسرے اساتذہ کے تاثرات و پیغامات بھی چھاپے تھے ۔ ٹائیٹل پیج پر غلامی کی زنجیریں ٹوٹتے
اور آزادی کا سورج طلوع ہوتے دکھایا گیا تھا ۔ ۱۹۶۰ء میں ، میں نے کالج سے ایف ایس سی کا امتحان
فرسٹ ڈویژن میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا ۔ ایف ایس سی میں میرا خاص مضمون ریاضی تھا ۔ اس
کے ساتھ ہی مجھے ادب سے لگاؤ تھا اور اب بھی ہے گو اب خالص ادبی مطالعے کا وقت بہت
کم ملتا ہے ۔ پبلک اسکول طرز کے اداروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی خاص افادیت یہ ہے
کہ یہاں طلبہ کو اپنے اساتذہ کے بہت قریب رہ کر زندگی کے بارے میں بہت کچھ سیکھنے اور بہت
سے رویئے جذب کرنے کا موقعہ ملتا ہے ۔ یہ بالکل صحیح ہے میرے دور تعلیم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس
وقت وہاں غیر معمولی طور پر تجربے کار با صلاحیت اور با کردار استاد موجود تھے ۔ ایک سے ایک بڑھ کر
اور عظیم کس کا نام لوں اور کس کا چھوڑ دوں اور اگر نام لینا ہی ہو تو اس دور کا کوئی طالب علم کرنل رفیق
کا نام لیئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا جو ہمارے کمانڈانٹ تھے اس لئے میں بھی یہی کہوں گا کہ ان کی
شخصیت غیر معمولی طور پر موثر تھی ۔ دوسرا نام مسٹر فضل حق حیدری کا ہے ۔ انگریزی پڑھانے میں
اور ڈرامہ پیش کرنے میں ان کا جواب نہیں تھا ، موسیقی ، مصوری اور فوٹوگرافی میں بھی دخل تھا ۔
ایسے فنکار استاد ہر ادارے میں نہیں ہوتے ۔ لیکن ذاتی طور پر جس شخصیت نے مجھے سب سے زیادہ
متاثر کیا وہ جناب سعید راشد تھے ۔ جو اس زمانے میں راشدی صاحب کے نام سے معروف تھے
راشد صاحب اسکین ہاؤس میں میرے پہلے ہاؤس ماسٹر تھے ۔ خاص طور پر اس وجہ سے میرا کردار
بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ، استاد ، ساتھی بڑے بھائی اور بزرگ میرے لئے اور شاید سب
کے لئے وہ اس وقت سب کچھ تھے ۔ سادہ مزاج نفاست پسند ، شفیق و ہمدرد لیکن ڈسپلن کے
معاملے میں سخت ، یہ بظاہر متضاد صفات ان کے ہاں ساتھ ساتھ موجود تھیں ۔ زندگی میں
توازن قائم رکھنا میں نے راشد صاحب سے سیکھا ۔ بہت مشکل لمحات میں ضبط و تحمل سے کام
لیتے میں نے انہیں ایک بار نہیں بارہا دیکھا آگے چل کر یہ مثال میرے بہت کام آئی ۔ اس کے

علاوہ جس طرح اور جس انداز سے وہ کلاس کے اندر اور کلاس سے باہر لڑکوں کی عزت کرتے تھے وہ میرے لئے نیا تجربہ تھا۔ اس رویئے سے کم از کم میرے اندر اپنی علیحدہ شخصیت کی اہمیت کا ایک شعور پیدا ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اصل میں استاد وہی ہے جو طالب علم کے شعور کو جگا دے جو اس کو اس کی شخصیت کے امکانات سے آشنا کر دے۔ کتاب زندگی کا یہ ورق الٹنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ایک آدھ شرارت اور سزا کا ذکر بھی کروں یہ غالباً ۱۹۵۸ء کی سردیاں تھیں ہم میٹرک کلاس کے لڑکے امتحان کی تیاری کے سلسلے میں کالج میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ تمام دن اور پھر رات گئے تک پڑھ پڑھ کے بور ہو جاتے تو رات کو کسی "مہم" کی سوجھتی اصل میں یہ لہو گرم رکھنے کا بہانہ تھا کالج کے آس پاس کے کھیت، ان کی گاجریں اور گنے ہمارا نشانہ بنتے تھے۔ اس میں خطرہ بھی تھا۔ لیکن جوان خون خطرات کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا کالج کے اندر مالٹوں کے درختوں پر یلغار ہوتی تھی۔ کیمسٹری لیب کے سامنے ایک کچی بارک میں ایک فزکس لیب ہوتی تھی جو اب گرا دی گئی ہے اس کے آخری کنارے پر رات کو جنگلی کبوتر بسیرا کرتے تھے یہ پرانی روایت چلی آ رہی تھی کہ رات کو ان پر شبخون مارا جاتے اور پھر جو کبوتر ہاتھ لگیں انہیں چوری چوری بھون کے کھایا جاتے ایک روز کبوتروں پہ ہاتھ صاف کرنے کا پروگرام بنا۔ اور گروپ کی قیادت حسب دستور افتخار جعفر کے ہاتھ میں تھی۔ اس روز ہمارے ہیوی ویٹ ہیرو شربت خان نے بڑے اصرار سے اپنی خدمات پیش کیں کہ آج کمانڈو ایکشن میں کروں گا۔ افتخار جعفر نے بہت سمجھایا کہ بھائی ہم پہ رحم کرو سائنس بلاک کی پرانی چھت تمہارا وزن نہیں برداشت کر سکے گی لیکن شربت خان نہ مانے آخر کو وہی ہوا جس کا ڈر تھا مگر شربت خان نے جونہی اپنا حملہ شروع کیا۔ بیرک کی پرانی بلی ٹوٹی اور شربت خان دھڑام سے نیچے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ ہاتھ پیر نہیں ٹوٹا۔ بہر حال شورسن کے چوکیدار بھاگا بھاگا آیا اور ہمارے ہیوی ویٹ ہیرو موقعہ واردات پر دھر لئے گئے۔ ہم نے بھی اپنی گرفتاریاں پیش کر دیں۔ اس لئے کہ ساتھی کو اکیلے پھنسے دیکھنا جواں مردی کے خلاف تھا۔ صبح کرنل رفیق کے سامنے پیشی ہوئی۔ وہ بہت سخت تھے۔ سب کا خیال تھا کہ خوب شامت

آئے گی۔ لیکن خلاف توقع انہوں نے معمولی سی سزا دے کر چھوڑ دیا۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ایسا انہوں نے یقیناً بہت سمجھ کے کیا ہوگا۔ وہ غلطی کی نوعیت کو بھی دیکھتے تھے جھوٹ اور دھوکے کی سزا ان کے یہاں بہت سخت تھی لیکن بے ضرر شرارتوں کو نظر انداز کر دیتے تھے

ملٹری کالج سے پی۔ایم۔اے تک

میں اٹھائیسویں لانگ کورس کے لئے اپریل ۱۹۶۱ میں پی ایم اے گیا اور اکتوبر ۱۹۶۳ میں وہاں سے پاس آؤٹ ہوا۔ میں صلاح الدین کمپنی میں تھا وہاں میرے ساتھ اور ہم عصر ملٹری کالج کے بہت سے اولڈ بوائز تھے جن میں سے کالج نمبر ۱۱۸۱ محمد اکرم، اور کالج نمبر ۲۱۸ افتخار اب شہید ہو چکے ہیں۔ افتخار کالج میں میرے ساتھ تھے لیکن وہاں ایک ٹرم سینئر تھے اور سخت سزائیں دے کر حق دوستی ادا کرتے تھے۔ پی۔ایم۔اے میں، میں اپنی کمپنی کی فٹ بال، باکسنگ، سکوائش اور اکیڈمی کی کرکٹ ٹیم میں تھا۔ چوتھی ٹرم میں کارپورل اور آخری میں سینئر انڈر آفیسر رہا۔ پاس آؤٹ ہونے پر انجینئرز میں کمیشن ملا جسے عام طور پر سفر مین کہا جاتا ہے۔

کمیشن سے بعد کی روئداد

۱۹۶۵ء کی لڑائی سے دو ہفتے پہلے تک میں فرسٹ انجینئر بٹالین کے ساتھ منسلک رہا۔ اور اور اس وقت تک صرف دو کورسز کئے تھے۔ جن میں اللہ کے کرم سے میری گریڈنگ اے اور بی پلس تھی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں نے سیکنڈ انجینئر بٹالین کے ساتھ چھمب جوڑیاں میں لڑی جنگ میں انجینئرز کا کام اپنی فوج کے لئے راستے اور پل بنانا اپنی طرف سے بارودی سرنگیں بچھانا اور دشمن کی بچھائی بارودی سرنگیں اٹھانا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فیلڈ انجینئرنگ کے بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں لڑائی میں مختلف اوقات میں مجھے مختلف کارناموں پر مامور کیا جاتا رہا۔ لیکن جو ذمہ داری زیادہ تر میرے سپرد کی گئی وہ بارودی سرنگیں بچھانے یا ہٹانے کی تھی اور اس کام

میں مجھے اپنی یونٹ میں ماہر سمجھا جانے لگا تھا۔ جنگ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ انسان اندر سے جو کچھ ہوتا ہے وہ سامنے آجاتا ہے۔ میری تعلیم و تربیت جس انداز سے ہوئی تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ جنگ کو میں ایک چیلنج اور پاکستان سے اپنی محبت کے لئے ایک امتحان سمجھوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کا عرصہ میں نے ایک جنون کی سی حالت میں گزارا نہ دن کا ہوش تھا نہ رات کا۔ اسی دوران میں ایک بارودی سرنگ پھٹنے سے زخمی ہوا اور گھٹنے سے ایک ٹانگ کٹوانی پڑی۔ اس کارروائی میں اپنی کارکردگی کے بارے میں میرا خود کچھ کہنا مناسب نہ ہوگا اس لئے امتیازی سند کے فرمان کو نقل کرتا ہوں۔

امتیازی سند کا فرمان

۱۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات کو پی اے ۶۸۱۹ لیفٹیننٹ منیر احمد افضل کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی کہ وہ اے فیلڈ کمپنی کی ایک پلاٹون کی مدد سے ۶ پنجاب کی پوزیشن کے سامنے اور دلوی پور کے مغرب میں بارودی سرنگیں بچھائیں۔ سرنگیں بچھانے کا حکم ۶ بریگیڈ کے کمانڈر نے دیا تھا چونکہ اس علاقے میں دشمن کے حملے کا خطرہ تھا یہ علاقہ دشمن کے چھوٹے ہتھیاروں اور دفاعی توپ خانے کے فائر کی زد میں تھا۔

لیفٹیننٹ منیر کی پلاٹون نے جونہی بارودی سرنگیں بچھانے کا کام شروع کیا پوری پلاٹون پر دشمن نے پوری طاقت سے فائر کھول دیا۔ اس کے باوجود لیفٹیننٹ منیر احمد افضل نے اپنی پلاٹون کو اس طرح پھیلا دیا اور اس ہوشیاری سے منظم کیا کہ بارودی سرنگیں بچھانے کی کارروائی بخوبی مکمل ہوئی۔ اس تمام کارروائی کے دوران لیفٹیننٹ منیر نے غیر معمولی جرأت اور قیادت کی مثالی صفات کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے ان کی ساری پلاٹون کا حوصلہ بلند رہا۔

۱۵ ستمبر ۶۵ ۱۹ء کو دلپال کے علاقے میں بھی لیفٹیننٹ منیر نے بارودی سرنگیں بچھانے کا فرض سخت مشکلات میں کامیابی سے ادا کیا۔

ان تمام کارروائیوں میں انہوں نے فرض سے لگن کا بہت اونچا معیار قائم رکھا اور اپنے ذاتی تحفظ کی ذرّہ برابر پرواہ نہیں کی۔ جس کی وجہ سے بارودی سرنگیں بچھانے کا اہم کام پورا ہو سکا۔ اس اعلیٰ کارکردگی کے لئے امتیازی سند کی سفارش کی جاتی ہے۔

امتیازی سند کا اعلان ۹ مارچ ۱۹۶۶ء کو کیا گیا۔

کتاب زندگی کا بہترین سبق

یہاں تک جو کچھ آپ نے پڑھا وہ کرنل منیر افضل کی آپ بیتی تھی۔ انہی کے قلم سے، اس کو پڑھ کر ہم نے ایک ملاقات میں ان سے یہ ذاتی سوال پوچھا۔

جب آپ لڑائی میں زخمی ہوتے اور گھٹنے سے ٹانگ کاٹی گئی تو آپ چھبیس برس کے ایک نوجوان غیر شادی شدہ لیفٹیننٹ تھے۔ یہ عمر امنگوں اور آرزوؤں کی ہوتی ہے۔ حسین خوابوں کی عمر ہوتی ہے۔ عین موسم بہار میں یہ گرم ہوا کا جھونکا آیا اس کو آپ نے کیسے برداشت کیا؟ آج آپ ماشاءاللہ لیفٹیننٹ کرنل ہیں۔ بھرا پرا گھر ہے۔ کونے کونے میں بہار ہے۔ قہقہے ہیں۔ چہچہے ہیں اور سب سے بڑھ کر آپ خود ایک بھرپور اور فعال زندگی گزار رہے ہیں اتنی کامیاب زندگی تو ان لوگوں کی بھی نہیں ہوتی، جنہیں بظاہر کوئی ہینڈی کیپ نہیں ذرا اس راز سے پردہ اٹھائیے۔

اس سوال کے جواب میں، کرنل منیر نے کہا۔

ایسا کیوں ہوا۔ یہ میری کتاب زندگی کا اہم ترین سبق ہے اور میں اس کتاب کے قارئین تک اپنا تجربہ ضرور پہنچانا چاہتا ہوں۔ جب یہ حادثہ رونما ہوا تو میری عمر صرف تئیس برس کی تھی اور میں نے اپنا کیریر بڑی امنگوں سے شروع کیا تھا اس وقت کوئی اور ہوتا تو اس صدمے سے جی چھوڑ بیٹھتا لیکن ۱۹۵۲ء میں والد کی حادثاتی موت کے بعد میری والدہ نے اس حادثے کا جس طرح مقابلہ کیا تھا اور میری تربیت جس طرح کی تھی اس کڑے وقت میں اس مثال نے مجھے بڑا حوصلہ دیا۔ نپولین کا وہ فقرہ جس کا کبھی والد صاحب نے حوالہ دیا تھا کہ کوئی چیز ناممکن نہیں ہے

وہ بھی میرے آڑے آیا اور میں نے دل میں تہیّہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے میں اپنی جسمانی معذوری کو اپنے حوصلوں اور امنگوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دوں گا اللہ کا شکر ہے کہ میں ایسا کر سکا میں نے ہر کورس اور ہر یونٹ میں کام کر کے نمایاں کامیابی حاصل کر کے اللہ کے کرم سے زمانے پر ثابت کر دیا کہ ہمت مرداں مدد خدا۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کے عزم اور حوصلے میں جو قوّت ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں۔ میرا زندگی بھر کا تجربہ ہے کہ انسان کام کرنے سے نہ تھکتا ہے اور نہ ہی اس کے جسم یا اعصاب پر اس کا کوئی برا اثر پڑتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں کام کرنے کا جذبہ اور شوق ہو۔ کام کرنے سے جو ذہنی سکون ملتا ہے، روح کو جو اطمینان نصیب ہوتا ہے، تحفّظ کا جو احساس ہوتا ہے۔ اس کا تو کوئی بدل ہی نہیں محنت کامیابی ہی کا ذریعہ نہیں، عزّت کا سرچشمہ اور اطمینان وسکون کا وسیلہ بھی ہے۔ اقبال کا یہ خیال کہ

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبین

صحیح ہی نہیں بالکل صحیح ہے۔ حادثے کے بعد مجھے میڈیکل کیٹگری "سی" کر دیا گیا تھا۔ اس کیٹگری کے افسر عموماً میجری سے آگے نہیں جاتے لیکن مجھے اللہ کا کرم ہے لیفٹیننٹ کرنیل کے عہدے پر بھی ترقی ملی میری اس کامیابی اور عزّت یابی میں میری والدہ کی دعاؤں اور میری بیوی کے بھرپور تعاون کا بڑا دخل ہے میرے بھائی بھی میرے لئے تقویت کا باعث بنے رہے ہیں۔ خدا ان سب کو خوش رکھے۔ اب تک زندگی میں جو کچھ کر سکا ہوں اس سے مطمئن تو نہیں لیکن شرمندہ ہرگز نہیں ہوں انسان کی نجات کوشش میں ہے۔ کامیابی اس کی ذمّہ داری نہیں۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

کمانڈر گل زمان ستارۂ جرأت

پی۔این

کمانڈر گل زمان ملک ستارۂ جرأت

پی۔این

۲۲۷۹۰ کمانڈر گل زمان ملک ستارۂ جرأت، ملٹری کالج کے ان فرزندوں میں سے ہیں جنہوں نے پاکستان نیوی میں نام پیدا کیا ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ایک اہم جنگی کارروائی حد درجہ دلیری سے سرانجام دینے پر گل زمان ملک کو ستارۂ جرأت کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ کوئی بڑا کارنامہ نہ محض اتفاق ہوتا ہے نہ مکمل طور پر حالات کی پیداوار ہوتا ہے اس کے پیچھے ایک شخصیت اور شخصیت کے پیچھے وراثت، ماحول، تربیت کے ترکیبی عناصر ہوتے ہیں۔ اس نفسیاتی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے گل زمان سے کہا کہ پہلے وہ اپنی وراثت، ماحول اور تربیت سے پردہ اٹھائیں اس کے جواب میں گل زمان لکھتے ہیں۔

وراثت اور ماحول

میرا نسلی تعلق مشہور اعوان قبیلے سے ہے جو جہلم کے علاقے میں صدیوں سے آباد قطب شاہی اعوانوں کی نسلی روایات میں دلیری و دلاوری کے ساتھ مذہبی عصبیت بھی شامل رہی

ہے تلوار کے ساتھ قرآن، کبھی ہمارا نسلی طرۂ امتیاز تھا۔ اب بھی راکھ میں کچھ چنگاریاں باقی ہیں۔ چنگاریوں سے میری مراد وہ ثرات ہیں جو میں نے اپنے گھرانے سے قبول کئے۔ ہمارے خاندان کے بیشتر افراد پشت ہا پشت سے فوجی ہیں اور فوجیّت ہمارے ماحول میں رچی بسی ہے۔ میرے والد ملک محمد خان بھی ایک طویل عرصے تک ۱۲ پنجاب رجمنٹ سے وابستہ رہے اور آخر میں آنریری لیفٹیننٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

والد کی شخصیت کا ایک پہلو

میرے والد ملک محمد خان صاحب بے حد بردبار انسان تھے۔ وہ مشکلات اور مسائل کا خاموشی سے مقابلہ کرنا جانتے تھے۔ بعض لوگ ہوتے ہیں جو بات بات پر بھڑک اٹھتے ہیں طیش میں آجاتے ہیں۔ جوش میں بہت کچھ کہہ گزرتے ہیں یا کر گزرتے ہیں ان کا انداز سنگ خارا کی اس چٹان کا سا تھا جو سمندری طوفانوں کا بے نیازی سے مقابلہ کرتی ہے۔ تو سب سے پہلی چیز جو میں نے والد ماجد سے سیکھی وہ یہ تھی کہ آدمی میں مشکل سے مشکل حالات کا دباؤ برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیئے۔ وہ کہا کرتے تھے بیٹا برداشت کرنا اور ضبط کرنا سیکھو۔ اگر وار کرنے کی ضرورت ہو تو بھرپور وار کرو لیکن بھرپور وار بھی وہی کر سکتا ہے جو جذباتی طوفان کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ والد کی ایک اور خصوصیّت جس کا میں بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ان کی سخت کوشی بلکہ جفاکشی کی عادت تھی۔ ان سے زیادہ محنتی آدمی میں نے نہیں دیکھا اسی محنت کی بدولت وہ سپاہی سے آنریری لیفٹیننٹ کے عہدے تک پہنچے۔ محنت کرنا جان مار کے کام کرنا ان کی فطرت سی بن گئی تھی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ انہوں نے ہمیں محنت کرنے کی خاص طور پر کبھی تاکید نہیں کی، اسی طرح اہتمام کے ساتھ نہ انہوں نے کبھی دیانت داری پر لیکچر دیا اور نہ خصوصیّت سے نصیحت کی۔ محنت اور دیانت ان کی زندگی میں رچی بسی تھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ میں نے والد سے سیکھا ان کے الفاظ سے نہیں ان کے کردار سے سیکھا یہاں مجھے یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ سچے اور

پکے مسلمان تھے اور شعائر اسلام کی پابندی بڑے اہتمام سے بلکہ شوق سے کرتے تھے۔ والدہ صبر و شکر کا پیکر تھیں۔ شکر الحمدللہ ان کا تکیہ کلام سا تھا۔ بات بات پر بسم اللہ کہتی تھیں۔ کوئی آئے تو بسم اللہ جائے تو بسم اللہ کوئی کام شروع ہو تو بسم اللہ میں جب کبھی اسکول سے آتا اور بھاگ کر ان کی طرف دوڑتا تو وہ اتنی خوش ہوتیں اور بسم اللہ کہتی جاتی تھیں۔ صبر کرنا اور شکر کرنا میں نے اپنی پیاری ماں سے سیکھا ہے۔

بچپن کے شب و روز

میری تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۹۴۵ء ہے اور جائے پیدائش ضلع جہلم، تحصیل پنڈ دادنخان کا ایک چھوٹا سا گاؤں چندو ہے لیکن چندو میں، میں نے چند سال ہی گزارے۔ جب میں چند سال کا تھا تو والد نے رحیم یار خان کے قصبے لیاقت پور میں دو مربعے زمین خریدی اور ہم لوگ چندو سے لیاقت پور منتقل ہو گئے۔ میری ابتدائی تعلیم لیاقت پور ہی میں ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں والد نے مجھے لیاقت پور کے پرائمری اسکول میں داخل کرایا تھا۔ یہ اسکول ہماری زمینوں سے خاصے فاصلے پر تھا اس عمر میں روزانہ اسکول پیدل آنا جانا میرے لئے خاصا مشکل تھا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ شروع سے مجھے پڑھنے کا شوق تھا اس لئے میں نے اس فاصلے کو اپنے اوپر بار نہیں ہونے دیا۔ لیاقت پور کا اسکول ایک چھوٹا اسکول تھا۔ دینیات پڑھانے کے لئے جو استاد تھے۔ ان کا نام مولوی عبدالرشید تھا۔ یہ نام ہی کے نہیں کردار کے بھی رشید تھے۔ اچھے باتیں ہی نہ بتلاتے تھے اچھے کام بھی کرتے تھے۔ میں نے ان میں یہ خاص بات دیکھی کہ لمبی چوڑی نصیحتیں نہیں کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو اس عمر میں بچوں کے لئے ضروری ہوتی ہیں بڑے پیار سے سمجھاتے تھے۔ تربیت دینا تعلیم دینے سے زیادہ مشکل کام ہے یہی وجہ ہے کہ اچھے معلم تو مل جاتے ہیں لیکن اچھے استاد ذرا مشکل سے ملتے ہیں۔ بچہ بھی عجیب چیز ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کے معنی سمجھے یا نہ سمجھے محبت، نفرت یا لاتعلقی کی زبان فوراً سمجھ جاتا ہے۔ ابھی دل کی بات زبان پر نہیں آتی کہ بچہ سمجھ جاتا ہے کہ کوئی کتنے فاصلے

سے اس سے بات کر رہا ہے ۔لیاقت پور اسکول کے زمانے کے دو ایک واقعات ایسے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتے ۔اپنے کاروان زندگی کی کہانی آگے بیان کرنے سے پہلے میں ان دو تجربوں کو بیان کرنا چاہتا ہوں ۔

دو بچے دو مائیں

ایک روز میں اسکول سے گھر واپس جا رہا تھا ۔کہ راستے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ہرنی کا ایک چھوٹا سا پیارا بچہ ایک جھاڑی کے تلے بیٹھا ہے ۔شاید سو رہا تھا کہ آنکھیں بند تھیں سمٹا ہوا لیٹا تھا ۔اور ایک پنجہ منہ کے قریب تھا ۔ہرنی کے بچے کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے دھک دھک کرنے لگا ۔ہرن کا پیارا بچہ وہ بھی اتنا قریب جی چاہا پکڑ کر خوب پیار کروں اور گھر لے جاؤں میں نے فوراً بستہ زمین پر رکھا ۔تختی ہاتھ میں لی ۔اور میں دبے پاؤں اپنے شکار کی طرف بڑھنے لگا ۔بچہ اسی طرح سویا ہوا سا لیٹا تھا ۔چند قدم باقی تھے ۔مجھے یقین تھا کہ میں اسے پکڑ لوں گا ۔کہ یکایک آناً فاناً ایک ہرنی چوکڑیاں بھرتی نمودار ہوئی ۔بچہ اچھلا اور وہ اسے لے کر ریت کے ٹیلوں کے پیچھے روپوش ہوگئی ۔یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ میں تو کھڑے کا کھڑا رہ گیا ۔بڑی مایوسی ہوئی ۔میں دیر تک اِدھر اُدھر ٹیلوں میں گھومتا رہا ۔ایک موہوم سے امید میں کہ شاید پھر کہیں وہ نظر آجائے ۔جب میں گھر کی طرف پلٹا تو خاصی دیر ہو چکی تھی ۔میری ماں مجھے ڈھونڈتی ہوئی گھر سے آرہی تھیں ۔جونہی انہوں نے مجھے دیکھا دوڑ کر مجھے گود میں اٹھا لیا ۔"کہاں رہ گیا تھا ۔میرے بچے!" انہوں نے مجھے چوم کر کہا ۔یہ زندگی ہے ماں کوئی بھی ہو مامتا سے خالی نہیں ہوتی ۔اور بچے کے لئے کوئی جگہ ماں کی آغوش سے زیادہ محفوظ نہیں ہوتی ۔

انسان تمام زندگی تحفظ کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور کہاں کہاں نہیں ڈھونڈتا لیکن تحفظ ملتا ہے تو محبت کی چھاؤں میں کہیں اور نہیں ۔

تپتی ریت اور پاؤں کے چھالے

دوسرا واقعہ بھی اسی زمانے کا ہے گھر اور ...ل کے راستے میں ایک نہر پڑتی تھی۔ والدین نے نہر میں نہانے سے منع کر دیا تھا۔ اس لئے میں نے کبھی نہر میں نہانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک روز یونہی خیال آیا کہ نہانے پر پابندی ہے کنارے بیٹھنے پر تو نہیں چنانچہ میں نے بستہ ایک طرف رکھا اور نہر کے کنارے پانی میں پاؤں ڈال کے بیٹھ گیا۔ پانی ٹھنڈا تھا بڑا مزہ آیا۔ میں نے پاؤں ذرا اور آگے کر دیئے۔ یکایک ایک لہر آئی۔ اور ایک پاؤں کی چپل پاؤں سے نکل کے بہہ گئی۔ چپل لہروں پر بہتی چلی جا رہی تھی اور میں اسے حسرت اور بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ چپل کا یوں بہہ جانا میرے لئے ایک حادثے سے کم نہ تھا اس وقت تو مجھے والدین کی ناراضگی کا ڈر تھا لیکن جب گھر کی طرف چلا تو پتہ چلا کہ یہاں تو ایک اور مسئلہ بھی ہے تپتی ریت پر پاؤں رکھنا مشکل تھا۔ بہرحال جیسے تیسے گھر پہنچا تو پاؤں میں بڑے بڑے چھالے پڑ چکے تھے۔
اس واقعہ سے بعد کو میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ حکم خواہ والدین کا ہو یا خدا کا اس کی اسپرٹ کے مطابق اس پر عمل کرنا چاہیئے لفظی اس ... سے حکم عدولی کا کوئی جواز نکالنا صحیح رویہ نہیں۔ اس سے نقصان ہی ہوتا ہے۔

ملٹری کالج کے لیل و نہار

ملٹری کالج میں، میں نے پانچویں درجہ میں اپنی تعلیم شروع کی یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے میرا کالج نمبر ۲۲۹۰ تھا۔ میرا پہلا ہاؤس برڈ ووڈ ہاؤس تھا۔ دوسرا آکنلک ہاؤس اور تیسرا ٹیپو سلطان ہاؤس برڈ ووڈ ہاؤس میں میرے ہاؤس ماسٹر علوی صاحب تھے۔ آکنلک ہاؤس کا تھوڑا سا تعارف ضروری ہے۔ آکنلک ہاؤس ایک کچا ہاؤس تھا جو جنگ عظیم دوم کے زمانے میں طلبہ کی عارضی رہائش کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس لئے بہت خستہ ہو چکا تھا۔ کچی

چھتوں اور کھکل کی دیواروں کی بری حالت تھی۔ اب گرا کی صورت پیدا ہو چکی تھی۔ بہر حال جب دو نئے ہاؤس اورنگ زیب ہاؤس اور ٹیپو سلطان ہاؤس قریب تیار ہو چکے تو آکنلک ہاؤس کے جھکے ہوئے درو دیوار کو ابدی آرام دینے کا منصوبہ بنایا گیا اتفاق کی بات ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ کارروائی عمل میں لائی جائے فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک جن کے نام پر اس ہاؤس کا نام رکھا گیا تھا کالج میں تشریف لائے اور اپنی یادگار کے آخری دیدار کو آکنلک ہاؤس میں تشریف لائے۔ ابھی جی بھر کے دیکھا بھی نہ تھا کہ دوسری یا تیسری ڈارم میں انگیٹھی کے اوپر ٹیپو سلطان کی ایک بڑی تصویر آویزاں دیکھی کہاں ٹیپو اور کہاں آکنلک، شیر میسور کی پرشوکت تصویر کو دیکھتے ہی فیلڈ مارشل صاحب کچھ ایسے بدمزہ ہوئے کہ انہیں فوراً وقت کی تنگی کا احساس ہوا اور الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں، میں نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا لیکن فرسٹ ڈویژن کوئی خاص امتیاز کی بات نہیں تھی کیونکہ کالج میں اوسط درجے کے لڑکے بھی فرسٹ ڈویژن تو لے ہی لیتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں، میں نے ایف ایس سی کیا سیکنڈ ڈویژن میں۔ کھیلوں میں مجھے باسکٹ بال سے زیادہ دلچسپی تھی لیکن اتنی نہیں کہ کوئی کلر وغیرہ لے سکتا۔

شرارتیں

شرارتیں کرنا ہر طالب علم کا حق ہوتا ہے۔ اور ایک نفسیاتی ضرورت بھی میں نے اپنے اس حق کو کس طرح استعمال اور اس ضرورت کو کس اسلوب سے پورا کیا اس کی داستان سناتا ہوں۔

ایک بار ہم کینٹین پر چائے پی رہے تھے کہ یکایک ایک دوست نے کہا۔ میں کمانڈانٹ کے یہاں اپنی درخواست لے کر گیا تھا وہاں میں نے عجب نظارہ دیکھا۔ دوستوں نے حیرت سے پوچھا کیا۔ وہ ستم ظریف بولا کرنل صاحب کے باغیچے کے بڑے بڑے مالٹے مجھے آنکھ مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے ہم نے پوچھا۔ کیا کہہ رہے تھے؟ وہ بولا گدرائے ہوئے مالٹے کہہ رہے تھے تف ہے تم لڑکوں پر اتنے دن ہو گئے ہم پیلے پڑنے لگے اور تین سو لڑکوں میں سے کسی میں اتنا حوصلہ نہیں کہ ہمیں

ہاتھ لگائیے۔ پھر تم نے کیا جواب دیا۔ میں نے کہا میرے پیارے مالٹو میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ میں اپنی چنڈال چوکڑی سے مشورہ کر لوں۔ پھر اس نے اپنے زانو پر زور سے ہاتھ مارا جو اتفاق سے میرے زانو پر لگا اور بڑے زور سے لگا اور کہنے لگا پھر کیا خیال ہے دوستو ہماری عزت کو چیلنج کیا گیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے ہم غیرت مند دھرتی کے غیرت مند سپوت اس چیلنج کو قبول نہ کرتے تو کیا کرتے چنانچہ وہیں چار کی پیالی پر پلان بنا اور اسی شب کمانڈانٹ صاحب کے باغیچے پر ہلہ بول دیا گیا۔ پھر جو ہونا تھا ہوا۔ پکڑے گئے اور کرنل صاحب کے ہاتھوں ان کے دفتر میں خاصی خاطر تواضع ہوئی۔ لیکن

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں

اور جناب شہسوار کو ایک آدھ بار اور بھی گرنا پڑا۔ اور اس کی تفصیل بھی دلچسپ ہے۔ اس زمانے میں یو ایس آئی ایس کی معلوماتی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ بھلا ان سے جوان خون کا کیا بھلا ہوتا۔ چنانچہ صحیح اور اصلی مار دھاڑ اور ناچ گانے سے بھرپور فلمیں دیکھنے جیدار لڑکے شہر جایا کرتے تھے۔ ایک روز ہمیں بھی خیال آیا کہ اس ثمر ممنوعہ کو بھی چکھنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے بھی شہر کے سینما میں فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ بستر پر تکیہ اس طرح سیٹ کیا جیسے کوئی سو رہا ہے یعنی نقلی آدمی بستر پہ لٹا کر خود اصلی فلم دیکھنے چلے گئے۔ لیکن ادھر ہاؤس ماسٹر صاحب بھی چوکس تھے۔ انکی چھٹی حس نے انہیں بھی خطرے سے آگاہ کر دیا۔ کہ اس فلم پر لڑکے ضرور جائیں گے۔ چنانچہ وہ بھی ریجنٹ سینما آ گئے ہم میں سے کسی نے ان کی جھلک گیلری میں دیکھی تو ہم کھسک گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ شکار نکلا جا رہا ہے تو وہ بھی جھپٹے اب ہماری خوش قسمتی کہ جہلم ہی پرانے پل پر پہنچے تو ایک کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ ڈرائیور صاحب نے جو یقیناً ایک بھلے آدمی تھے ہم سے پوچھا کہ لڑکو کیا قصہ ہے۔ ہم نے کہا ایک حادثہ ہو گیا ہے جلد سے جلد ہسپتال پہنچنا ہے انہوں نے کار کا دروازہ کھولا اور کہا آؤ بیٹھ جاؤ۔ چند لمحوں میں ہم کالج پہنچ گئے۔ اور بستر پہ لیٹ کر فوراً خراٹے لینے لگے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہاؤس ماسٹر آن پہنچے۔ ان کی آہٹ پاتے ہی

ہم نے خراٹوں کی آواز اور تیز کر دی اور ایک آدھ زلزلہ انگیز کروٹ بھی لی۔ وہ ٹارچ سے ادھر ادھر دیکھ کر واپس چلے گئے۔

دوسرے روز کہنے لگے کل رات تمہاری شکل کا ایک لڑکا میں نے ریجنٹ سینما میں دوسرے شو میں دیکھا تھا۔ میں نے کہا سر، اکثر شکلوں کی مشابہت سے دھوکا ہو جاتا ہے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ہاؤس چھوڑتے وقت میں نے انہیں یہ ایڈونچر سٹوری سنائی تو بہت ہنسے۔ اور بولے۔ اگر پکڑے جاتے تو خیر نہیں تھی۔ کالج میں ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی نک نیم بھی ضرور ہوتا ہے۔ مجھے یاروں نے گلی ڈنڈا کے لقب سے نوازا تھا۔ کیوں؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔ بس یہ نام پڑ گیا تھا۔ دوستوں کی مہربانی سے، کالج میں گزرے بہت مفید، اور بہت دلچسپ شب و روز کا یہ تذکرہ نامکمل رہے گا اگر میں کالج کے "معماروں" کا تذکرہ نہ کروں، سب سے پہلا نام تو کمانڈانٹ کرنل رفیق کا ہے جو میرے ۱۹۵۵ء میں داخل ہونے کے چند ماہ بعد آئے تھے اور اپریل ۱۹۵۹ء تک چار سال میں نے ان کا دور دیکھا اس دور کے نقوش اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں، رفیق صاحب کا دور عبوری دور تھا۔ انہوں نے کالج کو پبلک اسکول کا آب و رنگ دیا۔ انگلستان کے پبلک اسکولوں کی ایک روایت قوم پرستی اور حب الوطنی ہے۔ رفیق صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کالج کو قومی شعور دیا اور اخلاقی قدروں کو برتنا سکھایا ان کی نظر ہر لڑکے کے کردار پر رہتی تھی۔ بہت سخت تھے لیکن خلوص سے سخت تھے۔ ان کی سختی با شعور سختی تھی۔ ان کا زور لڑکوں کی شخصیت کے ارتقاء پر تھا۔ جہاں ہر لڑکے کے لئے باکسنگ لازمی تھی۔ وہاں ہر لڑکے کے لئے اسٹیج پر جانا تقریر کرنا اور ڈرامے کرنا بھی لازمی تھا۔ سیر و تفریح بھی ان کے زمانے میں بہت تھی مجھے یاد ہے کہ ایک سال رسول ہیڈ ورکس پر سارا کالج دو تین دن خیمہ زن رہا دوسرے سال کھیوڑہ کی نمک کی کانیں اور آس پاس کے صنعتی یونٹ دیکھنے گئے غالباً ۱۹۵۸ء میں لاہور کا چکر لگا تھا۔ جہاں جاتا تھا سارا کالج جاتا تھا۔ سگریٹ فیکٹری فوجی ٹیکسٹائل مل اور پرائم گلاس فیکٹری تو جہلم ہی کی چیزیں تھیں۔ میں نے رفیق صاحب سے دور رس اثرات قبول کئے اب تک جس چیز کی میں سب سے

زیادہ قدر کرتا ہوں وہ ان کی کردار سازی کی بہت ہی مخلصانہ کوشش تھی - انہیں اس بات کا جنون سا تھا۔ کہنے کو کردار سازی کا دعویٰ تو سب ہی کرتے ہیں لیکن وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جن کو میں نے اس سلسلے میں اپنی تمام زندگی میں سب سے زیادہ مخلص پایا - کالج کے دوسرے اساتذہ میں سے مجھے محمد حسن صاحب حیدری صاحب، بلگرامی صاحب، علوی صاحب، مظہر صاحب، راشد صاحب، ایوب صاحب اور شفیق صاحب خاص طور پہ یاد ہیں - ان میں سے ہر ایک سے میں نے کوئی نہ کوئی نئی بات سیکھی۔ حیدری صاحب اور علوی صاحب کے ڈرامے یاد ہیں - حیدری صاحب انگریزی کے اور علوی صاحب اردو کے بے نظیر استاد تھے۔ بلگرامی صاحب کا شگفتہ اور مشفقانہ انداز اپنی مثال آپ تھا۔ راشد صاحب کی اپنی انفرادیت تھی۔ بہت رکھ رکھاؤ سے پڑھاتے تھے۔ طلبہ سے اس طرح پیش آتے تھے جیسے وہ وی، آئی، پی ہوں۔ بے انتہا تحمل سے کام لیتے تھے لب ولہجہ کی نرمی اور رویے کی شائستگی ان پر ختم تھی۔ وقت کی پابندی اور لباس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بلیک بورڈ کو خوب صاف رکھنے کی تاکید کرتے۔ کاپیوں اور کتابوں پر مدکور چڑھوانے کا انہیں جنون سا تھا۔ غرض ان کی توجہ نفسیاتی تربیت پر زیادہ تھی اس وقت بعض لڑکے ان کی ہر وقت کی روک ٹوک اور لیکچر بازی سے بہت تنگ رہتے تھے۔ آج وہی انہیں سب سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔ ایوب صاحب کی اپنی خوبیاں تھیں۔ شروع میں بہت سگریٹ پیتے تھے لیکن لڑکوں کی اصلاح کے لئے انہوں نے خود سگریٹ پینا چھوڑ دیا۔

پاکستان نیول اکیڈمی

اپریل ۱۹۶۴ء میں، ملٹری کالج جہلم کو خیرباد کہنے کے بعد میں ۱۵ نومبر ۱۹۶۴ء کو پاکستان نیول اکیڈمی میں داخل ہوا۔ پہلی ٹرم پی ایم اے کاکول میں ۳۵ لانگ کورس کے ساتھ مکمل کی۔ پھر مئی ۱۹۶۵ء میں نیول اکیڈمی میں واپس جاکر باقاعدہ نیول کورس شروع کیا۔ ستمبر ۶۵ء میں جب جنگ چھڑی تو کراچی کی نیول تنصیبات کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھالی۔ جنگ کے اختتام پہ دوبارہ نیول

کورس شروع کیا۔ یکم جون ۱۹۶۸ء کو مجھے پاکستان نیوی میں کمیشن ملا۔ پھر مشرقی پاکستان، سیلون مشرقی افریقہ میں نیرسگالی کے دورے کئے کئی جہازوں پر متعین رہا۔ جنوری ۱۹۷۱ء میں نیول لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی ملی۔ اسی سال حج اکبر کی سعادت سے بہرہ یاب ہوا۔ جون ۱۹۷۱ء میں مجھے مشرقی پاکستان بھیجا گیا۔ چٹاگانگ کی بندرگاہ میرا مستقر تھی یہ زمانہ مشرقی پاکستان میں سیاسی اور فوجی بحران کا بلکہ طوفان کا تھا۔ جو چند ماہ بعد پھٹ پڑا۔ جنگ دسمبر ۷۱ء میں مجھے چٹاگانگ کی بندرگاہ کو دشمن کی دست برد سے محفوظ کرنے کے لئے وہاں ضروری کارروائی کرنے کا حکم ملا۔ اسی خدمت کے سلسلے میں ستارۂ جرأت سے نوازا گیا۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

جنگ دسمبر ۷۱ء کے دوران ٗ پی این نمبر ۱۰۵ لیفٹیننٹ گل زمان ملک پی۔این کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی تھی کہ وہ چٹاگانگ کی بندرگاہ تک پہنچنے والے راستوں پر آبی سرنگیں بچھائیں۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لئے صرف ایک چھوٹا جہاز (کوسٹر) موجود تھا۔ اسی میں سرنگیں بھرنا تھیں اور رات کے وقت اس بندرگاہ کے راہوں پر بچھانا تھیں۔ چونکہ اس کام کے لئے اس جہاز پر ضروری سازوسامان موجود نہیں تھا اس لئے یہ کام خطرات سے پر تھا۔ چنانچہ پہلے ہی دن ایک بارودی سرنگ بچھائے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی یکایک پھٹ گئی۔ خوش قسمتی سے کوسٹر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بہرحال سرنگیں بچھانے کا کام مسلسل تین راتیں جاری رہا۔

اس افسر نے ایک پرخطر مہم کو بڑی جرأت، لیاقت لگن اور شوق و ولولے کے ساتھ نہایت کامیابی سے سرانجام دیا۔ اور اپنی ذاتی مثال سے اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھایا اس پرعزم اور جرأت مندانہ کارروائی کے لئے لیفٹیننٹ ملک کے لئے ستارۂ جرأت کی سفارش کی جاتی ہے پی این ایس بختیار چٹاگانگ کے کمانڈنگ آفیسر کمانڈر ایس ایم حامد صاحب نے یہ سفارش نامہ نیول ہیڈ کوارٹر کراچی کو بھیجا تھا۔ اسی کی بنیاد پر ۱۹۷۶ء میں مجھے ستارۂ جرأت عطا ہوا۔ یہاں

میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس انتہائی پر خطر کام کے لئے میں نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ اس مہم کو انجام دینے کے لئے میرے پاس نیوی کے کل آٹھ جوان تھے۔ اور میں تنہا ایک افسر، سرنگوں کے بارے میں میری معلومات بھی نامکمل تھیں۔ بہر حال اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے حوصلہ دیا اور توفیق دی کہ میں اس نازک موقعہ پر یہ اہم پُرخطر خدمات بجا لاؤں۔ جب وہ لمحہ آن پہنچا تو میرے دل نے مجھ سے کہا کہ گل! تیار ہو جاؤ وقت جہاد آن پہنچا اس وقت پاکستان کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہ جو تم نے پاکستان کی خاطر جینے اور مرنے کا عہد کیا تھا اس کو نبھانے کا لمحہ آن پہنچا۔ چنانچہ میں نے رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے پیش کر دیا۔ اور تین دن تین راتیں لگا کر اس مشن کو پورا کیا۔

اس مشن کی تکمیل کے پس منظر میں یقیناً میری تعلیم و تربیت تھی۔ میرے خاندانی روایتیں میرے گھر کا مذہبی ماحول تھا اور سب سے بڑھ کر توفیق خداوندی۔

دسمبر ۷۱ء بعد کی کہانی

جنگ دسمبر کا جو المناک انجام ہوا وہ دنیا کو معلوم ہی ہے۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

دسمبر ۷۱ء سے جنگی اسیری کا دور شروع ہوا۔ زیادہ وقت ہندوستان میں رانچی اور رام گڑھ کے کیمپوں میں گزارا۔ ۱۳ مارچ ۱۹۷۴ء کو دوبارہ وطن عزیز کی خاک پہ قدم رکھا۔ اور اللہ کا شکر بجا لایا اور دوبارہ اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ ۱۹۷۵ء میں انگلستان سے تارپیڈو اور آبدوز شکن کورس کیا۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۶ء تک نیول اکیڈمی میں انسٹرکٹر رہا۔ اور جنگی جہازوں پہ بھی آتا جاتا رہا۔ دسمبر ۷۱ء میں جنگی خدمات کے صلے میں ستارۂ جرأت کا اعلان ۱۹۷۶ء میں ہوا۔ ۱۹۷۷ء میں امریکہ میں سرفیس وارفیئر کا کورس کیا۔ ۱۹۷۶ء میں جنگی جہازوں تیمور میں سیکنڈ ان کمانڈ رہا۔ ۸۱-۱۹۸۰ء میں نیول اسٹاف کورس کیا۔ یکم جنوری ۱۹۸۲ء کو کمانڈر کے عہدے پہ ترقی ہوئی۔

میری ذاتی قدریں

وہی ہیں جو اچھے اور سچے پاکستانی مسلمان کی ہونی چاہئیں۔ میں سخت محنت دیانت اور لگن کو بہت اہمیت دیتا ہوں یہ چیزیں میری گھٹی میں پڑی ہیں، سماجی زندگی میں، میں احسان اور ایثار کو بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ میں قائداعظم کے کردار سے بہت متاثر ہوں۔ افسوس ہے کہ عام پاکستانیوں کو بھی اس عظیم انسان کے کردار کے بارے میں اتنا نہیں معلوم جتنا معلوم ہونا چاہیئے غالب و کارساز کی تعریف قائداعظم پر صادق آتی ہے۔

کمانڈر سکندر حیات خان ستارۂ جرأت

پی۔این

کمانڈر سکندر حیات خان ستارۂ جرأت

پی-این

دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں دشمن کے نرغے سے پاکستانی گن بوٹ راجشاہی کا فرار جرأت اور فراست کا ایک حیران کن واقعہ تھا۔ جس کی داد اپنوں ہی نے نہیں غیروں نے بھی دی۔ اس پر خطر مہم کے ہیرو پاکستان نیوی کے کمانڈر سکندر حیات خان تھے۔

سکندر حیات کی داستان حیات ان ہی کے الفاظ میں سنیئے۔

نسلی پس منظر

نسلاً تو ہم قطب شاہی اعوان ہیں، اٹک، تلہ گنگ کے علاقے میں قطب شاہی اعوان قبیلے کے جو لوگ صدیوں سے آباد ہیں، ہمارا سلسلہ نسب بھی انہی سے ملتا ہے۔ قطب شاہی اعوانوں کے خون میں جرأت بھی ہے اور دین کی حرارت بھی۔ ان دو روایتوں کو میرے باپ دادا نے بھی زندہ رکھا۔ میں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

آباؤاجداد

میرے دادا ملک محمد خان، بنیادی طور پر زراعت پیشہ تھے۔ تھوڑی بہت زمین تھی۔ اسی پر کاشتکاری کرتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں وہ رسالے میں سپاہی بھرتی ہو گئے تھے کئی محاذوں پر داد شجاعت دی۔ جب جنگ ختم ہو گئی تو یہ بھی گھر آ گئے۔ کہا کرتے تھے جب لڑنا نہیں تو بہتر ہے آدمی کھیتی باڑی کرے اور اپنے رب کو یاد کرے۔ بڑے اللہ لوگ تھے۔ انھوں نے اپنی باقی زندگی کاشتکاری کرتے اور اپنے رب کو یاد کرتے اور اس کے بندوں کی خدمت کرتے گزار دی۔ ہمارے گھر میں جو دینی ماحول تھا جو سیدھی سادی زندگی کا انداز تھا وہ ہمارے دادا ملک محمد خان کا دیا ہوا تھا۔

میرے والد ماجد، حاجی محمد طیب خان ۱۹۳۶ء میں پاکستان نیوی میں ملاح کی حیثیت سے بھرتی ہوئے اور ۱۹۶۴ء میں چیف پیٹی افسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ یہ عہدہ بری فوج کے صوبیدار میجر کے برابر ہوتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یعنی گھر آتے وقت تمغہ خدمت سیکنڈ کلاس ملا تھا۔

میرے والد کا نام طیب خان تھا اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے دادا نے جب ابا کا نام یہ رکھا تو انہیں تربیت کس انداز سے دی ہوگی۔ میرے والد کا مزاج طیب و طاہر ہے گو دین کے عالم نہیں لیکن دین کا شعور رکھتے ہیں۔ انہوں نے خاندان کی روایتی دین داری کو قائم رکھا اور اسے جلا دی۔ مجھے دین سے جو تھوڑا بہت تعلق ہے وہ ان ہی کی دین ہے۔

پیدائش

تحصیل تلہ گنگ ضلع اٹک میں ایک گاؤں ہے۔ ڈنڈہ شاہ بلاول یہی ہمارا آبائی گاؤں ہے میں اسی گاؤں میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو پیدا ہوا۔

ابتدائی زندگی

میرے والد چونکہ نیوی کی ملازمت کے سلسلے میں کراچی میں تھے۔ اس لئے میری ابتدائی پرورش کی تقریباً تمام تر ذمہ داری میں والدہ اور دادا کے اوپر تھی۔ اور چونکہ میری والدہ بھی تقریباً تمام دن دادا کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی رہتی تھیں اس لئے تمام دن میں بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلتا کودتا رہتا تھا۔ صرف شام کے بعد سے والدہ اور دادا سے بات چیت ہوتی تھی۔ لیکن دونوں نے میرا خیال بہت رکھا۔ چونکہ میں گھر میں پہلا بیٹا تھا۔ اس وجہ سے دادا خاص طور پر میرا لاڈ کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے میں نے اس کا نام سکندر رکھا ہے یہ ضرور اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا۔ گو وہ خود کوئی ایسے امیر نہیں تھے۔ بس گزارے کی صورت تھی۔ لیکن گاؤں کے معیار کے لحاظ سے وہ مجھے عیش کراتے تھے۔

مثلاً اگر گاؤں کے عام بچوں کے پاس صرف ایک جوڑی کپڑے ہوتے تھے تو انہوں نے مجھے تین جوڑی کپڑے بنوا کر دیئے۔ گاؤں میں، میں تنہا لڑکا تھا جس کے پاس رسی ٹاپنے کے لئے اپنی رنگدار رسی تھی۔ اور کھیلنے کے لئے سابر کی ایک پرانی ٹینس بال، آج ان معمولی چیزوں کا خیال کر کے ہنسی آتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں یہ چیزیں میری آن بان کا باعث تھیں۔ گاؤں کے لڑکے خاص طور پر میرے ساتھ دوستی کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ وہ میرے ساتھ رسی ٹاپ سکیں۔ یا گیند کھیل سکیں۔

بچپن کی یادیں

ان تکلیفوں اور بیماریوں سے جن سے دیہاتی بچے عام طور پر دوچار ہوتے ہیں۔ مجھے بھی واسطہ پڑا تھا۔ آنکھوں کا دکھنا، خسرہ، کان پڑے اور جلدی سوزش ان سب نے مجھے خوب جی بھر کر ستایا ہسپتال نام کی کوئی چیز تو گاؤں میں تھی ہی نہیں۔ جو روایتی دیسی علاج سینہ بہ سینہ چلا آتا تھا۔ وہ

کارگر ہوا۔ جڑی بوٹی کے علاج سے صحت یاب ہوا۔ مجھے جلد کی سوزش کی تکلیف کبھی کبھی ہو جاتی تھی جسے آج اسکن الرجی کہتے ہیں۔ اس کا علاج ضرور گاؤں کے ایک بزرگ نے جدید طریقے سے کیا۔ میرے دادا کے ایک جہاں دیدہ دوست تھے۔ لڑائی کے زمانے میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ ایک روز گھر آئے جاڑے کا زمانہ تھا۔ میں دھوپ میں ایک مرہم لگائے بیٹھا تھا۔ دادا سے پوچھا بچے کو کیا تکلیف ہے؟ انہوں نے بتایا کہ جلد کی کوئی بیماری ہے۔ انہوں نے کہا کل میں ایک دوا لاؤں گا۔ آپ مکھن میں لپیٹ کر دے دیجئے انشا اللہ اس کو پھر یہ تکلیف نہیں ہوگی۔ چنانچہ دوسرے روز میں نے اس طریقے سے ان کی دوائی لی اور واقعی مجھے آج تک جلد کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ ایک عرصے کے بعد جب میں ان بزرگ سے ملا تو میں نے کہا دادا جی کچھ بتائیں وہ کیا دوا تھی یہ سن کر ہنس پڑے میں نے اصرار کیا تو بولے پتر تو نہیں مانتا تو سن وہ دوا کوئی اور چیز نہیں تیلے تھوتھے کا ایک ننھا سا ٹکڑا تھا۔ بچپن کی عادتوں کے بارے میں یہ کہ ایک تو ضدی تھا کہ جس بات پر اڑ جاتا تھا وہ کر کے چھوڑتا تھا دوسرے اپنے پلنگ پر علیحدہ سونے کی عادت تھی۔ اس عادت نے ایک بار مجھے اور میری دادی کو بہت پریشان کیا

وہ واقعہ یوں ہے۔ ہمارے گاؤں سے پانچ چھ میل دور ایک گاؤں میں ایک شادی تھی۔ دادی نے پوچھا سکندر تو چلے گا میں نے کہا ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے خوشی خوشی یہ فاصلہ طے کیا دن تو مزے سے گزر گیا۔ جب رات ہوئی تو بہت سے باراتیوں کو ایک کوٹھا دے دیا گیا۔ کہ یہاں سو رہو میں نے دادی سے کہا میں تو چارپائی پر سوؤں گا۔ شادی کے گھر میں نالتو چارپائی کہاں دادی نے لاکھ سمجھایا کہ بیٹے ضد نہ کرو یہاں چارپائی نہیں مل سکتی۔ سب اسی طرح زمین پر پیال ڈال کر سو رہے ہیں۔ لیکن میں نے نہ مانا آخر انہیں مجھے لے کر رات کے وقت چھ میل چل کر گھر واپس آنا پڑا۔

قرآن شریف تو میں نے گاؤں کی مسجد میں پڑھنا شروع کیا تھا۔ پانچ برس کی عمر میں گاؤں کے مڈل سکول میں جانے لگا تھا۔ چوتھا درجہ میں نے یہیں سے پاس کیا۔ ابھی چوتھے درجے ہی میں تھا کہ میرے دادا نے کہنا شروع کیا کہ میرا سکندر ملٹری کالج میں پڑھے گا۔ میرے دادا خود تو پڑھے

سکھے نہ تھے۔ لیکن فوج میں رہنے کی وجہ سے علم کی قدروقیمت سے خوب واقف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ میرے والد کم ازکم میٹرک تو کریں لیکن انہوں نے مڈل کرنے ہی نیوی میں بھرتی ہونا پسند کیا۔ تو میرے ڈاڈا نے اپنے چھوٹے بیٹے (یعنی میرے چچا) نواب خان کو بڑے شوق سے ملٹری کالج میں داخل کرایا۔ ان کا کالج نمبر ۷۹۸ تھا۔ چنانچہ دادا کی ترغیب پر میرے والد نے مجھے اپنے پاس کراچی بلوالیا۔ تاکہ میں وہاں رہ کر ملٹری کالج کے داخلے کے امتحان کی ضروری تیاری کر سکوں۔

اس سے پہلے کہ میں ملٹری کالج کے زمانہ تعلیم کے بارے میں گفتگو کروں میں اپنی زندگی کے ان تین عظیم محسنوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے میری راہوں کے کانٹے چن کر اور پتھر ہٹا کر بلندیوں کی طرف دیکھنا سکھایا سمت کا احساس اور منزل کا شعور دیا۔ محسنوں کی اس فہرست میں سب سے پہلا نام میری والدہ مکرمہ کا ہے وہ گھر کا کام بھی کرتی تھیں کھیتوں میں دادا کا ہاتھ بھی بٹاتی تھیں اور بچوں کی دیکھ بھال میں کمی نہیں آنے دیتی تھیں۔ وہ روزے نماز کی پابندی سے بھی غافل نہیں تھیں حد درجہ کریم النفس تھیں۔ بہت کھلا ہاتھ تھا۔ گھر میں طمانیت وسکون کی فضا ان ہی کے دم قدم سے تھی۔ محنت میں عظمت کا بنیادی سبق میں نے انہی سے سیکھا۔ یہ ان ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ کام کتنا ہی زیادہ ہو یا مشکل ہو میں اس سے نہیں گھبراتا بلکہ بڑے ذوق شوق سے کرتا ہوں بلکہ

جی خوش ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

والی صورت ہوتی ہے۔

میرے دوسرے ہیرو میرے دادا تھے۔ وہ خود ان پڑھ تھے۔ لیکن علم دوستی کا عالم یہ تھا کہ کہا کرتے تھے کہ اگر زمین پر کاغذ کا ٹکڑا پڑا مل جائے تو اسے بھی اٹھا کر پڑھ لیا کرو شاید کوئی نئی بات معلوم ہو جائے وہ دنیا کے دوسرے معاملات میں بھی بڑی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ اس عمر کو پہنچ کر میں کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں کہ کس قسم کی تعلیم عام ہوئی ہے کہ پڑھے لکھے اور اچھے بھلے اونچے عہدے کے آدمیوں میں بھی نہ صرف زندگی کی قدروں کا احساس کم ہے بلکہ معاملات کی سوجھ بوجھ بھی کم ہے۔ وہ تیسری شخصیت جس سے میں بچپن میں متاثر ہوا وہ میرے گاؤں شاہ بلاول کے ہیڈ ماسٹر صاحب

احمد یار خان تھے۔ بھاری بھر کم ڈیل ڈول بارعب چہرہ مہرہ اور کڑک دار آواز یہ تھے ماسٹر احمد یار خان۔ سب ان سے ڈرتے تھے۔ وقت کے بہت پابند تھے۔ گاؤں کے سکولوں میں وقت کو اور کام کو کون دیکھتا ہے یا پوچھتا ہے۔ لیکن وہ اس معاملے میں بڑے سخت تھے۔ کیونکہ بات کے کھرے اور معاملات کے بھی کھرے تھے۔ اس لئے کسی کو ان سے سرتابی کی مجال نہیں تھی۔ شہر سے دور ایک معمولی سے گاؤں میں سخت نامساعد حالات کی آندھی میں انہوں نے علم کا اور کردار کا چراغ روشن کیا ہوا تھا

شاہ بلاول سے ملٹری کالج تک پہنچنے کی داستان

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ملٹری کالج میں میرے داخلے کا خیال میرے دادا ملک محمد خان صاحب کا تھا۔ انہی نے مجھے میرے والد کے پاس کراچی بھیجا تاکہ میں ملٹری کالج میں داخل ہو سکوں۔ چنانچہ چند مہینے کراچی میں تیاری کرنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں ملٹری کالج میں پانچویں جماعت میں داخل ہوا۔ غالباً میری جماعت آخری جماعت تھی۔ جسے پانچویں درجے میں داخلہ ملا۔ اس کے بعد سے پانچویں درجے میں داخلہ بند کر دیا گیا۔ مجھے ۲۳۱۵ کالج نمبر ملا تھا اور میرا پہلا ہاؤس جس میں دو سال رہا۔ اسکین ہاؤس تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اسکین ہاؤس کی نمبر دو ڈارمیٹری میں میرا تیسرا الاکر تھا۔ مسٹر مظہر علی خان اور مسٹر سعید راشد ہاؤس کے دو ونگوں کے ہاؤس ماسٹر اور میاں خان ملک (کیپٹن پاکستان نیوی) ہاؤس پریفیکٹ تھے۔

کالج کے ماہ وسال

اسکین ہاؤس میں دو سال رہنے کے بعد میں دسمبر ۱۹۵۸ء میں ٹیپو سلطان ہاؤس میں منتقل ہو گیا۔ جوان دنوں نیا بنا تھا۔ اپنی کالج کی زندگی کے باقی چار سال میں نے ٹیپو سلطان ہاؤس ہی میں گزارے۔ وہاں میں نے دو ہاؤس ماسٹر دیکھے پہلے مسٹر ایلن مور ان کے بعد کیپٹن (اب بریگیڈیئر) اعجاز اکبر۔ کالج میں اپنی کارکردگی کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شروع میں کمزور تھا۔ لیکن ۱۹۶۲ء

میں جب میں نے کالج میٹرک کے بعد چھوڑا تو کالج میں میٹرک کے امتحان میں میری دوسری پوزیشن تھی۔ وظیفہ بھی لیا تھا۔

ہم نصابی سرگرمیاں

شروع کے تین سال تو کرنل رفیق کی کمانڈانٹی کے تھے۔ اس زمانے میں ہر لڑکے کے لئے ایکسٹرا کریکیولر سرگرمیوں میں سرگرمی سے حصّہ لینا لازمی تھا۔ اس لئے میں نے بھی اسٹیج کی سرگرمیوں میں حصّہ لیا۔ ویسے میرا اصل میدان کھیل کا میدان تھا میں نے تمام بڑے کھیلوں، ہاکی، فٹ بال، باکسنگ وغیرہ میں امتیاز حاصل کیا۔ جہاں تک قیادت کا تعلق ہے اس ضمن میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس میدان میں بھی میں بُرا نہیں رہا اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ میں ٹیپو سلطان ہاؤس کا پہلے ہاؤس سیکرٹری پھر ہاؤس پریفیکٹ رہا۔

شرارتیں

اگر کالج میں شرارتیں نہ ہوں تو یہاں کی زندگی ناقابل برداشت ہو جاتے۔ اس لئے میں بھی اپنے حصّے کی شرارتیں کیا کرتا تھا۔ ایک دوسرے کو چھیڑنے اور تنگ کرنے کے لئے چھٹی پر جانے اور واپس آنے کی رات خاص طور پر مخصوص تھی۔ چھٹی جانے کی رات سونے لڑکوں کے چہروں پر سیاہ اور سفید پالش ملنا بھی یاد ہے ایک دوسرے کو بیوقوف بنانے کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے رہتے تھے۔ کسی کے گھر سے کوئی چیز آئے اور یاروں کے ہاتھ نہ آئے ناممکن بات تھی۔ کینٹین کی ریوڑیاں بہت یاد آتی ہیں۔ جب جاڑے کی راتوں ہاؤس سے کمبل لے کر پریپ کرنے نکلتے تھے تو کینٹین پر پڑاؤ لازمی تھا۔ ریوڑیوں کا لفافہ لے کر کلاس میں جا بیٹھتے تھے۔ جاڑوں کے طویل پریپ ان ریوڑیوں کی رفاقت کے بغیر کاٹنا مشکل ہوتے۔ کالج کے سالانہ ڈرامے بھی یاد آتے ہیں حیدری صاحب اور علوی صاحب کے انگریزی اردو ڈرامے لاجواب ہوتے تھے۔ بلکہ ہر ہاؤس

کا الگ، ڈرامہ بھی ہوتا تھا۔ کالج کے میوزک کلب کی اپنی دھوم تھی کالج کی یادوں کا یہ تذکرہ ادھورا رہ جائے گا کہ اگر میں جمعے اور مغرب کی نماز کا ذکر نہ کروں جو لازمی پڑھنی پڑتی تھی۔ جس نے مجھ جیسے بہت سے طلبہ کو کم از کم ان دونوں نمازوں کا عادی بنا دیا۔ لیکن بعض ستم ظریف اپنے ہاتھ یا پیر کی صفائی دکھانے سے اللہ کے گھر میں بھی باز نہیں آتے تھے۔ مسجد سے باہر رکھی ہوئی چپلیں اکثر بدلتی رہتی تھیں۔ نئی چپلوں کا بدل جانا تو یقینی تھا خود میرے ساتھ دو بار یہی حادثہ پیش آیا بڑے شوق سے پالش کر کے نئی چپل پہن کر مسجد گیا۔ اور واپسی ننگے پاؤں ہوئی چونکہ جو صاحب میری نئی چپل کی جگہ اپنی چپل چھوڑ کر گئے تھے وہ اس حالت میں نہ تھی کہ اس کو پہن کر ٹیپو سلطان ہاؤس تک چلا جا سکے اللہ بھلا کرے اس شریف آدمی کا جو خاص طور پر نئی چپلوں پہ نظر رکھتا تھا۔ اب یہ باتیں خواب خیال ہوئیں۔

مختصر یہ کہ ملٹری کالج میں میرے چھ برس میری تعلیمی و تربیتی زندگی کے سب سے قیمتی سال ہیں آج میں جو کچھ ہوں وہ بڑی حد تک ملٹری کالج کی تربیت کا پھل ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی ادارہ در و دیوار کا نام نہیں ہوتا بلکہ روایتوں اور افراد کا نام ہوتا ہے۔ جو ان روایتوں کے امین ہوتے ہیں۔ اور اپنی شخصیّتوں کی تب و تاب سے طلبہ کے لئے جذب و کشش کا سبب بن جاتے ہیں۔

چند ناقابل فراموش شخصیّتیں

اساتذہ میں سے جنہوں نے مجھے کالج میں متاثر کیا بلکہ میری تمام زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے ان میں سرفہرست نام تو کالج کے کمانڈنٹ لیفٹیننٹ کرنل (بعد کو بریگیڈیئر) محمد رفیق کا ہے۔ ان کے بعد جو استاد خاص طور پر مجھے یاد آتے ہیں وہ مسٹر مظہر علی خان اور مسٹر سعید راشد فیضی ہیں۔ لوگ مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں کہ رفیق صاحب نے مجھے اتنا کیوں متاثر کیا؟ اپنے گذشتہ تاثّرات کا تجزیہ کرنے کے بعد میں مختصراً یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا قومی مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ بھلے ہیں یعنی جن کی قدریں صحیح ہیں وہ کمزور ہیں۔ اور جو لوگ تیز، مضبوط اور فعال ہیں

ان کا قلب سلیم نہیں ہے۔ رفیق صاحب کا قلب بھی قلبِ سلیم تھا۔ اور وہ بہت تنومند و توانا اور فعال بھی تھے۔ ان سے زیادہ کھرا، بے باک صحیح معنوں میں بے غرض مخلص اور قوم کا سچا وفادار انسان کم از کم میں نے نہیں دیکھا گرم دمِ جستجو نرم دمِ جستجو جلال و جمال قہاری و غفّاری کا ایک عجیب امتزاج۔

رفیق صاحب نے کالج کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ صبح کی پی ٹی سے لے کر رات لائٹس آوٹ تک کالج کے کسی نہ کسی گوشے میں لڑکوں کے مطالعے اور مشاہدے میں مصروف رہتے تھے۔ پھر رات کو بھی ڈارم چیک کیا کرتے تھے۔ میرا پہلا تعارف ان کے ساتھ بڑے عجب طریقے سے ہوا۔ میں ۱۹۵۶ء میں جب داخل ہوا تو دوسرے دن اسکین ہاؤس میں صبح سویرے پی ٹی کے لئے فال ان ہو کر پی ٹی گراؤنڈ کی طرف ہاؤس مارچ کرنے لگا تو میں نے دیکھا کہ کوئی افسر سائیکل پر ہاؤس کے سامنے سے گزرا اس نے ذرا سا سائیکل روکی تو ایک لڑکا اچک کر کیریر پر بیٹھ گیا۔ اور ان کے ساتھ پی ٹی گراؤنڈ تک گیا۔ کسی نے کہا یہ کرنل رفیق ہیں کمانڈانٹ۔ میں تو حیران رہ گیا اسی دن شام کو ہاؤس میں آتے تو چھوٹے لڑکوں نے انہیں گھیر لیا۔ انہوں نے ہمیں انگلش میوزک سنایا کسی پرانے لڑکے نے کہا سر مسلز دکھائیں چنانچہ انہوں نے بازو کے مسل کا مظاہرہ بھی کیا۔ اس پر بچوں نے تالیاں بجائیں۔ یہ رخ ان کی محبّت و شفقت کا تھا۔ چند دن بعد میں نے انہیں جلال میں دیکھا سارے کالج کے سامنے انہوں نے دو لڑکوں کی ایجوٹینٹ سے جو سخت کیننگ کرائی۔ وہ بھی کبھی نہیں بھول سکتا۔ بار بار ان کی گونج دار آواز گونجتی۔ کیری آن کیری آن، ڈسپلن کو توڑنے خصوصًا جھوٹ بولنے اور دھوکے بد اخلاقی کے کسی مظاہرے کی سزا ان کے یہاں بہت سخت تھی۔ بزدلی ایک اور ایسا قصور تھا جس کی سزا بہت سخت تھی۔ ایک بار ایک لڑکے نے (جس کا نام غالبًا غلام احمد تھا) لاہور میں باکسنگ کے ایک مقابلے میں اپنے مدِمقابل سے لڑنے سے انکار کر دیا۔ تو انہوں نے اسے فورًا کالج سے نکال دیا۔ کسی نے کہا سر! لڑکے کے کیریئر کا سوال ہے تو ان کا جواب تھا۔ قوم کے مستقبل کا سوال بھی ہے وہ قوم کے مفادات کے بہت بڑے محافظ تھے۔ وہ کسی غلط یا نالائق لڑکے کی قطعًا رعایت

نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف یہ عالم تھا جنرل حق نواز کا لڑکا سعید ہو یا کسی سپاہی کا کسی کو کسی پر برتری نہیں تھی۔ ہر ایک کو پوری توجہ اور اس کا حق ملتا تھا یہاں میں ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کروں گا عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ تعلیم و تربیت کے ہر میدان میں کچھ ہوشیار اور باصلاحیت تیز لڑکے منتخب کر لئے جاتے ہیں اور ان کو شو پیس بنا کر دنیا کو تماشا دکھایا جاتا ہے کہ دیکھو ہم کتنے باکمال ہیں لیکن یہ کرنل رفیق ہی تھے جنہوں نے ہر لڑکے کو ہر میدان میں آگے بڑھنے کا موقعہ دیا۔ نہ صرف موقعہ دیا بلکہ اس کو زبردستی آگے بڑھایا۔ یہ غالباً صرف ان کے دور میں ہوا کہ ہر کلاس کا ڈرامہ ہوتا تھا۔ ہر ہاؤس کا ڈرامہ ہوتا تھا۔ پھر پورے کالج کا ڈرامہ ہوتا تھا۔ اس طرح سارا کالج سال میں کم از کم ایک بار سٹیج پر آجاتا۔ یہی حال تقریروں کا تھا۔ وہ بھی ہر ایک کیلئے لازمی تھیں۔ جسمانی تربیت پر بھی اسی طرح زور تھا۔ باکسنگ ہر ایک کے لئے لازمی تھی۔ سال میں دو بار کراس کنٹری، دو بار اتھلیٹکس ہر مہینے آؤٹنگ سال میں دو بار اہم مقامات کی سیر، ڈنر نائٹس کا اہتمام ادب و آداب شائستگی سکھانے کا اہتمام مہینے میں دو بار ہاؤس ماسٹر کا انٹرویو، سال میں کمانڈنٹ کا انٹرویو غرض کیا بتاؤں ہمارا کردار، شخصیت ذہن کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کی نشوونما پر ان کی نظر نہ ہو۔ اور ہر معاملے میں ان کی مثال سب سے پہلے سب کے سامنے۔ ان کا سا ماہر تعلیم جو لیڈرشپ کی اتنی اعلیٰ صلاحیت بھی رکھتا ہو روز روز پیدا نہیں ہوتا۔

سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اتنے سچے اتنے کھرے اتنے ڈیبوؤنڈ تھے۔ کہ لڑکوں بلکہ سارے کالج کے قلب کو انہوں نے گرما کے رکھ دیا تھا کہ کالج کے ہر لڑکے کو انہوں نے متاثر کیا۔ بلکہ وہ ہر ان کے زیر عتاب رہے ان کو زیادہ چاہتے ہیں۔ میں شخصیت پرستی کا قائل نہیں ہوں۔ اب جب کہ میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہوں اور زندگی کا تھوڑا بہت تجربہ رکھتا ہوں ان کی کمزوریوں سے بھی بے خبر نہیں ہوں۔ لیکن کہنا یہ ہے کہ استاد ہو یا کسی میدان کا لیڈر جب تک وہ اندر باہر سے بالکل کھرا نہیں ہوگا۔ بات نہیں بنے گی۔ رفیق صاحب کو میں ایک علامت سمجھتا ہوں مجھے امید ہے کہ ہر دور میں اور ہر سطح پر کالج میں کرنل رفیق موجود رہیں گے۔ کالج کے اساتذہ میں سے

میرے پہلے ہاؤس ماسٹر مسٹر مظہر علی خان کی تصویر میرے ذہن میں بالکل تازہ ہے۔ اسکین ہاؤس کے دائیں طرف کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ بہت آہستہ بولتے تھے۔ اس سے بھی آہستہ قدم اٹھاتے تھے لیکن محبت و شفقت بلکہ ممتا کی تصویر تھے۔ ہر بچے کا لاکر جاکر دیکھنا اس کے بستر کی چادر کی سلوٹوں کو نکالنا ہاؤس انسپکشن پر جزئیات میں جانا ان کا وطیرہ تھا۔ سب بچوں کو ماؤں کی طرح پیار کرتے تھے۔ بڑے پیار سے نصیحتیں کرتے تھے۔ ان کے لمبے اخلاقی لیکچروں سے ہمیں الجھن ہوتی تھی۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ شاید ہماری اولاد کو ایسے استاد بھی نہ ملیں جو بجائے ٹی وی دیکھنے کے آدھ آدھ گھنٹہ کھڑے کھڑے نصیحتیں کرنا پسند کریں۔ اور اپنے فارغ اوقات کا بڑا حصہ بچوں کی ذرا ذرا سی خوشیوں میں شریک ہوتے اور ذرا ذرا سی تکلیفوں کو دور کرتے گزار دیں۔

مظہر صاحب کے حکم سے ہر روز سونے سے پہلے ہاؤس میں قومی ترانہ گایا جاتا تھا۔ موڈ ہو یا نہ ہو پورے اہتمام سے ترانہ پریڈ لازمی ہوتی تھی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ قومی ترانہ میرے تحت الشعور میں جاگزیں ہو گیا ہے۔ آج بھی قومی ترانے کا پہلا بول سنتے ہی میں از خود ساکت کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اور ساز و آواز کے ساتھ ہونٹ ہلنے لگتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر سوتے میں بھی کوئی مجھے قومی ترانہ سنائے تو میں اٹھ کھڑا ہو جاؤں گا۔ قومی ترانے سے اس تعلق کے لئے میں ملٹری کالج اور خاص طور پر مسٹر مظہر علی خان کا ممنون ہوں۔

مظہر صاحب کالج میں لاسٹ اینڈ فاونڈ چیزوں کے انچارج بھی تھے۔ اسکین ہاؤس میں ایک الماری رکھی ہوئی تھی اس میں کھوئی ہوئی اور بازیافتہ چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں ہم شرارت بھی کرتے تھے۔ لیکن مظہر صاحب کی سنجیدگی میں فرق نہیں آتا تھا۔ مظہر صاحب فزیالوجی اور ہائجین پڑھاتے تھے۔ اس میں بھی ان کا خاص انداز تھا۔ غالباً ساری ٹیکسٹ بک ان کو زبانی یاد تھی بہت نرم مزاج تھے۔ خود تو وہ کسی کو کیا سزا دیتے لیکن کلاس میں اگر کوئی لڑکا شرارت کرتا یا توجہ نہ کرتا تو اس کی ہپیٹ پریڈ ہوتی تھی۔ یعنی جوں ہی مظہر صاحب کی انگلی اٹھتی کلاس کے سارے لڑکے، اس نالائق شکار کے سر پہ ایک ایک چپت رسید کرتے۔ اگر دو چار روز میں ایک بار بھی

چیپٹ پریڈ نہ ہوتی تو مزہ نہ آتا۔ چنانچہ ہم میں سے کوئی نہ کوئی جان بوجھ کر کوئی شرارت کرتا اور چیپٹ پریڈ کے ہنگامے سے لطف اندوز ہوتا۔ منظر صاحب نے جو کچھ پڑھایا وہ مدتیں ہو گئیں ذہن سے محو ہو گیا۔ لیکن ان کی تربیت کے نقوش ابھی تک زندہ و تابندہ ہیں۔

مسٹر سعید راشد بھی اسی اسکین ہاؤس کے اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر تھے۔ ان سے میرا پہلا اور اصلی تعارف کلاس میں ہوا جب کلاس میں اردو پڑھانے آئے۔ لڑکے تعظیماً کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا۔ تشریف رکھیئے اور ساتھ ہی ہاتھ کا اشارہ بیٹھنے کے لئے کیا۔ میں اس جملے سے مانوس نہ تھا۔ میری طرح اور بہت سے نئے لڑکوں کو حیرانی ہوئی ہوگی۔ بعد کو پتہ چلا کہ یہ ان کی عادت ہے اسی طرح کلاس میں آتے ہی ہاتھ اٹھا کر سلام کرنا اور جاتے ہوئے تھینک یو جنٹلمین کہنا بھی ان کی عادت تھی۔ وقت کی پابندی میں ان کی مثال دی جاتی تھی جس طرح گھنٹی بجتے ہی کلاس میں داخل ہوتے تھے اسی طرح گھنٹی بج جانے پر جملے کو پورا کئے بغیر تھینک یو جنٹلمین کہہ کر ان کا رخصت ہو جانا ہمیں بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ (اس وقت غالباً اس لئے کہ ایک لمحہ بھی زائد پڑھنا نہ پڑے) راشد صاحب کا لباس و نفاست بھی ہم لڑکوں میں موضوع گفتگو بنتے تھے۔ وہ کلاس میں داخل ہونے سے پہلے اپنے جوتے کی گرد کو صاف کرنے کے لئے بھی کپڑے کا ایک ٹکڑا اپنی جیب میں رکھتے تھے۔ ان کا بے داغ لباس اور بے حد شائستہ لب و لہجہ اور ڈوب کر پڑھانے کا انداز ہمیں بے حد پسند تھا ان کی کلاس میں ہم بے حد سکون اور ذہنی چین سے بیٹھتے تھے۔ چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ جس سوال کا جواب ہمیں نہ معلوم ہو وہ ہم سے پوچھ کر ہمیں کبھی شرمندہ نہیں کریں گے۔ شاگردوں سے محبت کرنے والے استاد تو دو چار میں نے دیکھے ہیں لیکن چھوٹوں اور شاگردوں کی عزت کرتے میں نے انہیں کو دیکھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بڑے بڑے شورہ پشت لڑکے ان کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے تھے۔ اور ان کو آتے جاتے سلام کرنے میں فخر و خوشی محسوس کرتے تھے کلاس میں آ کر پہلی نظر بورڈ پر ڈالتے تھے۔ پھر ڈیسک کرسیاں ٹھیک قطاریں کرواتے کرسی میں صحیح زاویئے سے بیٹھنے کو کہتے مجھے اب بھی یاد ہے کہ بلیک بورڈ پر لکھنے کے لئے وہ چاک کا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا استعمال کرتے تھے۔ ہاؤس میں راشد صاحب تقریروں ڈراموں وغیرہ

کے انچارج تھے۔ اور بڑے ذوق وشوق سے لڑکوں کو ان کاموں کے لئے تیار کراتے تھے اس طرح کے مشغلے عام طور پر چند باصلاحیت افراد تک محدود رہتے ہیں لیکن راشد صاحب کی خوبی یہ تھی کہ وہ کم روشن میلے اور کم صلاحیت والے لڑکوں کو بھی اہمیت دیتے تھے اور ان کو بھی موقعہ دیتے تھے اس زمانے میں اسکین ہاؤس تقریروں اور ڈراموں میں بہت ممتاز تھا۔ ممتاز اختر اور سلیم اختر کیانی تو مانے ہوئے اسپیکر تھے۔

ایک مقولہ کبھی میں نے سنا تھا کہ واٹرلو کی جنگ ایٹن (پبلک سکول) کے کھیل کے میدانوں میں جیتی گئی تھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قومیں گھروں اور سکولوں میں بنتی اور بگڑتی ہیں اور قوم کے سب سے بڑے محسن اور سب سے بڑے دشمن اس کے اساتذہ ہوتے ہیں۔

جون ۱۹۶۲ء میں کالج چھوڑنے کے بعد کی منزلیں

اگست ۱۹۶۲ء میں میں نے ڈی جے کالج کراچی میں فسٹ ایئر پری انجینئرنگ گروپ میں داخلہ لیا۔ ملٹری کالج میں میرا شمار تعلیم کے اعتبار سے بہت اچھے لڑکوں میں ہوتا تھا۔ جب کہ ڈی جے کالج میں مجھے بڑی دشواری پیش آئی۔

ملٹری کالج میں تدریس کا نظام بہت مضبوط اور منظّم تھا۔ کورس وقت پر ختم کرائے جاتے تھے اور نظرثانی کا وقت بھی دیا جاتا تھا۔ ڈی جے کالج کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہاں تو دو سال گزرنے کے بعد اساتذہ کی کمی اور دوسرے امور کے باعث آدھا نصاب بھی ختم نہ ہوا تھا اس وقت مجھے ملٹری کالج بہت یاد آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف ڈسپلن بلکہ زندگی کے ہر مسئلے کی طرف منظّم رویّہ میں نے ملٹری کالج ہی میں سیکھا۔

۱۹۶۴ء میں، میں نے جیسے تیسے ڈی جے کالج سے ایف ایس سی کیا اور اسی سال میں پاکستان نیوی میں کمیشن کے لئے منتخب ہو گیا۔

نیوی میں جانے کی وجہ

ڈی جے کالج میں تعلیم کے دوران میں والد کے نیوی میں ہونے کی وجہ سے اکثر بحریہ کے جہازوں اور اداروں میں جاتا رہتا تھا۔ اس طرح میں نیوی سے مانوس ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ والد نے تو نیوی میں جانے پر زور نہیں دیا تھا۔ بلکہ انہوں نے فیصلہ میرے اوپر چھوڑ دیا تھا۔ ویسے اب میرا خیال ہے کہ شاید وہ میرے فوج میں کمیشن لینے کو زیادہ پسند کرتے۔

بحریہ میں کمیشن لینے کی روداد

نیوی میں میرے کورس کا نمبر پی ۴۲ تھا۔ نیول کیڈٹ کی حیثیت سے شروع کے چھ مہینے میں نے ۳۵ لانگ کورس کے ساتھ پی ایم اے کاکول میں گزارے۔ پی۔ایم۔اے میں چھ ماہ گزارنے سے ایک بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ آرمی کے طریقِ تربیت کا ذاتی تجربہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ وہاں بہت سے اچھے دوست بنائے۔ پی۔ایم۔اے کے تجربے کی وجہ سے مجھے آئندہ آرمی کے افسروں کے ساتھ کام کرنے میں بہت آسانی ہوئی۔ آرمی کو اور اس کے طریقہ کار کو سمجھنا اس کے بغیر ممکن ہی نہ تھا۔

پی۔ایم۔اے اور پاکستان بحریہ کے مختلف اداروں میں زیرِ تربیت رہنے کے بعد جون ۱۹۶۸ء میں مجھے پاکستان نیوی میں کمیشن ملا۔ جب میں سب لیفٹیننٹ تھا۔ تو پی۔این۔ایس بدر پر مجھے سرٹیفکیٹ ملا۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء تک میں پی۔این۔ایس مددگار سے متعلق رہا۔ اس عرصے میں مجھے لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی ملی۔ پی۔این۔ایس مددگار کی تعیناتی کے دوران میں نے دو بار افریقہ کا چکر بھی لگایا اور افریقی ساحل کے بیشتر شہر اور بندرگاہیں دیکھیں۔ افریقہ کو اپنے دوسرے سفر کے دوران میں نے جہاز کی رہنمائی بھی کی۔ یہ ایک انوکھا لیکن بہت مفید تجربہ تھا۔ جو آگے چل کر دسمبر ۱۹۷۱ء میں مجھے گن بوٹ راجشاہی کے تاریخی اور ڈرامائی فرار میں میرے کام آیا تھا۔

راجشاہی گن بوٹ کا فرار

افریقہ کے دوسرے سفر کے بعد جولائی ۷۱ء میں میرا تبادلہ پی۔ این۔ ایس بختیار پر کر دیا گیا۔ جو چٹاگانگ میں واقع تھا۔ پی۔این۔ایس بختیار میں آئے ہوئے مجھے چند ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھے پی۔ این۔ ایس راجشاہی میں ایگزیکٹو آفیسر کی حیثیت سے بھیج دیا گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا۔ جب مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کی باغیانہ سرگرمیاں ہندوستان کی امداد سے خطرناک صورت اختیار کرتی جارہی تھیں۔ اس لئے مشرقی پاکستان کی دریائی گزرگاہوں کی پٹرولنگ کی ذمہ داری پی۔ این ایس راجشاہی کے سپرد ہوئی۔ اس سلسلے میں جہاں بھی ضرورت ہوئی ہم نے فوج کو ضروری فائر سپورٹ دی۔ چار دسمبر کو جب راجشاہی کے کمانڈر لیفٹیننٹ محمد احمد ہندوستانی بمبار ہوائی جہازوں کے حملے سے زخمی ہو گئے تو میں نے راجشاہی کی کمان سنبھالی ہندوستانی حملے سے خود جہاز کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ اس کے ہل میں گولیوں سے کچھ نہیں تو ستر سوراخ ہو گئے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ جہاز کا انجن محفوظ تھا۔ جس کی وجہ سے چٹاگانگ کی بندرگاہ سے (جس کا محاصرہ ہندوستانی بحریہ کئے ہوئے تھی) ۱۶ اور ۱۷ دسمبر ۷۱ء کی درمیانی شب کو راجشاہی گن بوٹ کا فرار ممکن ہوا۔ لوگ اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ ۱۶ دسمبر کو سقوط مشرقی پاکستان کے چند گھنٹوں کے بعد مجھے راجشاہی کو آزاد پانیوں میں پہنچانے کی مہم کا آغاز کرنے کا خیال کیسے آیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوپہر تک ہمیں سقوط کی اطلاع مل چکی تھی۔ قانونی طور پر ہم جنگی اسیر ہو چکے تھے۔ لیکن ہر جنگی قیدی کا یہ حق بھی ہوتا ہے کہ وہ قید سے فرار کی کوشش کرے۔ چنانچہ میں نے یہ حق استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سوچا کہ اگر قیدی ہو گئے تو نہ جانے کب رہائی ہو کتنا عرصہ لگ جائے۔ کیا ہندوستانی خاردار تاروں کے اندر سڑتے کے بجائے یہ بہتر نہیں کہ مردانہ وار مرا جائے یا کامیاب ہوا جائے۔ مہم شروع کرنے سے پہلے کامیابی کے امکانات بظاہر تو بہت کم تھے۔ ہندوستانی بحریہ نے بندرگاہ میں بارودی سرنگیں بھی بچھائی ہوئی تھیں۔ لیکن میری چھٹی حس کہتی تھی کہ دشمن فتح کے نشہ میں چور ہوگا اگر ہمت و ہوشیاری

سے کام لیا جائے تو کامیابی کی خاصی امید ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بہت جلدی میں فرار کا منصوبہ بنایا گیا اور طے یہ پایا کہ ملیشیا کی بندرگاہ پینانگ کو منزل بنانا مفید رہے گا۔ یہاں اس امر کا اعتراف اور اظہار ضروری ہے کہ اس منصوبے اور فرار میں کالج ہی کے ایک قابل فخر سابق طالب علم لیفٹیننٹ کمانڈر تفسیر حسین شاہ کی کاوشیں بھی شامل حال رہیں۔ ملیشیا کی بندرگاہ کو منتخب کرنے کی ایک خاص وجہ تو یہ تھی کہ یہ قریب ترین مسلم ملک تھا جو ہمیں پناہ دے سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ساتھ دو ایک ایسے افسر تھے جو پہلے پینانگ جا چکے تھے اس لئے وہ اس کی طرف کچھ راہنمائی کر سکتے تھے ہم ۱۲ اور ۱۷ دسمبر کی درمیانی رات کو تقریباً ۳ بجے راشن اور ایندھن کا بندوبست کر کے چٹاگانگ کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے۔ اور احتیاطاً ساحل کے قریب کا راستہ اختیار کیا۔ تاکہ گن بوٹ کی آواز ساحل کے شور میں مدغم ہو جائے اور دشمن کے جہازوں کو ہمارے فرار کا پتہ نہ چلے۔ ہم نے ریڈیو اور ریڈار کی خاموشی برقرار رکھی تاکہ دشمن چوکنا نہ ہو جائے۔ جب تک ہم دشمن کے جہازوں کی زد میں رہے ہم نے اپنی طیارہ شکن توپیں بھی تیار رکھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ جرأت مندانہ اقدام جس کے لئے ہم نے بہت سوچ سمجھ کے منصوبہ تیار کیا تھا بالآخر کامیاب ہوا۔ اور ہم ہندوستانی بحریہ کا محاصرہ توڑ کر نکل جانے میں کامیاب ہوئے۔ گن بوٹ راجشاہی یا اس کے کریو کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ ۵ روز کی سخت تگ و دو کے بعد جب پینانگ کا بندرگاہ نظر آیا تو ہم سجدۂ شکر بجا لائے ۲۱ دسمبر ۷۱ء کو سہ پہر کے وقت ہم بندرگاہ میں داخل ہوئے۔ ملیشیا کی بحریہ نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اور ہمیں ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ پینانگ میں جو پاکستانی آباد ہیں انہوں نے ہماری بہت مدد کی۔ مالی بھی اور اخلاقی بھی۔ انہی کی مالی امداد سے ۲۴ افراد تیسرے دن پی آئی اے کی پرواز سے کراچی روانہ ہو گئے۔ ۲۰ دن کے بعد مزید ۲۰ پرواز کر گئے۔ مجھ سمیت پی۔ این۔ ایس راجشاہی کے عملے کے صرف ۷ افراد پیچھے رہ گئے۔ تاکہ ہم اس گن بوٹ کو اپنی سرکردگی میں کراچی لے جائیں۔ ۱۰ فروری ۱۹۷۲ء کو ہم راجشاہی گن بوٹ لے کر کراچی کی محبوب بندرگاہ میں داخل ہوئے۔ اور جس شان سے ہمارا استقبال ہوا اس منظر کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ لمحہ سارے عملے کے لئے زندگی کا تاریخی لمحہ تھا۔ اس کامیاب مہم کے لئے

مجھے ستارۂ جرأت عطا کیا گیا۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

اگرچہ دشمن کے متواتر ہوائی حملوں سے پاکستان نیوی کے جہاز پی-این-ایس راجشاہی کو ناصا نقصان پہنچ چکا تھا اور دشمن نے چٹاگانگ کی بندرگاہ کا بحری محاصرہ کر رکھا تھا ان حوصلہ فرسا حالات کے باوجود راجشاہی کے کمانڈر پی-این نمبر ۱۰۶۱ لیفٹیننٹ سکندر حیات خان نے غیر معمولی جرأت اور فراست کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے جہاز کو دشمن کے حوالے کرنے کے بجائے دشمن کا محاصرہ توڑ کر جہاز کو بچا لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۶؍دسمبر کی رات کو تیسرے پہر ۱۷؍دسمبر کی صبح طلوع ہونے سے بہت پہلے لیفٹیننٹ سکندر حیات خان نے اپنے جرأت مندانہ اقدام کا آغاز کیا۔ بارودی سرنگوں اور دشمن کے ہوائی اور بحری جہازوں سے بچتے بچاتے لیفٹیننٹ سکندر جہاز راجشاہی کو دشمن کے نرغے سے نکال لائے اور نہ صرف نکال لائے بلکہ بغیر کسی رہنما چارٹ کے ایک ہزار میل کا سفر طے کر کے پینانگ کی بندرگاہ تک باحفاظت پہنچایا۔ جہاز میں جہاز کی مقررہ تعداد سے دگنے افراد تھے۔ جن میں ۴۳ بحری فوج کے جوانوں کے علاوہ ۲ افسر پی اے ایف کے ایک افسر پی-آئی-اے کے شامل تھے۔

اس جرأت مندانہ اور مثالی اقدام سے لیفٹیننٹ سکندر حیات نے پاکستان بحریہ کی تاریخ پر ایک بے مثال باب کا اضافہ کیا:

اپنی قدروں کے بارے میں کمانڈر سکندر حیات ستارۂ جرأت لکھتے ہیں۔

میں اندر سے سیدھا سادا مسلمان ہوں۔ میرا خمیر ایک گاؤں کی مٹی سے اٹھا ہے۔ بچپن سے میں نے اپنی ماں اور دادا کو انتھک محنت کرتے دیکھا ہے۔ اس لئے محنت اور شکر میری زندگی کی بنیادی قدر ہے۔ مجھے ایک ستارہ جرأت ضرور ملا ہے لیکن زندگی ایک ستارے پر ختم نہیں ہو جاتی زندگی کا ہر لمحہ ایک نیا چیلنج بن کر آتا ہے۔ اس چیلنج کو قبول کرنا اور اس سے عہدہ برآ ہونا اصل

چیز ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے تو میں یہ کہوں گا کہ اس وقت جب جان کو سخت خطرہ ہو جان پر کھیل کر ستارۂ جرأت حاصل کر لینا آسان ہے۔ لیکن روزانہ کی زندگی میں نفس اور معاشرہ کے ناروا مطالبات کو رد کر دینا اور پھر حوصلے سے سر اٹھا کر چلنا سب سہاروں کو چھوڑ کر صرف خدا کے سہارے کو پکڑے رکھنا دیانت و ایثار کے رویّے کو اپنائے رکھنا مشکل تر اور عظیم تر کارنامہ ہے۔

غواصِ محبّت کا اللہ نگہبان ہو　　　ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

میجر سعید اللہ جنگ ستارۂ جرأت

بلوچ رجمنٹ

میجر سعید اللہ جنگ ستارۂ جرأت

بلوچ رجمنٹ

جنگ کے لاحقہ کی توجیہہ

میرے نام میں یہ جنگ کا لاحقہ ہی میرے خاندانی اور نسلی پس منظر کا غماز ہے۔ وضاحت اس امر کی یہ ہے کہ ہم اصلاً مدنی سید ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد میں سے وہ پہلے بزرگ جو مدینہ سے مغلوں کے دور میں برصغیر میں آئے اور دہلی میں آباد ہوئے ان کا نام سیّد غازی تھا۔ سید غازی اور ان کی اولاد مغلوں کے دور حکومت میں اعلیٰ عہدوں پہ فائز رہے ان کے خاندانی رشتے بھی مغل امراء میں ہوئے تھے۔ پھر یہ لوگ حیدرآباد دکن منتقل ہو گئے۔ حیدرآباد دکن جا کر انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں جن کے صلے میں جاگیروں کے علاوہ نواب اور جنگ کے خطابات عطا ہوئے۔ اس وقت سے ہم لوگ اپنے خاندانی امتیاز کے طور پر جنگ کا لاحقہ استعمال کرتے ہیں۔ کچھ نسبت سرسید احمد خان سے بھی ہے۔ سرسید احمد خان میرے پڑدادا نواب سمیع اللہ جنگ کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے۔ بعد کے زمانے میں ہمارے خاندان کے نواب سربلند جنگ اور حمید اللہ جنگ حیدرآباد کے چیف جسٹس ہوئے اور نواب محمد جنگ دہلی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر فائز

رہے تھے۔ انہوں نے قانون کی کئی کتابیں بھی لکھیں۔ پدرم سلطان بود کی بات تو غلط میں یہ مانتا ہوں کہ بڑائی خون میں نہیں ہوتی۔ کارنامے میں ہوتی ہے۔ حسب نسب اعلیٰ ہونے کا ایک نقصان بھی ہوتا ہے۔ کہ آدمی اپنی نسل اور خاندان پر فخر کرتا رہے۔ اور خود کو کوئی برتر چیز سمجھ کے خود برتر ہونے کی کوشش نہ کرے۔ اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ کیا خاندان سے کچھ فرق نہیں پڑتا؟ تو میں اس کا جواب یہ دوں گا۔ کہ خاندان سے فرق پڑتا ہے۔ لیکن خون کے ذرّوں کے وسیلے سے نہیں پڑتا۔ خاندانی ماحول، تربیت روایات سے پڑتا ہے۔ جب مجھے پہلی بار یہ بتایا گیا سر سیّد احمد خان میرے دادا تھے تو میں بہت چھوٹا تھا۔ سات آٹھ برس کا یا اس سے کم بھی مجھے ایک مبہم سا احساس ہوا تھا کہ وہ کوئی بڑے آدمی تھے۔ اس لحاظ سے ہم بھی بڑے ہو گئے۔ بعد کو جب میں نے سر سید احمد خان کے بارے میں پڑھا تو مجھے کچھ اندازہ ہوا وہ کس مرتبے کے آدمی تھے۔ مجھ پر بلکہ ہم سب بہن بھائیوں پر اپنے نام کے ساتھ جنگ لکھنے کا بڑا گہرا اثر ہے۔ اس نسبت نے ہمارے لئے ایک معیار مقرر کر دیا ہے۔ کہ ہماری نظر ان بلندیوں پر رہتی ہے جہاں تک ہمارے آباؤ اجداد پہنچے تھے۔ ہم ان کے برابر پہنچیں یا نہ پہنچیں (غالباً پہنچنا بہت مشکل ہے) لیکن اتنا ضرور ہے کہ ایک سطح سے نیچے نہیں آ سکتے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جب قدم غلط اٹھنے لگے تو ضمیر کہتا ہے ذرا سوچو، اپنے آپ کو سیّد زادہ کہتے ہو اور جنگ بھی لکھتے ہو۔ اور قدم کا رخ کدھر ہے۔ اس وقت میں ضمیر کی آواز سنتا ہوں۔ یا سننے کی کوشش کرتا ہوں۔ ۱۹۷۱ء میں جب مجھے ستارۂ جرأت ملا تو میرے تحت الشعور سے بار بار یہ آواز آتی تھی۔ جب اپنے کو سعید اللہ جنگ لکھتے ہو، تو "جنگ" کا حق بھی ادا کرو۔"

ابتدائی زندگی

قیام پاکستان کے وقت ہمارے خاندان کے بیشتر لوگ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ کچھ تو لاہور میں مستقل طور پر آباد ہو گئے اور کچھ بعد کو کراچی منتقل ہو گئے۔ میرے والد میجر سمیع اللہ جنگ

ان دنوں لاہور ہی میں تعینات تھے۔ میں لاہور ہی میں ۲۸ ستمبر ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوا۔ بچپن کی کوئی خاص بات یاد نہیں سوائے اس کے کہ مجھے عام بچوں کی طرح پڑھنے لکھنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی کھیل کود اور شرارتوں میں لگا رہتا تھا۔ چونکہ گھر کے ماحول میں تعلیم رچی بسی تھی اس لئے میرے والدین میری اس روش پر تنبیہہ کرتے تھے۔ میرا طریقہ یہ تھا کہ جب امتحان قریب آتا تو دو چار روز زور لگا کے پاس ہو جاتا اور پھر شرارتیں لیکن ہمارے گھر میں بچوں کو مارنے پیٹنے یا کوئی سخت سزا دینے کا رواج نہیں تھا۔ اس لئے والدین کی شفقت کی چھاؤں میں میرا بچپن ہنسی خوشی گزرا۔

ابتدائی تعلیم

میں نے اپنی رسمی تعلیم اسکول کوئٹہ سے شروع کی ۱۹۵۴ء میں والد مرحوم کا تبادلہ آرڈیننس ڈپو کالا جہلم ہوا تو میں پریزینٹیشن کانونٹ جہلم میں پڑھنے لگا۔ ۱۹۵۷ء میں ملٹری کالج جہلم میں داخل ہوا۔ ۲۳۱۸ کالج نمبر ملا۔ کالج میں داخل ہونے سے پہلے مجھے صرف ایک شخص نے اس طرح متاثر کیا کہ دل نے کہا "میں بھی ایسا ہی بنوں گا"، لیکن یہ کوئی اور نہیں میرے ابو میجر سعید اللہ جنگ تھے۔ میں نے بچپن میں ان سے جو تاثر لیا تھا وہ اب بھی قائم ہے۔ اپنی زندگی میں میں خاصے آدمیوں سے ملا ہوں لیکن والد مرحوم کو اب بھی میں کم از کم اپنے لئے آئیڈیل انسان سمجھتا ہوں، کالج میں، میں صرف چند سال رہا۔ اور یہ عرصہ میں نے اسکین ہاؤس میں گزارا۔ کمانڈانٹ کرنل رفیق تھے۔ کالج میں میرا نک نیم جنگو تھا۔

ایک ناقابل فراموش حادثہ

کالج میں ایک بار ایک حادثہ کا شکار ہوا تھا۔ اللہ کو زندگی منظور تھی کہ بچ گیا وہ واقعہ یوں ہے کہ سارا کالج دینہ میں پکنک کے لئے گیا ہوا تھا۔ سینئر لڑکے شاٹ پٹ لے جانا بھول گئے تھے اور ایک پتھر سے یہ کام لے رہے تھے۔ باری باری وہ پتھر پھینکتے اب ایک نشان کی ضرورت

تھی کہ کس کا پتھر زیادہ دور گرا۔ یہ میں تماشا دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ میں خود ہی نشانچی بن گیا۔ کہ یہ بتاؤں کس کا پتھر یا شاٹ پٹ پیچھے گرایا آ گے۔ میں اس کھیل میں مگن تھا کہ یکایک ایک پتھر مجھے آلگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر مجھے کچھ خبر نہیں رہی کہ کیا ہوا۔ کیسے ہوا۔ جب ہوش آیا تو میں سی ایم ایچ جہلم میں تھا۔ ابّا سامنے کھڑے تھے۔ اور امّی کا ہاتھ میرے شانے پر تھا۔ ہوش آنے پر ان دونوں کو سامنے دیکھ کر مجھے کچھ حیرت اور خوشی ہوئی۔ مجھے اس طرح ہوش میں آنے گویا دوبارہ زندگی پاتے دیکھ کر جو خوشی کی چمک میں نے ابّا امّی کے چہرے پر دیکھی وہ آج بھی میری یادوں کے آئینے میں محفوظ ہے۔ اور زخم کا نشان سر میں۔

چند خوشگوار یادیں

کالج میں مجھے انگریزی ڈراموں سے دلچسپی تھی۔ حیدری صاحب انگریزی کے بہترین استاد تھے۔ اور بہت ہی اعلیٰ درجہ کے ڈائریکٹر ان کی نگرانی میں، میں نے کئی انگلش ڈراموں میں حصہ لیا۔ اور دنیا کے سامنے کوئی کام کامیابی سے کرنے سے جو ہیجان انگیز خوشی ہوتی ہے اس کا احساس سب سے پہلے مجھے کالج اسٹیج پر ہوا۔ اس زمانے میں کالج میں حیدری صاحب، بلگرامی صاحب، مظہر صاحب بہت اچھے استاد تھے۔ ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔

کالج نے مجھے کیا دیا؟

کالج نے مجھے اپنی آپ کو دریافت کرنے میں کئی مواقع مہیا کئے، میرے شعور کے افق کو وسیع کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں جو تندرے آسائش کی زندگی کا خوگر تھا اور زندگی کے کام اپنے وقت پر اور اپنے طریقے سے کرنے کا عادی تھا۔ کالج نے مجھے سخت کوشی اور منضبط زندگی سے روشناس کرایا۔ کالج میں میں نے زیادہ عرصہ نہیں گزارا لیکن اس مختصر عرصے میں بھی مجھے زندگی کی چند اہم حقیقتوں کا تجربہ ہو گیا۔ اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنی فوجی زندگی میں کالج کا تجربہ میرے

بہت کام آیا۔

کالج سے بعد کی زندگی کی اہم منزلیں

اٹھارویں شارٹ سروس کورس میں، میں اگست ۱۹۶۸ء میں پی ایم اے میں داخل ہوا اور ۱۸ مئی ۱۹۶۹ء کو مجھے کمیشن ملا۔ کمیشن کے بعد میں ۱۷ بلوچ سے منسلک ہوا۔ ۱۷ بلوچ رجمنٹ کی وہ بٹالین ہے جس میں میرے والد اور تایا کو بھی کمیشن ملا تھا اس لئے ۱۷ بلوچ سے وابستہ ہونا گویا اپنی خاندانی بٹالین سے وابستہ ہونا تھا۔ اسی یونٹ میں میرے چھوٹے بھائی کیپٹن محمد حنیف اللہ جنگ نے ۱۹۷۶ء میں کمیشن لیا۔ ۱۹۶۹ء میں ۱۷ بلوچ لاہور میں متعین تھی۔ ۱۹۷۱ء کے اوائل میں یہ یونٹ ۶ اے۔کے بریگیڈ کے تحت آزاد کشمیر چلی گئی۔ ۱۷ بلوچ کے ساتھ مجھے سال ڈیڑھ سال ہی گزرا تھا کہ مجھے بلوچ سنٹر پوسٹ کر دیا گیا۔ اور خدمت یہ سپرد ہوئی کہ ایک نئی یونٹ ۳۹ بلوچ کھڑی کرنے میں مدد دوں۔ یہ کام میرے لئے نیا تھا لیکن دلچسپ تھا۔ ۱۹۷۱ء میں نوزائیدہ ۳۹ بلوچ نو ڈویژن کے ساتھ وابستہ کی گئی۔ یہ ڈویژن ان دنوں کھاریاں میں تھا مارچ ۱۹۷۱ء میں جب یہ پورا ڈویژن مشرقی پاکستان بھیجا گیا تو ۳۹ بلوچ کو دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقعہ ملا۔ مشرقی پاکستان کے میدان کارزار میں ناپختہ ۳۹ بلوچ نے چار ستارۂ جرأت اور ۴ تمغۂ جرأت حاصل کئے اس قابل فخر کارنامہ کے لئے میں اپنی بٹالین پر فخر کرتا ہوں۔

مشرقی پاکستان میں تگ و تاز کی داستان

مارچ ۱۹۷۱ء میں ایک اتوار کی چمکیلی دوپہر کو جب ہمارا ہوائی جہاز ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اترنے کی تیاری کر رہا تھا تو میں نے جہاز کی کھڑکیوں سے بہت شوق سے زمین کی طرف نگاہ دوڑائی دل نے کہا اچھا تو یہ ہے سنار دیس، سبزہ زاروں اور دریاؤں اور سنہرے ریشے کی سرزمین، حیرت انگیز طور پر پورا علاقہ خاموشی میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ لیکن خاموشی اور سکون کا یہ تاثر محض

سراب نظر تھا۔ جونہی جہاز نیچے اترا اور جہاز کا دروازہ کھلا تو پہلی آواز جو ہمارے کانوں سے ٹکرائی تو وہ مشین گن فائر کی آواز تھی۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اصل صورت حال کیا ہے۔ اور ہمیں کن مرحلوں سے گزرنا ہے۔ اسی شام سی ۱۳۰ طیاروں کے ذریعہ ہماری بٹالین کو کومیلا پہنچا دیا گیا۔ کومیلا میں ہمارے کرنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ جہازوں سے اترتے ہی ہم باغیوں کی سرکوبی میں مصروف ہوگئے۔ امن وامان کی بحالی کے آپریشن کے ابتدائی دنوں میں ہمارے ذمے یہ کام تھا کہ کومیلا اور سلہٹ کے اضلاع کے سرحدی شہروں میں امن وامان بحال کریں اور باغیوں کی تخریبی سرگرمیوں کا سدِباب کریں اللہ کا شکر ہے ہماری یونٹ نے اس فرض کو انتہائی کامیابی سے پورا کیا اور دو ماہ سے بھی کم عرصے میں کومیلا اور نواکھالی کے اضلاع نہ صرف تخریب کاروں سے پاک ہوگئے بلکہ سارے علاقہ میں نظم وضبط پورے طور پر بحال ہوگیا۔ اس کا تمام کریڈٹ میں اپنی یونٹ ۳۹ بلوچ کو دیتا ہوں۔ کچھ دنوں کے بعد جب حالات نے پلٹا کھایا اور جنگ کی سی صورتحال پیدا ہوگئی تو وہ معرکہ ہوا جس میں مجھے ستارہ جرأت کے اعزاز کا مستحق سمجھا گیا۔

معرکے کی تفصیلات

معرکے کا کوئی فوٹو بھی لیا گیا ہوتا تو بھی اس صورت حال کا صحیح تاثر پیدا نہیں کیا جا سکتا تھا اب میں لفظوں میں کیا بتاؤں۔ لڑائی کا مادی پس منظر کہاں سے آئے گا۔ میدان جنگ میں جہاں موت کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ بہت قریب سے سنی جا سکتی ہو۔ وہاں اپنے ہوش وحواس بجا رکھ کر دلیرانہ ضروری اور صحیح قدم اٹھانا ہی تربیت کا اور کردار کا صحیح امتحان ہوتا ہے۔

میں ۳۹ بلوچ کی اے کمپنی کا کمپنی آفیسر تھا۔ ہمیں حکم ملا کہ کومیلا کے قریب لکشم ریلوے اسٹیشن کو دشمن کے قبضے سے چھڑایا جائے ہم نے حملہ کیا گھمسان کا رن پڑا۔ اس وقت لیفٹیننٹ تھا میرا میدان کارزار کا تجربہ صرف چند مہینے کا تھا لیکن اللہ کی نصرت ہمارے آڑے آئی اور ہم سرخ ہوئے۔ دشمن بہت زیادہ جانی اور سامانی نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس معرکے میں خود

ہمارا نقصان بہت ہی کم ہوا تھا۔ اس کامیابی سے سارے علاقے میں دھوم مچ گئی میرے کمپنی کمانڈر میجر تیمور نے مجھے سب سے پہلے مبارکباد دی۔ اس تجربے نے میرے عزم و حوصلہ کو بھی دو چند کر دیا۔ اب میں بڑے سے بڑے پہاڑ سے ٹکر لینے کو تیار تھا۔

۳۹ بلوچ کی اے کمپنی غالباً تمام آرمی میں وہ واحد کمپنی ہے جس کے پاس سب سے زیادہ جنگی اعزازات ہیں۔ مثلاً چار ستارۂ جرأت، اور دو تمغۂ جرأت پوری یونٹوں کے پاس تو بہت کچھ ہے لیکن کسی یونٹ کی کوئی ایک کمپنی ایسی نہ ہوگی جس کا جنگی ریکارڈ اتنا شاندار ہو اس کا کریڈٹ کمپنی کمانڈر میجر تیمور شہید کو جاتا ہے وہ غیر معمولی قیادتی صلاحیتوں کے مالک تھے ان ایسے ذہین دلیر اور فراخ دل کمانڈر کم ہوتے ہیں۔ میجر تیمور شہید میں تین بہت اہم خوبیاں یکجا ہوگئی تھیں اپنے پروفیشن میں طاق تھے۔ دلیر تھے۔ ذہین تھے اور شریف النفس بھی تھے۔ یہ خوبیاں علیحدہ علیحدہ یا دو دو تو بہت لوگوں میں مل جاتی ہیں لیکن یکجا مشکل سے ملتی ہیں۔ تیمور آج بظاہر اس دنیا میں نہیں لیکن وہ میرے ہی نہیں بہت سے دلوں میں زندہ ہیں۔ اور اصل زندگی یہی ہے۔ ورنہ انسان کا مادی وجود تو دیر سویر ختم ہو ہی جاتا ہے۔

میجر تیمور ۱۰ دسمبر کو مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہوئے ان کی شہادت کے بعد اے کمپنی کی کمان میں نے سنبھالی۔

مصنّف کا تبصرہ

سعید اللہ جنگ کے ستارۂ جرأت کے سلسلے میں ہماری ان سے جو زبانی گفتگو ہوئی۔ یہ ہے۔

آپ کے ستارۂ جرأت کے پیچھے کیا قوت تھی؟ وہ کون سا جذبہ تھا جس نے وہ کام کرایا جس کے لئے آپ کو ستارۂ جرأت، ایسے اعزاز کا مستحق سمجھا گیا؟

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ والد مرحوم میجر سمیع اللہ جنگ میرے آئیڈیل تھے اور اب بھی ہیں۔ انہوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان کی دی ہوئی روشنی ہر قدم پر اور ہر مرحلہ پر

میری رہنما رہی ہے۔ والد کہا کرتے تھے۔

بیٹے۔ تمہاری موت کا طریقہ، وقت اور جگہ مقرر ہے اس میں کمی و بیشی نہیں ہو سکتی۔ موت کو اپنے وقت پر آنا ہے۔ اس سے تم نہیں بچ سکتے۔ تو پھر ڈرنا کیا۔ میرے بچے خوف کو اپنے دل سے نکال دو، موت کے خوف کو بھی اور ہر چیز کے خوف کو، خوف انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔" والد کے یہ الفاظ میرے لاشعور تک میں جذب ہو گئے ہیں میرا جو ایکشن تھا۔ جس کے لئے مجھے ستارۂ جرأت دیا گیا اسی ہوشیار بے خوفی کا نتیجہ تھا اور اللہ کی نصرت شامل حال تھی۔

بریگیڈیئر محمد نعیم اکبر خان امتیازی سند

پنجاب رجمنٹ

بریگیڈیئر محمد نعیم اکبر خان امتیازی سند پنجاب رجمنٹ

آبائی پس منظر

ضلع اٹک کی تحصیل پنڈی گھیب میں ایک گاؤں ہے ٹھبیہ بنڈ سلطانی سے چند میل کے فاصلے پر جسے جانبازوں اور دلیروں کی کچھار کہنا چاہیئے۔ یہی بریگیڈیئر محمد نعیم اکبر خان کا آبائی گاؤں ہے۔ ان کے والد صوبیدار میجر محمد اکبر خان کا شماران خوش نصیب والدین میں ہے جن کی تمام اولاد ہمہ خانہ آفتاب کے مصداق ایک سے ایک بڑھ کر ہوتی ہے ان کے بڑے بیٹے نسیم اکبر لیفٹیننٹ کرنل تھے جو ۱۹۰۳ء میں کوئٹہ میں ایک حادثے کا شکار ہوئے۔ نعیم ان سے چھوٹے ہیں۔ ان سے چھوٹے سلیم اکبر بھی اس وقت لیفٹیننٹ کرنل ہیں۔ اکبر خان صاحب کے پانچویں بیٹے کا نام میجر منیر اکبر خان ستارۂ جرأت ہے۔ منیر سے بڑے نذیر محمد نکریزی کے پروفیسر ہیں۔ اور ان سے چھوٹے منیر اکبر ڈاکٹر ہیں۔ نسیم اکبر کے سوا باقی بھائیوں نے گارڈن کالج میں پڑھا ہے اور نسیم کے بیٹے زاہد غالمگیرین ہیں۔ ماشاء اللہ اولاد تو اللہ کی دین ہے لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے کہ کسی کے چھ بیٹے ہوں اور سب بنے بیٹے

دائرے میں امتیازی شان رکھتے ہوں۔ اکبر خان صاحب کو یہ فخر اور شرف حاصل ہے۔ اس سلسلے میں جب ہم نے ان سے بات کی تو انہوں نے کہا۔

میں کس منہ سے اپنے مولا کا شکر ادا کروں۔ یہ سب اس کا کرم ہے میرا کچھ کمال نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے اپنے بچوں کی تربیت فرض سمجھ کے نہیں عبادت سمجھ کے کی۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے نہ صرف ان کو اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا بلکہ سعادت مند بھی بنایا اور محنت کرنے کی توفیق بھی دی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اولاد کے معاملے میں اپنی خوش نصیبی کو خود اپنے والدین کی دعاؤں کا حاصل سمجھتا ہوں جس نے اپنے والدین کی خدمت کی اور ان کو سکھ پہنچایا اللہ تعالیٰ اس کو اس کی اولاد سے سکھ پہنچاتا ہے۔ مجھ سے جو بن پڑا تھا میں نے اپنے والدین کے لئے کیا تھا۔ اللہ کے کرم وفضل سے آج میرے بچے میرے لئے بہت کچھ کر رہے ہیں میں صرف ان کے افسر ہونے کی بات نہیں کر رہا ہوں

افسر بننا اتنا مشکل نہیں جتنا مشکل انسان بننا ہوتا ہے اور آخر کار اچھا افسر بھی وہی ثابت ہوتا ہے جو اچھا اور کھرا انسان ہو۔ اللہ کا شکر ہے۔ میرے بچوں کو برے بھلے کی پہچان ہے حلال حرام کی تمیز ہے اپنی انسانی اور قومی ذمہ داریوں کا تھوڑا بہت احساس ہے۔ میں اپنے افسر بیٹوں سے ہمیشہ یہی کہا کرتا ہوں۔ بیٹا۔ کمال یہ ہے کہ تم اپنے رینک کے حوالے سے نہیں۔ اپنی شخصیت وکردار کے حوالے سے پہچانے جاؤ۔"

کاروانِ زندگی کی ابتدائی منزلیں

نعیم اکبر ایسے بلند نظر اور سلیم القلب باپ کے ہاں موضع ٹھیہ میں ۱۰ مارچ ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ نعیم کو بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ پہلی دو جماعتیں اپنے گاؤں میں پڑھیں۔ پھر چند سال لاہور میں زیرِ تعلیم رہے ۱۹۵۸ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم سے آٹھویں درجے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اور اسی سال اپریل کی ۱۷۔

تاریخ کو ملٹری کالج میں آٹھویں درجے میں داخل ہوئے

ملٹری کالج میں داخلہ

ملٹری کالج میں اپنے زمانہ تعلیم کے بارے میں بریگیڈیئر نعیم لکھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ میرے دو چھوٹے بھائی سلیم اکبر (کالج نمبر ۲۲۰۸) اور شبیر احمد (کالج نمبر ۲۳۵۴) مجھ سے پہلے کالج میں داخل ہو چکے تھے۔ میں اکثر ابّا جان کے ساتھ ان سے ملنے کالج جایا کرتا تھا اس زمانے میں کرنل رفیق کالج کے کمانڈانٹ تھے۔ لڑکے آؤٹ ٹینگ وغیرہ بہت جاتے تھے۔ ڈرامے وغیرہ بہت ہوتے تھے۔ میرے بھائی ان سرگرمیوں کے قصّے سناتے تھے۔ مجھے کھیلوں کا بھی شوق تھا یہاں کھیلوں کا انتظام بہت اچھا تھا۔ ان وجوہ سے میں نے بھی کالج میں داخل ہونے کا شوق ظاہر کیا۔ والد مکرم غالباً خود بھی یہی چاہتے تھے انہوں نے مجھے جلد ہی کالج میں داخل کروادیا۔ ۲۴۲۶ میرا کالج نمبر تھا۔ میں آٹھویں درجے میں داخل ہوا تھا۔ اسکین ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا۔ اس وقت وہاں ایک ونگ کے ہاؤس ماسٹر مظہر علی خان تھے اور دوسرے ونگ کے مسٹر سعید ہاشمی۔ میں مظہر علی خاں صاحب کے ونگ میں تھا۔

ملٹری کالج میں داخلے سے پہلے بھی میری تعلیمی پوزیشن اچھی تھی۔ کالج میں بھی میں اللہ کے کرم سے اپنی امتیازی حیثیت برقرار رکھ سکا۔ آٹھویں، نویں اور دسویں جماعت میں۔ کالج میں اوّل پوزیشن لیتا رہا۔ دسویں میں بورڈ کا اسکالرشپ حاصل کیا۔ گیارھویں اور بارھویں جماعت کی پوزیشن یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ پہلی دو تین پوزیشنوں میں کوئی پوزیشن تھی۔ ایف ایس سی میں فرسٹ ڈویژن اور اسکالرشپ حاصل کرنے کا اعزاز بھی نصیب ہوا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں جب ٹیپو ہاؤس گرین ہاؤس کے نام سے پہلے پہل آباد ہوا تو میں اس کا پہلا ہاؤس پریفیکٹ تھا۔ مسٹر ایلن مور ہاؤس آفیسر تھے۔ ۱۹۶۰ سے ۱۹۶۲ تک کالج کی ہاکی فرسٹ الیون میں کھیلتا رہا۔ ۱۹۶۱ء میں لاہور ایجوکیشن بورڈ کی ہاکی چمپئن شپ جیتی۔ اس کے علاوہ میں ہاؤس کی طرف سے ہاکی فٹ بال

باسکٹ بال، اتھلیٹکس اور سوئمنگ کے انٹر ہاؤس مقابلوں میں بھی حصّہ لیتا رہا۔ اور کالج کے پی ٹی اسکواڈ سے اوّل تا آخر وابستہ رہا۔ اللہ کا شکر ہے کہ کالج میں میرا تعلیمی اور تربیتی ریکارڈ قابل فخر حد تک اچھا رہا اس کے لئے میں اپنے شفیق، بلند نگاہ اور حد درجہ مخلص استادوں کا ممنون ہوں۔ اس زمانے میں وہاں علم وفن اور شخصیت وکردار کے لحاظ سے بڑے بڑے لائق فائق اور ممتاز اساتذہ موجود تھے۔ ڈراموں کو ڈائریکٹ کرنے میں حیدری صاحب کا جواب نہیں تھا تقریروں اور مباحثوں میں طلبہ کو طاق کرنے میں علوی صاحب اور راشد صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔ مظہر صاحب بلگرامی صاحب، صوبیدار عریف الحسن صاحب، ایوب صاحب، شفیق صاحب اپنے اپنے مضامین خوب پڑھاتے تھے۔ لیکن سب سے بڑھ کر اور سب سے ممتاز خود کمانڈانٹ کرنل رفیق تھے۔ ان کی موثّر اور پر وقار شخصیت نے کالج کو جگا کے رکھ دیا تھا۔ ان کا کمال یہی نہیں تھا کہ کالج کا ڈسپلن بہت چوکس تھا۔ بلکہ ان کا اصل کمال یہ تھا کہ انہوں نے کالج میں آنر سسٹم، آنر کورٹ، وغیرہ بہت سے ذرائع سے اور سب سے بڑھ کر اپنی جاندار شخصیت سے کالج میں ایک اخلاقی اور قومی احساس اور شعور پیدا کر دیا تھا۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اچھے لوگ کمزور اور غیر موثّر ہوتے ہیں اور جو موثّر اور باجبروت ہوں ان کی قدریں عموماً قابل ذکر نہیں ہوتیں۔ رفیق صاحب کی ذات میں بلند قدروں کے ساتھ موثّر قیادت بھی یکجا تھی۔ اس امتیازی خصوصیت نے ان کے دور کے ہر لڑکے کو متاثر کیا اور شدّت سے متاثر کیا۔ انہیں اخلاقی حس اور قیادتی صلاحیت پیدا کرنے کا ملکہ تھا ان دو باتوں کے لئے ان کا دور کالج کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جیسے لوگ کبھی نہیں مرتے ان کی شخصیت ایک لیجنڈ بن کے لوگوں کو متاثر کرتی رہتی ہے کسی فانی انسان کے لئے اس سے بڑھ کر سعادت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ عظیم انسانی اور اخلاقی قدروں دیانت، جرأت عدل، حب الوطنی اور عزیمت کی علامت بن جائے

ملٹری کالج کا دور میری زندگی کا بہترین دور اس لئے ہے کہ اس دور میں میں نے اپنے آپ کو تھوڑا بہت دریافت کیا اور بنیادی قدروں کا شعور حاصل کیا

اے مادر درس گاہ تو زندہ و تابندہ رہے!

پی ایم اے سے راجستھان کے ریگ زاروں تک

بریگیڈیئر نعیم کا کمیشن ۳۱ لانگ کورس کا ہے۔ نعیم نومبر ۱۹۶۲ء سے اپریل ۱۹۶۵ء تک پی ایم اے میں زیر تربیت رہے۔ وہاں کمپنی جونیئر انڈر آفیسر ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ پاس آؤٹ ہوتے وقت نارمن گولڈ میڈل جیتا اس کے علاوہ سائنس میڈل اور فزکس میڈل بھی لیا۔ اپریل ۱۹۶۵ء میں اپنی آبائی رجمنٹ فرسٹ پنجاب رجمنٹ سے وابستہ ہوئے جو ان دنوں سیالکوٹ میں متعین تھی۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں یونٹ کے ساتھ سیالکوٹ سے آزاد کشمیر گئے۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ شروع ہونے پر پھر سیالکوٹ واپس آئے اور باقی جنگ اسی محاذ پر دیکھی۔ اپریل ۱۹۶۶ء میں یونٹ کے ساتھ سیالکوٹ سے ملیر پہنچے۔ جولائی ۱۹۶۸ء میں جی او سی ۱۸ ڈویژن کے اے ڈی سی مقرر ہوئے۔ مئی ۱۹۷۰ء میں اسی منصب پر جنرل ایم رحیم خان کے ساتھ رہے، مارچ ۱۹۷۱ء میں دوبارہ ان کی پوسٹنگ فرسٹ پنجاب رجمنٹ رحیم یار خان میں ہوئی۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں جنگ کے دوران اپنی یونٹ کے ساتھ راجستھان کے محاذ پر معرکہ آرا ہوئے۔ اسی محاذ پر انہیں امتیازی سند کا اعزاز عطا ہوا۔

امتیازی سند کا فرمان

۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح کو بی کمپنی کے کمانڈر پی اے ۷۱۰۳ میجر محمد نعیم اکبر خان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ بٹالین کے بائیں بازو پر واقع ایک اونچی پہاڑی پر ایک پلاٹون سے قبضہ کر لیں۔ لانگن والا سے دشمن کو یہ پہاڑی صاف نظر آ رہی تھی اور وہ اس پر صبح سے تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمباری بھی کر رہا تھا اس پہاڑی کی اہمیت اور اس پر حملہ کرنے میں جو خطرات مضمر تھے انکے پیش نظر میجر نعیم اکبر نے اس پر حملے کی قیادت خود کرنا ضروری سمجھا۔ اگر دشمن کی مسلسل اور شدید گولہ باری کے

دوران میجر نعیم نے نہایت جانفشانی سے ایک خندق سے دوسری خندق تک جا کے دفاع کو منظم کیا۔ دشمن کی میڈیم آرٹلری کی حرکت میں آجانے سے اس پلاٹون کا کمانڈر شہید ہوگیا اور چار او۔ آر زخمی ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ دشمن کی مسلسل گولہ باری اور دو روز تک غذا اور پانی نہ ملنے سے تھکن کی وجہ سے آدمیوں کا حوصلہ کچھ پست ہو رہا تھا۔ ان حالات میں دشمن نے رات کو اس پوزیشن پر حملہ کیا میجر نعیم نے پلاٹون کے گن فائر کو کنٹرول کیا اور جب ایک بار گن کچھ خراب ہوگئی تو میجر نعیم نے خود اسے چلایا۔ اس موقعہ پر میجر نعیم کی پرسکون جرأت اور اعلیٰ قیادت کے مظاہرے سے ان کی پلاٹون کو بڑا حوصلہ ہوا۔ اور اس اہم حملے کو پسپا کر سکے۔

میجر نعیم کی دلیری و دلاوری ایک بار پھر ۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مسیت داری پہ ظاہر ہوئی کھارو تار کے مقام سے ان کی کمپنی کو رات کے وقت پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ جب ان کی کمپنی نے اپنی نئی پوزیشن سنبھالی تو آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ جس منظّم طریقے سے ان کی کمپنی کے بہت ہی زیادہ تھکے ہوئے آدمی آئے یہ بڑی حد تک میجر نعیم کی اعلیٰ قائدانہ اور ذاتی مثال پیش کرنے کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔

دوسرے روز ۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ساڑھے آٹھ بجے دشمن نے ان کی کمپنی پر ٹینکوں کے ایک اسکواڈرن سے توپ خانے اور ہوائی جہازوں کے تعاون کے ساتھ حملہ کیا۔ اور میجر نعیم نے تقریباً ایک گھنٹے تک دشمن کے سخت دباؤ کے باوجود اس کا جم کر مقابلہ کیا اور آخرکار اس کو پسپا ہونا پڑا۔ اس معرکے میں دشمن کا ایک ٹینک تو بالکل تباہ ہوگیا اور کئی اور ٹینکوں کو نقصان پہنچا۔ اسی روز سہ پہر کو دشمن نے تازہ دم دستوں اور ٹینکوں کی خاصی تعداد سے ایک بار پھر حملہ کیا۔ میجر نعیم کی کمپنی کا گولہ بارود تقریباً ختم ہو چکا تھا اور کھانے اور پانی کے بغیر یہ لڑائی ایک طرح سے قوّت ارادی اور لڑنے کے عزم کا مقابلہ بن گئی تھی۔ ان تمام مشکلات کے باوجود میجر نعیم کے لڑنے کے عزم اور حوصلے میں ذرا فرق نہیں آیا اور نہایت پُرسکون انداز میں انہوں نے مقابلہ جاری رکھا وہ اپنی پوزیشن پر جمے رہے اور دشمن کے حملے کو پسپا کر دیا۔ دھواں دھار

لڑائی کے دوران دشمن کی چالوں کا شکار ہونے سے بچنے کے لئے میجر نعیم کو اپنے دستوں کو دوبار ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا پڑا۔ دشمن کے توپ خانے اور ٹینکوں کے مسلسل فائر کے دوران کمپنی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا سخت کٹھن کام تھا۔ لیکن میجر نعیم نے ہر بار اپنے دستوں کی رہنمائی خود کی اور انہیں ان کی جگہوں پر لے گئے۔ نہایت پرخطر حالات میں جس طرح میجر نعیم نے بار بار خوشی سے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی اس کی وجہ سے ان کی کمپنی اور بٹالین کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور سرخ رو ہوئی۔ جس جگہ پرخطرہ ہوتا یا دشمن کا دباؤ ہوتا میجر نعیم وہاں ضرور موجود ہوتے اس دلیری بے خوف جرأت اور فرض کی حدوں سے بہت آگے جا کر اپنے فرائض انجام دینے کی بنا پر میجر نعیم کے لئے ستارۂ جرأت کی پرزور سفارش کی جاتی ہے۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۲ء کو امتیازی سند عطا ہوئی۔

شخصیّت کا تجزیہ

کسی انسان کو پرکھنے اور اس کی اقدار اور رویّوں کو جاننے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اسے کن اشخاص نے متاثر کیا۔ اور اس نے کن قدروں کی تعریف کی ہے۔ اس اصول کے تحت جب ہم نے نعیم سے پوچھا کہ آپ بتائیں آپ کو کن تاریخی شخصیتوں نے متاثر کیا تو ان کا یہ جواب آیا۔

تاریخی شخصیّتوں میں میرا مطالعہ فوجی شخصیّتوں تک محدود رہا ہے۔ اس میدان میں میں رومیل اور کلک سے متاثر ہوا ہوں۔ عام زندگی میں، میں جن شخصیّتوں سے متاثر ہوا ان میں پہلا نام میرے والد ماجد اکبر خان صاحب کا ہے۔ انہوں نے جس طرح پتّہ مار کر ہم بھائیوں کی پرورش کی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بچوں کی پرورش کرنا بھی ایک فن ہے۔ ایک جہاد ہے۔ ایک عمل ہے۔ بنیادی انسانی قدروں سے سب سے پہلے انہوں ہی نے مجھے متعارف کرایا۔ یہ تعارف بہت جلد ان قدروں سے ایک گہرے تعلق میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ سادگی۔ ایثار، خدمت اور جفاکشی کی

عظیم قدریں خود ان کی زندگی کا حصّہ رہی ہیں۔ مجھے ان کی جو بات سب سے زیادہ پسند رہی ہے یہ ہے کہ وہ براہ راست نصیحت کبھی نہیں کرتے۔ نصیحت اور رہنمائی ان کے رویے میں ہوتی ہے۔

دوسری شخصیت جس سے میں نے گہرا اثر قبول کیا ہے وہ جنرل ریاض حسین مرحوم کی تابناک شخصیت ہے۔ میں دو سال ان کا اے ڈی سی رہا۔ اس منصب کی وجہ سے مجھے انہیں خلوت اور جلوت میں بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور جتنا قریب سے دیکھا اتنا زیادہ اچھا پایا۔ وہ حلم اور بردباری، بے غرضی اور عدل گستری کا ایک نادر و نایاب نمونہ تھے انہوں نے نہ تو کسی کے ساتھ زیادتی کی نہ کسی غیر مستحق کو نوازا۔ ان کی شخصیّت میں جو توازن تھا۔ جو ٹھہراؤ تھا۔ وہ غیر معمولی وصف جسے عربی میں عدل کہا گیا ہے۔ اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ افسوس کہ ۱۹۷۳ء میں یکایک ان کا انتقال ہو گیا۔ میرے لئے تو گویا ایک چراغ بجھ گیا گو اس کی روشنی اب بھی باقی ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیّت ہے کہ وہ ہر راہ میں، ہر راہ گزر میں چراغ جلاتا اور بجھاتا رہتا ہے تاکہ اس کے بندوں کو روشنی ملتی رہے۔ اور منزل ان کی نگاہ سے اوجھل نہ ہو۔ فبای الاءِ ربکما تکذبان (تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

کارنامہ نہیں صرف ادائیگی فرض

بریگیڈیئر نعیم کے سوانحی کوائف حاصل کرنے کے لئے جو سوالنامہ ہم نے ان کے پاس بھیجا تھا اس کے آخر میں ایک سوال یہ بھی تھا۔ کہ آپ میدان کارزار میں جرأت کا مظاہرہ کس طرح کر سکے جس کے لئے آپ کو بہادری کا یہ اعزاز عطا ہوا۔ اس سوال کے جواب میں انہوں نے لکھا۔

"اوّل تو میں اسے کارنامہ نہیں کہتا۔ میں اپنی کمپنی کے ساتھ ایک فرض کو بجا لا رہا تھا۔ جس طرح ایک مسلمان اور پاکستانی سپاہی کو بجا لانا چاہیئے۔ یہ ضرور ہے کہ کسی فرض کو بجا لانے کا بھی میرا ایک تصوّر ہے۔ امن ہو کہ جنگ جو کام میرے سپرد کیا جائے میں اسے اپنے لئے ایک چیلنج سمجھتا ہوں اور میں اسے ایمان اور اپنے کردار کا امتحان بھی سمجھتا ہوں۔ اس کو جان لڑا کر کرنا میرے لئے عزّت

کا سوال بن جاتا ہے اس لئے کام کرتے ہوئے میں اپنی جان کو جان نہیں سمجھتا۔ یہی میں نے والدین سے سیکھا۔ یہی میں نے کالج سے سیکھا۔ یہی میرا طرز زندگی ہے۔ راجستھان کے ریگ زاروں میں لڑتے ہوئے مجھے خاص طور پر اپنے وطن پاکستان کی عزّت و حرمت کا خیال بھی تھا۔ اور اپنی عزّت کا بھی یقیناً میرے لاشعور میں یہ احساس بھی تھا کہ مجھ سے کوئی قدم ایسا نہ اٹھ جائے جس سے میری کمپنی کے کسی جوان کو یہ شبہ بھی ہو کہ صاحب بزدلی دکھا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میدان جنگ میں اپنی عزّت کا اپنی انا کا یہ احساس بھی ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ پھر جو کچھ جوانوں سے کہا کرتا تھا کہ موت سے کیا ڈرنا اسے اپنے وقت پر آنا ہے اور ضرور آنا ہے۔ اگر مرنا بھی ہے تو آدمی عزّت سے کیوں نہ مرے۔ اس پر میرا واقعی پختہ یقین ہے اس لئے میں بڑے آرام سے بغیر کسی ہیجان کے نہایت نارمل طریقے سے اس محاذ پر لڑتا رہا۔ اگر سرخ رو ہوا تو یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے کچھ کر سکنے کی توفیق دی۔

میجر داؤد الرحمان تمغہ جرأت

آرٹلری

میجر داؤد الرحمان تمغۂ جرأت، آرٹلری

آباؤ اجداد

میرے آباؤ اجداد اب سے ڈیڑھ صدی قبل، افغانستان کے شہر غزنی سے ہجرت کر کے صوبہ سرحد کے مشہور شہر نوشہرہ کے قریب ایک گاؤں پیر پائی میں آباد ہوئے تھے۔ میرا دادا ملک امداد خان اپنے قبیلے قمبر خیل کے سردار تھے۔ ہماری آبائی روایت سپہ گری اور زمینداری ہے لیکن ہمارے قبیلے اور گاؤں نے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ بھی دیا ہے۔ اب جہاں ہمارا گاؤں عسکری ستاروں کا گاؤں ہے وہاں جدید علم و فن کا گہوارہ بھی ہے۔ پیر پائی کو میں نے عسکری ستاروں کا گاؤں اس لئے کہا اس لئے کہ شاید سارے پاکستان میں ہمارے گاؤں ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اتنی چھوٹی سی بستی میں تین افسر ستارۂ جرأت ہیں جن میں سے دو نے دو بار ستارۂ جرأت لیا ہے۔ اس طرح گویا پانچ ستارے پیر پائی کے افق پہ جھلملاتے ہیں۔ یہ سب ہمارے گاؤں کے لوگ ہیں ان کے علاوہ قومی زندگی کے دوسرے شعبوں جیسے انجینئرنگ

اور قانون میں بھی ہمارے گاؤں کے افراد نے نام پایا ہے۔ لیکن اب بھی ہمارا خاص پیشہ سپہ گری ہی ہے میرے والد، چچا، بہنوئی اور کئی دوسرے رشتہ دار فوجی افسر ہیں میرا چھوٹا بھائی خلیل الرحمٰن جو ایک ہوائی حادثے میں اللہ کو پیارا ہوا ملٹری کالج کا ہیڈ بوائے رہ چکا تھا۔ اور کوئٹہ میں حادثہ کے وقت کیپٹن کے عہدے پر فائز تھا۔

اس نسلی اور خاندانی پس منظر کی داستان چھیڑنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بتا سکوں کہ میرا نسلی اور خاندانی پس منظر کیا ہے۔ کس قسم کے ماحول میں، میں نے پرورش پائی ہے اور کن روایات سے میں نے شعوری اور لاشعوری طور پر اثر قبول کیا ہے۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

میں اپنے آبائی گاؤں بیر پانی میں ۱۸ دسمبر ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوا اور رسمی تعلیم کی ابتدا کراچی کے ایک اسکول سے ہوئی۔ کچھ عرصے کے بعد والد صاحب کا تبادلہ راولپنڈی میں ہو گیا اور پنڈی کے مشہور سینٹ پیٹرک سکول میں پڑھنا شروع کیا۔ اسی اسکول سے ساتویں جماعت پاس کر کے میں ۱۹۶۰ میں ملٹری کالج میں آٹھویں درجے میں داخل ہوا۔ اور ۵۷۵ کالج نمبر ملا۔ ٹیپو سلطان ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا۔ اور مسٹر ایلن مور میرے پہلے ہاؤس ماسٹر تھے۔ ٹیپو سلطان ہاؤس میں تین سال رہا۔ کالج میں اپنی تعلیم کے باقی تین سال میں نے بابر ہاؤس میں گزارے جولائی ۱۹۶۶ء میں ایف اے کرنے کے بعد میں نے کالج کی بھرپور اور پرتعمیر زندگی کو خیرباد کہا۔ بھرپور اور پرتعمیر میں نے اس لئے کہا ہے کہ کالج میں میری توانائیوں کو اظہار کا اور صلاحیتوں کو پنپنے کا پورا پورا موقعہ ملا۔ میں کالج کے ان خوش قسمت طلبہ میں سے ہوں جنہوں نے کالج سے بھرپور استفادہ کیا۔ کھیلوں اور اسپورٹس میں مجھے نمایاں کامیابی ہوئی۔ بہترین اتھلیٹ اور بہترین باکسر ہونے کا اعزاز بھی ملا۔ ۱۹۶۴ء کے انٹر سروسز پبلک اسکولز اسپورٹس مقابلوں میں بھی مجھے بہترین باکسر قرار دیا گیا تھا۔ دوسرے عہدوں کے بعد آخر ۱۹۶۵ میں مجھے کالج کا ہیڈ بوائے یا کالج پریفکٹ ہونے کا امتیاز بھی حاصل ہوا۔ میں بڑی جذباتی بلکہ

سیمابی طبیعت کا آدمی ہوں اس لئے اکثر حادثات اور ہیجانی واقعات سے دوچار ہوتا رہتا ہوں ایلین کالج کے دوران قیام میں، میں ایک ایسے ذہنی تجربے سے ضرور گزرا جس کا تعلق ۱۹۷۱ء میں میری جنگی تگ وتازسے بھی ہے۔ مثلاً یہ کہ جب ستمبر ۶۵ء کی جنگ چھڑی تو میں کالج میں بارھویں درجے کا طالب علم تھا۔ ۶ ستمبر کی صبح کو لاہور پر ہندوستانی حملے کی خبر کروڑوں پاکستانیوں کی طرح مجھ پر بھی بجلی بن کر گری۔ چند گھنٹوں کے بعد صدر پاکستان، ایوب خان کی نشری تقریر نے میرے اندر آگ بھر دی۔ میرا فوری احساس یہ تھا۔ کہ کسی طرح مجھے بھی جنگ کی آگ میں کودپڑنے کا موقعہ ملے۔ میں بھی اپنے زور بازو کو آزمانا چاہتا تھا۔ لیکن سوائے خبریں سننے، اخبار پڑھنے اور پیچ وتاب کھانے کے میں کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی بے بسی پر رونا آیا۔ بچپن سے میں جنگجوئی کے خواب دیکھتا آیا تھا میں نے اپنے بڑوں کو اور اپنے بزرگوں کو بڑے بڑے کارنامے کرتے سنا تھا۔ میرے دل میں بھی یہ امنگ چٹکیاں لیتی تھی کہ میں بھی کوئی کارنامہ انجام دوں۔ لیکن اب جو یہ موقعہ آیا تو کچھ نہ کر سکتا تھا۔ میں باربار سوچتا تھا کہ کاش میں فوج میں ہوتا۔ جنگ کی وجہ سے کالج بند کر دیا گیا تھا۔ جب میں گھر گیا اور والد صاحب کو میری ذہنی کیفیت کا علم ہوا تو انہوں نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا وہ آج بھی میرے دل پر نقش ہے۔ ان کے یہ الفاظ تھے۔

"میرے بیٹے میرا زندگی بھر کا تجربہ یہ ہے کہ انسان جس چیز کو شدّت سے اور خلوص سے چاہتا ہے وہ اس کو دیر سویر حاصل ہو ضرور جاتی ہے۔ اگر تم سچّے دل سے جہاد میں حصہ لینا چاہتے ہو تو مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا موقعہ ضرور دے گا۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ ساری زندگی پڑی ہے۔ بیٹے انتظار کرنا بھی سیکھو اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جہاد تو قدم قدم پر ہے۔ لمحہ بہ لمحہ ہے۔ ساری زندگی جہاد ہے۔ اپنے نفس کو زیر کرنا بھی جہاد ہے۔ بلکہ جہاد اکبر ہے۔ اس لئے تمہیں افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

والد کی اس تقریر نے میری سوچ پر گہرا اثر ڈالا۔ اور بہت جلد مجھے جو کچھ انہوں نے کہا تھا۔ اس کی صداقت کا ثبوت بھی مل گیا۔ وہ یوں کہ چند سال بعد جب میں نے ۱۹۷۱ء کے عملی جہاد میں

حصہ لیا تو مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ میدان جنگ میں بھی وہی سرخ رو ہو سکتا ہے جو زندگی کے جہاد میں سرخ رو ہونا جانتا ہو۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ کالج میں، میں نے بھرپور زندگی گزاری جو دوڑتا ہے وہ گرتا بھی ہے۔ چنانچہ ایک دو بار گرا اور بری طرح گرا۔ ہوا یوں کہ میں ٹیپو سلطان ہاؤس میں نویں درجے میں تھا تو اکثر سنتا تھا کہ سینئرز نہر اپر جہلم کو تیر کر پار کرتے ہیں۔ میرے بازوؤں میں جب سکت آئی تو میں نے سوچا کہ مجھے بھی اپنا امتحان لینا چاہیئے۔ چند قریبی دوستوں سے مشورہ کیا کہ نہر کو کراس کرنے کا ارادہ ہے۔ انہوں نے ڈرایا کہ پل کے نیچے پانی کا بہاؤ بہت تیز ہے اور نہر کی چوڑائی بہت زیادہ ہے۔ بچپن سے میں خطر پسند ہوں۔ اور اگر کوئی کسی مشکل کام سے ڈرائے تو مجھے ضد سی ہو جاتی ہے کہ اسے کر کے چھوڑوں چنانچہ میں نے پختہ عزم کر لیا۔ کہ خواہ کچھ ہو جائے اس نہر کو تیر کے پار ضرور کروں گا۔ چنانچہ شروع جون کی ایک گرم دوپہر کو جب سب لڑکے آرام کر رہے تھے میں ڈارم سے کھسک گیا اور نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں میرا دوست ریاض پہلے سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ چنانچہ تیراکی کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ دونوں نے نہر کو ایک ایک بار پار کیا۔ پھر چپکے سے کمرے میں آکر سو گئے۔ میں دل میں خوش تھا کہ دل کی ایک حسرت تو نکل گئی۔ پھر یہ فخر بھی ہوا کہ جو کام سینئرز کر سکتے ہیں وہ میں بھی کر سکتا ہوں۔

ہر مجرم اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتا ہے میرا بھی خیال تھا کہ میرا طریق واردات اتنا مکمل تھا۔ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی ہوگی۔ دوسرے روز جب کمانڈانٹ کے سامنے میری پیشی ہوئی تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ بات کھلی کیسے؟ اب زندگی کے تجربے سے معلوم ہوا کہ کوئی حقیقت راز نہیں رہ سکتی، بہر حال مختصر یہ کہ میں نے فوراً اقرار جرم کر لیا۔ لیکن معافی نہیں مانگی۔ اقرار کرنے لیکن معافی نہ مانگنے کی بھی ایک وجہ تھی۔ میرے باپ نے بچپن میں مجھے یہی بتایا تھا بیٹا کبھی غلط قدم نہ اٹھانا۔ اور اگر دلیری سے ایسا کر لیا ہے تو دلیری سے سزا بھی بھگتنا۔ چنانچہ کمانڈانٹ صاحب نے پہلے تو کچھ دیر سمجھایا کہ نہر میں تیرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر جو سزا تجویز کی اس نے میرے ہوش اڑا دیئے۔ یعنی یہ کہ موسٹی ہال میں سارے کالج کے سامنے تاج پوشی ہوگی (پبلک کیننگ کو تاجپوشی کہتے تھے)

بیدوں کی جسمانی تکلیف تو میں نے سہہ لی لیکن کالج کے سامنے پٹنے کی ذلت کے احساس نے مجھے توڑ کے رکھ دیا۔ لیکن چند روز کے بعد میں نارمل ہو گیا۔ اور میں نے عہد کیا کہ میں اس داغ کو مٹاؤں گا اور کالج کا اہم ترین لڑکا بن کے دکھاؤں گا۔ اس واقعہ کے بعد میری سوچ میں ایک ڈرامائی تبدیلی واقع ہوئی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ " داؤد! زندگی اپنے تمام امکانات کے ساتھ سامنے پڑی ہے آگے بڑھو اور ان امکانات کو بروئے کار لاؤ۔ کس طرح اس داغ کو مٹاؤ اور کچھ کر کے دکھاؤ۔ آج جب کہ اس واقعہ کے بارے میں لکھ رہا ہوں تو میرا خیال یہ ہے سزا برحق لیکن سزا ذلت آمیز یا ذلت انگیز نہیں ہونا چاہیئے۔ سزا کا مقصود و مطلوب اصلاح ہوتا ہے نہ کہ شخصیت کی تخریب۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ صحیح اور صحیح طریقے سے سزا دینا جو مثبت نتائج پیدا کر سکے۔ بہت مشکل کام ہے یہ تو ایک تلخ یاد تھی شیریں یادیں بھی بے شمار ہیں۔ کالج میں، میں نے اپنی زندگی کے بہترین دن گزارے کالج سے میری زندگی کی بہت سی سہانی یادیں وابستہ ہیں۔ ایسے واقعات کی یادیں جنہوں نے میری آئندہ زندگی کو متاثر بھی کیا۔ مثلاً دسمبر ۱۹۶۳ء کی بات ہے انٹر سروسز پبلک اسکولز اسپورٹس ٹورنامنٹ کیڈٹ کالج پٹارو میں ہو رہا تھا اتفاق کی بات کہ اتھلیٹکس کی آخری دوڑ ۱۰۰ × ۴ ریلے تک سب کالجوں کے پوائنٹس برابر تھے۔ اب فیصلہ اس آخری دوڑ پر تھا۔ اسی دوڑ کے نتیجے میں کسی کالج کو پریذیڈنٹ شیلڈ ملنا تھی۔ اس وجہ سے سب ٹیموں میں سخت جوش و خروش پھیلا ہوا تھا اور چونکہ اس بار تقسیم انعامات کے لئے پریذیڈنٹ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان خود تشریف لا رہے تھے اس لئے ہر کالج کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ شیلڈ جیتے اور خود صدر کے ہاتھ سے شیلڈ لے کر سرخ رو ہو۔ آخر وہ وقت آن پہنچا جس کے لئے سب شرکاء کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ صدر صاحب بری اور بحری افواج کے کمانڈر انچیف اور وزیر خارجہ کے ساتھ تشریف لائے اور اپنی نشستوں پہ بیٹھے ہماری ٹیم کو کمانڈنٹ کرنل سردار خان نے بلایا اس موقعہ پر کرنل عبدالغفور اور حیدری صاحب بھی موجود تھے ان سب نے ہماری ہمت افزائی کی اور اس دوڑ پر جو بازی لگی ہوئی تھی ہمیں اس کی اہمیت کا احساس دلایا۔ ہمیں پہلے سے اپنی ذمہ داری کا احساس تھا ان کے کہنے سے یہ احساس

دو چند ہو گیا۔ دوسری ٹیم بھی کم نہیں تھی۔ انہوں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن ہمارے لئے تو یہ عزت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ میں نے ریلے ریس کے باقی ساتھیوں سے کہا۔ دوستو، جان لڑا دو آج کالج کی عزت کا سوال ہے۔ مختصر یہ کہ ہماری ٹیم نے نہ صرف یہ ریلے ریس جیتی بلکہ پچھلے ریکارڈ بھی توڑ دیئے۔ صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے کالج کی کارکردگی کی بڑی تعریف کی۔ کرنل سردار نے خوش ہو کر ہمیں کراچی کی سیر کرائی۔ حیدری صاحب نے مووی کیمرے پر ہماری فلم بنائی۔ تمام ملک میں کالج کا نام ہوا اور خود میری زندگی میں یہ کامیابی بہت اہم ثابت ہوئی۔ اس امتیازی کامیابی کے بعد، لڑکوں کی نظر میں اور اساتذہ کی نظر میں میری ساکھ بہت بڑھ گئی۔ اور مجھے وہ منزل قریب نظر آنے لگی جس کے لئے میں کئی برس سے کوشاں تھا۔ آخر میں ایک اور واقعہ کا ذکر ضروری ہے جس نے مجھے کالج میں شدت سے متاثر کیا۔ وہ فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک کی کالج میں آمد سے متعلق ہے۔ آکنلک کا شمار دوسری جنگ عظیم کے مشہور جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ کالج میں ایک ہاؤس بھی ان کے نام سے منسوب تھا۔ غالباً ۱۹۶۳ء میں جب وہ ایک نجی دورے پر پاکستان آئے تو کالج میں بھی آئے کالج ہال میں جو تقریر انہوں نے کی اس نے بھی مجھے شدت سے متاثر کیا۔ ان کی تقریر کے دو نکتے اب بھی مجھے یاد ہیں۔ پہلے تو انہوں نے کہا فوجی زندگی کے ساٹھ سالہ تجربے کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ مارشل ریس ایک افسانہ (Myth) ہے ہر قوم لڑتی ہے اور لڑ سکتی ہے اگر اس میں لڑنے کا جذبہ اور ولولہ ہے۔ دوسری بات جو انہوں نے کہی وہ ان کی زندگی سے متعلق تھی۔ انہوں نے کہا۔ میں بچپن میں یتیم ہو گیا تھا۔ میری ماں نے مجھے بڑی مشقتوں سے پالا۔ میں نے اپنی تعلیم ملٹری کالج کی طرز کے ایک فوجی اسکول میں حاصل کی۔ اور محض اپنی محنت، شوق اور لگن کے بل بوتے پر اس مرتبے تک پہنچا جس پر میں آج ہوں۔

مجھے نہیں معلوم کہ دوسروں نے آکنلک کی تقریر سے کیا اثر قبول کیا لیکن ان کی تقریر کے آخری نکتے نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ محنت اور لگن ہر کامیابی کا راز ہے۔ اس سے عام آدمی بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔

سرائنلک اردو، پشتو پنجابی بڑی روانی سے بولتے تھے۔ میں نے ان کی دیکھا دیکھی پنجابی سیکھی۔ اس سے مجھے آئندہ فوجی زندگی میں بہت فائدہ ہوا۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں مجھے کالج میں پریفیکیٹ بننے کا اعزاز ملا۔ یہ ایک بہت قیمتی تجربہ تھا۔ اس نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ اس سے میرے اندر وہ ضروری اعتماد پیدا ہوا جو ہر سطح کی قیادت کے لئے ضروری ہے۔ پبلک اسپیکنگ کا تجربہ بھی ہوا۔ اب میں ہر جگہ بے جھجک بول سکتا ہوں اس کی ابتدا بھی وہیں سے ہوئی تھی سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے طور پر فیصلے کرنا اور مسائل سے نمٹنا سیکھا۔ زندگی میں ایک چیز ہوتی ہے ہر طرح کے مزاج کے لوگوں کے ساتھ گزارا کرنا اور ان سے تعاون کرنا اور تعاون لینا اس کی ابتدائی تربیت بھی میں نے وہیں حاصل کی۔

اپنے تجربے کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کالج میں ہر لڑکے کو کسی نہ کسی قسم کی عملی ذمہ داری کے تجربے سے گزرنا چاہیئے۔ کارزار حیات میں خالی خولی معلومات سے کام نہیں چلتا غالب و کارساز و کارکشا شخصیّت کی ضرورت ہوتی ہے۔

میرا یہ بھی خیال ہے کہ طالب علمی ہی کے زمانے میں لڑکوں کو بلندیوں کی طرف دیکھنا سیکھنا اور سکھانا چاہیئے۔ اگر میں اپنا نفسیاتی تجزیہ کروں تو کہوں گا کہ یہ عزم میرے اندر کالج ہی کے زمانے میں پیدا ہو گیا تھا۔ کہ زندگی میں کچھ کر کے دکھانا چاہیئے۔ میرا پہلا ہاؤس ٹیپو سلطان ہاؤس تھا۔ ہاؤس میں جگہ جگہ سلطان شہید کا یہ مقولہ لکھا ہوا تھا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ اس مقولے سے میں نے یقیناً بہت اثر قبول کیا۔

کاروانِ زندگی کی اگلی منزلیں

میں نے ۱۹۶۷ء میں ۴۰ پی ایم اے لانگ کورس سے اپنے فوجی زندگی کا آغاز کیا۔ وہاں اچھا رہا اور اچھی پوزیشن پر پاس آؤٹ ہوا۔ لیکن کوئی امتیاز حاصل نہ کر سکا جس کی مجھے خود اپنے آپ سے اور دوسروں کو مجھ سے توقع تھی۔ پہلے تو خود حیران ہوا۔ میں نے اپنے دل سے کہا داؤد!

تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ ملٹری کالج میں جو تمہاری اٹھان تھی اسے کس کی نظر کھا گئی ؟ تم نے تو فضاؤں میں پرواز کرنے کا عزم کیا تھا۔ تم تو ان پہاڑیوں پر بھی نہ چڑھ سکے۔ دل نے کہا۔ بھلے مانس۔ عقل سے کام لو۔ سوچو، تمہارے بازو تو سلامت ہیں۔ تم اڑے کیوں نہیں۔ جب میں نے اپنے ڈھیلے پن کا تجزیہ کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو گیا تھا۔ میں نے اتنی لگاتار محنت نہیں کی جتنی کرنی چاہیئے تھی مجھے اپنے بازوؤں پر اعتماد تھا۔ لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ پرواز کے لئے صرف بازو ہی کافی نہیں ان کو پھڑ پھڑانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ جتنا آدمی ناکامی سے سیکھتا ہے اتنا کامیابی سے نہیں سیکھتا یہ بالکل صحیح ہے۔ میں نے اس تجربے سے زندگی کا ایک بہت بڑا سبق سیکھا۔ وہ یہ کہ کامیابی و کامرانی مسلسل جدوجہد چاہتی ہے کارزار زندگی میں صرف صلاحیت سے کام نہیں چلتا۔ ۱۹۶۹ء میں مجھے توپ خانے میں کمیشن ملا۔ یہ شعبہ مجھے دیا گیا تھا میں نے اپنی خوشی سے نہیں لیا تھا۔ میں انفنٹری میں جانا چاہتا تھا ۱۹۷۱ء کی جنگ تو میں نے توپ خانے کی یونٹ کے ساتھ لڑی لیکن بالآخر مجھے انفنٹری سے وابستہ ہونے کا موقعہ ملا۔ اب میں ۱۷ الیف ایف کے ساتھ ہوں۔ انفنٹری میرا شوق تھا تو یہاں آ گیا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ آرٹلری میں بھی میرا کیریر برا نہ تھا۔ آرٹلری میں اپنے عہدے کے لحاظ سے میں تمام اہم مناصب پر فائز رہا۔ ۷۱ء کی جنگ میں میری آبزرور پارٹی نے جنگی اعزازات حاصل کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔ وہ اس طرح کہ میرے علاوہ میرا ڈرائیور (جو شہید ہوا) اور میرا معاون بھی جنگی اعزاز یافتہ ہے۔ انفنٹری میں آنے کے بعد میں اپنی پلٹن کا کوارٹر ماسٹر ایجوٹینٹ، کمپنی کمانڈر رہا ہوں۔ انفنٹری اسکول میں ٹیک ونگ کی انسٹرکٹری بھی کی ہے۔ انفنٹری اسکول کے ایجوٹینٹ ہونے کا امتیاز بھی مجھے حاصل رہا ہے

جنگ دسمبر ۷۱ء کا معرکہ

اس معرکے کا نام معرکہ سلیمانکی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس معرکے کی تفصیلات بیان کروں۔

یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس لڑائی میں معجزانہ طور پر میری ایک ایسی خواہش پوری ہو گئی۔جس کا خواب میں نے کالج میں دیکھا تھا۔ کالج میں، میں اور فادر ولیم (کرنل طلعت عمر ستارۂ جرأت) گہرے دوست تھے۔ ہم دونوں کی سوچ ایک سی تھی۔ ہم دونوں نے عہد کر رکھا تھا لڑائی ہوئی تو دونوں ساتھ ساتھ لڑیں گے اور کوئی نہ کوئی جنگی اعزاز حاصل کریں گے۔ ۱۹۶۸ء میں طلعت کو انفنٹری ملی اور ۱۹۶۹ء میں مجھے میری مرضی کے خلاف آرٹلری سے وابستہ کیا گیا۔ اس طرح بظاہر ایک ساتھ لڑنا ممکن نہ رہا۔لیکن خدا کو ہماری آرزو کو پورا کرنا منظور تھا اس کا انتظام اس نے کر دیا۔ وہ اس طرح کہ جنگ ۷۱ء سے پہلے میری یونٹ لاہور میں اور طلعت کی سیالکوٹ میں تھی کچھ عرصے کے بعد ہم دونوں کی یونٹیں بہاولپور چلی گئیں۔پھر ایک روز ۲۲ ستمبر کو ہم دونوں سرحد پر یکجا کھڑے تھے۔طلعت ایک کمپنی کے کمانڈر تھے اور میں ان کی کمپنی کا توپ خانی دیدبان (آرٹلری آبزرور) یہ عجب اتفاق بلکہ حسن اتفاق تھا اس ایک واقعہ سے بھی میں نے دور رس نتائج اخذ کئے۔ پہلے یہ کہ خلوص میں بڑی طاقت ہے۔جو بات دل سے اور پورے خلوص سے چاہی جائے وہ پوری ہو کر رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔معرکہ سلیمانکی نے میری کئی حسرتوں کو پورا کر دیا۔معرکہ سلیمانکی کی تفصیل میں جانے سے پہلے میں اس معرکے کی اہمیت پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔معرکہ سلیمانکی نے اس افسانوی مفروضہ کو پاش پاش کر دیا کہ دشمن کی چوکیاں ناقابل تسخیر ہیں۔اس معرکے نے ثابت کر دیا کہ صرف انسان ناقابل تسخیر ہوتے ہیں چوکیاں اور مورچے نہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں دشمن نے یہاں منہ کی کھائی تھی۔اس لئے اس نے اپنے دفاعی مورچوں کو ناقابل تسخیر بنانے کا اہتمام کیا۔ پہلے تو اس نے اپنے علاقے میں سرحد سے ڈیڑھ میل اندر ایک نہر بنائی یہ نہر تقریباً تیس فٹ گہری اور نوے فٹ چوڑی تھی۔نہر کے اس پار دشمن نے نہر کی نکلی ہوئی مٹی سے ایک بند بنایا تھا جو تقریباً بیس فٹ اونچا اور دس فٹ چوڑا تھا اس بند پر دشمن نے کنکریٹ کے نہایت مضبوط بنکر بنائے تھے اور ان بنکرز کے اردگرد جھاڑیاں اور پیڑ اگائے ہوئے تھے ان بنکرز میں دشمن اپنے تمام میکانکی ساز و سامان کے ساتھ مورچہ بند تھا۔ان مورچوں کے بارے میں جو خبریں ہم تک پہنچی تھیں وہ یہی تھیں کہ ان کو جن بھی فتح نہیں کر سکتے۔

مزید برآں، سرحد کے ساتھ ساتھ دشمن کی دفاعی چوکیاں بھی تھیں۔ گویا پہلے ان سرحدی چوکیوں سے نمٹنا تھا۔ جن سے مقابلے کے نتیجے میں دشمن کا خبردار ہو جانا یقینی تھا۔ اس کے بعد تار اور بارودی سرنگیں پھر نہر اور پھر بنکرز۔ گویا ان مرحلوں سے کامیابی سے گزر کر ہی آگے بڑھا جا سکتا تھا۔ لیکن سلیمانکی ہیڈ ورکس کے تحفظ کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ دشمن کے ان مورچوں پر جنہیں ناقابل تسخیر کہا جاتا تھا۔ آگے بڑھ کر حملہ کیا جاتے اور ان پر قبضہ کیا جائے۔ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام کو ساڑھے چھ بجے اس حملے کا آغاز کیا گیا۔ یہ حملہ دو کمپنیوں سے کیا گیا ایک کمپنی کی قیادت میجر شبیر شریف شہید نشان حیدر ستارۂ جرأت کر رہے تھے۔ دوسری کمپنی کرنل طلعت عمر ستارۂ جرأت کے زیر کمان تھی۔ میں ان دونوں کے ساتھ آرٹلری آبزرور تھا۔ دشمن کی پہلی چوکیوں پر آسانی سے قبضہ کر لیا گیا، دشمن کے پندرہ سپاہی بھی جنگی قیدی بنائے گئے۔ اس کے بعد نہر کے بند پر اصل حملہ شروع کیا گیا، بارودی سرنگوں، خاردار تاروں اور نہر کو پار کر کے جب ہم بند پر پہنچے تو ہمیں خود یقین نہیں آرہا تھا کہ ہم نے بڑی حد تک یہ معرکہ سر کر لیا ہے دشمن اپنے مضبوط دفاعی بنکرز میں مورچہ بند بیٹھا تھا۔ ہم اس کے چھوٹے ہتھیاروں کی زد میں تھے۔ اور دشمن کا توپ خانہ بھی ہم پر فائر کر رہا تھا ہر طرف آگ بھڑک رہی تھی بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی اور دھوئیں سے سانس لینا دشوار تھا۔ بنکرز کو دشمن سے خالی کرانے کے لئے اس سے دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔ ہمارے جوان یا علی کا نعرہ لگا کر دشمن پر جھپٹ پڑے۔ آخر کار رات کے دو بجے کے قریب ہم نے دشمن کو بھگا کر ان مورچوں پر قبضہ کر لیا جن کو ناقابل تسخیر کہا گیا تھا۔ یوں منہ کی کھا کر دشمن نچلا کیا بیٹھتا دشمن نے چوٹ کھائے سانپ کی طرح پلٹ کر حملہ کیا اور بڑی قوت سے کیا۔ اپنے علاقے اور دفاعی چوکیوں کو واپس لینے کے لئے دشمن نے اپنی تازہ دم فوج سے ٹینکوں اور توپ خانے کے ساتھ ایک نہیں کئی بڑے زوردار حملے کئے۔ اس کی انتہائی کوشش تھی وہ اپنے دفاعی مورچوں پر دوبارہ قبضہ کر لے ہمیں معلوم تھا کہ دشمن جوابی حملہ کرے گا۔ ہم ذہنی اور عملی طور پر اس کے جوابی حملے کے لئے تیار تھے۔ اور ہم نے بھی عزم کیا ہوا تھا کہ جان جائے یا رہے دشمن کو اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے

دیں گے۔ بہر حال جب دشمن نے جوابی حملے کئے تو یہ ہماری توقعات سے کہیں زیادہ شدید اور بھرپور تھے بہر حال ہم نے دشمن کے ہر حملے کو پسپا کیا اور اس کو اس کے عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اس معرکے میں دشمن کے پندرہ سے زیادہ ٹینک کھیت رہے اور اس کا خاصا جانی نقصان بھی ہوا۔

معرکہ سلیمانکی ہماری عسکری تاریخ کا ایک قابل ذکر اور قابل فخر ورق ہے۔ اس معرکے میں، ہم نے کم نفری اور کم ساز وسامان کے ساتھ دشمن پر کاری ضرب لگائی نہ صرف کلیدی، سلیمانکی ہیڈ ورکس کو محفوظ رکھا اور دشمن کو اس کے علاقے میں لڑنے پر مجبور کیا مزید برآں اس کے مورال پر بھی کاری ضرب لگائی اس میں افسروں کی قائدانہ صلاحیت کا بھی ہاتھ تھا۔ لیکن اصل فرق افسروں اور جوانوں کے جذبے اور عزم سے پڑا۔ دشمن کے بنکر مضبوط تھے اور ہمارے ارادے۔ اس معرکے میں ہمارے تقریباً ساٹھ جوان اور افسر شہید ہوئے اور سو سے زیادہ زخمی شہیدوں میں میجر شبیر شہید نشان حیدر، ستارۂ جرأت بھی شامل تھے اس معرکے میں شہادت کے بعد انہیں نشان حیدر کے سب سے بڑے جنگی اعزاز سے نوازا گیا۔ اس سے پہلے ۱۹۶۵ء میں جب وہ اسی کمپنی میں سیکنڈ لیفٹیننٹ تھے انہیں ستارۂ جرأت دیا گیا تھا۔ پاکستانی افواج میں یہ دو بڑے اعزاز کسی اور کے پاس نہیں۔

اس معرکے میں کیپٹن طلعت عمر کو ستارۂ جرأت اور سیکنڈ لیفٹیننٹ فاروق افضل کو تمغہ جرأت دیا گیا۔ ان افسروں کے علاوہ کئی اور جے سی اوز اور این سی اوز کو بھی ستارۂ جرأت اور تمغہ جرأت سے نوازا گیا۔ اس طرح ہماری دو کمپنیاں پاکستان آرمی کی سب سے زیادہ اعزاز یافتہ کمپنیوں میں شمار ہوتی ہیں۔

مصنّف کا تبصرہ

معرکہ سلیمانکی میں داؤد الرحمان کی کارکردگی کا معیار کیا تھا اس کا اندازہ اس فرمان سے ہوتا ہے جو ان کو تمغہ جرأت عطا کرنے کے موقعہ پر جاری کیا گیا۔

تمغۂ جرأت کا فرمان

کیپٹن داؤد الرحمان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ تین اور چار دسمبر ۱۹۷۱ء کی درمیانی شب کو اپنے ٹاور سے ۶ ایف ایف کو صادقیہ پوسٹ پر حملہ کرنے میں توپ خانے کی مدد بہم پہنچائیں۔ اس ذمہ داری کو انہوں نے بہت ہی قابل تحسین طریقے سے پورا کیا۔ داؤد الرحمان مسلسل ۴۸ گھنٹے اپنا کام کرتے رہے اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز کو صورت حال سے برابر باخبر رکھا۔ وہ اگر چاہتے تو ٹاور کے اندر سے بھی تھوڑا بہت مشاہدہ کر کے نشانوں پر فائر کرا سکتے تھے۔ اور لڑائی سے متعلق ضروری معلومات ہیڈ کوارٹر کو دے سکتے تھے لیکن محض بہتر مشاہدہ اور فائر کنٹرول کے لئے اس افسر نے ٹاور کی کھلی چوٹی پر بیٹھنے کو ترجیح دی حالانکہ ایسا کرنا سخت خطرناک تھا۔ چونکہ دشمن کا توپ خانہ شدید گولہ باری کر رہا تھا۔ اور ہوائی حملے بھی جاری تھے۔ اپنے ذاتی تحفظ کی پرواہ کئے بغیر اس افسر نے اس پر خطر جگہ ڈٹے رہنے پر اصرار کیا اور بہت صحیح فائر سپورٹ دلوا کر پلٹن کو دشمن کے کئی جوابی حملے پسپا کرنے میں انتہائی کارگر مدد دی۔

۷ دسمبر کی شام کو داؤد ۶ ایف ایف کی سب سے اگلی کمپنی سے جا ملے۔ اور اس طرح اس پلٹن کو مفتوحہ پوزیشنوں پر قبضہ جمائے رکھنے میں ضروری مدد دی۔ ۸ اور ۹ دسمبر کی درمیانی شب کو دشمن نے بکتر بند دستوں، انفنٹری اور توپ خانے سے ایک بھرپور جوابی حملہ کیا۔ شدید گولہ باری سے بریگیڈ کے مواصلات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس صورت میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو مکمل طور پر اس معلومات پر انحصار کرنا پڑا۔ جو یہ افسر بڑی خوبی اور تیزی سے بہم پہنچا رہا تھا۔ یہ افسر وائرلیس پر بذات خود بولتا رہا اور توپ خانے کی یا ہوائی مدد ٹرپس کو دلواتا رہا۔ لمحہ بہ لمحہ بدلتی لڑائی کی صورت حال پر اس افسر کا رواں تبصرہ ایک سننے کی چیز تھی۔ اس رواں تبصرے سے اس افسر نے لڑائی کے نازک لمحوں میں رہنمائی کی اور دشمن پر بروقت اور صحیح نشانہ پر فائر کروا کر دشمن کے ایک بڑے حملہ کو ناکام بنوا دیا۔ جس میں اس کا شدید جانی اور سامانی نقصان ہوا۔

میدان جنگ میں داؤدالرحمان کا رویّہ اور کارکردگی سب کے لئے ہمت افزائی کا باعث بنی رہی۔ اس تمام عرصے میں اس افسر نے اپنے ذاتی تحفظ کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی۔ اور جہاں فرض کی لکیر ختم ہوتی تھی اس سے بہت آگے جاکر اپنی ذمہ داری کو پورا کیا۔

اس افسر کو ۹ دسمبر کو اپنی نئی یونٹ میں نوشہرہ جانا تھا لیکن اس دلیر نے میدان کارزار کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اور اعلیٰ افسروں سے درخواست کی کہ اسے اسی جگہ لڑائی لڑتے رہنے کی اجازت دی جائے اس دلیری جاں نثاری اور جوش و جذبے سے اپنے فرض کو انجام دینے کے لئے کیپٹن داؤدالرحمٰن کے لئے ستارۂ جرأت کے اعزاز کی سفارش کی جاتی ہے: یہ الفاظ بریگیڈ کمانڈر کے ہیں۔ ۱۵ اپریل ۱۹۷۲ء کو تمغہ جرأت عطا ہوا۔

شخصیت کا تجزیہ

کوئی کارنامہ چھوٹا ہو یا بڑا ظاہر ہے کہ محض اتفاق نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے ایک شخصیت ہوتی ہے۔ اور شخصیت کا تانا بانا انسان کی قدروں اور اندازِ نظر سے بُنا جاتا ہے۔ اس لئے ہم نے داؤدالرحمان سے پوچھا آپ کی قدریں اور رویّے کیا ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ کی سوچ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں داؤد نے کہا۔

میرے نزدیک صرف ترقی کرنا (عہدے وغیرہ کے لحاظ سے) یا کثیر دولت جمع کر لینا کوئی ایسا کارنامہ نہیں جس پر انسان فخر کرے یا مطمئن ہو۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ انسان نے دنیا کو کیا دیا۔ اگر انسان دنیا کو کچھ دے نہ سکے، کوئی قابلِ ذکر خدمت نہ کر سکے تو عہدہ اور دولت اگر ہو بھی تو ہیچ ہے۔ اسی لئے میں عزت اور شہرت کو عہدے اور دولت پر ترجیح دیتا ہوں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہیرو میدان جنگ کا محتاج نہیں ہوتا۔ اصل ہیرو تو وہ ہے جو زندگی میں ہیرو ہو میری بھی اندرونی خواہش یہی ہے اگر دنیا چھوڑنے سے پہلے میں ملک و قوم کے لئے کچھ کر سکوں میدان جنگ میں یا کارزار زندگی میں ـــــ تو میں سمجھوں گا۔ کہ زندگی اکارت نہیں گئی۔ یہ تمغہ جرأت تو میرے لئے صرف ایک اشارہ ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں!

غالب نے کہا تھا کہ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے اس میں کوئی شک نہیں انتخاب خواہ وہ کسی چیز کا ہو انسان کو ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ اس لئے ہم نے داؤد سے قصداً پوچھا کہ وہ انسانوں میں اپنا انتخاب بتائیں۔ یعنی انہیں کن لوگوں نے متاثر کیا۔ داؤد نے بے ساختہ کہا۔

میں اس سوال کے جواب میں تین متضاد شخصیتوں کا ذکر کروں گا سب سے پہلے مدر ٹریسا کا نام لوں گا یہ عظیم خاتون ایک عیسائی راہبہ ہیں جو چالیس سال سے کوڑھ کے مریضوں کی مسیحائی میں مصروف ہیں۔ کوڑھ کے مریض سے اس کے اپنے عزیز رشتے دار بھاگتے ہیں۔ چالیس سال تک ہزاروں ایسے بدنصیبوں اور مجبور انسانوں کی دیکھ بھال کرنا اور ان میں سے بیشتر کو نارمل زندگی گزارنے کے قابل بنا دینا اور یہ سب کچھ بغیر کسی صلے یا ستائش کی تمنا کے کرنا بہت بڑا اور صحیح معنوں میں عظیم کارنامہ ہے۔ میں مدر ٹریسا کے جذبے قوّت ارادی اور عزم سے بہت متاثر ہوں۔

اپنے زمانے کے عسکری لیڈروں میں سے، میں ونسٹن چرچل کا مداح ہوں یہ شخص ہند و پاکستان کی آزادی کا دشمن ضرور تھا اور سخت قدامت پسند بھی۔ لیکن اپنے ملک کے لئے اس نے بہت کچھ کیا۔ وہ بڑے عزم اور حوصلے کا انسان تھا دوسری جنگ عظیم میں انگلستان کی ڈوبتی کشتی کو اس نے بچایا۔ ناکامی و مایوسی کے موقعہ پر بھی سر کو اونچا رکھنا اسی کا کام تھا۔ میری تیسری پسندیدہ شخصیت چین کے وزیر اعظم چو این لائی ہیں جو تمکنت و وقار کا مجسمہ تھے ان سے زیادہ حلیم اور سلیم الطبع شاید ہی کوئی سیاست دان ہوا انہوں نے اپنے ملک کی بڑی خدمت کی اور ثقافتی انقلاب کے طوفانی دور میں بھی اپنی میانہ روی کو باقی رکھا اس بنا پر میں ان کی قدر کرتا ہوں میں ہر اس شخص کی قدر کرتا ہوں جو چراغوں کی نہیں ستاروں کی تمنا کرتا ہو۔ جو انسانوں کی عزّت کرتا ہو، ان سے محبّت کرتا ہو۔

ایک صاحب نظر مبصّر کا تبصرہ

آخر میں ہم میجر داؤد کے بارے میں ان کے اعلیٰ کمانڈر میجر جنرل امیر حمزہ خان ہلال جرأت، ستارۂ

جرأت کے تاثرات نقل کرتے ہیں۔ جنرل حمزہ لکھتے ہیں۔

"سلیمانکی کے معرکے میں، داؤدالرحمان، کیپٹن طلعت کی کمپنی کے ساتھ توپ خانے کے آبزور تھے توپ خانے کے دوسرے دیدبان یا تو شیل شاک کا شکار ہو گئے یا دشمن کے دباؤ سے مجبور ہو کر اپنی جگہیں چھوڑ بیٹھے۔ لیکن داؤد آخر تک بہت ہی اہم توپ خانے کے فائر سے آخر تک طلعت کی کمپنی کی مدد کرتے رہے یہ محض فرض کی ادائیگی کا معاملہ نہیں تھا یہ اس سچی اور پر جوش دوستی کا کرشمہ تھا جو ان دو افسروں کے درمیان پہلے سے موجود تھی۔ اس طرح کی رفاقت اور دوستی کی کوئی اور مثال میرے ذہن میں نہیں ایسے باحوصلہ اور جری، کھرے افسروں کی قدر و قیمت کا اندازہ میدان جنگ میں اس وقت ہوتا ہے جب باد مخالف تند و تیز ہو۔ ورنہ زمانہ امن میں ایسے باصلاحیت اور جگر دار افسر، مہاجروں کو کمبل تقسیم کرنے کے کام پر مامور نظر آتے ہیں۔"

اس کتاب کے لئے یہ تاثرات قلم بند کرنے کے لئے ہم حمزہ صاحب کے کریمانہ تعاون کے لئے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

میجر منیر اکبر ستارۂ جرأت

پنجاب رجمنٹ

میجر منیر اکبر ستارۂ جرأت، پنجاب رجمنٹ

اپنے ذاتی تحفظ کی قطعاً پرواہ نہ کرکے، فرض کے ساتھ اپنی بھرپور لگن سے اور مثالی جرأت کا مظاہرہ کرکے، اس افسر نے دوسروں کے سامنے ایک قابل تقلید مثال پیش کی۔ اس معرکے میں دو ایسے موقعے آئے جب اس نوجوان افسر نے انتہائی خطرناک حالات میں اپنی زندگی کو داؤں پر لگایا اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا۔ اس مثالی جرأت و استقامت کا مظاہرہ کرنے پر میں اس افسر کے لئے ستارۂ جرأت کی سفارش کرتا ہوں۔

—— یہ ستارۂ جرأت کے سفارش نامے کے آخری الفاظ ہیں جو ۵ا؍ جنوری ۱۹۷۲ء کو راجستھان سیکٹر میں فرسٹ پنجاب کے کمانڈنگ افسر نے اپنی بٹالین کی اے کمپنی کے کمپنی افسر کے لئے لکھے۔ اس نوجوان کمپنی افسر کا نام سیکنڈ لیفٹیننٹ منیر اکبر تھا۔ جسے یونٹ میں آئے چند مہینے ہی ہوئے تھے۔ ان سیکنڈ لیفٹیننٹ منیر اکبر جو اب تیر سے میجر ہیں۔ کی داستان حیات کے چند اوراق پیش کئے جاتے ہیں۔

آباؤ اجداد اور خاندانی پس منظر

میجر منیر اکبر کا نسلی تعلق کھتر راجپوتوں کی اس شاخ سے ہے جو ضلع اٹک کی تحصیل پنڈی گھیب کے ایک گاؤں پنڈ سلطانی میں عرصہ دراز سے آباد ہے ان کے آباؤ اجداد کا پیشہ بھی زیادہ سپہ گری رہا ہے۔ ان کے دادا، تایا، والد، بڑے بھائیوں سب کا تعلق فوج سے رہا ہے۔ ان کے دادا اور تایا دونوں اپنے علاقے کے مشہور شہسوار تھے۔ اس شوق نے انہیں کیولری میں پہنچایا انہوں نے اپنے وقتوں میں رسالے میں بڑی آن بان سے نوکری کی۔ ہر خاندان کے مخصوص رویے ہوتے ہیں۔ جو نسلاً بعد نسلاً چلتے ہیں۔ پنڈ سلطانی کے اس کھتر خاندان کی روایت رہی ہے کہ بات کھری کی جائے جو دل میں ہو وہ منہ پر ہو۔ اس روایت کو منیر اکبر کے والد محترم صوبیدار میجر اکبر خان صاحب نے بھی قائم رکھا اور اب ان کی اولاد ان کے نقش قدم پر ہے۔

کاروان زندگی کی پہلی منزل

منیر اکبر اپنے آبائی گاؤں پنڈ سلطانی جسے وہ پیار سے کنگسٹن کہتے ہیں ۱۹۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسی گاؤں میں حاصل کی۔ منیر کے بچپن کے بارے میں ان کے والد محمد اکبر خان لکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد کی دولت سے نوازا ہے۔ اللہ نے چھ بیٹے دیئے۔ سب ایک سے ایک بڑھ کر۔ ماں باپ کے لئے بڑا مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد میں تفریق کریں میرے لئے تو سب ہی اچھے ہیں۔ اب چونکہ بات منیر کی ہو رہی ہے وہ بھی اس کے ستارۂ جرأت کے پس منظر میں۔ اس لئے میں اس کی دو ایک انفرادی خصوصیات کا تذکرہ کروں گا۔ پہلے تو یہ کہ یہ شروع سے سنجیدہ طبیعت تھا پڑھنے کا شوق تھا۔ اس کو کبھی ٹھیلنے کی ضرورت پیش نہیں آئی دوسرے یہ کہ یہ جبر و دھونس کو کبھی قبول نہیں کرتا تھا۔ اس کو خواہ مخواہ لڑائی جھگڑا کرنے کی عادت نہیں تھی۔ چپ چاپ

اپنا کام کرتا رہتا تھا۔ لیکن اگر کوئی لڑکا یا ساتھی اس پر رعب جمانے کی کوشش کرتا یا کوئی زیادتی کرتا تو پھر شیر کی طرح بپھر جاتا تھا۔ پھر چھوٹے بڑے کو نہیں دیکھتا تھا۔ تیسرے میں نے یہ دیکھا کہ بچپن میں بھی اپنی ایک رائے ایک معیار رکھتا تھا۔ اور کام اپنے طریقے سے کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور بعض اوقات اپنی پسند ناپسند پر بھی ضد کرجاتا تھا۔ اور جب ضد پر آجاتا تھا تو پھر اس کو سنبھالنا مشکل ہوجاتا تھا۔ بہت صحت مند اور سمارٹ تھا۔ اور پڑھنے لکھنے میں بھی طاق۔ شروع میں دو چار جماعتیں اس نے پنڈ سلطانی میں پڑھیں پھر ہر اسٹیشن پر میں نے اسے اپنے ساتھ رکھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب یہ چوتھی جماعت میں تھا تو اس کو اس سال کے لئے اسکول کا بہترین لڑکا چنا گیا تھا۔ اپنے بچپن کی تعلیم و تربیّت کے بارے میں منیر اکبر لکھتے ہیں۔ ہمارے گھرانے کی روایت سپہ گری رہی ہے ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے بیشتر اعزا و اقربا فوج سے وابستہ رہے یا وابستہ ہیں۔ اس پس منظر میں ہمارے ابّا جان نے اپنی روشنیٔ طبع سے اپنے گھر میں اپنے ہاتھوں سے دیئے جلائے۔ وہ کوئی پیشہ ور استاد نہیں ہیں لیکن گھر کو انہوں نے سکول بنا رکھا تھا۔ گھر میں شام کو باقاعدہ کلاس سی لگتی تھی ایک چھوٹے سے تختہ سیاہ کا انتظام بھی تھا۔ دیواروں پر نقشے اور چارٹ لٹکتے رہتے تھے۔ وہ سہ پہر اور شام کو مغرب کے بعد تک بلاناغہ سب بھائیوں کو پڑھاتے تھے کسی کو حساب کسی کو انگریزی اور کسی کو اردو، ہماری بیٹھک پر کسی اسکول کا گمان ہوتا تھا۔ ہینڈ رائٹنگ کو سنوارنے کا تو جیسے انہیں جنون سا تھا۔ انگریزی اور اردو کا خط ہم سب بھائیوں کا بہت پختہ اور خوبصورت ہے اس کا کریڈٹ اور ہم سب بھائیوں کی تعلیمی کارگزاریوں کا سارا کریڈٹ ابّا جان کو جاتا ہے۔

بعض لوگ پڑھتے بھی بہت ہیں اور علم بھی خاصا حاصل کرلیتے ہیں لیکن انہیں علم سے محبّت نہیں ہوتی۔ علم سے ان کا تعلق کاروباری ہوتا ہے۔ جوں ہی امتحان پاس کیا یا کورس ختم ہوا وہ کتاب بھی بند کردیتے ہیں والد صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے اندر علم کی محبّت، علم کا شوق پیدا کیا۔ چنانچہ کم از کم میرے لئے مطالعہ زندگی کی ایک ضرورت بن گیا ہے۔

کالج میں داخل ہونے سے پہلے دو سال میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول کالج روڈ راولپنڈی میں بھی گزارے وہاں عربی کے ایک استاد تھے حجازی صاحب ان کی شخصیت کو نہ بھلا سکتا ہوں اور نہ ان کے احسانات کو فراموش کر سکتا ہوں وہ عربی پڑھاتے تھے وہ عربی سبق تو یاد نہیں رہے لیکن مذہب سے جس طرح انہوں نے تعارف کرایا مذہبی قدروں کو جس طرح انہوں نے برت کے دکھایا اس کا لازوال نقش میرے ذہن پر ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ واعظ اور ناصح لوگوں کی غلطیوں اور فروگذاشتوں پر سخت رویّہ اختیار کر لیتے ہیں کچھ نہیں تو لہجہ ہی سخت ہو جاتا ہے لیکن وہ سراپا شفقت تھے۔ خطا کاروں کے ساتھ بھی شفقت ہی سے پیش آتے تھے۔ میں اسکول میں دو برس رہا میں نے کبھی انہیں طیش میں آتے یا مارتے پیٹتے نہیں دیکھا حالانکہ ایسے بہت سے موقعے آتے رہتے تھے کہ وہ درشت رویّہ اختیار کرتے تو حق بجانب ہوتے تحمل وضبط ان پر ختم تھا اور ایسا بھی نہیں تھا کہ بالکل اللہ میاں کی گائے ہوں۔ سختی کے موقعہ پر سختی بھی کرتے تھے۔ اصولی معاملے میں اچھے سے اچھے لڑکے کی بھی رعایت نہیں کرتے تھے معمولی سی معمولی کوتاہی کو نوٹ ضرور کرتے تھے لیکن لاتعلقی کے ساتھ نہیں تعلق کے ساتھ یہی ان کا کمال تھا اسی لئے آج میں انہیں یاد کر رہا ہوں اور انہیں اپنے محسنوں میں شمار کرتا ہوں۔ پڑھانے والے بہت ہوتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں معلم و مربّی کوئی کوئی ہی ہوتا ہے۔

کالج کے شب و روز

منیر اکبر کالج میں ۱۹۶۴ء کو آٹھویں درجے میں داخل ہوئے اور ۱۹۶۹ء میں ایف ایس سی کر کے کالج کو خیر باد کہا۔

ملٹری کالج میں اپنے دورِ تعلیم کے بارے میں منیر اکبر لکھتے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ کالج میں داخل ہونے سے پہلے تعلیم میں مجھے جو امتیازی حیثیت حاصل تھی کالج میں آنے کے بعد میں نے اسے برقرار رکھا۔ یہاں یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ کلاس میں

پہلی دوسری یا حد سے حد تیسری پوزیشن حاصل کرنے میں مجھے کوئی خاص کاوش نہ کرنی پڑتی تھی ایک مرتبہ غالباً دسویں درجے میں جب میری کلاس میں پانچویں پوزیشن آئی تھی تو مجھے خاصی حیرانی ہوئی۔ جیسے کوئی انہونی بات ہوگئی ہو اصل میں اباّ جان نے میری تعلیمی بنیادوں کو اتنا مضبوط بنا دیا تھا کہ اسکول اور کالج میں مجھے تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ جب تک میں کالج میں رہا مجھے سال بہ سال تعلیمی انعامات سالانہ جلسہ تقسیم انعامات کے موقعہ پر ملتے رہے۔

کھیلوں کے بارے میں یہ کہ کھیل کھیل لیتا تھا۔ یونہی واقعہ یہ ہے کھیلوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ غیر نصابی سرگرمیوں کے ذیل میں یوں ہے کہ میں سی سی پی یعنی کلائمبرز کلب آف پاکستان کا اپنے کالج کے زمانے میں رکن رہا اور ان کی طرف سے دیا ہوا ایک سرٹیفکیٹ میرے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ کالج کی سطح پر صرف ایک مرتبہ ڈرامے میں حصّہ لیا اور دو مرتبہ تقریروں میں۔ انگریزی میں فی البدیہہ تقریر کے مقابلے میں کالج میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ معلومات عامہ کے مقابلے میں کالج بھر میں اوّل رہا۔ الامان! یادیں ہیں کہ سمندر کی لہروں کی طرح امنڈی چلی آتی ہیں۔ ان یادوں کو الگ الگ گننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ان لہروں کو علیحدہ علیحدہ کرنا۔ نک نیم جو چپک گیا تھا سمائیلنگ فیس تھا۔ کالج میں نظم و ضبط ایسا تھا کہ کوئی سی بات بھی "شرارت" کے ضمن میں آجاتی تھی۔ بہرحال سب پہ گرفت نہ ہوتی تھی۔ اب سمجھتا ہوں کہ ہمارے استادوں کو معلوم سب ہوتا تھا انکی چشم پوشی کا مقصد محض یہ تھا کہ ہماری طفلانہ جرأت مندی کی حوصلہ شکنی نہ ہو۔

زیادہ شرارتیں کالج کے مشہور ریپ پیریڈ سے وابستہ تھیں۔ مجھ سمیت اکثر کیڈٹ اسے اپنے فارغ اوقات میں ایک بے جا مداخلت کا درجہ دیتے ہوئے کسی نہ کسی طور اس کا دورانیہ مختصر کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ چوکیدار کی نظر بچا کر وقت سے پہلے چھٹی کی گھنٹی بجا دینا۔ کالج کے لان میں پھیلے ہوئے قدیم درختوں میں شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ دینا اور کلاسیں ویران ہونے کا تماشا دیکھنا کالج کے باہر کھیتوں سے موسمی سبزیاں اور کمانڈانٹ کے گھر سے تکیے کے غلافوں میں مالٹے

بھر کے لانا وغیرہ دل پسند شرارتیں تھیں۔ کبھی کبھی اس مشغلہ میں دلچسپ غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ مثلاً ایک مرتبہ بڑے شوق سے ککڑیاں اور کھیرے تکیے کے غلافوں میں بھر کر لائے گئے او سب کی نظریں بچا کے ایک کونے میں چارپائی کے نیچے ڈال دیئے گئے جب مال غنیمت بانٹنے وقت آیا تو دن کی روشنی ہی میں پتہ چل سکا کہ بہت سے کدو اور توریاں بھی اس میں شامل تھیں۔ پانی پھینکنا ہمارا اور ہمارے گروہ کا ٹریڈ مارک تھا۔ سردیوں کا زور ہو رضائیوں میں لوگ گھسے ہوں فلم ابھی ختم ہوئی ہو اور واپسی پر سارا بستر بھیگا ہوا۔ اس میں کئی جدت طرازیاں کی گئی تھیں۔ اور آخری جدت یہ تھی بندہ سویا ہوا ہو اور اس کا بستر اس طرح بھگو دیا جاتے کہ آخر تک اسے معلوم نہ ہو۔

کالج کی کیا کیا بات یاد کروں۔ کالج میں گزرا ہوا ایک ایک دن یاد آتا ہے۔ ضابطے سخت تھے۔ اور ان کو توڑنے کی شعوری کوشش نہ کرنے کے باوجود ان آبگینوں کو کہیں نہ کہیں غیر شعوری طور پر ٹھیس لگ ہی جاتی تھی۔ نوعمری اور پھر نوجوانی میں نئی نئی حرکات کو جی چاہتا ہے اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ نوجوانی ایک طرز احساس کا نام ہے۔ نویں درجے ہی سے مجھے گھومنے پھرنے یا پھر اکناہیں پڑھتے رہنے کا ازحد شوق ہو گیا تھا جسکی وجہ سے لائبریری کی شاید ہی کوئی کتاب پڑھنے سے رہ گئی ہو گھومنے پھرنے کا شوق بس عود کر آیا تھا کیونکہ بچپن میں اس مشغلے کی وجہ سے کئی بار پٹائی تک نوبت آ گئی تھی۔ پانی کی اونچی ٹینکی پر اوپر تک چلے جانا اور اس کی چھت سے چاروں طرف کا مشاہدہ ایک عام مشغلہ تھا۔ یہ ٹینکی کھیل کے بڑے میدان کے کنارے واقع تھی۔ کھیل سے یاد آیا کہ روزانہ پی ٹی کا پریڈ صبح سویرے ہوتا تھا اور اس کے لئے بہت تردد کر کے اٹھنا پڑتا تھا۔ لیٹ ہونے کے خوف سے ہم سب پی ٹی کا ڈریس پہن کر سوتے تھے اور شاید لباس بدلنے کا اور تیار ہونے کا عالمی سپیڈ ریکارڈ اپنے کالج سے کبھی باہر نہ گیا ہو گا۔ ایک صبح جب یونہی لپک کر تیار ہوتے اور پی ٹی میدان میں وارد ہوئے تو مجھے ایک جوتا غیر ضروری طور پر تنگ محسوس ہوا۔ پریڈ سے باہر جانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ چار ناچار اسی تکلیف میں پی ٹی کا پریڈ گزارا۔ واپس کمرے میں آ کر جوتا جو اتارا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک غریب مینڈک بری طرح کچلا جا چکا تھا۔ جلدی میں مرتے مینڈک کو نکالے بغیر

جو تاپہن لیا تھا۔ایک بار اپنے بہت گہرے دوست غلام محمد محترم کے ساتھ تہ کی سیر کو گیا وہاں مویشیوں کو پار کرانے کے لئے ایک فیری لگائی گئی تھی ہم نے اس کے ذریعے نہر پار کرنے کی ٹھانی کشتی پانی میں دو رسّوں کے سہارے قائم تھی ۔ اور اس کے کسی طرف چلنے کی شرط یہ تھی کہ یہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ایک زاویہ بنائے تاکہ پانی اسے دھکیل سکے۔ہم فیری پر بیٹھے پانی کا دباؤ برابر ہونے پر یکایک رک گئی بلکہ اٹک کے رہ گئی۔ اسے چلانے کے لئے ضروری تھا کہ ایک طرف سے مزید رسّہ ڈھیلا کیا جائے یہ کیسے ہو کہ بہاؤ کے خلاف اتنی بڑی فیری کو پہلے کھینچ کر رستے میں سلیک لایا جائے اور پھر اسے اس ڈنڈے پر سے کھولا جائے۔جس پہ یہ لپٹا رہتا تھا۔شام ہو رہی تھی اور ہماری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی نہر کے اطراف میں ٹریفک بھی کم ہو چلی تھی بالآخر ایک بندۂ خدا کو شور مچا کے متوجہ کیا۔ وہ رکا تو اسے کنارے پر سے کوئی اینٹ وغیرہ پھینکنے کو کہا جس کی مدد سے بڑی مشکل سے رسہ (دراصل یہ زنجیر تھی) ڈھیلا کیا گیا۔اور ہم انچ انچ رکتے ہوئے کنارے پہ آ لگے۔

کھاریاں میرے ماموں تھے چھٹی کے دن ہم کرائے پہ سائیکل لے کے ان کے گھر چلے جاتے تھے اور ایک گھنٹہ سستانے کے بعد واپس آ جاتے تھے۔کبھی پیدل بھی کھاریاں تک ہو آتے تھے۔یاد رہے کہ یہ کوئی بیس بائیس میل کا چکر بنتا ہے۔ایک دفعہ میں نے پنڈی تک سائیکل پہ جانے کی ٹھانی دو چھٹیاں تھیں اسلئے فیصلہ کیا کہ ایک دن پنڈی جاؤں گا اگلے روز واپس آجاؤنگا۔مئی کا مہینہ تھا چنانچہ صبح صبح روانہ ہو گیا۔پنڈی تک سارا رستہ چڑھائی کا رہا۔خصوصًا دینہ سے تہ کی بل کا راستہ بارہ میل لگاتار چڑھائی تھی جب پہلی دفعہ اس چڑھائی پہ رُکا تو سامنے ایک فوجی کنوائے میں میرے سب سے بڑے بھائی (میجر نسیم اکبر مرحوم) ٹلہ فائرنگ کے لئے آتے دکھائی دیئے انہوں نے میرا کافی حوصلہ بڑھایا۔ پھر گوجر خان رکنے کے بعد پنڈی جا کر دم لیا ۔شام کو پنڈی کی سیر کی اور اگلے روز صبح سویرے واپس سائیکل پر سرائے عالمگیر روانہ ہو گیا۔واپسی پر شاید ایک مرتبہ ہی رک کے چائے پی۔دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اورنگ زیب ہاؤس سے گزر ہوا تو وہاں کے ہاؤس ماسٹر

(صدیقی صاحب) کچھ ذہنی امتحان وغیرہ اپنے لڑکوں کا لے رہے تھے۔ مجھے بھی بلالیا اور کہنے لگے آؤ دیکھتے ہیں تھکاوٹ کا تم پہ کتنا اثر ہوا ہے۔ مجھے اور ان کو بھی بہت حیرت اور مسرت ہوئی کہ میرا اسکور وہاں موجود سب طلباء سے زیادہ رہا۔ اس اورنگ زیب ہاؤس میں ہمارے ایک کلاس فیلو تھے جو جنات سے بہت ڈرتے تھے۔ اس کمزوری کا علم کسی نہ کسی طرح دیگر دوستوں کو ہو گیا۔ ان دنوں جن بھوت بن کر وہمی دوستوں کو ڈرانا بہت مزے کی شرارت ہوتی تھی۔ سوان کو کا منصوبہ بنایا گیا۔ جب یہ رات کو سو گئے تو کیچڑ بھرے جوتوں سے ان کے بستر سے لے کر روشن دان تک پاؤں کے نشان بنائے گئے۔ وہاں ایک دوست کو خوفناک آوازیں نکالنے پہ مامور کیا گیا اور دو تین بھوت منہ میں چھوٹی ٹارچیں دبائے۔ دانتوں کی جگہ مالٹے کا چھلکا کاٹ کے لگائے ان کی پائنتی کی طرف براجمان ہو گئے اصل کارروائی کیسے ہوئی یہ نہ پوچھئے لیکن یہ صاحب بھوت بھوت چلاتے بھاگے اور کئی روز اس بستر پہ سونے سے انکاری رہے جس سے بقول ان کے بھوت روشن دان کی طرف گیا تھا۔ ہمارے ایک کمانڈانٹ ازلی کنوارے تھے پنڈی انٹر کانٹی نینٹل میں جا کے ٹھہرے تو بہت متاثر ہوئے۔ خصوصاً ان کی لانڈری سروس اور برتن بہت پسند آئے تھے چنانچہ کالج کے تمام میسوں کے لئے اس سٹائل کی کراکری بنوائی گئی اس کراکری میں چاء کی پیالیوں کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ خاصی موٹی بنائی گئی تھیں اور بقول ایک صاحب کے چائے پیتے ہیں تو ان پیالیوں سے ہونٹ ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔

پی۔ ایم۔ اے سے راجستھان کے ریگزاروں تک

پی ایم اے سے راجستھان کے محاذ تک کے واقعات کے متعلق میجر منیر اکبر لکھتے ہیں۔

اواخر ۱۹۶۹ء سے تقریباً دو سال میں پی ایم اے میں ۴۵ لانگ کورس میں زیر تربیت رہا یہ تمام عرصہ میں نے طارق کمپنی میں گزارا کورس کے آخری ٹرم میں پلاٹون سارجنٹ رہا۔ پی ایم اے میں مجھے ایک ہی قابل ذکر امتیاز حاصل ہوا اور وہ یہ کہ میں نے پی ایم اے کا مشہور رکاوٹوں کا کورس ایک ریکارڈ وقت

میں مکمل کیا تھا۔ اس کے لئے مجھے ایک چاندی کا میڈل عطا ہوا تھا۔ ۲۹ راگست ۱۹۷۱ء کو میں پی ایم اے سے پاس آؤٹ ہوا۔ اور آباتی پلٹن فرسٹ پنجاب سے وابستہ کیا گیا۔

جب میں ستمبر ۱۹۷۱ء کے پہلے ہفتے میں اپنی یونٹ پہنچا تو اس زمانے میں یہ یونٹ رحیم یار خان میں تھی۔ مجھے اے کمپنی میں کمپنی افسر لگایا گیا اور چند ماہ بعد میں نے اسی حیثیت سے راجستھان سیکٹر میں لڑائی میں حصہ لیا۔ لڑائی میں اپنے کردار کے بارے میں کچھ کہنا میرے لئے مناسب نہیں۔ اس کی تفصیل کے لئے میرے ستارۂ جرأت کا فرمان دیکھا جاسکتا ہے۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

جنگ ستمبر کے دوران پی اے ۱۲۹۵۷ سیکنڈ لیفٹیننٹ محمد منیر اکبر فرسٹ پنجاب کی اے کمپنی کے کمپنی آفیسر تھے۔ ۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اس کمپنی کو حکم دیا گیا کہ وہ ۳۸ کیولری کے ساتھ مل کر آگے بڑھے اور لانگن والا پوسٹ پر قبضہ کرلے۔ اس حکم کی تعمیل میں اے کمپنی آگے بڑھی اور ۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہندوستانی علاقے میں نو میل اندر جاکر کھارو نار کے مقام پر دفاعی مورچہ بندی میں مصروف ہوگئی۔

۶ دسمبر کو ۱۰ بجے دشمن کے ایک ٹینک اسکواڈرن نے اس کمپنی پر حملہ کیا۔ دفاعی اعتبار سے یہ کمپنی بہت غیر محفوظ حالت میں تھی۔ اس کا سامنے کا رخ ضرورت سے زیادہ پھیلا ہوا تھا اور کمپنی کے دونوں بازوؤں پر جو پوزیشنیں تھیں وہ بھی نفری کی کمی کی وجہ سے خالی تھیں اس وجہ سے کمپنی کے دونوں بازو بھی غیر محفوظ ہوگئے تھے۔ دشمن نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دن کے سوا گیارہ بجے کمپنی کو دائیں بازو کی طرف سے گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔ اس خطرے کو بھانپتے ہوئے لیفٹیننٹ اکبر کو حکم دیا گیا کہ وہ دشمن کی اس پیش رفت کو فوری طور پر روکیں۔ لیفٹیننٹ منیر اکبر نے اپنے مختصر آدمیوں اور بہت کم ہتھیاروں سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہوئے چٹان کی طرح دشمن کی پیش قدمی روک دی۔

اس کے بعد انہیں اس پوزیشن سے واپس بلایا گیا اور شام کے چار بجے ان سے کہا گیا کہ وہ ٹینک شکار پارٹی کی قیادت کریں۔ دشمن کے ٹینک کمپنی کی پوزیشن سے چار سو گز سے بھی کم فاصلے پر دندناتے

پھر رہے تھے وہ شکاری چیتے کی طرح خندقوں کو پھلانگتے ہوئے ٹینکوں پر چڑھ دوڑے چار بج کر بیس منٹ پر دشمن ۶ ٹینکوں کا نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹنے لگا۔ لیکن منیر اب کہاں دشمن کو بچ کر جانے دینے تھے انہوں نے ایک ٹینک کے بہت قریب پہنچ کر خود اس پر ایک راکٹ فائر کیا اور اس کو تباہ کر دیا۔

۹ دسمبر کو مسیت داری کے مقام پر ایک یونٹ کے خوف و انتشار کی وجہ سے پیچھے ہٹنے کی وجہ سے پانچ بجے شام کے قریب بریگیڈ کا دایاں بازو کمزور پڑنے لگا۔ حقیقت میں دشمن کے ٹینکوں اور انفنٹری اور اے کمپنی کے درمیان کوئی نہ تھا۔ اسی یونٹ کے گہرائی میں متعین دستوں کے پیچھے ہٹ جانے سے اے کمپنی کا بازو بھی خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس نازک موقعہ پر سیکنڈ لیفٹیننٹ منیر کے سپرد ایک بار پھر یہ ذمہ داری کی گئی کہ وہ پیش قدمی کرتے ہوئے دشمن کے خلاف ایک ٹینک شکار پارٹی کی قیادت کریں۔ اے کمپنی نے بڑی ہمت سے حملہ آور دشمن کا حملہ روک تو لیا لیکن دشمن اس سے پہلے بٹالین کے دائیں بازو کا ایک حصہ پامال کر چکا تھا۔ لیفٹیننٹ منیر کو ٹینک شکار پارٹی کے ساتھ اس لئے بھیجا گیا تھا تاکہ وہ دشمن کو ہماری پوزیشن کے بازو تک پہنچنے سے باز رکھیں۔ اس طرح دستوں کو محفوظ طریقے سے پیچھے ہٹنے کے لئے سانس لینے کا موقعہ مل جائے۔

دشمن کے بھاری توپ خانے کی شدید گولہ باری اور ٹینکوں کے شدید تر فائر سے میدان جنگ میں گرد اور دھوئیں کا طوفان آیا تھا دھول اور دھوئیں کے اس طوفان کی پرواہ کئے بغیر لیفٹیننٹ منیر دشمن کے ان پانچ ٹینکوں کے قریب پہنچ گئے جو ہماری پوزیشن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب وہ ٹینکوں سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھے تو انہوں نے خود سنا کہ دشمن کا ٹینک افسر ٹینکوں کو اس علاقے سے پیچھے ہٹنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ اس آواز سے انہوں نے ٹینکوں کی صحیح جگہ کا اندازہ لگایا اور خود اپنے ہاتھ سے ایک ٹینک پر راکٹ فائر کیا جس کی وجہ سے ٹینک کو فوراً آگ لگ گئی جبکہ دوسرے ٹینک بھی اس علاقہ سے تیزی سے نکل گئے۔ اس سے پہلے منیر اپنے لانچر کو دوبارہ بھرتے دشمن کے ٹینک گرد اور دھوئیں کے پردے میں غائب ہو گئے۔

لیفٹیننٹ منیر نے پھر بھی دشمن کے ٹینکوں کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال کے دشمن کی طرف بڑھتے رہے۔ جب دشمن نے دیکھا کہ یہ پرعزم مجاہد تو سر ہی پر آتے جاتے ہیں تو اس نے ہر قسم کا فائر کھول دیا۔ گولیوں اور گولوں کی اس طوفان کی پرواہ کئے بغیر لیفٹیننٹ منیر بڑے عزم کے ساتھ ایک اونچی پہاڑی کی طرف بڑھتے رہے ابھی دشمن ان کی مار کی زد سے ذرا دور ہی تھا کہ دشمن یکایک پیچھے ہٹا اور اپنے تحفظ کی خاطر اپنے دستوں کے پیچھے چلا گیا۔ اس تمام معرکے میں لیفٹیننٹ منیر نے اپنے ذاتی تحفظ کی ذرہ بھر پرواہ نہیں کی۔ منیر نے جس لگن اور جرأت کا مظاہرہ کیا وہ ہر ایک کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ تھا۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کی جس آمادگی کا مظاہرہ انہوں نے کیا اور دو مختلف موقعوں پر جس طرح یقینی موت کو دعوت دی اس جذبے اور جرأت کی بنا پر لیفٹیننٹ منیر اکبر کے لئے ستارۂ جرأت کی سفارش کی جاتی ہے۔

۱۵ اپریل ۱۹۷۲ء کو ستارۂ جرأت عطا کیا گیا۔

معرکہ پر تبصرہ

اس سوال کے جواب میں کہ اس معرکے کے دوران ان کے احساسات کیا تھے۔ کس چیز نے ان سے وہ کارروائی کروائی جس کے لئے انہیں ستارۂ جرأت کا مستحق سمجھا گیا۔ میجر منیر نے بہ کمال انکسار کہا میں اسے کارنامہ نہیں کہتا۔ جو کچھ میں ہوں اس کے حساب سے میں وہی کر سکتا تھا جو میں نے کیا۔ دیرو از نو آپشن۔ اس کے لئے میں نے کوئی خاص شعوری کاوش بھی نہیں کی۔ میدان جنگ میں جو فضا ہوتی ہے۔ اس میں شعور نہیں لاشعور کام کرتا ہے۔ کام ہو جاتے ہیں کئے نہیں جاتے۔ لڑائی میں اندرونی شخصیت بروئے کار آتی ہے۔ آدمی اندر سے جیسا ہو میدان جنگ میں وہی باہر آجاتا ہے۔ اب کسی کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان لمحات میں، مجھ پر کوئی خاص جذبہ طاری نہ تھا میں نے جو قدم اٹھایا بہت نارمل طریقے سے بہت پرسکون انداز سے اٹھایا اور اگر کوئی احساس تھا تو ہندوستانی ٹینکوں کی مسلسل گولہ باری کی وجہ سے ایک جھنجھلاہٹ کا سا احساس

تھا۔ مختصر یہ کہ یہ کام کرنا ہی تھا۔

ہمارے سوالنامے میں ایک سوال یہ بھی تھا۔ کہ آپ کو کن شخصیتوں نے متاثر کیا؟

اس کے جواب میں منیر اکبر لکھتے ہیں۔

آپ کے سوال میں "ہے" کا اضافہ میرا ہے اور اس طرح مجھے زیادہ اسکوپ مل جاتا ہے جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں یعنی ا، گو ، ں وقت نوعمری یا نوجوانی کا زمانہ تھا۔ عقل ابھی پختہ نہیں تھی (شاید اب بھی نہیں ہے) متاثر ہونے کا سلسلہ یوں ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ہر ایک تاریخی و غیر تاریخی ہستی سے شاید کچھ نہ کچھ تاثر لاشعوری طور پر قبول کیا ہے۔ میں نے ڈھیروں خود نوشت اور سوانح پڑھ ڈالی ہیں۔ ایک استاد نے کہا تھا یہ بہترین تربیت ہے۔ شعوری طور پر بہت کم کسی کی نقل کی ہے جہاں کسی کی کوئی خصوصیت اپنانے کی کوشش کی ہے تو اس بات کا خیال رکھتے ہوتے کہ وہ میری اندرونی ذات کے ساتھ ٹکرائے نہیں ظاہر بات ہے ہر ایک کی شخصیت یکتا ہوتی ہے اور اس میں ادھر ادھر کے زیادہ پیوند لگانا شخصیت کو ایک حد تک مجروح کر سکتا ہے۔ مجھے ان لوگوں کی کہانیاں زیادہ متاثر کرتی رہی ہیں جو اپنے عزم کی بنا پر اپنی زندگی کے نصب العین تک پہنچنے میں کامیاب رہے یہ بات اتنی آسان نہیں جتنی نظر آتی ہے۔ پہلے تو زندگی کا نصب العین متعین کرنا کوئی کھیل نہیں۔ میں نے بہت سے لوگوں کو تو اسی پہلی منزل میں ٹھوکر کھاتے دیکھا ہے پھر اگر ایمان و یقین میں ایک انچ کی کسر بھی رہ جائے تو انسان قربانی دیتے ہوئے ڈول سا جاتا ہے اور بغیر قربانی دیئے کچھ حاصل نہیں ہوتا دوسرے ان لوگوں خصوصاً ان جرنیلوں کی کہانیوں نے مجھے متاثر کیا ہے جو لڑائی ہارنے کے باوجود اپنی منتشر قوت کو دوبارہ مجتمع کر کے ، دوبارہ صف آرا ہوتے اور دشمن کو شکست دی۔ میرے نزدیک جرنیلی کا اصل کمال یہی ہے۔ جو جرنیل متواتر فتوحات حاصل کرتے رہے وہ قابل تحسین ضرور ہیں لیکن عین اسی وجہ سے مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ ایک ناکامی کی صورت میں ان کا ردعمل کیا ہوتا۔

زندگی کی قدریں

قدروں کی تشکیل وترتیب اور شکست وریخت کا عمل تو زندگی بھر کسی نہ کسی طور جاری رہتا ہی ہے ۔ بہر حال میں خدا خوفی، فرض سے لگن، اپنے خیالات کا بلا کم وکاست اظہار، حصول علم اور اپنی جڑوں کے ساتھ وفاداری کو بہت زیادہ اہمیّت دیتا ہوں میں ان ساتھیوں، اساتذہ اور بالا کمانڈروں کا بہت احسان مند ہوں ۔ جنہوں نے مجھے یہ راہیں متعیّن کرنے اور ان پہ چلنے میں مدد دی ۔ کچھ لوگ اس میں رکاوٹ بھی بنے ۔ ا ہدوں کے حسد سے بھی واسطہ پڑا لیکن کیا وہی اور کہا وہی جس کو صحیح سمجھا ۔ گو ایسا کرنے سے اکثر نقصان بھی اٹھانا پڑا ۔ مجھے زیادہ سمجھوتہ کرنا نہیں آتا ۔

مصنّف کا تبصرہ

منیر اکبر کا یہ آخری فقرہ قابل غور ہے جو اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتا وہ کوئی کوئی ہوتا ہے اس کے لئے بڑا حوصلہ اور بہت بڑا دل چاہیئے ۔ سمجھوتہ نہ کرنے کا خطرہ وہی مول لے سکتا ہے جسے اپنے اوپر ہی نہیں اپنی قدروں پر بھی اعتماد ہو ۔ جس کی نظر اس زندگی پر ہی نہیں اس زندگی سے بعد کی زندگی پر بھی ہو ۔ جو لوگ روزانہ کی زندگی میں سمجھوتہ نہیں کرتے وہ میدان جنگ میں بھی سمجھوتہ نہیں کرتے ۔

لیفٹیننٹ کرنل طلعت عمر ستارۂ جرأت

ایف ایف آر

لیفٹیننٹ کرنل طلعت عمر ستارۂ جرأت ایف ایف آر

جنگ دسمبر ۱۹۷۱ء میں سلیمانکی کے محاذ کی معرکہ آرائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے میجر جنرل (ریٹائرڈ) امیر حمزہ خان، ہلال جرأت، ستارۂ جرأت لکھتے ہیں۔ "اس نوجوان کمپنی کمانڈر کی کارکردگی اس نوعیت اور معیار کی تھی کہ اگر نشان حیدر صرف شہیدوں کو عطا کرنے کی روایت نہ ہوتی تو میں اس کے لئے نشان حیدر کی سفارش کرتا۔"

جنرل حمزہ کا اشارہ کرنل طلعت عمر ستارۂ جرأت کی طرف ہے جو سلیمانکی کے محاذ پر ایف ایف آر کی ایک ہراول کمپنی کی کمان کر رہے تھے کرنل طلعت کی داستان حیات کے کچھ اوراق پیش کئے جاتے ہیں۔

یہ مٹی کہاں کی ہے؟

خون میں اثر ہو یا نہ ہو تربیت میں اور ماحول میں ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے ہم فوجی اعزاز یافتہ

سے پہلے اس کے ماحول، اس کے آباؤ اجداد اس کی خاندانی روایتوں اور رویّوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ گویا پہلے مٹی اور جڑوں کی بات ہوتی ہے اس بارے میں طلعت لکھتے ہیں۔

میری مٹی مہنا سچا گاؤں کی ہے۔ مہنا سچا ضلع شیخوپورہ کی حدود میں واقع ہے۔ یہی میرا آبائی گاؤں ہے۔ لیکن میرے قدیم اجداد یہاں کے نہیں تھے قریب ڈیڑھ سو سال پہلے میرے دادا چوہدری سکندر دہلی سے ہجرت کرکے لاہور کے مضافات کے اس گاؤں میں آکر آباد ہوئے تھے۔ ہجرت کرنے کی ایک خاص وجہ تھی۔ میرے پڑدادا مغل دور میں صوبیدار کے معزز اور اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ انگریزوں سے ان کی بنی نہیں۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت میں ناکام ہوئے جس کی پاداش میں ہجرت کرنی بنی۔ میں نے سنا ہے کہ پڑدادا کے آباؤ اجداد کا پیشہ بھی سپہ گری تھا۔ نسلاً ہم جاٹ ہیں۔ گویا جنگجوئی اور سپہ گری ہمارے خون میں ہے، سپہ گری اور کاشت کاری دونوں پیشے سخت کوشی کا تقاضا کرتے ہیں۔ انہی دو پیشوں سے ہمارے آباؤ اجداد وابستہ رہے۔ میرے نانا مرحوم تقسیم سے پہلے انڈین پولیس میں ایک نامی گرامی افسر تھے۔ اور انہیں جرأت و دلاوری کے لئے انڈین پولیس میڈل بھی ملا تھا۔

میرے والد کرنل حق نواز خان نے دوسری جنگ عظیم میں برما کے محاذ پر حصہ لیا تھا۔ ان کے لئے ملٹری کراس کی سفارش کی گئی تھی۔ اسی طرح ان کا جنگی ریکارڈ ۱۹۴۸ء کے کشمیر آپریشن میں بھی شاندار رہا تھا۔ اس آپریشن میں ان کی کارکردگی کی بنیاد پر ان کا نام ستارۂ جرأت کے اعزاز کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ سے پہلے انہوں نے ۶ ایف ایف کو چار سال کمان کیا تھا۔ خوش قسمتی سے اسی یونٹ کے ساتھ میں نے دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں حصہ لیا۔ جب میں اکتوبر ۱۹۶۸ء میں اس یونٹ میں گیا تو ان کی جرأت، دیانت اور فراخ دلی کے چرچے یونٹ کے جوانوں اور رینکس میں عام تھے۔ چنانچہ میرے والد کا نام اور کام یونٹ میں میرے لئے ایک معیار اور ایک چیلنج بن گیا تھا خدا کا شکر ہے کہ میں اس نام کی لاج رکھ سکا۔

بچپن اور لڑکپن کی باتیں

جس طرح کا پودا ہوتا ہے اسی طرح کا پیڑ ہوتا ہے اس اصول کا اطلاق ماہرین نفسیات انسانوں پر بھی کرتے ہیں۔ انسان کی شخصیت کا بنیادی سانچہ بچپن میں بن جاتا ہے بعد میں اس کی تراش خراش ہوتی رہتی ہے لیکن بنیادی ساخت نہیں بدلتی۔ اسی لئے کسی کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ کرنے کے لئے اس کے ماحول اور بچپن کے واقعات حالات اور حادثات کا کھوج لگایا جاتا ہے۔ اس اصول کے تحت جب ہم نے طلعت سے اپنے بچپن کی سرگذشت سنانے کو کہا تو ان کا جواب یہ تھا: میں جون ۱۹۴۹ء میں سرگودھا میں پیدا ہوا جہاں ان دنوں میرے والد پوسٹ تھے۔ بچپن میں میری تربیت کا رخ مردانہ کھیلوں اور جسمانی سخت کوشی کی طرف تھا خاندان کے بڑوں کی شہ پر میں لڑکوں سے لڑائی کے کھیل اور کشتی لڑتا تھا۔ چونکہ والد کو شکار سے دلچسپی تھی اس لئے شروع ہی سے میں نے شکار میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی جو آج بھی میری ہابی ہے۔ والد سے لڑائی کی کہانیاں سن سن کر مجھے لڑنے کا شوق ہو گیا تھا۔ درختوں کی ٹہنیاں توڑ کر ان کی تلواریں بناتے تھے۔ پہلے ان سے لڑتے تھے پھر پیڑوں اور گھروں کی دیواروں کے پیچھے چھپ چھپ کر ایک دوسرے پر مٹی کے گولے پھینکتے تھے۔

اسی طرح کے مشغلوں اور کھیلوں سے نہ صرف میرے اندر سخت کوشی کی عادت پیدا ہوئی بلکہ خود اعتمادی، اور قوت ارادی بھی پروان چڑھی اس کے علاوہ نہروں میں تیرنا اور گھڑ سواری بھی میرے لڑکپن کے مشغلے تھے۔ کبھی تیرنے اور گھڑ سواری کی اجازت ملتی تھی اور کبھی نہیں۔ لیکن مجھے بغیر تیرے اور گھوڑا دوڑائے چین نہیں آتا تھا۔ صورت سے اب تو میں خاصا سنجیدہ نظر آتا ہوں۔ اس وقت میں بہت بھولا بھالا نظر آتا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے خاصی شرارتیں کرنے اور کر کے بچ نکلنے کا موقعہ مل جاتا تھا۔ اب بھی کسی کسی کو میری اندرونی تندی کا اندازہ ہو سکتا ہو۔ میں عادتاً بظاہر پرسکون اور خاموش رہتا ہوں۔

ابتدائی تعلیم

میں نے میٹرک تک تعلیم لاہور کے مشہور اسکول سنٹرل ماڈل ہائی اسکول میں حاصل کی۔ سنٹرل ماڈل اسکول میں بھی میری دلچسپی، آؤٹ ڈور سرگرمیوں میں زیادہ تھی۔ ہنسی مذاق اور شرارتوں میں خاصا وقت گزارتا تھا۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ اس سلسلے میں خاصا بدنام تھا۔ اگر اسکول میں کوئی نئی شرارت ہوتی کوئی چھوٹا موٹا بے ضرر ہنگامہ ہوتا تو لوگ فوراً کہتے یہ طلعت کی حرکت ہوگی۔ بکرٹو اسے۔ شرارتیں تو میں کرتا تھا لیکن اس معاملہ میں میرا ایک اصول تھا مثلاً یہ کہ شرارت اس طرح کی جائے کہ اس سے کردار یا عزت نفس پر حرف نہ آئے اور کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ اگر شرارت کرکے پکڑا جاتا (اور پکڑے جانے میں مزہ آتا تھا) تو محض سزا سے بچنے کی خاطر جھوٹ بولنے کو بہت برا سمجھتا تھا اور کسی کو پھنسانے کو تو میں گناہ سمجھتا تھا۔ اب بھی میرا خیال یہ ہے کہ شرارتیں ضرور کرنا چاہئیں جس طرح انڈا توڑنے کے لئے ہوتا ہے اسی طرح بعض پابندیاں بھی توڑنے کے لئے ہوتی ہیں۔ زندگی میں بغیر تھوڑی سی سرکشی کے مزہ نہیں آتا۔ ہر معاملہ میں بہت زیادہ احتیاط کو میں غلط سمجھتا ہوں اور مجھے راشد صاحب کا قول بار بار یاد آتا ہے جو انہوں نے ایک بار کلاس میں سنایا تھا کہ کسی مفکر نے اپنے کسی عزیز کے بارے میں کہا تھا۔ کہ وہ کمبخت اچھا کیا ہوتا وہ تو برا بھی نہ ہو سکا۔

ـــــ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ شرارت کرکے اس سے مکر جانے کو میں حد درجہ بزدلی اور ناقابل معافی جرم سمجھتا ہوں اس لئے جس میں شرارت کرنے یا کسی پابندی کو توڑنے کا حوصلہ ہے (اور ہونا چاہیئے) تو اس میں شرارت یا حکم عدولی کی پاداش بھگتنے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیئے۔ یہی جوانمردی ہے۔ گو میں جانتا ہوں کہ اکثر ایسا کرنا مشکل ہوتا ہے اسی لئے میرا خیال ہے کہ بچوں، لڑکوں بلکہ نوجوانوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو وسیع ترپس منظر میں فراخ دلی سے دیکھنا چاہیئے۔ اور ارباب اختیار کو بہت مجبور اور فراخ دل ہونا چاہیئے سزا کو ضرورت سے زیادہ سخت نہ بنایا جائے اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ لڑکے شرارتیں کرتے رہیں اور پابندیاں توڑتے

رہیں اور سزائیں بھگتتے رہیں۔ اس لئے کہ ان دونوں باتوں کی کردار سازی میں اپنی اہمیت ہے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسا بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ خود میرا تجربہ اس سلسلہ میں خاصا تلخ ہے۔ سنٹرل ماڈل اسکول میں میرا آؤٹ ڈور ریکارڈ بہت شاندار رہا اسکاؤٹنگ میں، میں قائد اعظم اسکاؤٹ کے درجے تک پہنچا۔ جونیئر کیڈٹ کور میں سینئر انڈر آفیسر رہا۔ نشانہ بازی میں بہترین نشانہ باز کا اعزاز ملا میں ہاکی، کرکٹ، والی بال اور اتھلیٹکس کی اسکول ٹیموں میں بھی کھیلتا تھا۔

ملٹری کالج میں داخلہ۔ بلندیوں کی طرف پہلا قدم

۱۹۶۳ء وہ یادگار سال تھا جب میں، ملٹری کالج میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوا اور ۲۸۷۵ کالج نمبر ملا۔ بابر ہاؤس میرا ہاؤس تھا۔ اسی کے مہربان در و دیوار کے سائے میں دو سال گزارے اس وقت بابر ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر میجر (اب بریگیڈیر) شوکت خورشید تھے اور لیفٹیننٹ ممتاز علی اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر کالج کے کمانڈانٹ لیفٹیننٹ کرنل محمد سردار خان تھے اور ایجوٹنٹی کے منصب پر کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) اکرام اللہ خان فائز تھے۔

انٹر سروسز پبلک اسکول ٹورنامنٹ کی اس زمانے میں بہت دھوم دھام تھی۔ میں چونکہ آؤٹ ڈور مشاغل میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا اس لئے میرے لئے یہ زمانہ بہت سازگار تھا۔ میں نے کھیلوں اور اسپورٹس میں دل کھول کے حصہ لیا اور بہت سے امتیازات حاصل کئے۔ مثلاً نشانہ بازی میں ٹیم کیپٹن تھا اور کلر ہولڈر تھا۔ ۱۹۶۵ء کے آئی۔ایس۔ایس۔بی میں مجھے بہترین نشانہ باز کا اعزاز بھی ملا۔ کرکٹ میں وائس کیپٹن اور کلر ہولڈر تھا۔ ہاکی اور اتھلیٹکس میں، میں کالج ٹیم میں شامل تھا۔

شرارتوں کے اشارے

سنٹرل ماڈل اسکول میں لاہور میں میری شرارتوں کا ریکارڈ شاندار تھا۔ ملٹری کالج میں بھی بُرا نہیں رہا۔ کالج کے پیچھے نہر کی طرف گئے، خربوزے اور کھیرے کے کھیت اب بھی یاد آتے ہیں خدا نہر کے پانی کو ہمیشہ ٹھنڈا اور تیز رواں رکھے اس میں بھی جوان خون کی گرمی کا خوب امتحان ہوتا ہے۔ رات کو سرائے کے ہوٹلوں کی چاء بھی یاد آتی ہے اور اس وقت جو مزہ گانے سننے میں آتا تھا۔ وہ اب کہاں جہلم میں دوسرے بلکہ تیسرے فلم شو کی اپنی لذت تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس سلسلہ میں میرا اصول کیا تھا شرارت یا خلاف ورزی۔ ایک ایڈونچر کے طور پر ہو۔ اس میں بھی کردار اور شرافت کی حدیں ہیں انہیں ملحوظ رکھا جائے میں کہتا ہوں کہ لڑکوں کو مہم جو، خطر پسند پر حوصلہ اور پر اعتماد بنانے کا ایک نصاب بنانا چاہیئے۔ ان کی قوت مقاومت کو بیدار کرنا چاہیئے اور شرارتوں کے بارے میں وسیع النظر اور وسیع القلب ہونا چاہیئے۔ غازیوں پر اس کتاب کے تجربے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ کس ٹائپ کے لڑکے میدان جنگ میں سرخرو ہوتے۔

کیا کھویا کیا پایا

میں نے کالج میں دو برس بڑے بھرپور طریقے سے گزارے۔ یہ میری زندگی کا بہت قیمتی دور تھا یہاں آکر مجھے بلندیوں کا احساس ہوا۔ اور ان تک پرواز کرنے کے لئے پروں کو تولنا سیکھا مسٹر راشد اور مسٹر رشید جیسے بعض بڑے اچھے استادوں سے فیض حاصل کیا۔ بہت سے اچھے دوست ملے۔ میجر داؤد ان میں سے ایک ہیں جو میرے ساتھ ۱۹۷۱ء میں شریک کارزار رہے۔ ان دوستوں سے اب بھی گاڑھی چھنتی ہے۔ اور ہاں مجھے کالج میں ایک دلچسپ نک نیم بھی ملا۔ فادر ولیم۔ دوستوں میں میں اب بھی اسی نام سے معروف ہوں۔ لوگ مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں۔ تم فادر ولیم کیسے ہو گئے یہ کیا قصہ ہے؟ تو وہ قصہ یوں ہے کہ اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ انگریزی کی کتاب میں ایک مزاحیہ

نظم فادر ولیم تھی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ موسیٰ ہال کے دائیں بازو کے کلاس روم میں راشد صاحب یہ نظم پڑھا رہے تھے انہوں نے فادر ولیم کا جو نقشہ کھینچا تو بعض شریر لڑکوں نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا انہوں نے پوچھا کیا ہے۔ کسی کے منہ سے نکل گیا سر، فادر ولیم۔ تو جناب اس روز سے ہم فادر ولیم بن گئے۔ دوستوں کی محبت بھی کیا کیا رنگ لاتی ہے۔

—مختصر یہ کہ کالج میں میری شخصیت کو پھلنے پھولنے کا موقعہ ملا۔ خدا کالج کو شاد و رکھے۔

پی۔ ایم۔ اے سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک

اس سلسلے میں کرنل طلعت عمر لکھتے ہیں۔

میں نومبر ۱۹۶۶ء سے اکتوبر ۱۹۶۸ء تک ۳۹ لانگ کورس میں پی۔ ایم۔ اے کاکول میں زیر تربیت رہا۔ پی۔ ایم۔ اے میں، میں نے بہترین نشانہ باز کا اعزاز حاصل کیا اور اکیڈمی سے بی اے کیا۔ پی ایم۔ اے سے میں اپنے والد کی یونٹ ۶ ایف ایف میں گیا۔ کچھ عرصے یونٹ میں مختلف فرائض انجام دینے کے بعد میں نے ۶ ایف ایف کی کمپنی کی کمان سنبھالی۔ تین سال اس کی کمان کرنے کے بعد اسی کمپنی کی قیادت کرتے ہوئے میں نے دسمبر ۷۱ء کی جنگ میں سلیمانکی سیکٹر میں حصہ لیا۔

سلیمانکی کا معرکہ

اس معرکہ میں کرنل طلعت عمر نے کیا کردار ادا کیا اس کا اندازہ اس فرمان سے ہوتا ہے جو ان کو ستارہٴ جرأت عطا کرنے کے سلسلے میں جاری ہوا۔

ستارہٴ جرأت کا فرمان

دسمبر ۷۱ء کے دوران پی۔ اے ۶۰۵۰ کیپٹن طلعت عمر ۶ ایف ایف کی سی کمپنی کو کمان کر رہے تھے۔ آغاز کارزار کے دن یعنی ۳ دسمبر ۷۱ء کو کیپٹن طلعت عمر کی کمپنی کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی وہ

سلیمانکی فاضلکا پر واقع صادقیہ چوکی پر قبضہ کرے۔ اس چوکی پر ۳۰ آسام نامی انڈین بٹالین کی پلاٹونیں متعین تھیں۔ کیپٹن طلعت نے اپنی ایک پلاٹون کو بنیاد کے طور پر چھوڑا اور باقی کمپنی کو لے کر اس طرح ہوشیاری سے آگے بڑھے اور ایسی موثر تدبیریں کیں کہ دشمن کو بے خبری میں جا لیا۔ دشمن کے گرنیڈ پھینکنے کے فاصلہ پر پہنچ کر کیپٹن طلعت عمر نے ذاتی طور پر حملہ کی رہنمائی کی اور دشمن کو مکمل طور پر زیر کر لیا۔ ۳۶ انڈین سپاہی جنگی قیدی بنائے اور بھاری مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں کیپٹن طلعت عمر کا یہ پہلا کارنامہ تھا۔ ان کی ذاتی جرأت ہمت، استقلال عزم اور قیادت کے بغیر سی کمپنی تباہی سے دوچار ہو سکتی تھی۔

سبونا ندی پر گورکھ کھیڑا بند ھے اس کے داہنے حصے پر دشمن نے زبردست حفاظتی مورچہ بندی کی ہوئی تھی۔ جس کے متعلق دشمن کا خیال تھا کہ یہ ان کی ناقابل تسخیر میجینو لائن ہے۔ ۳ اور ۴ دسمبر کی درمیانی رات تقریباً گیارہ بجے کیپٹن طلعت عمر کو حکم ملا کہ دشمن کی اس مورچہ بندی پر حملہ کریں اور اسے دشمن سے صاف کریں۔ پہلی کارروائی کے بعد کیپٹن طلعت کی کمپنی پوری طرح منظم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ انہیں یہ نیا حکم ملا۔ ایک لمحہ بھی کھوئے بغیر کیپٹن طلعت نے اپنی کمپنی کو لے کر گورکھ کھیڑا بند کا رخ کیا۔ یہ حد درجہ خطرناک راستہ تھا۔ جو اس وقت بھاری توپ خانے کی شدید گولہ باری اور خود کار ہتھیاروں کی فائر کے زد میں تھا اس کے باوجود طلعت عمر نے بڑی تیزی سے یہ فاصلہ طے کر لیا۔ اور سبونا پل کو عبور کر کے اور بذات خود کمپنی کی رہنمائی کرتے ہوئے دشمن کو اس کے مضبوط مورچوں میں جا لیا اور اس کا صفایا کرنا شروع کر دیا ابھی وہ سبونا پل کے دائیں طرف واقع گورکھ کھیڑا بند کے تقریباً تین سو گز کے ٹکڑے پر ہی قبضہ کر پائے تھے کہ ان کی کمپنی پر دشمن نے ٹی ۵۴ قسم کے روسی ٹینکوں کی مدد سے جوابی حملہ کیا۔ کیپٹن طلعت نے تیزی سے ضروری کارروائی کی اور اپنے دستے کی کامیاب قیادت کر کے دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ دشمن کا بھاری نقصان ہوا۔ وہ افراتفری میں اس طرح بھاگا کہ اپنے مقتولوں اور زخمیوں کو بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ جو بچاؤ بچاؤ کی بری طرح چیخ و پکار کر رہے تھے۔ اسی جوابی حملے کو پسپا کرتے ہوئے "سی" کمپنی نے مزید ۲۴

ہندوستانی سپاہی قیدی بنائے - اس کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن نے گورمکھ کھیڑا بند کی بازیابی کو اپنی عزّت کا مسئلہ بنا لیا اس نے اپنے فاضلکا بریگیڈ کی پوری قوت داؤں پر لگا دی۔ فاضلکا بریگیڈ کو ۱۳ آرٹلری بیٹری اور ۱۸ کیولری کے ٹی ۵۴ قسم کے بی اسکواڈرن سے کا پورا تعاون حاصل تھا۔ دشمن نے تقریباً ہر روز کیپٹن طلعت کی سی کمپنی پر جوابی حملہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا۔ گورمکھ کھیڑا بند پر سی کمپنی کا قبضہ دشمن کے لئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا - یہ جوابی حملے خصوصی شدت سے ۷ اور ۸ دسمبر کی درمیانی رات اور ۱۳ اور ۱۴ دسمبر کی درمیانی رات کو کئے گئے۔ لیکن سب جوابی حملوں کو بڑی کامیابی سے پسپا کر دیا گیا اور ہر بار دشمن کا خاصا جانی نقصان ہوا۔ کئی ٹینک تباہ ہو گئے۔

کیپٹن طلعت کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے ۷۵ ایم ایم کی چینی توپ کی مدد سے دشمن کے ٹینک تباہ کئے۔

پاکستانی فوج کی عظیم روایات کے عین مطابق اگر سی کمپنی حد درجہ مشکل حالات میں دشمن کے حملوں کا کامیابی سے اور موثر طریقے سے مقابلہ کر سکی تو یہ کارنامہ صرف سی کمپنی کے کمانڈر کیپٹن طلعت کی ذاتی جرأت عزم، قوت برداشت، حوصلہ اور فرض شناسی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ پندرہ روز تک یہ افسر نہ ڈھنگ سے سویا نہ آرام کیا - اپنے آدمیوں میں ایک دیو کی طرح جما کھڑا رہا - اور اس نے اندھیرے میں روشنی کی کرن کا کام کیا۔

۱۸ دسمبر ۷۱ء کو جب فائر بندی ہوئی تو دنیا نے دیکھا کیپٹن طلعت کی سی کمپنی کے مورچوں کے آس پاس سینکڑوں ہندوستانیوں کی لاشیں پڑی ہیں - اور کئی جلے ہوئے انڈین ٹینک تو کمپنی کی خندقوں سے گزوں کے فاصلے پر کھڑے ہیں - ان میں سے بعض ٹینک تو اب بھی وہاں پڑے ہیں - اور خود ایک داستان عبرت بن گئے ہیں۔

اس تمام جنگ کے دوران کیپٹن طلعت کی کارکردگی ہر موقعہ پر مثالی رہی انہوں نے دشمن کے بھرپور حملوں کو پسپا کرنے میں غیر معمولی قائدانہ صلاحیت کا ثبوت دیا - اور فرض کے حدود

سے بہت آگے جا کر ضروری اقدامات کئے۔ ان کی جرأت کبھی کبھی جنون کی حدوں کو چھوتی نظر آتی تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ توپ کے گولے کی بارود کی بو طلعت کو مست کر دیتی ہے۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھنا آتا ہے۔ پاکستان آرمی اس پر اور اس جیسے نوجوان افسروں پر جتنا فخر کرے بجا ہے۔

اس لئے کیپٹن طلعت کے لئے فوری طور پر ستارۂ جرأت کے آپریشنل ایوارڈ کی پرزور طریقے سے سفارش کی جاتی ہے۔

مصنّف کا تبصرہ

ستارۂ جرأت کے لئے طلعت کے بریگیڈ کمانڈر کا یہ بیان مزید کسی تفصیل کا محتاج نہیں ان الفاظ سے طلعت کی جو تصویر ابھرتی ہے اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ ہم نے اس کارنامے پر جب طلعت کو پرجوش مبارک دی تو انہوں نے کہا۔ اس محاذ پر جو کچھ کامیابی ہوئی وہ تنہا میرا کارنامہ نہیں تھا۔ اس معرکے میں میری کمپنی کی کارکردگی کا بحیثیت مجموعی کیا تھا اس کا اندازہ آپ کو ان اعزازات سے ہو سکتا ہے جو میری کمپنی نے حاصل کئے۔ جن کی تفصیل یہ ہے ستارۂ جرأت ۲، تمغۂ جرأت ۴، امتیازی سند ۶، کمانڈر انچیف کی تعریفی سند ۳۔

اس جنگ میں کمپنی کے ۴۸ افراد زخمی اور شہید ہوئے۔ ہاں ایک اور بات یاد آئی کہ اس ایکشن میں میرے بہترین دوست اور کالج کے پرانی ساتھی کیپٹن (اب میجر) داد ذالرحمٰن نے بھی آرٹلری کے آبزرور کی حیثیت سے حصّہ لیا تھا اور اپنی اعلیٰ کارکردگی کے لئے تمغۂ جرأت پایا تھا۔ ان اعزازات میں انہیں اور ان کے ساتھیوں کو بھی شامل کرنا چاہیئے کیونکہ وہ بھی اس کمپنی کا حصّہ تھے۔

وہ محرک قوّت، وہ جذبہ کون سا تھا؟ جب ہم نے طلعت سے پوچھا کہ وہ یہ کیا غیر معمولی کارنامہ کیسے انجام دے سکے

تو ان کا جواب یہ تھا۔

جنگ میں سوچنے اور حساب لگانے کا موقعہ نہیں ہوتا۔ وہاں وہی کچھ سامنے آجاتا ہے جو انسان اندر سے ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ میں سارے چھلکے اتر جاتے ہیں اور اصل انسان چھل چھلا کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ مشاہدہ بالکل صحیح ہے۔ جو کچھ میں نے ۳ دسمبر سے ۱۸ دسمبر ۷۱ء تک کیا۔ وہ کوئی فلوک کوئی حادثہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا۔ یہ اس دل و دماغ اس تعلیم و تربیت اس ماحول کا پھل تھا جس میں پل کر میں جوان ہوا تھا۔ اگر کوئی یہ پوچھے کہ اس ماحول یا تربیت، یا ذہن کے اجزائے ترکیبی کیا تھے۔ تو میں کہوں گا کہ میرے لاشعور میں میرے مذہبی معتقدات اور مذہبی قدریں تھیں قومی جذبہ بھی تھا۔ اپنی انا کا مسئلہ اور اپنی منصبی ذمہ داری یا فرض کا احساس بھی تھا۔ محرکات کے یہ سب دھاگے ایک دوسرے میں بٹے ہوئے تھے۔ جنگ کے اس حقیقی تجربے کی بنا پر، میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ ملٹری کالج ایسے قومی اداروں میں تعلیم سے زیادہ تربیت پر زور دینا چاہیئے۔ زیادہ اس لئے کہ کتابی معلومات حاصل کرنے کا سلسلہ تو زندگی بھر چلتا رہتا ہے اور صرف معلومات سے انسان نہیں بدلتا۔ جاننا ایک ذہنی عمل ہے اس کا تعلق کردار سے نہیں ہوتا۔ جبکہ تربیّت کا تعلق انسان کے جذبے، سوچ اور رویے سے ہوتا ہے۔ تربیّت سے انسان بدلتا ہے اس کی سوچ بدلتی ہے۔ اس کا طرز احساس بدلتا ہے اور انسان کی سوچ اور احساس ہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کے کردار کے رخ کو متعیّن کرتی ہیں۔

اس لئے یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ تربیّت کو زیادہ اہمیت دینی چاہیئے۔ یہ وہی مین اور مشین والی بات ہے ذہن مشین کی حیثیت رکھتا ہے۔ مین انسان کا کردار اس کی سوچ اس کا احساس ہے اور چونکہ تربیّت سکھانے کی چیز نہیں جذب کرنے کی چیز ہے۔ اس لئے ادارہ کی فضا اہمیّت رکھتی ہے۔ ہر ادارہ کی ایک فضا ہوتی ہے۔ ایک مزاج ہوتا ہے۔ مثلاً میرے گھر کی فضا میں جسمانی قوّت اور اخلاقی جرأت رچی بسی تھی۔ یہی فضا میری کمپنی کی تھی۔ جو فضا جس جگہ کی ہوتی ہے وہ اس کے باسیوں کے لاشعور میں، ان کے خون میں رچ بس جاتی ہے۔

ایک صاحب نظر کا تبصرہ

اس سوانحی خاکہ کے شروع میں ہم نے دسمبر ۷۱ء میں طلعت عمر کے کمانڈر میجر جنرل امیر حمزہ خان ہلال جرأت ستارۂ جرأت کا ایک فقرہ طلعت کے بارے میں نقل کیا ہے ان کا مکمل تبصرہ یہ ہے۔

۱۹۷۱ء کی جنگ میں میجر طلعت ایک کمپنی کمان کر رہے تھے۔ سلیمانکی سیکٹر میں میرے بریگیڈ نے جو کامیابیاں حاصل کیں ان کو برقرار رکھنے میں طلعت نے ایک کلیدی رول ادا کیا ہندوستانی کے متواتر اور مسلسل جوابی حملوں کے باوجود یہ اپنی پوزیشنوں پر ڈٹے رہے۔ اسی سیکٹر میں ایک اور کمپنی کمانڈر میجر شبیر شریف نے ان ہی حالات میں مزاحمت کرتے ہوئے شہادت پائی اور نشان حیدر کے اعزاز سے سربلند ہوئے۔ چونکہ نشان حیدر کا اعزاز اب روایتی طور پر صرف شہادت کے بعد ہی دیا جاتا ہے اس لئے میں نے ان کے لئے اس سب سے اونچے عسکری اعزاز کی سفارش نہیں کی ورنہ وہ ہر طرح اس اعزاز کے مستحق تھے۔

طلعت خاموش طبیعت ہیں معاملات کے سیدھے اور کھرے۔ جنگ کے خطرناک ترین لمحوں میں بھی کرنے کی بات پہلے خود کر کے دکھانے کی اہلیت اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قیادت کی اس امتیازی صفت ہی نے ان کے جوانوں کو ان حالات میں ان کے ساتھ رکھا۔ جبکہ دوسرے ان حالات میں ان سے پیچھے اپنی پوزیشنوں کو چھوڑ بیٹھے تھے صرف اس اندیشے میں کہ اگر طلعت کی پوزیشنیں دشمن نے سر کر لیں تو ہم کیا کریں گے۔ تنہا طلعت کی کمپنی نے دشمن کے سترہ ٹینکوں کو نشانہ بنایا اور دشمن کے تین ٹینک کریو کو قیدی بنایا۔ طلعت ایسے جری، جیالے اور جواں مرد افسر پر کوئی فوج اور کوئی قوم فخر کر سکتی ہے۔ ایسے باشعور اور جاں باز مجاہد ہر روز پیدا نہیں ہوتے۔

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) رخمان گل

ایم سی، امتیازی سند، ستارۂ خدمت، ستارۂ قائداعظم، ستارۂ پاکستان

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) رحمان گل

ایم سی، امتیازی سند، ستارۂ خدمت، ستارۂ قائداعظم، ستارۂ پاکستان

اعلیٰ فوجی، سول اعزازات، جرنیلی، گورنری اور پھر دو ملکوں کی سفیری۔ یہ امتیازات خود بتا رہے ہیں کہ جنرل رحمان گل کی زندگی کن شاہراہوں سے گزری ہے اور کس شان سے گزری ہے۔ لیکن کامیابیوں اور کامرانیوں کی اس طویل داستان کے پیچھے بھی ایک اور داستان ہے خاندانی روایتوں کی، بہتر تعلیم و تربیت کی، عزم و حوصلہ اور صبر آزما جدوجہد کی۔ اس داستان کے جستہ جستہ حصے جنرل رحمان گل کے الفاظ میں ان کے انٹرویو سے مرتب کر کے پیش کئے جاتے ہیں۔

آباؤ اجداد

میرا نسلی تعلق خٹک قبیلے سے ہے اور اس کی بھی بارک شاخ سے۔ میرا آبائی گاؤں ترخہ کوتی ہے جو کوہاٹ ڈویژن کے ضلع کرک میں واقع ہے۔ ترخہ کوتی تین ذیلی قبیلوں کی بستی ہے۔ جبار خیل، مندر خیل اور لینڈی خیل۔ میں جبار خیلی ہوں۔ یہ قبیلہ ہمارے مورث اعلیٰ عبدالجبار کے نام پہ ہے۔

روشنی کے دریچے

جب میں پیدا ہوا تو میرے گھر کے آنگن میں علم کی روشنی تھی اور یہ محض اتفاق نہ تھا ایک عرصے سے جبار خیلوں میں علم کی روایت چلی آ رہی تھی۔ ہمارے بیشتر اجداد لکھ پڑھ سکتے تھے۔ بعض نے دینی مدرسوں میں جا کر تعلیم حاصل کی تھی جو باہر نہیں جا سکے تھے وہ گاؤں ہی میں بزرگوں سے پڑھ لیتے تھے۔ میرے دادا جان راز گل کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ اپنی مادری زبان پشتو کے علاوہ نہ صرف فارسی بلکہ عربی بھی روانی سے بول لیتے تھے۔ میرے اباجی علی اصغر خان کا امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے گاؤں میں سب سے پہلے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا۔ دادا جان راز گل نے میرے اباجی کے لئے بہت کچھ چھوڑا تھا لیکن انہیں ان کے علمی ورثے پر خصوصی فخر تھا۔ ان کی فارسی اور عربی کی کتابوں کو ہمارے گھر میں ایک قیمتی خزانے کی سی حیثیت حاصل تھی۔ جب بھی گھر میں خاندانی روایتوں کی بات چلتی تو جرأت وغیرہ کی کہانیاں سنانے کے بعد وہ یہ ضرور کہتے۔

"رحمان گل! مجھے زیادہ پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ تم اپنے دادا جان کی طرح جبار خیلوں کا نام روشن کرنا"

میرے اباجی گاؤں کے دوسرے افراد کی طرح ۲ ایف ایف آر سے وابستہ ہوتے تھے۔ جنگ عظیم اوّل کے آخر میں لڑائی میں حصہ لیا تھا اور صوبیدار کے عہدہ سے ریٹائر ہوتے تھے۔ فوج میں انکی کارکردگی کس معیار کی تھی اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ سرکار وقت نے انہیں او، بی، آئی کے اعزاز اور سردار بہادر کے خطاب سے نوازا تھا۔ جرأت اور خودداری تو خیر ہمارے خون میں ہے۔ اپنے اباجی کی جس خصوصیت سے میں بطور خاص متاثر ہوا وہ ان کی بے لاگ دیانت اور انصاف پسندی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایک طویل عرصے تک اپنے گھرانے اور گاؤں کے معاملات اور تنازعات سلجھاتے اور نمٹاتے رہے لیکن انہوں نے انصاف کے تقاضوں کو رشتہ و پیوند اور دوسرے مفادات پر مقدم رکھا۔

میری اماں جی کم گو مگر ایک پروقار خاتون تھیں۔ انہوں نے گاؤں کی چھوٹی سی دنیا میں اتنے

دل اور ہاتھ کی فراخی سے اپنا ایک مقام بنایا ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ میں ان غیر معمولی طور پر باشعور اور پُروقار والدین کی تربیت اور دعاؤں کے سائے میں پلا بڑھا اور زندگی کے مختلف مراحل طے کئے۔ میرے والدین نے مجھے لیفٹیننٹ جنرل ہوتے اور سندھ کا گورنر بنتے دیکھا۔ دسمبر ۱۹۷۲ء میں جب اماں جی کا انتقال ہوا تو میں افغانستان میں سفیر تھا اور جب ابا جی نے ۱۹۷۳ء میں رحلت کی تو میں لیبیا میں سفیر مقرر ہو چکا تھا۔ اب والدین کے مہربان سایہ عاطفت سے محروم ہونے کے بعد میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے میں اس گھر میں ہوں جس کی چھت طوفان سے اڑ گئی ہو۔

آغاز سفر

میں اپنے آبائی گاؤں ترخہ کوئی میں ۲۵ اگست ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم میں نے اپنے گاؤں ہی میں حاصل کی پھر کوئی دو برس اسلامیہ ہائی اسکول کوہاٹ میں بھی پڑھا۔ کوہاٹ میں ایک چھوٹے سے واقعہ نے مجھے کے جی آر ملٹری اسکول جہلم پہنچا دیا۔ وہ چھوٹا سا واقعہ جو میری زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا یوں ہے کہ میں یونٹ لائنز میں والدین کے ساتھ رہتا تھا اور اسلامیہ ہائی اسکول پڑھنے جاتا تھا جو خاصے فاصلے پر تھا اس لئے میرے اور دوسرے دو ہم جماعت لڑکوں کے والدین نے اسکول آنے جانے کے لئے ایک تانگہ لگوایا ہوا تھا۔ ایک روز معمول کے مطابق ہم یونٹ لائنز کے سامنے تانگے میں بیٹھ رہے تھے کہ ادھر سے ایک انگریز افسر (غالباً یونٹ کے ایجوٹینٹ) کا گزر ہوا۔ ہمیں دیکھ کر وہ رک گیا۔ اسے تھوڑی بہت پشتو آتی تھی۔ ہم سے پوچھنے لگا

"پڑھ لکھ کے کیا بنو گے؟"

دوسرے دونوں لڑکے جھجک کے چپ رہے۔ میں چہک کے بولا "لفٹین" اس نے انگریزی میں کچھ کہا اور چلا گیا۔ میرے لئے یہ بات آئی گئی ہوئی۔ لیکن وہ افسر نہ بھولا اس نے اسی دن میرے ابا جی کو دفتر میں بلایا اور کہا اگر آپ چاہیں تو آپ کے بیٹے کو کے۔ جی۔ آر اسکول جہلم کے لئے نامزد کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے انہیں ... لفٹین ...

شام کو اسکول سے واپس آیا اور کھانا کھا کر گلی ڈنڈا لے کر باہر کھیلنے جانے لگا تو ابا جی نے مجھے پکارا "رحمان گل ادھر آؤ"۔ ان کا یوں پورا نام لے کر بلانا اس بات کا اشارہ تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ سنجیدہ ہوتے تو پورا نام لے کر بلاتے تھے۔

"تو پھر تم لفٹین بننا چاہتے ہو؟" میں سمجھ گیا کہ صبح کی بات ان تک پہنچ چکی ہے۔ "جی ہاں" میں نے تن کر اور جوش سے جواب دیا۔ اس عرصے میں ان کا کھردرا لیکن شفیق ہاتھ میرے سر تک پہنچ چکا تھا۔

"تو پھر کے۔جی۔آر اسکول جانا پڑے گا"

"جاؤں گا"

میں نے یوں برجستہ کہا جیسے کسی نے مجھے تیار کر رکھا ہو۔ یہ وہ لمحات تھے جب قدرت میرے لئے جرنیلی، گورنری اور سفارت کاری لکھ رہی تھی۔ انہوں نے میرے ارادہ کو پرکھنے کیلئے کہا:

"جہلم اسکول بہت دور ہے وہاں اکیلے رہنا پڑے گا"

"رہوں گا"

انہوں نے پیار سے میرے شانے تھپتھپائے۔ میں نے نظر اٹھائی تو ان کی آنکھوں میں فخر کی چمک دیکھی۔ مجھے آج بھی حیرت ہے کہ یہ مکالمہ میں اتنے اعتماد سے کیسے بول گیا۔ بہر حال یوں چند لمحوں میں میرا جہلم جانا پکاّ ہو گیا۔ ہر باپ اپنی زندگی کی حسرتیں اپنی اولاد میں پوری ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ افسری ان کی حسرت تھی یا نہیں لیکن علم کی روشنی ضرور تھی۔

ایک چھوٹا سا طوفان

باپ بیٹے کے اس مکالمے کو میری اماں جی بڑی دلچسپی بلکہ اس سے زیادہ تشویش سے سن رہی تھیں آخر میں اباجی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "رحمان گل جہلم اسکول پڑھنے جائے گا" اماں جی جو خاموش طبع تھیں اور ابا جی سے کبھی بحث نہیں کرتی تھیں۔ ایک دم پھٹ پڑیں بلکہ شیرنی کی طرح بپھر گئیں۔ "نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ رحمانا بہت چھوٹا ہے۔ میں اپنے بچے کو کالے کوسوں نہیں بھیج سکتی" وغیرہ وغیرہ۔

مامتا کی آگ بڑی ہوتی ہے۔ وہ برابر بولے جا رہی تھیں۔ ابا جی چپ تھے۔ دوسرے دن یہ معاملہ خاندان کے قریبی عزیزوں کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے بھی اماں جی کے نقطہ نظر کی تائید کی۔ لیکن ابا جی جو حتمی فیصلہ کر چکے تھے اس پر قائم رہے۔

کے۔ جی۔ آر سکول جہلم میں داخلہ۔ جرنیلی کی طرف پہلا قدم

کوہاٹ سے جہلم سراستے عالمگیر تک اچھا خاصا طویل اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ لیکن جب کسی کام کا شوق ہو تو راستے کی طوالت کم اور دقتیں آسان معلوم ہوتی ہیں چنانچہ روشنی کی تلاش میں پہلا سفر مجھے گراں معلوم نہ ہوا۔ اور خوشی خوشی اس اجنبی دنیا میں قدم رکھا جہاں ایک نئی زندگی میرا انتظار کر رہی تھی۔ داخلے کی رسمی کارروائی ختم ہونے کے بعد جب ابا جی برڈ وڈ ہاؤس میں مجھے چھوڑ کر جانے لگے تو میں نے ان کی پُر وقار آنکھوں میں نمی دیکھی۔ اندر سے جو میرا حال تھا سو تھا۔ لیکن میں نے اس وقت ان کے سامنے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔ ان کے جانے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کے رویا۔

یہ واقعہ ستمبر ۱۹۲۹ء کا ہے۔ ۲۶۱ میرا اسکول نمبر تھا۔ اور میں چوتھی جماعت میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت اسکول کو شروع ہوئے بھی ٹھیک چار سال ہوئے تھے۔ گویا اسکول کا بھی بچپن تھا۔ اور میرا بھی۔ ستمبر ۲۵ کی انٹری کے سارے طلبہ اسکول میں موجود تھے۔ نمبر ۲ سلطان محمد (بعد کو بریگیڈیئر) ہاؤس ہیڈ ہوا کرتے تھے۔ اور نمبر ۲۹ محمد زر اسکول ہیڈ ہوا کرتے تھے۔ کیپٹن ڈبلیو ایل کلارک اسکول کے کمانڈانٹ، فتح روز خان صوبیدار میجر اور جمعدار فیروز خان برڈوڈ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر تھے۔ لڑکے سر پر گہرے نیلے رنگ کا رومال باندھتے تھے۔ رات کو مٹی کے تیل کے لیمپ جلتے تھے اور میسوں میں باقاعدہ ڈائننگ ہال نہیں بنے تھے۔ لڑکے چٹائی پر بیٹھ کر اور لمبی چوکیوں پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے۔ گویا تنکا تنکا جمع کر کے آشیاں بندی ہو رہی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں ایچ ایچ کلارک کمانڈانٹ ہو کر آئے۔ اور ۱۹۳۳ء میں میجر سیلبی آئے اور ۱۹۳۷ء میں ان کی جگہ میجر اسٹیبنگ نے لی۔ اس طرح میں نے اسکول میں چار کمانڈانٹ دیکھے۔ میرے ہوتے ہوتے اسکول نے ترقی کی کئی منزلیں طے کیں۔ بنیادی سہولتوں

میں اضافہ ہوا۔میں میں بنچ اور میز آئے۔نئی عمارتیں بنیں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ اسکول کے تعلیمی معیار اور رتبہ میں اضافہ ہو۔آرمی کے امتحانات شروع ہوتے۔اسکول مڈل سے ہائی اسکول کے درجے تک پہنچا اور تعلیمی معیار میں اس حد تک اضافہ ہوا کہ ۱۹۳۷ء سے چیدہ چیدہ لڑکوں نے آرمی اسپیشل کا امتحان دینا شروع کیا۔۱۹۳۸ء میں، میں تیسرا لڑکا تھا جس نے یہ امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔اس طرح ۱۹۲۵ء میں جو ادارہ پڑھے لکھے سپاہی پیدا کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ وہ ۱۹۳۶ء سے افسر پیدا کرنے کی منزل تک پہنچا۔ ۱۹۳۶ء میں پہلی بار دو لڑکے رگل شہزاد (جہلم) نوگانگ کے پری کیڈٹ کالج میں بھیجے گئے تاکہ وہ آگے آئی۔ایم۔اے (انڈین ملٹری اکیڈیمی دہرہ دون) میں کمیشن کے لئے جا سکیں۔

اسپیشل کلاس

۱۹۳۸ء میں میرے جہلم سکول چھوڑنے سے پہلے وہاں اسپیشل کلاس شروع کر دی گئی تھی میں نے بھی اس کلاس میں شرکت کی۔اس کلاس کا معیار انٹرمیڈیٹ کے برابر تھا۔اس میں امپیریل جیوگرافی، میپ ریڈنگ، جنرل نالج اور جنرل سائنس کے اضافی مضامین شامل تھے۔اس میں دسویں درجے کے منتخب طلبا شامل کئے جاتے تھے۔شروع میں اسپیشل کلاس کے اسٹاف میں ایک برٹش افسر تھا۔دوسرے سال بی اے ای سی کے دو مزید وارنٹ آفیسر آگئے تھے جو انگریزی اور جنرل سائنس پڑھاتے تھے۔

آرمی اسپیشل پاس کرنے کے بعد اوپر کے چند طلبہ کمیشن کے لئے براہ راست کچز کالج بھیج دیئے جاتے تھے اور باقی اپنی یونٹوں میں چلے جاتے تاکہ وہاں سے وائی کیڈٹ اسکیم کے ذریعے کمیشن کے لئے اپنی قسمت آزمائیں۔

اسپیشل کلاس میں چند ہی لڑکے تھے لیکن اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ خود کمانڈانٹ ڈبلیو پی سیلبی ہفتہ میں ایک پیریڈ لیتے تھے اور مسز سیلبی بھی کم از کم ہفتہ میں ایک بار ضرور اسپیشل کے لڑکوں کو اپنے بنگلے پر بلاتی تھیں۔اور چائے کی پیالی پر ہم سے ہلکی پھلکی باتیں کرتی تھیں۔مقصد یہ تھا کہ ہماری

انگریزی رواں ہو، مجلسی آداب سے واقفیت ہو اور خود اعتمادی پیدا ہو۔

۳۸- ۱۹۲۷ء میں پانچ اور لڑکوں کے ساتھ میں اسپیشل کلاس میں تھا، عنایت، حضور نذیر بھی میرے ساتھ ہی تھے۔ ۱۹۳۸ء کے اوائل میں کمانڈنٹ میجر سیلبی اسپیشل کلاس کو مطالعاتی دورے پر طورخم افغان سرحد تک لے گئے تھے۔ اسی دورے پر سیلبی ہمیں جی او سی پشاور ڈویژن میجر جنرل سی بی ڈیش وڈ سے ملاقات کے لئے لے گئے تھے۔ جنرل ڈیش وڈ نے ہماری وی آئی پی کی طرح تواضع کی۔ مجھے یاد نہیں کہ جنرل ڈیش وڈ کے ساتھ فلیگ اسٹاف ہاؤس میں چاء پیتے ہوئے میرے دل کی گہرائیوں میں یہ خواہش تھی یا نہیں کہ کبھی میں بھی اس فلیگ اسٹاف ہاؤس میں میزبانی کروں۔ لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اٹھائیس سال کے بعد اسی گھر میں، ڈویژن کے جی او سی کی حیثیت سے میں اپریل ۱۹۶۶ء سے مارچ ۱۹۷۰ء تک قیام پذیر رہا۔

میں ملٹری کالج میں تقریباً نو سال رہا۔ اس میں ایک سال کا وہ عرصہ بھی شامل ہے جب میں گھر پہ ایک سال ایک طرح کی جبری چھٹی پر رہا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب میں آٹھویں درجہ میں تھا۔ تو سیلبی صاحب نے نوٹ کیا کہ جہاں میری تعلیمی ترقی کی رفتار بہت تسلی بخش ہے اس حساب سے میں جسمانی طور پر نہیں بڑھ رہا۔ خاص طور پر میرا قد کمیشن کے مطلوبہ معیار پر نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے جہلم بریگیڈ کے کمانڈر بریگیڈیر اینڈرسن سے مشورہ کیا اور اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک میڈیکل بورڈ تشکیل دیا گیا۔ جس نے یہ سفارش کی کہ میں سال بھر کے لئے پڑھائی ملتوی کر کے گھر پہ چھٹی پر رہوں۔ اور گاؤں کی آزاد فضا میں کھاؤں پیوں۔ چنانچہ میں سال بھر گاؤں میں ایک آزاد پرندہ کی طرح رہا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ چنانچہ جب میں واپس آیا تو میرا قد پانچ انچ بڑھ چکا تھا۔ واپس آکر میں نے بہت جلد پڑھائی کی کمی کو پورا کر لیا۔ ۱۹۳۸ء میں، میں نے آرمی اسپیشل کا امتحان دیا اور اس امتحان میں اوّل آیا۔ میں کالج کا تیسرا لڑکا تھا جس نے یہ امتحان پہلی کوشش میں پاس کیا تھا اس کے بعد مجھے کچز کالج میں براہ راست داخلہ کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے اس سے پہلے کہ میں اپنی داستان حیات کا اگلا ورق الٹوں، میں ملٹری کالج کی تعلیم و تربیت کے معیار پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

اسکول کا رول

تعلیم ایک مسلسل عمل ہے۔ انسان تمام زندگی سیکھتا رہتا ہے۔ ایک تعلیمی ادارے کا کام یہ ہے کہ وہ تعلیم کی بنیادوں کو استوار کردے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صحیح تعلیمی رویے پیدا کرے تاکہ زندگی کے آئندہ مرحلوں میں طلبہ کے لئے اپنے طور پر علم حاصل کرنا آسان ہوجائے اس کے علاوہ اس کے اساتذہ بھی ایسے ہوں جو اپنی قدروں، کردار اور رویوں سے طلبا کے کردار اور رویوں کی تعمیر و تشکیل کرسکیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر ہورہا ہے کہ اس ادارہ نے یہ بنیادی کام کماحقہ پورا کیا۔ شروع کے چند سالوں میں تو یہ پرائمری اسکول ہی تھا۔ پھر ۱۹۳۳ء تک مڈل درجے تک پہنچا۔ ۳۵-۱۹۳۴ء سے جب اس نے ہائی اسکول کا مرتبہ حاصل کیا۔ اس وقت سے اس کا عمومی تعلیمی معیار ملک کے کسی ادارے سے کم نہیں تھا۔ کمانڈانٹ میجر سیلبی کے علاوہ جو کیمبرج کے تعلیم یافتہ تھے۔ دو انگریز وارنٹ آفیسر تھے اور ملکی اساتذہ میں صوبیدار غلام احمد صاحب صوبیدار سکندر خان صاحب، صوبیدار ایم اے لطیف صاحب اپنے اپنے مضامین میں طاق تھے (بعد کو یہ تینوں ایجوکیشن کور میں افسر ہوئے) ان لوگوں نے ہمیں آرمی اسپیشل کرایا۔ اور ہماری تعلیمی بنیادیں اتنی پختہ کیں کہ آگے چل کر ہم کچز کالج لوگانگ، آئی ایم اے اور پھر غیر ملکی تعلیمی اداروں میں ملک کے کسی اور ادارے کے طلبہ سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ اس امر کی تصدیق میرے تمام ہم عصر کریں گے جن میں سے کئی جنرل آفیسر ہوئے۔ اور مختلف حیثیتوں میں بڑا نام پایا۔ اس زمانے کے وہ اساتذہ بھی جو علم میں کم تھے اپنی لگن اور جذبے میں کم نہیں تھے ہر لڑکے پر ذاتی توجہ تھی اور تعلیم و تربیت کا اہتمام پورے ذوق و شوق سے ہورہا تھا کمانڈانٹ سیلبی اور ان کی بیگم طلبہ کو اپنے بچوں کی طرح چاہتے تھے اور اسی طرح ان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بلکہ ان کے والدین سے بھی رابطہ رکھتے تھے۔ چھٹیوں میں طلبہ کے گھروں کا چکر لگاتے تھے۔ سیلبی اور اسٹیبنگ نے تو مرتے دم تک پرانے طلبہ سے رابطہ قائم رکھا اور یہ بھی نہیں کہ وہ تنگ نظر ہوں۔ سیلبی نے ۱۹۴۸ء میں ہمیں پاکستان کے بارے میں مضامین لکھوانے شروع کردیئے تھے۔ سیلبی ریٹائرمنٹ کے بعد ۱۹۴۷ء سے لندن کی پاکستانی سوسائٹی کے ممبر تھے اور اپنے طور پر پاکستان کی ایک لابی تھے۔ انہوں

نے مجھے آخری خط ۵ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو لکھا تھا۔ چند دنوں کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

کوئی ادارہ ایسے ہی اساتذہ سے بنتا ہے جو کام کے دیوانے ہوں۔ جو سچی لگن سے اپنا سب کچھ ادارے کو دے سکیں۔ ادارے پوری توجہ چاہتے ہیں۔ یہ کیریئر افسروں کے بس کی بات نہیں جن کی ترجیحات ادھر ہوتی ہیں۔

کچز کالج سے آئی ایم اے تک

آرمی سپیشل کرنے کے بعد مجھے کالج ہی سے براہ راست کچز کالج کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ لیکن جب ایم ایچ پنڈی میں طبی معائنے کے لئے گیا تو آنکھوں کے ککروں کی وجہ سے مجھے آرمی کے لئے ان فٹ قرار دے دیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ماہر چشم میجر فاروقی نے (یہ صاحب ۴۷ء میں ڈی ایم ایس ہو گئے تھے) مجھ سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہو سکتا ہے تم بینائی سے محروم ہو جاؤ۔ اس موقع پر میری آبائی یونٹ میرے آڑے آئی اور اس نے میرا ایک انگریز ماہر چشم سے علاج کرایا۔ نو مہینے کے بعد مجھے فٹ قرار دیا گیا۔ ایک بار پھر میں جی او سی ایسٹرن کمانڈ کے سامنے پیش ہوا۔ اور دوبارہ کچز کالج کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ جولائی ۱۹۳۹ء میں نوگانگ چلا گیا۔ وہاں میں نے اپنی نصابی برتری کو قائم رکھا اور میں اپنی ٹرم کے امتحان میں اوّل آیا۔ انڈین ملٹری اکیڈمی دہرہ دون میں ریگولر کورس کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ ہر چند کہ تعلیمی نصاب میں امتیاز حاصل کرنے کو میری ترجیحات میں پہلی حیثیت حاصل تھی۔ میں نے اسپورٹس میں بھی اپنی کارکردگی کے ایک معیار کو برقرار رکھا۔ باکسنگ میں، میں بہترین لوزر رہا۔ سوئمنگ میں کانسی کا تمغہ لیا۔ اور پانچ میل لمبی کراس کنٹری ریس میں تیسرے نمبر پر آیا۔ یہ تفصیلات میں اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ ہمارے نوجوانوں کو یاد رہے کہ ذہن اور جسم دونوں کو مضبوط رکھنا کارزار حیات میں ضروری ہوتا ہے۔

انڈین ملٹری اکیڈمی میں داخلہ ہندوستان گیر بنیاد پر ہوتا تھا۔ تمام برطانوی ہند سے ۶۰ کیڈٹ ہر ٹرم میں منتخب کئے جاتے تھے۔ داخلے کے وقت میرٹ کے لحاظ سے میں چھٹے نمبر پر تھا۔ پاس آؤٹ ہوتے وقت میرا نمبر پانچواں تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں والد کے سامنے سرخ رو ہوا اور دادا راز کل

کی علمی روایت کو آگے بڑھا سکا۔

میں ۲/۱۳ ایف ایف میں کمیشن ہوا تھا۔ (اب ۸ ایف ایف) ۱۹۴۸ء تک میں اسی بٹالین سے وابستہ رہا۔ ۴۵-۱۹۴۴ء میں برما کے محاذ پر اسی بٹالین کی ڈی کمپنی کی کمان کرتے ہوئے مجھے ملٹری کراس (ستارۂ جرأت) عطا ہوا تھا۔

۲/۱۳ ایف ایف ۲۶ ڈویژن کا حصہ تھی۔ اور خاص برما اور ساحل کے قریب کے جزیروں پر جاپانیوں کے خلاف نبرد آزما رہی تھی۔ اب اس کو ساحلی شاہراہ پر ڈویژن کے ہراول دستے کے طور پر بڑھنا تھا۔ اور بٹالین کا ہراول دستہ میری کمپنی تھی۔ ڈی کمپنی نے پہلے تو معمولی مزاحمتیں دور کیں پھر اس کا سامنا دشمن کی ایک مضبوط پوزیشن سے ہوا۔ دشمن شاہراہ کے کنارے ایک نیچی پہاڑی پر پوزیشن لئے ہوئے تھا۔ اور اس نے پوزیشن کے سامنے ہر قسم کی رکاوٹیں تیار کی ہوئی تھیں۔

ڈی کمپنی کے اگلے دستے جب دشمن
کی پوزیشن کے قریب پہنچے تو دشمن نے پوری قوت سے فائر کھول دیا۔ جس کی وجہ سے ڈی کمپنی کو رُکنا پڑا۔ اور اس طرح پورے ڈویژن کا ایڈوانس رُک گیا۔ اس وقت مجھے حکم دیا گیا کہ دشمن کی پہاڑی کی پوزیشن پر قبضہ کر کے راستہ صاف کروں میں نے فوراً بائیں بازو سے حملے کا منصوبہ بنایا توپ خانے کی دو بیٹریوں کا تعاون بھی مجھے حاصل تھا۔ یہ حملہ بجلی کی سی تیزی سے کیا گیا تھا۔ لیکن دشمن کا موال بھی آخری آدمی آخری گولی کا تھا اس لئے دشمن پھر بھی پوزیشن پر ڈٹا رہا۔ اور ڈی کمپنی کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا اسکے باوجود میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ میں نے دوبارہ کمپنی کو منظم کیا اور پوری قوت سے حملے کو جاری رکھا۔ کمپنی کو شدید ترین مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ایک ایک بنکر کے لئے دست بدست لڑائی لڑنی پڑی۔ جی او سی اور بریگیڈ کمانڈر خود بھی اس لڑائی کو دیکھ رہے تھے۔ چونکہ ان کے آئندہ منصوبوں کا انحصار اس مزاحمت کے صاف ہو جانے پر تھا۔ میں نے اس موقع پر بذات خود حملہ کی رہنمائی کی۔ دشمن کی مزاحمت بے انتہا تھی۔ دوپہر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ تب کہیں جا کے اس پہاڑی پر قبضہ مکمل ہو سکا۔ ڈی کمپنی نے اپنے آپ کو دوبارہ منظم کیا تا کہ پیش قدمی جاری رکھے۔ ٹھیک اس وقت دشمن کے تازہ

دستوں نے ڈی کمپنی پر پیچھے سے حملہ کیا اگرچہ کمپنی بری طرح تھک چکی تھی اور اس کی تعداد بھی کم ہو چکی تھی اس کے باوجود میری کمپنی نے دشمن کا یہ حملہ بھی پسپا کر دیا اور پھر پوری ڈویژن کی پیش رفت کے لئے راستہ بنا دیا۔ اسی کارروائی کیلئے مجھے ایم سی کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔

جہادِ کشمیر

۱۹۴۴ء میں، میں ایم سی لے چکا تھا لیکن مزہ نہیں آیا تھا۔ وہ محض ایک ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کاوش تھی ایک چیلنج تھا جس کا میں نے سامنا کیا لیکن جب معرکہ کشمیر میں مجھے شریک ہونے کا موقع ملا تو میرے دل و دماغ کی کیفیت ہی اور تھی۔ چونکہ یہ جہاد تھا، جہاد ایک عظیم مقصد کی خاطر! اس لئے میں اور میرے جوان ایک نئے جذبے سے سرشار تھے۔

کشمیر آپریشن میں، میں فروری ۴۸ سے جون ۴۸ تک شریک رہا۔ فروری اور مارچ میں، میں نوشہرہ سیکٹر کو کمان کر رہا تھا۔ پونچھ سیکٹر میں، میں نے ۸ ایف ایف کے عارضی کمانڈنگ افسر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اس سیکٹر میں لڑائی کا یہ ایک اہم موڑ تھا۔ ٹیڑی ناٹ فیچر پر دشمن کا دباؤ بہت زیادہ تھا وہ اس پہاڑی کو سر کر کے آگے بڑھنا چاہتا تھا پر دشمن کو منہ کی کھانی پڑی۔ اور وہ اس فیچر کو عبور نہ کر سکا میں اس سیکٹر میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کر ہی رہا تھا کہ یکایک حکم ملا کہ میں ٹیٹوال سیکٹر کی کمان سنبھالوں۔

یہ مئی ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے۔ وہاں ایک ایمرجنسی کی صورت پیدا ہو گئی تھی وہاں کے لشکری دستے اور کچھ باقاعدہ دستے اس حد تک افراتفری کا شکار ہو گئے تھے کہ مظفر آباد کے ہیڈ کوارٹر سے ان کا رابطہ ہی منقطع ہو گیا تھا میں نے اس سیکٹر کو دوبارہ منظم اور متحرک کیا۔

فروری سے جون تک جہادِ کشمیر میں اپنی کارکردگی پر خود تبصرہ کرنا میرے لئے موزوں نہیں میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اسی پر مجھے امتیازی سند کے اعزاز سے نوازا گیا تھا یہاں اس کا اعتراف بھی کرتا چاہوں کہ قومی معرکوں میں اعزازات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی جہاں

[illegible]

حالات میں اور جس ساز و سامان سے ہم لڑ رہے تھے وہ سراسر ناکافی و ناساز گار تھے۔

جہاد کشمیر میں اپنی چند ماہ کی تگ و تاز کو میں اپنی عسکری زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں۔ انسان کی اس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ایک عظیم مقصد کے لئے کچھ کر سکے۔ اگر ایسے عظیم مقصد کے لئے جان بھی کام آئے تو کم ہے۔

کشمیر آپریشن کے بعد

جون ۱۹۴۸ء میں، میں اسٹاف کالج کے لئے گیا۔ ۴۹ء میں ۵۳ بریگیڈ کا بی ایم ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں ۱۳/۶ ایف ایف (اب ۱ ایف ایف) کو کمان کیا۔ ۵۲-۱۹۵۰ء انفنٹری ڈائریکٹوریٹ میں جی ایس او ون رہا۔ ۱۹۵۲ء سے ۵۶ء تک ٹی ایس کا کمانڈر رہا۔ ۵۷-۱۹۵۶ء میں آئی ایف ایف کو کمانڈ کیا۔ ۵۸-۱۹۵۷ء میں ڈائریکٹر انفنٹری رہا۔ اکتوبر ۵۸ء سے نومبر ۶۳ء تک آئی جی ایف سی کے منصب پر فائز رہا۔ نومبر ۶۳ء سے اپریل ۶۴ء تک جی ایچ کیو میں ڈی سی جی رہا۔ پھر اپریل ۶۴ء سے مارچ ۶۶ء تک ایم ایس رہا۔ اپریل ۶۶ء میں میجر جنرل ہو کر ۷ ڈویژن کا جی او سی مارچ ۱۹۷۰ء تک رہا۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں لیفٹیننٹ جنرل بنا۔ پھر ۲۳ دسمبر ۱۹۷۱ء تک گورنر سندھ رہا۔ اس کے بعد فوج سے ریٹائر ہو کر ۷۳-۱۹۷۲ء میں افغانستان میں سفارت کاری کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ۱۹۷۳ء سے ۷۶ء تک لیبیا میں سفیر رہا۔

سول اعزازات

آخر میں، میں ان تین سول اعزازات کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا جن سے مجھے مختلف اوقات میں نوازا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں جب میں بلوچستان میں آئی جی ایف سی تھا تو وہاں خضدار آپریشن کے لئے مجھے ستارۂ خدمت دیا گیا تھا۔ پھر ۱۹۶۲ء کے دیر بجوڑ آپریشن میں ستارہ قائداعظم ملا اور آخر میں ۱۹۷۰ء میں سندھ کے گورنر کی حیثیت سے خدمت بجالانے کے لئے ستارۂ پاکستان عطا ہوا۔

سفارت کاری

اواخر دسمبر ۱۹۷۱ میں میں آرمی سے ریٹائر ہو گیا تھا۔ مارچ ۱۹۷۲ء سے اپریل ۱۹۷۳ء تک میں افغانستان میں پاکستان کا سفیر رہا۔ جولائی ۱۹۷۳ء سے مئی ۱۹۷۶ء تک لیبیا میں سفارت کاری کی خدمات انجام دیں۔

کسی انسان کی اس سے بڑھ کر خوش بختی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی مٹی کے کام آئے اور اپنی زندگی کا کچھ حق ادا کر سکے خدا کا شکر ہے اور صد ہزار بار کہ میں پاکستان کی میدان کارزار میں اور زمانہ امن میں کچھ خدمت کر سکا۔ ترقی کے یہ مواقع، یہ عزتیں اور یہ رفعتیں غرض جو کچھ مجھے ملا اور ہم سب کو ملا ہے یہ سب پاکستان کی دین ہے۔ پاکستان کی جڑوں کو پانی دینا نہ صرف ایک سعادت ہے بلکہ وقت کی اشد ضرورت بھی۔

مصنّف کا تبصرہ

جنرل رحمان گل کا یہ انٹرویو بریگیڈیئر محمد حیات ستارۂ جرأت نے پشاور میں ریکارڈ کیا تھا۔ ہمارے سوال نامے کے آخر میں۔ ایک سوال یہ بھی تھا۔

"آپ کی زندگی کا رہنما اصول کیا رہا ہے۔ اتنی بھرپور اور کامیاب زندگی کا راز کیا ہے؟"

انٹرویو میں یہ سوال براہ راست زیر بحث نہیں آ سکا تھا۔ اس لئے ہم نے وضاحت کے لئے رحمان گل صاحب سے رجوع کیا تو ان کا یہ جواب آیا۔

میرے گھر میں جو علم کی روایت رچی بسی تھی میں اسے اپنے کیریر کی تشکیل و تعمیر میں بنیادی اہمیت دیتا ہوں۔ میرے والد گرامی نے رسمی تعلیم کم حاصل کی تھی لیکن وہ علم کا شوق اور ذوق رکھتے تھے انہوں نے اپنے والد یعنی میرے دادا جان راز گل کو جو فارسی اور عربی کے عالم تھے ہمیشہ میرے سامنے ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کیا۔ بچپن سے میری خواہش تھی کہ میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل

کروں۔ چنانچہ میں تمام عمر روشنی کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں۔ مجھے خوشی ہے اور فخر ہے کہ میرے دونوں بیٹوں افتخار الرحمان اور رفیق الرحمان نے اس خاندانی روایت کو قائم رکھا ہے افتخار نے پی ایم اے سے اعزازی تلوار اور صدارتی میڈل لیا تھا۔ پھر اسٹاف کالج کے امتحان میں اوّل آکر کیمبرلے (یوکے) سے اسٹاف کالج کیا اور آج کل ماشاء اللہ کمانڈ اینڈ اسٹاف کالج کوئٹہ میں لیفٹیننٹ کرنل کے رینک میں ڈی ایس ہیں۔ اسی طرح رفیق نے خیبر میڈیکل کالج کے فائنل کے امتحان میں ۱۵ ۳ طلبہ میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔

دیانت اور سخت کوشی بھی ہمارے گھرانے کی خصوصیت رہی ہے۔ آسان کام اور شارٹ کٹ کو میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ جرأت اور غیرت مندی تو خیر اس فضا میں تھی جس میں، میں نے بچپن میں سانس لی۔

بچپن اور لڑکپن کے تعلیمی خاص طور پر تربیتی ماحول کو ترقی و کامیابی کی بنیادی شرط سمجھتا ہوں انسان کے جوہر ذاتی بھی سازگار ماحول ہی میں کھلتے ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں ملٹری کالج جہلم میرا داخلہ اصل میں جرنیلی کی طرف پہلا قدم تھا۔ میرے کیریر کی بنیادیں وہیں رکھی گئیں۔ زندگی کے بنیادی روّیے میں نے وہیں سیکھے۔ میری خوش قسمتی سے اس وقت وہاں چند ایسے اساتذہ تھے (جن میں کمانڈانٹ کرنل سیلبی کا نام سرفہرست ہے) جن کے کردار اور روّیوں نے میری راہوں کو روشن کیا۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ پاکستان کی سب سے بڑی ضرورت کیا ہے اور اس کے ہر طرح کے مسائل کا بنیادی حل کیا ہے تو میرا ایک ہی جواب ہو گا۔ "روشنی، روشنی"! ہمیں علم حاصل ہی نہیں کرنا علم پیدا بھی کرنا ہے۔ (علم اور معلومات میں فرق کرنا بہت ضروری ہے) لیکن صرف علم حاصل کرنا ہی کافی نہیں اس کو موثر بنانے کے لئے ذہن و کردار کی تربیت بھی ضروری بلکہ زیادہ ضروری ہے اور اس کے لئے ہمیں اچھے اساتذہ کی ضرورت ہو گی اور قومی سطح پر اپنی ترجیحات کو نئے سرے سے متعین کرنا پڑے گا۔

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) شاہ محمد امتیازی سند

آرٹلری

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) شاہ محمد امتیازی سند

آرٹلری

پرانی باتیں

دنہارا اور سون سکیسر کے علاقے میں اعوان قوم کے لوگ فاتح سومنات محمود غزنوی کے زمانے سے آباد ہیں جب مغل بادشاہ بابر دہلی کی طرف یلغار کرتے ہوئے ادھر سے گزرا تو اس نے اعوانوں کی شمشیر زنی سے بھی فائدہ اٹھایا اور پھر دریائے ستلج اور بیاس کے دوآب کی فوجی اہمیت کے پیش نظر اس نے اعوانوں کی ایک بڑی تعداد کو وہاں جاگیریں دے کر آباد کیا۔ چنانچہ صدیوں بعد بھی جالندھر کے ضلع میں اعوانوں کے ساٹھ سے زیادہ گاؤں تھے۔ انہیں میں سے ایک گاؤں الہ دین پور میرا آبائی گاؤں تھا۔ یہیں فروری ۱۹۲۴ء کی دس تاریخ کو میں پیدا ہوا۔

انگریزوں کے زمانے میں جالندھر کے اعوان گھرانے عموماً ساتویں راجپوت رجمنٹ فیلڈ آرٹلری میں بھرتی ہوا کرتے تھے۔ میرے والد عمر بخش مرحوم بھی ۱۹۰۷ء میں آرٹلری سے وابستہ ہوئے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں مشرق وسطیٰ، افریقہ اور یورپ میں اس شان سے

جنگی خدمات انجام دیں کہ ان کی جرأت مندی کا ذکر فوجی مراسلوں میں ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہونے پر وہ ریٹائر ہو کر گھر آگئے تھے۔

ہندو پانی اور مسلم پانی

ہمارا گاؤں الہ دین پور جالندھر چھاؤنی کے جنوب میں واقع تھا اس لئے میں نے اپنی رسمی تعلیم چھاؤنی کے ہائی اسکول سے شروع کی جالندھر کا، کے جی آر اسکول بھی قریب ہی واقع تھا اس لئے اکثر اس کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوتا گو دور سے۔ کے جی اسکول کے لڑکوں کی سج دھج ہی اور تھی۔ ایک روز والد صاحب کسی کام سے کے جی اسکول گئے تو مجھے بھی ساتھ لیتے گئے، وہاں کھیلوں کے سالانہ مقابلے ہو رہے تھے۔ میرا دل بڑا للچایا کہ میں بھی کھیلوں میں حصّہ لوں۔ والد نے یقیناً میرے شوق کو محسوس کیا ہوگا تبھی تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے مجھے بلایا اور کہا۔ "شاہ محمد! میں تمہارے داخلے کی درخواست کے جی آر میں دے رہا ہوں۔" "کے جی آر اسکول میں!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ یہ خبر اتنی اچھی تھی کہ مجھ سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ تقریباً اچھل کے میں نے کہا۔ "ضرور دیں۔ کے جی آر میں ضرور پڑھوں گا۔" میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو والدہ کھڑی تھیں اور چپ تھیں ان کو دیکھتے ہی میں نے اپنے جملے میں اضافہ کیا۔ "میں ہر اتوار کو گھر آجایا کروں گا۔ کے جی آر اسکول قریب ہی تو ہے۔" میں نے یہ جملہ اس لئے کہا تھا کہ کہیں والدہ میری جدائی کے خیال سے میرے داخلے کی مخالفت نہ کریں۔ انہوں نے تو کچھ نہیں کہا لیکن والد کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔

"ہر اتوار کو کیسے آؤ گے۔ تم جہلم کے، کے جی آر اسکول جا رہے ہو۔ اور وہ بہت دور ہے۔"
"جہلم کیوں؟" "اس لئے کہ یہاں کا کے جی، ہندو سکھ، ڈوگروں اور گورکھوں کے لئے ہے، مسلمان بچے کے جی آر جہلم جاتے ہیں۔"

دو قومی نظریئے سے یہ میرا پہلا تعارف تھا بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ تعارف کی ابتدا تھی اس

لئے کہ اس نظریے سے میرا اصل تعارف اس وقت ہوا جب جہلم اسکول میں داخلے کے لئے جاتے ہوتے اسٹیشنوں پر میں نے ہندو پانی اور مسلمان پانی کی صدائیں سنیں۔ لالہ موسیٰ کے جنکشن پر جب گاڑی زیادہ دیر رکی تو میں نے ایک دو جگہ ہندو پانی اور مسلم پانی لکھا بھی دیکھا۔

ملٹری سکول جہلم میں داخلہ

اگست ۱۹۳۶ء میں، جب میں یہاں آٹھویں درجے میں داخل ہوا تو یہ ایک ہائی اسکول تھا پانچ سال بعد ۱۹۴۱ء میں جب میں نے اس کے مانوس درودیوار کو خدا حافظ کہا تو جہلم کے پل سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ اور یہ ادارہ ایک کالج کا رتبہ حاصل کر چکا تھا۔ میرا کالج نمبر ۶۲۳ تھا اور بُرڈوڈ ہاؤس میرا پہلا ہاؤس تھا چونکہ مجھے متھرا کے آرٹلری سنٹر نے نامزد کیا تھا اس لئے میرے لاکر پر اسی کا نام چسپاں تھا میرے ساتھ نمبر ۶۱۲ سے لے کر ۶۲۳ تک ۱۲ لڑکے اس سال داخل ہوئے یہی وہی سال تھا جب دو لڑکوں — گلشیر اور محمد اجمل — کو پری کمیشن ٹریننگ کے لئے نوگانگ بھیجا گیا تھا گویا یہ ادارہ اپنی زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا تھا۔ میرے ساتھ جو لڑکے داخل ہوئے تھے وہ ملک کے مختلف گوشوں سے آئے تھے مثلاً ۲۶ ۔ صبغت اللہ بنگلور جنوبی ہند کا تھا۔ اس طرح ایک ڈارم میں مختلف علاقوں کے مسلمان لڑکے یکجا رہتے تھے اس کا ایک ضمنی نتیجہ یہ ہوا تھا کہ علی گڑھ کی طرح جہلم ملٹری کالج مسلمانوں کا ایک قومی ادارہ بن گیا تھا۔ اس سے ان میں ایک مشترک قومی احساس پیدا ہوا جو زمانہ امن و جنگ میں خصوصاً پاکستان بننے کے بعد بہت کام آیا۔

ملٹری کالج کے اسی تجربے کی روشنی میں میرا یہ خیال ہے کہ ملک میں ایسے تعلیمی ادارے کثرت سے ہونے چاہئیں جن میں ملک کے مختلف گوشوں سے طلبہ آکر ایک مشترک قومی ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کریں۔

۱۹۴۰ء میں میں نے آرمی اسپیشل کا امتحان پاس کیا اور اسپیشل کلاس یا آرمی کلاس میں گیا یہ ایک طرح کی فرسٹ ائر تھی لیکن اس میں کمیشن کی تیاری کرائی جاتی تھی۔ آرمی کلاس کے لڑکے

کبھی کبھی کسی استاد کی غیر حاضری میں کلاس بھی لیتے تھے۔ ۴۱۔۱۹۴۰ء میں میں لارنس ہاؤس کا ہیڈ بوائے رہا اسی سال مجھے تعلیم میں سال کا بہترین کیڈٹ ہونے کا انعام ملا اس انعام کا اعلان ہونے سے پہلے میں کچنز کالج نوگانگ جا چکا تھا۔ انعامی کتابیں مجھے کمانڈانٹ کرنل اسٹیبنگ نے ایک خط کے ساتھ کچنز کالج کے کمانڈانٹ کرنل ہاروے کے توسط سے مجھے بھیجیں۔ اس خط کے ذریعے سے کرنل ہاروے سے میرا براہ راست تعارف ہوگیا۔ ہاروے کا تعلق بلوچ رجمنٹ سے تھا اور وہ اسٹیبنگ کی طرح بہت موثر لیکن سخت گیر تھے۔ اسٹیبنگ کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے شاگردوں کے کیریئر پر برابر نظر رکھتے تھے۔ سیلبی اور اسٹیبنگ اور دوسرے اساتذہ کے بارے میں میں مزید بات کرنے سے پہلے میں کالج کے بارے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جہاں ۴۱-۱۹۳۶ء کے زمانے میں اسکول نے تعلیمی و تربیتی معیاروں میں کافی ترقی کی اس کا ٹریننگ روٹین، کٹ، کھانا وغیرہ یکساں رہا لباس میں صرف یہ ایک تبدیلی ہوئی کہ گہرے سبز (او لیو گرین) رومال کی جگہ سائڈ کیپ نے لے لی جس سے لڑکوں کی اسمارٹنس میں خاصا اضافہ ہوا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو ۴۱-۱۹۴۰ء ہی میں ایک سویلین ملک وزیر خان سائنس کے استاد ہو کر آتے) میرے زمانے میں کالج کی اہم تقریبات چار تھیں۔ ۱۱ ستمبر کو یوم صلح منایا جاتا تھا سال میں ایک بار جہلم، جالندھر اجمیر کے۔ کے جی اسکولوں کے کھیلوں کے مقابلے باری باری ہر اسکول میں بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوتے تھے اور سال کی سب سے اہم تقریب کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسکول کے اندر انٹر پلاٹون کھیلوں اور صفائی ستھرائی کے مقابلے ہوتے تھے۔ ماہانہ ہاؤس انسپکشن پر کالج فلیگ انعام میں دیا جاتا تھا۔ اور سالانہ تقسیم انعامات کا جلسہ ہوتا تھا۔

میرے محسنوں کو میرا سلام پہنچے

محض لکھنا پڑھنا اور کھیل تو کہیں بھی ہو سکتا ہے اصل میں تو ایک اسکول اس کے استادوں ہی سے بنتا ہے۔ یوں تو سب ہی اچھے تھے۔ لیکن میں اپنے اساتذہ میں سے صوبیدار (بعد کو

لیفٹیننٹ کرنل) سکندر خان، صوبیدار (بعد کو لیفٹیننٹ کرنل) انور حسین شاہ اور وارنٹ افسر (بعد کو میجر) ایل ٹی لیوس سے خاص طور سے متاثر ہوا۔ یہ تینوں بہت ہی موثر استاد تھے۔ سکندر خان صاحب اور انور حسین شاہ صاحب نے ہماری کرداری تربیت پر بالخصوص اسلامی اور قومی جذبہ پیدا کرنے کے لئے طلبہ پر بہت محنت کی۔ خود ان کا کردار اور روّیہ بے داغ اور قابل تقلید تھا۔ سکندر خان صاحب کا خط بہت خوبصورت تھا کام سے لگن کا یہ عالم تھا کہ امتحان سے پہلے ایک بورڈ پر نوٹس لکھ کر ہاؤس میں رکھ دیتے تھے تاکہ لڑکے آخر وقت تک کچھ نہ کچھ ذہن میں رکھ لیں۔ ان کے ہینڈ رائٹنگ کا اسٹائل میں نے اب تک اپنایا ہوا ہے اسی طرح انور حسین شاہ صاحب خوش خلق و خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ جغرافیے کے بہت اچھے استاد تھے لیوس انگریزی پڑھاتے کے علاوہ ہاکی کا بہت اچھا کوچ بھی تھا

جنوری ۴۰ء میں آرمی اسپیشل کا امتحان دینے میں پنڈی گیا تھا اس گروپ میں بشیر، صادق، صاحب زاد گل بھی تھے۔ ہم سگنل کی ایک یونٹ کی بیرک میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ امتحان کے دوران میں یکایک بیمار ہو گیا۔ شدید تکلیف تھی۔ ۵-۶۳ صادق کو کسی طرح معلوم تھا کہ میجر سیلبی پنڈی میں نادرن کمانڈ کے ایجوکیشن آفیسر ہیں چنانچہ صادق نے انہیں اطلاع کی۔ اطلاع ملتے ہی وہ اور بیگم سیلبی فوراً آئے اور اپنی گاڑی میں مجھے اپنے گھر لے گئے حالانکہ میں ان کے زیر تربیت صرف ایک سال رہا تھا۔ ڈاکٹر کو دکھایا اور ساری رات دونوں میاں بیوی میری دیکھ بھال کرتے رہے۔ سوپ وغیرہ بیگم نے رات گئے اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے مجھے پلایا نہ صرف یہ بلکہ امتحان کے بعد سیلبی اپنی کار میں مجھے اور صادق کو پشاور لنڈی کوتل کی سیر کو لے گئے تھے۔ راستے میں ہم اکوڑہ خٹک سے چند میل آگے صادق کے انکل سے ملنے ان کے گاؤں میں بھی رکے تھے ان سے سیلبی صاحب کی کچھ جان پہچان پہلے سے بھی تھی آگے طورخم تک گئے تھے اور لنڈی کوتل میس کی مہمانوں کی کتاب میں ونسٹن چرچل کے دستخط بھی دیکھے تھے۔

میجر سیلبی اس ادارہ کے پہلے ماسٹر بلڈر تھے۔ ۱۹۲۷ء میں میجر ٹی ایچ اسٹیبنگ کمانڈنٹ

ہوکر آئے انہوں نے انگلش پبلک اسکولوں کی روایات کو یہاں رائج کیا ان کے لئے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ فنا فی الکالج تھے۔ سیلبی اور بیگم سیلبی کی طرح یہ دونوں میاں بیوی بھی جنکی دنیا میں کوئی اور دلچسپی نہیں تھی دن رات کالج کے لئے ایک کئے ہوئے تھے۔

ایک فلسفہ تربیت

اسٹیبنگ کا اپنا ایک فلسفہ تربیت تھا انہوں نے ذمہ داری اور جواب دہی کا ایک نظام وضع کر رکھا تھا۔ پر یکٹس پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ لیڈر شپ کی تربیت ان کا مطمح نظر تھا۔ ذمہ داری سمجھنے اور اٹھانے کی جو تربیت انہوں نے دی اس سے میری طرح طلبہ کی کئی نسلوں نے فائدہ اٹھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زندگی بڑی سخت تھی (بلکہ قصداً اسے سخت بنایا گیا تھا) اس کے بعد کچنر کالج اور آئی ایم اے کی کیڈٹ کی سختی، سختی نہیں معلوم ہوتی۔ خدا بھلا کرے چارلی چیپلن کا کہ جس کی فلموں کو دیکھ کر ہم ہنسنا اور چہکنا نہیں بھولے تھے۔

کمیشن اور اس کے بعد کی منزلیں

میں کچنر کالج میں جولائی ۴۱ سے جنوری ۴۲ تک زیر تربیت رہا وہاں سے ریگولر کمیشن کے لئے منتخب ہوکر انڈین ملٹری اکیڈیمی دہرہ دون گیا جنگ کی وجہ سے یہ کورس چھ ماہ کے وار کورس میں بدل دیا گیا تھا۔ ۲۵ اکتوبر ۴۲ کو آرٹلری میں کمیشن ملا۔ لڑائی میں فیلڈ آرٹلری کی کمان کی۔ جنگ کے بعد ملایا اور انڈونیشیا کے پوسٹ وار آپریشنز میں حصہ لیا۔ تقسیم ہند کے موقعہ پر میری یونٹ سول انتظامیہ کی مدد کے لئے راولپنڈی ڈویژن میں مصروف رہی۔ یہ تھوڑے دن مجھے دیار غیر میں غیروں کے لئے تگ و تاز کے پانچ برسوں پر بھاری معلوم ہوئے۔ اس ڈیوٹی سے مجھے اپنے ملک کے معاملات سے براہ راست واسطہ پڑا۔ مہاجروں کی حالت زار دیکھ کر میں تڑپ اٹھا۔ دل میں ہوک اٹھی کہ کاش میں پاکستان کے لئے کچھ کر

سکوں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جلدی ہی اس کی ایک صورت پیدا ہوگئی۔

کشمیر آپریشن

مئی جون ۱۹۴۸ء میں انڈین آرمی کا منصوبہ یہ تھا کہ دریائے جہلم کے مشرق میں آزاد کشمیر کے سارے علاقے پر قبضہ کر لے۔ شمال میں مظفر آباد اور جنوب میں میرپور منگلا اس کا ہدف تھا اس حملے کو روکنے کے لئے پاکستان کی طرف سے پہلی بار فیلڈ گنوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے بغیر انفنٹری کی مدافعت موثر نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ جون ۱۹۴۸ء میں سیکنڈ فیلڈ رجمنٹ کی دو بیٹریاں حرکت میں لائی گئیں۔ ایک شمالی سیکٹر کے لئے دوسری جنوبی سیکٹر کے لئے میں اس جنوبی سیکٹر کی فیلڈ بیٹری کا کمانڈر تھا۔ اس کا کام ۱۱۲/د ایف ایف آر کو توپ خانے کی ضروری امداد مہیا کرنا تھا۔ یہ بیٹری میرپور جھنگر دھرمسال روڈ پر ٹانڈر گاؤں کے علاقے میں متعین کی گئی تھی۔ جھنگر دھرمسال پر جہاں سے کوٹلی اور میرپور کو سڑکیں جاتی تھیں دشمن اپنی طاقت جمع کر رہا تھا۔ سبز کوٹ فیچر پر بھی دشمن کی اگلی چوکیاں تھیں بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیر بعد کو لیفٹیننٹ جنرل) کے ایم شیخ نے فیصلہ کیا کہ اس مقام پر دشمن کی جارحانہ قوت کو بے اثر کیا جائے یہ کام انفنٹری اور توپ خانے کو کرنا تھا۔ چونکہ تمام دن دشمن کے ہوائی جہاز بمباری کرتے رہتے تھے اس لئے ضروری تادیبی کارروائی کے لئے شام کو سات بجے کا وقت مقرر کیا گیا۔ یہ، جولائی ۱۹۴۸ء کی بات ہے اس حملے کے لئے میں نے اپنی آبزرویشن پوسٹ کیری نامی ایک نیچی پہاڑی پر قائم کی یہ کوئی بہت موزوں جگہ نہیں تھی اس کے اطراف میں تین اونچی پہاڑیوں میں دشمن موجود تھا اور یہ جگہ دشمن کے چھوٹے ہتھیاروں کی زد میں بھی تھی لیکن اس کے علاوہ کوئی اور ایسی جگہ نہ تھی جہاں سے دشمن کے بریگیڈ ہیڈکوارٹرز اور کیمپ کو نشانہ بنایا جا سکتا۔ جنگ میں خطرے کو نہیں ضرورت کو دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنی پوسٹ قائم کرکے میں نے زیر وار کے لئے ضروری تیاری شروع کر دی۔ یہ کام انتہائی رازداری سے ہونا

تھا۔لیکن غیر تربیت یافتہ لشکریوں کی غیر ذمہ دارانہ جلت پھرت نے دشمن کی توجہ ادھر کرا دی اور مقررہ وقت سے کوئی پندرہ منٹ پہلے دشمن نے مارٹروں، ماؤنٹین اور فیلڈ گنوں سے میری پوسٹ پر شدید گولہ باری شروع کر دی۔ ہمارا کچھ نقصان بھی ہوا لیکن اللہ کا شکر ہے میں نے صورت حال کو اپنی گرفت میں رکھا اور اپنی گنوں سے دشمن کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر، کیمپ اور حملہ آور دستوں پر صحیح صحیح فائر گرا سکا۔ میری پوسٹ پر دشمن سات اور آٹھ جولائی کی درمیانی رات کو مسلسل گولہ باری کرتا رہا یہ بہت سخت لمحات تھے لیکن اللہ کی نصرت آڑے آئی اور میری بیٹری اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکی۔ دشمن کو اس فیلڈ فائر کی توقع نہیں تھی اور وہ بھی اتنا صحیح۔ چنانچہ اس کو شدید نقصانات اٹھانے پڑے۔ ۸ جولائی کی صبح آل انڈیا ریڈیو نے بریگیڈیئر عثمان کے کام آنے کی خبر نشر کی بریگیڈیئر کمانڈر اور اس کے اسٹاف آفیسرز ہماری بیٹری کا شکار بنے تھے۔ بریگیڈ ہیڈکوارٹر کے توپ خچے اڑ گئے تھے۔ ساتھ ہی دشمن کا مورال بھی پرزے پرزے ہو گیا۔ پھر اس نے میرپور منگلا کی طرف پیش قدمی کی ہمت نہیں کی۔

لڑائی کوئی ایک فرد نہیں لڑتا۔ اس معرکہ میں، میرے ساتھ میری پوری بیٹری تھی اگر کوئی بات بنی تو سب کی کارکردگی سے بنی۔ یہاں میں خاص طور پر اپنے رفیق کار کمپنی کمانڈر میجر (اب لیفٹیننٹ کرنل) خداداد کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا۔ ان کی دلیری اور جیالداری بھی بڑے کام آئی۔ یہ ماشاء اللہ ملٹری کالج کے فرزند بھی ہیں (کالج نمبر ۵۹۴) میں ان کو اور اپنے سارے ساتھیوں کو اپنے اعزاز میں شریک کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسی کارکردگی کے لئے مجھے امتیازی سند عطا کی گئی جس کا اعلان ۲۳ مارچ ۱۹۵۰ء کو ہوا تھا۔

دھوپ چھاؤں

اکتوبر ۴۲ء میں جو وردی پہنی تھی وہ جنوری ۶۸ء میں عزت سے اتاری۔ فوج کے معمول کے مطابق خدمت کی مختلف راہوں سے گزرا۔ پھر سول میں مختلف منصبوں پر رہا۔ جولائی ۱۹۷۱ء تو

میں سندھ کے ڈائریکٹر انکوائری اینٹی کرپشن کے عہدہ سے ریٹائر ہوا۔ زندگی کبھی دھوپ میں گزری کبھی چھاؤں میں۔ دھوپ میں ثابت قدم رہنے کی کوشش کی اور چھاؤں میں اللہ کا شکر ادا کیا اور دھوپ سے کبھی گھبرایا نہیں بلکہ

جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

میرا یہ رویّہ رہا۔ خاص طور پر اس لئے کہ مجھے میری مادر علمی نے یہی سکھایا تھا۔

حرف آخر

جو سوالنامہ اس سوانحی خاکے کے لئے مجھے بھیجا گیا تھا اس میں آخری سوال یہ تھا کہ آپ کو زندگی میں کن اشخاص نے متاثر کیا۔ اور پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لئے آپ کی ترجیحات کیا ہیں؟

میں تعلیم میں صوبیدار سکندر خاں سے، تربیت میں میجر سیلی سے اور قیادت میں کرنل اسٹیبنگ سے متاثر ہوا۔ یہ تینوں اپنے اپنے دائرہ میں بے نظیر تھے۔

بڑے کام کے پیچھے بڑا استاد

میں خود ایک بڑے آدمی کی تعریف میں نہیں آتا لیکن جو کچھ تھوڑا بہت تجربہ میں نے زندگی میں حاصل کیا ہے اس کی بنا پر میرا ایمان ہے کہ ہر بڑے کام اور بڑے آدمی کے پیچھے ایک استاد ہوتا ہے اس لئے پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لئے میری ترجیحات میں استاد سب سے پہلے آتا ہے چنانچہ میں اس تحریر کو ایک گمنام استاد کے نام ایک نذرانہ عقیدت پر ختم کرتا ہوں۔

میرے نغمے اس گمنام استاد کیلئے ہیں

عظیم جرنیل بڑی بڑی مہمات کو سر کرتے ہیں مگر وہ گمنام سپاہی ہیں جو جنگ کو جیتتے ہیں۔ بڑے بڑے ماہرین تعلیم کسی تعلیمی نظام کی تنظیم و تشکیل کرتے ہیں مگر وہ گمنام استاد ہی ہے جو اس نظام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہوئے اپنے افکار تازہ سے نوجوانوں کا لہو گرماتا اور ان کی راہبری کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے دن گوشۂ گمنامی میں گزارتا ہے اور تمام عمر مصائب و مشکلات ہی کا شکار رہتا ہے۔

اس کے لئے نہ تو کبھی کوئی بگل ہی بجا ہے اور نہ کبھی پھولوں سے لدی بیند ہی کسی گاڑی نے اس کا انتظار کیا ہے اس کی خدمات کو سراہتے ہوئے نہ تو کسی خصوصی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے اور نہ ہی کبھی کسی نے اسے پھولوں کا ہار پہنانے یا گلدستے پیش کرنے کے بارے میں سوچا ہے۔

مگر وہ خود ان باتوں سے بے نیاز ہو کر جہالت کے تاریک محاذ پر کسی چوکس پاسبان کی طرح علم کے ہتھیاروں سے لیس اپنے فرائض کی بجا آوری میں مشغول نظر آتا ہے۔ وہ جہالت کی خندقوں کھائیوں، کھاڑیوں اور مورچوں پر تابڑ توڑ حملے کر کے جہالت کے نام و نشان کو مٹا کر علم کی سرحدوں کو وسیع کرنے میں لگا رہتا ہے۔

اپنی روزمرہ کی زندگی میں وہ صبر کی سراپا تصویر بنا ان مخالف و خطرناک بدروح طاقتوں کا قلع قمع کرتا ہے جو اس کے نوجوانوں پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ وہ نوجوانوں کی پوشیدہ اور سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کر کے ان میں تڑپ اور روح پیدا کرتا ہے اور اپنی ذہنی دولت کے سرمائے کو جو اس کا اصل سرمایہ ہے۔ اپنے طلبا میں بانٹتا اور تقسیم کرتا ہے اور ان کو اس انمول دولت میں برابر کا شریک سمجھتا ہے۔ وہ جہالت کے بتوں کو پاش پاش کر کے اپنے طالب علموں میں تلاش و تجسس کا جذبہ اجاگر کر کے انہیں آگے بڑھنے کا درس دیتا ہے وہ اپنے ان طلبا۔

ـے دلوں میں ، جو راہ حیات پر متزلزل اور غیر مستقل ہوتے ہیں یقین وایمان اور اعتماد دو ـے دِ ۔ کی شعلیں جلا کر ان کی راہوں کو منور کرتا ہے اور اپنی ذہنی خوشبوؤں سے انہیں مالا مال کرتا ہے ۔ وہ علم کی لاتعداد شمعیں روشن کرتا رہتا ہے ۔ یہ شمعیں آگے جا کر ملک وملت کا نام روشن کرکے اس کی شکر گذار ہوتی ہیں ۔

بس یہی اس کا انعام ہے ۔

علم کتاب سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے مگر وہ علم محض کتابی ہوتا ہے اس لئے کہ شخصیت کی تکمیل اور علم کی محبت ولگن اور ذاتی شوق صرف اور صرف استاد ہی کی ذات کا مرہون منت ہے ۔

ایک مملکت میں استاد سے زیادہ کسی اور کے بس میں نہیں کہ وہ استاد کا سا مقام حاصل کر سکے جس کی ذمہ داریاں لاتعداد ہوں اور ان کا ثمر ومعاوضہ برائے نام اور یہ نام صرف استاد ہی کو دیا جا سکتا ہے کہ فرائض وذمہ داریوں کے لحاظ سے وہ ایک بادشاہ ہے مگر اپنی ذات کے لحاظ سے بنی نوع انسان اور پوری انسانیت کا خادم ۔ (گیلین سے ماخوذ)

لیبیا ویلی کا ہیرو

حق نواز کیانی شہید

سعید راشد

بک کارنر پبلشرز ٥ مین بازار ٥ جہلم

خالد سیف اللہ

فیض عالم صدیقی

شائع ہوگیا ہے

بک کارنر پبلشرز، بک سیلرز، مین بازار، جہلم

تذکرۂ شہداء

سعید ارشد

چھپ کر تیار ہے

بک کارنر

چوک فیصل شہید جہلم

سرسیّد احمد خان

راجہ طارق محمود

○

فوٹو آفسٹ پر

بُک کارنر
پبلشرز، بکسیلرز، جنرل آرڈر سپلائیر
چوک فیصل شہید مین بازار جہلم، پاکستان

اقوالِ زرّیں

شاہد حمید

بک کارنر پبلشرز
جہلم